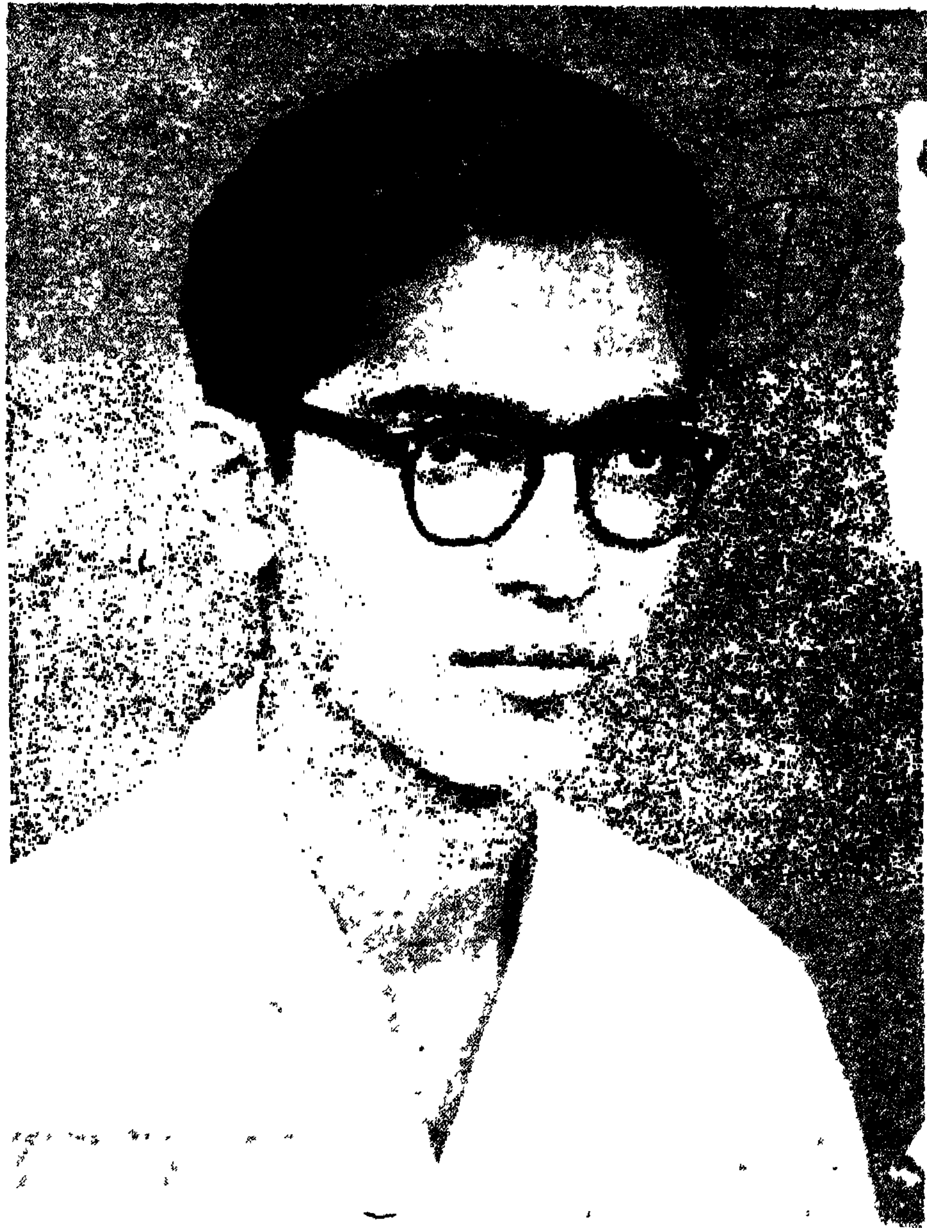
بزمِ تعلیم





دنیا کی پہلی خلاباز خاتون: —— ویلین تینا نِکولائیوا تریشخوفا

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۲	جنوری ۱۹۶۵	شمارہ ۱



ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

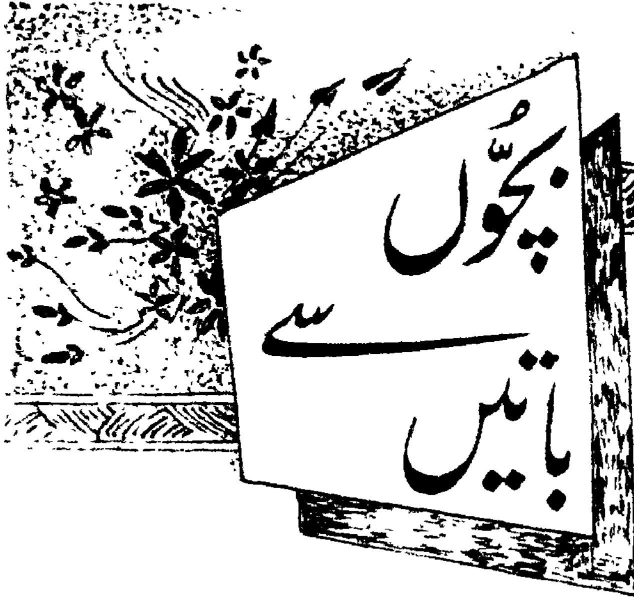
الانہ چندہ : ـــــ پانچ روپے

پرچہ : ـــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

فہرست مضامین



پیامیوں کو نیا سال مبارک!

— آپ کا یہ پرچہ پہلی بار آفسٹ
چھپا ہے۔ خدا کرے آپ کو پسند
ئے، اگر پسند آئے تو اسی کو ہماری
ن سے نئے سال کا تحفہ سمجھیے۔

یہ آفسٹ پریس مکتبہ جامعہ کا ہے۔
ں تھوڑے دن ہوئے مکتبہ نے اسے
یا ہے۔ اس میں ایک بڑی آفسٹ
ن ہے، دو چھوٹی ٹائپ کی مشینیں ہیں۔
پریس کا نام لبرٹی آرٹ پریس ہے۔

پچھلے مہینے (۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء) اس
کا افتتاح بہت دھوم دھام سے
، کوئی بارہ تیرہ سو مہمانوں کو بلایا
تھا۔ افتتاح ہماری جامعہ کے
وائس چانسلر جناب پروفیسر محمد مجیب
کے ہاتھوں ہوا۔ مجیب صاحب نے پریس
کا کام جرمنی میں سیکھا ہے۔ اس لیے
اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں
اور کون ہو سکتا تھا! افتتاح کے بعد
مکتبہ کی طرف سے عصرانہ بھی تھا۔ اس
کا انتظام بھی مکتبہ کے شایانِ شان تھا۔

اس جلسے میں مکتبہ کے جنرل منیجر
جناب تاباں صاحب نے یہ خوش خبری
بھی سنائی کہ تھوڑے دنوں میں آفسٹ
کی ایک اور بڑی مشین لگائی جائے گی۔

دعا کیجیے کہ لبرٹی آرٹ پریس دن دونی ترقی کرے اور ہمارا پیام تعلیم اس میں اچھے سے اچھا چھپے۔

اس مرتبہ سرورق یا ٹائٹل پر عزیزی میاں محمد شفیع کی تصویر چھاپی جا رہی ہے۔ محمد شفیع، محمدیہ ہائی اسکول (بمبئی) میں آٹھویں درجے میں داخل ہوئے تھے اور آٹھویں سے گیارہویں درجے تک تمام امتحانوں میں اوّل آئے۔ مختلف تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی بہت نمایاں رہے۔ ۱۹۶۴ء کے ایس۔ ایس۔ سی بورڈ کے امتحان میں تمام مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ اردو میں مہاراشٹر کی پوری ریاست میں اوّل آئے اور مولانا ابوالکلام آزاد پرائز اور "یحییٰ سنگاپور والا" انعام حاصل کیا۔ ہم اس شاندار کامیابی پر عزیزی موصوف کو، محمدیہ ہائی اسکول کے پرنسپل دلوی صاحب اور اسکول کے تمام استادوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

پیامیوں کو دسمبر کا پرچہ خاص طور سے اچھا لگا۔ بچوں اور بڑوں کی متفقہ رائے ہے کہ پیام تعلیم دھیرے دھیرے ترقی کر رہا ہے۔ کس کا امتحان، چارہ گر بھی کیا کرے، برقعے والی، دن پھر گئے، تعلیمی سفر، سو سال بعد۔ خاص طور پر پسند کیے گئے۔ رسالے کا ٹائٹل بھی بمبئی کے علاقے میں خاص طور پر بہت پسند کیا گیا۔

پچھلے مہینے (۱۷ر تا ۲۰ر دسمبر) جامعہ تعلیم ملّی کراچی نے اپنا یوم تاسیس بہت شان و شوکت سے منایا۔ یہ جامعہ بھی ہماری جامعہ کے نمونے پر قائم کی گئی ہے۔ جامعہ کے پرانے طالب علموں اور پرانے کارکنوں نے آج سے بارہ سال پہلے (۱۹۵۲ء) کراچی شہر سے میلوں دور ایک سنسان اور ویران جگہ ملیر میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔

یہاں پہلے ایک ٹوٹی پھوٹی پرانی عمارت تھی اور چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ اسی ٹوٹی پھوٹی عمارت میں پہلے

سہ ابتدائی یا پرائمری اسکول قائم کیا
۔ پھر مدرسہ ثانوی، پھر کالج پھر استادوں
مدرسہ یا ٹریننگ کالج ۔

اور ان اداروں کی اپنی اپنی الگ
ک عمارتیں ہیں بہت شان دار! لائبریری،
جد، اسٹاف کوارٹرس، کیفے ٹیریا، کی عمارتیں
ن کے علاوہ ہیں ۔

ہم اپنے ان پُرانے ساتھیوں کے جوش،
ہمت، لگن، اور مستقل مزاجی کی داد دیے
بغیر نہیں رہ سکتے جنھوں نے کُل بارہ برس
کی مدت میں یہ معجزہ کر دکھایا ۔

اس سالانہ تقریب کی کامیابی پر ہم
ڈاکٹر محمود حسین صاحب جامعی ماسٹر عبدالحی صاحب
ور ان کے ساتھیوں کی خدمت میں دلی
مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔ پیام تعلیم کے
گلے شمارے میں ہم اس ادارے کا مفصل
حال آپ کو بتائیں گے ۔ ابھی پچھلے تعلیمی میلے
میں شرکت کے لیے ماسٹر عبدالحی صاحب
اور ان کے ساتھی جامعہ تشریف لائے تھے ۔

مولانا حالیؔ مرحوم کو ہم آپ سب اچھی
طرح جانتے ہیں ۔ یہ بڑے عالم و فاضل تھے۔
بہت بڑے ادیب تھے ، بہت بڑے مصنف تھے۔
چوٹی کے شاعر تھے ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ
بہت اچھے انسان تھے ۔ انھوں نے زبان و
قلم سے عمر بھر قوم کی خدمت کی ہے ۔ ان کی
دو کتابیں ، مسدس حالی اور مناجات بیوہ آج
تک گھر گھر پڑھی جاتی ہیں ۔ انھوں نے بڑوں
کے ساتھ بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے ۔
اتنا اچھا لکھا ہے کہ ان کی بہت سی نظمیں کورس
کی کتابوں میں شامل ہیں ۔

مولانا حالیؔ مرحوم کا انتقال ۱۹۱۴ء میں
ہوا تھا ۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ان کی پچاسویں
برسی کے موقع پر پیام تعلیم کا حالی نمبر نکالا
جائے ۔ مارچ کا پیام تعلیم ایک طرح سے
حالی نمبر ہو گا ۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنے بزرگوں سے
(باقی صفحہ ۴۶ پر دیکھیے ۔)



جناب محمد شفیع الدین نیّر



نیا سال مُبارک

پیامِ تعلیم پڑھنے والوں کو یہ نیا سال ہو مبارک
خوشی کے نایاب موتیوں کا بھرا ہوا تھال ہو مبارک

ترقیوں کی جو چوٹیاں ہیں، تُم اِن پہ اس سال چڑھ کے پہنچو
تمھیں مبارک یہ جانفشانی، تمھیں یہ اقبال ہو مبارک

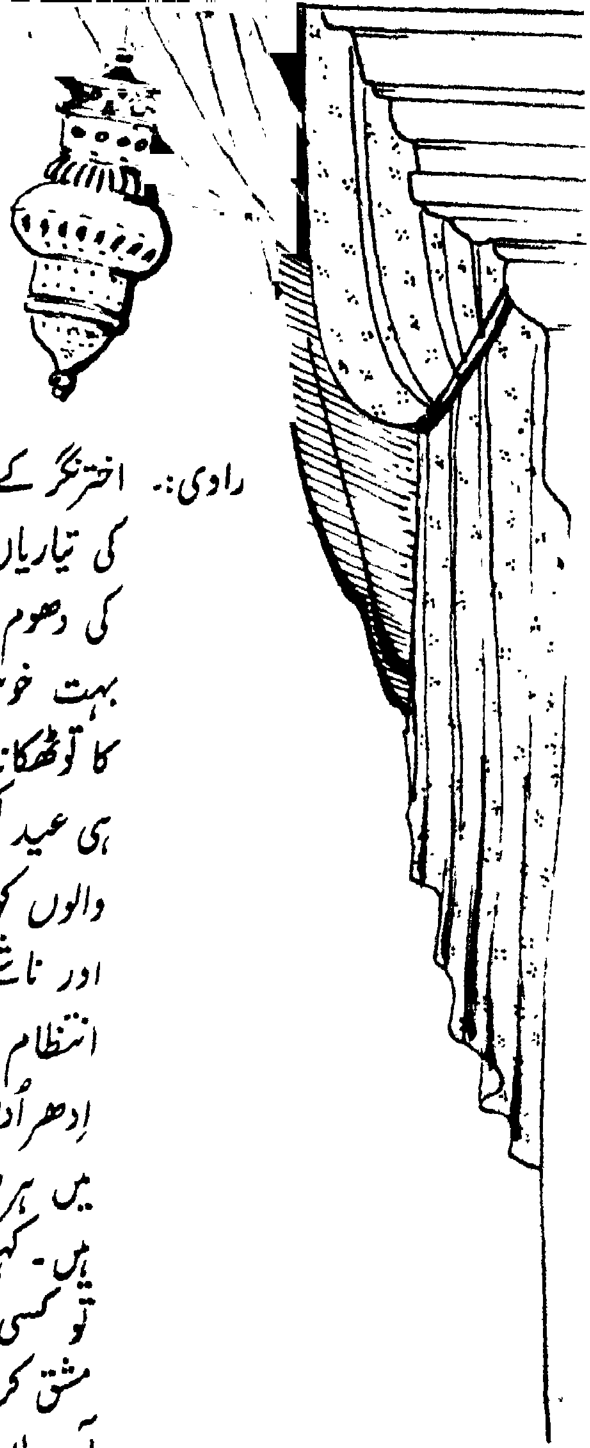
حصولِ تعلیم و تربیت میں تمھیں میسّر ہو کامیابی
چلن تمھارا ہر ایک دِلکش، تمھاری ہر چال ہو مبارک

جو وار ہو تم پہ حادثوں کے ستم کی تلوار کا اچانک
تمھیں بھی اُس وقت صبر و ہمّت کی آہنی ڈھال ہو مبارک

تمھارے حق میں یہی دُعا ہے، یہ دل کے نیّر کا مدّعا ہے
جو وصف اب تک نہ مِل سکا ہو تمھیں وہ اِس سال ہو مبارک

جناب یوسف ناظم

ڈرامے کی تیاری



راوی:۔ اختر نگر کے نورس ہائی اسکول کے سالانہ جلسے کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ ہر طرف بس جلسے کی دھوم ہے۔ پڑھائی لکھائی بند ہے اُستاد بہت خوش ہیں اور طالب علموں کی خوشیوں کا تو ٹھکانا ہی کیا۔ ہر کسی کے چہرے پر عید ہی عید لکھی ہوئی ہے۔ جلسے کا انتظام کرنے والوں کو مفت کی حاضری مِل رہی ہے۔ چائے اور ناشتے کا بھی بندوبست ہے۔ جو طالب علم انتظام میں نہیں ہیں عبداللہ دیوانے بن کر اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ اسکول کے احاطے میں ہر طرف شور ہے۔ قہقہوں کی آوازیں ہیں۔ کہیں تقریروں کی تیاری ہو رہی ہے تو کسی طرف اسپورٹس کی۔ کوئی گانے کی مشق کر رہا ہے تو کسی کو پریڈ کی فکر ہے۔ آپ ان ہنگاموں میں کچھ بھی سمجھ نہ پائیں

گے ــــ اِدھر آئیے ہمارے ساتھ۔
ہاں اِس طرف ــــ دیکھیے اِس
کمرے میں اسکول کی ڈراما کمیٹی
کی میٹنگ ہو رہی ہے ــــ دیکھیے
تو سہی لڑکے کیا کر رہے ہیں ــــ
ہاں، ہاں پردہ اٹھا کر دیکھیے نا۔

(پردہ اٹھتا ہے)

(کئی لڑکوں کے ایک ساتھ بولنے کی
آوازیں۔ ہلکا ہلکا شور)

صدر:۔ (میز پر ہاتھ پٹخ کر)۔ آپ لوگ سُنیں
گے بھی کہ نہیں۔ ۳ بجنے والے ہیں،
دو گھنٹے سے ہماری میٹنگ ہو
رہی ہے اور اب تک کسی ایک
بات کا بھی فیصلہ نہیں ہوا۔

معتمد:۔ جی ہاں اگر یہی حال رہا تو بس
ہو چکا ڈراما۔

مظہر:۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ پہلے
یہ طے کر لیجیے کہ ڈراما کون سا ہوگا۔
اور اس کے بعد کام کرنے والوں
کو چُنا جائے لیکن یہاں تو گھوڑا،
گاڑی کے پیچھے جوتا جا رہا ہے۔

ساجد:۔ اچھا اچھا مظہر صاحب۔ زیادہ
محاورے نہ چھانٹیے۔ آپ کے محاورو
ہی نے ہمارے دو گھنٹے کھا۔
صدر صاحب، میری رائے ہے
آپ پہلے مظہر صاحب کو آدھ گ
خاموش رہنے کی ہدایت کیجیے۔

مظہر:۔ اور فقط آپ بولتے رہیں۔ پہلے ا
منہ کے دانت تو گن لیجیے۔ بڑ
آئے وہاں سے خاموشی کی تجو
کرنے والے۔

جلال:۔ یہ سراسر تمہاری توہین ہے منہ
ساجد خود کیوں نہیں خاموش بیٹھتے
یہ خاموش بیٹھے ہوتے تو اب
تک ہم تصفیہ کیا ڈرامے کا ریہرسل
بھی کر چکے ہوتے۔

ساجد:۔ جلال میاں آپ کیا جانیں ڈراما
کسے کہتے ہیں۔ ڈراما کمیٹی میں
تو آپ بس اِس لیے چُن لیے گے
ہیں کہ دوپہر کے کھانے پر آ
کے گھر سے توشہ دان بہت
آتا ہے۔

جلال:۔ بکومت۔ تین ڈرامے تو میں نے خود لکھے ہیں۔۔

ساجد:۔ اگر تمہارا ڈراما کھیلا گیا تو میں ڈراما کمیٹی سے استعفیٰ دے دوں گا بلکہ اسکول ہی سے اپنا نام کٹوا لوں گا۔

مظہر:۔ ضرور، ضرور۔ اُس دن ہم یوم نجات منائیں گے۔ ممکن ہے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی خوش ہو کر ایک دن کی چھٹی دے دیں۔

ساجد:۔ اسکول کی چھٹی تو بس آپ کی وفات پر ہی ملے گی مظہر صاحب۔

صدر:۔ آرڈر، آرڈر۔ یہ کیا تماشا ہے۔ آپ لوگ اپنے جھگڑے کسی اور موقعے کے لیے اٹھا رکھیے۔

معتمد:۔ دوستو! کھلے دل سے اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ بحث کرنی چاہیے۔ اسکول کی طرف سے ہم پر ذمہ داری ہے کہ ہم ڈرامے کا پروگرام کریں۔ اگر ہم یہ نہ کر سکے تو ہمارے ساتھی تھو تھو کریں گے۔

جلال:۔ صحیح کہا آپ نے معتمد صاحب نے۔ صدر صاحب، میری رائے ہے کہ میرا ڈراما "پورس کی بیٹی" ٹھیک رہے گا۔

ساجد:۔ کون سا ڈراما؟ پورس کی بیٹی؟

جلال:۔ جی ہاں! پورس کی بیٹی۔

ساجد:۔ پہلی بیٹی یا دوسری؟ (ہنسنے کی آوازیں)

مظہر:۔ صدر صاحب۔ ان سے آپ خاموش رہنے کے لیے کہیے نا۔ ہر بار مذاق۔ ہر بار مذاق۔ شرافت تو جیسے انھیں چھو کر نہیں گئی ہے۔

ساجد:۔ جی ہاں شرافت آپ کو بھی بس چھو کر گزر گئی۔ آپ کے اندر داخل نہ ہو سکی۔

صدر:۔ ساجد صاحب۔ آپ ذرا خاموش رہیے۔ اور مجھے یہ تو معلوم کرنے دیجیے کہ یہ پورس کی بیٹی تھی کہاں (ہنسنے کی آوازیں)

معتمد:۔ امرناتھ جی، آپ بتائیے نا۔ آپ تاریخ میں ہمیشہ اوّل آتے ہیں

امرناتھ:۔ جی میں نے کہیں پڑھا نہیں کہ پورس کی کوئی بیٹی بھی تھی۔

جلال:۔ لیکن اگر پورس کی کوئی بیٹی نہیں تھی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟

ساجد:۔ جی ہاں، جی ہاں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ تو بس ڈراما لکھتے ہیں۔

جلال:۔ حاتم طائی کی بیٹی بھی تو ایک ڈراما ہے۔

معتمد:۔ ہوگا! اس کے یہ معنے نہیں کہ ہر شخص کی بیٹی پر ڈراما لکھا جا سکتا ہے ـــــ صدر صاحب اس ڈرامے کے بارے میں سب کی رائے لے لیجیے۔

صدر:۔ آپ لوگوں کی 'پورس کی بیٹی' کے بارے میں کیا رائے ہے۔

مظہر:۔ میری رائے میں یہ ڈراما پاس کر لینا چاہیے۔

ساجد:۔ ضرور، ضرور۔ بلکہ ڈراما لکھنے والے کو بھی پاس کرکے اگلی کلاس میں بھیج دینا چاہیے۔

امرناتھ:۔ صدر صاحب میری رائے میں یہ ڈراما نہیں کھیلا جا سکتا۔

معتمد:۔ میری بھی رائے ہے کہ یہ ڈراما کسی اور اسکول کے لیے رہنے دیا جائے۔

صدر:۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ـــ جلال صاحب آپ کا دوسرا ڈراما کون سا ہے!

ساجد:۔ لیکن یہ ضروری کیا ہے کہ جلال صاحب ہی کا لکھا ہوا ڈراما پیش کیا جائے۔

صدر:۔ اسکول کے جلسے میں اسکول ہی کے کسی طالب علم کا ڈراما اچھا معلوم ہوگا۔ ہاں فرمائیے جلال صاحب۔

جلال:۔ میرا سب سے اچھا ڈراما تو 'پورس کی بیٹی' ہی تھا لیکن اگر آپ لوگوں کی رائے نہیں ہے تو جانے دیجیے۔ میرا دوسرا ڈراما ہے "گوبھی کا پھول"!

ساجد:۔ کیا کیا! گوبھی کا پھول۔ یہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟ آپ کے دماغ میں!

صدر:۔ ساجد صاحب! آپ بہت زیادہ بول رہے ہیں۔ کیا پھول گوبھی آپ نے کبھی دیکھی نہیں؟

جلال:۔ ساجد صاحب کیا جانیں گوبھی کا پھول کیا ہوتا ہے۔ حضرات اِس ڈرامے میں میں نے بڑے کام کی باتیں بتائی ہیں اور لوگوں کو فنِ باغبانی اور کاشتکاری کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت کی ہے — میرے ڈرامے کی ہیروئین گوبھی کے پھول کی بہت شوقین ہے۔

ساجد:۔ کیا وہ اپنے جوڑے میں گوبھی کا پھول لگاتی ہے — یا گوبھی کے پھولوں کا ہار آپ کو پہناتی ہے۔

امرناتھ:۔ ساجد صاحب آپ ظلم کر رہے ہیں۔ ہمیں ڈراما تو سننے دیجیے۔

معتمد:۔ لیکن ہم ہیروئین کہاں سے لائیں گے۔

جلال:۔ یہ بعد میں طے ہوگا۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ڈرامے کی ہیروئین ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو کم سے کم ۵ سیر وزنی پھول گوبھی پیدا کر سکے۔

ساجد:۔ تو پھر تو وہ بغیر شادی ہی کے رہ جاتی ہوگی۔

جلال:۔ جی نہیں۔ ڈرامے کا ہیرو، چھ سیر وزنی پھول گوبھی پیدا کر کے دکھاتا ہے اور شادی کر لیتا ہے۔

ساجد:۔ واہ بھئی کیا ڈراما ہے۔ اچھا جلال صاحب اس میں پھول گوبھی کا پارٹ کون کرے گا۔ آپ خود؟

مظہر:۔ یہ ساجد تو یوں ہی اوٹ پٹانگ کہتے رہیں گے۔ ڈراما سبق آموز ہے۔ اسے پاس کر لینا چاہیے۔

ساجد:۔ یہ ڈراما کسی زراعتی اسکول کے لیے اچھا رہے گا اور —

صدر:۔ اس میں تو ہیروئین کا بھی جھگڑا ہے۔ جلال صاحب آپ کا تیسرا ڈراما کون سا ہے!

جلال:۔ اب دیکھیے صدر صاحب۔ میرا ایک ہی ڈراما رہ گیا ہے اگر یہ بھی آپ نے ناپسند کر دیا تو

میں کیا کروں گا۔

ساجد: یہ آپ سوچیے کہ آپ کیا کریں گے؟ ڈراما لکھنے کے علاوہ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

امرناتھ: بتا دیجیے نا جلال صاحب، آپ کا تیسرا ڈراما کون سا ہے؛ وقت بہت ہوگیا اور آج ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع دینے کی آخری تاریخ ہے۔

معتمد: آج اگر ہم تصفیہ نہ کر سکے تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب ڈراما کھیلنے کی اجازت ہی نہ دیں۔

مظہر: ڈراما کھیلنے کی اجازت مل چکی ہے اب اجازت نہ ملنے کا کب سوال ہے۔

امرناتھ: بھائی ڈرامے کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔ اب جلسے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔

معتمد: اچھا خیر سنیں تو سہی ان کا تیسرا ڈراما کون سا ہے۔

ساجد: مظہر صاحب کی رائے تو پہلے ہی لکھ لیجیے۔ ڈراما کوئی بھی ہو وہ اس کے حق میں رائے دیں گے۔

صدر: جلال صاحب! آپ کے تیسرے ڈرامے کا کیا عنوان ہے۔

جلال: جی "جنگل کا مور"

ساجد: بہت اچھا ہے۔ یہ ڈراما اسکول میں ہوگا یا جنگل میں۔

امرناتھ: اور ہم مور لائیں گے کہاں سے۔

ساجد: جلال صاحب سے پہلے یہ پوچھا جائے کہ مور چرند ہے یا پرند۔

مظہر: چرند ہو یا پرند۔ جنگل کا مو کچھ چھپتا نہیں۔

جلال: مظہر تم بھی بدل گئے! یاد ہے نے دوپہر کے کھانے پر کیا کیا تھا۔ بتاؤں سب کو۔

ساجد: نہیں نہیں کچھ بتانے کی نہیں۔

مظہر: لیکن جلال میں نے تو صرف کے بارے میں کہا۔

جلال: آج دوپہر تم ہی نے یہ عنو

مجھے بتلایا تھا اور اب کہہ رہے
ہو کہ عنوان اچھا نہیں۔

معتمد:۔ اُفوہ! کس مصیبت میں پھنس
گئے ہم لوگ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب
نے چار بجے رپورٹ پیش کرنے
کے لیے کہا تھا اور اب ساڑھے چار
ہونے آئے ہیں۔

انتھ:۔ بہتر ہے کہ صدر صاحب، ہیڈ ماسٹر
صاحب سے کہہ دیں کہ ہم لوگ
ڈراما نہیں کھیل سکتے۔

صدر:۔ ہاں ہم لوگ صرف لڑ سکتے ہیں۔

(ایک چپراسی داخل ہوتا ہے)

معتمد:۔ اے لیجیے، وہ ہیڈ ماسٹر صاحب
کا چپراسی آگیا ــــ کیا ہے مدو؟

مدو:۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ نوٹس
بھیجا ہے۔

...:۔ لاؤ میں پڑھوں۔ (پڑھتا ہے)
"اسکول کے سالانہ جلسے میں
ڈرامے کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کا
وقت دیا گیا تھا لیکن اب یہ
طے ہوا ہے کہ بجائے ڈرامے
کے ایک مشاعرہ کیا جائے۔ مشاعرے
کے انتظامات کے لیے 'اردو سوسائٹی'
کو ہدایت دے دی گئی ہے۔

(پردہ گرتا ہے۔)



جناب سید حرمت الاکرام

مبارک ہو بچو! نیا سال آیا
نئی صبح نے اپنا جلوہ دکھایا
نئی جھلملاہٹ ہے دھرتی کے رخ پر
زمانہ نئی آن سے مسکرایا
بدلتے ہوئے وقت کی ساعتوں نے
نئے ساز چھیڑے، نیا گیت گایا
بڑھے قافلے اپنی منزل کی جانب
جرس کی صدا نے دلوں کو جگایا
مبارک ہو بچو! نیا سال آیا

مبارک ہو بچو! نیا سال آیا
نئے حوصلے اپنے دل میں جگاؤ
نئی آرزوؤں کی محفل سجاؤ
اٹھو پیار کی جوت سے گھر [illegible]
اندھیروں سے [illegible]
ہر اک مرحلہ [illegible]
قدم [illegible]
کھلاؤ [illegible]
مہکے [illegible]
مبارک ہو بچو! نیا سال آیا



جناب محمد امین استاد مدرسہ ثانوی

پہلی خلاباز خاتون

"میں واصل ہوں... یہاں سے زمین کو صاف دیکھ رہی ہوں... مجھے بڑا مزہ آرہا ہے۔"

۱۶ رجون ۶۳ء کو ماسکو میں ٹیلی ویژن کا پروگرام دیکھنے والوں نے یہ آواز سنی۔ یہ پہلی خلاباز خاتون کی آواز تھی جو اپنے خلائی جہاز "ووسٹک ششم" میں بیٹھ کر ۱۸،۰۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے گردش کر رہی تھیں۔ ان کا اصلی نام مسز والن تینا نکولائیوا ترشکوفا ہے۔

"واصل" ان کا خلائی نام ہے۔

ماسکو اور ساری دنیا میں سب حیرت ہوئی کہ خلا کے مسافر صرف مرد ہی نہیں ہیں۔ عورتیں بھی اس دوڑ میں ان کے دوش بدوش، ان کے ہم رکاب ہیں۔

ٹیلی ویژن میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ خوشی سے جگ مگا رہا ہے، آواز جوش سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی زندگی کا یہ زرّیں موقع تھا اور اس قدر قابل فخر کہ اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ راکٹ کے اندر بیٹھ کر صرف خلا میں چکر نہیں لگا رہی تھیں، اپنے ہم وطنوں سے باتیں بھی کر رہی تھیں اور اُن کو اپنی اُڑان اور اپنے خلائی سفر کے متعلق تفصیلات بھی بتا رہی تھیں۔

ویلن تینا کی خوشی کا تو کیا پوچھنا

کرۂ ارض کے لوگ بھی کچھ کم خوش نہیں تھے۔ روس کے طول وعرض میں وہاں کے عوام خوشی سے جھوم رہے تھے اور جگہ جگہ سڑکوں اور گلیوں میں محو حیرت بنے ناچ رہے تھے۔

خوشی کا جذبہ اور اس کی اُمڈتی ہوئی کیفیت اس درجہ غالب تھی کہ ٹیلی ویژن کی ایک اناؤنسر اُس کی رَو میں بہہ گئیں اور خوشی سے بھری ہوئی آواز میں انھوں نے کہا "ویلیا، جان و دل سے پیاری، بہترین، لاجواب، کس قدر حیرت انگیز کارنامہ انجام دے رہی ہے۔"

سہیلیاں پیار سے انھیں ویلیا کہتی تھیں۔

ویلن تینا ۸۸٫۳ (88.3) منٹ میں پوری دنیا کا ایک ایک چکّر لگا لیتی تھیں۔ ان کا مدار زمین سے ۱۱۳ میل اور ۱۱۴ میل کی بلندی پر تھا۔

آسمان کی بلندی پر اُڑتے وقت وہ زمین سے غافل نہیں تھیں۔ زمین کا مشاہدہ وہ برابر کررہی تھیں اور یہ بھی بتا رہی تھیں کہ نیچے کے مناظر کیسے ہیں۔ جب وہ اپنے وطن سے ہوکر گزریں تو انھوں نے والگا کو پہچانا اور برجستگی سے انھوں نے کہا "والگا یہاں سے کس قدر حسین نظر آرہا ہے لیکن زمین! واہ اس کا کیا کہنا وہاں سے والگا اور زیادہ حسین نظر آتا ہے۔"

وہ نہ صرف روسی عوام سے مخاطب تھیں بلکہ دنیا کے جن ملکوں سے ہوکر گزرتی تھیں ہر ایک ملک کے عوام کے نام مبارک باد اور نیک خواہشات کا پیغام بھیجتی تھیں۔

اپنے خلا کے جہاز میں ویلن تینا کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ بالکل نارمل تھیں۔ انھیں بھوک بھی لگی۔ پیٹ بھرکر انھوں نے کھانا بھی کھایا اور پھر اطمینان سے سوئیں بھی۔ انھوں نے گیت بھی گاکر سنائے اور "عقاب" ویلیری بائی کووسکی کے ساتھ مل کر انھوں نے کورس کے گیت بھی نشر کیے۔ بائی کووسکی ان ہی کی طرح

خلا کے مسافر تھے اور چند میل کے فاصلے پر دوسرے راکٹ میں بیٹھے خلا میں گردش کررہے تھے۔

عورت ذات کو لوگوں نے کچھ اس درجہ نازک قرار دیا ہے کہ خلا میں سفر کرنے کی بات خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی تھی لیکن ویلیا نے قوّت برداشت، حوصلہ اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ انھوں نے ایک دن نہیں لگاتار تین روز چکّر لگائے ——

امریکہ کے سب خلاباز جتنی دیر تک چکّر لگا چکے ہیں یہ مدّت اس سے زیادہ تھی۔

یہ تین دن جو انھوں نے خلا میں گزارے محض تفریح کے لیے نہیں، ان کے ذمے بڑے کام تھے۔ مشاہدہ ضروری تھا، نوٹ بک میں اپنے تاثرات قلم بند کرنا ضروری تھا اور ساری اطلاعات زمین والوں کو بتانا ازبس ضروری تھا۔

اپنا پروگرام مکمل کرنے کے بعد جب ان سے کہا گیا کہ نیچے اترو تو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا جہاز اور اس کی مشین کنٹرول کی اور روس کے وسط ایشیائی علاقے میں پیراشوٹ کی مدد سے اطمینان سے اُتر آئیں۔

اُترتے وقت ان کو کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ صرف ان کی ناک پر ہلکی سی خراش آگئی تھی۔

زمین پر واپس آنے کے بعد اُن کے کیا تاثرات تھے؟ نہایت سلیقے اور خاص انداز میں انھوں نے فرمایا "آپ لوگوں کو وہ مثل یاد ہوگی: مہمان بن کر کہیں جانا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ گھر لوٹتا ہے تو اور زیادہ مزہ آتا ہے۔ جب میں نیچے اُتری تو میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے گھر لوٹ آئی ہوں۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

انھیں اس بات پر بڑا فخر تھا کہ نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے اپنی ذمّے داری کو نباہا۔

اس اُڑان اور خلائی سفر کا ایک خاص مقصد تھا:

خلا میں زیادہ دیر تک سفر کرنے

سے مرد اور عورت کے اعضا پر کیا اثر پڑتا ہے؟

یہ تجربہ اس سلسلے میں کامیاب رہا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ راکٹ کی اُڑان میں جو زور اور دباؤ کی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور فضا میں بے وزنی کا عالم طاری ہوجاتا ہے اسے مردوں کی طرح عورتیں بھی جھیل سکتی ہیں۔

ویلن تینا میں بچپن میں یا جوانی کی عمر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ ضرور تھا کہ دوسری ہم عمر لڑکیوں کی طرح وہ بھی خواب وخیال کی دنیا میں رہتی تھی۔ اور "جادو کے قالین" پر بیٹھ کر سیر کیا کرتی تھی۔ پیراشوٹ سے البتہ اسے بہت دلچسپی تھی اور اس سے نیچے کودنے کی مشق اس نے باربار اور جانفشانی کے ساتھ کی تھی۔

خلا کا مسافر بننے سے پہلے اس نے ۲۶ بار نیچے کودنے کی مشق کی تھی۔ کبھی بلندی سے، کبھی آسمان سے، کبھی خشکی پر اور کبھی پانی میں۔ بار بار کی مشقوں سے اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ خلا کی اُڑان اس کے لیے کوئی خوف و ہراس کی بات نہیں رہی تھی۔

کاسموناٹ بننے کے لیے جب اس کا انتخاب کیا گیا تو ٹریننگ اسکول میں اس کو بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان آزمائشوں میں ویلیا نہ صرف پوری اُتری بلکہ اس نے اپنی طاقت اور مستقل مزاجی کا ثبوت دے کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ مردوں میں جو لوگ اس کے ساتھ ٹریننگ حاصل کر رہے تھے وہ قدم قدم پر اس کی کامیابی دیکھ کر رشک کرتے تھے۔

مہینوں اس نے مصیبت جھیلی اور نہایت سخت ٹریننگ حاصل کی۔ جب وہ ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہوئی تو اُس کو خلا میں بھیجنے کے لیے چنا گیا۔ اور یوں اس کے خواب وخیال کی دنیا حقیقت بنتی نظر آئی۔ اس کی امیدیں بر آئیں اور نئی تمنائیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ اس نے راکٹ اور اس کی ٹکنالوجی کا بغور

مطالعہ کیا اور بڑی محنت وجانفشانی کے بعد اس کی مشکلات پر قابو پایا۔ وہ مسلسل محنت کرتی رہی اور آخرکار اس میں بھی اس نے اپنی دھاک بٹھادی۔ گورنمنٹ نے اس کے شوق اور اس کی ہمت کی داد دی اور اس کی کامیابی کی خوشی میں خلا میں جانے سے پہلے اسے جونیر لفٹننٹ کا عہدہ دے دیا۔

ویلن تینا کو اب بین الاقوامی شہرت حاصل ہوچکی ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے خاندان کو دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ وہ کسی اونچے خاندان کی چشم وچراغ نہیں ہے۔ ایک معمولی گھرانے کی لڑکی ہے۔ ۶ مارچ ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کے گاؤں کا نام ماس لینن کو وٹ تھا۔ اس کے والد ایک ٹریکٹر ڈرائیور تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں وہ فوج میں تھے اور محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہوگئے تھے۔ ویلن تینا ابھی چھوٹی تھی۔ جیسے تیسے وہ اسکول میں تعلیم حاصل کرتی رہی۔ ۱۷ سال کی ہوئی تو ربر کے ٹائر بنانے کے ایک کارخانے میں اُسے نوکری مل گئی۔ پھر سوتی کپڑے کے ایک کارخانے میں چلی آئی اور اپنی والدہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ یہ پہلے ہی سے اُسی کارخانے میں ملازم تھیں۔ مزدوری کے دوران میں اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور شام کی کلاسوں میں شریک ہوتی رہی۔ کتائی کے کام میں اس نے مہارت حاصل کی اور پھر یہیں سے اس نے ۱۹۶۰ء میں گریجوٹ کا کورس مکمل کیا۔

اس وقت تک اس میں پیراشوٹ سے کودنے کا شوق پیدا ہوچکا تھا اور وہ اس کی مشقیں کررہی تھی۔ یرسلاف کے ہوائی کلب میں وہ ٹریننگ لے رہی تھی اور اپنے سوتی کپڑے کے کارخانے کے پیراشوٹ کلب میں بھی برابر شریک ہوتی تھی۔ اسی دوران میں یوری گگارن نے خلا میں پہلی اڑان کی۔ اس حیرت انگیز کارنامے کا حال سُن کر اس میں بے پناہ جوش پیدا ہوگیا۔ اُس نے عہد کرلیا کہ وہ

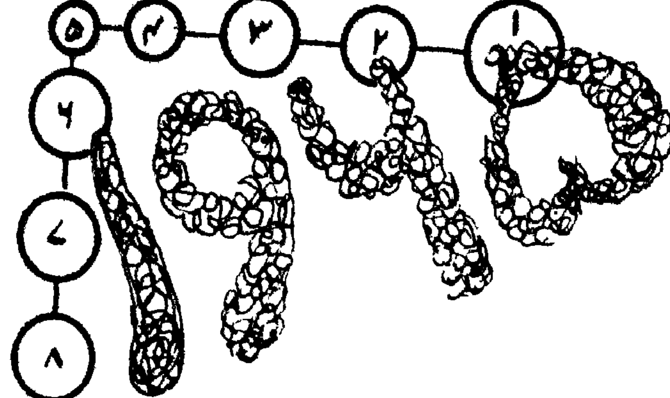
بھی کاسموناٹ بن کر رہے گی۔ اس نے خلا کے متعلق ٹریننگ دینے والے اسکول میں داخلے کی درخواست دی۔ اس کی درخواست منظور ہو گئی۔ اس کے بعد اس کے لیے سب راستے ہموار ہوتے گئے۔

ویلن تینا خوب تندرست اور جسمانی لحاظ سے خوب مضبوط ہے۔ یوری گگارن کے الفاظ میں "اس میں خاص قسم کا حُسن بھی ہے اور جھجھک ذرّہ برابر نہیں ہے"۔ موسیقی اور ادب کا مطالعہ اس کا خاص مشغلہ ہے۔ جدید آرٹ سے وہ پناہ مانگتی ہے۔ اس کے محبوب موسیقار بی ٹھوون اور چے کو وسکی ہیں اور آخرالذکر کا پیانو اور آرکسٹرا پر کنسرٹ سننے میں اسے بہت لطف آتا ہے۔ تالستائے اور مائخل شلوخاف کی کتابیں وہ بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔ شلوخاف نے جب سنا کہ وہ خلا میں اڑان کر رہی ہے تو اچنبھے میں پڑ گئے اور بولے "ایک عورت اور خلا میں! آپ کے لیے ہو لیکن میرے لیے یہ واقعہ قرین قیاس نہیں۔ نہ میں کبھی سوچ سکتا تھا۔ دنیا کے متعلق جو میرے تصورات ہیں اور آیندہ کے جو امکانات ہیں یہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے"۔

ویلن تینا کی کامیابی انسانیت کی جیت ہے، نسوانیت کی جیت ہے، انسانی تمدن کی جیت ہے، انسانی جذبے کی جیت ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ خلا کی دوڑ میں بھی عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

۴ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ویلن تینا نے کیوبا میں اپنے استقبال کے موقع پر کہا: "جلد ہی سوویت یونین کے خلاباز راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جائیں گے۔ وہ چاند پر نہ صرف اتریں گے اور اس کا مشاہدہ کریں گے بلکہ وہاں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد زمین پر واپس بھی آئیں گے اور سب کو وہاں کے حالات سنائیں گے"۔

جنوری ۱۹۶۵ء



بہ خضر برقی شاستری

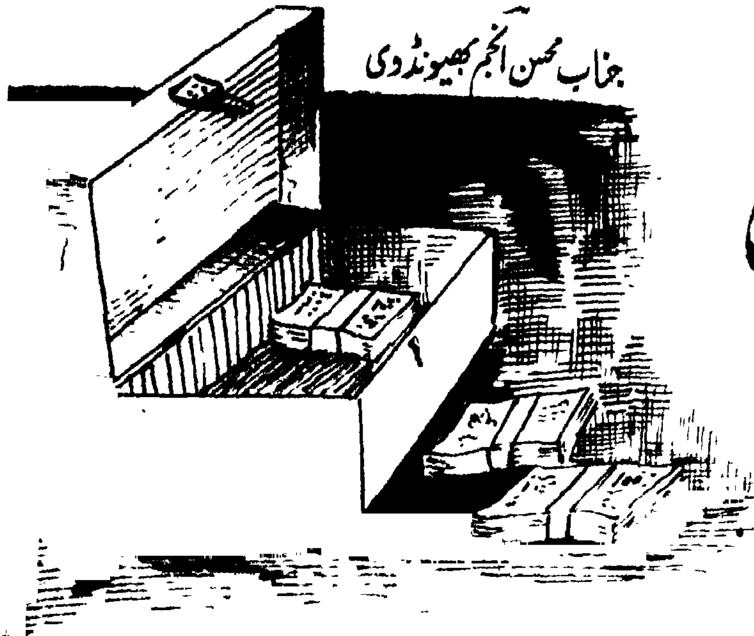
بارہ[۱۲] مہینے ختم ہوئے ہیں
نئے سال نے سر چمکایا
سازنے چھیڑے نئے ترانے
پینسٹھواں[۶۵] سن گاتا آیا
بولو بچو کیا سوچا ہے؟

پڑھنا، لکھنا چھوڑ کے تم نے
کھیل میں سارا وقت گنوایا
رکھ دیں کتابیں ڈیسک کے اندر
کھیل کا ایسا بھوت سمایا
بولو بچو کیا سوچا ہے؟

وقت ہے کم اور کام زیادہ
سوچو سمجھو اپنی بھلائی
ٹائم[۱] پریکشا[۲] کا آیا ہے
نئے سال نے راہ دکھائی
بولو بچو کیا سوچا ہے؟

---

۱ وقت ۲ امتحان



سُوٹ کیس بدل گیا

جناب محسن انجم بھیونڈوی

"کھٹ! کھٹ!! کھٹ!!!" کسی نے دروازے پر دستک دی۔

اسلم نے دروازہ کھولا۔ ڈاکیے نے ایک تار اسلم کے ہاتھ میں دیا اور جلدی سے سائیکل پر بیٹھ چلتا ہوا۔

اسلم نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ چچا جان کا تار تھا۔ لکھا تھا "شام کی ٹرین سے آرہا ہوں۔"

اسلم خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ چچا جان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اسلم اور صفیہ سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ صفیہ اسلم کی چھوٹی بہن تھی۔ چچا جان جب کبھی بمبئی سے آتے، اسلم اور صفیہ کے لیے اچھے اچھے پھل، بسکٹ، مٹھائیاں اور کھلونے وغیرہ ضرور لاتے تھے۔ اسی لیے اسلم اور صفیہ بڑی بے چینی سے ہر مہینے چچا جان کے آنے کا انتظار کیا کرتے۔

اسلم دوڑا دوڑا باورچی خانے میں گیا اور امّی جان کو بھی خوش خبری سنائی۔ صفیہ کا چہرہ بھی اس خبر سے کِھل گیا۔ دونوں بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگے۔

اسلم کی امّی جان کھانے کی تیاری

ں بڑی تندہی سے مشغول ہو گئیں۔ بازار سے کچھ سامان لانے کے لیے انھوں نے پنے نوکر رامو کو پکارا۔ لیکن رامو وہاں موجود نہ تھا۔ آدھے گھنٹے تک رامو نہیں آیا تو امّی جان نے اسلم کے ڈیڈی سے پوچھا "کیا آپ نے رامو کو کہیں بھیجا ہے؟"

ڈیڈی نے جواب دیا "نہیں، میں نے تو اُسے کہیں نہیں بھیجا۔"

دو گھنٹے گزر گئے۔ امّی جان اور ابّا جان پریشان تھے کہ آخر رامو کہاں چلا گیا؟ رامو کو چوری کی لت پڑ گئی تھی۔ کئی مرتبہ اُس نے اسلم کے ابّا جان کے کوٹ سے روپے نکال لیے تھے۔ لیکن رامو کے گڑگڑانے اور معافی مانگنے کے بعد اسلم کے ڈیڈی نے اسے دوبارہ کام پر رکھ لیا تھا۔ اسلم کے ڈیڈی نے اپنی گودریج کی تجوری دیکھی جو بدستور بند تھی۔

چار گھنٹے گزر گئے لیکن رامو کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اسلم کے ڈیڈی نے پورا گھر دیکھا لیکن کوئی بھی قیمتی چیز غائب نہ تھی۔ مزید اطمینان کے لیے انھوں نے تجوری کھولنا چاہی۔ قریب ہی ہینگر پر لٹکے ہوئے کوٹ میں سے انھوں نے چابی نکالی، تجوری کا پٹ کھولا۔ "ارے! یہ کیا!!" ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ تجوری خالی پڑی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسلم کی امّی نے پوچھا۔

"دس ہزار روپے گئے۔" اسلم کے ابّا جان نے مایوسی سے کہا۔

"کیا....؟" امّی جان کو بہت تعجب ہوا "ضرور رامو کی کارستانی ہے۔"

"ہاں! لیکن اب کیا ہو سکتا ہے!" ابّا جان بے حد پریشان نظر آرہے تھے۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اسلم اور صفیہ دونوں دوڑے ہوئے دروازے پر گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ چچا جان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا اور ان کا یہ یقین ٹھیک نکلا۔ دروازے پر چچا جان بھورے رنگ کا سوٹ کیس لیے کھڑے تھے۔ دونوں بھائی بہن

خوشی سے اچھل پڑے۔ اور چچاجان کا ہاتھ پکڑکر ڈرائنگ روم میں لے آئے جہاں ان کے ڈیڈی اور ممی اداس اور پریشان سے بیٹھے تھے۔ دونوں کو اداس اور آزردہ خاطر دیکھ کر چچاجان کو بڑا تعجب ہوا۔ ڈیڈی نے سارا قصّہ بیان کر دیا۔

چچاجان نے مشورہ دیا "فوراً پولیس میں اطلاع دینا چاہیے۔ کیا عجب جو روپیہ مل جائے"۔

اِدھر اسلم اور صفیہ بہت خوش تھے۔ انھیں یقین تھا کہ چچاجان کے سوٹ کیس میں مٹھائیاں، بسکٹ اور کھلونے ضرور ہوں گے۔ انھوں نے چچاجان سے سوٹ کیس کی کنجی مانگی۔ دونوں سوٹ کیس کھولنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ اور جیسے ہی اسلم نے سوٹ کیس کا ڈھکنا اٹھا۔ چچاجان چونک پڑے۔ یہ سوٹ کیس ان کا نہیں تھا۔ انھوں نے جلدی سے سوٹ کیس کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اسلم نے اب غور سے سوٹ کیس میں رکھی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کہا "مجھے تو یہ سوٹ کیس اپنے نوکر رامو کا سا لگتا ہے"۔

چچاجان نے اب پورا سوٹ کیس اُلٹ دیا۔ نیچے پورے دس ہزار روپوں کی دس گڈیاں بڑی حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں۔ تمام لوگ خوشی سے چیخ پڑے۔ یہ وہی روپیہ تھا جو اسلم کے ڈیڈی کی تجوری سے غائب ہوا تھا۔ روپے کی اس غیر متوقع واپسی پر تمام لوگ حیران تھے۔ چچاجان نے کہا "شاید میرا سوٹ کیس بس میں تبدیل ہوگیا"۔

پھر تمام لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتوں میں لگ گئے۔ شام کے کھانے کے بعد رامو اچانک واپس آگیا اس کا منہ اترا ہوا تھا اور وہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب سوٹ کیس تبدیل ہی ہوگیا ہے تو غیرحاضری کا کوئی بھی بہانہ کر دوں گا۔

"تم اب تک کہاں تھے؟" اسلم

ڈیڈی نے گرج کر پوچھا۔

"جی... جی... میری طبیعت خراب تھی۔" رامو نے بہانہ تراشا۔ اچانک چچاجان کی نظر رامو کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے سوٹ کیس پر پڑی۔ انھوں نے رامو کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور کونے میں لکھے ہوئے باریک حرفوں کو پہچان کر کہا۔" ارے! یہ تو میرا سوٹ کیس ہے۔"

رامو کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

چچاجان نے سوٹ کیس کھولا۔ اور اس میں سے مٹھائی، بسکٹ، چاکلیٹ اور پھل نکال کر اسلم اور صفیہ کو دیے۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ چچا جان پھل اور مٹھائیاں ضرور لائیں گے۔" اسلم نے سیب کی ایک قاش منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ صفیہ ایک ساتھ دو تین چاکلیٹ منہ میں رکھ کر بولی "لیکن اس مرتبہ مٹھائی اور پھل چچا جان نہیں رامو لایا ہے۔"

... سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس

جناب ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن

دِلوارا کے مندر



آپ نے کشمیر، دارجلنگ، مسوری، نینی تال، شملہ اور آبو کے نام تو ضرور سنے ہوں گے۔ گرمیوں کے موسم میں جب گرمی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ پہاڑوں پر چلیں۔ آپ کا جی بھی ضرور چاہتا ہوگا کہ کسی پہاڑ کی سیر کریں۔ آئیے ہم آپ کو ان میں سب سے پرانے پہاڑ آبو اور اس کے جینی مندروں کی سیر کرائیں۔ ان کو دیکھنے کے لیے دور دور سے یاتری آتے ہیں اور دلوارا کے مندروں اور ان کی کاری گری کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔

آبو راجستھان اور گجرات کی سرحد پر ہے۔ اس کی اونچائی پانچ ہزار فٹ ہے۔ اور اس کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے کٹھن راستوں سے چڑھنا پڑتا ہے۔ مگر جب ایک دفعہ آپ اس ہری بھری اور خاموش جگہ پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر سفر کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبو پہاڑ ہزاروں سال پہلے بھی رشی منیوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس کا پرانا نام ناگ دیوتا کے نام پر اربودا پہاڑ تھا، جو بگڑتے بگڑتے آبو پہاڑ ہوگیا۔ ساتویں صدی عیسوی تک آبو پہاڑ شیو دیوتا کے ماننے والوں کا گڑھ بنا رہا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جینی بھکشو بھی یہاں آتے رہے۔

دسویں گیارھویں صدی میں ماؤنٹ آبو اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر گورجروں کا راج تھا، ان کی راج دھانی چندراوتی آبو کے دامن میں واقع تھی۔ چندراوتی پر راجکمار دھندو راج کرتا تھا جو گجرات اور دکن کے چالوکیہ راجہ بھیم دیو اوّل کے ماتحت تھا، راجہ دھندو نے گورجر دیس کو آزاد کرانے کے لیے کوشش کی تو چالوکیہ راجہ نے اس بغاوت کو دور کرنے کے لیے اپنے قابل وزیر اور سپہ سالار ومل ساہا کو چندراوتی پر چڑھائی کرنے کا حکم دے دیا۔ ومل ساہا نے نہ صرف چندراوتی پر قبضہ کر لیا بلکہ راجہ دھندو کو بھی سمجھا کر مہاراجہ بھیم دیو کے ماتحت رہنے پر راضی کر لیا۔ مگر چندراوتی کے خوب صورت مناظر نے ومل ساہا پر ایسا جادو کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے یہیں رک گیا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات ایک جینی بھکشو دھرم گھوش سے ہوئی اور اس بھکشو کی باتوں کا ومل ساہا پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے لڑائی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

ومل ساہا کے کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کے پاس روپیہ بے حساب تھا۔ اس لیے اس نے اور اس کی بیوی نے یہ طے کیا کہ آبو پہاڑ پر ایک ایسا خوب صورت مندر بنوائیں کہ اس جیسا پوری دُنیا میں نہ مل سکے۔ مگر سوال تھا جگہ کا، برہمن پجاری ایک انچ زمین دینے کو تیار نہ تھے۔ آخر اس نے برہمنوں کو زمین کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے دِلوارا کے مقام پر جینی مندر بنانے کا کام شروع کرا دیا۔ لیکن پہاڑ پر عمارت بنوانا کچھ آسان کام تو ہے نہیں پورا عمارتی سامان، نیچے سے اوپر لے جانا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں دِلوارا مندر میں جو سنگ مرمر لگا وہ سب کا سب نیچے سے کمرانہ کی کانوں سے منگوایا گیا تھا اس لیے مندر پر خرچ بہت زیادہ ہوا۔ مگر جب ۱۰۳۲ء میں یہ بن کر تیار ہو گیا تو پھر

اس مندر کا کوئی جواب نہ تھا۔ آئیے اب آپ کو اس مندر کی سیر کرائیں۔

دلواڑا کے مندر کے چاروں طرف ایک فصیل ہے جو معمولی پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے اندر ایک ایسا مندر بھی ہو سکتا ہے جس میں ہمارے دیس کی مورتی کلا کے بہترین نمونے موجود ہوں گے۔ فصیل کے اندر قدم رکھیے تو چاروں طرف کمرے نظر آتے ہیں جن کے اندر جینی بزرگوں کی مورتیاں رکھی ہیں۔ صحن کے بیچ میں مندر کی اصل عمارت ہے جو [illegible] فٹ لمبی اور [illegible] فٹ چوڑی ہے۔ مندر میں داخلے کا دروازہ پورب کی طرف ہے۔ اس دروازے سے ذرا آگے بڑھیے تو [illegible] سنگ مرمر نظر آنے لگتا ہے جو دودھ جیسا سفید اور ہاتھی دانت جیسا چکنا۔ دلوارا مندر کے کاریگروں نے سنگ مرمر میں ایسی ایسی جالیاں کاٹی ہیں، پھول بنائے ہیں، گلدستے [illegible] ستون [illegible]

تراشے ہیں، مجسمے تیار کیے ہیں کہ ان کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ کام پتھر نہیں ہے بلکہ ہاتھی دانت یا موم پر کیا گیا ہے۔ اس مندر میں ایک انچ جگہ ڈھونڈنا بھی بہت مشکل ہے جہاں مورتی کلا کا کمال نہ دکھایا گیا ہو اور پھر ہر جگہ اچھوتا خیال، نرالا بانکپن اور نئی سج دھج ہے۔ لیکن گنبد کے بنانے میں تو ان کاریگروں نے بس کمال ہی کر دیا۔ یہ گنبد سنگ مرمر کے سولہ ستونوں پر قائم ہے، ہر ستون پر بہت باریک اور نفیس کام ہے اور پھر ہر ستون کے اوپر ودّیا دیوی یا سرسوتی کی ایک ایک مورتی کچھ ایسی خوب صورتی اور ہنرمندی سے بنائی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ مورتیاں گنبد کا پورا بوجھ اٹھائے ہیں۔ ودّیا دیویوں سے اوپر گنبد میں کوئی سات یا آٹھ دائرے اور ہیں، جو چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس گنبد پر جو پھول اور بیلیں بنی ہوئی ہیں

وہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ گنبد کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا بنا ہوا تین فٹ لمبا کنول کا پھول جھومر کی طرح لٹک رہا ہے اور اس پر اتنا باریک کام کیا گیا ہے کہ اس پر زیور کا دھوکا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس مندر نے سات سو گرمیاں، سردیاں اور برساتیں دیکھی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ابھی کل ہی بن کر تیار ہوا ہے۔ اس گنبد سے ذرا فاصلے پر وہ کمرہ ہے جہاں جینیوں کے پہلے تیرتھا نکر آدی ناتھ کی مورتی رکھی ہے۔ اس مورتی کی آنکھوں اور سینے پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

ومل ساہا کے مندر کے دروازے کے سامنے ایک دالان ہے جس میں مرمر کے بنے ہوئے دس ہاتھی کھڑے ہیں۔ ان ہاتھیوں پر ومل ساہا کے خاندان کے لوگ براجمان ہیں۔

ومل ساہا کے مندر کے پاس ہی دو بھائیوں، وستوپال اور تیج پال کا مندر ہے۔ یہ پہلے مندر کے دو سو سال کے بعد یعنی ۱۲۳۱ء میں بنوایا گیا تھا۔ ان جینی بھائیوں نے بہت سے مندر، تالاب، باغ، فوارے، کنوئیں اور باؤلیاں بنوائی تھیں۔ ان میں سے اکثر زمانے کے ہاتھوں ختم ہو گئیں مگر آبو پہاڑ کا مندر جو تیج پال اور اس کی بیوی انوپما دیوی نے بنوایا تھا اب بھی اس زمانے کی خوش حالی پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ یہ دونوں بھائی تیرتھ یاترا کے لیے سوراشٹر جا رہے تھے۔ ان کے پاس بہت سی دولت تھی۔ انھوں نے اس دولت کو چور ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک جگہ گڑھا کھود کر دفن کرنا چاہا لیکن وہاں سے ان کو ایک اور بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ دونوں بھائیوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بڑی دولت کا کیا کریں۔ اس موقع پر تیج پال کی پتنی انوپما دیوی نے مشورہ دیا کہ اس دولت

سے مندر بنوا دیے جائیں تو بڑا اپُن ہوگا۔ اسی زمانے میں دونوں بھائی گجرات کے دگھیلا راجہ کے یہاں وزیر بن گئے۔ انھوں نے جب آبو پہاڑ کی پوِتّرتا کے بارے میں سنا تو وہاں ایک مندر بنوانا شروع کر دیا۔ لیکن کام کی رفتار دھیمی تھی اس لیے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو نہ تو اچھا کھانا ملتا تھا اور نہ اچھی تنخواہ۔ انوپما دیوی کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے مزدوروں کے کھانے پینے کا بڑا اچھا انتظام کر دیا۔ بس پھر کیا تھا اب تو رات دن کام ہونے لگا۔ کہتے ہیں کہ جب مندر کی نازک سنگ تراشی کا کام ختم ہوگیا تو تیج پال نے اس کے بیل بوٹوں میں مزید صفائی اور باریکی پیدا کرنے کے لیے سنگ تراشوں سے کہا کہ جتنے وزن کے پتھر کو وہ چِلا دیں گے اتنے ہی وزن کی چاندی ان کو انعام میں دی جائے گی۔ اس انعام کی خبر پا کر کاریگر اور جی لگا کر کام کرنے لگے، کام بہتر ہوتا گیا، مگر تیج پال کے پاس دولت کی کمی نہ تھی، اس لیے اب اس نے اعلان کرا دیا کہ جس کا کام اس سے بھی اور اچھا ہوگا اسے سونے میں تولا جائے گا۔ اس خبر کو سنتے ہی کاری گروں نے دن رات ایک کر دیا اور مندر واقعی سُندرتا میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ چاہے یہ کہانی سچی ہو یا جھوٹی لیکن اس میں شک نہیں کہ تیج پال کے مندر کا کام ہمارے دیس کے مندروں میں نزاکت اور صفائی کے لحاظ سے بے مثل ہے۔

تیج پال کے مندر میں سب سے زیادہ خوب صورت چیز اس کا گنبد ہے جو آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔ برآمدے میں کل ۲۶ ستون ہیں۔ گنبد کے مرکزی حصّے میں جو پھول لٹکا ہوا ہے وہ بڑے قیمتی پتھر کا ہے۔

اس کی شکل اَدھ کھلے کنول کے پھول جیسی ہے جس کی پنکھڑیاں ایسی باریک اور نازک ہیں گویا کہ بلور کا جھاڑ لٹک رہا ہے۔ گنبد سے نظریں ہٹائیے تو سامنے ہی وہ کمرہ نظر آتا ہے جہاں جینیوں کے بائیسویں تیرتھانکر نیمی ناتھ کی قیمتی مورتی رکھی ہے۔ اس مندر میں کوئی ۳۹ کمرے اور ہیں جن کے برآمدوں کو بہت سے مورتی کلا کے شاہکاروں سے سجایا گیا ہے۔

اس مندر کا ہاتھی خانہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ ومل ساہ کے ہاتھی خانے کے ڈھنگ پر بنایا گیا ہے لیکن اس سے ذرا بڑا ہے۔ کمرے کے اندر سنگ مرمر سے تراشے ہوئے ہاتھی کھڑے ہیں، ان کی جھولیں، ان کا ساز و سامان، گرہ لگی ہوئی رسیاں اور آرایشی سج دھج ایسی ہے کہ اس پر نظر جمی کی جمی رہ جاتی ہے۔ کہتے ہیں پہلے ان ہاتھیوں پر وستو پال کے خاندان کے لوگوں کی مورتیاں رکھی تھیں، لیکن اب تو خالی ہاتھی ہی رہ گئے ہیں۔ ہاتھیوں کے پیچھے سنگ مرمر کی دس سِلوں پر وستو پال کے گھرانے کے مرد اور عورتیں دکھائی گئی ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں سِلوں پر وستوپال اور اس کی دو پتنیاں للتا دیوی اور ویرتو دیوی اور تیج پال اور انوپما دیوی دکھائے گئے ہیں۔ تیج پال کے مندر بنوانے میں اس کی بیوی انوپما دیوی کا بڑا ہاتھ تھا، چنانچہ ایک کتبہ میں کہا گیا ہے کہ:-

"انوپما دیوی آکاشی سُندرتا کا ایک پھول ہے جس کا پورا پری وار ایمانداری، پاک دامنی، عقل، سلیقہ، فیاضی اور ذہانت کے لیے ممتاز ہے۔"

اور سچ تو یہ ہے کہ خود یہ مندر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ تیج پال اور اس کے خاندان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ٹیبور سیکلج

ترجمہ

جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا



جاگور! جاگور!! ارے جاگور!!!
یہ ڈری ڈری، سہمی سہمی
آوازیں سُن کر میں جیسے چونک
پڑا۔ اپنے کیبن سے نکل کر جہاز
کے عرشے پر آگیا۔ کچھ لوگ
عرشے کے جنگلے پر جھکے ہوئے
تھے اور کچھ نیچے سے تیز تیز
قدم اٹھائے اوپر آرہے تھے۔
جنگلے کے قریب پہنچا تو میرے
سامنے ایک انوکھا منظر تھا۔
جہاز سے تھوڑی ہی دور چڑھے
ہوئے دریا کے تیز دھارے
پر ایک چھوٹا سا جزیرہ بہا
چلا آرہا تھا۔

اس وقت ہمارا جہاز ایراگوئے دریا میں چل رہا تھا۔ یہ جنوبی امریکہ کے مشہور دریائے آمیزن کا معاون دریا ہے۔ یہ دریا بہت تیز بہتا ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اس کی تیز اور طاقتور دھار کناروں کی زمین کو نیچے ہی نیچے کاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اکثر زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر دریا میں بہنے لگتے ہیں اور زمین کے ان ٹکڑوں پر جتنے بھی پیڑ پودے اور جانور ہوتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ بہہ نکلتے ہیں۔ جیسے کوئی چھوٹا سا جزیرہ بہتا چلا جا رہا ہو۔

اس وقت ہمارے سامنے اسی طرح کا ایک جزیزہ بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جہاز کے تمام مسافر اس جزیرے کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ایک خاص حصّے کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے جاگور! جاگور! [illegible]لا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا میری نظر بھی اس جاگور پر پڑی۔

آپ نے چڑیا گھر میں تیندوا تو دیکھا ہوگا۔ جاگور تیندوے سے ملتا جلتا درندہ ہے۔

اس سے پہلے بھی کئی بار مجھے امریکی جنگلوں میں جاگور دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ جنوبی امریکہ کا سب سے زیادہ خوفناک درندہ ہے۔ اس کی ہر حرکت سے شاہانہ آن بان ٹپکتی ہے۔ بڑا ہی رعب دار، بہت ہی خوبصورت، بے حد پھرتیلا مگر بے حد خطرناک۔ لیکن اس وقت جو جاگور ہمارے سامنے تھا وہ اُن جیسا ہرگز نہ تھا۔ اس کی ٹپّوں والی کھال بالکل بھیگ چکی تھی۔ خوبصورت نرم بال جسم سے چپک گئے تھے۔ اس وقت تو یہ بے چارہ بالکل بھیگی بلّی کی طرح نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے آنے والے خطرے کا پورا پورا احساس ہے۔ وہ ہماری طرف بڑی عاجزی اور امداد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو

خُدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر سب ہی لوگوں کے دل دُکھ رہے تھے پر ہم مجبور تھے۔ اسے بچا نہ سکتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ بہتا ہوا جزیرہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم ابھی جنگلے کے پاس سے ہٹے بھی نہ تھے کہ جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کھڑے ہوئے لوگ لڑکھڑا گئے۔ کچھ لڑھک بھی گئے۔ جہاز رُک گیا جیسے اس کے سامنے کوئی بڑی سی چٹان آگئی ہو یا کسی نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔ ساتھ ہی جہاز کے نیچے سے گھڑگھڑاہٹ کی تیز آوازیں بھی آنے لگیں۔ مسافروں میں عجیب ہل چل اور افراتفری مچ گئی۔ حیران و پریشان ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کچھ نیچے کی طرف بھاگے تو کچھ نیچے سے اوپر کی طرف دوڑے۔ کسی کو ایک دوسرے کی سُدھ نہ رہی۔ بچوں اور عورتوں کی چیخ پکار نے تو آتے اوسان حواس بھی گم کر دیے۔

اتنے میں کسی نے چیخ کر کہا "بھائیو، ہم ڈوب رہے ہیں" بات ٹھیک ہی تھی۔ پانی عرشے پر آنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگوں کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

لیکن عین اسی وقت لاوڈ اسپیکر پر جہاز کے کپتان کی پُرسکون آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"بھائیو! پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ ہمارے پاس لائف بوٹ موجود ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم مسافروں کو کنارے پر پہنچا دیں گے۔ آپ سب لوگ حوصلہ رکھیے۔ دھکا پیل نہ کیجیے۔ اپنی اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑے رہیے۔ چیخنے چلانے اور اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

کچھ تو کپتان کی اس مختصر تقریر سے اور کچھ لائف بوٹوں یا بچانے والی کشتیوں کو اترتا دیکھ کر ڈھارس بندھی۔ پہلے چکر میں بچوں والی چار



عورتوں کو کنارے پر پہنچایا گیا اس کے بعد دو تین چکروں میں بقیہ عورتیں لے جائی گئیں۔ پھر مردوں کا نمبر آیا۔ ہم سب ملا کر ۳۰ مرد تھے۔ سب کو کنارے پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ میری باری سب سے آخری چکر میں آئی۔ اس وقت جہاز کے عرشے پر کمر کمر تک پانی آچکا تھا۔ تمام مسافر خیریت کے ساتھ کنارے پر اُتر گئے تو کپتان اور اس کا عملہ بھی جہاز کو چھوڑ کر کنارے پر آگیا۔

ہم سب لوگ دریا کے کنارے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ہمارے تین طرف ہزاروں سال پُرانا اور بے حد گھنا جنگل تھا۔ درخت اتنے موٹے کہ چار پانچ آدمیوں کی کولی میں نہ سمائیں۔ اونچے اتنے کہ ان کی پھننگی دیکھنا چاہو تو ٹوپی گر جائے۔ نیچے جھاڑیاں اتنی گھنی اور ایک دوسرے میں ایسی گتھی ہوئی کہ قدم رکھنا مشکل۔ لچکیلی مگر مضبوط جنگلی بیلیں درختوں اور جھاڑیوں کو بری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔

سامنے دریا کے مٹیلے پانی میں جہاز کے سامنے کا حصّہ نظر آرہا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ پانی میں ڈوبے ہوئے کسی پیڑ کے تنے سے ٹکرانے سے جہاز کی تلی میں کوئی بڑا سوراخ ہو گیا تھا۔

اب وہی پیڑ جہاز کو سہارا دیے ہوئے تھا۔

ہم ایک عجیب یاس اور ناامیدی کے عالم میں برازیل کے انجانے اور خطرناک جنگل کے کنارے کھڑے تھے۔ سب ہی لوگوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ سارے کا سارا سامان جہاز میں رہ گیا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس نہ تو کچھ کھانے کو تھا اور نہ پہننے کو۔ جہاز کا کپتان دلاسا دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہمیں تقین دلا رہا تھا کہ کل تک جہاز کو کنارے پر لائے اور اس میں سے ضروری سامان نکال لینے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور جہاز کی مرمت کر کے جلدی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ اس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے تھوڑی دیر میں سے ہر شخص ایک دوسرے کو تسلی دینے میں مصروف تھا۔

اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلتا۔ اس لیے ہم نے ایک چھوٹے شکاری چاقوؤں سے جھاڑ جھنکاڑ کاٹنا اور صاف کرنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب نے مل کر زمین کا ایک بڑا حصہ صاف کر لیا۔ بیچ میں آگ سلگائی اور سب لوگ گرتے ہوئے تنوں اور لکڑی کے کندوں پر بیٹھ کر اپنے کپڑے اور بھیگے ہوئے بدن سکھانے لگے۔ دن کے ۲ بج چکے تھے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اب جب ذرا اطمینان ہوا تو بھوک کا احساس ہوا اور بھوک لگی تو کھانے کی تلاش کی فکر ہوئی۔

(باقی آئندہ)



نیا سال

جناب کوثر اعظمی

نیا سال لے کر نئی ریت آیا نئے ساز چھیڑے، نیا گیت گایا
زمانے پہ چھائی ہے کیا پریت چھایا زمیں مسکرائی، فلک مسکرایا
نیا سال آیا، نیا سال آیا

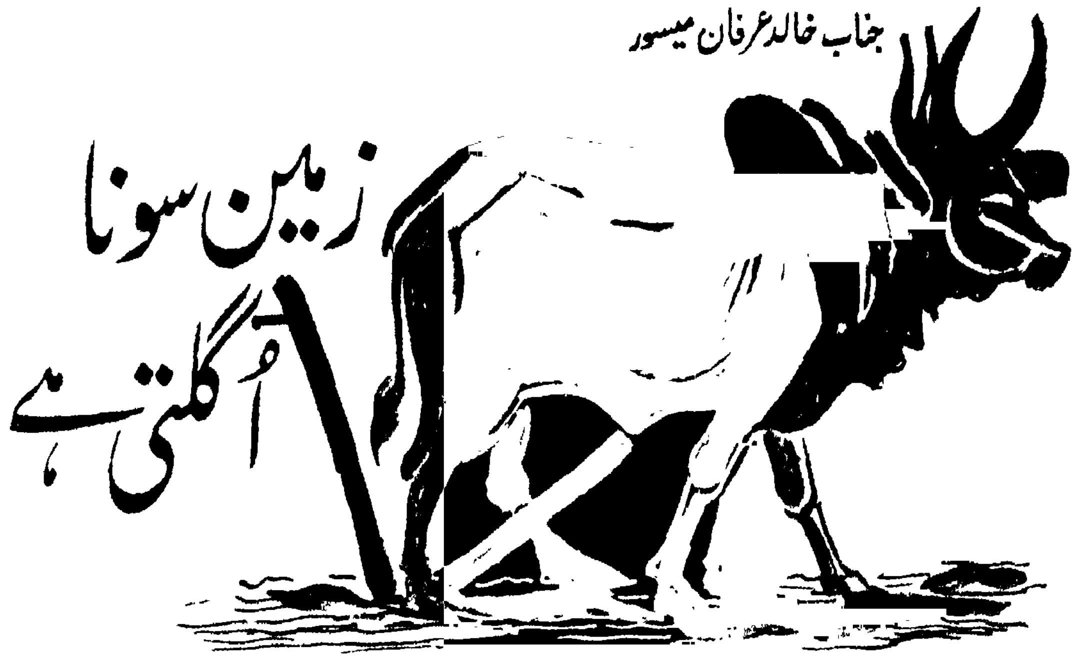
چلو ہم بھی گائیں خوشی کے ترانے چمن میں لگی ہر کلی مسکرانے
مسرّت کے بجنے لگے شادیانے نیا سال ہم کو خدا نے دکھایا
نیا سال آیا، نیا سال آیا

نہیں کھیل سے جن کو فرصت ذرا بھی نہیں علم سے جن کو رغبت ذرا بھی
نہیں جن کو بھاتی ہے محنت ذرا بھی پلٹتی نہیں ان کی ہرگز بھی کایا
نیا سال آیا، نیا سال آیا

کریں عہد آؤ لکھیں گے، پڑھیں گے ترقی کے میداں میں آگے بڑھیں گے
ذرا بھی نہ ہم مشکلوں سے ڈریں گے نئے سال نے حوصلہ آ بڑھایا
نیا سال آیا، نیا سال آیا

جناب خالد عرفان میسور

زمین سونا اُگلتی ہے



جی ہاں زمین سونا اُگلتی ہے۔ سچ مچ کا سونا۔ ایک یہی کیا کوئلہ، پٹرول، اور بہت سی دھاتیں آپ اسی بے چاری کا سینہ چیر کر تو نکالتے ہیں۔

پر ایک چیز ہے۔ کہیں زیادہ قیمتی کہیں زیادہ انمول۔ پوچھیے کیا؟ ارے بھئی وہی چیز جس پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے ——— ہماری غذا۔ یہ غذا ہم اسی زمین سے تو حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہمارے سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

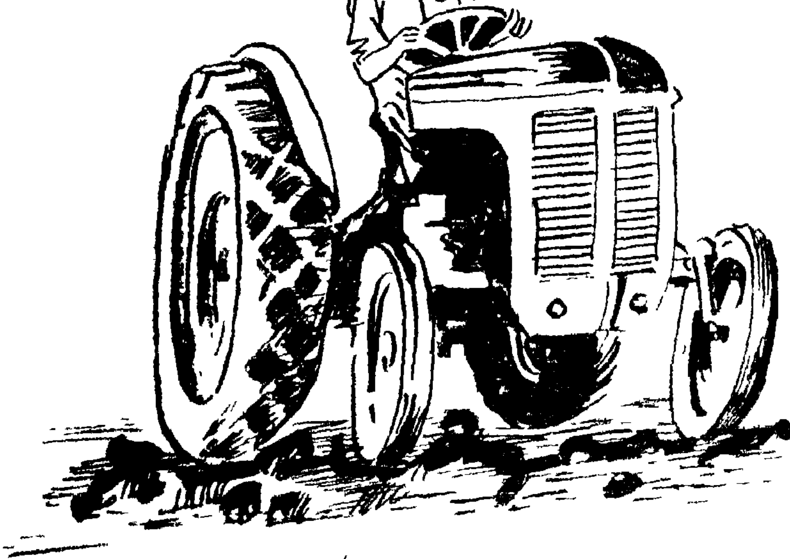
دیکھیے ہم آپ کی زمین پر تو رہتے بستے ہیں یہیں پلتے بڑھتے ہیں۔ بچے سے جوان ہوتے ہیں جوان سے بوڑھے ہوتے ہیں۔ یہ زمین ہمیں اپنے بسنے کے لیے جگہ ہی نہیں دیتی بلکہ ہمارے لیے غذا کا سامان بھی کرتی ہے۔ اسی غذا کی بدولت ہم زندہ رہتے ہیں۔ پلتے بڑھتے ہیں۔ یہ ٹھیک سے نہ ملے تو ہماری نشوونما رک جاتی ہے۔ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

اناج، ترکاریاں، پھل پھلاری ہماری غذا کا ضروری حصّہ ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمیں زمین سے ملتی ہیں۔ زمین یہ سب چیزیں

کرکے گویا ہماری پرورش کرتی ہے۔
تو دیس کے بہت سے لوگ اسے
تی ماتا کہتے ہیں۔ اچھا آئیے دیکھیں اس
اکا انتظام کیسے ہوتا ہے؟
ابھی کچھ دنوں پہلے مان سون ہوائیں
اڑوں سے ٹکراکر دیس کے میدانوں میں
ہو برسا گئیں۔ مینہہ کے پانی سے مٹی
یگ کر نرم پڑ گئی۔ ہمارے کسانوں نے
عیتوں میں ہل چلایا اور بیج بو دیے۔
اس زمانے میں یعنی برسات کے
ہم میں صبح تڑکے سیر کے لیے کسی دیہات
طرف نکل جائیے۔ آپ کو ہر طرف
سان اپنے اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے
ملیں گے۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے
ج بونے کے لیے کسان نے پتھریلی یا
ی زمین کو نہیں چنا ہے۔ مٹیلی یعنی مٹی
زمین کو چنا ہے۔
نرم، گیلی اور چکنی مٹی کے کھیت میں
پ سے اوپری تہہ سخت ہو جاتی ہے۔
میں بیج نہیں بوئے جا سکتے۔ برسات
پانی کے چند چھینٹے پڑتے ہی یہ
نرم پڑ جاتی ہے۔ اور اب کسان نلائی
کرکے اس میں ہل چلاتا ہے۔ ہل چلانے
سے مٹی ڈھیلی پڑ جاتی ہے اس میں
پانی آسانی سے جذب ہو جاتا ہے۔ ہوا
کا گزر بھی اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ پودوں
کی جڑیں بھی غذا کی تلاش میں زیادہ
گہرائی تک جا سکتی ہیں۔ پر آج کل دیسی
ہل کی جگہ، مشین بھی استعمال ہونے لگی
ہے۔ اس مشین کو ٹریکٹر کہتے ہیں۔ یہ
بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے ذریعے
بہت گہرائی تک زمین کی مٹی اُلٹ پلٹ
ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی نیچے کی زرخیز
اور اُپجاؤ مٹی اوپر آجاتی ہے۔ پودوں
کی جڑیں اندر دور تک جا سکتی ہیں اور
مضبوطی کے ساتھ جم سکتی ہیں۔
ایک بات اور ہے۔ کسی بڑے، بہت
بڑے کھیت میں جسے فارم بھی کہتے ہیں
دیسی ہل کو گڑائی کرنے میں کئی دن
لگ جاتے ہیں۔ ٹریکٹر یہ کام چند
گھنٹوں میں کر لیتا ہے۔ پھر دیسی
طریقے سے ہل چلانے میں کسان تھکتا

ہے، بیل تھکتے ہیں پھر بھی بہت اندر کی اُپجاؤ مٹی اوپر نہیں آسکتی۔ یہ ٹریکٹر اب تک باہر سے منگائے جاتے تھے پر اب یہ اپنے دیس میں بننے لگے ہیں اور تھوڑے دنوں میں ان کا رواج سارے دیس میں عام ہو جائے گا۔

اے لیجیے باتوں ہی باتوں میں



اصلی بات تو رہی جاتی ہے۔ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہل چلانے سے اوپر کی مٹی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ زمین کی اوپری پرت کی یہ مٹی پودوں کی نشوونما کے لیے بہت ضروری ہے۔ زمین کے

اوپری پرت کا اکثر حصہ زیادہ تر اسی مٹی کا بنا ہے۔ اسی لیے درختوں اور پودوں کی جڑیں معدنی غذا کی تلاش میں اندر بہت دور تک آسانی سے جا سکتی ہیں۔

اگر آپ حیرانی سے میرا منہ نہ تکنے لگیں تو ایک بات اور بتاؤں۔ اگر نباتات نہ ہوتے تو زمین ایک سنسان اور

لق و دق میدان ہوتا نہ ہم آپ ہوتے نہ دوسرے جاندار۔ نہ چرند نہ پرند نہ مچھلیاں نہ کیڑے مکوڑے۔ ان سب کی زندگی کا دار مدار نباتات ہے اور نباتات اسی نرم مٹی پر اُگتے ہیں اسی

لیے یہ مٹی دنیا کی بہت ہی قیمتی چیز سمجھی جاتی ہے۔

اچھا آج میں آپ سے ایک سوال کروں۔ زمین کے اوپری پرت کی یہ نرم نرم مٹی آخر کہاں سے آئی؟ لیجیے، آپ تو مسکرانے لگے۔ جیسے دل میں کہہ رہے ہوں یہ بھی کوئی سوالوں میں سوال ہے۔ پر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ آج سے کروڑوں بلکہ اربوں برس پہلے زمین ایسی نہ تھی جیسی اب ہے تو حیرت سے آپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے گا۔ ہے بھی تعجب کی بات! 34123

اب سے کروڑوں سال پہلے زمین پر زندگی کا وجود ہی نہیں تھا۔ بس چٹانیں تھیں۔ سخت اور ٹھوس چٹانیں، بڑی بڑی اور خوب اونچی اونچی چٹانیں۔ پر آج وہ کیا ہوئیں؟ اجی جناب ان ہی کو تو آپ مٹی کے ننھے ننھے ذروں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

اب آپ نے پھر سوچنا شروع کیا: آخر یہ ہوا کیسے۔ کسی نے جادو کی چھڑی ہلا دی؟ — اور اگر یہی صورت ہے تو آج جو چٹانیں ہمیں نظر آرہی ہیں کیا ان کا بھی یہی حشر ہوگا؟ وہ بھی نرم مٹی میں بدل جائیں گی؟

جی ہاں آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔ اب سے لاکھوں لاکھ برس بعد ان چٹانوں کا بھی یہی حشر ہوگا اور ان چٹانوں کو مٹی میں بدلنے والی جادو کی چھڑی بارش ہوگی، برف ہوگا، ہوا ہوگی۔ یہ تینوں تو سورج کی گرمی کی مدد سے سخت سے سخت چٹان کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔ مگر بہت آہستہ آہستہ۔ سو دو سو برس میں نہیں بلکہ لاکھوں سال میں۔

اس طرح کے عمل سے شروع میں تو چٹانوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر کنکریاں بنتی ہیں اور پھر ریت۔ مزے کی بات تو یہ کہ یہ کنکریاں خود آپس میں رگڑ کھاکر ریت بن جاتی ہیں۔ پر بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس توڑ پھوڑ میں ننھے ننھے جاندار اور جراثیم بھی حصہ لیتے ہیں یہ جاندار بہت ہی ننھے ننھے ہوتے ہیں

بغیر خوردبین کی مدد کے نظر نہیں آسکتے۔
اچھے قسم کی زرخیز اور اپجاؤ مٹی تو جبھی
بننا شروع ہوتی ہے جب یہ جراثیم اپنا
عمل شروع کرتے ہیں۔

ایک سوال پھر دماغ میں پیدا ہوتا
ہے۔ زمین کی اوپری سطح تو سخت ہوتی
ہے یہ نرم مٹی میں کیسے بدل جاتی ہے؟
آئیے اس سوال کا حل بھی تلاش
کریں:۔

آپ نے گیلے پتھروں پر، گیلی دیواروں
پر یا تالابوں کے کنارے سبز رنگ کی تہہ
سی جمی ہوئی دیکھی ہوگی۔ یہ کائی کہلاتی
ہے۔ یہ کائی اصل میں ننھے ننھے پودے ہیں
بہت سادہ مگر بڑے سخت جان۔ اسے کتنا
ہی صاف کیجیے۔ تھوڑے دنوں بعد پھر
نکل آئے گی۔ یہ کائی اور اسی طرح کے
دوسرے پودے دیکھنے میں بے کار معلوم
ہوتے ہیں مگر مٹی کو نرم اور زرخیز بنانے
میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

دیکھیے، ہوا میں اور بارش کے پانی
میں کچھ نمک ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے
مرکبات کے ذرّے بھی ہوتے ہیں۔ کائی یہ
نمک اور دوسرے ذرّے اپنے میں جذب
کرلیتی ہے۔ انھیں اپنے تنے میں اپنی جڑ
میں محفوظ کرلیتی ہے۔ یہ نمک نباتات کی
نشو ونما یا پھلنے پھولنے کے لیے بہت ضروری
ہیں۔ یہ زمین کے اندر گہرائی میں بھی
پائے جاتے ہیں کائی اور اس جیسے دوسرے
پودے انھیں بھی کھینچ کر اوپر لے آتے
ہیں اور اپنے اندر محفوظ کرلیتے ہیں۔

کائی کی اور اسی جیسے دوسرے
پودوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے
تھوڑے ہی دنوں میں یہ پودے اپنی
موت آپ مرجاتے ہیں اور گلنے سڑنے لگتے ہیں۔
اب ان پر آس پاس کے جراثیم حملہ کرتے ہیں اور اپنی
پرورش کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس طرح کائی کے اندر سے
وہ ساری غذا باہر آنے لگتی ہے جو دوسرے پودوں
کی نشو ونما کے لیے ضروری ہے۔

کائی کے سڑنے سے ایک بات اور
ہوتی ہے۔ بعض ایسے تیزاب نکلنے لگتے
ہیں، جن میں وہ تمام معدنی نمک گھل
جاتے ہیں اور مٹی کا جزو بن جاتے ہیں

یہ نمک ان تیزابوں کی مدد کے بغیر اس مٹی میں حل نہیں ہو سکتے تھے۔

اور سنیئے، ہم آپ جب سانس لیتے ہیں تو ہمارے پھیپھڑے پاک صاف ہوا اپنے اندر لے لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ باہر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کاربن ڈائی آکسائڈ پودوں اور درختوں کی مدد سے پھر آکسیجن میں بدل جاتا ہے۔ کیوں بدل جاتا ہے؟ یہ اپنے سائنس کے ماسٹر سے پوچھیے۔

اچھا اس کائی اور اس کے ساتھی پودوں کا معاملہ بھی عجیب ہے! یہ جیسے جیسے بڑھتے جائیں گے، پھیلتے جائیں گے ان کے اندر سے کاربن ڈائی آکسائڈ برابر نکلتی رہے گی۔ اور یہ گیس زمین کے اندر والے پانی میں حل ہو کر ایسا تیزاب بنائے گی جس میں نمک اور کھاد دونوں حل ہو جائیں گے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ زمین کی سطح پر ان گلے سڑے نباتات اور ان پر پلنے والے جراثیم کی ایک باریک سی تہہ جم جائے گی۔ پر ابھی بات ختم تو نہیں ہوئی۔ ان گلے سڑے پودوں پر زیادہ بڑی، زیادہ گھنی کائی جمنا شروع ہو گی اور اس کی جڑوں میں نمکوں کی زیادہ مقدار جمع ہو گی۔ پھر یہ بھی گلنے سڑنے کے بعد پہلے سے موٹی تہہ سطح پر بنائے گی اور مٹی کا جزو بن جائے گی۔ اس طرح تہہ پر تہہ چڑھتی چلی جائے گی۔

اس سے فائدہ کیا ہوگا؟

زمین کی گہرائی تک ایسی کھاد بن جائے گی جس کی معدنیات اور نمک کو اس زمین پر اُگنے والے پیڑ پودے آسانی سے اپنی غذا بنا سکیں گے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ نومبر دسمبر میں ہرے بھرے درخت اپنے سبز پتوں کی چادر اُتار پھینکتے ہیں۔ بالکل ننگ دھڑنگ ہو جاتے ہیں۔ اس موسم کو خزاں کا موسم کہتے ہیں۔ خزاں کے موسم میں، پت جھڑ ہی نہیں ہوتا، تنے کی کھال تک اُتر جاتی ہے۔ یہ پتے اور یہ چھال درخت کی جڑ کے آس پاس گر کر گل سڑ جاتے ہیں

ان میں جو معد نبات ہوتی ہیں وہ مٹی میں مل جاتی ہیں۔

غرض اس طرح زمین کی سطح پر ان گلے سڑے پتّوں کی ایک تہہ چڑھ جاتی ہے۔ یہ بڑی اچھی کھاد ہوتی ہے۔ زمین کے اس حصّے کو خوب زرخیز، خوب اُپجاؤ بنا دیتی ہے۔ اُپجاؤ مٹی کے لیے جو جو باتیں ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود ہوتی ہیں۔

پودوں کی غذا میں نائٹروجن بہت سے نمک اور ہوا کے سوا نمی اور دوسری گیسیں بھی شامل ہیں اور ان سب کا خزانہ نرم مٹی کی یہی اوپری تہہ ہے۔

اس تہہ کا ایک کام اور بھی ہے، مٹی کے درجۂ حرارت کو قائم رکھے تاکہ پودوں کی جڑوں کے پھیلنے کا موقع ملے اور بہتر اور اعلیٰ نباتی زندگی کے لیے راستہ ہموار ہو سکے۔

محمد جبین حسّان

انوکھا چُناؤ

۵



اب مچھلی کا شکار رہ گیا تھا۔ وہی چوتھا مقابلہ! لوگ اس چوتھے مقابلے کے لیے میدان کے کنارے پہنچے۔ یہاں ایک نالا تھا۔ اس کے کنارے بہت ڈھلوان تھے۔ نالے کے اندر کافی فاصلے پر نشانہ رکھ دیا گیا۔ جیسے یہ دریا ہے اور دونوں بہادر اس دریا میں اپنے برچھے سیدھے یا اندر کی طرف پھینکیں گے۔ جیسے مچھلی کے شکار کے وقت پھینکتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔

جج نے پکارا۔

"ہرن قدم"

اب کے ہرن قدم مچھلی کے شکار کا برچھا لایا۔ برچھے کی چھڑ بہت ہلکی اور پتلی تھی۔ پتھر کی نوک چھوٹی تھی مگر چاقو کی طرح تیز تھی۔ یہ برچھا ایسا بنا تھا کہ پانی پر پھسلتا چلا جائے۔ سیدھا مچھلی کے جا لگے اور اُسے چھید دے۔

ججوں نے ہرن قدم کا برچھا دیکھا اور پاس کر دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کنارے کی طرف چلا۔ پورے بھروسے

اور پکّے ارادے کے ساتھ چلا۔

لوگوں کو یقین تھا کہ ہرن قدم اس وقت اپنی جان لڑا دے گا۔ وہ پہلے تین مقابلے ہار چکا ہے۔ان تینوں میں وہ بس اُنیس بیس کے فرق سے ہارا ہے۔ یہ مقابلہ تو جیسے بھی بنے اُسے جیتنا ہی ہے۔

لو۔ وہ تیار ہوگیا۔ اس نے اپنے برچھے کو تولا۔ پوری احتیاط سے نشانہ لیا اور پھینک دیا۔ برچھے نے ہوا میں خوبصورت کمان بنائی اور نشانے پہ جا لگا۔

برچھا اٹک کر تھرتھرایا۔ پر بھئی برچھے کی نوک لال نشان کے بیچوں بیچ سے اک ذرا نیچے ہٹ کر گھسی تھی پھر بھی ہرن قدم نے ایک ناممکن بات ممکن کر دکھائی۔

اب بڑسنگا برچھا لیے سامنے آیا۔ ججوں نے اس کا برچھا پاس کر دیا۔ اس نے تیار ہونے اور نشانہ لینے میں کافی دیر لگائی۔

اس نے بہت ہی احتیاط سے نشانہ لیا۔ بہت ہی آہستہ آہستہ برچھا اوپر اٹھایا۔ اک ذرا کے ذرا ہاتھ میں تھامے رہا۔ اور پھر نشانے پر پھینک دیا۔

اس کا برچھا نشانے پہ جا لگا تھا۔ لال نشان کے بیچوں بیچ!

اب تو بڑسنگے کے ساتھیوں کی بَن آئی۔ انھوں نے اپنے شور سے آسمان سَر پہ اُٹھا لیا۔

"ہم نے سردار پالیا۔"

"ہمارا سردار چن لیا گیا۔"

"بڑسنگا ہمارا سردار ہے۔"

— —

اب پانچواں جج آگے بڑھا اور بولا:-

"پانچواں مقابلہ کشتی کا ہے ——"

یہ سنتے ہی بڑسنگے کے ساتھی جج کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور زور زور سے چلّانے لگے:

"اب کشتی کا مقابلہ نہیں ہونا۔ بڑسنگا سات میں سے چار مقابلے

چکا ہے۔ خود بزرگوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق بڑسنگا اب ہمارا سردار ہے۔"

جج نے جواب دیا:-

"سات مقابلے طے ہوئے تھے اور یہ طے ہوا تھا کہ جو بھی سات میں سے چار جیت لے گا اور باقی تین میں اچھا رہے گا وہی سردار بنے گا۔ اور کشتی کے، تیر پھینکنے کے اور دوڑنے کے کُل تین مقابلے باقی ہیں۔"

اس کے بعد جج نے ہرن قدم کو بلایا اور کہا:-

"ہرن قدم۔ پچھلے چار مقابلوں میں بڑسنگے کی جیت ہوئی۔ تین مقابلے اور رہ گئے ہیں۔ کیا تم ان میں حصّہ لینا چاہتے ہو؟"

ہرن قدم نے جواب دیا۔

"میں قبیلے کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ بڑوں نے کُل سات مقابلے رکھے تھے۔ سب جانتے ہیں چار مقابلے ہار چکا ہوں۔ لیکن بڑوں کی خواہش ہے تو میں ان تینوں میں بھی حصّہ لینے کے لیے خوشی سے تیار ہوں۔"

جج نے بڑسنگے کو بلا کر پوچھا:-

"سرداری کا فیصلہ کرنے کے لیے سات مقابلے رکھے گئے تھے چار مقابلے تم جیت چکے ہو۔ باقی تین میں تم حصّہ لینا چاہتے ہو؟"

بڑسنگا بولا:-

"باقی تین مقابلوں کی اب ضرورت ہی کیا ہے۔ بڑوں نے ایک بات یہ بھی تو کہی تھی کہ سات میں سے چار مقابلوں میں جیت سرداری کا فیصلہ کر دے گی۔ میں یہ چار جیت چکا ہوں۔ اب تو بڑسنگا ہی سردار ہے۔"

بڑسنگے کے ساتھیوں نے نعرہ لگایا:-

"بڑسنگا ہمارا سردار ہے۔"

بھیڑ میں سے ایک آواز آئی:-

"بڑسنگا ڈر رہا ہے کہ باقی تین مقابلوں میں کہیں ہار نہ جائے۔"

بڑسنگے نے چاروں طرف نظر دوڑا کر کس نے یہ بات کہی اور پھر سر اونچا

کرکے بولا:

"برسنگا کشتی کے لیے تیار ہے۔"

جج نے حکم دیا:

"اکھاڑے کی جگہ صاف کر دو۔"

ہرن قدم پہلے سے تیار تھا۔ جس وقت برسنگا جج سے باتیں کر رہا تھا، ہرن قدم کپڑے اتار کر اکھاڑے کی طرف چل پڑا تھا۔

برسنگا اکھاڑے میں اترا تو پھر کانا پھوسی ہونے لگی۔ ہرن قدم کے ساتھی کہہ رہے تھے:

"یہ کشتی تو برابر کی نہیں ہے قبیلے کا چلن قبیلے کی ریت تو کچھ اور ہے۔ دونوں پہلوان برابر کی ٹکر کے ہونے چاہئیں۔ برسنگا تو ہرن قدم سے کہیں بھاری بھرکم ہے۔"

ہرن قدم نے اس کانا پھوسی سے ذرا دلچسپی نہ لی۔ وہ تو اپنے بس بھر جو کچھ کر سکتا تھا اس کے لیے تیار ہو گیا۔

اب دونوں پہلوانوں نے اپنے دیس کے رواج کے مطابق ہاتھ ملائے۔ دونوں آمنے سامنے آ گئے۔ ایک نے اپنا بایاں پیر دوسرے کے بائیں پیر پر رکھ دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بائیں ہاتھ پکڑ لیے۔ دونوں کے داہنے ہاتھ داؤں پیچ کے لیے آزاد تھے۔

دونوں پہلوان بڑے جوش سے لڑتے رہے۔ ہرن قدم بہت تیز اور پھرتیلا تھا۔ ادھر برسنگا بہت لمبا چوڑا اور موٹا تازہ تھا۔ ہرن قدم برسنگے کو اٹھا کر پھینک سکتا تھا مگر پچھاڑ نہیں سکتا تھا۔

ایک بار تو برسنگے نے ہرن قدم کو سر سے اچھال کر نیچے پھینک دیا۔ مگر وہ بڑی خوبصورتی سے زمین پر آیا۔ برسنگا اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ سیدھا کھڑا تھا۔

(باقی آئندہ)


نہیں جناب میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں،
روضہ تو شاہجہاں، اکبر وغیرہ کا ہوتا ہے!
کیا آپ کا روزہ ہے؟

کھلاڑی

اولمپک

۲

اولمپک کا اِنتظام

اولمپک مقابلوں کے لیے ایک بین الاقوامی اولمپک کونسل ہوتی ہے۔ اس میں مختلفِ ممالک کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹی چار سال پہلے ہی طے کر لیتی ہے کہ اگلے مقابلے کہاں ہوں گے۔ [illegible]

رسم افتتاح

اولمپک کے اِفتتاح کی رسم کی اہمیت بھی بہت ہے۔ یہ بہت ہی شان و شوکت سے اور پُراثر انداز میں ہوتی ہے۔ یونانی آگ کو بہت مقدس سمجھتے تھے۔ اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے اولمپک کھیلوں کے موقعے پر بھی آگ روشن کی جاتی تھی۔ اور یہ رسم آج بھی ادا کی جاتی ہے۔ اور اس قدیم رواج کے مطابق اولمپک شروع ہونے سے بہت دن پہلے ایک مشعل سورج کی کرنوں سے اسی پرانے اولمپیا (یونان) میں جلائی جاتی ہے۔ اور

پھر یہ مشعل جہاں تک ممکن ہو بہت سے دوڑنے والوں کی مدد سے اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں اولمپک ہونے والے ہوں۔ آخر میں اس مشعل کو اولمپک کا ایک ممتاز کھلاڑی اسٹیڈیم میں لے جاتا ہے۔ افتتاح کی رسم اس ملک کا بادشاہ یا صدر کرتا ہے۔ سب سے پہلے اس ملک کے قومی ترانے کی دھن بجتی ہے جہاں اولمپک ہو رہے ہیں۔ پھر سب ملکوں کے کھلاڑی اپنی اپنی ٹولیوں میں، اپنے اپنے ملک کے جھنڈے کے ساتھ مارچ پاسٹ کرتے ہیں۔ مارچ پاسٹ ختم ہوتا ہے تو سب کھلاڑی صدر کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں اور صدر کھیل شروع ہونے کا اعلان کرتا ہے اور فوراً ہی اولمپک ترانے کی دھن بجائی جاتی ہے اور اولمپک جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کبوتر بھی چھوڑے جاتے ہیں، جو امن اور شانتی کی نشانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد تین بندوقیں چھٹتی ہیں اور اولمپک مشعل کو لانے والا آخری کھلاڑی دوڑ کر میدان کا ایک چکر لگاتا ہے۔ اور پھر اولمپک کی آگ جلاتا ہے۔ جس کا انتظام ایک چبوترے پر کیا جاتا ہے۔ یہ آگ پرانی رسم کے مطابق ان کھیلوں کے مقابلے ختم ہونے تک جلتی رہتی ہے۔

اولمپک عہد

جوں ہی اولمپک کی آگ روشن ہوتی ہے۔ میزبان ملک کی ٹیم کا کپتان کھلاڑی ڈائس پر جاتا ہے اور جھنڈے کا ایک کونا پکڑ کر شریک ہونے والے سب کھلاڑیوں کی طرف سے یہ حلف لیتا ہے۔

"ہم لوگ حلف لیتے ہیں کہ ہم لوگ اولمپک کھیلوں میں ایک سچی اسپورٹس مین شپ اسپرٹ کے ساتھ حصّہ لیں گے۔ اسپورٹس کی شان اور

اپنے ملک کی عزت کی خاطر ہم لوگ ان کھیلوں کے قاعدے قانون کی عزت اور پابندی کریں گے۔"

اس کے بعد میزبان ملک کے قومی ترانے کی دھن بجتی ہے اور کھلاڑی اپنی جگہوں پر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح افتتاح کی یہ رسم ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مقابلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

آخری رسم

ختم کرنے کی رسم مختصر اور سادہ طریقے سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حصہ لینے والے ملکوں کے بہت سے کھلاڑی اپنے اپنے ملکوں کو جا چکے ہوتے ہیں۔ جو لوگ آخری [illegible] جاتے ہیں۔ اس میں [illegible] کا جھنڈا [illegible] اور [illegible] اس [illegible] بعد ان مقابلوں کا انتظام [illegible] کا

باری باری سے ان ملکوں کے قومی ترانوں کی دھن بجتی ہے۔ اور بین الاقوامی اولمپک کونسل کا صدر ان کھیلوں کے ختم ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اگلے اولمپک کے لیے مقام کا اعلان کرتا ہے۔ اس طرح سے اس رسم کے بعد اولمپک کھیل ختم ہو جاتے ہیں۔

اس سال بھی ٹوکیو اولمپک میں یہ رسم بہت ہی پر اثر تھی۔ باری باری سے یونانی، جاپانی اور میکسکو کے قومی جھنڈے ان کے قومی ترانوں کی دھن کے ساتھ لہرائے گئے۔ اور ۱۹۶۸ء میں ہونے والے مقام میکسکو کا اعلان کرنے کے بعد اولمپک آگ بجھا دی گئی۔ رخصت ہوتے وقت دنیا کے یہ کھلاڑی ایک دوسرے کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور محبت کے جذبے سے بھرے ہوئے دلوں سے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

یہ اولمپک کھیل جیساکہ آپ کو محسوس ہوا ہوگا، دنیا کے بڑے واقعات کا ایک جز بن گئے ہیں۔ یہ ۱۸۹۶ء سے برابر ہوتے چلے آئے ہیں۔ جو بات ان کے بانی نے سوچی تھی وہ بہت حد تک پوری ہو رہی ہے۔ اور اس سال ٹوکیو اولمپک سے یہ بات اور پکی ہو گئی کہ کھیل کود ساری دنیا کی ملکیت ہیں۔ ان مقابلوں میں دنیا کے بیشتر ملکوں نے حصّہ لیا۔ ایشیا کے ملک (سوائے جاپان کے) ابھی اس میدان میں پیچھے ضرور ہیں۔ لیکن ہر ملک میں اپنی بساط کے مطابق جسمانی تعلیم و تربیت کے نئے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔

ہمارے دیس میں لوگوں کا دھیان اس کام کو ترقی دینے کی طرف ہے اور خیال ہے کہ اب اور زیادہ توجہ دی جائے گی۔ اگر ہم میں سے ہر بچہ اور نوجوان اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تندرست اور مضبوط بنانا اپنا قومی فرض سمجھ لے تو ہمارا ملک بھی ایک اچھے معیار پر پہنچ سکتا ہے۔

ٹوکیو کے اس سال کے مقابلوں میں حصّہ لینے والے نوجوانوں نے بہت ہمّت اور جوش سے حصّہ لیا اور نئے نئے رکارڈ قائم کیے۔ ان دو ہفتوں میں ۳۵ نئے دنیا کے رکارڈ قائم کیے گئے۔ امریکہ غیر سرکاری حساب کے مطابق اوّل رہا، اس نے سونے کے ۳۶ تمغے جیتے۔ اس کے مقابلے میں روس اس مرتبہ دوم آیا اور ۳۰ سونے کے تمغے حاصل کیے۔ پچھلے اولمپک میں روس نے سب سے زیادہ سونے کے تمغے جیتے تھے اور اوّل آنے کا بالا ارا تھا۔ لیکن اس مرتبہ امریکہ نے بہت تیاری کی اور دوڑ، کود اور تیراکی وغیرہ میں اپنے کمال دکھائے اور اوّل آنے کا شرف حاصل کیا۔ ہم ایشیا والوں کو بھی

فخر ہے کہ دنیا کے ان مقابلوں میں جاپان کا نمبر تیسرا رہا۔ اس نے ۱۶ سونے کے تمغے حاصل کیے۔

دوڑیں

دوڑوں میں میراتھن دوڑ سب سے لمبی اور مشکل دوڑ ہے۔ اس کا نام یونان کی ایک لڑائی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ دوڑ ۲۶ میل کی ہوتی ہے۔ اس سال اس دوڑ کو جیتنے والے بہادر اور سخت جان انسان اتھوپیا (افریقہ) کے بکیلو ہیں۔ یہ پہلے کھلاڑی ہیں، جنھوں نے اس سخت دوڑ کو اولمپک کی تاریخ میں دوبارہ جیتنے کا فخر حاصل کیا۔ اس دوڑ کے ۲۶ میل کے فاصلے کو انھوں نے ۲ گھنٹے ۱۲ منٹ اور ۲ر۱۱ سکنڈ میں طے کیا۔

اس وقت دنیا میں سب سے تیز دوڑنے والے امریکہ کے ایک حبشی آر۔ ال۔ ہیز ہیں۔ انھوں نے ۱۰۰ میٹر کے فاصلہ کو دس سیکنڈ میں طے کرکے دنیا کا رکارڈ قائم کیا۔

عورتوں میں ۱۰۰ میٹر کی دوڑ میں بھی امریکہ ہی کی خاتون وامیا ٹائیس ہیں۔ انھوں نے اس دوڑ کو ۲ر۱۱ سکنڈ میں پورا کیا۔

۵۰۰۰۰ ہزار میٹر (۲ر۳۱ میل) پیدل چلنے کے مقابلہ میں اٹلی کے پامبک اوّل آئے۔ انھوں نے یہ فاصلہ ۴ گھنٹے ۱۱ منٹ اور ۲ر۴۱ سیکنڈ میں طے کیا۔ اور دنیا کا رکارڈ قائم کیا۔

اونچی کود

اونچی کود میں روس کے وی برومیل اول آئے۔ یہ ۷ فٹ $\frac{3}{4}$ ۱ انچ کودے اور اولمپک کا رکارڈ قائم کیا۔ عورتوں کے مقابلوں میں رومانیا کی آئی بالاس نے ۶ فٹ $\frac{3}{4}$ ۲ انچ اونچا کود کر اولمپک رکارڈ قائم کیا۔

لمبی کود

لمبی کود میں برطانیہ کے ڈیوینز ۸ ، ۷ میٹر کود ے اور اول آئے۔ نے عورتوں میں برطانیہ کی خاتون میری انیڈ ۲۲ فٹ ۱/۴ ۲ انچ لمبی چھلانگ لگا کر دنیا کا رکارڈ قائم کیا۔

گولا پھینکنا

امریکہ کے ڈلاس لونگ نے ۱۶ پونڈ کا گولا ۶۶ فٹ ۱/۴ ۸ انچ پھینکا اور اولمپک کا رکاڈ قائم کیا۔ عورتوں میں روس کی خاتون تمارا پرمیس نے ۵۹ فٹ ۱/۴ ۶ انچ دور گولا پھینک کر اولمپک رکارڈ قائم کیا۔

زنجیر سے لٹکا ہوا گولا پھینکنا

زنجیر سے بندھا ہوا گولا پھینکنے میں روس کے کلم اول آئے انھوں نے ۶۹ ، ۷۴ میٹر دور پھینکا۔

نیزہ

نیزہ پھینکنے میں فن لینڈ کے پی۔ ال نوالا ، اول آئے۔ انھوں نے ۸۲ ، ۶۶ میٹر دور پھینکا۔ اور عورتوں کے مقابلوں میں روس کی گور جیکووا ۱۹۸ فٹ ۱/۴ ۱ انچ کی دوری پر پھینک کر اول رہیں۔

تیراکی

تیراکی میں امریکہ کے ییل یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے رکارڈ قائم کیا ، جن کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ یہ اولمپک کی تاریخ میں پہلے نوجوان ہیں جنھوں نے تیراکی میں ۴ سونے کے تمغے حاصل کیے۔

تیراکی میں ۴۰۰ میٹر میں امریکہ کے شولینڈر اول آئے۔ اونچی ڈائیونگ میں امریکہ کے آرسیبر برجر اول آئے۔ عورتوں کی اونچی ڈائیونگ میں بھی امریکہ کی خاتون بش اول آئیں۔

لیکن ہیچی ڈائوِنگ میں جرمنی کی خاتون
انجیل کریمر اوّل آئیں۔

رائفل نشانہ بازی

۲۲ پائنٹ ڈو رائفل کے لیٹ کر،
بیٹھ کر، اور کھڑے ہوکر نشانہ بازی
کے مقابلوں میں امریکہ کے لونز وگر
نے ۱۱۶۴ پائنٹ حاصل کیے اور
دنیا کا رکارڈ قائم کیا۔

ہاکی کا فائنل میچ ٹوکیو میں ہندوستان
اور پاکستان کے درمیان کھیلا گیا۔ اولمپک
کھیلوں میں یہ تیسرا موقع تھا جس
میں ہندوستان اور پاکستان کا فائنل
میچ میں مقابلہ ہوا۔ اس مرتبہ
دونوں ٹیمیں برابر کی ٹیمیں تھیں اس
لیے مقابلہ بہت سخت تھا۔
بدقسمتی سے پاکستان [illegible]
گول سے ہار گیا اور جیت کا سہرا
ہندوستان کے سر رہا۔ ہم سب
ہندوستانی بھائیوں کو جیت کی یہ
خبر سن کر بے حد خوشی ہوئی، اور
سارے ہندوستان میں جشن منائے گئے۔
ہم لوگوں نے بہت محنت کے بعد
اپنی کھوئی ہوئی شہرت کو دوبارہ
حاصل کیا۔

اسی طرح فٹ بال کا مقابلہ
ہنگری اور زیکوسلواکیا کی ٹیم کے
درمیان ہوا۔ یہ مقابلہ بھی بہت
سخت تھا۔ ان میں ہنگری کی ٹیم
جیت گئی۔ ہنگری کی ٹیم نے ۲ گول
کیے زیکوسلواکیا کی ٹیم صرف ایک
ہی گول کر پائی۔



ہارسنگھار کے پھول بنائیں

پھول خوبصورت ہوتے ہیں، رنگین ہوتے ہیں، خوشبودار ہوتے ہیں۔ سب کو اچھے لگتے ہیں۔

لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ پھولوں کو اپنے قریب رکھیں۔ گھر میں اُگائیں، میز پر سجائیں، کپڑوں پر لگائیں ہاتھ پر رکھیں یا جسم پر پہنیں۔

لیکن پھول جلد مرجھا جاتے ہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ نہیں ملتے۔ اس لیے لوگ اُن کی تصویریں بھی پسند کرتے ہیں۔

کاغذ کے پھول بنانا ایک دلچسپ کام ہے۔ اس کام میں جی بھی لگتا ہے اور کام کرکے خوشی بھی ہوتی ہے۔ یہ کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں، نہ زیادہ سامان کی ضرورت ہے۔

ہارسنگھار کے پھول بنانا میں نے اپنی ایک شاگرد نعیمہ سعید سے سیکھا ہے۔ میں آپ کو سکھائے دیتا ہوں۔ آپ کو بنانا آجائے تو دوسروں کو سکھا دیجیے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ دنیا میں ہنر، حسن اور نیکیاں اسی طرح پھیلتی ہیں۔

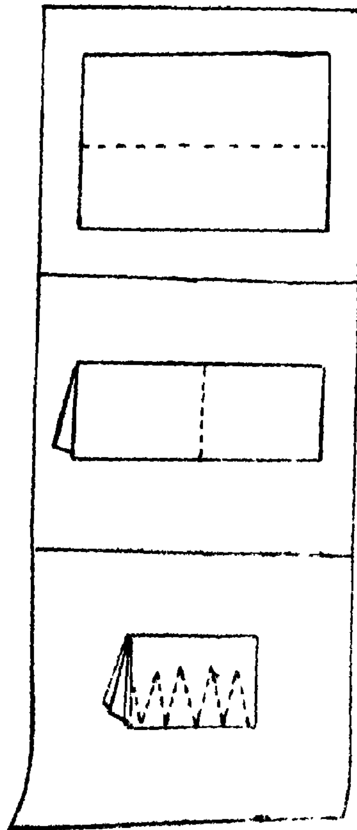
سامان:۔ اس پھول کو بنانے کے لیے کاغذ، قینچی، سوئی دھاگہ، نارنجی رنگ اور لیئی کی ضرورت پڑتی ہے۔

کاغذ سفید، باریک اور ذرا کرارا

ہونا چاہیے۔ جیسا چائے کے ڈبّوں کے اندر لگا ہوتا ہے۔ بازار میں "بٹر پیپر" کے نام سے بکتا ہے۔ ویسے پتنگ کے کاغذ سے بھی کام چل سکتا ہے۔

پہلے کاغذ کے دو مستطیل ٹکڑے کاٹ کر رکھ لیجیے۔ بڑا ٹکڑا تقریباً چار سینٹی میٹر لمبا اور تین سینٹی میٹر چوڑا ہو۔ چھوٹا ٹکڑا تین سینٹی میٹر لمبا اور سوا سینٹی میٹر چوڑا ہو۔ چھوٹے ٹکڑے کو ایک طرف سے نارنجی رنگ لینا چاہیے۔ دھاگے کو بھی نارنجی رنگ میں رنگ کر سُکھا لینا چاہیے۔

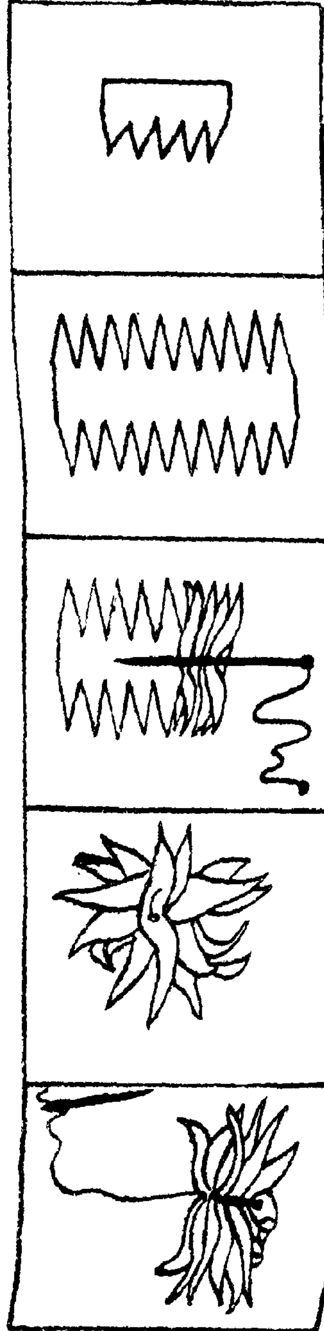
طریقہ:- پھول بنانے کا طریقہ نیچے لکھا ہے۔ کچھ شکلیں بھی بنا دی ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔



۱۔ کاغذ کا بڑا مستطیل ٹکڑا اُٹھائیے۔

۲۔ اُس کو لمبائی کے رُخ دوہرا کر لیجیے۔

۳۔ اب اس کو چوڑائی کے رُخ دوہرا کر لیجیے۔



۴۔ اوپر صرف آدھا سینٹی میٹر جگہ چھوڑ کر، پانچ لمبی، تکونی، پنکھڑیاں قینچی سے کاٹ لیجیے۔

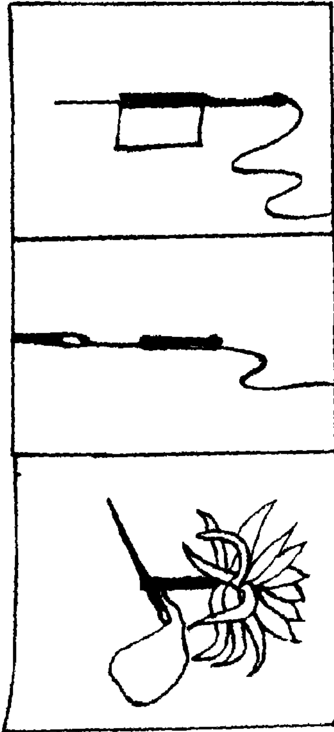
۵۔ کاغذ کو پورا کھول دیجیے۔

۶۔ سوئی میں نارنجی دھاگہ پرو کر دھاگے کے آخر میں صاف سی گرہ لگا دیجیے جو پھول کا "زیرہ" بنے گی۔

۷۔ کاغذ کے بیچ میں، لمبائی کے رُخ، سوئی سے ٹانکے بھریے۔ کاغذ کو سوئی پر ہی جما رکھیے۔

۸۔ سوئی سے پروئے کاغذ میں دو بل دے کر پنکھڑیوں کو پھول کی شکل میں لائیے اور اس کو تھوڑا دبا دیجیے تاکہ بل کھل نہ جائیں۔

۹۔ پھول کو تاگے میں پرو کر گرہ تک پہنچا دیجیے۔



۱۰۔ کاغذ کا چھوٹا مستطیل ٹکڑا اٹھائیے۔ سادہ طرف سے اُس پر لیئی لگائیے۔ لیئی لگے حصّے کو سوئی پر رکھ کر اس طرح لپیٹیے کہ نارنجی رنگ کی ایک نلکی سی بن جائے۔

۱۱۔ اِس نلکی کو بھی دھاگے میں پرو کر پھول سے ملا دیجیے۔

۱۲۔ نلکی کے آخری سِرے پر ٹانکہ دے کر گرہ لگا دیجیے۔ اور دھاگہ توڑ لیجیے۔

ہارسنگھار کا پھول تیار ہے۔

ایسے کئی پھول بنا کر ایک ساتھ رکھے جائیں تو بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھنے والا انھیں اصلی پھول سمجھتا ہے۔

ان پھولوں کا ہار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ببول کی پتلی خشک شاخوں کے کانٹوں میں پرو کر کالے یا گہرے نیلے، کپڑے یا کاغذ کے سامنے سجایا جائے تو کانٹوں پر کھلے ہوئے یہ پھول تاروں کی طرح دمکیں۔ ٹہنی پر بہار آجائے گی۔

اگر شروع میں اچھا پھول نہ بنا پائیں تو جی نہ چھوڑیے۔ میں بھی شروع میں اچھے پھول نہ بنا سکا تھا۔ یاد رکھیے مہارت مشق سے پیدا ہوتی ہے۔

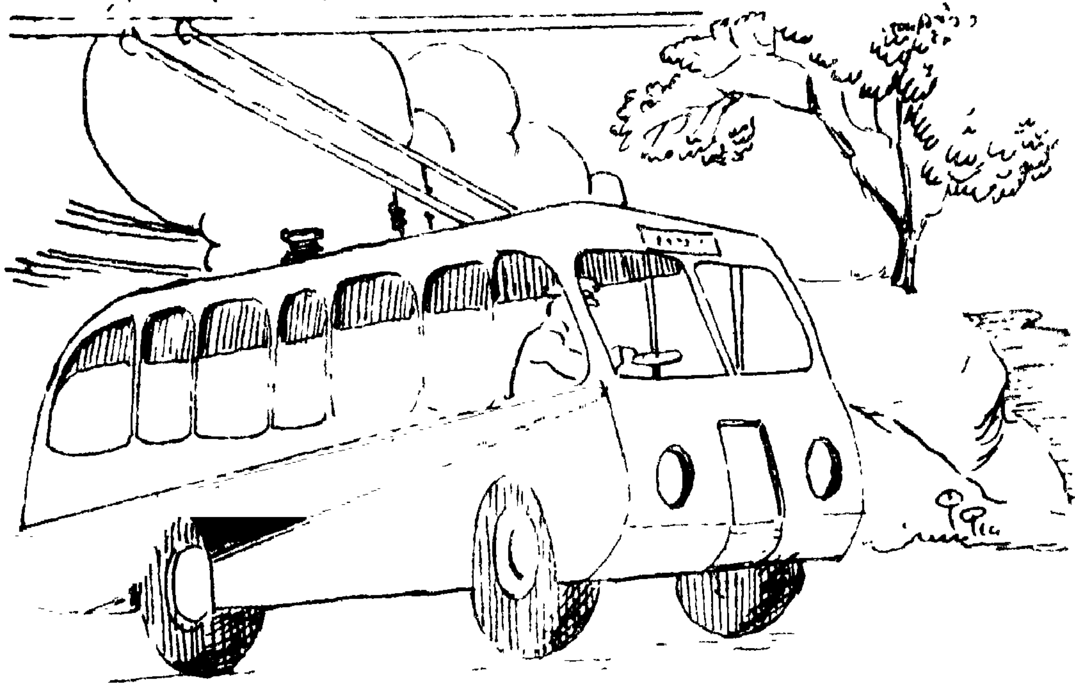
جناب سخاؔ احمد خاں امروہوی

عزم

ہم جہاں بھی جائیں گے راستے بنائیں گے
مئے خلوص ہر ایک کو شوق سے پلائیں گے
مردہ دل میں پھر سے ایک اِنقلاب لائیں گے
کر کے جان قرباں ہم دیس کو بچائیں گے
ہوگی ایک نئی منزل جو قدم اٹھائیں گے
شمع علم کی گھر گھر مل کے سب جلائیں گے
اے سخاؔ کہیں گے جو
کر کے ہم دکھائیں گے

محمد حبیب حسین خاں متعلم
محمدیہ ہائی اسکول، بمبئی

ٹرالی میں چڑھے



بمبئی میں برسوں سے ٹرام کا
رواج تھا۔ اب اس کی جگہ ٹرالی چلنے
والی تھی۔ لوگ ٹرالی کی تعریف میں
زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔
ہر جگہ ٹرالی کا چرچا تھا۔ میں نے بھی
دل میں کہا، کچھ نہ کچھ بات ہے جو
لوگ ٹرام کو جلد سے جلد بند کرا کے
ٹرالی چلانے پر زور دے رہے ہیں۔
آپ تو جانتے ہیں نئی چیزوں
کو دیکھنے کا شوق سبھی کو ہوتا ہے۔ ان
سبھی میں ہمیں بھی شامل کر لیجیے۔
ہمیں بھی دھن سوار ہوئی کہ کسی
طرح ایک نظر ہم بھی دیکھ لیں۔ یارا
دوستوں کی زبانی بھی اس ٹرالی کے

بارے میں بہت کچھ سُنا تھا۔ ایک صاحب نے کہا: "یار، میں نے خود ڈپو میں جاکر اسے دیکھا ہے، کیا آرام دہ سیٹیں ہیں"۔ دوسرے صاحب بولے "اجی سیٹیں جیسی بھی ہوں تیزی میں تو ہماری بسوں کو مات دے دیتی ہے۔ ٹرام کی طرح جوں کی چال نہیں چلتی۔ پھر پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ بھی نہیں جس سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ کھڑکیاں کھلی کھلی، چاروں طرف شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت ہی خوب صورت لگتی ہے"۔ ایک صاحب نے یہ اطلاع دی کہ ہماری حکومت نے اسے چیکوسلواکیہ سے منگوایا ہے۔ اور جناب اس کا صحیح نام "اسکوڈا" (SKODA) ہے۔ غرض ان تمام تعریفوں کو سُن سُن کر اشتیاق اور بڑھا۔

یہ ٹرالی بسیں کبھی کبھار جانچ کے لیے چلائی جاتی تھیں اور گھر کے سبھی لوگ انھیں دیکھ چکے تھے۔ اتفاق کی بات ہمیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور اپنی بدنصیبی پر افسوس کر رہے تھے۔

لیجیے ایک دن یہ اُمید بھی پوری ہوگئی۔ ہوا یہ کہ شام کے چار بجے مجھے کہیں جانا تھا۔ مولانا شوکت علی روڈ کے قریب پہنچا تو اچانک ایسا لگا جیسے ہمارے کانوں کے قریب کسی نے بم چھوڑ دیا ہو۔ بچّوں کے شور وغل نے رہے سہے حواس بھی گم کر دیے، ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹرالی ہمارے قریب سے گزری۔ اور ابھی ایک نظر بھی نہ دیکھا تھا کہ نظروں سے غائب!

پھر اس کے بعد اُڑتی اُڑتی خبر سُنی کہ ۱۲ را پریل کی شب کو آٹھ بجے ٹرالی بسوں کا افتتاح وائی۔ بی۔ چوہان کریں گے وہ اس میں سوار ہوکر ایک دورہ بھی کریں گے۔ خیر صاحب ۱۲ را پریل کی شب کو ۶ بجے سے لوگ سڑکوں پر اِکٹھّا ہونے لگے۔ خدا خدا کرکے انتظار کی گھڑیاں بیتیں اور پانچ چھ ٹرالی بسیں ایک دم سامنے سے گزریں لیکن

ان میں کون سی بس میں چوہان صاحب تشریف فرما تھے ، کچھ پتہ نہ چلا۔ خیر بھائی بس کو تو اچھی طرح دیکھ لیا۔ یہ ہی کیا کم تھا۔

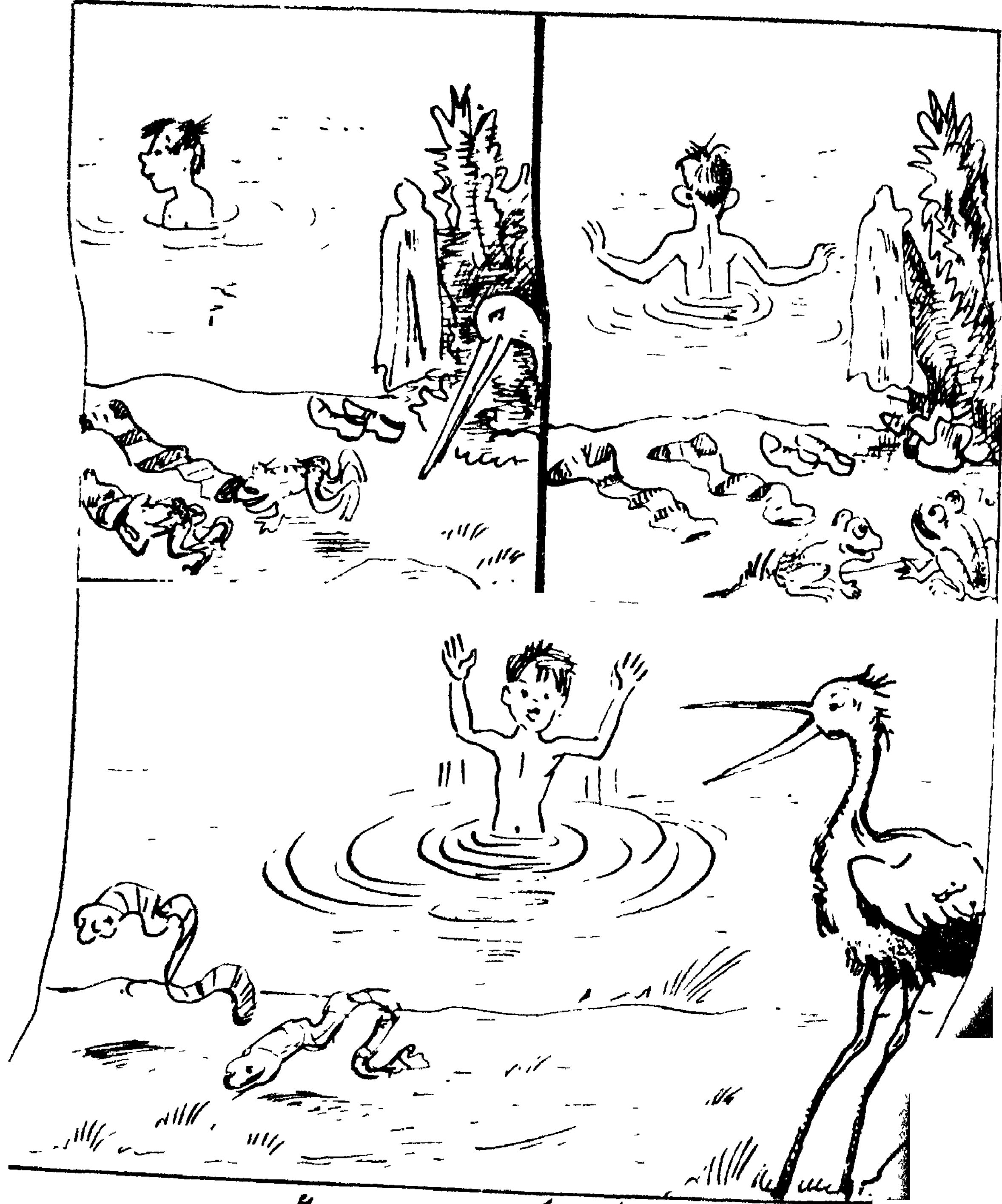
دوسرے دن ٹرالی میں بیٹھنے کا موقع بھی فراہم ہو گیا۔ بس اسٹینڈ پر جا کر معلوم ہوا کہ ایک ہم ہی اس میں بیٹھنے کے خواہش مند نہیں اور بہت سے لوگ یہی خواہش لے کر آئے ہیں۔ پرانی بسیں آتیں اور یوں ہی چل دیتیں۔ کچھ لوگوں کو میں جانتا ہوں وہ آج تک بس کے لیے لائن میں نہیں کھڑے ہوئے پر وہ بھی آج دم سادھے لائن میں کھڑے ٹرالی کا انتظار کر رہے تھے۔

خیر صاحب، یہ ٹرالی صاحبہ آخر تشریف لے آئیں۔ [illegible] کس طرح داخل ہوئے یہ نہ پوچھیے۔ بہت سے لوگ پہلے ہی [illegible]

کی طرح بھرے تھے۔ ٹرالی میں بیٹھنے کی بہ نسبت کھڑے رہنے کی جگہ زیادہ کشادہ تھی، تازہ ہوا کا بھلا کہاں گزر۔ اور گرمی ! خدا کی پناہ !! ٹرالی میں روشنی کی خاطر کھڑکیاں تھیں لیکن اس وقت تو دن میں بھی شام کا دھندلکا سا لگ رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچّے سبھی کا بُرا حال تھا۔ سب ہی سوچ رہے تھے کہ کاش پرانی بس ہی میں سوار ہوتے !

ہم نے بھی آئندہ کے لیے قسم کھا لی۔

"اب کھائی تو کھائی اور اب کھائی تو رام دُہائی۔"



جان بچی لاکھوں پائے۔

بچّوں سے باتیں (بقایا صفحہ ۵)

اور اپنے پیامیوں سے پوری امید ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے اور مولانا مرحوم کے بارے میں اچھے اچھے مضمون لکھ کر بھیجیں گے۔

پیامیوں کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ہمارے پُرانے، بہت پُرانے کرم فرما اور سرپرست جناب محمد شفیع الدین نیرؔ صاحب نے اس مرتبہ اپنی دو نظموں سے ہمیں نوازا ہے۔ کچھ تو ان کی بیماریوں اور کچھ غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے نیرؔ صاحب کو ادھر توجہ کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک نظم نیا سال آپ اسی پرچے میں پڑھیں گے، دوسری نظم (باپو کی یاد میں) فروری کے پرچے میں چھپے گی۔

اس نئے سال سے ہم ایک نئی کہانی کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ "انوکھے واوا" جس طرح یہ نام انوکھا ہے ایسے ہی کہانی بھی بہت انوکھی، بہت اچھوتی اور غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے بہت پسند کریں گے۔ اور بہت شوق سے پڑھیں گے۔

آپ کو یقین نہ آئے گا

مگر یہ حقیقت ہے کہ :-

ایک عمدہ بمبار طیارے

پر جتنا خرچ آتا ہے اس سے (۱) دو لاکھ پچاس ہزار اسکول ٹیچروں کو ایک سال تک تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ (۲) سائنس کی ۳۰ فیکلٹیاں ایسی تعمیر کی جا سکتی ہیں کہ ہر ایک میں ایک ایک ہزار طالب علم ہوں۔

ایک ایٹمی ڈبکی کشتی

کی جتنی قیمت ہوتی ہے اس سے پچاس شہروں میں جدید ترین قسم کے اسپتال قائم کیے جا سکتے ہیں۔

آواز کی رفتار سے تیز

اُڑنے والے ایک جنگی طیّارے کی قیمت میں چھ لاکھ مکان ایسے بنائے جا سکتے ہیں کہ ان میں ۳۰ لاکھ سے زیادہ آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہو۔

(یونیسکو فیچرز)



لطیفے

"میں گھر جارہا ہوں۔"
"کیوں؟"
"کیوں کہ میں وہاں رہتا ہوں۔"

"بھیّا میں اپنے کتّے کا نام اسد رکھنا چاہتی تھی پر امّی نے جھڑک دیا، کہنے لگیں یہ اسد کی بے عزتی ہوگی۔"
"امّی بڑی اچھی ہیں۔"
"پھر میں نے اس کا نام آپ کے نام پر رکھنا چاہا، مگر انھوں نے پھر جھڑک دیا، کہنے لگیں یہ کتّے کی بے عزتی ہوگی۔"

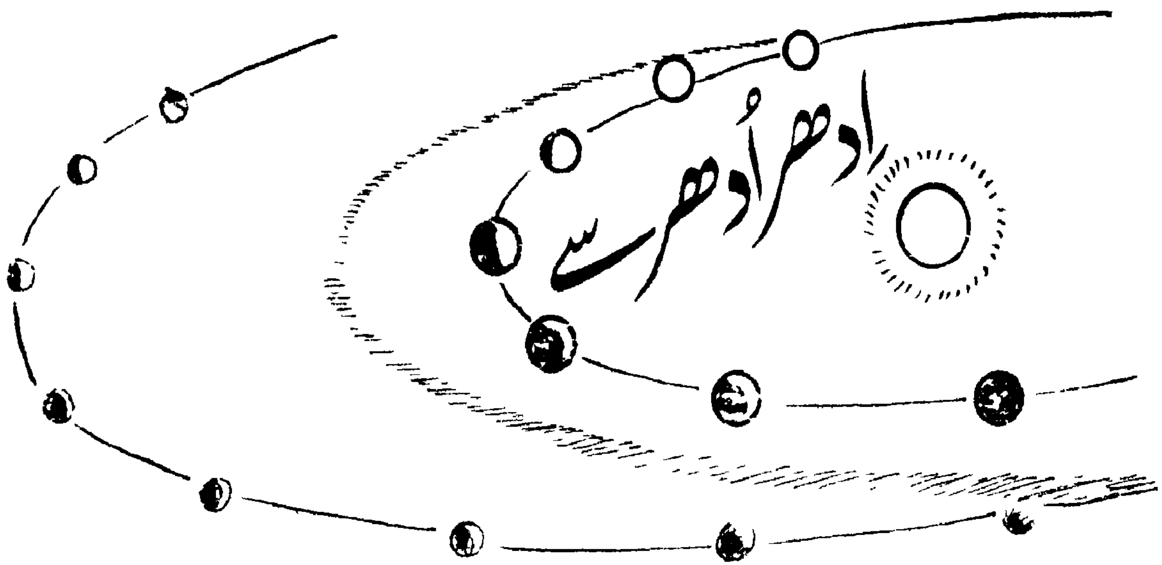
"بھلا تم کہاں تک تیر سکتے ہو؟"
"کبھی اندازہ نہیں لگایا۔"

"اچھا یہاں سے لے کر اس سڑک تک تیر سکتے ہو؟"
"بکواس نہ کرو، کوئی بھی وہاں تک تیر کے نہیں جا سکتا!"
"بھلا کیوں؟"
"یہاں پانی بھی ہے تیرنے کے لیے؟"

استاد: "سترھویں صدی کے تاریخ دانوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"
شاگرد: "یہ کہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے۔"

پاگل: "ہمیں آپ پہلے ڈاکٹر سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔"
ڈاکٹر: مسکرا کر "کیوں بھئی؟"
پاگل: "آپ بالکل ہم جیسے لگتے ہیں۔"

صحافی



بچوں کا چڑیا گھر

دہلی کے بچوں نے یہاں کا چڑیا گھر ضرور دیکھا ہوگا۔ اس چڑیا گھر میں اب ایک "بچوں کا چڑیا گھر" بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ ارے آپ تو اچنبھے میں پڑ گئے۔ پہلے پوری بات تو سُن لیجیے! اس چڑیا گھر میں طرح طرح کے بچے نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ننھے ننھے پیارے پیارے جانور رکھے جائیں گے۔ اور آپ جیسے چھوٹے چھوٹے بچّے آزادی سے ان معصوم جانوروں کے ساتھ دوڑ بھاگ سکیں گے۔ ان کے ساتھ کھیل کود کر ان کو بھی خوش کر سکیں گے اور اپنا جی بھی بہلا سکیں گے۔

اس چڑیا گھر میں ایک اور دلچسپ چیز بھی شروع ہونے والی ہے۔ چڑیا گھر کو دیکھنے میں بہت چلنا پڑتا ہے۔ لوگ تھک جاتے ہیں۔ اب اس چڑیا گھر میں خاص طرح کی گاڑیاں چلائی جائیں گی۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ چڑیا گھر کے بھانت بھانت کے جانور ہی ان گاڑیوں کو چلائیں گے۔ بھئی چڑیا گھر کو دیکھنے کا تب تو لطف آ جائے گا۔

بندروں کی لغت

بندر بھی آپس میں بولتے ہیں، باتیں کرتے ہیں۔ منہ سے آوازیں نکال کر اور

ھ پیر اور آنکھوں کے اشارے سے اپنی
ت اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہیں۔ لندن
ے ایک پروفیسر رابرٹ ہنڈے نے
ندروں کی ان حرکات و سکنات کا بغور
طالعہ کیا ہے۔ انھوں نے بندروں کی
یسی ۳۰ آوازیں اور ۳۰ اشارے جمع
کیے ہیں۔

بھاکڑہ ننگل کی سیر کیلیے بچّوں کی کوشش

پنجاب میں ایک گاؤں نند پور ہے۔
ں کے اسکول کے بچوں نے اپنا ایک
ب بنایا ہے۔ اس کلب کی طرف سے
یک مرغی خانہ اور سبزیوں کا ایک چھوٹا
سا فارم چلتا ہے۔ اس مرغی خانے اور
یوں کے فارم پر بچّے خود ہی کام
تے ہیں۔ فرصت کے وقت میں ان کے
سے جو آمدنی ہوتی ہے بچے اسے کلب
یں جمع کرتے جا رہے ہیں۔
آپ جانتے ہیں یہ بچے اپنی محنت
ے کیوں جمع کر رہے ہیں؟

انھوں نے سیر کا پروگرام بنا رکھا
ہے۔ ان پیسوں سے وہ سب مل کر بھاکڑہ
ننگل باندھ دیکھنے جائیں گے۔ بھاکڑہ
ننگل ہندوستان کا سب سے بڑا باندھ ہے،
جو پنجاب میں ستلج ندی کے اُوپر باندھا گیا
ہے۔ ہندوستان ہی کے نہیں ساری دُنیا
کے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ بھلا ان بچوں
کے دل میں اس عظیم الشان باندھ کو دیکھنے
کا ارمان کیوں نہ پیدا ہوتا۔
اپنی فرصت کے وقت میں اپنی محنت
سے کمائے ہوئے پیسے سے بھاکڑہ ننگل
دیکھنے میں انھیں مزہ ہی اور آئے گا۔

چاند کے بعد مرّیخ

اس سے پہلے چاند کی سطح کی تصویر
اُتارنے والے طیّاروں کی خبریں آپ
پڑھ چکے ہیں۔ اب ایک اور خلائی طیّارہ
چھوڑا گیا ہے۔ یہ طیّارہ مریخ یا منگل تارے
کی سطح کی تصویریں اُتارے گا۔ ۲۸ نومبر
کو امریکہ نے یہ خلائی طیّارہ چھوڑا ہے۔
سائنس والوں نے دوربینوں کی

مدد سے مریخ کے بارے میں کچھ قیاس کر رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سیارے پر زندگی کے آثار موجود ہیں۔ انھوں نے مریخ کی سطح پر پانی کی کچھ نہریں بھی دیکھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مریخ ہی ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کی آب و ہوا انسانوں کے لیے کسی حد تک موافق ہو سکتی ہے۔ جہاں انسان نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ زندگی گزار بھی سکتا ہے۔

امریکہ نے جو خلائی طیارہ چھوڑا ہے، اسے ۸ ماہ کے اندر ۳۵ کروڑ میل کی اُڑان طے کرنی ہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں یہ طیارہ مریخ کے قریب سے گزرے گا۔ اس وقت اس طیارے کا ٹیلی ویژن کیمرہ مریخ کی تصویر کھینچ کر زمین پر بھیجے گا۔

ان تصویروں سے مریخ کے بارے میں تصدیق ہو جائے گی اور آئندہ مریخ پر انسان کے پہنچنے کی تیاری میں مدد ملے گی۔

چاند پر وقت بتانے والی گھڑی

ابھی حضرت انسان چاند پر پہنچے بھی نہیں مگر وہاں زندگی گزارنے کی تیاری ابھی سے شروع کر دی ہے۔ خبر ملی ہے کہ امریکہ کی ایک کمپنی نے چاند پر پہنچنے والوں کے لیے خاص طرح کی گھڑی ابھی سے بنا ڈالی ہے۔ یہ گھڑی چاند پر یہ بتائے گی کہ اس وقت دنیا میں کیا وقت ہے، کون سی تاریخ ہے اور دنیا اس وقت چاند کے کس رخ پر گھوم رہی ہے۔

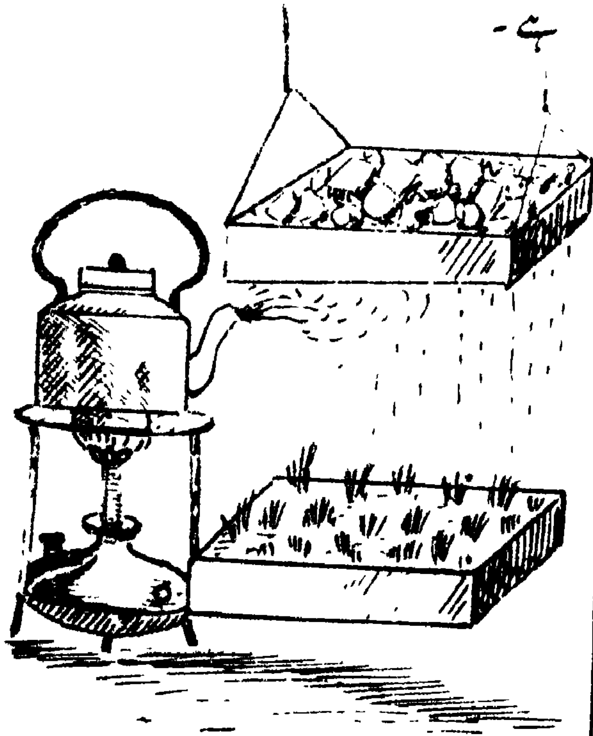
جناب مجیب احمد خاں

بارش کا چکّر

ایک بڑی ٹرے میں مٹی کی تہہ جمائیے اور اس میں ننھے ننھے پودے یا چھوٹی چھوٹی گھاس لگا دیجیے۔ ٹرے کے قریب ہی ایک طرف اسٹوو پر پانی سے بھری کیتلی چڑھا دیجیے۔ کیتلی کی ٹونٹی ٹرے کی طرف رکھیے۔ ٹونٹی سے دو تین انچ کی بلندی پر ایک اور ٹرے اس طرح لٹکائیے کہ پہلی ٹرے کے ٹھیک اوپر رہے۔ اس ٹرے میں پگھلے ہوئے برف کی تہہ جما دیجیے۔ اب اسٹوو کو جلائیے۔ لیجیے آپ کا بنایا ہوا بارش کا چکّر تیار ہوگیا۔

کیتلی کی ٹونٹی سے نکلنے والی بھاپ اوپر والی ٹرے کی ٹھنڈی تہہ کو چھوئے گی۔ ٹھنڈ پاکر یہ پانی کے قطروں میں بدلے گی اور پھر ننھی ننھی بوندیں بن کر نیچے والی ٹرے پر برسنے لگے گی۔

اس تجربے میں پہلی ٹرے زمین کو، دوسری ٹرے فضا کی بالائی سرد پٹی کو اور کیتلی زمین پر پانی اور انجرات مہیا کرنے والے ذرائع کو ظاہر کرتی ہے۔





سید احمد ولی پرنٹر اور پبلشر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔



پروفیسر محمد مجیب اُس خودکار آفسٹ مشین کا افتتاح کررہے ہیں جس پر پیامِ تعلیم چُھپتا ہے

y 1965. Regd, No. D. 14[illegible]

Payam -i- Taleem

New Delhi. 25

بچّوں کے لئے

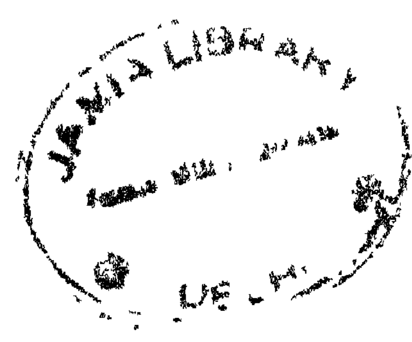
دستوں میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

کتاب	صفحات	قیمت
بونو	۱۶	۱۹
[illegible]	۲۰	۲۵
دو کہانیاں	۲۰	۳۱
گیہوں کی [illegible]	۱۴	۳۱
[illegible]	۵۲	۷۵
[illegible] اور [illegible]	۷۸	۶۹
[illegible]	۱۴	۳۷
نیلا پیالہ	۴۳	۱۲۵
[illegible]	۲۰	۳۱

[illegible]

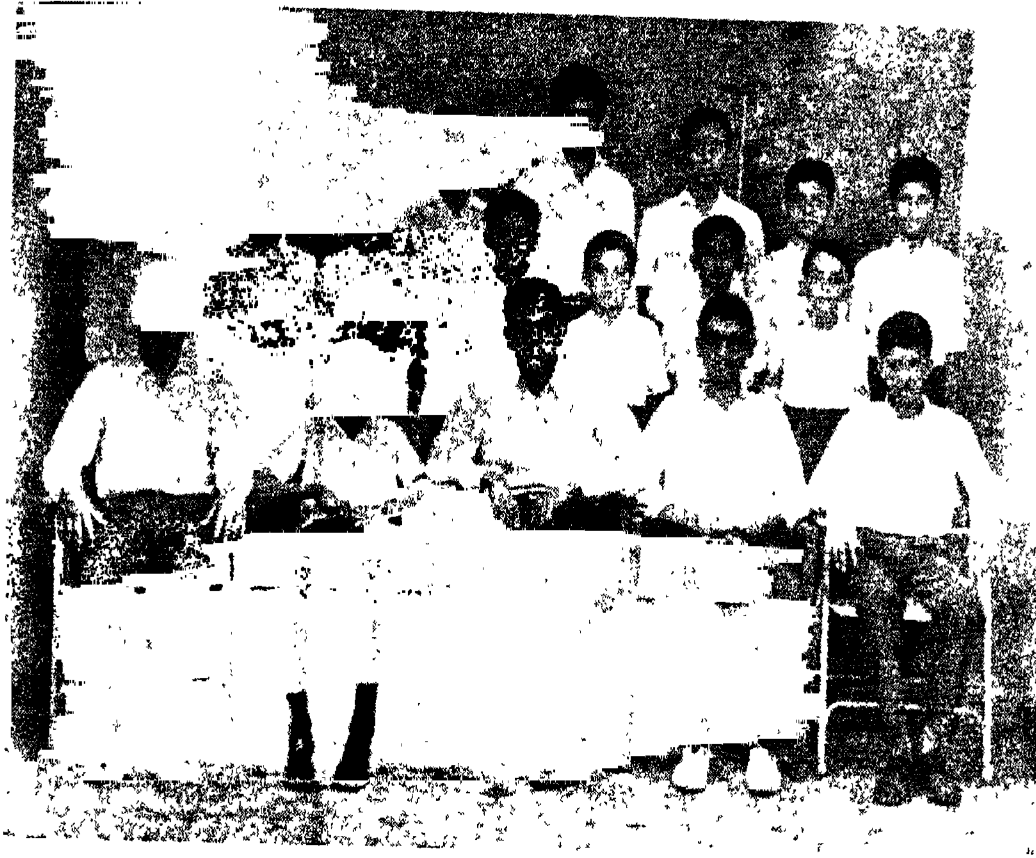
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

بامِ تعلیم





ارکان کابینہ محمدیہ ہائی اسکول مبئی



بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں)
محمد اقبال الوی (اسپیکر) ابوبکر محمد یوسف ملا (وزیر ثقافت)، محمد اسحاق شیخ داؤد (وزیر اعظم)
یوسف اللہ، سید سبط احمد (وزیر تعلیم و صحت) رحمان الٰہی افضال الٰہی (وزیر مالیات)

کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں)
(دوسری صف میں) شکیل محمد اطہر (وزیر کھیل)
(تیسری صف میں) عطا محمد اشرف (نائب لیڈر حزب مخالف)
۳۔ سید علی کوثر (لیڈر حزب مخالف)
۴۔ محمد عیسیٰ حیدری (وزیر نشر و اشاعت)

پیامِ تعلیم
دہلی

جلد ۲ فروری ۱۹۶۵ء شمارہ ۲

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی



سالانہ چندہ : ـــــ پانچ روپے
فی پرچہ : ـــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵


فہرست



بچّوں سے باتیں

پیامیوں کو عید مُبارک !

جس وقت یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا، آپ عید کی تیاریوں میں لگے ہوں گے۔ امنگوں بھرے دل سے اس خوشی کے دن کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ خدا ایسی خوشی کا دن بار بار لائے "ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم"۔

ہماری زبان اردو دیس کے شمالی علاقے میں پیدا ہوئی۔ پر عجیب بات ہے۔ اسی زمانے میں یہ دکن تک جا پہنچی۔ یہ اب کی نہیں سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔ وہاں یہ خوب پھولی پھلی اور تو اور بادشاہوں تک نے اس کی سرپرستی کی۔

آپ نے شاید قطب قلی شاہ کا نام سُنا ہو۔ اس بادشاہ نے تو ساری عمر اس کی خدمت میں گزار دی۔ اس زبان کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ حیدرآباد میں تو "یوم قطب قلی شاہ" کے نام سے ۱۱ر جنوری کو یادگار دن منایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہم یہ مضمون پیام تعلیم میں شائع کر رہے ہیں۔

جنوری کا پرچہ پیامیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لکھائی، چھپائی، تصویریں، مضمون سبھی چیزیں پسند کی گئیں۔ پیامیوں کو یہ سُن کر خوشی

ہوگی کہ ہمارے جنرل منیجر جناب تاباں صاحب ابھی مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اسے اور بہتر اور بہتر بنانے کی فکر میں ہیں۔ دعا کیجیے خدا ان کی کوششوں کو کامیاب کرے!

جنوری کے مضامین میں، ڈرامے کی تیاری کوے دادا۔ خلاباز خاتون۔ اولمپک۔ سوٹ کیس بدل گیا۔ خاص طور سے پسند کیے گئے۔

پرچے کے بارے میں اپنی رائیں بھیجنے میں ابھی تک استادوں، پیامیوں کے سرپرستوں اور بڑے پڑھنے والوں کا نمبر بڑھا ہوا ہے۔ پر ہم تو چاہتے ہیں کہ خود ہمارے پیامی زیادہ سے زیادہ تعداد میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائیں ہمیں بھیجیں۔ جو چیز اچھی لگی ہو اس کا بھی ذکر کریں اور پرچے میں جو کمی ہو اُسے بھی لکھیں۔

حالی نمبر کی تیاری شروع ہوگئی ہے مضمون بھی آنے لگے ہیں۔ ہمارا نہرو نمبر آپ نے بہت پسند کیا تھا۔ خدا کرے اس مرتبہ بھی ایک کارآمد اور مفید چیز ہم آپ کے سامنے پیش کرسکیں ایسی چیز جسے دیکھتے ہی آپ پھڑک اٹھیں۔ کیا اچھا ہو کہ نہرو نمبر کی طرح اس نمبر میں بھی پیامی زیادہ سے زیادہ حصّہ لیں۔ ہم ان کے مضامین کا انتظار کریں گے۔

ہمارے اچھے، بہت اچھے ساتھی جناب شاہد علی خاں صاحب انچارج شاخ بمبئی (سکریٹری انجمن ترقی اردو مہاراشٹر) کی کوشش اور توجہ سے بمبئی کے اسکولوں کے بچوں نے اپنے مدرسے کی سرگرمیوں کا حال بھیجنے کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ اس پرچے میں محمدیہ ہائی اسکول کی پارلیمنٹ کا حال پڑھیے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کی تصویریں بھی دیکھیے۔ اور موقع ملے تو اپنے اسکول اور مدرسے کی اسی طرح کی سرگرمیوں کا حال ہمیں لکھ کر بھیجیے۔

ابھی پچھلی جنوری کے شروع میں جامعہ کے پرانے استاد حضرت مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خواجہ صاحب عرصے تک جامعہ کالج میں دینیات کے استاد رہے ہیں اور بچوں کے لیے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۶ پر)



ناب مولانا محمد عارف اعظمی جہانا گنجوی

دُعا

اے مالکِ دو عالم تجھ سے یہ التجا ہے
وہ راہ سہل کر دے جس میں تری رضا ہے
توفیق دے کریں ہم دن رات تیری طاعت
بھر دے ہمارے دل میں ایمان کی محبت

کر دے ہمارے دل سے تو دُور ہر بُرائی
بن کر رہیں ہمیشہ آپس میں بھائی بھائی
شیوہ رہے ہمارا ہر دم بڑوں کی عزّت
اپنا ہو یا پرایا ہر ایک سے محبّت

قوّت دے بازوؤں میں خدمت کریں وطن کی
خدمت کریں وطن کی، زینت بنیں چمن کی
ہر ہر عمل ہمارا اِک درسِ زندگی ہو
دم سے ہمارے سارے عالم میں روشنی ہو

علم و یقیں سے یارب دامن ہمارا بھر دے
جو کام آئے دونوں عالم میں وہ ہنر دے

جناب شمیم حنفی

چکبست کے کچھ دلچسپ اشعار

آپ نے پنڈت برج نرائن چکبست کا نام ضرور سنا ہوگا۔ وہی چکبست جو ہماری زبان کے مشہور شاعر تھے، جنھوں نے بہت سی اچھی اچھی نظمیں کہی ہیں، بہت سے مرثیے لکھے ہیں۔ یہ بات شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ چکبست کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ وہ لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد جب تھکے ماندے کچہری سے گھر واپس آتے تھے تو گھر کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتے تھے۔ انھیں دلچسپ کہانیاں سناتے تھے اور ان کے لیے ننھی منّی نظمیں کہتے تھے۔ چکبست کا انتقال تو ۱۲، فروری ۱۹۲۶ء کو ہوگیا لیکن ان کے خاندان کے بہت سے لوگ آج بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ ان ہی لوگوں میں چکبست کے ایک نواسے گوپال چکبست صاحب بھی ہیں جو لکھنؤ کے کسی کالج میں پڑھتے ہیں۔

ایک دن اتفاقاً گوپال چکبست سے میری ملاقات ہوگئی۔ باتوں ہی باتوں میں انھوں نے کہا کہ چکبست کے کچھ ایسے اشعار بھی انھیں یاد ہیں جو نہ تو چکبست کے مجموعۂ کلام "صبح وطن" میں شامل ہیں اور نہ کہیں اور شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ دلچسپ شعر بھی تھے جنھیں سُن کر آپ لطف لیں گے اس لیے آپ کو سناتا ہوں۔

ایک دلچسپ نظم سُننے سے پہلے یہ جان لیجیے کہ یہ نظم کس موقعے پر کہی گئی

تھی۔ ہوا یہ کہ ایک بار چکبست کی آٹھ نو سال کی بھتیجی اچانک بیمار پڑ گئی۔ انفلوئنزا کی طرح اس زمانے میں "ڈنگو" نام کے ایک بخار کی وبا پھیلی تھی۔ ان کی بھتیجی کو یہی بخار ہو گیا تھا۔ بیماری میں بستر پر پڑے پڑے وہ بہت چڑچڑی ہو گئی تھی اور نہ تو آسانی سے دوا پیتی تھی نہ پھل کھاتی تھی۔ پھل کھاتے کھاتے طبیعت اُکتا چکی تھی اور بار بار کھچڑی کھانے کے لیے مچلتی تھی۔ گھر کے سب لوگ اس کی ضد سے پریشان تھے۔ آخرکار چکبست نے اسے بہلانا شروع کیا۔ پہلے تو اس کے سامنے بچوں کی سی حرکتیں کرتے رہے تاکہ کسی طرح اس کی طبیعت خوش ہو اور وہ ڈاکٹر کی بات مان لے۔ لیکن جب وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو چکبست نے فوراً ایک نظم کہہ کر اسے سُنا دی اور وہ ہنس پڑی۔ ظاہر ہے کہ ہنسی آنے کے بعد اس کی ضد ختم ہو گئی۔ آپ بھی وہ نظم سُنیے:-

کھچڑی لانا، کھچڑی لانا
اس میں تھوڑا گھی بھی ملانا
میں نہیں پیتی دودھ انار
لاؤ چٹنی، لاؤ اچار
'ڈنگو' سے ہے مجھ کو پیار
ہو جاتا ہے ایک سو چار
منہ ہے میرا لال چقندر
بھائی ہے میرا منّو بندر

اب کچھ اور شعر سُنیے:-

چکبست کے ایک بے تکلف دوست تھے۔ یہ بھی وکالت کرتے تھے پر ان کی وکالت زیادہ نہیں چلتی تھی۔ چکبست اکثر ان سے مذاق کیا کرتے تھے۔ ایک بار چکبست نے ایک رباعی میں ان وکیل صاحب کے آفس کا بہت دلچسپ نقشہ کھینچا جسے سُن کر خود وکیل صاحب بھی ہنس پڑے۔ وہ رباعی یہ تھی:-

کرسی سے عیاں لغزشِ یک پائی ہے
میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
ہوتا نہیں اس جا سے موکّل کا گزر
آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

ان ہی وکیل صاحب کے بارے میں چکبست کا ایک اور شعر سُنیے:-

مرتے دم جب ملک الموت مقابل آیا
دلِ نادان یہ سمجھا کہ موکّل آیا

اسی طرح چکبستؔ کے ایک اور بے تکلف دوست تھے۔ ایک بار وہ بیمار پڑے۔ انھیں بخار آگیا تھا اور پیر میں گلٹی نکل آئی تھی۔ تکلیف بہت معمولی سی تھی لیکن وہ بہت زیادہ پریشان تھے اور زندگی سے مایوسی کی باتیں کرتے تھے۔ چکبستؔ انھیں دیکھنے کے لیے گئے اور ان پر نظر پڑتے ہی فوراً ہی ایک شعر کہہ کر پڑھ دیا جسے سُن کر ان کے دوست کو بھی ہنسی آگئی۔ آپ بھی وہ شعر سُنیے:

بخار آیا ہے، سر میں درد ہے، پاؤں میں گلٹی ہے
عدم کا پارسل لدنے کو ہے تیار بلٹی ہے

دیکھا آپ نے! چکبستؔ کتنے دلچسپ آدمی تھے۔





سچّی کہانی

جناب خلیق انجم اشرفی

جاڑے کے دن تھے۔ ہم لوگ لحافوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے، انگیٹھی پر چائے کا پانی سنسنا رہا تھا، رعنا والد صاحب سے کہانی سنانے کے لیے ضد کر رہی تھی۔

آخر والد صاحب کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننی ہی پڑی۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا تو لو بیٹی آج ایک سچّی کہانی سنو۔ بالکل آنکھوں دیکھی۔"

اتنا سن کر ہم لوگوں کا اشتیاق بڑھ گیا اور ہم سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ والد صاحب تھوڑی دیر رُک کر کہنے لگے۔

"جیسا کہ تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے، میں بھی دوسری جنگِ عظیم میں شرکت کر چکا ہوں۔ ان دنوں ہماری فوج مصر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک دن جرمن نازیوں سے دست بدست مقابلے میں زخمی ہو کر میں مصر کے فوجی ہسپتال میں علاج کے لیے داخل کرا دیا گیا۔ ان دنوں فوجی ہسپتال زخمیوں اور بیماروں سے بھرے رہتے تھے۔ میں جس کمرے میں تھا اس میں میرے علاوہ دو تین مریض اور تھے۔

"میرے بستر کے پاس ہی ایک انگریز فوجی افسر البرٹ کا بستر تھا۔ اسے دمے کا مرض تھا۔ دمے کی اس تکلیف اور کچھ اپنی فطری تندمزاجی کی وجہ سے وہ بہت

چڑچڑا ہو گیا تھا۔

ہم لوگوں کی تیماردار ایک ہنس مکھ نرس "جوزیفائن" تھی۔ غصّہ میں تو میں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ہر وقت فرشتوں جیسی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ وہ صرف اپنی ڈیوٹی نہیں پوری کرتی تھی بلکہ مریضوں کو لطیفے اور دلچسپ واقعات سُنا کر اُن کے مرض کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتی تمام مریض اس سے بے حد خوش تھے۔ ناخوش تھا تو وہ فوجی افسر البرٹ جو ہر ایک سے غصّے سے اور چیخ کر بات کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ بات بات پر جوزیفائن کو جھڑک دیا کرتا مگر اس خوش اخلاق نرس کے ماتھے پر بَل نہ آتا بلکہ اس کی اور دلدہی کرتی کیونکہ وہ اس کے چڑچڑے پن کی وجہ سے واقف تھی۔

"میرا زخم بہت معمولی تھا۔ میں جلد ہی اچھا ہو گیا۔ جس دن مجھے ڈسچارج ہونا تھا جوزیفائن صبح سے ضروری خانہ پُری میں مصروف تھی۔ اسی اثناء میں البرٹ نے دو دفعہ پکارا مگر وہ اپنے کام میں اتنا کھوئی ہوئی تھی کہ اس کی بات نہ سن سکی۔ یہ دیکھ کر البرٹ جھنجھلا گیا اور چیخ کر بولا 'بہری ہو گئی ہے کیا؟'

"جوزیفائن چونک کر مڑی اور پھر جلدی سے دوڑ کر البرٹ کے پاس پہنچی اور بڑی نرمی سے پوچھا 'کیا چاہیئے مسٹر البرٹ؟'

'ہوں! کیا چاہیے!' البرٹ غصّے میں اسی کے الفاظ دہراتا ہوا بولا 'اتنی دیر سے چیخ رہا ہوں اور تو اتنی دیر سے سُن ہی نہیں رہی تھی'۔ نرس کو اُس کے اس بدتمیزی کے لہجے پر بھی غصّہ نہ آیا۔ وہ مسکرا کر بولی 'اوہ! مسٹر البرٹ! میں ذرا کام کر رہی تھی!'

"اس کی مسکراہٹ پر البرٹ بھڑک اٹھا اور اچانک نیچے رکھا ہوا شیشے کا اُگال دان اس کے منہ پر کھینچ مارا!"

"بیچاری نرس!" رعنا بولی۔

"بھئی بولو مت! اس طرح کہانی کا مزہ جاتا رہتا ہے"! میں نے اسے منع کیا اور والد صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بولا "پھر کیا ہوا؟"

"پھر بقول رعنا بیچاری نرس کا سارا چہرہ بلغم اور تھوک سے تر ہو گیا۔ شیشے کے لگنے سے پیشانی پر بڑا سا زخم ہو گیا اور خون اس سے بہہ بہہ کر اس کے چہرے کو تر کرنے لگا۔ یہ واقعہ کچھ ایسا اچانک پیش آگیا کہ میں کچھ نہ کر سکا۔ یہ دیکھ کر میں نے سمجھا کہ اب یا تو جوزیفائن البرٹ کو غصے میں کچھ کھینچ مارے گی ورنہ ڈاکٹر سے شکایت کر کے اس کو کچھ سزا تو ضرور ہی دلوائے گی مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جوزیفائن کے چہرے پر ایک شکن نمودار ہونے کے بعد پھر وہی فرشتوں جیسی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور وہ مسکرا کر بولی 'ارے! مسٹر البرٹ! آپ تو خفا ہو گئے۔ زیادہ غصہ نہ کیجیے ورنہ آپ کو کھانسی کا دورہ پڑ جائے گا'۔

"یہ کہہ کر مسکراتی ہوئی غالباً منہ دھونے اور زخم کی ڈریسنگ کرنے چلی گئی۔ میں دم بخود بستر پر بیٹھا جوزیفائن کی کردار کی بلندی پر غور کر رہا تھا اور البرٹ بالکل ہکا بکا سا چھت کو تکے جا رہا تھا۔

"تھوڑی دیر بعد جوزیفائن سر پر سفید پٹی باندھے کمرے میں داخل ہوئی تو البرٹ اچانک بستر سے اتر کر جوزیفائن کے قدموں پر گر پڑا اور رو رو کر کہنے لگا 'سسٹر! مجھے معاف کر دو میں غصے میں اندھا ہو گیا تھا! تم بہت بلند ہو سسٹر اور میں بہت ہی نیچ!'

"جوزیفائن کے چہرے پر پھر وہی فرشتوں جیسی مسکراہٹ آگئی جیسے وہ اپنی انسانیت اور انتقام کے بدلے 'درگزر' کر دینے پر نازاں ہو اور جیسے وہ انسانیت کی اس جیت پر نازاں ہو! اس نے آہستگی سے البرٹ کو شانوں سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور آہستہ سے بولی 'میرے بھائی! میں نے تمہیں معاف کر دیا!' یہ سن کر البرٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں منظر کے اثر سے متاثر سا ہو کر کھڑکی سے باہر پارک میں کھیلتے معصوم بچوں کو دیکھنے لگا جن کے چہروں پر ابھی تک معصومیت کے نقوش تھے اور جن کے چہروں پر جوزیفائن جیسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی!" اتنا کہہ کر والد صاحب نے ایک لمبا سانس لیا اور دوسری طرف کروٹ بدل لی اور ہم لوگ اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے جوزیفائن کے کردار پر غور کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے تو ہم کیا کریں گے؟ بدلہ لینا پسند کریں گے یا معاف کر دیں گے!

جناب محمد شفیع الدین نیّرؔ

باپو کی یاد میں



جنوری کی تیس تاریخ کو مہاتما گاندھی شہید ہوئے ان ہی کی یاد میں اور ان ہی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے یہ نظم لکھی گئی ہے۔ نیّرؔ

اِس دیس کو جگایا، گاندھی مہاتما نے
آگے اسے بڑھایا، گاندھی مہاتما نے

جس راستے پہ چل کر آزاد ہو گئے ہم
وہ راستا دکھایا، گاندھی مہاتما نے

آپس کے پریم ہی میں بھارت کی ہے بھلائی
یہ گُر ہمیں بتایا، گاندھی مہاتما نے

بھارت کے اِس چمن کو اپنے لہو سے سینچا
یہ کام کر دکھایا، گاندھی مہاتما نے

ہندو ہوں یا مسلماں سکھ ہوں کہ پارسی ہوں
سب کو گلے ملایا، گاندھی مہاتما نے

اُلفت کے پھول پھولے، آپس کے بَیر بھولے
وہ پریم رَس پلایا، گاندھی مہاتما نے

بھارت میں چل رہی تھی ظلم و ستم کی آندھی
اِس ظلم کو مٹایا، گاندھی مہاتما نے

جب تک رہے وہ زندہ، جو بات منہ سے کہہ دی
اُس بات کو نبھایا، گاندھی مہاتما نے

تم سے بنے تو بچّو! تم بھی وہ کر دِکھاؤ
جو کام کر دکھایا، گاندھی مہاتما نے

جناب محمد امین صاحب

آب و ہوا بدل رہی ہے؟



آپ کو یقین آئے یا نہ آئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہماری دنیا کی آب و ہوا بدل رہی ہے۔ بہت سے سائنس داں تو کہتے ہیں، بچے تو بچے ادھیڑ عمر کے لوگوں کو اس تبدیلی کے دیکھنے کا پورا پورا موقع ملے گا اور وہ اسے پوری طرح محسوس کریں گے۔

اس کی اہمیت یوں زیادہ ہے کہ اس طرح کی موسمی تبدیلی ایک ہزار برس بعد ہوتی ہے۔ یہ سائنس داں کہتے ہیں، زمین کے محور کا زاویہ بدل رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دھوپ میں تیزی اور شدت بڑھ رہی ہے۔ اور کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ یورپ کی آب و ہوا بالکل افریقہ جیسی ہو جائے گی۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوگا، گرم ملکوں کے پیڑ پودے یورپ میں اُگنے لگیں گے اور افریقہ کے جانور آپ کو یورپ کے اس سرد خطے میں ٹہلتے نظر آئیں گے۔ ہے نا عجیب بات!

دریائے رھائن کی وادی میں گھنے جنگل اُگ آئیں گے یہ اتنے گھنے ہوں گے کہ ان میں سے گزرنا مشکل ہو جائے گا۔ وارسا (پولینڈ کی راجدھانی) کے آس پاس کا علاقہ تو شکاریوں کی جنت بن جائے گا۔ اتنے شیر ہوں گے، اتنے شیر ہوں گے کہ چاہے جتنے مار لو۔ عام خیال یہ ہے کہ اگلی صدی شروع ہوتے ہی تبدیلیوں کا دور شروع ہو جائے گا۔

بعض سائنس دانوں کو تو اپنی اس بات کا اتنا یقین ہے کہ انھوں نے آئندہ آنے والی باتوں کی پیشن گوئی بھی کردی ہے۔ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ تبدیلی کب ہوگی۔

مثلاً ۱۹۸۰ء میں افریقہ کے گرم علاقوں کے نباتات بڑے پیمانے پر یورپ میں اُگنے لگیں گے۔ اور پھر ۱۹۹۰ء کے آس پاس سکنڈی نیویا (ناروے، سویڈن، ڈنمارک) کے ملکوں میں موسم دو بار گرم ہونا شروع ہو جائیں گے اور یہ موسم کافی دنوں تک چلتے رہیں گے۔ پھر ۱۹۹۵ء میں زمین دوز پانی کی سطح نیچے گر جائے گی (انسان کو چاہیے کہ سمندر کے پانی کو صاف کرکے پینے کی اسکیم پر جلد سے جلد عمل کرنے کی صورت نکال لے) آخر ۲۰۵۵ء میں گرم علاقے کے حیوانات یورپ کے ملکوں میں رفتہ رفتہ بڑھنے لگیں گے یا اُن کی نشوونما شروع ہو جائے گی اور پھر معتدل اور گرم علاقے کے نباتات اور حیوانات کثرت سے پائے جانے لگیں گے۔ جیسا کہ شکل ۲ میں دکھائے گئے ہیں۔

کئی سائنس داں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ آب وہوا ایک دم نہیں بدلے گی بلکہ رفتہ رفتہ ۲۵۰ سال کی مدت میں یہ تبدیلی مکمل ہوگی۔

بہرحال جن لوگوں کا خیال ہے کہ آب وہوا جلد ہی اور کم مدت میں بدلے گی اور بدل کر رہے گی، اُن کا کہنا یہ ہے کہ ریڈایشن (سورج کی دھوپ) کا اثر دنیا کی آب وہوا پر ضرور پڑے گا۔ قطبین پر ریڈیو ایکٹیو کے بچے کھچے اور بے کار ذرے اور مادے جو پہلے سے کافی مقدار میں موجود ہیں اور گردش کر رہے ہیں وہ زمین کی قوتِ کشش کی وجہ سے اور بڑھتے جا رہے ہیں اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ قطبین پہ کرۂ ہوائی کا جو غلاف ہے وہ ان کی شدت اور زیادتی کو نہیں روک پائے گا اور پھر زمین محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح دونوں نصف کُروں کے وسطی علاقوں میں سالانہ درجۂ حرارت کا اوسط بڑھ جائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر زمین کے جھکاؤ کا زاویہ بھی بدل گیا۔ خواہ مختصر طور سے ہی تو اس میں شک نہیں کہ آب وہوا

میں بنیادی تبدیلی ہو کر رہے گی ۔ بہر حال ابھی ہم ایسی منزل میں نہیں پہنچے ہیں کہ وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ ریڈیو ایکٹیو کے بے کار ذروں کی کیا حقیقت ہے ۔ ابھی ان کے متعلق تحقیقات کی ضرورت ہے لیکن کاربن کے اثرات آب و ہوا پر ضرور اثر ڈالیں گے۔

دنیا کے سب سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ زمین کی تاریخ میں موجودہ دور یقیناً آب و ہوا کے دو بڑے دوروں کے درمیان ایک کڑی ہے گویا یہ عبوری دور ہے اور اس دور یا اس صدی کے آخر میں عارضی طور سے آب و ہوا ضرور گرم ہوگی اور قطب شمالی اور قطب جنوبی کی ساری برف پگھل جائے گی ۔ اس کے بعد نہایت ڈرامائی انداز میں دنیا کی آب و ہوا ایک دم سرد ہو جائے گی ۔

اٹلی میں فضا اور موسم کے چند پر جوش ماہرین پچھلے سال (۱۹۶۴ء) کی گرمی کا ذکر کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ آثار بتا رہے ہیں کہ آب و ہوا گرم ہونا شروع ہو گئی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۶۴ء میں جون اور جولائی کے مہینوں میں جنوبی یورپ میں موسم بہت گرم تھا اور گرمی کی شدت کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ایسی گرمی صدیوں کے بعد پڑی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگست ۱۹۶۴ء کا موسم فرانس میں بھی موجودہ صدی کا سب سے گرم موسم تھا۔



(۲)

بہر حال یورپ کے سائنس دانوں کی پیشین گوئی اگر صحیح ثابت ہو گئی تو ہم اس دور یا اس صدی میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ افریقہ اور یورپ کی آب و ہوا یکساں ہو جائے گی ۔ جیسا کہ شکل ۲ میں دکھایا گیا ہے۔

پیشن گوئی کے صحیح ہونے کا امکان کیا ہے؟"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آب و ہوا میں تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ابتدائی تاریخ سے لے کر اب تک ہمارا دور ایسے حالات سے دوچار رہا ہے جن میں زبردست تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ غیر معمولی تبدیلیوں کے اسباب کیا ہیں؟"

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سورج کی مناسبت سے زمین کی جو پوزیشن ہے اس کی تبدیلی کی وجہ سے آب و ہوا بدلتی ہے۔ دوسرے سائنس داں کہتے ہیں کہ کرۂ ہوائی اور خلا میں جو خصوصیات ہیں اُن میں تبدیلی کی وجہ سے آب و ہوا بدلتی ہے۔ کچھ سائنس داں یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین کی اندرونی تہوں میں چٹانوں کی بناوٹ کا جو طریقہ رہا ہے اس کی تبدیلی کی وجہ سے آب وہوا بدلتی ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں اب تک کوئی مسلمہ رائے نہیں بنی ہے۔

آٹون بیوغنسکی روس کے ماہر جغرافیہ داں ہیں۔ انھوں نے آب وہوا کی تبدیلی پر دو سو کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا خیال ہے بلکہ انھیں پکا یقین ہے کہ وقتاً فوقتاً آب وہوا میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ مدوجزر کو اُبھارنے اور پیدا کرنے کی طاقت پر منحصر ہیں اور اسی کے ساتھ سورج کی حدت میں کمی بیشی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

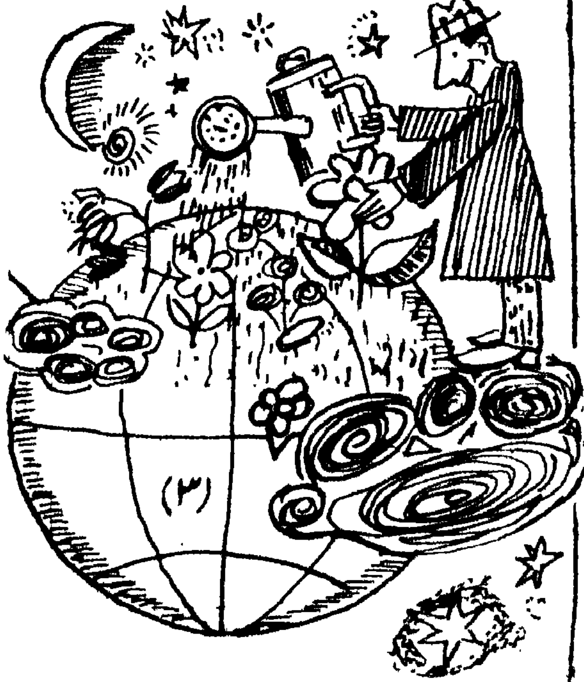
مدوجزر کی لہریں جب پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنی طاقت سے زمین کو جھنجھوڑ دیتی ہیں اور جب زمین، سورج اور چاند تینوں اپنی گردش کے دوران ایک سیدھ میں آجاتے ہیں تو بڑی زبردست لہریں اُٹھتی ہیں۔ یہ مسلسل باقاعدگی کے ساتھ ۱،۸۵۰ سال کے وقفے کے اندر بار بار ہوتا رہتا ہے۔ آخری بار جب مدوجزر کی لہریں اپنے پورے عروج پر یا انتہائی خطرناک منزل میں تھیں تو یہ پندرھویں صدی کا نصف زمانہ تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر بار ۱،۸۵۰ سال کے وقفے میں باقاعدگی کے ساتھ ہچکولوں کا دور ضرور آتا ہے۔ اس دور کے شروع زمانے میں یعنی ۳۰۰ اور ۵۰۰ سال کے دوران دنیا کی آب وہوا

ٹھنڈی اور مرطوب رہتی ہے۔ اس کے بعد ایک ہزار سال کے دوران آب وہوا خشک اور گرم رہتی ہے۔ دو زمانوں کے بیچ میں سو سال سے تین سو سال تک کے درمیان عبوری دور رہتا ہے یعنی سرد، مرطوب، گرم اور خشک زمانے کے درمیان کا دور۔

یہ ممکن ہے کہ ایک نسل کی عمر کے دوران آب وہوا میں بڑی تبدیلیاں آجائیں۔ یوفنسکی کا خیال ہے کہ ایسی تبدیلیاں جو آتی ہیں تو اس کا تعلق سورج کی حدت سے ہے۔ بظاہر یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے زمانے میں آب وہوا جو گرم ہو رہی ہے اس کا تعلق ۱۸۵۰ سال والے چکر کے ساتھ ہو یعنی اس دور کی پہلی مدت ختم ہو گئی ہے اور اب دوسری مدت شروع ہونے کی تیاری ہے۔

بیشتر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ جب سے تھرمامیٹر ایجاد ہوا ہے اس وقت سے لے کر اب تک آب وہوا میں اتنی زبردست تبدیلی آج تک نہیں ہوئی ہے لیکن ابھی اس بات پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ تبدیلی کا ٹائم ٹیبل (نظام اوقات)

کیا ہے۔ مثال کے طور پر مائخل بیود وخوف (جو کہ روس کی اکیڈمی آف سائنس کے ممبر ہیں اور لینن انعام جیت چکے ہیں) کا خیال ہے کہ یورپ میں جلدی سے آب وہوا کی تبدیلی اسی وقت ہو گی جب کہ کرۂ ارض کی ساری برف پگھل چکی ہو گی۔ گلوب پر جو برف کی تہیں بیٹھی ہوئی ہیں وہ سورج کی دھوپ (ریڈایشن) کو ۸۰ اور ۹۰ فیصدی تک واپس



(رفلکٹ) کر دیتی ہیں۔ اگر برف کی تہیں پگھل کر ختم ہو گئیں تو سورج کی دھوپ اور طاقت کو کرۂ آب جذب کرنا شروع کر دے گا

اس طرح زمین میں گرمی کا تناسب بڑھ ئے گا. جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔

بیو غنسکی صاحب فرماتے ہیں " یورپ ، بہت جلدی گرمی کا موسم آجائے گا مجھے س سے اتفاق نہیں ہے۔" وہ مزید فرماتے ں " یہ صحیح ہے کہ ۱۹۶۴ء میں گرمی کا موسم نی معمولی رہا ہے۔ سوویت یوکرین کی راجدھانی ئیو میں جون کے مہینے میں ماہانہ اوسط درجۂ رارت ۲۲٫۳ سینٹی گریڈ رہا ہے جبکہ پہلے یادہ سے زیادہ ۲۱٫۹ ڈگری سینٹی گریڈ ون ۱۸۵۵ء میں ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۱۱ء سے مسلسل ہمارے پاس صحیح صحیح درجۂ حرارت کا ریکارڈ رہا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۹۶۴ء میں گرمی کا موسم سارے ریکارڈ کے مقابلے میں سب سے گرم رہا ہے لیکن محض ایک سال میں درجۂ حرارت بڑھ جانے سے ہمیں ڈرامائی انداز سے فوراً نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے اس لیے کہ آب و ہوا کی تبدیلی کا اندازہ اس سے نہیں ہوگا البتہ موسم کا اتار چڑھاؤ ضرور معلوم ہو جائے گا۔ ۱۶۰ سال کے ماہانہ اوسط درجۂ حرارت کی جانچ پڑتال سے پتہ چلتا ہے کہ روسی میدان (خاص طور سے یورپین روس) کی آب و ہوا اور زیادہ گرمی کی طرف مائل ہے جگہ جگہ گرمی خاصی بڑھے گی لیکن اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ مغربی دنیا کے سائنس دانوں کو یقین ہے یا اُن کی پیش گوئی ہے۔ ریڈایشن (سورج کی دھوپ اور طاقت) کا اثر آب و ہوا پر پڑتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کی وجہ سے جلد اور کوئی غیر معمولی تبدیلی ہو جائے"۔

افریقہ یا گرم علاقے کے نباتات اور حیوانات کے یورپ میں منتقل ہونے کے سلسلے میں چند اور ماہرین کی رائے دلچسپی سے خالی نہیں۔ روس کی یوکرینین اکیڈمی آف سائنس کے مشہور علم حیوانات کے ماہر کی رائے ہے " آب و ہوا کی تبدیلی ایک تو ریڈایشن سورج کی دھوپ اور طاقت اور دوسرے کرۂ ہوائی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار پر منحصر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب زمین پر ہمالیہ پہاڑ کے بننے کا یا وجود میں آنے کا زمانہ تھا تو اس وقت ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار زیادہ تھی اور

اس زمانے میں خاص قسم کے پھل اور افریقہ کے اکیشیا کے درخت اور پودے یوکرین (روس کا ایک صوبہ) میں اُگتے تھے اور وہاں کے اسٹیپ (گھاس کے میدان) میں زرافہ اور شتر مرغ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اب پھر یہی نباتات اور جانور دوبارہ آجائیں لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی نہیں ہوگا بلکہ یہ صدیوں کا معاملہ ہے۔ آج کل کے زمانے میں کسی چیز کی پیش گوئی کرنا خطرناک ہے۔ اس کے باوجود مجھے پورا یقین ہے کہ انسان جتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اس لحاظ سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ آب و ہوا میں خود تبدیلی پیدا کر سکے گا نہ کہ آب و ہوا انسان کو بدل دے گی۔ اگر آب و ہوا میں قدرتی طور سے تبدیلی ہوئی تو وہ اتنی آہستہ آہستہ ہوگی کہ انسان اس زمانے کی بڑھتی ہوئی آسانی اور سائنس اور ٹکنالوجی کی سہولت سے کام لے کر آب و ہوا پر قابو حاصل کر لے گا۔"

یوکرینین اکیڈمی کے ممبر سر اخیم سبوتین (جو کہ اکیڈمی کی جیو فزکس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ ہیں) کی رائے یہ ہے کہ "کرۂ ارض جو کہ انسان کا گھر ہے اس کی آب و ہوا بدل سکتی ہے لیکن اتنی جلدی جلدی نہیں۔ سورج کی دھوپ اور حدت (ریڈ ایشن) میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اُن کی بنا پر اتنی جلدی ہمیں کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے اور نہ ماہانہ اوسط درجۂ حرارت کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آب و ہوا بدل رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۵۸ء میں سورج کے اندر ایک زبردست حدت کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے مقناطیسی طوفان آئے تھے لیکن اس کا سلسلہ تھوڑے ہی دن تک قائم رہا۔ آب و ہوا گرم ہو رہی ہے۔ ریڈیو ایکٹیو کے مادّے جو کہ سڑ کر گل رہے ہیں ان کے اندر کی حدت یا گرمی خارج ہو کر جمع ہو رہی ہے اور یہ آب و ہوا کو گرم بنا رہی ہے لیکن گرمی کی شدّت بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے اس لیے کہ ریڈیو ایکٹیو کے مادّے جو کہ کرۂ ارض کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں ان کی مقدار گھٹ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال میں زمین پر سرد آب و ہوا کا دور دورہ شروع ہو جائے۔

"آج کل انسان بہت سے تعمیری کام کر رہا ہے۔ وہ نئے سمندر بنا رہا ہے، ریگستانوں کو بدل رہا ہے، خشک اسٹیپ کے میدانوں کو ہرے بھرے میدانوں میں بدل رہا ہے، نئے نئے ہزاروں ایکڑ زمین میں درخت لگا رہا ہے، دریاؤں کے بہاؤ کے رخ کو موڑ رہا ہے۔ اس طرح انسان خود دنیا کی آب و ہوا بدل رہا ہے۔ آب و ہوا مرطوب ہو رہی ہے اور اس کی شدت گھٹ رہی ہے۔ اس لیے اب یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے لحاظ سے آب و ہوا کو بدلنے میں یا اس پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

شاہدہ سُلطانہ فائزہ متعلمہ سٹی ہائی اسکول (حیدرآباد)



یومِ جمہوریۂ ہند

آگئی ہے بہارِ آزادی — سب پہ چھایا خمارِ آزادی
حاصلِ افتخارِ آزادی — ہے یہی یادگارِ آزادی

ہم مسرت کے گیت گاتے ہیں
جشنِ جمہوریہ مناتے ہیں

ہر برس جنوری جو آتی ہے — صبحِ نَو کا پیام لاتی ہے
جب صبا چل کے گدگداتی ہے — ہر کلی کھل کے مسکراتی ہے

گُل انوکھا سماں دکھاتے ہیں
جشنِ جمہوریہ مناتے ہیں

لالہ وگُل کی یہ جو محفل ہے — اس میں ویروں[۱] کا خوں شامل ہے
اُن کے ایثار کا یہ حاصل ہے — اُن پہ قربان آج ہر دل ہے

اُن کی تاریخ ہم سُناتے ہیں
جشنِ جمہوریہ مناتے ہیں

اُن ہی سانچوں میں ہم کو ڈھلنا ہے — اُن کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے
جستجو میں ہمیں نکلنا ہے — اُن سہاروں سے اب سنبھلنا ہے

فائزہ ہم قدم بڑھاتے ہیں
جشنِ جمہوریہ مناتے ہیں

۱؎ بہادروں



محترمہ نجمہ پرویز (ہمیرپور)

کتاب کی تلاش

"اری رفو! چاروں طرف کیا تلاش
کرتی پھر رہی ہو؟" میں نے رفعت کو سارے
گھر میں حیران و پریشان گھومتے دیکھ کر پوچھا۔
"میری اردو کی کتاب بڑی دیر سے
نہیں مل رہی ہے، خدا معلوم کہاں غائب
ہو گئی؟" رفعت روہانسی سی تھی۔
"غائب کہاں ہو جائے گی، اپنی میز
پر دیکھو — ابھی اس دن ڈرائنگ کی کاپی
کے لیے سارے گھر کو سر پر اٹھائے تھیں اور
آخر میں وہیں میز پر ملی تھی...."
"لیکن آج تو میں نے میز کی ایک ایک
چیز ہٹا کر دیکھ لی ہے، کوئی سوئی تو ہے
نہیں کہ نظر نہ آئے ضرور سیفی بھیا نے چھپائی
ہو گی...."

"تو پھر سیفی سے پوچھو" میں نے کہا
اور رفعت سیفی کو بلانے چل دی۔
"سیفی بھیا.... اے سیفی بھیا، تم نے
میری اردو کی کتاب تو نہیں دیکھی —؟"
رفعت نے سیفی سے پوچھا۔
"ارے واہ، میں کیوں دیکھنے لگا، کوئی
میں چوتھے درجے میں پڑھتا ہوں جو آپ
کی کتاب کی ضرورت پیش آئے گی، مجھے
نہیں معلوم تمہاری کتاب وتاب.... ہر روز
تو تمہاری کوئی نہ کوئی چیز کھوتی رہتی ہے۔
سنبھال کر کیوں نہیں رکھتی ہو؟" سیفی نے
جو اس طرح کورا جواب دیا تو رفعت رو پڑی۔
"دیکھیے باجی، میں کیا کروں جب کوئی
میری میز سے ہی چرالے۔ ابھی کل ہی تو اسکول

سے آکر سب کتابیں میز پر رکھی تھیں....!"

"اچھا، اچھا تو روتی کیوں ہو ـــــ؟ چلو میں تلاش کرتی ہوں" اور میں رفعت کے ساتھ کمرے میں گئی - میز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے زلزلہ آیا ہو....ساری کاپیاں کتابیں تتر بتر ہو رہی تھیں، قلم میز کے نیچے پڑا تھا، دوات اُلٹی ہوئی تھی، سیاہی میز پوش کو رنگتی ہوئی نیچے فرش پر ٹپک رہی تھی....

" رفّو! تم اتنی بڑی ہو گئی ہو اور اپنی کتابیں، کاپیاں تک سلیقے سے نہیں رکھ پاتیں، دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے؟" میں نے کتابیں اٹھائیں تو کئی کتابوں کے شروع اور آخر کے کئی کئی صفحے ندارد، کسی پر سیاہی گری ہوئی، کسی کاپی کے صفحے پھٹے ہوئے تھے تو قلم کا نب ٹوٹا ہوا..... رفعت اب بھی اردو کی کتاب تلاش کرنے کی دُھن میں اُلٹ پُلٹ کر رہی تھی۔ میں نے اسے ٹوکا ـــ "کیوں رفّو! جن کتابوں سے تم علم حاصل کرتی ہو، ان کی اسی طرح قدر کی جاتی ہے؟"

" تو پھر باجی! اور کیا کروں....؟ آپ نے کہا تھا کہ کتابیں میز پر رکھا کرو، میں اسکول سے آکر بس میز پر ہی کتابیں رکھتی ہوں...."

" یہ تو بہت اچھی بات ہے، کتابیں ہمیشہ اسی جگہ رکھنی چاہئیں جو جگہ انھیں رکھنے کے لیے منتخب کی گئی ہے چاہے وہ میز ہو، الماری ہو یا بُک ریک ہو....اس طرح تمھیں کتابیں تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر سارے گھر میں وقت نہیں برباد کرنا پڑے گا، اُلجھن سے بچو گی اور کتابیں بھی گُم ہونے سے بچیں گی، لیکن رفّو! کتابوں اور کاپیوں کے لیے صرف تمہارا اتنا ہی تو فرض نہیں ہے۔ انھیں صاف ستھرا اور ترتیب کے ساتھ رکھنا چاہیے...."

" باجی! میں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن یہ گندی ہو جاتی ہیں"

" تمھیں چاہیے کہ ان پر دوسرا کاغذ ضرور چڑھا لو اس طرح یہ میلی بھی نہ ہوں گی اور ان پر کسی قسم کے دھبّے بھی نہ پڑیں گے..."

" لیکن باجی! یہ پھٹ بھی جاتی ہیں، اب

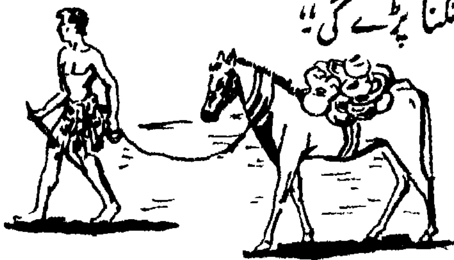
جغرافیہ کی کتاب دیکھیے، کئی صفحے نکل
ے ہیں"
"تمہارے پھوہڑپن کی بدولت ــــــ
تم انھیں احتیاط کے ساتھ پڑھتیں تو
نہ پھٹتیں، تم کتابیں موڑ کر پڑھتی ہوگی
کے علاوہ اگر تھوڑی سی پھٹ بھی
ے یا صفحے نکل جائیں تو گوند سے جوڑ
چاہیے۔ کتابیں کبھی ٹھونس ٹھونس
بھی نہ رکھنا چاہیے اس سے بھی پھٹ
تی ہیں اور آپس میں کبھی چھینا جھپٹی بھی
نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ورق الٹنے
میں بھی احتیاط رکھا کرو۔۔۔۔"
"وہ تو باجی، میں بہت احتیاط رکھتی
کبھی کبھی جلدی میں ورق نہیں اُلٹ
تو تھوک سے یوں چھڑا لیتی ہوں۔۔"
ت نے تھوک لگا کر ورق اُلٹ کر
انا چاہا، میں نے جلدی سے اس کا
لیا ــــ "چھی، یہ کیا گندی عادت ہے؟
ح تو تم روزانہ بہت سی گندگی اپنے
لے جاتی ہو۔ آیندہ ایسی حرکت کبھی
ــــ" پھر میں نے میز سے ساری کتابیں،

کاپیاں اٹھا کر دوسری میز پر رکھیں اور
میز پوش ہٹایا تو ڈھیر ساری گرد میرے
منہ پر پڑی۔
"رفو! چھٹی کے دن میز تو صاف کرلیا
کرو، دیکھو کتنی گرد ہے میز پوش پر بھی جگہ جگہ
سیاہی کے نقش و نگار بن رہے ہیں، دوات
میں ڈھکن لگا کر کیوں نہیں رکھتی ہو۔۔۔۔؟
قلم میں نب بھی سالم نہیں ہے، گر کر ٹوٹ گیا
تھا تو اسے بدل دیتیں۔۔۔۔ لکھنے کی ضرورت
ہوگی تو چیختی پھرو گی کہ نب ٹوٹا ہوا ہے۔۔۔۔"
رفعت نادم سی ہو رہی تھی۔ اس نے میز صاف
کرنے میں میری مدد کی، پھر جلدی سے گوند
اور ردّی اخبار اٹھا لائی۔ میں نے اس کی
ساری پھٹی ہوئی کتابوں کو گوند سے جوڑا۔
کتابوں اور کاپیوں پر ردّی اخبار چڑھا
دیے۔ رفعت اپنی کتابوں اور کاپیوں کا
یہ نیا روپ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔۔۔۔
"ہائے باجی! یہ تو بالکل نئی لگ رہی ہیں،
لیکن مجھے اب یہ جاننے میں دقت ہوگی کہ کون
سی کتاب کس مضمون کی ہے، ساری کتابیں
کھول کر دیکھنا پڑا کریں گی۔۔۔۔"

"بالکل نہیں.... تم تھوڑا سا سفید سادہ کاغذ لاؤ، ابھی یہ مسئلہ بھی حل ہوا جاتا ہے" اور میں نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ان پر کتابوں کے نام لکھ دیے اور اس ٹکڑے کو کتاب کے اوپری کاغذ پر چپکا دیا.... "لو بھئی! اب تو کوئی دشواری نہیں رہے گی نا.... اور ہاں دیکھو کتابوں کے اندر جا بہ جا نام لکھنا بھی ٹھیک نہیں، اس سے کتاب بدنما بن جاتی ہے"۔ رفعت خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی اور یہ بالکل بھول گئی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اردو کی کتاب کے لیے رو رہی تھی۔ جب میز صاف کردی گئی تو اس پہ صاف دھلا ہوا میز پوش لگایا گیا، پھر کتابیں اور کاپیاں ترتیب سے رکھی گئیں، بکس کے رنگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر رکھے گئے، پنسل، قلم اور ربر وغیرہ الگ ایک ڈبے میں رکھ دی گئیں، دوات میں سیاہی ڈال کر ڈھکن لگایا گیا اور جب یہ سب ہو گیا تو میں نے فکرمندی کے لہجے میں کہا ـــــ "رفو! تمہاری اردو کی کتاب تو ملی ہی نہیں...."

"ارے ہاں، میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی، اب کیا ہوگا؟ کل میرا اردو کا ٹیسٹ ہے...." وہ پھر روہانسی سی ہو گئی میں نے سیفی سے پوچھا، امّی سے پوچھا، نوکروں سے پوچھا، سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ ایک بار تو سیفی اور رفعت میں لڑائی ہوتے ہوتے بچی۔ سیفی کا کہنا تھا کہ وہ اسکول میں بھول آئی ہوگی اور رفعت کہتی تھی کہ سیفی نے اُسے پریشان کرنے کے لیے چھپا دیا ہے۔

اتنے میں اچانک اُسے کچھ یاد آیا۔ دوڑی دوڑی اپنے پلنگ کے پاس گئی۔ سرہانے کی طرف بستر کو اُلٹا اور چیخ کر بولی: "باجی یہ رہی کتاب۔ میری ہی غلطی تھی۔ رات پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگی تو میں نے اسے بستر کے نیچے رکھ دیا پر یہ بات مجھے اب یاد آئی۔ اب تو مجھے سیفی بھیّا سے معافی مانگنا پڑے گی"۔



جناب کوثر اعظمی



بچہ اور ستارا

بچہ:

اے آسماں کے تارو جو جگمگا رہے ہو
کتنے حسین ہو تم کیا مسکرا رہے ہو
ری ادا سے اپنی دل کو لبھا رہے ہو

ر کے ہو دھارے آکاش کے ستارے
س قدر ہو دلکش تم کس قدر ہو پیارے
ہتا ہے، بیٹھا کرتا رہوں نظارے

روشنی بکھیری تم نے ہے اس جہاں میں
کھلا دیا ہے تم نے وہ کہکشاں میں
ان پڑ گئی ہے کل بزمِ آسماں میں

ش میں بھی ہوتا ننھا سا ایک تارا
ے کاش مجھ کو آکاش کا کنارا
مگا کے روشن کرتا جہاں یہ سارا

ستارا:-

اے بھولے بھالے بچے تم ہو زمیں کے تارے
دھرتی کی گود میں اک ننھے سے ماہ پارے
تم کو خبر نہیں ہے تم کس قدر ہو پیارے

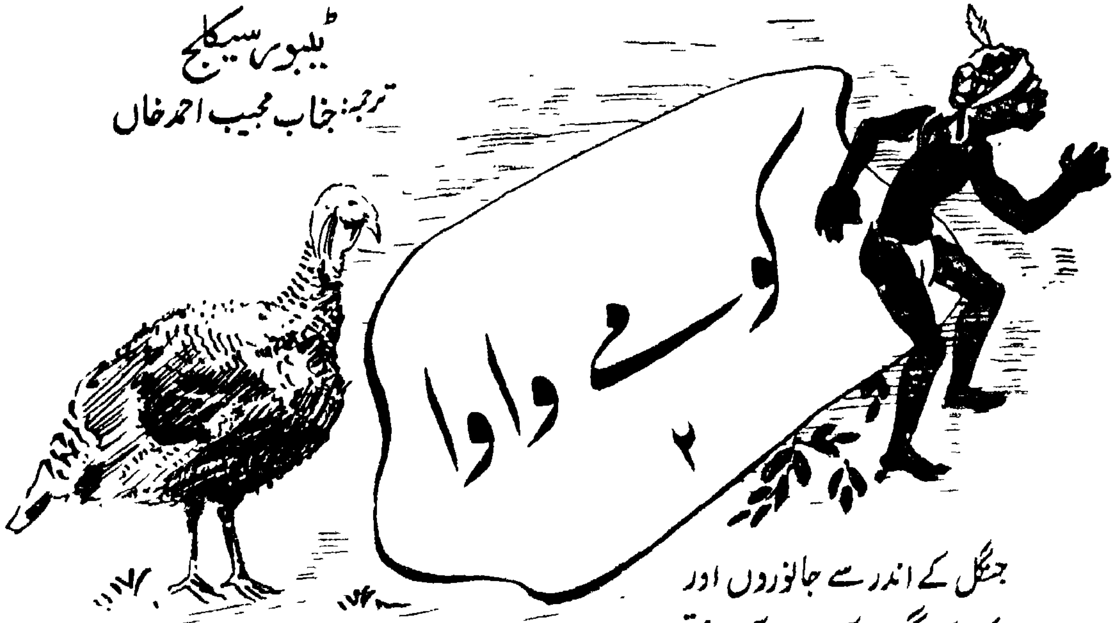
ہنستی ہوئی کرن ہو تم جانِ انجمن ہو
پھولوں سے بڑھ کے دلکش تم نازشِ چمن ہو
روشن ہے جس سے عالم وہ نیّرِ زمن ہو

آنکھوں کے نور ہو تم دل کے سرور ہو تم
مشہور بھولے پن میں نزدیک و دور ہو تم
ظلمت گھرے جہاں میں قندیلِ طور ہو تم

انسانیت کی اپنی اک جوت گر جگا لو
دھرتی کے سامنے پھر آکاش کو جھکا لو
اک دو کا ذکر کیا پھر دنیا کا دل لبھا لو

ٹیبو سیکلج

ترجمہ: جناب مجیب احمد خاں



جنگل کے اندر سے جانوروں اور پرندوں کی اَن گنت آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں میں سب سے صاف اور نمایاں آواز کسی بڑے پرند کی تھی۔ یہ پرند اُن پیڑوں کے اوپر اُڑ رہے تھے جو ہمارے کیمپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

"یہ آواز تو فیل مرغ کی ہے۔" میرے ایک ساتھی نے کہا۔ دوسرے ہی لمحے سامنے والے پیڑ کی شاخیں ہلیں۔ فیل مرغ اُن شاخوں پر آ بیٹھا تھا۔ اس کے بھورے پروں پر سفید سفید دھاریاں بہت خوب صورت معلوم ہو رہی تھیں۔

"کاش ہمارے پاس بندوق ہوتی! کم سے کم اس وقت کے کھانے کا انتظام تو ہو ہی جاتا!!" ہم میں سے کسی نے کہا۔ بے بسی اور نا اُمیدی نے ہمیں پھر گھیر لیا۔

یکایک ہمارے سروں کے اوپر سنسناہٹ سی ہوئی۔ فیل مرغ کی تیز چیخ نکلی اور وہ ہمارے سامنے جلتی ہوئی آگ میں دھڑام سے آ گرا۔ اس غیر معمولی واقعے نے ہم سب کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ سب لوگوں کی نظریں اُدھر اٹھ گئیں جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جنگلی لڑکا ایک ہاتھ میں تیر کمان لیے پیڑ پر سے اُتر رہا ہے۔ پیڑ سے اُتر کر وہ ہمارے سامنے آیا اور بولا:-

"میرا نام کوے واوا ہے۔ 'کاراجا' میرے قبیلے کا نام ہے۔ میرے دوست مجھے 'واوا' کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔ میں یہاں سے تھوڑی دور دریا کے اُتار پر مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ پیاس جو لگی اور دریا کا پانی پیا تو نمکیں نمکین سا لگا۔ بس میں سمجھ گیا کہ قریب ہی کوئی جہاز ڈوبا ہے اور جہاز والے خطرے میں ہیں۔ آپ لوگوں کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک چلا آیا۔"

"تم پانی کے کھاری پن سے یہ کیسے جان گئے کہ جہاز ڈوبا ہے اور ہم لوگ خطرے میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھے الوآ کا کہنا ہے کہ جہاں شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں وہاں شہد ضرور ہوتا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"لیکن تمھارے قبیلے والے تو سفید رنگ کے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں، پھر تم ہمارے پاس کیوں آگئے؟"

"بوڑھے الوآ کا کہنا ہے کہ جو کوئی مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کرتا ہے وہ خود اپنی مدد کرتا ہے۔"

"بہت خوب! لیکن میاں صاحب زادے، تم تو ابھی نو دس برس کے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ اس چھوٹی سی عمر میں تم ہماری کیا مدد کر سکو گے؟" میں نے کہا۔

"میں بارہ سال کا ہو چکا ہوں۔ اور بوڑھے الوآ کا کہنا یہ ہے کہ مچھلی کے بڑے پن کا اندازہ اس کی لمبائی سے اور آدمی کے بڑے پن کا اندازہ اُس کی جانکاری اور علمیت سے کیا جاتا ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

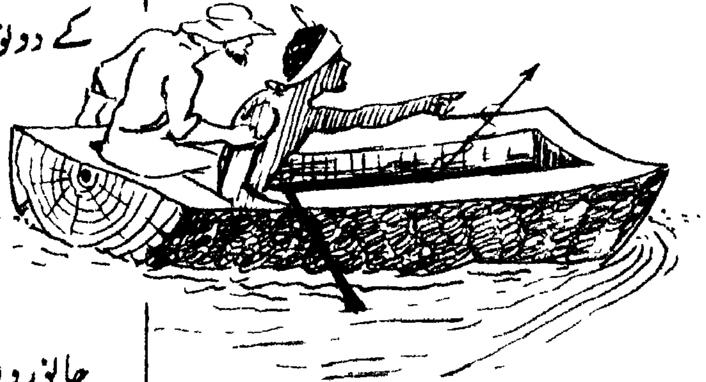
کوے واوا ہم سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے لمبے اور تیز چاقو سے لکڑی کے دو شاخے بھی بنا رہا تھا۔ اُس نے تین دو شاخے بنائے اور اُن کو آگ کے چاروں طرف کھڑا کیا اور فیل مرغ کو صاف کر کے بھُننے کے لیے اُن پر لٹکا دیا۔

دوسرے دن سورج نکلنے سے بہت پہلے کوے واوا نے مجھے آ جگایا۔ پتہ نہیں اتنے بہت سے آدمیوں میں سے اس نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا۔ کہنے لگا:

"نکو چیپ! کیا تم کوے واوا کے ساتھ مچھلی کا شکار کھیلنے چلو گے؟"

جنگلی قبیلوں کی زبان میں "نکوچپ" ڈاڑھی والے آدمی کو کہتے ہیں ۔ اُس زمانے میں میرے چہرے پر لمبی ڈاڑھی تھی ۔ اس لیے جنگلی لوگ مجھے نکوچپ کہہ کر پکارتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ کومے دادا کی اتنی اچھی دعوت کو میں کیسے قبول نہ کرتا ۔ اور پھر کومے دادا تو شروع ہی سے مجھے بہت اچھا لگا تھا ۔

کومے دادا نے اپنی کینو (چھوٹی کشتی) پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی ۔ اس میں شکار کا سب سامان رکھا جا چکا تھا ۔ اس سامان میں ایک ہلکی پھلکی کمان اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تیر تھے ۔ پتلی چھڑ والا ایک مضبوط ہارپون تھا ۔ ہارپون کے دستے پر مضبوط لمبی ڈوری بندھی تھی ۔ کشتیاں تو آپ نے دیکھی ہوں گی ۔ کومے دادا



کی کشتی ان جیسی نہ تھی ۔ یہ تو کسی موٹے پیڑ کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی جاتی ہے ۔ اس میں کوئی جوڑ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے اس میں پانی آنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا ۔ لیکن ذرا سا توازن خراب ہونے سے کشتی ٹوٹ جانے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے ۔

کومے دادا نے مجھ سے کشتی کے اگلے حصّے پر بیٹھنے کو کہا ۔ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا تو وہ پچھلے حصّے پر جا بیٹھا اور چھوٹے چھوٹے چپوؤں کی مدد سے کینو کو بڑی ہوشیاری سے کھینے لگا ۔

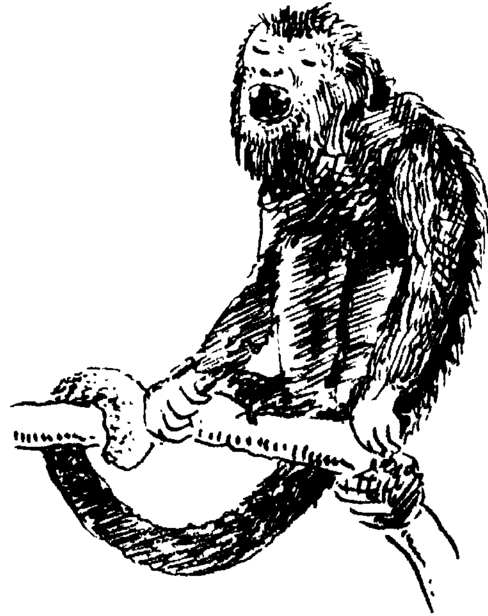
ایمزن کے اس استوائی علاقے میں صبح کی خنک ہوا بڑی خوش گوار معلوم ہو رہی تھی ۔ دریائے ایراگوئے کے دونوں کناروں پر جنگلی بیلوں میں گتھی ہوئی جھاڑیاں اور تناور درخت کھڑے تھے ۔ ایسا لگتا تھا جیسے دریا کے دونوں طرف دیو قامت دیواریں کھڑی ہوں ۔ ہماری کشتی دریا کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی ۔ بے شمار پرندوں کے چہچہانے اور طرح طرح کے جانوروں کی آوازوں سے سارا جنگل گونج رہا تھا ۔ ان آوازوں نے عجیب سحر رنگ

کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ان میں ایک آواز تو سب سے نمایاں تھی۔ یہ بہت اونچی، بہت بھاری اور بہت ڈراونی آواز تھی۔

کومے واآوا نے کہا: "یہ آواز بھونکنے والے بندر کی ہے۔"

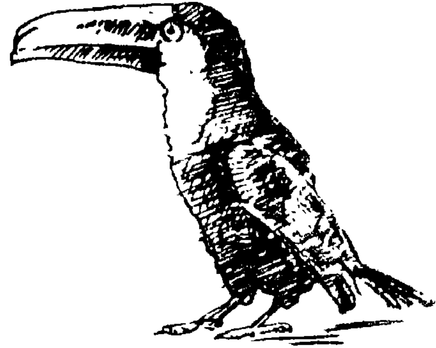
اور پھر وہ کینو کو اس طرف لے چلا جدھر سے یہ آواز آرہی تھی۔ اُس نے مجھ سے چپّو چلانے کو کہا اور خود پتوار کی مدد سے کینو کو بڑی خاموشی کے ساتھ دریا کے کنارے کے ایک پیڑ کے نیچے جا لگایا۔

"کہیے دیکھ رہے ہیں آپ اُسے؟ دیکھیے وہ۔ اُدھر دیکھیے۔ اُدھر ـــ وہ بیٹھا ہے......"



ایک بہت ہی اونچے پیڑ پر مجھے بھونکنے والے بندر کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ آواز سے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ شیر نہیں تو چیتے کے برابر تو ضرور ہوگا لیکن وہ تو بس ایک اوسط درجے کے کُتّے کے برابر تھا۔ کومے واآوا نے ایک عجیب بات بتائی۔ "جب یہ بندر بولنا چاہتا ہے تو گردن کی ایک تھیلی میں بہت سی ہوا بھر لیتا ہے۔ اور جب اس ہوا کو زور سے بھونکتا ہے تو اتنی زوردار اور ڈراونی آواز نکلتی ہے۔"

ہم اپنی کشتی میں بیٹھے ان بندروں کی اُچھل کُود کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اتنے میں پیڑ کے اوپر سے 'ٹاؤکن' کا ایک جوڑا اڑتا ہوا گزرا۔ ٹاؤکن ایک عجیب الخلقت پرندہ ہے۔ رنگ بالکل کالا۔ گردن کے چاروں طرف پیلے رنگ کا ایک حلقہ۔ اس کی سب سے دلچسپ اور انوکھی چیز اس کی پیلی چونچ ہے۔ یہ لمبائی اور چوڑائی میں اس کے بدن کے برابر ہوتی ہے۔ اُڑتے وقت ایسا لگتا ہے کہ اس کی لمبی چوڑی اور بھاری چونچ اس کو زمین



پرلا گرائے گی ۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ۔ وہ دوسرے پرندوں کی طرح بڑی آسانی سے اُڑتا پھرتا ہے۔

ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ کوے واوا نے اپنی کشتی پھر روک دی اور ایک بڑی اور گھنی جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ شروع شروع میں تو کچھ نہ دکھائی دیا۔ بہت غور سے دیکھا تو جھاڑی کے اندر بے شمار ننھی منی رنگ برنگی چڑیاں اُڑتی اور پھُدکتی نظر آئیں۔ ان میں سے بعض تو بس شہد کی بڑی مکھی جتنی تھیں ۔ ایک چڑیا کی چونچ اس کے جسم سے بھی زیادہ لمبی تھی ۔ ایک اور چڑیا کے سر پر سبز پروں کا خوبصورت تاج تھا۔ اُڑتے وقت چڑیاں اپنے پروں کو اس قدر تیزی سے چلا رہی تھیں کہ پر نظر نہ آتے تھے ۔ ان میں سے بعض ایک ہی جگہ رُکی ہوئی اُڑ رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُڑتے اُڑتے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کو رُک گئی ہوں ۔ ان چڑیوں کو قدرت کا ہیلی کوپٹر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ ان جھاڑیوں میں اتنی بہت سی اور اتنی رنگا رنگ چڑیاں تھیں اور اس طرح چہچہا رہی تھیں جیسے وہ اپنے کسی سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے اکٹھا ہوئی ہوں اور زور دار بحث میں مشغول ہوں ۔

اے لیجیے ۔ اچانک ساری کی ساری چڑیوں نے ایک دم چُپ سادھ لی ۔ جنگل کے دوسرے جانوروں کی آوازیں بھی رُک گئیں ۔ پورے جنگل میں سناٹا سا چھا گیا ۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو ۔ بس ایک درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے دو بندر آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے ۔

" ہمیں یہاں سے فوراً چل دینا چاہیے جنگل کے جانوروں اور پرندوں کی خاموشی بتا رہی ہے کہ کوئی خطرہ ہے ۔" کوے واوا نے کہا ۔

(باقی آئندہ)



جناب محمد اسحاق، محمدیہ ہائی اسکول (بمبئی)





ہماری پارلیمنٹ

معمول کے مطابق اس سال بھی ہماری اسکول کی پارلیمنٹ کے انتخاب پرجوش طریقے پر عمل میں آئے، ان انتخابات میں، ریڈ، بلو، گرین اور یلو ہاؤسز نے پُرجوش طریقے پر حصہ لیا۔ یلو ہاؤس کے امیدوار تعداد میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے پھر بھی انھیں مکمل اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ انھوں نے بلو ہاؤس کو اپنے ساتھ ملاکر مشترک حکومت قائم کی۔ اسی طرح گرین ہاؤس اور ریڈ ہاؤس کے اشتراک سے مضبوط مخالف پارٹی بن گئی۔

اب کابینہ یا وزارت کے نام بھی سنیئے:-

۱۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ	محمد اسحاق شیخ داؤد	جماعت دہم
۲۔ وزیر ثقافت	ابوبکر محمد یوسف ملّا	جماعت دہم
۳۔ وزیر مالیات	رحمان الٰہی سبحان الٰہی	جماعت ہفتم
۴۔ وزیر تعلیم وصحت	سید سیف اللہ سید بشیر احمد	جماعت ہشتم

۵. وزیر نشر و اشاعت		محمد سلیم عیسیٰ کھتری		جماعت ہفتم
۶. وزیر کھیل		شیخ اطہر حسین شیخ محمد حسین		جماعت ہفتم
۷. اسپیکر		محمد اقبال اسمٰعیل دلوی		جماعت دہم

اسکول کے اندرونی معاملات میں انتظام کی بہتری کے خیال سے وزیر اعظم ہی نے وزیر داخلہ کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں اسکول کا اپنا میدان نہ ہونے کی وجہ سے طلباء کو میدان میں جاتے وقت راستہ پار کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اس کے پیش نظر وزارتِ داخلہ کے تحت، آر، ایس، پی کا محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسکول کے داخلی نظام کی سہولت کے لیے وزیر داخلہ کے تحت افسروں (Prefect) کا تقرر کیا گیا۔

اس سال وزارت بننے کے فوراً بعد وزیر نشر و اشاعت نے نوٹس بورڈ پر ملکی خبریں اور جملہ کارروائیوں کو طلباء تک پہنچانے کا کام شروع کر دیا ہے، اسی وزارت کے تحت دیواری اخبار کا کام بھی ہے یہ دیواری اخبار "تنویر" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ حسب سابق وزارت کھیل کے تحت سالانہ اسکول اسپورٹس کا انتظام بمبئی کے تاریخی میدان گوالیا ٹینک پر کیا گیا۔ طلباء نے اسپورٹس میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور کھیل کے میدان میں اپنی دلچسپیوں کا شاندار طریقے پر مظاہرہ کیا۔ کامیاب طلباء کو سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات میں انعام دیے جائیں گے۔

وزارت تعلیم نے اسکول میگزین کی تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔ توقع ہے کہ سالانہ امتحانات سے پہلے ہی رسالہ چھپ جائے گا۔ اس وزارت نے اسکول کی لائبریری کے لیے کتابیں، رسالے اور اچھے روزنامے فراہم کر کے طلباء میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کا اہم کام اپنے ذمے لیا ہے۔

وزیر برائے ثقافتی امور نے ۲۰ دسمبر کو منعقد ہونے والے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کی تیاریاں شروع کر دی ہیں جس میں ڈرامے، لوک گیت اور لوک ناچ پیش کیے جائیں گے۔

گذشتہ سال یوم تقسیم انعامات کے موقعے پر ریاست مہاراشٹر کے نائب وزیر تعلیم ڈاکٹر کیلاش اور بمبئی کے میئر جناب اسحاق بھائی بندوق والا نے صدرِ جلسہ اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جلسے میں شرکت کی تھی، توقع ہے کہ اس سال بھی ریاست مہاراشٹر ہی کے کسی وزیر کے ہاتھوں انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔

جناب منیر الحسن

پیام عید



خوش ہو کے عید کی ہم خوشیوں کو یوں منائیں
دل سے ہر ایک کو ہم اپنے گلے لگائیں
بھولیں نہ اس کو ہرگز ہم عید کی خوشی میں

اتنا ہو عزم پیدا کردار میں ہمارے
اس کی مدد کو دوڑیں جو بھی ہمیں پکارے
بھولیں نہ اس کو ہرگز ہم عید کی خوشی میں

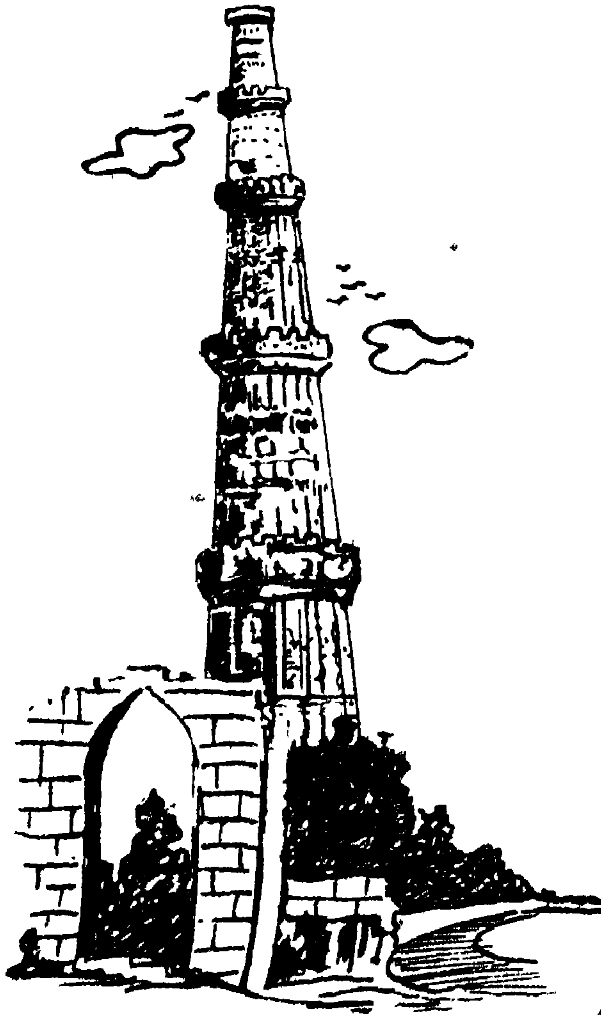
اس عمر میں ہم اپنی یہ کام کر دکھائیں
یعنی کہ زندگی کو ہم کام کا بنائیں
بھولیں نہ اس کو ہرگز ہم عید کی خوشی میں

انسانیت کی خدمت شیوہ ہو عام اپنا
خدمت میں خلق کی ہو اُونچا مقام اپنا
بھولیں نہ اس کو ہرگز ہم عید کی خوشی میں

جناب ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن

قطب مینار



دِلّی ہمارے دیس ہندوستان کا دل ہے۔ سینکڑوں برس پہلے بھی یہ ہندوستان کی راجدھانی رہی ہے اور آج بھی اسے ہمارے دیس کی راجدھانی ہونے کی عزت حاصل ہے۔

آج سے سینکڑوں برس پہلے دلّی میں بڑے بڑے راجاؤں، سلطانوں اور شہنشاہوں کا راج تھا۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے دلّی کے نئے نئے شہر بسائے۔ ان شہروں میں اچھے اچھے محل، قلعے، مینار، مندر اور مسجدیں بنوائیں۔ ان بادشاہوں اور سلطانوں کا دور تو گزر گیا لیکن ان کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں آج بھی دلّی میں موجود ہیں۔ ان ہی میں

ایک قطب مینار ہے جسے شہاب الدین محمد غوری کے ایک غلام سپہ سالار قطب الدین نے بنوانا شروع کیا تھا اور پھر اس کے جانشین شمس الدین التمش نے اسے ۱۲۲۰ء میں پورا کرایا۔

قطب مینار کو دیکھنے سے آپ کے

دل میں سوال پیدا ہوگا کہ اسے بنانے کا سبب کیا تھا؟ کیا یہ عمارت محض ایک یادگار ہے جو ایک بادشاہ نے اپنی خوشی کے لیے بنائی یا اس کا کوئی مقصد بھی تھا؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اذان دینے کا منارہ تھا اس لیے کہ یہ مسجد قوّت الاسلام کے ایک کونے میں ہے لیکن اتنی اُونچائی سے اذان دی جائے تو آواز نیچے تک مشکل ہی سے پہنچے گی۔ زیادہ صحیح خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قطب مینار کو "منارۂ فتح" کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا اس لیے کہ اسی طرح کے فتح کے منارے غزنی اور غور میں بھی ہیں۔

قطب مینار دُنیا کے مشہور ترین میناروں میں سے ہے، اس کی بلندی ۲۳۴ فٹ ہے اور اس سے زیادہ بلند پتھر کا کوئی تنہا مینار نہیں ہے اس کے سامنے کھڑا ہوا انسان بالشتیہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بنانے میں سُرخ اور سفید پتھر کا استعمال کیا گیا ہے۔ مینار شکل گاجر جیسی ہے یعنی نیچے چوڑی ہے اور جتنا اُوپر جائیے پتلی ہوتی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کسی زمانے میں قطب مینار کی سات منزلیں تھیں لیکن اب تو صرف پانچ باقی ہیں۔ ان میں سے پہلی قطب الدین ایبک نے اور باقی التمش نے بنوائیں۔ مگر مینار کے اُوپر کی دو منزلوں کی بناوٹ اور سنگ مرمر کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں نئے سرے سے بنوایا گیا۔ فیروزشاہ تغلق کے عہد میں اُوپر کی دو منزلوں کو ایک زلزلے سے نقصان پہنچ گیا تھا، فیروزشاہ نے ان دونوں منزلوں کی مرمّت کروائی اور اُوپر ایک چھوٹی سی چھتری بڑھا دی۔ ۱۵۰۵ء میں سکندر لودی نے اس کی دوبارہ مرمّت کی۔ ۱۸۰۳ء میں مینار کو پھر نقصان پہنچا۔ ایک انگریز انجینیر میجر اسمتھ نے اس کی مرمّت کی اور فیروزشاہ کی چھتری کی جگہ اس نے اپنی بنائی ہوئی ایک چھتری اُوپر چڑھا دی لیکن اس چھتری کی بناوٹ قطب مینار کی بناوٹ سے مختلف تھی اس لیے ۱۸۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اُسے ہٹا دیا اور اب وہ قریب ہی مینار

کے پاس باغ میں رکھی ہے۔

قطب مینار کی ہر منزل کے ختم پر چاروں طرف ایک خوبصورت جھروکا بنا ہوا ہے اور سب سے اُوپر پیتل کا کٹہرا ہے تاکہ جو لوگ اُوپر جائیں وہ گِر نہ جائیں۔ پہلی منزل میں باہر کی طرف کو اُوپر سے نیچے ایک لکیر گول اور ایک کمرخ کی طرح ہے۔ دوسری منزل میں سب لکیریں گول ہیں، تیسری میں پھر سب کمرخی، چوتھی اور پانچویں منزلیں سادی ہیں۔ مینار کے باہر پتھر پر بڑے اچھے اچھے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں اور قرآن شریف کی آیتیں ایسی خوبصورتی سے کھودی گئی ہیں جیسے کسی خوش نویس نے کاغذ پر لکھ دی ہوں۔ قطب مینار کی دیواریں باہر کی جانب ڈھلوان ہیں تاکہ مینار زیادہ مضبوط ہو۔ یہ ڈھلان اتنا زیادہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اُوپر سے کودے تو وہ سیدھا زمین پر ہرگز نہیں گر سکتا بلکہ پہلے دیواروں سے ٹکرائے گا۔ اگر قطب مینار کو غور کے ساتھ کچھ فاصلے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مینار بالکل سیدھا نہیں کھڑا ہے بلکہ ایک طرف ذرا سا جُھکا ہوا ہے۔ یہ مختلف زلزلوں کا اثر ہے۔ آج کل محکمۂ آثارِ قدیمہ اس کی بڑی نگرانی کرتا ہے اور دیواریں دراڑ پڑتے ہی اس کی مرمّت کر دی جاتی ہے۔

قطب مینار کے اُوپر چڑھنے کے لیے اس کے اندر چکّردار سیڑھیاں بنی ہیں جن کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ آئیے اب ان سیڑھیوں سے مینار کے اُوپر چڑھیں۔ لیکن اُوپر چڑھتے وقت یہ خیال رہے کہ سیڑھیوں پر سے کہیں آپ کا پاؤں نہ پھسل جائے اس لیے کہ کثرتِ استعمال سے یہ بہت کچھ گھس گئی ہیں لیکن کچھ دنوں سے قطب مینار کے اندر بجلی کی روشنی کا انتظام ہو جانے سے یہ ڈر کم ہو گیا ہے۔ آپ سانس لینے کے لیے ہر منزل کے جھروکے پر ذرا دیر کے لیے رُک سکتے ہیں لیکن یہاں سے ذرا نیچے کے مناظر پر بھی نظر ڈالتے چلیے—

یہ لیجیے آپ آخرکار اُوپر پہنچ ہی گئے۔ آپ کا تمام پسینہ اُوپر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے سوکھ جائے گا۔ اب ذرا چاروں طرف گھوم کر نیچے کی طرف دیکھیے۔ اتنی اُونچائی سے مسجد قوت الاسلام اور اس کے آس پاس کی عمارتیں چھوٹے چھوٹے گھروندے معلوم ہوتے ہیں۔ نیچے کھڑے ہوئے انسان بونے اور پارک میں کھڑی ہوئی موٹریں کھلونے سی لگتی ہیں۔ آپ کو مسجد قوت الاسلام کے ایک طرف ایک ادھورا مینار بھی نظر آجائے گا جو علاءالدین خلجی نے بنوانا شروع کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ علائی مینار کو قطب مینار سے دوگنا بنوائے مگر بے وقت کی موت نے اس کام کو پورا نہ ہونے دیا اور بس ایک منزل ہی بن کر کام رُک گیا۔

مسجد قوت الاسلام کے ایک کونے میں آپ کو سلطان التمش کا مقبرہ نظر آئے گا جو لال پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس مقبرہ کا شمار ترکوں کے خوبصورت اور سب سے پُرانے مقبروں میں کیا جاتا ہے۔ اس مقبرہ کی اندرونی دیواروں پر بہت خوبصورت کام کیا گیا ہے مگر اس مقبرہ پر گنبد کا نہ ہونا ایک پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ مسجد کے دوسرے کونے پر نظر ڈالیے تو علاالدین خلجی کا سیدھا سادا سا مقبرہ اور مدرسہ نظر آئے گا لیکن اس سے ذرا فاصلے پر علائی دروازہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی شکل نعل نما ہے اور فنی مہارت کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوبصورت دروازہ دہلی میں نہیں ہے۔ یہ دروازہ علاالدین خلجی نے مسجد میں داخل ہونے کے لیے بنوایا تھا۔ صبح کے سورج کی کرنیں جب اس دروازہ کے رنگین پتھروں پر پڑتی ہیں تو یہ جواہرات کے ایک جڑاؤ صندوقچے کی طرح جھم جھم چمکنے لگتا ہے۔

غرض قطب مینار کیا ہے دہلی کے شہر کے پاس یوں کھڑا ہے جیسے چوکیدار کھڑا حفاظت کر رہا ہو۔ اس نے سینکڑوں سردیاں، گرمیاں اور برساتیں دیکھی ہیں مگر اس کی مضبوطی اور استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

محترمہ شمیم ملک (آگرہ)

چھوٹا بھائی



شہلا خیر سے ساتویں میں تھی کہ گھر میں ایک اور مہمان تشریف لائے۔ سارے گھر پر خوشی چھا گئی... امّی، ابّا، دادی اماں، چچا اور پھپیاں سبھی تو جیسے خوشی کے ساگر میں ڈوب گئے.... پر شہلا کو کچھ ایسا لگا جیسے منّے نے اِس گھر میں آکر اُس کی ساری خوشیاں اور محبتیں چھین لیں.... کل تک تو وہ سب کے ہاتھوں کا کھلونا تھی۔ سب کے گلے کا ہار تھی۔ سب کی گود اس کے لیے پالنا تھی... پر اب.... جیسے اسے سب بھول گئے... معصوم سا بھولا بھولا گڈا اسے اپنا منہ چڑاتا ہوا لگتا تھا۔ نہ جانے کیا اچھا لگتا ہے ممی کو! ہر وقت تو روتا رہتا ہے! مگر اس کی ہر ایک بات سب کے دل کو بھاتی ہے... وہ رو کیا دیا بڑی کرامت کر دی.... امّی کا تو سارا دھیان اسی پر ہے... مجھ سے تو اب ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتیں... ہاں کبھی کبھی... ذرا منے کا گدّا اٹھانا، تولیا اٹھانا... بس یہی حکم دیتی رہتی ہیں اِن کے لیے تو اب مُنّا ہی سب کچھ ہے۔

اور جب مدرسہ کھلنے کا وقت آیا تو.... تو اس سے کہا گیا۔ "بس اب آپ کے کھیلنے کے دن ختم ہوئے اسکول میں پڑھنے جایا کیجیے...." کل تک تو پھپیاں اور دادی کہتی تھیں..."ارے

بھی کھیلنے بھی دو .... عمر پڑی ہے پڑھنے کی"۔ لیکن یہ منّا کیا آیا کہ کھیلنے کے دن بھی ختم ہو گئے۔

شہلا کو محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر پہاڑ رکھ دیا گیا ہے... اسکول وقت پر جانے کے لیے ہر روز صبح چھ بجے اٹھنا پڑتا، نہانا پڑتا اور جلدی کھانا پڑتا.... ہائے تو کیا اس منّے نے دادی اماں پر بھی جادو کر دیا ہے؟ پہلے تو وہ تھپکیاں دے دے کر سلاتی تھیں یہ منّا کیا آیا کہ دادی اماں سب کچھ بھول گئیں۔

منّا صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھتا اور کبوتروں کی طرح غٹر غوں غٹر غوں کرنے لگتا... سب اس کے پلنگ کے چاروں طرف جمع ہو جاتے، قہقہے لگاتے ... اس کے ننھے منے ہاتھ پیر سے کھیلتے .... اور کہتے..."انسان بڑا ہو جاتا ہے ... اس میں مکّاریاں اور فریب آجاتا ہے.... منّے کو دیکھو کتنا معصوم ہے .... کتنی صبح اٹھتا ہے ..." ہونھ ... تو کیا ہم صبح نہیں اٹھتے تھے ... خود ہی تو یہ لوگ ہمیں تھپکیاں دے دے کر سُلاتے تھے ... سردی ہے تو ٹھنڈ لگ جائے گی... گرمی ہے تو رات چھوٹی ہوتی ہے۔

پھر دسمبر کا مہینہ آیا... شہلا کی سالگرہ ہوئی... دعوت کا انتظام کیا گیا.... لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس بار کی سالگرہ پھیکی پھیکی ہے..... پہلے جیسی دھوم دھام نہیں... یہ سب منّے کی وجہ سے تو ہے۔

ہونھ "تحفہ"... یہ چچا کا ہے ، اور یہ پھپی کا... پہلے انھوں نے پانچ روپیہ والی سوتی جاگتی گڑیا دی تھی... اور اب ہم بڑے ہو گئے ہیں... بس یہ ہے فراک کا کپڑا۔

دعوت کے بعد سب مہمان جا چکے تو وہ ان کے دیے ہوئے کھلونوں سے کھیلنے لگی... اتنے میں امی کمرے میں آگئیں۔ انھوں نے کھلونے چھین کر رکھ دیے... "بس اب انھیں منّے کے لیے رکھ دو... تم اب بڑی ہو گئیں۔ کیا عمر بھر موٹر سے کھیلو گی اور غبارے اڑاتی رہو گی"!

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے... سردی کی رات میں وہ باہر جا کر بیٹھ گئی.... سب سے خفا ہو کر... آخر حد

ہوتی ہے صبر کی ... وہ سال بھر سے سب کچھ دیکھ رہی ہے ... کیا وہ چابی والی موٹر نہیں چلا سکتی ... وہ رات بھر جاڑے میں سکڑتی رہی ... اسے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا... کب ہوا۔

جب صبح اسے ہوش آیا ... تو اس نے دیکھا ... امّی اس کے پاس لیٹی تھیں ....

سارے گھر کا ماحول اس کی بیماری کی وجہ سے بدلا ہوا تھا ... منّے کے رونے کی آواز آرہی تھی ... امّی آیا کو ڈانٹ رہی تھیں۔ "میں شہلا کو نہیں چھوڑ سکتی ... اس کو تیز بخار ہے ... شور مت مچاؤ ... منّے کو دودھ دے دو ... رلاؤ مت ..." شہلا نے دیکھا امّی کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار تھے ... وہ محبت سے اس کا سر دبا رہی تھیں اور سب لوگ بھی پریشان تھے۔ نہ جانے کس جذبے سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ... امّی نے اسے سینے سے لگا لیا

"کیا بات ہے بیٹی ... رات کو تم باہر آنگن میں بے ہوش کیوں پڑی تھیں"۔

"سچ مچ منّا چھوٹا ہے امّی .... معصوم ہے ... ہم بڑے ہیں ... اس کی بڑی بہن ہیں۔ وہ بیچارہ خود دودھ بھی نہیں پی سکتا ..."

اس کے بلکنے کی آواز اس کے کانوں کو تکلیف پہنچانے لگی .... اس کا دل دُکھنے لگا ... وہ روتے روتے بولی ..." ممّی منّے کو دودھ پلا دیجیے ... میں اب اچھی ہوں۔ میں تو بڑی ہوں ممّی ... وہ مجھے باجی کہے گا نا؟ ہماری گڑیا اسے کھیلنے کے لیے دے دیجیے"۔

"اچھا، میری بچّی اچھا میں چلی جاؤں گی ... لیکن تو یہ تو بتا دے کہ باہر پڑی کیوں تھی ... کس بات پر خفا تھی ..." ممّی نے اسے سینے سے اور چپٹا لیا ... "تو بھی تو ابھی معصوم ہے بیٹی ناسمجھ ہے۔ جب تک تیرا بخار کم نہ ہوگا میں نہیں ہٹوں گی"۔

جناب سید رفیع الدین قادری

سُلطان محمدؐ قلی قطب شاہ



حیدر آباد دکن کا نام آپ نے ضرور سُنا ہوگا۔ بہت دنوں تک یہ آصف جاہی خاندان کی ریاست کا دار السلطنت رہا ہے۔ اس ریاست نے ہماری اردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اردو یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کے نام سے سب سے پہلے یہیں قائم ہوئی۔ یہیں وہ دار الترجمہ قائم ہوا جس نے مختلف زبانوں کی اَنگنت علمی کتابوں کے ترجمے اردو میں شائع کیے۔ آزادی ملنے کے بعد آندھرا پردیش کے نام سے نئی ریاست بنی تو اسی شہر کو اس ریاست کی راج دھانی کے لیے موزوں سمجھا گیا۔

آپ شاید یہ سُن کر تعجب کریں کہ جس الوالعزم بادشاہ نے اس شہر کو بسایا وہ خود اس زبان کا بہت بڑا شاعر تھا اور ساری عمر اردو زبان کی خدمت کرتا رہا۔

اس بادشاہ کا نام محمد قلی قطب شاہ تھا۔ گول کنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا یہ پانچواں بادشاہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا پندرہ سال (۱۵۸۰ء) کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور صرف ۴۷ کی عمر میں (۱۶۱۱ء) انتقال کر گیا۔

لیکن اسی مختصر مدت میں اس نے ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک اس کی یاد دلاتی رہیں گی۔ محمد قلی قطب شاہ کی راج دھانی گول کنڈہ تھی۔ سُلطان محمد قلی نے آج سے ۳۷۳ سال پہلے ۱۵۹۱ء میں سرکاری طور پر ایک شاندار شہر اپنی ملکہ بھاگ متی (حیدر محل) کے نام سے بسایا اور شہر حیدرآباد نام رکھا۔

حیدرآباد کی بنیاد چارمینار سے رکھی جو آج بھی حیدرآباد کی سب سے خوبصورت اور بڑی عمارت ہے۔ اس عمارت کی اونچائی ۱۸۹ فٹ ہے اس کے اوپر ایک مسجد اور ایک مندر بنایا گیا۔

چارمینار پر مسجد اور مندر کا بنایا جانا بادشاہ کے انصاف اور ہندو مسلم ایکتا کی کبھی نہ بھلائی جانے والی حقیقت سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چارمینار کی تعمیر میں تین لاکھ خرچ آیا۔ چارمینار کے ساتھ ہی اس نئے شہر میں چار بازار اور چودہ دکانیں بھی بنائی گئیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے جس چاؤ، جس محبت سے حیدرآباد بسایا اس کا اندازہ خود اس کے کلام سے ہوتا ہے۔ ایک جگہ اپنی نظم "مناجات" میں خدا سے جہاں بہت سی باتوں کی دعا کرتا ہے وہیں اپنے شہر کی آبادی کے لیے دعا کرتا ہے۔

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع
(مچھلی)

اے خدا! تو میرے شہر کو لوگوں سے اس طرح بھراپُرا رکھ جس طرح تونے سمندروں کو مچھلیوں سے بھر دیا۔

سُلطان محمد قلی ہندوستان کے بادشاہ اکبر اعظم کا ہم عصر تھا۔ اکبر نے قومی ایکتا قائم رکھنے کے لیے راجپوت شہزادی سے شادی کی اور محمد قلی نے اسی مقصد کی خاطر ایک ہندو شہزادی سے شادی کی۔ محمد قلی کے درباریوں اور نوکروں میں ہمیشہ بہت سے ہندو کام کرتے تھے اور ان میں سے کچھ تو اپنی عقلمندی ہوشیاری اور بہادری کے سبب اونچے درجوں پر پہنچ گئے تھے۔ بادشاہ کو ان پر پورا

بھروسا تھا۔ اور ان کی رائے سے بڑے
بڑے مسلمان امیر اور سپہ سالار تک بدل
دیے جاتے تھے۔ محمد قلی اپنی ہندو رعایا اور
راجاؤں کے ساتھ ہر وقت پریم اور محبت
کا برتاؤ کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ
ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی بھید بھاؤ
ہی نہیں کرتا تھا۔

سلطان محمد قلی نیک دل، سخی اور فیاض
س نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ
ارتوں کی تعمیر اور عوام کی بھلائی میں
کی۔ اس کے دربار کے خاص انجینئر میر
الب نے لکھا ہے کہ لگ بھگ ستّر لاکھ
پے عمارتوں کی تعمیر میں خرچ ہوئے۔

ہر سال محرم میں محمد قلی ساٹھ ہزار
پے مجاوروں اور خادموں کے وظیفوں
ایام عاشورہ کے پکوان پر خرچ کیا
تا تھا۔

اس نے اپنی آخری آرام گاہ میں عام
اسلامی گنبدوں سے ہٹ کر ایک ایسی وضع
کا گنبد بنایا ہے جس کا نچلا حصّہ مندروں
ا ہم شکل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کے علاوہ تلگو
اور فارسی میں بھی شاعری کرتا تھا مگر اس کا
اردو کلام ہی محفوظ رہا۔ (محمد قلی کا ضخیم کلیات
ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع
کیا ہے)۔

محمد قلی نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں
پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی
عوام کے رسم و رواج، رہن سہن پر بڑی
عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ بادشاہ ہونے
کے علاوہ صحیح معنوں میں عوامی شاعر بھی تھا۔
وہ زندگی کے عوامی پہلوؤں پر ان ہی کی
طرح نظر ڈالتا اور ان ہی کی طرح دلچسپی لیتا
تھا۔

ہندوستان کے موسموں، برسات، گرمی
اور سردی پر بھی اس نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔
خاص کر برسات پر۔ ہندوستان کے موسموں
اور تہواروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے
رسم و رواج اور کھیل کود میں بھی ذاتی
دلچسپی لیتا تھا۔ ان سے متعلق اپنی نظموں
میں دلچسپ تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔ محمد قلی
ابتدا ہی سے بہت خوش رو اور چھریرے بدن

کا تھا۔ اس کا رنگ سفید، بال سیاہ، دہانہ چھوٹا اور آنکھیں بڑی تھیں۔ محمد قلی کی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

محمد قلی کئی تقریبیں مناتا تھا ان میں جشن میلادالنبی، شب برات، عید، رمضان، بقرعید۔ جشن نوروز اور بسنت کے علاوہ اپنی سالگرہ کے موقع پر خیر و خیرات کرتا تھا۔ ان تہواروں میں خود بھی شریک ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں محرم کی تقریبوں کی ابتدا محمد قلی ہی نے کی تھی۔

ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "محمد قلی قطب شاہ" میں لکھا ہے "وہ اردو کا پہلا محسن تھا اور اس نے زبان کی ایسے وقت مدد کی جبکہ وہ اس کی محتاج تھی۔ محمد قلی نے اردو پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر سے نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی قدر کی بلکہ خود بھی اردو کا شیدائی تھا۔ اس نے اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے گویا بارہ سال کی عمر کے بعد سے اوسطاً ہر روز اس نے چار پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔"

اس کا اردو کا کلام اس کی زندگی ہی میں بہت مقبول ہوا تھا اور اب تک مشہور ہے چنانچہ آج بھی دیہاتی عورتیں مختلف تقریبوں میں اس کے گیت گاتی ہیں۔

یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آج بھی اس سے اتنی عقیدت ہے کہ اب بھی اس کی گنبد پر جا کر منت مانگتے ہیں۔

اس کی ان ہی خوبیوں کے اعتراف میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ گذشتہ چھ سال سے ۱۱ جنوری کو منایا جاتا ہے۔



محمد قلی

وہ پہلا قطب شاہِ عالی مقام ... ہے نام
اُسی نے رکھی اِس کی بُنیاد ہے ... آباد ہے
یہ ظاہر ہے خود چار مینار سے ... پیار سے
دُعا اس کو دیتی ہے ہر آتما ... دھرماتما
اُسے راج کرنے کا آتا تھا ڈھب — بڑے خوش تھے ہندو مسلمان سب
وہ دکھ درد سب کا سمجھتا رہا — وہ دونوں کو اپنا سمجھتا رہا
غزل بھی کہی، مرثیہ بھی کہا — وہ اردو کی بھاشا کا شاعر بھی تھا
اُسی سے چلا قطب شاہوں کا راج — مناتی ہے دن جس کا جنتا بھی آج

دماغ اور دل کی یہ پہچان ہے
یہ سب زورؔ[1] صاحب کا احسان ہے

---

[1] ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی طرف اشارہ ہے جن کی کوششوں سے حیدرآباد میں ہر سال جنوری میں یومِ محمد قلی منایا جاتا ہے۔

جناب بدرالدین صاحب استاد مدرسہ ابتدائی



آگرہ کا تعلیمی سفر

دسمبر کے "پیام تعلیم" میں آپ نے جامعہ کے تعلیمی میلے کا حال پڑھا ہوگا۔ اس سال میلے میں مدرسہ ابتدائی کی طرف سے اقبال منزل اور حالی منزل کے طلباء نے ٹی اسٹال کھولا تھا۔

جب ٹی اسٹال کھولا گیا تھا اسی وقت ارادہ تھا کہ اس کے نفع سے آگرے کا تعلیمی سفر کیا جائے گا۔

چنانچہ اس ارادے کے مطابق ہم نے آگرے کا پروگرام بنایا۔ ۱۸ نومبر کی تاریخ طے کی اور انتظامات شروع کر دیے۔

جوں جوں تاریخ قریب آتی گئی لڑکوں کا جوش و خروش بڑھتا گیا، ہر لڑکا اپنے کپڑے، بستر اور اٹیچی تیار کرتا نظر آیا جیسے عید کی تیاری ہو رہی ہو۔

غرض تاریخ آگئی اور ۱۸ نومبر ۱۹۶۴ء کی رات کو ۸ بجے ساٹھ طلباء چار استاد اور دو ملازموں کا قافلہ جامعہ لاری سے اسٹیشن پہنچا۔ کنسیشن ٹکٹ پہلے ہی سے خرید لیے گئے تھے اور رات کو ۱۱ بج کر ۵۰ منٹ پر دہلی جھانسی پسینجر سے روانہ ہونا تھا۔

سب لوگ ۱۲ نمبر پلیٹ فارم پر سامان کے قریب بیٹھ گئے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار کی گھڑیاں گزر رہی تھیں کہ معلوم ہوا۔ ہماری گاڑی جو پونے گیارہ بجے آنے والی تھی اب ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی ہے۔

یہ خبر ایسی افسوس ناک تھی جس نے لڑکوں کو بھی لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

بہت سے بچّے بندھے ہوئے بستروں پر سو گئے، کچھ پلیٹ فارم پر مٹر گشت لگانے لگے۔

استادوں نے چائے کے گھونٹ لے لے کر وقت گزارنا شروع کیا، گاڑی اور لیٹ ہو گئی اور خدا خدا کر کے سوا بجے پلیٹ فارم پر آئی۔

اب گاڑی میں جگہ کی تلاش شروع ہوئی بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم پر دشمن نے حملہ کر دیا ہے اور ہم لوگ سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔

بڑی کوشش کے بعد ایک ڈبّا ملا جس میں آدھا سامان رکھا اور آدھے لڑکوں کو بٹھا دیا دوسرے ڈبّہ میں دو استادوں کے ساتھ باقی بچے سوار ہوئے۔

گاڑی چلی تو کچھ جان میں جان آئی اور ذرا سا اطمینان کا سانس لیا، مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ ابھی ہمارے صبر کا امتحان باقی ہے۔

نئی دہلی کے اسٹیشن سے کچھ ایسی سواریاں آئیں جن کی آمد ہمارے لیے ایک مصیبت سے کم نہ تھی۔

بہت روکنے کے باوجود کئی جوان کھڑکیوں سے اندر کود آئے اور بچوّں کی ٹانگوں پر چڑھتے چڑھاتے مع سامان کے سوار ہو گئے۔

یہ مصیبت بھی بھری اور سفر جاری رہا۔

صبح دس بجے کے قریب متھرا کا اسٹیشن آیا۔ یہاں سب لوگوں نے پیڑوں اور پکوڑیوں سے ناشتہ کیا، کیلے کھائے اور آگے روانہ ہو گئے۔

دوپہر پونے بارہ بجے کے قریب آگرہ کے ایک اسٹیشن راجہ کی منڈی پر اترے۔

اترنے کا منظر بھی پُر لطف رہا۔ بات یہ ہوئی کہ سارے اسٹیشنوں پر تو گاڑی قریب قریب پندرہ بیس منٹ رکتی آئی مگر راجہ کی منڈی

پر جہاں ہمیں اُترنا تھا صرف ۲ منٹ رکی۔

ہم سب لوگوں نے بڑی تیزی سے سامان اُتارا مگر آخری سامان اُتر رہا تھا کہ گاڑی نے سیٹی دیدی اور ہمارے ایک ملازم اللہ دیا کے ایک پیر کا جوتا گاڑی میں رہ گیا۔

بے چارے اللہ دیا نے بڑی کوشش کی اور گاڑی کے پیچھے بہت دور تک بھاگتے رہے، بھاگتے جاتے اور چیختے جاتے "میرا جوتا، میرا جوتا ....." مگر جوتا نہ ملنا تھا نہ ملا اور آخر کو ہمیشہ کے لیے جدائی کا داغ دے گیا۔

خیر صاحب جیسے تیسے اسٹیشن پر اُترے یہاں پہلے سے احمدیہ حنفیہ اسکول سے آئے ہوئے ایک نمائندے رمضانی صاحب موجود تھے۔ ہمیں اسی اسکول میں ٹھہرنا تھا۔

ان کے ہمراہ ہم لوگ باہر آئے اور سارا سامان تانگوں میں بھر کر بھیج دیا خود پیدل مارچ کرتے ہوئے سب بچوں کے ساتھ احمدیہ حنفیہ اسکول محلہ ڈھولی کھار پہنچے۔

جاتے ہی اسکول کے صدر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ مگر ایسے اخلاق سے ملے جیسے پرانی جان پہچان ہو۔

ملاقات کے بعد صدر صاحب نے فرمایا اسکول کے چار کمرے آپ لوگوں کے لیے خالی کر دیے گئے ہیں مگر پہلے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لیجیے، کھانا تیار ہے۔ اس کے بعد آرام کیجیے گا۔"

تمام بچے تھوڑی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئے اور کھانا شروع ہو گیا۔ اسکول کے صدر صاحب کے اخلاق اور خلوص و محبت کو ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔

جوں ہی بچے کھانے بیٹھے صدر صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے کھانا نکالنا شروع کیا اور پھر جب تک سب کھا کر فارغ نہ ہو گئے برابر آکر پوچھتے رہے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، بے تکلف ہو کر کھائیے۔

کھانے کے بعد ہم لوگوں نے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر تاج محل چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

پہلی بار تاج محل کا دیدار

۱۹ر نومبر کی شام کو ہم لوگ کچھ تانگوں

میں اور کچھ بس سے سوار ہو کر تاج محل پہنچ گئے۔

مغرب کے بعد چودھویں رات کا چاند نکلنا شروع ہوا اور تاج محل پر بہار آئی۔ واقعی اس منظر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تاج محل کا ہر رنگ روپ بے مثال ہے۔

ہم لوگ رات کے نو بجے تک وہاں رہے، خوب تفریح کی، ایک مختصر سی بیت بازی کی محفل بھی ہوئی جسے وہاں آنے والے لوگوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور ہر طالب علم کے شعر پر داد دی۔

خاص طور پر یوسف حسین (ششم) رفیق احمد (انجم) کے اشعار پسند کیے گئے۔

ساڑھے نو بجے ہم لوگ قیام گاہ واپس آ گئے۔

فتح پور سیکری

۲۰ر نومبر کی صبح فتح پور سیکری چلنے کا پروگرام تھا، ہم لوگوں نے ایک لاری صبح ہی ۹۰ روپے کرائے پر طے کر لی۔ فتح پور سیکری یہاں سے تقریباً ۲۵ میل دور ہے اور یہ سفر لاری ہی سے آسانی سے ہو سکتا تھا۔

بہرحال ناشتے کے بعد سب لڑکے خوشی خوشی لاری پر سوار ہوئے اور گیارہ بجے فتح پور سیکری پہنچے۔

سیکری کی شاندار عمارتیں زیادہ تر اکبر کی بنوائی ہوئی ہیں۔

یہاں ہم نے ایک گائڈ کو ساتھ لیا جس نے کوئی ایک گھنٹے میں سب عمارتوں کے حالات تفصیل سے بتائے۔

یہاں کی عمارتوں میں پنج محل، بلند دروازہ اور سلیم چشتیؒ کا مزار خاص عمارتیں ہیں۔ بلند دروازہ کی اونچائی ۱۷۶ فٹ ہے۔ کہتے ہیں یہ ایشیا کا سب سے اونچا دروازہ ہے۔

اسی طرح سلیم چشتیؒ کا مزار بھی سیپ کا بنا ہوا ہے جس کی چمک دمک لاجواب ہے اور پنج محل کی عمارت بھی نہایت خوبصورت ہے۔

مزار کے برابر جامع مسجد ہے اس میں ڈیڑھ بجے ہم لوگوں نے جمعہ کی نماز پڑھی اور پھر لاری سے سکندرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

سکندرہ

۴ بجے شام کو سکندرہ پہنچے۔ اس عمارت

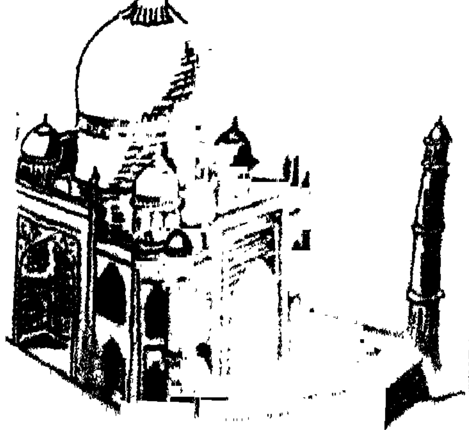
میں اکبر کا مزار ہے جو بہت اندر جا کر اندھیرے میں ہے۔
یہاں چھ بجے تک ہم لوگوں نے سیر کی اور پھر لاری سے قیام گاہ واپس آگئے۔

اعتماد الدولہ کا مقبرہ

۲۱ نومبر کی صبح ناشتہ کر کے پیدل اعتماد الدولہ کے مقبرے پہنچے۔ یہ عمارت آگرہ فورٹ کے اسٹیشن سے کوئی ایک میل دور ہے، اس میں جہانگیر کی بیوی نور جہاں کے والد اعتماد الدولہ اور ان کی دوسرے رشتہ داروں کی قبریں ہیں۔
یہ جہانگیر کی بنوائی ہوئی سفید پتھر کی وہ عمارت ہے جس میں پہلی بار پچی کاری کا کام کیا گیا ہے۔
اعتماد الدولہ کی قبر میں ایسا پتھر لگایا گیا ہے جو دور سے بالکل لکڑی معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے اس پتھر کو سنگ کٹھو کہتے ہیں۔

آگرہ کا قلعہ

۱۲ بجے کے قریب ہم لوگ اعتماد الدولہ کے مقبرے سے قلعے پہنچے۔ کوئی ایک گھنٹے تک گائڈ کے ساتھ سب عمارتیں دیکھیں، یہاں سے تاج محل بہت خوبصورت نظر آتا ہے، اور قلعے کی ہر عمارت دہلی کے لال قلعے سے زیادہ اچھی ہے۔
۲ بجے کے قریب ہم لوگ واپس قیام گاہ آگئے۔
اسی دن رات کو واپس دہلی آنا تھا اس لیے سفر کی تیاری شروع کردی اور شام کو ۶ بجے کھانا کھا کر تانگوں میں اسٹیشن آگئے۔
۹ بجے رات کو ٹرین چلی اور صبح پونے پانچ بجے دہلی پہنچ گئے۔ سفر اتنا شاندار رہا کہ ہر بچہ بہت خوش اور مگن نظر آتا تھا۔ واپس آکر سب نے "آگرہ کی سیر زندہ باد" کے ایسے نعرے لگائے کہ مدرسہ کی فضا گونج اٹھی۔ پھر یہی نہیں کہ صرف آگرہ کی عمارتوں کو دیکھ کر خوش ہو لیے بلکہ ہر بڑے طالب علم نے تاریخی عمارتوں پر اور سفر کے حالات پر مضامین لکھے اور چھوٹے بچوں نے صرف عمارتوں کے نام یاد کیے۔
اس طرح یہ سفر تعلیمی اور تفریحی دونوں لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔



جناب ظفر احمد نظامی



آؤ ہم تم مل کر....

ہم ہیں چاند سے زیادہ روشن، ہم ہیں ننھے ننھے تارے
ہم ہیں مستقبل کے سورج، ہم ہیں سب راج دُلارے
ہم ہیں کاہکشاں کے ساتھی، ہم سے ڈرتے ہیں اندھیارے
جیون کی مشکل راہوں پر آزادی کے گیت سُنائیں
آؤ ہم تم مل کر اپنی دھرتی کو آکاش بنائیں

تاریکی کا سینہ چیر کے ہم نے پھیلایا اُجیالا
ہم نے آندھی کا رُخ موڑا، ہم کو طوفانوں نے پالا
ہم رکھتے ہیں اپنے دل میں ایسے عزائم جیسے ہمالا
کوشش کر کے سارے دلوں سے نفرت کی دیواریں ڈھائیں
آؤ ہم تم مل کر اپنی دھرتی کو آکاش بنائیں

پیار ہمارا سچا مذہب، امن ہمارا مسلک ہے
امن کے گہرے گہرے سائے میں ہی خوشی کی ٹھنڈک ہے
اپنی نگری میں دیکھیں ہم آخر نفرت کب تک ہے؟
پیار کے پھولوں سے ہم اپنے باغ کا ہر گوشہ مہکائیں
آؤ ہم تم مل کر اپنی دھرتی کو آکاش بنائیں

محمد حسین حسّان

انوکھا چناؤ

۶



بہت دیر تک دونوں میں داؤں پیچ ہوتے رہے کبھی ایک کا پلّہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا۔

آخر کئی منٹ بعد بڑسنگے نے داؤں پر لاکر ہرن قدم کو نیچے لانے میں پوری طاقت لگا دی اور پچھاڑ دیا۔

جج نے اعلان کیا:۔

"بڑسنگا جیت گیا"۔

بڑسنگے کے ساتھی چیخ اٹھے:۔

"ہمارا نیا سردار زندہ باد"

"بڑسنگا پانچوں مقابلے جیت گیا"۔

دھیرے دھیرے یہ شور کم ہوا تو چھٹا جج سامنے آیا اور بولا:۔

"اب چھٹا مقابلہ تیر کمان کا ہوگا"۔

بڑسنگے کا ایک ساتھی بول اٹھا:۔

"بھلا اب باقی مقابلے کرانے میں کون سی

عقل مندی ہے۔ بڑسنگا پانچوں مقابلے جیت چکا ہے کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا ہے کہ دونوں میں سے کون مضبوط ہے۔ بڑسنگے کو سردار ہونا چاہیے۔"

جچوں نے بڑسنگا اور ہرن قدم دونوں کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا:۔

"کیا تم دونوں اس مقابلے میں حصّہ لینا چاہتے ہو؟"

ہرن قدم نے رضامندی ظاہر کی، بڑسنگے نے انکار کردیا۔

جچوں نے کہا یہ ساتوں مقابلے تو پہلے سے طے ہو چکے ہیں۔

چھٹے جج نے پھر اعلان کیا:۔

"چھٹا مقابلہ تیر کمان کا ہوگا۔"

اب کے مقابلہ کرنے کی باری بڑسنگے کی تھی۔ جج نے اُسے آواز دی پر وہ نہیں آیا۔

بھیڑ میں سے کسی نے کہا:۔

"وہ اپنا تیر کمان لینے گیا ہے۔"

"پر یہ سب سامان تو پہلے ہی سے لانا چاہیے تھا۔"

جچوں نے تھوڑی دیر آپس میں باتیں کیں۔ پھر فیصلہ کیا کہ ہرن قدم ہی یہ مقابلہ شروع کرے۔ ہر ایک تین تین تیر چلائے گا۔

یہ پت جھڑ کا موسم تھا۔ پیڑوں کے پتّے سوکھ کر پیلے پڑ چکے تھے۔ بہت سے پیڑوں کے پتّے جھڑ رہے تھے۔ میدان کے کنارے ایک بڑا سا پیڑ تھا۔ یہ آس پاس کے سب پیڑوں سے اونچا تھا۔ اس کے سب پتّے گر چکے تھے۔ بس اوپر کی، سب سے اوپر کی ٹہنی پر دو پتّے بچے کھچے رہ گئے تھے۔ بس وہی تیروں کا پہلا نشانہ قرار دیے گئے۔

جج نے جوں ہی ان دو پتّوں کی طرف اشارہ کیا، بھیڑ میں سے بہت سے لوگ سر ہلانے لگے۔

"اوں ہوں ناممکن! بالکل ناممکن! قبیلے کا کوئی بہادر اپنا تیر اتنی دور، اتنا سیدھا نہیں پھینک سکتا نہ اپنی کمان کو اتنا موڑ سکتا ہے نہ جھکا سکتا ہے۔ یہ ناممکن کام

اگر کوئی کرسکتا ہے تو ہرن قدم کرسکتا ہے شکار میں اور تیر چلانے میں اس کی دور دور شہرت تھی۔

ہرن قدم کے تیروں کی اور اس کی کمان کی جانچ کی گئی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

اب ہرن قدم پیڑ کے پاس آیا۔ تیر کو چلّے پہ چڑھایا۔ کمان کو خوب کھینچا، شست باندھی اور تیر چھوڑ دیا۔ وہ تیکھے تیر نشانے کی طرف چلا۔ جیسے لکیر کھنچ گئی۔

بھیڑ میں سے ہر ایک چلّا اٹھا۔

"تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے"

تیر کی تیز نوک نے پتّے کی ڈنڈی کو کاٹ دیا تھا اور پتّا ہوا میں تیرتا زمین کی طرف آرہا تھا۔

سب نال ہندی اس نشانے کی باتیں کر رہے تھے اور ہر ایک کی زبان پر تھا کہ اس علاقے میں ہرن قدم ہی سب سے اچھا نشانہ باز ہے۔

بڑسنگا جج کے سامنے آیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے گھیرے میں آیا۔ اس کے چہرے پہ روکھاپن اور ناگواری تھی۔ وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"بڑسنگا اب کمان نہیں اٹھائے گا۔ وہ بازی جیت چکا ہے۔ یہ بات طے ہوئی تھی کہ سات میں سے چار مقابلوں میں جیت کامیابی کے لیے بس ہے۔ بڑسنگے نے چار نہیں پانچ مقابلے جیتے ہیں۔ بڑسنگا اب سردار ہے۔"

یہ باتیں اس نے اونچی آواز میں کہیں خوب چلّا چلّا کر کہیں۔ اس کے ساتھیوں نے سر ہلا ہلا کر ہاں میں ہاں ملائی۔

اب تو ساتوں ججوں نے اپنے سر جھکا لیے۔ ساتوں دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ آخر سب سیدھے کھڑے ہوگئے اور سب سے بوڑھے جج نے یوں کہنا شروع کیا:۔

"بڑسنگا کہتا ہے کہ اب اس مقابلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سات میں سے پانچ مقابلوں میں اسے کامیابی ہوئی ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہی سب سے زیادہ طاقتور ہے اور بڑسنگا ٹھیک ہی کہتا ہے۔"

مجمع اس بوڑھے یا پردھان جج کی باتیں سننے کے لیے اور قریب آگیا۔ بڑسنگے کے ساتھی جج کا فیصلہ سننے کے لیے بے قرار تھے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ پردھان جج کب بڑسنگے کی سرداری کا اعلان کرتا ہے۔

بوڑھے جج نے اپنی تقریر جاری رکھی:۔

"یہ طے ہوا تھا کہ سردار اسی بہادر کو بنایا جائے جو اپنے کو سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ سمجھدار ثابت کرے۔"

"پانچ مقابلوں میں جیت یہ ثابت کرتی ہے کہ دونوں بہادروں میں بڑسنگا سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ لیکن اس نے چھٹے اور ساتویں مقابلے میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ جن میں اس کے ہارنے کا امکان تھا۔

"ہرن قدم پہلے چار مقابلوں میں ہار چکا تھا لیکن اس نے پانچویں (کشتی کے) مقابلے میں بھی خوشی سے حصّہ لیا۔ حالانکہ اس مقابلے میں اپنی ہار کا اُسے یقین تھا۔ اس نے باقی کے دو مقابلوں میں بھی حصّہ لینے پر رضامندی ظاہر کی حالانکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ سردار چنے جانے کا اب اس کے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔

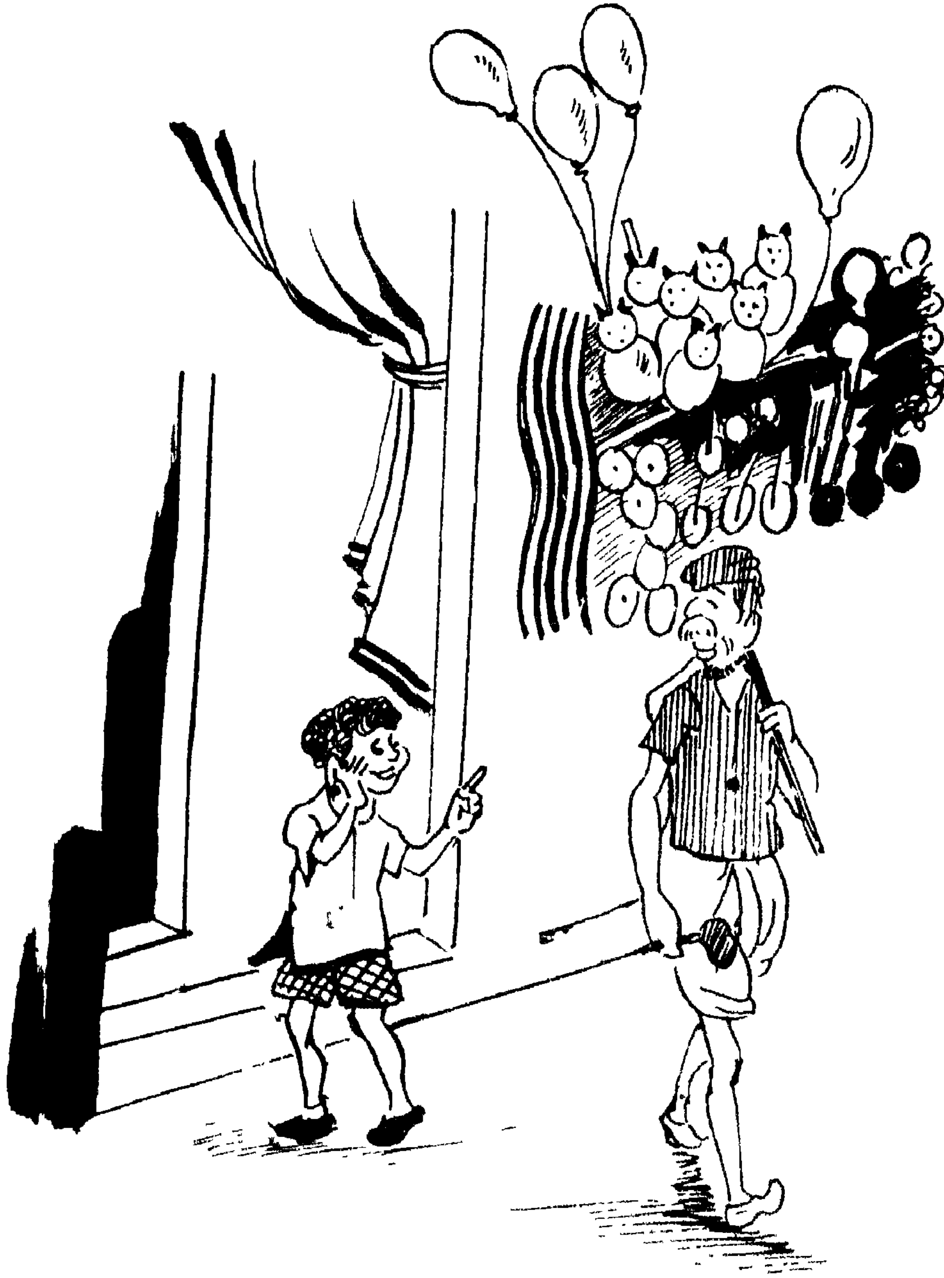
"کوئی شخص جو ہار کا مقابلہ نہیں کر سکتا سچّا بہادر نہیں ہے۔ اور جو شکست کھا کر بھی اپنا فرض انجام دیے جاتا ہے، سچ مچ بہادر سپاہی ہے۔

"سمجھ دار سپاہی وہی ہے جو اپنی قابلیت اور اہلیت کے مطابق بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو پروگرام طے ہو گیا ہے اس پر چلتا ہے جو تمام اونچ نیچ کو دھیان میں رکھتا ہے وہی ٹھیک طرح سے اپنا فرض انجام دیتا ہے۔

"ہرن قدم نے کسی مقابلے میں حصّہ لینے سے انکار نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ صرف آخری دو مقابلوں میں اسے کامیابی کی زیادہ امید ہے پھر بھی جو بات طے ہو گئی تھی ہرن قدم اسی پر چلا، اس نے اپنا فرض ادا کیا۔"

کچھ دیر سناٹا رہا، پھر سات بڑوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ہرن قدم ہمارا سردار ہے۔"



ذرا زور سے آواز لگاؤ، امّاں اُونچا سنتی ہیں۔

جناب قاضی محمد احمد جامعہ کالج



کالا پتھر

آپ نے کبھی نہ کبھی ریل پر سفر تو کیا ہوگا۔ کیسی دلچسپ، کیسی حیرتناک سواری ہے! دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرادیتی ہے۔ ریل کا انجن اژدہے کی طرح پھنکاریں مارتا، دھواں اُگلتا کس تیزی سے اُڑا چلا جاتا ہے، مسافروں سے یا بھاری سامان سے لدے ہوئے بڑے بڑے ڈبے اس طرح اپنے پیچھے کھینچے لیے جاتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

شاید آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس انجن میں آخر اتنی طاقت کہاں سے آگئی؟

اچھا آیئے انجن کے پاس چلیں دیکھیے انجن میں پیچھے کی طرف کالے پتھروں کا ڈھیر لگا ہے۔ یہی کالے پتھر اس طاقت کی کنجی ہیں، انجن میں پانی کی بہت بڑی ٹنکی ہے۔ کالے پتھر کو جلاکر ٹنکی میں پانی گرم ہو جاتا ہے تو بھاپ بننے لگتی ہے۔ یہی بھاپ انجن کی مشین کو چلاتی ہے۔

تو جناب طاقت کی اصل بنیاد یہی کالا پتھر ہے۔ اور اسی کالے پتھر کو پتھر کا کوئلہ کہتے ہیں آج کل تو بڑے بڑے شہروں میں اس سے کھانا پکانے کا رواج بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

پر کیا اس سے بس یہی دو کام لیے جاتے ہیں؟

جی نہیں۔ نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی مشینیں اس کی طاقت سے چلتی ہیں۔ دیکھیے نا

ہماری دُنیا آج کل کس تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ یہ بلا کی تیزی مشینوں کی بدولت آئی ہے اور یہ مشینیں کوئلے ہی کی طاقت سے تو چلتی ہیں۔

کوئلے کے مقابلے میں لوہے کی بڑی دھوم ہے پر لوہے کو دھات سے الگ کرنے اور اسے فولاد بنانے کے لیے بھی تو کوئلے ہی کی مدد لینا پڑتی ہے۔

غرض ہماری دُنیا کی اس دن دونی رات چوگنی ترقی میں اس کالے پتھر یا پتھر کوئلے کا بڑا ہاتھ ہے۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملک اس کوئلے کی بدولت مالا مال ہو گئے ہیں۔ برطانیہ، جرمنی، روس، امریکہ یہ سب بڑے ترقی یافتہ بڑے طاقت ور ملک ہیں، اور اس کوئلے کی ہی بدولت انھیں اتنی خوش حالی اتنی طاقت نصیب ہوئی ہے۔

پر اب بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ انسان نے کئی نئی طاقتوں مثلاً تیل، گیس، اور ایٹم کی طاقت کا پتہ لگا لیا ہے اور یہ طاقتیں کوئلے کو مات دے دیں گی۔ ان کے مقابلے میں کوئلے کی اہمیت بس یونہی سی رہ جائیں گی۔

اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ یہ طاقتیں بہت بڑی ہیں، بہت ہی بڑی۔ ان کی بدولت ہماری دُنیا اور بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے مگر یہ بات کہ ان کی وجہ سے کوئلے کی اہمیت کم ہو جائے گی بس کسی حد تک ہی ٹھیک ہے۔ کوئلے نے تو جناب پچھلے سوا سو برس سے دنیا پر حکومت کی ہے اور یہ حکومت ابھی بہت دنوں تک باقی رہے گی۔

اس وقت بھی لگ بھگ پچپن فیصدی طاقت اسی کوئلے سے حاصل کی جاتی ہے اس کے مقابلے میں پٹرول سے ۲۷ فیصدی گیس سے ۱۰ فیصدی اور پانی سے کل ۸ فیصدی طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ کتنا بڑا فرق ہے۔

اور پھر ابھی تو نہ جانے کوئلے کا کتنا بڑا ذخیرہ زمین کے نیچے دبا پڑا ہے ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آسام کی گالو پہاڑیوں میں۔ اُتّر پردیش کے مرزا پور ضلع

یں اور کشمیر میں بہت بڑے ذخیروں کا پتہ
چلا ہے۔

غرض ابھی بہت دنوں تک دُنیا کی
ترقی میں کوئلے کا بہت بڑا ہاتھ رہے گا۔
ذرا غور تو کیجیے۔ دیکھنے میں یہ کالا کلوٹا پتھر
کتنا بدنما ہے، کتنا بھدّا ہے۔ اس نے کتنے
شہروں کو کالا کر ڈالا ہے۔ اس کے زہریلے
دھوئیں سے ہم آپ سبھی گھبراتے ہیں اور
بے چارے کان میں کام کرنے والے
مزدور تو سر سے پیر تک کالے نظر آتے
ہیں لیکن اس کے کارنامے کتنے شاندار ہیں!
اور اب تو ہمارے سائنس دانوں
نے اس سے ایسی ایسی چیزیں نکالی ہیں
کہ آدمی اچنبھے میں رہ جاتا ہے۔ آپ کو
یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ بالکل واقعہ
ہے کہ اس سے خوشبوئیں اور عطر تیار کیے
جاتے ہیں اور کالے کلوٹے کوئلے صاحب
خوشبو بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے
ہیں۔ ان سے طرح طرح کے خوبصورت رنگ
تیار کیے جاتے ہیں اور ابھی نہ جانے اور
کیا کیا چیزیں اس سے تیار ہوں گی ہمارے
سائنس داں برابر چھان بین میں لگے ہوئے ہیں۔

(باقی آئندہ)

بچوں سے باتیں (بقایا صفحہ ۴)

یہ اب سے سترّہ برس پہلے کی بات ہے۔ آزادی
ملے ابھی پورا سال بھی نہ بیتا تھا۔ ۳۰ جنوری ۴۸ء
کو ایک مذہبی دیوانے نے دہلی میں ہمارے باپو
کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

باپو (مہاتما گاندھی) نے آزادی کی لڑائی
کا ایک انوکھا ڈھنگ اختیار کیا تھا۔ وہی
جسے ستیہ گرہ اور عدم تشدّد کا طریقہ کہتے ہیں۔
انھوں نے اپنے دیس ہی کو نہیں ساری دنیا
کو مل جُل کر رہنے کا، میل محبت سے رہنے کا
پیغام دیا اور دنیا نے ان کی بات کو بہت
غور اور توجہ سے سُنا اور بڑے عالموں اور
تاریخ دانوں نے انھیں اس صدی کا سب
سے بڑا آدمی مانا۔

ان کی یاد منانے کے لیے ہم ان کی تصویر
شائع کر رہے ہیں اور نیّر صاحب کی ایک اچھی
سی نظم بھی



"توبہ توبہ" وہاں اتنی ٹھنڈ تھی کہ موم بتی کا شعلہ جم کر رہ جاتا تھا۔ لاکھ پھونک ماریے بجھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

"ارے! یہ تو کچھ بھی نہیں" ایک دوسرے صاحب نے فرمایا "جہاں ہم رہتے تھے وہاں سردی کا یہ عالم تھا کہ الفاظ بھی ہمارے منہ سے برف کی ڈلیاں بن کر نکلتے تھے۔ ہم انھیں چمچے میں گرم کرکے ان پر کان دھرتے تھے کہ کہنے والے نے کہا کیا تھا۔"

میرے پاس ایک سفید مرغی ہے جو بھورے انڈے دیتی ہے۔

تو؟ اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟

اچھا! ــــ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟

پڑوسی:۔ بھئی منیر صاحب۔ ذرا آج بجلی کا پنکھا دوپہر کے لیے دے دیجیے۔

منیر:۔ جی نہیں میں آج گھر پر ہی رہوں گا۔

پڑوسی:۔ اچھا ــــ تو پھر سائیکل دے دیجیے۔

استاد:۔ تمھیں اگر سو روپے مل جائیں تو کیا کروگے؟

شاگرد:۔ میں انھیں گن کر دیکھوں گا کہ پورے بھی ہیں یا نہیں۔

خلیق انجم اشرفی۔ دہلی

ب عشرت صدّیقی

دوسروں کے کہے میں نہ آؤ

ندی کے کنارے ایک بہت بڑا پیڑ
تھا۔ اس کی ایک شاخ پر ایک چڑیا رہتی
تھی، دوسری شاخ پر ایک گلہری رہتی
تھی اور اس کی جڑ میں ایک چوہا رہتا تھا۔

ایک دن تینوں نے فیصلہ کیا کہ
آپس میں مل جُل کر رہیں اور جو جس
قابل ہے ویسا ہی کام کرے۔ اور جسے
جتنی بھوک ہو اتنا کھائے۔

بات طے ہو گئی۔

چڑیا نے کہا: "میں اُڑ سکتی ہوں۔
اس لیے میں دُور دُور سے سامان اور
لکڑیاں چُن چُن کر لاؤں گی۔"

چوہا بولا: "میں پانی لا دوں گا اور
آگ جلا دوں گا۔"

گلہری بولی: "میں کھانا پکانا جانتی
ہوں، میں کھانا پکا دیا کروں گی۔"

سب راضی ہو گئے اور اپنے اپنے
حصّے کا کام کرنے لگے۔ مِل جُل کر کام
کرنے سے تینوں کو بہت فائدہ پہنچا۔
اور کچھ ہی دنوں میں ان کے پاس بہت
دولت جمع ہو گئی۔

تینوں خوب کام کرتے تھے۔ ڈٹ
کر کھانا کھاتے اور اطمینان کی نیند سوتے
تھے۔ اور اس طرح تینوں جلد ہی کافی
تندرست اور موٹے ہو گئے۔

پر جنگل میں اور جانور بھی تو تھے!
ان میں جو نیک تھے وہ ان کے میل
محبّت سے بہت خوش تھے۔ جو بُرے

تھے انھیں یہ ہنسی خوشی کی زندگی ایک
آنکھ نہ بھائی، وہ ان میں پھوٹ ڈالنے
کی کوششوں میں لگ گئی۔

ایک دن چڑیا لکڑی کا گٹھر لے
کر آرہی تھی۔ راستے میں ایک دوسری
چڑیا سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔

"بہن! تم اتنی بہت سی لکڑی کیا کروگی؟"
دوسری چڑیا نے انجان بن کر پوچھا۔

"ارے! تم نہیں جانتیں؟ ہم تین
ہیں اور تینوں آپس میں مل جل کر کام
کرتے ہیں۔ میں سامان اور لکڑیاں لاتی
ہوں۔ چوہا پانی لاتا ہے، آگ جلاتا
ہے۔ گلہری کھانا پکاتی ہے۔ اس
طرح مزے میں زندگی کے دن گزر
رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی دوسری چڑیا منہ بنا
کر بولی: "کہنے کی بات نہیں ہے۔ لیکن
ہم تم ایک ہیں۔ اس لیے بنا کہے رہا
نہیں جاتا۔ سچ کہتی ہوں بہن! تمھاری
حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ تم اس
قدر محنت کرتی ہو اور تمھارے باقی
ساتھی گھر بیٹھ کر چین کی نیند سوتے ہیں۔
چوہا ذرا سا پانی لا دیتا ہے۔ گلہری تھوڑی
دیر تک چولھے کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔
اس طرح وہ دونوں تم کو بے وقوف
بنا رہے ہیں اور تم سے خوب کام
لیتے ہیں۔"

یہ بات چڑیا کے دل کو لگی، خاموشی
کے ساتھ گھر چلی آئی، لکڑی کے گٹھر
ایک طرف رکھا۔ کھانا تیار تھا۔ تینوں
نے کھایا، اور سونے کے لیے چلے
گئے۔

دوسرے دن تینوں اُٹھے۔ گلہری
اور چوہا اپنے اپنے کام میں لگ گئے
لیکن چڑیا اُداس اُداس سی اپنے گھونسلے
میں بیٹھی رہی۔ دونوں ساتھیوں نے
وجہ پوچھی تو بولی: "میں اب تم لوگوں
کے لیے محنت نہیں کروں گی۔ میں اس
قدر کماتی ہوں اور تم سب مزے
اُڑاتے ہو۔"

گلہری اور چوہا یہ سُن کر گھبرائے۔
انھوں نے چڑیا کو بہت سمجھایا۔ لیکن

چڑیا اپنی ضد پر اڑی رہی ۔ آخر کام کا دوبارہ بٹوارہ ہوا۔

اس نئے بٹوارے میں گلہری کو لکڑی اور سامان لانا تھا ۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری چوہے کو سونپی گئی اور چڑیا کو پانی لانے کا کام دیا گیا۔

گلہری سامان لانے کے لیے روانہ ہوئی ۔ لیکن کچھ ہی دور جانے کے بعد راستے میں ایک کتّا اس پر جھپٹا، بیچاری اُڑنا تو جانتی نہ تھی ۔ گرفت میں آ گئی اور کتّے نے گلہری کا کام تمام کر دیا۔

چوہا کھانا پکانے چلا ۔ بے چارے کو طریقہ تو معلوم نہیں تھا ۔ ہانڈی میں ترکاری ڈال کر اسے چلانے کے لیے برتن میں گھُس گیا ۔ اور اسی میں جھُلس کر رہ گیا ۔ ادھر چڑیا پانی بھرنے کے ارادے سے چونچ میں بالٹی لٹکا کر ندی کی طرف چلی، پانی سے بھری ہوئی بالٹی اُٹھانے لگی مگر پانی کے وزن سے بالٹی بھاری ہو گئی تھی ۔ اس لیے وہ نیچے کی طرف جانے لگی۔ گھبراہٹ میں چڑیا کو کچھ نہ سوجھا ، اور بالٹی کے ساتھ وہ بھی ندی میں ڈوب گئی۔

اُس بُری چڑیا کو ان کے انجام سے خوشی تھی پر جنگل کے اچھّے پنچھی سوگ منا رہے تھے اور کہہ رہے تھے ۔

"چڑیا عقل سے کام لیتی ، دوست دشمن میں تمیز کرتی تو یہ نوبت کیوں آتی؟"

معلّم

کتابوں کی باتیں



کتاب: بچوں کی دُنیا

مصنف: منشی تلوک چند محروم

صفحات: ۱۲۴ سائز ۱۸X۲۲/۸

قیمت: چار روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

'بچوں کی دنیا' سجانے والے ہمارے نام ور اور بزرگ شاعر حضرت تلوک چند محروم ہیں۔ وہ ۱۸۸۷ء میں مغربی پنجاب کے ایک شہر میاں والی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اب دہلی میں رہتے ہیں۔ لڑکپن سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ اُن کی نظمیں ایک زمانے سے مدرسوں میں پڑھائی جانے والی اردو کی کتابوں میں شامل کی جارہی ہیں۔ آپ جیسے بہت سے بچوں کے ماں باپ نے بھی اپنے بچپن میں اُن کی شاعری کا مزا چکھا ہوگا۔

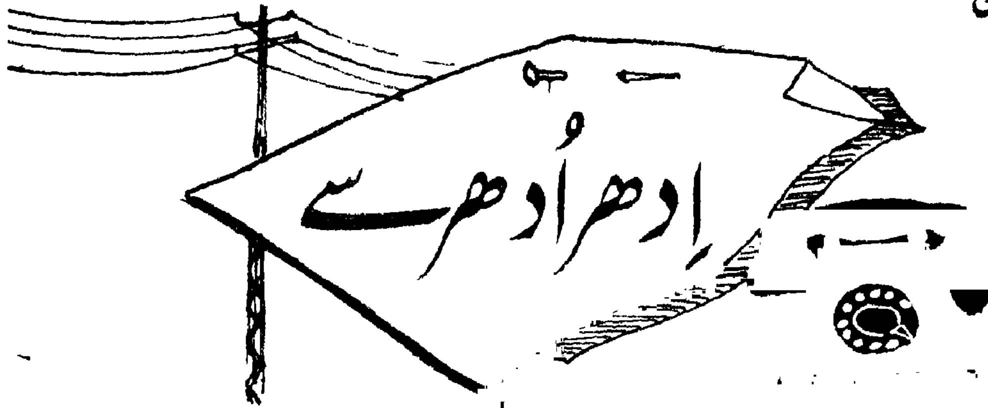
حضرت محروم نے ہمیشہ بچوں کو یاد رکھا اور ان کے مزاج و مذاق کا خیال رکھ کر نظمیں کہیں۔ وہ زندگی بھر ایک استاد رہے ہیں اور انھیں بچوں کو نیک راستہ دکھانے کی فکر برابر رہتی ہے۔ وہ

عموماً کوئی اچھی بات بڑے پیارے ڈھنگ سے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں پڑھ کر دل بھی خوش ہوتا ہے اور اخلاق بھی سنورتا ہے۔

'بچوں کی دنیا' میں اُن کی ۴۲ اپنی نظمیں اور ۲ ترجمے شامل ہیں۔ دو چار کے علاوہ یہ سب اخلاقی ہیں یعنی اُن سے کسی اچھی بات کا سبق ملتا ہے یا کسی بُرائی سے بچنے کی ہدایت۔ جیسے 'پہلے کام پیچھے آرام' سچائی، جھوٹ، ورزش، قرض — بہار، بارش، گنگا اور شام میں قدرتی مناظر کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یوں تو حضرتِ محروم بچوں کا خیال کرکے آسان زبان کہتے ہیں لیکن کہیں کہیں مشکل الفاظ پھر بھی آ ہی گئے ہیں۔ لہٰذا بچوں کی آسانی کے لیے کتاب کے آخر میں تمام مشکل الفاظ کے معنی بھی دے دیے گئے ہیں۔

اور ہاں، 'بچوں کی دنیا' میں ایک خوبی اور ہے —— یہ بڑی صاف ستھری چھپی ہے۔ اس میں بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں اور با قاعدہ جلد بندھی ہوئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو میں بچوں کے لیے نظموں کی ایسی عمدہ چھپی ہوئی کتابیں تقریباً ناپید ہیں۔ چار سال ہوئے جب حضرتِ محروم نے 'بہارِ طفلی' بھی اسی شان سے چھپوائی تھی۔ یہ کتاب بھی بچوں کے لیے پیاری پیاری نظموں کا ایک گلدستہ ہے۔ بہت خوبصورت!

"بچوں کی دنیا" واقعی ایک تحفہ ہے۔ جو بچہ پائے گا، جھوم جھوم جائے گا۔

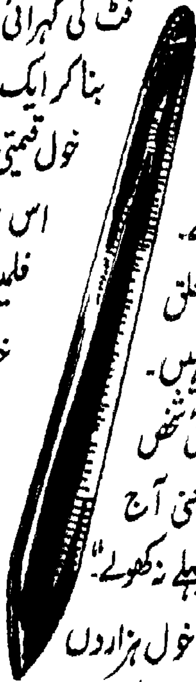


پانچ ہزار سال بعد، آج کی دُنیا

پانچ ہزار سال بعد دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اس وقت نئی نئی ایجادوں سے دنیا کا رنگ روپ بالکل نرالا بن چُکا ہوگا۔ اور ہماری آج کی دنیا تو اُس وقت پُرانے زمانے کی ایک گزری ہوئی کہانی ہوگی۔

مگر یہ کہانی اُس وقت دلچسپ ضرور ہوگی۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج کی دنیا کی کہانی ۵ ہزار سال بعد پھر سے دیکھنے کے لیے محفوظ کردی گئی، مگر کیسے؟

ابھی کچھ دن پہلے امریکہ کے شہر نیویارک میں ایک عالمی میلا ہوا تھا۔ اس میلے میں دنیا کے تمام ملکوں نے حصّہ لیا۔ جس جگہ پر یہ میلا ہوا تھا اس جگہ ۵۰ فٹ کی گہرائی میں بہت ہی محفوظ جگہ بناکر ایک خول رکھ دیا گیا ہے۔ یہ خول قیمتی دھاتوں سے تیار کیا گیا ہے۔ اس خول میں آج کی دنیا سے متعلق فلمیں وغیرہ بنا کر رکھ دی گئی ہیں۔ خول کے اوپر لکھا ہوا ہے "کوئی شخص اس خول کو ۶۹۶۵ (یعنی آج سے پانچ ہزار برس بعد) سے پہلے نہ کھولے۔" خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خول ہزاروں سال تک خراب نہیں ہوگا۔ اور اس میں رکھی ہوئی فلمیں بالکل صحیح سلامت ملیں گی۔



ذرا سوچیے آج سے پانچ ہزار سال بعد کے زمانے میں ہماری آج کی دنیا کتنی عجیب وغریب

معلوم ہوگی۔

ہمارے وزیراعظم اور گڑیا

۱۵ر دسمبر کو دہلی میں انعام تقسیم کرنے کا ایک بہت شاندار جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسے کی صدارت دس سال کی ایک بچی نے کی تھی استقبالیہ بھی ایک بچی نے پڑھا، اور جلسہ ختم ہونے سے پہلے مہمانوں کا شکریہ بھی ایک چھوٹے سے بچے نے ادا کیا۔ ان ہی بچوں کے درمیان ہمارے وزیراعظم لال بہادر شاستری بھی تشریف رکھتے تھے۔ایک بچی انعام پانے والوں کے نام کا اعلان کرتی جاتی اور شاستری جی انھیں انعام تقسیم کرتے جاتے تھے۔

پچھلے چودہ برس سے "شنکر" کی طرف سے دہلی میں بچوں کی پینٹنگ اور دوسرے مشغلوں کا ایک مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں دنیا کے ہر ملک کے بچے حصّہ لیتے ہیں۔ اس سال جو مقابلہ ہوا تھا اسی کے انعامات تقسیم کرنے کی تقریب ۱۵ر دسمبر کو دہلی میں ہوئی تھی۔

ہمارے مرحوم وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو اس مقابلے سے خاص طور پر دلچسپی لیا کرتے تھے اور ہر سال اپنے ہاتھ سے انعامات تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس بار ہمارے موجودہ وزیراعظم لال بہادر شاستری جی نے انعامات تقسیم کیے۔ شاستری جی کو بھی بچوں نے انعام میں ایک گڑیا پیش کی، جسے پاکر وہ بہت خوش ہوئے۔

اس سال کُل ۴۴۶ انعام تقسیم کیے گئے۔ ۴۱۱ پینٹنگ کے مقابلوں میں اور ۳۵ انعام ادبی مشغلوں کے مقابلوں میں — یہ انعامات ۶۶ ملکوں کے بچوں میں تقسیم کیے گئے۔

صدر جمہوریہ کا سونے کا تمغہ جاپان کے ایک آٹھ سال کے بچے نے حاصل کیا۔ جس کی پینٹنگ سب سے اچھی مانی گئی۔ نائب صدر جمہوریہ کا ادبی مقابلے کا سونے کا تمغہ ہندوستان کی ایک بچی (عمر ۱۲ سال) تنو راجن نے حاصل کیا۔

مرحوم جواہرلال نہرو ہر سال سونے کے ۲۴ تمغے اپنی طرف سے بچوں میں تقسیم کرتے تھے۔ مرحوم پنڈت جی کی اس یادگار کو قائم رکھتے ہوئے اس سال بھی ۲۴ خاص انعامات تقسیم کیے گئے۔

بچّہ جو بھیڑیوں میں پلا

گیارہ سال پہلے ۱۵ر جنوری ۱۹۵۴ء کو

لکھنؤ کے اسپتال میں ایک عجیب و غریب بچّہ داخل کیا گیا تھا۔ اس بچے کا نام اب رامو رکھ دیا گیا ہے۔ اسے لوگ "بھیڑیا بچہ" بھی کہتے ہیں۔ رامو ریل کی پٹری کے پاس ایک بہت ہی سنسان جنگل میں ملا تھا۔ اس وقت سے ڈاکٹر اس بچّے کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ دنیا بھر کے سائنس داں اس عجیب و غریب بچّے کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے روس کے ایک ڈاکٹر نے لکھنؤ اسپتال کے ڈاکٹروں سے اس بچے کا حال دریافت کیا تھا۔ لکھنؤ کے ڈاکٹر نے اس مہینے ایک خط میں بچّے کی زندگی کا حال لکھ کر بھیجا ہے، جو بہت دلچسپ ہے۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ رامو جنگلی جانوروں کے بیچ پلا بڑھا ہے۔ انسانوں سے کبھی اس کا سابقہ نہیں پڑا۔ رامو جب اسپتال لایا گیا تھا، اس وقت وہ کچّے گوشت کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے اور مڑے ہوئے ناخن تھے۔ وہ برتن میں منہ ڈال کر پانی پیتا تھا۔ روشنی سے گھبراتا تھا، انسانوں کے قریب آنے پر غصّہ دکھایا کرتا تھا اور کُتّے سے کافی مانوس تھا۔

مگر اب رامو روشنی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو پہچاننے لگا ہے۔ اب وہ انڈے چپاتی، شوربا، مکھن، پھل اور دال سبھی کچھ کھاتا ہے۔

رامو لکھنؤ کے بلرام پور اسپتال میں ایک بہت ہی شاندار کمرے میں رہتا ہے۔ گدّے پر تکیہ لگا کر سوتا ہے۔ اس کی خدمت کے لیے ایک آدمی ہر وقت موجود رہتا ہے۔

جانوروں کی صحبت نے انسان کے اس بچّے کو حیوان بنا ڈالا تو اب انسانوں کی صحبت اسے دوبارہ انسان بنا دے گی۔

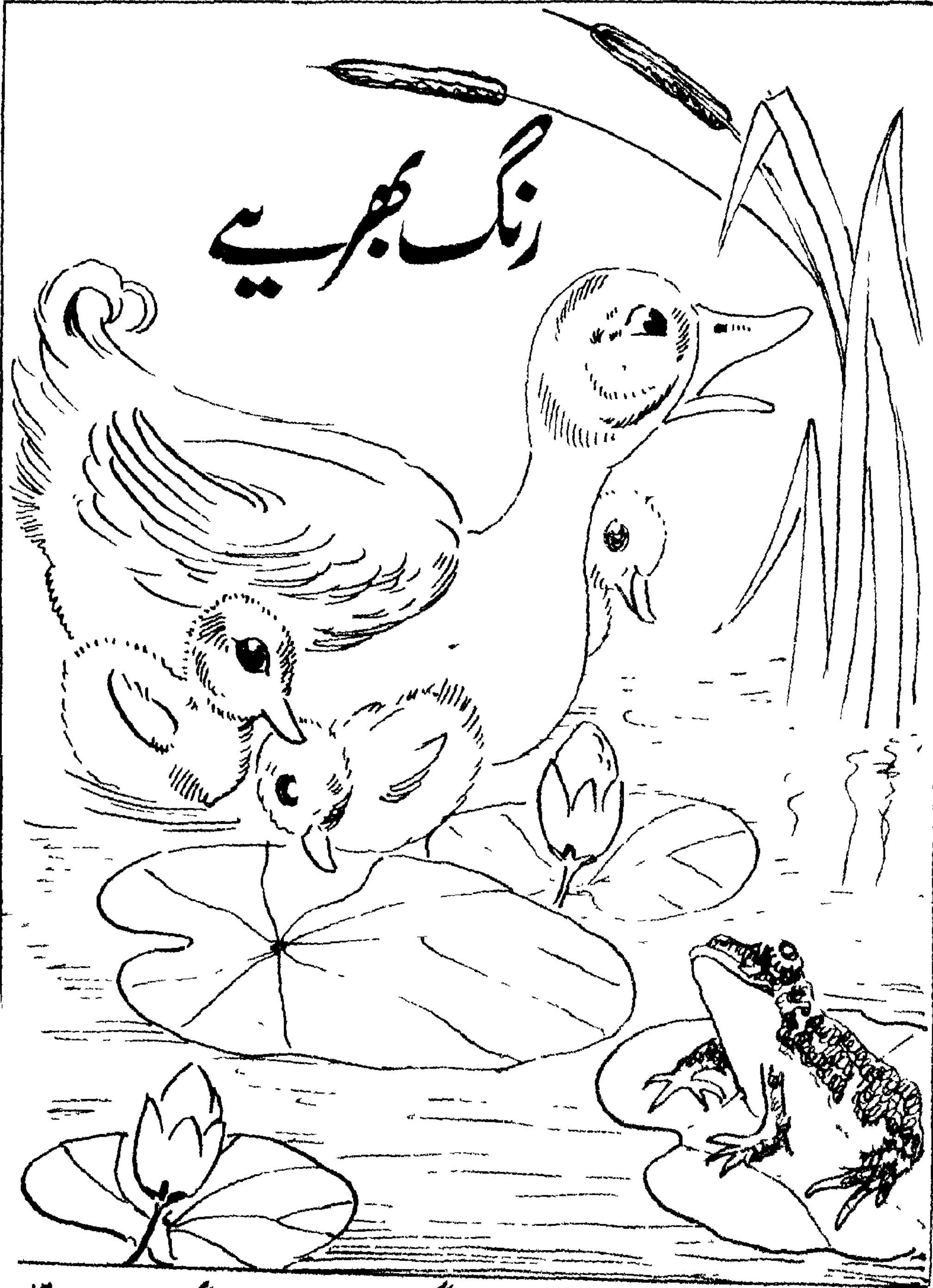
نئے زمانے کی کشتی نوح

کیا پھر کوئی زبردست سیلاب آنے والا ہے، ساری دنیا کو غرق کر دینے کے لیے؟ کیا پھر دنیا تباہ ہونے کو ہے اور دنیا کی مخلوقات کو آئندہ کے لیے بچا رکھنے کے لیے کشتی نوح کی طرح کی کوئی کشتی تیار کی گئی ہے؟ کشتی نوح کی مناسبت سے حضرت نوح کا واقعہ یاد آنا یقینی بات ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ساری دنیا پانی سے ڈھک گئی تھی۔ صرف وہی چرند پرند اور انسان تباہی سے بچ سکے جو حضرت نوح کی کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ خدا کی یہی وہ مخلوق تھی جو دنیا کو پھر سے بسانے کے لیے بچ رہی تھی۔ مگر آپ گھبرائیے نہیں جو بات میں آپ کو بتا رہا ہوں وہ اس سے ذرا مختلف ہے۔

اس وقت ہندوستان میں کچھ ایسے چرند اور پرند موجود ہیں، جو اب بہت ہی کم تعداد میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی طرف سے یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ اگر ان کو احتیاط سے نہ رکھا گیا تو دنیا سے جلد ہی ان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ ان چرندوں اور پرندوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہماری حکومت نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس پروگرام کے ماتحت ان جانوروں کی کچھ ٹولیاں، خاص طرح کے جہاز میں دنیا کے ایسے علاقوں میں پہنچا دی جائیں گی۔ جہاں کی آب و ہوا ان کے لیے زیادہ موافق ہو گی۔ اس جہاز کا نام بھی "کشتی نوح" رکھا گیا ہے۔

یوم جمہوریہ کے جلوس میں مشہور کھلاڑی بھی حصّہ لیں گے

ہر سال دہلی میں یوم جمہوریہ کے موقعے پر بہت شاندار جشن منایا جاتا ہے۔ ۲۶ جنوری کی صبح راشٹرپتی بھون سے ایک بہت ہی شاندار جلوس نکلتا ہے۔ اس سال کی پریڈ میں ہندوستان کے چوٹی کے کھلاڑی بھی حصّہ لیں گے۔ ہندوستان کی ہاکی ٹیم، جو دنیا میں اپنی دھاک جما چکی ہے اس کے تمام کھلاڑی اس پریڈ میں شریک ہوں گے۔



ناشر پبلشر سید احمد دہلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

February, 1965. Regd. No. D. 1457

Payam -i- Taleem

New Delhi. 25

بچوں کے لئے

ماسکو میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

● چوزہ	صفحات	۲	قیمت	۱۹	پیسے
● دستانہ	〃	۲۰	〃	۲۵	〃
● دو کہانیاں	〃	۲۰	〃	۳۱	〃
● گیہوں کی بال	〃	۱۶	〃	۳۱	〃
● تصویروں میں چیونٹی کی کہانیاں	〃	۵۲	〃	۷۵	〃
● روی اور ششی	〃	۷۸	〃	۶۹	〃
● تین بھالو	〃	۱۶	〃	۳۷	〃
● نیلا پیالہ	〃	۴۴	〃	۱۲۵	〃
● بیشکا	〃	۱۶	〃	۳۱	〃

ان میں سے چوزہ ½۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
½۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر کے سائز کی ہیں۔

پیام تعلیم

حالی نمبر



پیدائش ۱۸۳۷ء

وفات ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء



پروفیسر محمد مجیب

یوم جمہوریہ ۱۹۶۵ء کے موقع پر آپ پدم بھوشن کے
اعزاز سے نوازے گئے

حالی نمبر

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۲   مارچ ۱۹۶۵ء   شمارہ ۳

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی



سالانہ چندہ : ــــ پانچ روپے
فی پرچہ : ــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵



فہرست

بچّوں سے باتیں

ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے ہیں (نومبر ۱۹۶۴ء) ہم نے پیامِ تعلیم کا نہرو نمبر شائع کیا تھا۔ آپ نے اسے پسند کیا۔ بہت پسند کیا۔ ہماری ہمت بڑھی۔ کام کرنے کا حوصلہ بڑھا۔

اور اب ہم آپ کی خدمت میں حالی نمبر پیش کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ بھی آپ کو پسند آئے۔ اور ہم نے اس کی ترتیب میں جو محنت کی ہے ہمارے مضمون نگاروں نے آپ کے لیے اچھے اچھے مضمون لکھنے کی جو زحمت فرمائی ہے ٹھکانے لگے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ پچھلے دسمبر میں مولانا حالی کے انتقال کو پورے پچاس سال ہو چکے ہیں۔ محترم تاباں صاحب کی تجویز تھی کہ مولانا کی پچاس



سالہ برسی کے موقع پر ایک خاص نمبر نکالا جائے۔

تجویز بہت اچھی تھی دل سے قبول کی گئی۔ مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ ہم نے وقت بہت کم رکھا تھا پھر بھی ساتھیوں کی مدد اور بزرگوں کی سرپرستی کے سہارے یہ کام انجام پا گیا۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنے مخدوم محترم ڈاکٹر سید عابد حسین اور جناب وقار خلیل (ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد) سے خاص طور پر بہت مدد ملی۔ ڈاکٹر صاحب کے ارشاد پر جن بزرگوں

سے درخواست کی گئی سب نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔

※

وقار صاحب نے لکھنے والوں کے نام تجویز کیے اکثر حضرات سے مضامین لکھوا کر بھجوائے اور خود ایک نظم مرحمت فرمائی۔

※

حیدرآباد کے بزرگوں میں وزیر حسن صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ آپ ذرا ان کا اندازِ بیان دیکھیے ان کی نکھری ستھری پیاری زبان دیکھیے ایک ایک لفظ کیسا جچا تلا ہے!

※

محترم غلام ربانی صاحب نے مولانا حالی کے حالات کے ضمن میں مولانا عبدالحق کا حال بھی بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔

※

محترم محمد اکبرالدین صدیقی کی سرپرستی بھی ہمارے لیے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ظہیر الحق صاحب نے بھی حالی کی مسدس پر بڑا اچھا سا مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ اظہر افسر صاحب سے پیام تعلیم کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ مولانا حالی پر ان کا ڈراما بھی بہت خوب ہے۔

※

ڈاکٹر شجاعت سندیلوی نے مولانا حالی پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹری کی ڈگری لی ہے۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے مولانا حالی کی تمام حیثیتیں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے شمیم حنفی صاحب نے حالی اور غالب کے تعلقات اور لطیف اعظمی صاحب نے حالی اور شبلی کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

※

محترمہ صالحہ عابد حسین کا مضمون آپ یقیناً بڑے شوق سے پڑھیں گے۔ بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ صالحہ عابد حسین صاحبہ مولانا حالی کی پر پوتی ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں مولانا کی گھریلو زندگی کا حال بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے او بتایا ہے کہ مولانا کو اپنے عزیزوں خصوصاً بچوں سے کتنا گہرا تعلق تھا۔

※

ظفر الاسلام صاحب نے بھی بہت اچھے انداز میں مولانا حالی پر قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی 'پیام تعلیم' کی سرپرستی فرماتے رہیں گے

※

مخدومی رشید صدیقی صاحب پیام تعلیم کے پرانے سرپرست ہیں۔ آپ مضمون کے لیے تو وقت نہ نکال سکے لیکن ایک انوکھی چیز عنایت فرمائی ہے۔ اپنی طرف سے ایک انعامی مقابلے کا اعلان کیا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اس مقابلے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں حصّہ لیں۔

———— ⁜ ————

اس پرچے میں ایک اور اچھی سی نظم ہے۔ یہ ہمارے محترم نیر صاحب نے لکھی ہے اور ایسا لگتا ہے دل سے لکھی ہے۔

———— ⁜ ————

اس پرچے میں مولانا حالی پر آپ کو اپنے ساتھیوں کے مضمون بھی نظر آئیں گے۔ گنجایش کی کمی کے سبب ہم تھوڑے سے مضمون شامل کر سکے۔ ان میں سے بھی اکثر کو مختصر کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ہم اپنے دوست محمد حسین صاحب حیدرآبادی (استاد مدرسہ ثانوی جامعہ) کے احسان مند ہیں۔ اس طرح کے مضامین کی فراہمی میں آپ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

———— ⁜ ————

مولانا حالی پر کچھ مضمون اور نظمیں ہمیں دیر میں ملیں اور مجبوراً حالی نمبر میں شامل نہ ہو سکیں۔ انھیں اگلے پرچے میں شامل کیا جائے گا۔

———— ⁜ ————

آپ نے اخباروں میں شاید ایک خبر پڑھی ہو۔ ہمارے محترم وائس چانسلر یا شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب کو ہماری حکومت نے پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا ہے۔

اب سے کوئی ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ مولانا حالی کو (۱۹۰۴ء میں) شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے مبارکباد کا خط بھیجا:
"مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارکباد دیتا ہوں اب جاکر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔"

ہمارے مجیب صاحب تاریخ کے ماہر ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی کے علاوہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو اور انگریزی میں کئی معرکتہ الآرا کتابوں کے مصنف ہیں۔ بہت بڑے ماہر تعلیم ہیں۔ اس لیے ہم مجیب صاحب سے زیادہ حکومت کو اس کے حسن انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو نواز کر اعزاز کی وقعت بڑھتی ہے۔

———— ⁜ ————

ہماری جامعہ کے پرانے طالب علم میر اکبر علی خاں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی

کو بھی یہ اعزاز ملا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں بھی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

---- ※ ----

کئی سال ہوئے ہمارے محترم بزرگ، ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو بھی یہی اعزاز مل چکا ہے۔ مخدومی ڈاکٹر صاحب کو پہلے پدم بھوشن اور پھر سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ جامعہ کے چار بزرگوں کو ان بڑے بڑے اعزازات کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ اور یہ ایک ادارے کے لیے بڑی بات ہے۔

---- ※ ----

پنویل (مہاراشٹر) میں ایک تعلیمی ادارہ یعقوب بیگ ہائی اسکول بہت کامیابی سے اپنے تعلیمی فرائض انجام دے رہا ہے۔ پنویل ایجوکیشن سوسائٹی اسے چلاتی ہے۔ پچھلے مہینے عید کے دن اس کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ تقریب بہت شاندار طریقے سے منائی گئی۔

---- ※ ----

جناب عبدالرحمٰن صاحب انتولے نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ سنگِ بنیاد بمبئی کے مشہور سماجی کارکن یحییٰ بھائی جسدن والا (ڈائرکٹر مرکنٹائل بنک کو آپریٹو بنک) سے رکھوایا گیا۔

---- ※ ----

جلسے میں جناب صدر، جناب جسدن والا، جناب مہر مہسلائی اور جناب شاہد علی خاں وغیرہ نے تعلیم کی اہمیت پر بہت اچھی تقریریں کیں۔ ہم اس تقریب کی کامیابی پر پنویل ایجوکیشن سوسائٹی کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس اسکول کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

---- ※ ----

دارالمصنفین اعظم گڑھ ہمارے دیس کا مشہور علمی ادارہ ہے۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اسے قائم کیا تھا۔ یہ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو عزیز شاگردوں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے اپنے استاد کی اس یادگار کو سنبھالا۔ اپنی پُرخلوص جد و جہد، لگاتار محنت سے اسے ترقی دی اور کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ سارے اسلامی دنیا میں اس کا نام ہو گیا۔

---- ※ ----

علامہ سید سلیمان ندوی اللہ کو پیارے ہوئے۔ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالر

(باقی ۹ صفحہ پر ملاحظہ

مولانا حالی



اے زمین آسمان کے مالک
ساری دُنیا جہان کے مالک

تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

آئی موسم سے تنگ جب خلقت
تو نے موسم کی دی بدل صورت

گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب
تو نے برسات بھیج دی یا رب

سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان
مینھ برسنے سے آئی جان میں جان

گئے جب لوگ مینھ سے سب گھبرا
حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا

جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات
دم کے دم میں بدل گئے دن رات

پھر لگی پڑنے جب بہت سردی
مشکل آسان تو نے پھر کر دی

جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار
جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار

تو یوں ہی رُت پہ رُت بدلتا رہا
یوں ہی دُنیا کا کام چلتا رہا



آپ نے حالی کا نام تو سنا ہوگا۔ ان کی نظمیں بھی پڑھی ہوں گی۔ اور شاید اپنے بزرگوں کو اُن کی غزلیں گاتے اور ان کی "مسدس" جھوم جھوم کر پڑھتے دیکھا ہوگا۔ بڑے ہونے پر آپ ان کی بہت سی کتابیں پڑھیں گے۔

یہ کتابیں نظم میں بھی ہیں نثر میں بھی ہیں۔ انھوں نے تین ۳ بہت مشہور آدمیوں؛ سعدی شیرازی، مرزا غالب اور سر سید کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں۔ اردو ادب میں تنقید کی پہلی کتاب "مقدمۂ شعر و شاعری" بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ بچوں کی تعلیم اور تربیت پر "مجالس النسا" کے نام سے انھوں نے ایک قصہ دو جلدوں میں لکھا ہے۔ اور بہت سے مضمون ہیں جو کچھ کتاب کی شکل میں چھپے ہیں کچھ نہیں چھپے ہیں۔ ان کے خطوں کے مجموعے ہیں جن سے ان کی ذات اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ جب تمھیں اپنی زبان کے ادب سے لگاؤ پیدا ہوگا اور بڑے ادیبوں کو پڑھنے کا شوق، تب تم جان پاؤگے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کتنے بڑے ادیب تھے، کتنے بڑے شاعر تھے، کتنے بڑے نقاد تھے اور ان کا اردو زبان پر اور اردو ادب پر کتنا احسان ہے!

لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف بہت بڑے شاعر، بہت بڑے ادیب ہی نہ تھے، ایک بڑے انسان بھی تھے۔ ان کا دل بڑا تھا جس میں سب کے لیے جگہ تھی۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے، سچے انسان تھے۔ ان میں ہمدردی تھی۔ دوسروں کا دکھ درد سمجھنے اور اس کو دور کرنے کی لگن تھی۔

اپنی قوم، اپنے ملک کی محبت کوٹ کوٹ کران کے دل میں بھری تھی۔ وہ ساری زندگی پیسے سے، ہاتھ پاؤں سے، زبان سے، قلم سے، ہر طرح دوسروں کی خدمت اور مدد کرتے رہے، ان کی بھلائی اور ترقی کی کوشش میں لگے رہے۔

بچوں سے انھیں بہت پیار تھا۔ ان کی بھلائی کی فکر انھیں ہر وقت رہتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ آج کے ننھے بچے کل بڑے ہوکر ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے اور قوم کی حالت سدھارنے کے بڑے کام انجام دیں گے۔ اگر ان کی تعلیم اور تربیت کی فکر نہ رکھی گئی تو ساری قوم تباہ ہو جائے گی۔ اپنے محترم دوست سرسید کے ساتھ مل کر انھوں نے اعلیٰ تعلیم کا مدرسہ قائم کرنے میں بہت کام کیا ہے۔ آج وہی مدرسہ ہندوستان کی بہت بڑی یونیورسٹی ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہے۔

چھوٹے بچوں کی تعلیم اور تربیت کا بھی وہ بہت دھیان رکھتے تھے۔ اپنے بہت بڑے گھرانے کے پچاسیوں بچوں کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں کے بچوں، دوستوں اور ملازموں کے بچوں کا بھی وہ بڑا خیال اور فکر رکھتے تھے۔ ان کا بے حد لاڈ پیار کرتے مگر ساتھ ہی ان کے اخلاق اور عادتیں سنوارنے کا دھیان بھی رہتا تھا۔

بچوں سے محبت کا مادّہ ان کے اندر فطری تھا۔ میں نے اپنی والدہ، خالہ وغیرہ سے سنا ہے کہ خاندان میں جس کسی گھر میں کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا اور مولانا کو اطلاع ملتی تو وہ اُس دن وہاں پہنچتے۔ ننھے میاں یا ننھی بی بی کو نہالچے سمیت گود میں اٹھا لیتے، منہ لگا کر اس کو پیار کرتے اور دیر تک گود میں لیے بیٹھے رہتے اور ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کہتے اور ماں باپ کو مبارک باد دیتے رہتے۔

لڑکوں سے بھی زیادہ انھیں لڑکیاں پیاری تھیں۔ ان کے بڑے سے گھرانے میں خود ان کے نواسے، نواسیاں، پوتے پوتیاں اور پرنواسے اور پرپوتے غرض بہت سے بچے تھے اور پھر دوسرے عزیزوں کے بچے تھے ــــ یہ سب بچے بھی سمجھتے تھے کہ مولانا انھیں کتنا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ خود بھی "بابا" کو بے حد چاہتے تھے۔ میں نے اپنے بزرگوں کے مردوں اور عورتوں کو ــ جو مولانا کے سامنے بچے رہ چکے تھے ــــ مولانا کا نام آتے ہی بے اختیار آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ "بابا"

جیسا بچوں کو چاہنے والا ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ تم جانو مولانا لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے ملنے اور باتیں پوچھنے ان کے پاس آتے تھے مگر بچے ہر وقت ہر حال میں ان کے پاس جا سکتے تھے۔ وہ کام کرتے رہتے اور بچے ان کے پاس کھیلا کرتے۔ کبھی ان کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیتے۔ دوات گرا دیتے، قلم چھین لیتے مگر ان کو برا نہ لگتا۔ برا لگنا تو دور رہا وہ الٹا بچوں کی شوخیوں سے خوش ہوتے تھے۔ ہاں جب بچے ذرا بڑے ہو جاتے تو پھر وہ ان کو ادب و آداب سکھانے اور تہذیب اور تمیز سے رہنے کی تربیت کرتے۔

سیدین صاحب ان کی پوتی کے بیٹے ہیں مولانا حالی انھیں بہت چاہتے تھے۔ جب ان کی اماں ان کو لے کر دادا کے ہاں جاتیں تو وہ بہت خوش ہوتے۔ ان کا مکان دو منزل کا تھا۔ نیچے کے گھر میں زنان خانہ (عورتوں کے رہنے کا مکان) تھا اور اوپر مولانا حالی کی بیٹھک تھی اوپر کے کمرے کی ایک کھڑکی صحن میں کھلتی تھی۔ جب سیدین ان کے پاس جاتے تو مولانا نیچے آکر پوتی سے ملتے، پھر نواسے کے ساتھ کھیلتے اور پھر کام کرنے اوپر چلے جاتے۔ سیدین صاحب کو "بابا" کا چلا جانا اچھا نہ لگتا اور وہ پکارتے "بابا" "بابا" مولانا اوپر کی کھڑکی کھول کر جواب دیتے اور پھر بچے کے پکارتے رہنے پر نیچے اتر کر اسے پیار کرکے اور کچھ دیر کھیل کر اوپر کام کرنے چلے جاتے۔ تم جانو بچوں کو تو کسی بات کو بار بار کہنے میں مزا آتا ہے۔ میری اماں بتایا کرتی تھیں کہ جتنی بار سیدین "بابا، بابا" پکارتا اتنی بار وہ بڑھاپے اور بیماری کے باوجود کوٹھے سے اتر کر نیچے آتے اور بچے کو پیار کرکے واپس جاتے۔

ماؤں کی مجال نہ تھی کہ بچوں کو ڈانٹیں یا ماریں۔ بچہ کسی اور بات پر بھی روتا تو مولانا ان کی ماں پر ناراض ہوتے کہ بچے کو کیوں رُلا رکھا ہے۔

سیدین صاحب سے چھوٹی بہن سیدہ خاتون کو (جو بائیس سال کی عمر میں خدا کو پیاری ہو گئیں) مولانا سب بچوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ بچی تھی بھی بلا کی ذہین اور بے حد پیاری۔ وہ انھیں گھنٹوں گود میں لے کر بیٹھے رہتے اور ان کی مزے مزے کی باتیں سنتے۔ ایک بار برسات کا زمانہ تھا۔ مولانا اپنے بڑے گھر کے دالان میں تخت پر گاؤ تکیے سے لگے بچی کو گود میں لیے اس کی غوغاں سن رہے تھے۔ پاس ہی

کانسے کا ایک خالی پیالا رکھا تھا۔ باہر کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔ یکایک ایک زور کا تڑاخا ہوا۔ ایک شعلہ چمکا۔ بجلی پیالے پر گرتی، مولانا کی گود میں لیٹی بچی کے بھورے بالوں کی ایک لٹ جلاتی سہ دری کے روشن دان سے نکل گئی تھی۔ سہ دری میں ریشمی کپڑوں کا ایک بکس رکھا تھا جب اسے کھولا گیا تو اندر کے سارے کپڑے راکھ ڈھیر تھے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ مولانا اور ان کی گود میں لیٹی سیدہ بال بال بچ گئے۔ سیدہ پر مولانا نے چالیس شعر کی ایک نظم بھی کہی تھی۔ زبان بالکل سیدھی سادی ہے پر انداز بڑا دلکش ہے۔ بس لگتا ہے کہ مولانا بچوں کی زبان میں ان سے باتیں کر رہے ہوں۔ پانچ سات شعر آپ بھی سن لیجیے ؎

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے — صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
اپنے ماں باپ کی دُلاری ہے — اور عزیزوں کو بھی وہ پیاری ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر ہے اچھے برے کی سب پہچان
جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں — بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
کچے پن سے یقین نہیں کرتی — دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

آگے چل کر سید دین صاحب کا اور اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہاں ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو — چونکہ اوپر تلے کے ہیں دونوں
بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا — اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹتی ہے دوڑ کر ماں سے — بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے
یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں — جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں
پھر تو آتا ہے اس پر اور بھی پیار — ہوتی جاتی ہے جس قدر ہوشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول — بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب — زرگری اپنی بولتی ہے جب

اور بچوں کی بیماری تو ان کو بے قرار ہی کر دیتی تھی۔ کوئی بچہ بیمار ہو جائے یا اس کا دودھ چھوٹنے والا ہو اور اس سے وہ پریشان ہو تو ماں-ائی کے ساتھ مولانا بھی جاگ جاگ کر ٹہل ٹہل کر رات گزار دیتے تھے۔

سنہ بارہ یا تیرہ (۱۳-۱۹۱۲ء) کا ذکر ہے مولانا حالیؔ اپنے ایک عزیز کے ہاں فرید آباد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا، دسمبر کا مہینہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ جس مکان میں مولانا ٹھہرے تھے اس کے باہر کوٹھڑی میں ایک عورت وزیرن رہتی تھی۔ ایک دن اس کا چھوٹا بچہ بیمار ہوگیا۔ مولانا کو رات کو اس کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر سنتے رہے۔ اٹھتر برس کی عمر اور ایسی سردی رات کا وقت مگر ان سے صبر نہ ہوا۔ باہر نکلے۔ پوچھا وزیرن بچہ کیوں رو رہا ہے اس نے بیماری کا حال بتایا تو اصرار کرنے لگے کہ میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔ مگر وزیرن نے سمجھایا کہ اس وقت نہیں صبح کو دیکھا جائے گا۔ وزیرن کی تسلی تشفی کر کے واپس اپنے کمرے میں آئے مگر رات بھر بچے کی فکر لگی رہی اور سو نہ سکے۔ صبح ہی اپنے عزیز ڈاکٹر لیاقت حسین کو بچے کو دیکھنے کو بھیجا اور جب تک رہے انھیں تاکید کرتے رہے کہ بچے کا دھیان رکھنا۔

بچے کی ان کی نظر میں بڑی اہمیت تھی اور اس زمانے میں بھی جب اونچ نیچ ذات پات میں تمیز کی باتیں عام تھیں ان کے دل میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، اونچے نیچے کا ذرا بھید بھاؤ نہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا جو میں اب سناؤں گی۔

پانی پت میں ایک بار تانگے میں بیٹھے مولانا ایک محلے سے دوسرے محلے میں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ سڑک کے کنارے کچھ لوگ کھڑے ہیں معلوم ہوا ایک بچہ نالی میں گر گیا ہے۔ بچہ مہتر کا تھا اس لیے کوئی اُسے نالی سے نکال نہیں رہا تھا سب لوگ کھڑے رام رام کر رہے تھے۔ مولانا جھٹ تانگے سے اترے۔ نالی کے پاس جاکر جھکے اور گندگی کا خیال کیے بغیر دونوں ہاتھ اندر ہاتھ ڈال کر بچے کو باہر نکالا اور پاس کھڑے لوگوں سے کہا "جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ آپ کو اس ننھے بچے میں نظر آتا" بچے کے کپڑے اتارے اس کو صاف کیا اور اس کے ماں باپ کے گھر کا پتہ پوچھ کر خود اُسے ان کے سپرد کر کے آئے۔

بچوں سے محبت کے یہ چند واقعات ہم نے نمونے کے طور پر آپ کو سنائے ہیں۔ ان سے آپ ان کی سیرت کا تھوڑا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حالیؔ بچوں کو قوم کی بہت بڑی دولت سمجھتے تھے۔ خدا کرے ان کی قوم کے بچوں میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہوں جو خود حالیؔ میں موجود تھیں اور وہ حالیؔ کے وطن اور قوم کا نام اونچا کریں۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

یادِ حالیؔ

ادب کی وہ محفل رہے خالی خالی
کہ جس میں نہ ہو ذکرِ اشعارِ حالیؔ

وہ حالیؔ جو تھا خادمِ ملک و ملت
وہ حالیؔ کہ ہے مرتبہ جس کا عالی

وہ فطرت کا عاشق، وہ حکمت کا شیدا
وہ اخلاق کی جس نے مسند سنبھالی

وطن کی محبّت کے نغمے سُنائے
وہ بن کر رہا باغِ اُلفت کا مالی

وہ ہر نظم جس کی لڑی موتیوں کی
وہ اشعار ہیں جس کے پھولوں کی ڈالی

حقیقت نگاری میں شہرت ہے جس کی
ہے ضرب المثل جس کی شیریں مقالی

ہوئی جس سے علم و ادب کی ترقّی
ہے اُردو زباں جس کے نازوں کی پالی

عمل اور محبّت کا پیغام دے کر
وہ حالیؔ کہ پھر جس نے راہِ بقا لی

جو حالیؔ کی اخلاق میں پیروی کی
تو گویا رہِ راست نیّرؔ نے پالی

جناب آغا وزیر حسن دہلوی

مولانا حالؔی کی ایک جھلک

(۱)

مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی ہماری اگلے وقتوں کی تہذیب کا جیتا، جاگتا مُرقّع تھے۔ خلیق، سیر چشم، سادہ مزاج، جس نے ہنسی خوشی گزار دی۔ ادب زندگی کا نقش ہوتا ہی ہے۔ اُن کی زندگی کی عظمت اُن کے کلام میں بھی آئی۔ نثر میں حیاتِ جاوید، نظم میں مسدّس حالؔی سی اُن کی وہ با عظمت کتابیں ہیں جن پر ہمارے مُلک کا ادب ہمیشہ فخر کرے گا۔ نتھرا، ستھرا، جچا، تُلا طرزِ تحریر، وضیعی سے زیادہ فطری، سنجیدہ، دل نشین۔ کہتے ہیں کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں چکھ لیا جائے۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں نگل لیا جائے۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اُنھیں چبایا اور ہضم کیا جائے۔ مولانا حالؔی کی کتابیں چبانے اور ہضم کرنے کے لیے ہیں۔ مثلاً سوانح نگاری اور شعر شاعری کے اصولوں سے تو انھوں نے برسوں پہلے ہمارے ادب کو اِس ڈھنگ سے روشناس کیا کہ وہ آج کی بھی چیز ہے، کل بھی ملک اُس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ سچ یہ ہے کہ ہم اُن کی کتابیں نہیں پڑھا کرتے۔ اُن کی پاکیزہ خصلتیں پڑھتے ہیں۔ کُشادہ دِلی، بلند خیالی، اخلاص مندی کے جس ڈوب سے وہ کتابیں انھوں نے لکھی ہیں وہ رنگ ہمارے خون میں بھی گھُل جاتا ہے۔ اُن کا یہ اثر ہے۔ مُلک کے ایسے زندہ دل بُزرگوں کو یاد نہ رکھنا، اُن سے زندہ دِلی نہ سیکھنا بدذوقی ہے۔

(۲)

سب جانتے ہیں کہ فرنگی سامراج کے ہتھکنڈوں نے ایک وقت ہمارے ملک کا گلا گھونٹ دیا۔

تھا۔ گھٹن بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا جس کے نتائج نے ہمیں ایسا دبایا کہ گھگی بندھ گئی تھی۔ جن ہمدرد بزرگوں نے بڑے جتن سے ہمیں سنبھالا، دل آور بنایا، ان میں مولانا حالی بھی ہیں۔ غدر کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہماری آپس کی مخالفت تھی۔ غلامی سے نکلنے، آزاد ہونے کی ہماری جان توڑ کوشش کا نام دراصل غدر تھا۔ اس مخالفت نے ہمیں ایک نہ ہونے دیا۔ ہماری قیدِ غلامی کو ایک صدی اور بڑھا دیا۔ اسی پھٹکار سے اپنے پرائے بنے۔ دوسروں کی بن آئی۔ ہم ناکام رہے۔ اس بات کو مولانا حالی نے بھی تاڑا۔ چاہا کہ زبان کے ذریعے ہی ہم ایک بنیں۔ ملک سے نکبت دور ہو۔ ہمارے ملک کے دو بڑے رکن ہندو اور مسلمان ہیں۔ یہ دونوں اس طرح قریب ہوں کہ اردو زبان میں تالیف و تصنیف کریں" خم خانۂ جاوید" لکھتے ہوئے انھوں نے اس کو یوں واضح کیا ہے کہ نہ مسلمان بےضرورت عربی، فارسی کے الفاظ لکھیں، نہ ہندو بےضرورت ہندی، سنسکرت کے الفاظ لکھیں۔ ان زبانوں کے عام فہم الفاظ البتہ اردو زبان میں آئیں۔ یوں ہندو مسلمان دونوں میں صلح و آشتی کی بنیاد پڑے۔ وہ اردو داں جو ہندی اور سنسکرت نہیں جانتا۔ محض عربی اور فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے، وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی ہے جو عربی، فارسی سے نابلد ہے۔ صرف ہندی اور سنسکرت پر بھروسہ کر بیٹھا ہے۔ وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔ یہ لکھتے وقت مولانا حالی کی نظر یقیناً اس حقیقت پر تھی کہ ہر ملک کی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی بھی ایک زبان ہے۔ ہمارا ملک۔ بھانت بھانت کے لوگوں، بھن بھن کی زبانوں کا استھان ہے۔ یہاں ایسی ہی ایک زبان چاہیے۔ جو سب کی زبان ہو۔ ملک کے پورب، پچھم، اتر، دکھن بولی، سمجھی، لکھی، پڑھی جاتی ہو۔ جس زبان کا نام اردو ہے۔ وہ ایسی ہی ایک زبان ہے۔ اس سے ملک، ہم زبان، ہم خیال، ہم دل ہوگا۔ اس زبان کو ایک سے زیادہ زبانوں کے لفظ و خیال سے مالا مال ہونا چاہیے۔ اس نے انھیں اپنایا ہے۔ یہ انھیں اپنا سکتی ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے۔ اس خیال سے انھوں نے

ہندی کے لفظ اِس خوبی سے برت کر دکھائے ہیں کہ رشک آتا ہے۔

(۳)

مولانا حالؔی کی طرح مہاتما گاندھی نے بھی اِس زبان کو ملک کی یکجہتی کا ذریعہ جانا۔ چاہا کہ اس کو نستعلیق، اور دیوناگری دونوں رسمِ خط میں لکھا، پڑھا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ نستعلیق رسمِ خط عربی رسمِ خط کی ایک شکل ہے۔ عربی رسمِ خط لاطینی رسمِ خط کے بعد دُنیا کا سب میں زیادہ استعمال ہونے والا رسمِ خط ہے۔ نستعلیق رسمِ خط کے ذریعے ایک تو دُنیا میں بہت سوں سے ناتہ جُڑے گا۔ دوسرے اپنی خوبصورتی کی بدولت یہ رسمِ خط ہمارے مُلک کے حسنِ ذوق کا مرئی ثبوت بھی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اردو ہی ملک کی ہر دل عزیز زبان ہے۔ ہر کوئی اس کو اپنا سمجھتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ پنجاب اس کا جنم بھوم ہے۔ ایک کہتا ہے کہ دلّی میں اس نے جنم لیا۔ ایک کہتا ہے کہ دکن میں اس کا آغاز ہوا۔ اس کا فیصلہ تو مُہنجد ارو کی سی کسی کھُدائی کے بعد ہی ہو تو ہو۔ یہ واقعہ ہے جس کو پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ہمارا ملک اپنے رہنے بسنے والوں کے مذہبوں، نسلوں، تہذیبوں، ذاتوں، زبانوں کا بڑا نیرنگ ہے۔ اِس نیرنگی میں جو زبان یک رنگی لائی، سمجھوتا لائی وہ اُردو زبان ہے۔ اس کی یہ قدر و قیمت ہے۔ ملک کے اِس جمہوری دَور میں تو یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ہزاروں برس پہلے ہمارے ملک میں دیس دیس کے لوگ آئے۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ہی آئے۔ ہزاروں برس آیا کیے۔ یہ لوگ اپنی اپنی زبانیں بولتے تھے۔ ایک کچھ کہتا۔ دوسرا کچھ سُنتا۔ کچھ نہ سمجھتا۔ مُنہ تکتا رہ جاتا۔ کہنے کو لکھو کھا لوگ یک جا ہوئے۔ سوچیے تو اکیلے اکیلے تھے۔ آپس کا ہنسنا بولنا، ملنا جُلنا، لینا دینا کچھ نہ تھا۔ ایک دیس کے ہو کر بھی الگ الگ تھے۔ ہوتے ہوتے آخر کہنے سُننے کے ڈھنگ نکلے۔ سب کی ایک بولی، ایک زبان بنی۔ سب کی ملی جُلی جھولی سے ایک بیج گرا۔ زندگی، زمانے نے اس کو آسرا دیا، پالا، پوسا۔ وہی اُگا، بڑھا، پھولا، پھلا۔ درخت سا درخت بنا۔ جس کو آندھیاں بھی نہ گرا سکیں یہی بولی یہی زبان پہلے پہل پراکرت کہلائی۔ اسی نے ارتقائی کینچلیاں ڈالیں۔ ایک سے زیادہ روپ دھارے۔ پالی، مرہٹی، پشاچی، شورا سینی، ماگدھی ——— ایک روپ اُردو بھی ہے!

ناب ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

حالی اور بچّے

مولانا حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ماں باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ بھائی بہنوں نے پالا پوسا۔ انھوں نے پہلے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ کسی بزرگ سے فارسی پڑھ لی، کسی بزرگ سے عربی پڑھ لی، بس علم کا شوق تھا جو رہنمائی کرتا رہا اور حالی نے اسی طرح دھیرے دھیرے فارسی اور عربی میں کافی استعداد حاصل کرلی۔ پڑھنے کا انھیں اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ ایک مرتبہ گھر والوں سے چھپ چھپاکر دِلّی چلے آئے اور تقریباً ڈیڑھ برس تک مولوی نوازش علی مرحوم سے پڑھتے رہے۔

غرض مولانا حالی نے اسی پریشانی اور مصیبت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بڑے ہوئے تو روزی کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ پہلے حصار میں ملازم ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں نوکری ختم ہوگئی۔ کسی نہ کسی طرح جان بچاکر اپنے وطن پانی پت پہنچے۔ تین چار برس تک وطن میں رہے مگر علم کا شوق اس پریشانی اور بے روزگاری میں بھی جوں کا توں رہا۔ لیکن اپنے طور پر پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب ذرا امن ہوا تو پھر دہلی پہنچے، وہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی اور حالی ان کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوگئے۔ نواب صاحب کی صحبت سے حالی کو بہت فایدہ ہوا۔ شعر و شاعری کا باقاعدہ سلسلہ ان ہی کی صحبت میں قائم ہوا۔ حالی نے خود کہا ہے۔

غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا
حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے

مولانا حالی مرزا غالب سے پہلے پہل اس وقت ملے تھے جب وہ پہلی دفعہ دہلی پڑھنے کی غرض سے گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جن زمانے میں میرا دہلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کہنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے کہا:

'اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دہلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا'"

نواب صاحب کے ساتھ رہنے سے حالی کا شعر و سخن کا شوق تازہ ہوگیا اور وہ اپنا کلام مرزا غالب کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجنے لگے۔ یہ سلسلہ بھی سات آٹھ برس تک رہا۔

۱۸۶۹ء میں مرزا غالب اور شیفتہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ حالی پھر بے روزگار ہوگئے۔ اس مرتبہ انھیں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ایک جگہ مل گئی اور ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی عبارت کو درست کرنے کا کام دیا گیا۔ تقریباً چار برس تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ اس کام کی وجہ سے انھیں انگریزی سے مناسبت پیدا ہوگئی۔

اس کے بعد دہلی میں اینگلو عربک اسکول میں مدرس ہوگئے۔ اسی زمانے سے مولانا کو سکون نصیب ہوا اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہوگئے اور سرسید کی تحریک میں بھی عملی طور پر سب سے زیادہ حصہ اسی زمانے میں انھوں نے لینا شروع کیا۔

سرسید کی تحریک پر جب مولانا کو ادبی خدمات کے صلے میں حیدرآباد سے پہلے ۷۵ روپیہ ماہوار پھر سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا تو مولانا نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت ترک کر دی اور اپنا پورا وقت ادب کی خدمت

کرنے میں صرف کرنے لگے۔ اور آخری وقت تک علمی وادبی مشاغل میں مصروف رہے۔
انھوں نے کم وبیش اٹھارہ کتابیں نثر میں اور چھوٹی بڑی سینتیس ۳۷ کتابیں نظم میں لکھی ہیں۔ بہت سے نامکمل مسودوں کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ نثر میں درسی کتابوں کے علاوہ، مقالات حالی، یادگار غالب حیات سعدی، مقدمہ شعروشاعری، حیات جاوید، مکاتیب حالی اور نظم میں مد وجزر اسلام، دیوان حالی، مناجات بیوہ، شکوۂ ہند، اور بہت سی چھوٹی بڑی مثنویاں، متعدد ترکیب بند، قطعات، رباعیات اور مسدس وغیرہ یادگار ہیں۔

دن رات کی محنت کی وجہ سے مولانا حالی کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ ان کی طبیعت روز بروز خراب رہنے لگی، موت سے چند ماہ قبل بیماری کا سخت حملہ ہوا زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں ہو سکتا تھا علاج بہت ہوا مگر سب بے سود آخر یہی بیماری موت کا بہانہ بنی، اور وہ گھڑی آگئی جب مولانا حالی نے ملک بقا کے قاصد کا استقبال کرتے ہوئے دار فانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہا۔

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے ملکِ فانی الوداع
آگیا حالی کنارے پر جہاز — الوداع اے زندگانی الوداع

۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو، علم وادب کا یہ آفتاب، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ ایسے پرخلوص، دردمند، شریف، نیک نفس، بلند فکر اور قابل ادیب کہیں صدہا سال میں پیدا ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا حالی کی زندگی کا مختصر ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے کس طرح علم حاصل کیا اور بے سہارا ہوتے ہوئے بھی کس طرح علم وادب کے آفتاب بن کر چمکے؛ آدمی میں سچی لگن ہو، دُھن کا پکا ہو تو ساری رکاوٹیں ایک ایک کرکے دور ہو جاتی ہیں اور آخر کار کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

وہ زیادہ تر تعلیم سے متعلق رہے اس لیے انھیں بچوں کو سمجھنے کا کافی موقع ملا۔ ان کو بچوں سے

بڑی محبت تھی، وہ چاہتے تھے کہ ہمارے بچے بڑے ہوکر علم و ہنر میں بھی ممتاز ہوں اور انسانیت و شرافت میں بھی طاق ہوں۔ وہ بچوں کے دلوں میں اعلیٰ جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے، انھیں بہترین انسان بنانا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے بچوں کے لیے بڑی اچھی اچھی باتیں لکھیں۔ ان کی باتوں میں شیرینی بھی ہے گھلاوٹ بھی ہے دلکشی بھی ہے۔ وہ نصیحت بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ بری نہیں معلوم ہوتی۔ بچوں کے دلوں پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ انھیں زندگی کی حقیقت، کام کی اہمیت، وقت کی قدر و قیمت، اور دوسری تمام مفید باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ ان میں علم اور عمل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، ان میں نیک بننے اور نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حالیؔ نے ایسی مفید اور نتیجہ خیز باتیں، نظم میں زیادہ اور نثر میں کم لکھی ہیں۔ نظم میں انھوں نے غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، ترکیب بند، غرض ہر صنفِ سخن میں اور ہر موضوع، مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، وطنی اور فطری پر لکھا ہے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ خدا کی شان، جوانمردی کا کام، غوث اعظم، میں کیا بنوں گا، سپاہی، موچی، چھٹی رساں، روٹی کیونکر میسر آتی ہے۔ پینٹھ۔ گھڑیاں اور گھنٹے۔ دھان بونا۔ مرغی اور اس کے بچے۔ شیر کا شکار۔ بلّی اور چوہا۔ ایک چھوٹی بچی کے مسائل۔ حقوقِ اولاد یا لاڈ لا بیٹا وغیرہ۔ ان کے علاوہ غزلیات، رباعیات اور قطعات میں حکمت و نصیحت کا بیش بہا خزانہ بھرا ہوا ہے۔

دوسری نیچرل اور مکالمہ والی نظموں میں بھی بچوں کے لیے بہت کچھ مواد موجود ہے۔ حبِ وطن، نشاطِ امید، برکھارت، مناجات بیوہ، کلمۃ الحق، مناظرہ رحم و انصاف، مناظرہ تعصب و انصاف، جھوٹ اور اپکے کا مناظرہ۔ مناظرہ واعظ و شاعر، دولت اور وقت کا مناظرہ، مسدس حالی وغیرہ۔ ہر ایک میں بچوں کے لیے سبق آموز اور نصیحت خیز اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان بہت آسان اور دلچسپ ہے۔ بیان صاف اور شگفتہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں وہ اپنے خیالات ادا کرتے ہیں جنھیں بچے بہت آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔

حالیؔ بچوں کے دلوں میں خدا کی سچی محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ، ان میں، خدا پر یقین رکھنے اور اسی سے مدد طلب کرنے کا جذبہ بیدار رکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کی شان میں کہتے ہیں۔

اے زمین آسمان کے مالک　　ساری دنیا جہان کے مالک
توہی ہے سب کا پالنے والا　　کام سب کے بنالنے والا
بھوک میں توہمیں کھلاتا ہے　　پیاس میں توہمیں پلاتا ہے

اس کے بعد ان تمام انعامات الٰہی کا ذکر کیا ہے جن کو ایک بچہ بخوبی سمجھ سکتا ہے اور آخر میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں　　تیری مشکل کشائی کے قرباں

مناجات بیوہ میں 'خدا کی حمد' کتنی آسان زبان میں لکھی ہے !

اے سب سے اوّل اور آخر　　جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے دین اور دنیا کے مالک　　راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور پردار کے والی　　اے سارے سنسار کے والی
ناؤ جہاں کی کھینے والے　　دُکھ میں تسلی دینے والے
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا　　تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا　　بھید تیرے حکموں میں ہیں کیا کیا
ہر دَم تیری آن نئی ہے　　جب دیکھو تب شان نئی ہے

پیغمبر اسلام سے مولانا حالؔی کو عشق تھا' وہ چاہتے تھے کہ رسول پاک کی تعلیمات پر سچے دل سے عمل کیا جائے تاکہ دین اور دنیا دونوں جگہ فلاح حاصل ہو۔ رسول پاک کی ذات گرامی مجموعہ صفات تھی، آپ تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ اسی لیے آپ کو 'رحمۃ العالمین' کہا جاتا ہے۔ مولانا حالؔی نے مسدس مدو جزر اسلام میں نبی کی تعلیمات اور صفات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبایل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسدس میں خدا پر بھروسا رکھنے، اپنا کام آپ کرنے، ہمت و محنت کے ساتھ علم و فن کو حاصل کرنے اور اپنے اندر جملہ اخلاقی فضایل پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے جہاں تک ہو کام آپ اپنا سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو
تمھیں اپنی مشکل کو آساں کروگے تمھیں درد کا اپنے درماں کروگے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کروگے کروگے تمھیں کچھ اگر یاں کروگے
چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

بچوں میں جوش اور ولولہ، عزم و حوصلہ، ہمت و استقلال پیدا کرنے کے لیے انھوں نے متعدد نظمیں لکھیں۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ بہادری اور جوانمردی کا کام یہ ہے کہ سخت سے سخت اور جانی دشمن کو بھی مصیبتوں سے نجات دلائی جائے اور ان پر قابو پانے کے بعد بھی اس کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے لیے وہ ایک کہانی لکھتے ہیں کہ کسی دولت مند کے تین بیٹے تھے، تینوں نیک بہادر اور فرماں بردار۔ باپ نے آخری وقت ان سب سے کہا کہ تم میں سے جو سب سے زیادہ جوانمرد ہوگا اسی کو میں ایک قیمتی موتی انعام دوں گا۔ تینوں نے اپنے اپنے کارنامے بیان کیے۔

پہلے لڑکے کے نزدیک امانت میں خیانت نہ کرنا ہی جوانمردی کا کام ہے۔ اس نے فخریہ اپنی دیانتداری کو بیان کیا لیکن باپ نے سُن کر جواب دیا۔

اک خیانت کے نہ کرنے پر یہ ناز — شرم کی جا ہے تیری عمر دراز

دوسرے لڑکے نے اپنا یہ کارنامہ بیان کیا کہ اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک چھوٹے بچّے کو دریا میں ڈوبنے سے بچا لیا۔

باپ نے سُن کے یہ سب اس سے کہا — کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے — نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

ان کے بعد سب سے چھوٹا بیٹا آگے بڑھا اور اس نے بہت ادب سے یہ عرض کیا کہ میں نے اپنے جانی دُشمن کو موت کے منہ سے بچایا حالانکہ اگر میں چاہتا تو ؎

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار — اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ غار

لیکن مرتے ہوئے کو مارنا بہادری اور جوانمردی نہیں اس لیے میں نے اس کی جان بچائی اور ؎

منہ کو دامن سے گر ڈھانک لیا — اس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

باپ نے بیٹے کو دعا دی اور لڑکوں سے پوچھا کہ
بولو! اب کس سے ہوا کام بڑا؟

سعادت مند بیٹوں نے جواب دیا "حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے"

باپ بیٹوں کی اس سعادت مندی سے بہت خوش ہوا اور چھوٹے بیٹے کو قیمتی موتی انعام میں دے کر کہا ؎
لو، یہ ہو تم کو مبارک بیٹا

دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا اور احسان نہ جتانا، سب سے بڑی انسانیت ہے، پکے دین دار اور سچے ایماندار کی تعریف یہی ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے۔

یہی دین ہے اور ہے یہی ایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

جو لوگ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں، دوسروں کے لیے تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، دوسروں کی بھلائی

کے لیے اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے، وہی انسان کہے جانے کے مستحق ہیں اور انھیں کا نام وکام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا رہے ہیں۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں — راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے — روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ایک بزم مناظمہ قائم کی۔ اس بزم میں مصرع طرح کے بجائے کوئی عنوان دیدیا جاتا تھا اور شعراء اسی عنوان پر نظم لکھتے تھے۔ مولانا حالی نے اس بزم کے لیے چار نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں کافی مقبول ہوئیں۔ ان سے اردو شاعری میں نیچرل شاعری کی بنیاد پڑی۔ پہلی نظم 'برکھا رت' ہے۔ جس میں برسات کی مختلف کیفیتوں اور رسموں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم بچوں اور بوڑھوں دونوں کے لیے یکساں مفید اور دلچسپ ہے۔ دوسری نظم 'نشاط امید' ہے، امید ہی پہ دنیا قائم ہے۔ ناامیدی، زندگی کو موت سے بدل دیتی ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد مایوسیوں کے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں۔ دل میں عزم و حوصلہ، ہمت و استقلال کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ امید کو مخاطب کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں۔

اے مری امید، میری جاں نواز — اے مری دل سوز، میری کارساز
کاٹنے والی غمِ ایام کی — تھامنے والی دلِ ناکام کی
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں — تو نہ ہو تو ہوا بھی برہم جہاں
تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید — چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

تیسری نظم 'حبِ وطن' ہے۔ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہوتی ہے، وطن کے کانٹے پردیس کے پھولوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس نظم میں حالی نے وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ اہل وطن کے فرائض بھی بتلائے ہیں۔ میل ملاپ

ہمدردی ومحبت، خلوص دیگانگت، ایثار وقربانی کے بغیر وطن کی نہ خدمت ہوسکتی ہے اور نہ وطن ترقی کرسکتا ہے۔ حالی کے دل میں حب وطن کا سمندر موجزن تھا، انھیں وطن سے سچا عشق تھا یہاں تک کہ وہ اس کی ایک مشتِ خاک کے بدلے بہشت بھی لینا پسند نہیں کرتے۔

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

ان کے نزدیک وطن سے سچی محبت یہ ہے کہ قوم وملک کی تباہی وبربادی نہ دیکھی جاسکے۔ وہ اہلِ وطن سے کس درد بھری آواز میں کہہ رہے ہیں۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد؟ — نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد؟
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے — قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو — قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم وزر سے ہے

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اس بزم کے لیے انھوں نے آخری نظم مناظرہ رحم وانصاف لکھی۔ مناظرہ کے طور پر انھوں نے کئی اور نظمیں لکھیں۔ مناظرہ تعصب وانصاف، مناظرہ واعظ وشاعر، جھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، دولت اور وقت کا مناظرہ۔ یہ سب نظمیں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے میں رہنمائی کرتی ہیں۔ حالی نے ہر نظم میں بحث واستدلال سے کام لیا ہے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بتائی ہیں اس کے بعد فیصلہ کیا ہے۔ مثلاً مناظرہ دولت اور وقت

میں دولت اور وقت دونوں کی خوبیاں بتائی ہیں اور آخر میں وقت کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ وقت کہہ رہا ہے

جن کے قبضہ میں ہوں میں اے دولت　　　تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت
کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر　　　جا کے میں ہات سے آتا نہیں پھر
ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز　　　میری ایک ایک پل ہے ان کو عزیز
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں　　　ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں
نہ کوئی کام ہو ان سے انجام　　　نہ ارادہ ہو کوئی ان کا تمام

آخر میں وقت نے کہا کہ تجھ میں گن تو بہت ہیں مگر مجھے زیادہ بحث کرنے کی نہ فرصت ہے اور نہ طاقت

بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو　　　بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو
اس میں ہے میرا سراسر نقصان　　　کہ ہے انمول مری اک اک آن

حالی نے وقت کی قدر کرنے کا مشورہ دیا اور خود اس پر عمل کیا۔ لیکن ہندوستانی سماج اپنی آن پر اب بھی قائم ہے اس میں اب بھی دولت کی پوجا ہوتی ہے اور وقت جیسی انمول چیز کو پھوٹی کوڑی یا ایک نئے پیسے کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس دور میں تو معمولی سے معمولی چیز حاصل کرنے کے لیے وقت کو جس طرح برباد کرنا پڑتا ہے اس کی مثال، جاہل سے جاہل قوم اور پسماندہ سے پسماندہ ملک میں بھی مشکل سے ملے گی۔

حالی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق بغیر راستی اور راست بازی کے ناممکن ہے، وہ سچائی کو سب سے بہتر سیاست اور کامیابی و کامرانی کا سب سے موثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سچائی کے لیے ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے تیار رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ سچائی سب نیکیوں کی جڑ ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی عبادت ہے نہ نیکی۔ کلمہ حق میں مشاہیر عالم کی مثالیں دی ہیں کہ انھوں نے حق گوئی کی بدولت کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں، کسی کو زہر کا پیالا پینا پڑا، کسی کو سولی دی گئی، کوئی جلا وطن کیا گیا، لیکن شمع حق کے پروانے ہنستے کھیلتے یہ سب مصیبتیں جھیل لے گئے اور رہتی دنیا تک اپنا نام اور کام چھوڑ گئے، جس کی روشنی سے دنیا کی تاریکی دور ہو گئی۔

ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا　　　حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

پیام تعلیم

اے راست گوئی اے ابر رحمت ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے پر تیری دارو صحت فزا ہے

حالی نے راہ راست اختیار کی تھی، انھوں نے ادب میں، سماج میں، تعلیم میں، مذہب میں جو بات سچی پائی اس کا بے خوف ہو کر اعلان کیا، اس پر خود عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی مخالفت بھی ہوئی، اور انھوں نے مصیبتیں بھی برداشت کیں لیکن وہ راہ راست پر چلتے رہے۔ انھیں یقین تھا کہ

"ہوتی ہے سچ کی قدر پہ نا قدریوں کے بعد" اور

اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا پر فتح جب پائی، سچائی ہی نے آخر پائی ہے

حالی علم کو روشنی اور جہالت کو تاریکی سمجھتے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور طرح طرح سے سمجھایا ہے کہ علم وحکمت کے بغیر نہ کوئی قوم زندہ رہی ہے، نہ زندہ رہے گی، بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانا ضروری ہے۔ موجودہ زمانہ جاہلوں اور بے ہنر کے لیے، موت کا پیغام لے کر آیا ہے۔

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ ان کو کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز نہ فصادی، نہ جراحی، نہ کحالی، نہ عطاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

علم کی عظمت واہمیت پر حالی نے متعدد رباعیاں بھی لکھیں

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال غایب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

مولانا حالی تمام عمر اسی قسم کی اچھی اچھی باتیں لکھتے رہے، اسی لیے ان کو ہندوستان کا سعدی بھی کہا

جاتا ہے۔ شیخ سعدی نے بھی نثر و نظم دونوں میں نصیحت کے موتی پروئے ہیں اور مولانا حالی نے بھی۔ ان کا پورا کلام علم و حکمت، اخلاق و نصیحت کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ میں نے اس میں سے چند 'جواہرات' پیش کر دیے۔ 'سعدی ہند' کی 'امرت بانی' کا یہ تحفہ بچوں کے لیے کتنا مفید اور نصیحت آمیز ہے۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بے گانگی کی — نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

جناب وقار خلیل، حیدر آباد

حالی کی یاد



حالی خوش بیاں کی یاد آئی
ہائے کس مہرباں کی یاد آئی

جس نے بدلا نظامِ شعر و سخن
اُس مہر ضوفشاں کی یاد آئی

جس کی تحریر روشنی کی لکیر
صبح کے گلستاں کی یاد آئی

پست جب بھی ہوا شعورِ سخن
فکر کے آسماں کی یاد آئی

جس نے مہکائے فکر و فن کے چراغ
رشکِ صد کہکشاں کی یاد آئی

اِس سلگتے ہوئے زمانے میں
موجِ بحرِ رواں کی یاد آئی

جس نے تعلیم کا پیام دیا
پھر اُسی دلستاں کی یاد آئی

آج پھر ملک و قوم و ملت کو
حالی نکتہ داں کی یاد آئی

آخرِ شب سہی وقار خلیل
فخرِ ہندوستاں کی یاد آئی

جناب محمد اکبر الدین صدیقی حیدرآباد



حالی کی شاعری

مولانا حالی نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اس وقت ہماری شاعری بڑی بناؤٹی قسم کی ہوگئی تھی۔ ہمارے شاعر ایک تو شعر کہتے وقت بڑی مشکل زبان استعمال کر رہے تھے دوسرے یہ کہ زندگی میں جو باتیں ہوتی ہیں ان کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے شعر سن کر لوگوں نے تعریف تو کی مگر ان سے کوئی اثر قبول کرنا، کوئی سبق حاصل کرنا یا شعر میں کہی ہوئی بات پر چلنا ان کے لئے مشکل معلوم ہوا۔ یوں سمجھو کہ یہ شاعری فقط دل بہلاؤ اور دکھاوے کی شاعری تھی جس سے شاعر اپنے سننے والوں کا جی بہلاتا تھا۔ اس کی شاعری میں عشق و محبت کی بے سر و پا باتیں کہی ہوتی تھیں اور وہ اپنی قابلیت جتانے کے لئے عربی اور فارسی کے مشکل مشکل لفظ استعمال کرتا تھا۔

مولانا حالی کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کی غرض یہ ہوتی کہ ہماری بات فوراً سمجھ میں آئے اور پڑھنے یا سننے والا اس کا اثر قبول کرے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا کہنا بے کار ہے۔ بات اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب کہ سچی ہو اور سیدھی سادی زبان میں کہی گئی ہو۔ اسی لیے مولانا حالی نے شعر میں آسان زبان میں سچی باتیں کہنی شروع کیں۔ چونکہ انھوں نے عام شاعروں کے طریقے کے خلاف کام کیا اس لیے ابتدا میں ان کی شاعری کو پسند نہیں کیا گیا۔ مولانا حالی کو بھی لوگوں کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا مگر وہ اپنی بات پر

جمے رہے اور ان کی پسند اور ناپسند کا کوئی خیال نہ کیا۔ وہ سیدھے سادے انداز میں شعر کہتے رہے اور لوگ ان کی ہنسی اُڑاتے رہے۔ چنانچہ حالی ایک شعر میں یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے دل کا حال اپنے کسی دوست کے سامنے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی دوست ہی نظر نہیں آتا۔ شعر ہے ؂

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

ایک شعر میں فرماتے ہیں۔ ہمارا کام کہتے رہنا ہے ایک دن آئے گا کہ ہماری آواز اثر پیدا کرکے رہے گی ؂

سُنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سچی بات لوگوں کو عموماً کڑوی لگتی ہے۔ حالی نے بھی اپنی قوم اور اپنے ملک کے بارے میں بہت سی سچی باتوں کو بیان کیا تو لوگ بڑے غصے میں آگئے اور انھیں برا بھلا کہنے لگے۔ چنانچہ وہ اپنے مخالفوں کو کچھ کہنے کی بجائے اپنے آپ سے کہتے ہیں ؂ ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

لوگوں نے حالی کو مشورہ دیا کہ آپ ایسے اشعار کہیے جیسے ہمارے پچھلے شاعروں نے کہے ہیں۔ ان میں رنگینی ہے۔ دل کو بہلانے کی خوبی ہے، ذہن کو سکون دینے والی کیفیت ہے۔ روکھے پھیکے شعر کہنے سے کیا فائدہ!

اس پر مولانا حالی فرماتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم ذہن کے عیش و آرام کی باتیں کریں۔ "واہ وا" کہہ کر تعریف کرتے جائیں خواہ شعروں میں خوبی ہو یا نہ ہو۔ اب نہ ہمارے پاس دولت رہی نہ سلطنت، یہی دونوں چیزیں ہمیں عیش و آرام کی طرف لے جاتی ہیں۔ جب یہ زمانہ ہی گزر گیا تو ایسی شاعری سے کیا فائدہ؟ فرماتے ہیں ؂

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی بے وقت کی راگنی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو نئے حالات سے باخبر کریں، نئی نئی باتیں بتائیں۔ ان کو سمجھائیں کہ دُنیا کے دوسرے لوگ کس طرح ترقی کے میدان میں آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور ہم کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار

میں ان چیزوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالی نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

اس طرح شہر میں حالی نے ایسے نایاب مال کی دوکان کھولی ہے جس سے لوگ بہت کم واقف ہیں۔ یہ صحیح بھی ہے کہ نایاب مال کی اہمیت اور ضرورت جب تک سمجھ میں نہ آئے آدمی اُس کو لیتا نہیں۔ حالی نے اپنی آواز میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ ایک انداز میں شعر کہتے رہے اور آخر ایک وقت آیا کہ انھیں کہنا پڑا ؎

سُر بھی وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

یا تو ایک دن وہ تھا کہ کوئی ان کو شاعر سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا یا ایک دن یہ آیا کہ ان کے دُشمن اور مخالفین بھی ان کی شاعری کا لوہا مان گئے۔ حالانکہ انھوں نے اپنے شعر کہنے کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

ہمارے شاعروں نے خواہ وہ پرانے ہوں کہ نئے، زاہد اور واعظ کو ہمیشہ بُرا بھلا کہا ہے۔ لیکن حالی کی وضع داری نے انھیں بُرا کہنا گوارا نہ کیا۔ وہ اپنے خاص انداز میں ان کی بُرائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا دل نہ دکھے۔ اسی طرح انھوں نے بڑے بڑے مضامین اور معانی آسان الفاظ میں ادا کئے مثلاً کون ہے جس نے رنج و غم نہیں اٹھائے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

ایک جگہ وہ انسانیت کے مدارج کا اظہار کتنے سادہ طریقے سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

ہمارے شاعروں نے اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے بڑا اور بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور شعر میں ایسے مضمون بیان کرتے وقت دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے بلکہ برائیاں بیان کی ہیں۔ حالی نے بھی اپنے کو بڑا بتلانے کی کوشش کی مگر کسی کو نظروں سے گرایا نہیں۔ یہ دو شعر پڑھ کو اندازہ ہوسکے گا۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ
حالی نے اپنی قوم کے لیے "مسدس حالی" جیسی شاندار نظم لکھی۔ انھوں نے عورتوں کے لیے بھی کئی نظمیں لکھیں "مناجات بیوہ" ان کی سب سے آسان، سب سے زیادہ اثر میں ڈوبی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو لانے والی نظم ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا اور بڑوں کے لیے بھی۔ سعدی، غالب اور سرسید کی زندگی کے حالات بھی لکھے اور ان کے کارناموں کی اچھائی برائی کو بتایا۔ ہمیں شعر کے بارے میں بتایا کہ کیسا ہو۔ ان کی نظم اور نثر چنبیلی کے پھولوں کا ایک ڈھیر ہے جو پڑا ہنس رہا، مہک رہا اور مہکا رہا ہے۔ رنگینی نہیں ہے تو نہ ہو۔

پروفیسر غلام طیب کا ایک شعر ہے۔
دنیا نے پانی پت کو برسوں لہو سے سینچا
تب جا کے اس چمن میں پیدا ہوا ہے حالی
اور اس بات میں کتنی صداقت جھلکتی دکھائی دیتی ہے!!



مولانا حالی

پیارے نبیؐ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

جناب شمیم حنفی

لائق اُستاد کا لائق شاگرد

کسی بھی لائق استاد کے لائق شاگرد کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے پیارے استاد کے نام اور کام کو آگے بڑھائے۔ استاد کی زندگی کے اچھے پہلوؤں سے روشنی حاصل کرے، اس کی اچھی باتوں کو اپنائے اور انھیں دوسروں تک پہنچائے۔

غالؔب کو آپ سب اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ان کی گنتی ہماری زبان کے چند سب سے بڑے شاعروں میں ہوتی ہے۔ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہیں تھے، بلند انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی میں بڑا بانکپن تھا۔ ان کے مزاج میں بڑی خودداری، مروت، نیکی اور شرافت تھی۔ اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں حالؔی جیسا لایق شاگرد ملا جس نے ان کے بعد بھی ان کے نام اور کام کو آگے بڑھایا۔

غالؔب نے اپنے عزیز شاگرد حالؔی کو کسی درجے میں کورس کی کتابیں نہیں پڑھائی تھیں۔ وہ اس طرح کے استاد نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کو شاعری کا فن سکھایا۔ یوں تو حالؔی نے نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ جتنے بڑے نثر نگار تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ اور انھیں اتنا بڑا شاعر بنانے میں اُن کے لایق استاد غالؔب کا بہت ہاتھ تھا۔ غالؔب انھیں بتاتے تھے کہ اشعار میں کس قسم کی باتیں ہونی چاہئیں، یہ باتیں کس طرح کہی جائیں اور کیا کیا خوبیاں اچھے شاعر کے لیے ضروری ہیں۔

حالؔی بہت ذہین آدمی تھے۔ وہ خود بھی اچھی طرح یہ سمجھتے تھے کہ ہماری زبان اور ادب کو کس قسم کی شاعری کی ضرورت ہے۔ اس میں کیا کیا ایسی خوبیاں ہوں جن سے ہماری پیاری زبان دوسری بڑی زبانوں

کے ادب کی برابری کر سکے۔ پھر غالبؔ نے انھیں جو سبق دیے تھے، جو باتیں سمجھائی تھیں، ان کے سامنے جس قسم کی شاعری کا نمونہ پیش کیا تھا، ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر حالیؔ نے اچھی شاعری کے لیے کچھ اصول بنائے اور ایک نہایت قابلِ قدر مقالہ لکھا۔ اس مقالے کو حالیؔ کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے بڑی شہرت ملی۔ اس مقالے میں حالیؔ نے پہلے کی شاعری میں جو خرابیاں تھیں وہ بتائیں، جو کمی تھی اس کی طرف اشارے کیے اور یہ بھی بتایا کہ یہ خرابیاں کس طرح دور کی جائیں اور اس کمی کو کیسے پورا کیا جائے۔

اور یہی نہیں! حالیؔ نے یہ بھی کیا کہ ان کے استاد غالبؔ کی زندگی میں جو اچھی باتیں تھیں انھیں بھی دوسروں تک پہنچایا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے غالبؔ کے انتقال کے بعد ان کی زندگی اور شاعری پر ایک بہت اچھی کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام "یادگارِ غالب" ہے۔

یوں تو غالبؔ پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری پر سینکڑوں مضامین لکھے گئے ہیں اور آج بھی لوگ برابر غالبؔ پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن آج بھی "یادگارِ غالبؔ" غالبؔ کی زندگی اور شاعری پر بے حد اہم اور بہت اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

حالیؔ نے یہ کتاب صرف اس لیے نہیں لکھی کہ وہ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا جس کی طرف اس کتاب کے شروع میں انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حالیؔ کو غالبؔ سے بہت محبت تھی۔ وہ اچھے اور لائق شاگرد کی طرح دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے بہت قریب سے غالبؔ کو دیکھا تھا۔ اس لیے حالیؔ کے جاننے والوں نے ان پر زور دیا کہ وہ اس کتاب کو ضرور لکھیں۔

اس کے علاوہ حالیؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں وہ اچھی باتیں موجود ہیں جو کسی اچھے اور بلند انسان میں ہونی چاہئیں۔ غالبؔ کے جیسے انسان کسی بھی ملک یا قوم میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ شگفتگی اور زندہ دلی ہے جو ہمیں ہر حال میں خوش رہنے کا سبق دیتی ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں نہ جاننا بہت افسوس کی بات ہوگی۔ یہی وہ باتیں تھیں جنھیں ذہن میں رکھ کر حالیؔ نے یہ کتاب لکھی۔

"یادگارِ غالبؔ" میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں حالیؔ نے اپنے استاد کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ

بتایا ہے کہ غالب کب پیدا ہوئے، اُن کا خاندان کیسا تھا، انھوں نے کس طرح تعلیم حاصل کی، پیدائش سے لے کر موت تک ان کی زندگی میں کیا کیا واقعات ہوتے رہے، ان کے مزاج میں کیسی نیکی، شرافت، خودداری، سچ سے پیار اور جھوٹ سے نفرت، زندہ دلی، شگفتگی اور وضع داری تھی۔ انھوں نے کس جراءت اور بہادری کے ساتھ مصیبتوں اور دُکھوں کا مقابلہ کیا، اپنی پریشانی کے زمانے میں بھی کس طرح اپنی آن بان کا خیال رکھتے رہے اور دوسروں کی مدد کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ حالی نے اپنے استاد کی زندگی کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ ہم سب کے لیے ایک نمونہ بن سکتی ہے۔ حالی کے ایک ایک لفظ سے اس محبت، خلوص اور احترام کا پتہ چلتا ہے جو ان کے دل میں اپنے استاد کے لیے تھا۔

خود حالی کے مزاج میں بڑی سادگی اور شرافت تھی اور بے حد انکسار تھا۔ اس لیے انھوں نے پوری کتاب میں کہیں بھی یہ بتا کر لوگوں پر رعب جمانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ غالب سے کتنے قریب تھے یا غالب انھیں کتنا مانتے تھے۔ لیکن انھوں نے جس طرح غالب کی زندگی پر قلم اٹھایا ہے اس سے ہر پڑھنے والے کو شاگرد اور استاد کی گہری محبت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں حالی نے غالب کی اردو و فارسی شاعری اور نثر نگاری کی خوبیاں اور اچھائیاں بتائی ہیں۔ غالب کے اشعار کی مثالیں دے کر ان کی باتیں سمجھائی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اردو اور فارسی زبان و ادب میں غالب کتنی اہمیت اور کیسا بلند مقام رکھتے ہیں۔

اس طرح یہ کتاب صرف ایک شاعر کی زندگی کی کہانی یا اس کے کارناموں کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہ کتاب ہمارے سامنے ایک اچھی زندگی کی مثال پیش کرتی ہے۔ ایک ایسی شاعری کی خوبیاں بیان کرتی ہے جو ہر زمانے میں کسی بھی شاعر کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتی ہیں۔ ہماری زبان کے ایک ادیب نے اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ خود غالب بھی اگر اپنی زندگی کے بارے میں لکھتے تو ان کی کتاب شاید حالی کی اس کتاب سے زیادہ مختلف نہ ہوتی۔

حالی پہلی بار ۱۸۵۳ء میں دلی آئے تھے اور اسی وقت غالب سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس زمانے میں غالب بوڑھے ہو رہے تھے اور حالی نوجوان تھے۔ غالب نے جب ان کے چند اشعار سنے تو بہت زور

دے کر یہ کہا کہ وہ شعر کہتے رہیں۔ حالیؔ نے جب غالبؔ جیسے باکمال شاعر سے یہ بات سنی تو انھیں اپنے آپ پر اعتماد محسوس ہوا اور وہ برابر شعر کہتے رہے۔ جب تک وہ دلی میں رہے برابر غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان کو اپنے شعر دکھاتے رہے اور ان سے مشورے لیتے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں حالی اپنے وطن پانی پت چلے گئے لیکن دور رہ کر بھی وہ اپنے محترم استاد کو برابر خط لکھتے رہے اور انھیں یاد کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ یہی وہ انقلاب تھا جس میں ہمارے ملک والوں نے پہلی بار ایک ہو کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہر طرف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس ہنگامے کے بعد حالیؔ پھر دلی چلے آئے۔ دو سال یہاں رہے۔ پھر ایک ملازمت کے سلسلے میں باہر چلے گئے لیکن استاد کی محبت انھیں بار بار دلی لاتی رہی۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو جب مرزا غالبؔ کا انتقال ہوا اس وقت حالیؔ دلی ہی میں موجود تھے۔ پیارے استاد کی موت نے اُن کے ہوش گم کر دیے تھے۔ وہ اپنے استاد کی ایک ایک بات یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ غالبؔ کے بعد ساری دنیا اُن کی نظروں میں تاریک ہو گئی تھی۔ حالیؔ کے درد و غم کا کچھ اندازہ آپ کو اس مرثیے سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنے محبوب اور محترم کی وفات پر لکھا تھا۔ چند شعر دیکھیے:۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا ‎ ‎ ‎ شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دیکھیے! وہ کتنے درد کے ساتھ اپنے استاد کو یاد کرتے ہیں:۔

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں ‎ ‎ ‎ کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل ‎ ‎ ‎ کس سے دادِ سخنوری پائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں ‎ ‎ ‎ اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو ‎ ‎ ‎ سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ‎ ‎ ‎ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار نہیں بلکہ خون میں ڈوبے ہوئے آنسو ہیں جو الفاظ میں ڈھل گئے ہیں اب مرثیے کے آخری بند کے چند اشعار بھی دیکھیے، حالی یہ سوچ رہے ہیں کہ اب غالب کی جگہ کون لے گا ۔

ہند میں نام پائے گا اب کون — سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آئے تھے — جا کے دلّی سے آئے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

دیکھا آپ نے! ایک ایک لفظ میں حالی کے درد و غم کی تصویریں ابھر آئی ہیں۔

ان تمام باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہونہار شاگرد حالی کو اپنے لایق استاد غالب سے کتنی محبت تھی اور ان کے دل میں استاد کا کتنا احترام تھا۔ یوں تو غالب کو حالی کے علاوہ اور بھی کئی ہونہار اور اچھے شاگرد ملے لیکن حالی نے جس طرح استاد کا نام روشن کیا وہ کسی دوسرے شاگرد سے نہیں ہو سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کی سب سے اچھی یادگار خود حالی تھے۔ شاید اسی لیے ہماری زبان کے مشہور شاعر جناب صفی لکھنوی نے حالی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مرحوم تھے یادگارِ غالب — تلمیذِ دنا شعارِ غالب
دم سے ان کے بہارِ غالب — روشن شمع مزارِ غالب

کتنا اچھا ہو اگر ہر اچھے استاد کو حالی ہی جیسے ہونہار، نیک، ذہین، فرماں بردار اور لایق شاگرد ملیں —— !



جناب عبداللطیف اعظمی

مولانا حالیؔ اور شبلیؔ کے تعلقات

سرسیداحمد خاں کے بعد جن لوگوں نے اردو زبان وادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور اردو کے خزانے کو اچھی اچھی کتابوں اور اونچے اونچے خیالات سے مالامال کیا ہے، ان میں حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد دہلوی اور ذکاءاللہ دہلوی خاص طور پر اہم اور مشہور ہیں۔ ان پانچوں عالموں نے اپنے اپنے لحاظ اور طریقے سے اردو کی دل و جان سے خدمت کی۔ اس کا اعتراف عوام اور خواص کے علاوہ حکومت نے بھی کیا اور ان سب کو اُس زمانے کا بہت بڑا خطاب جسے شمس العلماء کہتے تھے، عنایت کیا۔ یہ پانچوں ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیچے ہم ان کی پیدایش اور وفات کی تاریخیں لکھتے ہیں، ان سے تم کو اندازہ ہوگا کہ ان لوگوں نے کتنی مدت تک ایک ساتھ گزاری ہے۔

نام	تاریخ ولادت	تاریخ وفات	تقریباً عمر
۱۔ شمس العلماء منشی ذکاءاللہ دہلوی	۱۸۳۲ء	۱۹۱۰ء	۷۸ سال
۲۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزادؔ	۱۸۳۵ء	۱۹۱۰ء	۷۵ سال
۳۔ شمس العلماء حافظ نذیر احمد دہلوی	۱۸۳۶ء	۱۹۱۲ء	۷۶ سال
۴۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ	۱۸۳۷ء	دسمبر ۱۹۱۴ء	۷۷ سال
۵۔ شمس العلماء مولانا شبلیؔ نعمانی	۱۸۵۷ء	نومبر ۱۹۱۴ء	۵۷ سال

اوپر کے چارٹ سے تم کو اندازہ ہوگا کہ ان پانچوں بزرگوں میں مولانا شبلیؔ کی عمر سب سے کم تھی۔ مگر انھوں نے کتابیں سب سے زیادہ لکھی ہیں

ـــــــــ ۔ ان کے بعد سب سے زیادہ کتابیں
ولانا حالی نے لکھی ہیں۔ ان دونوں کی کتابوں
کے مضمون بھی بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں، مثلاً
ان دونوں نے اردو کی تنقید نگاری اور سوانح
نگاری کو بہت ترقی دی۔ دونوں اُردو کے
بہت اچھے شاعر ہیں۔

جب دو آدمی ایک ہی میدان میں کام
کرتے ہوں تو ان میں اختلافات پیدا ہونے کا
بہت امکان ہوتا ہے اور جب ایک ہی مضمون
پر دو آدمی کتابیں لکھتے ہیں تو ان کی رایوں میں
اکثر اختلاف بھی ہو جاتا ہے کبھی کبھی اس سے
ان کے آپس کے تعلقات بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

اب دیکھیے حالی اور شبلی کا زمانہ ایک
ہے، انھوں نے ایک ہی مضمون پر کئی کتابیں
لکھی ہیں، کچھ باتوں میں ان کی رایوں میں خاصا
فرق بھی تھا، اس لیے بعض لوگوں نے لکھا ہے
کہ ان کے آپس کے تعلقات اچھے نہیں تھے، مگر
یہ بات صحیح نہیں ہے۔

جن لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو
دیکھا ہے اور ان کے حالات سے اچھی طرح واقف
ہیں، انھوں نے ان کے اخلاق اور ان کی رواداری
کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دونوں ایک
دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے، ایک دوسرے
کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کی بڑائی
اور اچھائی کا چرچا کرتے تھے۔ ان دونوں کے
خط کتاب کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ ان
کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو ایک
دوسرے کے خط کا انتظار رہتا تھا، جب ان
میں سے کسی کی کوئی کتاب چھپتی تھی تو ایک
دوسرے کو بھیجتے تھے اور دونوں ایک دوسرے
کی کتابوں کی تعریف کرتے تھے، اور علمی کاموں
اور خدمتوں کو سراہتے تھے۔ مثلاً مولانا حالی نے
اپنے ایک خط میں مولانا شبلی کو لکھا ہے:-

"اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ
کے درود نے میری آنکھوں کے ساتھ
وہی کام کیا جو پیراہن یوسف نے چشم
یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔"

تم نے غالباً حضرت یعقوبؑ اور حضرت
یوسفؑ کا قصہ سنا ہوگا۔ حضرت یوسف کے
بھائی ان سے حسد کرتے تھے۔ وہ لوگ ایک
دن دھوکا دے کر ان کو جنگل لے گئے اور ان
کو ایک اندھے کوئیں میں ڈال دیا اور گھر واپس

آکر ان کے والد حضرت یعقوب سے کہا کہ ان کو بھیڑیا اُٹھالے گیا۔ حضرت یعقوب اپنے بیٹے کے غم میں اس قدر روئے' اس قدر روئے کہ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔ حضرت یوسف کو کچھ لوگوں نے کوئیں سے نکال لیا اور ان کی جان بچا لی، مگر ان کو مصر لے جاکر بیچ دیا۔ حضرت یوسف کو اس کا اندازہ تھا کہ ان کے والد ان کے غم میں کس قدر نڈھال ہوں گے، اس لیے کسی ترکیب سے اپنے کپڑے اپنے والد کو بھجوا دیے۔ جب حضرت یوسف کے کپڑے حضرت یعقوب کو ملے تو انھوں نے اپنے چہیتے بیٹے کی محبت میں ان کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور کہتے ہیں آنکھوں کی روشنی واپس آگئی۔ مولانا حالؔی نے اپنے خط میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب سوچو، جب انھوں نے مولانا شبلی کے خطوں کے بارے میں اس طرح لکھا ہے تو اس سے اندازہ کر سکتے ہو کہ ان کو مولانا شبلی سے کس قدر محبت تھی۔ اسی خط میں آگے چل کر مولانا حالؔی نے مولانا شبلی کی کتابوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ زبان زرا مشکل ہے اور عربی کا ایک فقرہ لکھا ہے اس لیے ہم تم کو صرف اس کا مطلب بتلاتے ہیں۔ مولانا حالؔی لکھتے ہیں کہ " آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا کہ جس نے آپ کی کتابوں کی قدر و منزلت کو پہچان لیا، اس کی زبان گونگی ہو گئی"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ " آپ کا وجود قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔"

اسی طرح ایک اور خط میں مولانا شبلی کی ایک کتاب "دستۂ گل" کی تعریف کی ہے۔ اس کتاب میں مولانا شبلی کی فارسی نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ مولانا حالؔی لکھتے ہیں:

> "میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ بھی ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں۔ مگر "دستۂ گل" کے دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔"

مولانا عبدالحق صاحب کو جنھیں بابائے اردو کہا جاتا ہے، مولانا حالؔی سے بڑا گہرا تعلق تھا اور مولانا حالؔی بھی ان کو اپنے عزیزوں کی طرح مانتے تھے۔ مولانا عبدالحق نے اُردو کے اچھے

دیبوں کی ایک فہرست بنائی تھی، جن کے متعلق مضامین لکھوانے کا ارادہ تھا۔ اس فہرست میں مولانا شبلی کا نام کسی وجہ سے رہ گیا تھا۔ جب مولانا حالی کو اس کی خبر ہوئی تو مولوی عبدالحق صاحب کو فوراً لکھا:۔

"اس سے زیادہ تعجب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فرد گزاشت (اتفاقی غلطی) کو سوائے اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔"

ٹھیک جس طرح مولانا حالی نے مولانا شبلی کی جگہ جگہ تعریف کی ہے اور ان کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے، اسی طرح مولانا شبلی نے بھی ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ فارسی زبان کے مشہور ادیب شیخ سعدی پر جب مولانا حالی کی کتاب شائع ہوئی تو مولانا شبلی نے اپنے ایک عزیز کو خط لکھا، جس میں اس کی بڑی تعریف کی اور لکھا:۔

"میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ دیکھو کہیں واپس نہ جائے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے، واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب کے اور کئی خریدار پیدا کرنے چاہئیں۔"

ایک مرتبہ مولانا شبلی کو ان کے ایک عزیز نے مرزا غالب پر لکھنے کے لیے کہا تو انھوں نے جواب دیا۔

"مرزا غالب کے حالات در یو یو مولوی حالی نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے۔"

مولانا حالی کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے خط لکھا:۔

"مولانا! آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو خطاب دیتا ہوں! اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی ......"

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا سلوک کرتے تھے۔

مولانا حالی

کہنا بڑوں کا مانو

اے بھولے بھالے بچّو! نادانو! ناتوانو!
سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
حکم ان کا ماننے میں برکت ہے میری جانو!
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ اور اُستاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمہارے نعمت
کڑوی نصیحتوں میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ کا عزیزو مانا نہ جس نے کہنا
دُشوار ہے جہاں میں عزت سے اُس کا رہنا
ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلت کا اس کو سہنا
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے ان کی ملامتوں سے
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

تم کو نہیں خبر کچھ اپنے بُرے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی، اتنی ہی عقل چھوٹی
ہے بہتری اسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اس بات سے بچو تم، جس بات پر وہ ٹوکیں
جھک جاؤ دوڑ کر تم گر آگ میں وہ جھونکیں
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

جو دیں تمہیں وہ کھاؤ، نعمت سمجھ کر اُس کو
دیں زہر بھی تو پی لو، امرت سمجھ کے اس کو
اور خاک دیں تو لے لو، دولت سمجھ کے اُس کو
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ہے کوئی دن میں پیارو، وہ وقت آنے والا
دُنیا کی مشکلوں سے تم کو پڑے گا پالا
مانے گا جو بڑوں کی، جیتے گا وہ ہی پالا
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

جناب غلام ربانی

مولانا حالی اور مولوی عبدالحق

دنیا میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو شروع ہی سے اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دے لیتے ہیں لیکن مقصد مقصد میں فرق ہے، اگر اس میں کوئی ذاتی فائدہ رکھا گیا ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑا آدمی وہ ہے جو ہر وقت انسانیت کی بھلائی کو سامنے رکھے اور اسی دھن میں اپنی زندگی گزار دے۔ مولانا حالی اور مولوی عبدالحق ایسے ہی بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنی پہاڑ سی زندگیاں قوم کی بھلائی کے کاموں میں کاٹ دیں

نصیحت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کا حق اس شخص کو ہے جو خود بھی باعمل ہو، نیک نیت اور پاک سیرت ہو۔ اس میں ہمدردی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا حالی کی ذات میں جمع تھیں۔ پھر نصیحت کرنے کا ڈھنگ بھی ہوتا ہے۔ وہ بڑی محبت اور شفقت سے نصیحت کرتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی کی طرح نشتر نہیں چبھوتے تھے۔ لوگوں کا مذاق نہیں اڑاتے تھے بلکہ جو بات کہتے تھے اس میں دل سوزی ہوتی تھی جو دلوں میں اتر جاتی تھی۔ اس کا اثر اس درجہ ہوتا تھا کہ ان کے کلام پر لوگ آبدیدہ ہو گئے ہیں۔ وہ بہت بڑے وطن پرست تھے قوم کا درد ان کے دل میں اتنا تھا کہ عمر بھر قوم کی بے کسی پر آنسو بہاتے رہے۔

آدمی کتنا ہی بڑا عالم ہو اگر وہ خوش اخلاق نہیں ہے تو اس کا علم و فضل بے معنی ہو جاتا ہے علم کی یہی شان ہوتی ہے۔ مولانا حالی کی علمی شان ان کا انکسار اور فروتنی تھی۔ جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں، ان کے کلام سے

سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے نیک نفس تھے۔ کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ جو لوگ ان کی برائی کرتے، ان کی برائی سے کبھی اپنی زبان یا قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

مولانا حالی بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے ادیب تھے۔ یہ دونوں خوبیاں ایک ذات میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ انھوں نے شاعری میں پرانی روشس کو بدلا۔ لوگوں کے غور و فکر کے لیے نئی راہیں نکالیں۔ جس طرح انھوں نے شاعری میں انقلاب پیدا کیا، اسی طرح اپنی متین اور سنجیدہ نثر سے ادب میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ زبان پر ان کو بڑی قدرت تھی۔ انھوں نے ہندی کے بہت سے ایسے لفظ بھی استعمال کیے ہیں جن کو شاعروں اور انشا پردازوں نے اپنے لائق نہیں سمجھا تھا۔

مولانا کے زمانے میں کئی بلند پایہ ادیب تھے جن کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں مگر ان کی نثر میں صنعت گری تھی۔ بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے لفظوں کی دکان لگائی جاتی تھی۔ اُن کو تشبیہوں اور استعاروں سے سجایا جاتا تھا۔ لیکن بناوٹ کی باتیں زیادہ دن نہیں چلتیں۔ ان کا طرز تحریر زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ مولانا حالی خیال کو سب سے پہلے رکھتے تھے۔ وہ پڑھنے والے پر رعب نہیں جماتے تھے بلکہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے چاہے عبارت میں شگفتگی کم ہو جائے۔ ان کا بیان جچا تلا اور مدلل ہوتا تھا۔ اس میں سادگی اور متانت تھی۔ آج کل کی نثر میں جو متانت ہے وہ مولانا کا طفیل ہے۔

بچوں کو بوڑھوں سے کم دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر مولانا کو بچے بھی پسند کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ مولانا حالی تبدیل آب و ہوا کے لیے فرید آباد تشریف لے گئے۔ وہاں وہ سید ہاشمی مرحوم کے ہاں ٹھہرے۔ ان کی آمد کے موقع پر ایک جلوس نکالا گیا جس میں قصبے کے تمام لڑکے موجود تھے۔ اس میں زیادہ تر دس بارہ برس کے بچے تھے جو "مولانا حالی زندہ باد" کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ ان کے نعروں میں صرف ایک ہی چیز تھی جس کو محبت کہتے ہیں اس بچھیرا پلٹن کو دیکھ کر مولانا مسکرا رہے تھے۔ میں نے اس شان کا جلوس آج تک نہیں دیکھا۔

مولوی عبدالحق بچوں میں بچے، جوانوں میں

جوان مگر بوڑھوں میں بوڑھے ہرگز نہیں تھے۔
انھوں نے ۹۲ سال کی عمر پائی مگر بوڑھے کبھی نہیں ہوئے آخر تک جوان رہے۔ ان کے بڑھاپے پر جوانی کو رشک آتا تھا۔ ان کو دیکھ کر کچھ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ دنیا میں ایسی نظیر ملنی مشکل ہے کہ کسی ایک ہستی نے کسی زبان کے لیے اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔ اسی لیے اب ان کا نام "بابائے اردو" پڑ گیا ہے۔

مولانا عبدالحق کو مولانا حالی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ مولانا کا ذکر اس محبت اور ادب سے کرتے تھے جیسے کوئی مرید اپنے پیر کا حال بیان کرتا ہے۔ وہ مولانا حالی کے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے مولانا کے طرزِ تحریر پر کچھ اعتراض کیے ہیں، ان کا جواب مولوی صاحب نے اس طرح دیا کہ مولانا کی نثر کی خوبیاں اجاگر ہو گئیں۔

مولانا حالی کی طبیعت کا اثر مولوی صاحب کے مزاج پر کچھ زیادہ نہیں پڑا البتہ ان کے طرزِ بیان پر پورا اثر تھا وہی سلاست اور روانی تھی۔ مولانا کے ہاں شگفتگی کی جو کمی تھی اس کو پورا کر دیا تھا۔ سادہ لکھنے کو اور بھی لکھتے ہیں لیکن ان کی سادگی میں جو حسن ہے وہ آج تک کسی انشاپرداز کو نصیب نہیں ہوا۔ اس سادگی میں قوت اور تاثیر تھی اس کی وجہ ان کا خلوص تھا، حق و صداقت تھی، جو بیان کی جان ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں چھوٹے چھوٹے لفظ اس طرح بٹھاتے تھے کہ وہاں سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ مولانا کی طرح مولوی صاحب نے بھی ہندی کے بہت سے لفظ استعمال کیے ہیں جو اب مقبول ہو گئے ہیں۔
ادب میں وہ جس بلند مقام پر پہنچ گئے تھے آخیر تک وہیں جمے رہے کوئی ان کو وہاں سے نہ ہٹا سکا۔

مولوی صاحب میں عزم و استقلال بلا کا تھا۔ جس کام کو اٹھاتے تھے اس کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے، کیسی ہی مشکل پیش آتی، ہمت نہیں ہارتے تھے۔ ان میں خلوص اور ایثار اس درجہ تھا کہ انھوں نے اپنی ذات کو مٹا دیا تھا۔ ان کی کامیابی کی بڑی ذمہ دار اُن کی محنت اور جفاکشی ہے۔ دن رات کام کرتے تھے اور تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اس میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں انھوں نے اردو کی راگنی نہ چھیڑی ہو۔ شہر شہر اور قصبہ قصبہ اتنے

پھرے کہ زمین کا گز بن گئے۔ انھوں نے اردو کی خاطر جوانی کی اُمنگ، بڑھاپے کا سکون، عمر بھر کی کمائی اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا، وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اردو کی دھن میں لگے رہتے تھے۔

مولوی صاحب کو قدرتی منظر بہت پسند تھے اورنگ آباد میں وہ ایک پہاڑی کے دامن میں رہے تھے حیدرآباد میں ان کا بنگلا پہاڑی کے اوپر تھا۔ گرمی کے موسم میں اکثر کوئٹہ، شملہ، مسوری، دارجلنگ وغیرہ کسی پہاڑی مقام پر چلے جاتے تھے۔ درختوں سے ان کو عشق تھا۔ ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ان کو درختوں سے لپٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

مولوی صاحب نے امیرانہ زندگی بسر کی، وہ بڑے نفاست پسند تھے، اچھی جگہ، اچھا مکان، اچھا کھانا پینا، اچھا لباس ان کی زندگی کے لوازمات تھے۔ روزمرہ کا ایک معمول تھا، جس میں فرق نہیں آتا تھا۔ صبح ٹھنڈے پانی سے نہاتے، دن بھر کام کرتے، شام کو ٹہلنے چلے جاتے تھے۔ اس وقت کرتے کے گریبان کا اوپر کا بٹن کھلا ہوتا تھا، ننگے سر، ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے پہاڑیوں میں نکل جاتے تھے۔

مولوی صاحب گھڑی نہیں رکھتے تھے مگر وقت کے بڑے پابند تھے، وجہ یہ تھی کہ وہ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ وقت ضائع کرنے کو بہت بڑی فضول خرچی سمجھتے تھے۔ بہت خوش طبع تھے، خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اپنی تکلیف دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے شاید وہ اس کو اپنی شکست سمجھتے تھے۔ وقت بہت بڑی دولت ہے۔ اس کے خرچ کا حساب رکھتے تھے اور قدرت سے اس کا معاوضہ کام کی شکل میں وصول کرتے تھے۔ کبھی باتوں میں زیادہ وقت گزر جاتا تو ہڑبڑا کر اٹھتے اور کہتے، افوہ! بہت وقت گزر گیا۔ یہ کہہ کر کام پر جا بیٹھتے۔ کام میں ان کو راحت ملتی تھی بلکہ یہ ان کی عادت تھی۔

مولانا حالی اور مولانا عبدالحق نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اردو زبان دنیا کے پردہ پر باقی ہے ان دونوں بزرگوں کا نام بھی باقی رہے گا۔



جناب اظہر افسر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

پیام

ڈرامے کے کردار :— حامد
نجمہ
مولانا حالی

(ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ ہے ۔ درمیان میں میز ہے آس پاس کچھ کرسیاں رکھی ہیں دیوار پر اردو زبان کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تصویریں لگی ہیں ، حامد (عمر گیارہ سال) ایک آرام کرسی پر دراز ہے اور ہاتھ میں کوئی پرچہ لیے مولانا حالی کی نظم "امید" کے کچھ شعر ترنم سے پڑھ رہا ہے ۔)

حامد :- بہت ڈوبتوں کو تیرایا ہے تو نے بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے اجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے
بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے اندھیرے میں اکثر اجالا کیا ہے
بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو ......

مولانا حالی : (دائیں جانب سے مولانا حالی قدیم طرز کا دُہرا پاجامہ اور سیاہ اچکن پہنے چاندی کی کمانیوں والا چشمہ لگائے ترکی ٹوپی اوڑھے داخل ہوتے ہیں ۔ ڈاڑھی بھک سفید ہے) خوب — بہت خوب ۔

حامد: کون ۔۔ آ ۔۔ آ ۔۔ آپ؟
مولانا حالیؔ: ڈرو نہیں۔ میں حالیؔ ہوں جس کی تم یہ نظم پڑھ رہے ہو۔
حامد: مولانا حالیؔ؟
مولانا حالیؔ: ہاں، خواجہ الطاف حسین حالیؔ
حامد: م ۔۔ م ۔۔ مگر آپ؟ (اوپر ایک فریم کی جانب دیکھتا ہے) آپ کی تصویر؟
مولانا حالیؔ: میں خود جو یہاں موجود ہوں تو تصویر کی کیا ضرورت ہے۔
حامد: اوہ ۔۔ تو آپ تشریف رکھیے نا۔
مولانا حالیؔ: تم نے اس درد سے میری نظم پڑھی کہ میں بے اختیار ہو اٹھا۔ کیا نام ہے تمھارا؟
حامد: جی میرا نام ۔۔ حامد ہے۔
مولانا حالیؔ: کون سے درجے میں پڑھتے ہو؟
حامد: جی گرام اسکول کے ساتویں درجے میں۔
مولانا حالیؔ: ماشاءاللہ۔
نجمہ: (بائیں جانب ایک ننھی سی لڑکی (عمر نو سال) دکھائی دیتی ہے)۔ حامد بھائی تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟
حامد: ارے نجمہ ۔۔ آؤ آؤ اندر آؤ۔ آپ کو پہچانتی ہو؟
نجمہ: (اندر آجاتی ہے) نہیں تو ہیں تو یہ کہنے آئی تھی کہ کل کے جلسے میں میں بھی چلوں گی۔
مولانا حالیؔ: کیسا جلسہ؟
حامد: آپ کو شاید تعجب ہو کل ہمارے پیارے رسالے "پیام تعلیم" کی جانب سے آپ کی پچاسویں برسی منائی جا رہی ہے اس جلسے میں، میں آپ کی وہ نظم پڑھنے والا ہوں جس کی ابھی ابھی مشق کر رہا تھا۔
نجمہ: میں بھی مولانا حالیؔ پر ایک چھوٹا سا مضمون پڑھوں گی۔
حامد: نجمہ آپ ہی مولانا حالیؔ ہیں۔
نجمہ: (حیرت سے) مولانا حالیؔ ۔۔ تسلیم۔
مولانا حالیؔ: جیتی رہو بیٹی، سدا پھولو پھلو ۔۔
نجمہ: ابا کہتے ہیں آپ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے، آپ نے ڈھیر ساری چیزیں بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے لکھی ہیں۔ آپ مجھے اپنا کچھ حال سنائیے نا۔ کل کے جلسے میں، میں آپ پر ایک مضمون

پڑھوں گی۔

مولانا حالی: مجھ پر مضمون پڑھو گی؟

نجمہ : جی ہاں ۔ بتائیے نا ۔ آپ کب پیدا ہوئے، کہاں پیدا ہوئے اور.....

(مولانا حالی پیچھے ہاتھ باندھے ٹہلنے لگتے ہیں)

مولانا حالی: آج سے کوئی ایک سو اٹھائیس سال پہلے میں ایک چھوٹے سے قصبے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔

حامد : وہی پانی پت جس کی تین لڑائیاں تاریخ میں بہت مشہور ہیں؟

مولانا حالی: ہاں وہی ۔ میں ابھی بہت چھوٹا تھا کہ مجھ سے اپنے ماں باپ کا پیار چھن گیا۔ اور نو برس کی عمر ہی سے میں اپنے بڑے بھائی کی نگرانی میں آگیا۔ بچپن ہی سے تعلیم کا شوق میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ میرے بڑے بھائی نے پہلے تو مجھے قرآن حفظ کروایا۔ قرآن شریف کے بعد میں نے فارسی اور طب کی کتابیں پڑھیں، پھر عربی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن....

حامد : لیکن؟

مولانا حالی: بہت جلد مجھے روزی کمانے کی فکر کرنی پڑی اور کوئی انیس برس کی عمر میں ضلع حصار میں ایک چھوٹی سی نوکری کرلی، پھر جب سن ستاون میں آزادی کی لڑائی شروع ہوئی تو میں یہ ملازمت چھوڑ کر پانی پت چلا آیا اور چار برس تک بالکل بے کار رہا۔ یہ دن بڑی مصیبت میں گزارے لیکن اس عرصے میں مختلف استادوں سے میں طرح طرح کے علوم سیکھتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے کی بھی کوشش کرتا رہا۔

حامد : سب سے پہلی نظم آپ نے کون سی لکھی؟

مولانا حالی: وہی جو ابھی تم گنگنا رہے تھے، ویسے میں جب ملازمت سے پہلے کچھ دنوں دلی میں تھا تو اردو زبان کے مشہور شاعر حضرت مرزا غالب کی شاگردی کا بھی مجھے فخر حاصل ہوا تھا، پھر ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے

ہندوستان میں ایک انوکھے مشاعرے
کی بنیاد ڈالی یہ مشاعرہ اپنی طرز کا پہلا
مشاعرہ تھا۔

نجمہ : وہ کیسے؟

مولانا حالی: ایسے کہ اس مشاعرے میں صرف
موضوع یا عنوان دے دیا جاتا تھا
کہ شاعر اس پر اپنی طرف سے نظمیں
لکھ کر لائیں۔ میں نے کوئی چار نظمیں
لکھیں۔

حامد : کون کون سی؟

مولانا حالی: برسات، امید، رحم و انصاف اور
حب وطن اور پہلے مشاعرے میں یہی
نظم امید سنائی، ان نظموں کی ایسی
دھوم مچی کہ حد نہیں، تم نے سرسید احمد
خاں کا نام تو سنا ہوگا۔

حامد : ہاں، ہاں کیوں نہیں ان کا ایک مضمون
"تہذیب" تو ہمارے اردو نصاب
میں ہے۔

مولانا حالی: یہ میرے بڑے پیارے دوست تھے،
ان ہی کے کہنے پر میں نے مسدس
لکھی، یہ مسدس اس قدر مقبول ہوئی
کہ اس زمانے کے بچے بوڑھے نوجوان
سبھی گھر گھر گاتے اور جھومتے پھرتے
تھے، دور دور تک اس کا شہرہ ہوا۔

حامد : جی ہاں ابا کہتے ہیں قدیم زمانے کی
شاعری میں صرف گل و بلبل کے
افسانوں کا چرچا تھا سب سے پہلے
آپ ہی نے قومی شاعری کی بنیاد ڈالی
اور ایسی نظمیں لکھیں جو ہماری سوئی
ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا سبب بنیں،
آپ کی یہ نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔
چپ کی داد، مد و جزر اسلام، شکوۂ ہند،
حقوق اولاد اور مناجات بیوہ وغیرہ۔

نجمہ : آپ نے شاید نثر کی بھی تو کئی کتابیں
لکھیں ہیں۔

مولانا حالی: ہاں میری نثر کی کتابوں میں "حیات
سعدی" اور "حیات جاوید" جس
میں میں نے اپنے عزیز دوست
سرسید کی زندگی کے حالات لکھے
ہیں بہت پسند کی گئیں۔

حامد : اور "یادگار غالب"، جس میں آپ نے
مرزا غالب کی زندگی کے واقعات

پر لطف انداز میں بیان کیے ہیں اردو
کے کلام کا انتخاب دیا ہے؟ ابا کہتے
ہیں اردو زبان میں سوانح عمری لکھنے
کے آپ ہی بانی ہیں، نظم کی طرح آپ
کی نثر بھی بہت صاف ستھری اور پاکیزہ
ہے۔ اردو میں تنقید نگاری یعنی کسی
مضمون یا شعر کی اچھائی برائی لکھنے
کے فن کی بھی آپ ہی نے ابتدا کی ہے۔

نجمہ مجھے تو آپ کی نظمیں بے حد پیاری
لگتی ہیں بے حد پیاری!

مولانا حالی : میرا مقصد اپنی ساری تحریروں سے
صرف یہی تھا کہ آج کے بچے جو کل
بڑے ہوں گے اور آج کے نوجوان
جو آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالیں
گے اس طرح اپنے اخلاق کو سنواریں،
ایسی عمدہ تربیت پا جائیں کہ وہ دنیا
کے مثالی انسان بن جائیں۔

حامد : ہم آپ کی تعلیمات کو پورا کریں گے مولانا،
آپ نے جو سبق ہمیں دیے ہیں، آپ
نے جو راہ ہمیں دکھائی ہے، ہم زیادہ
سے زیادہ بچوں اور نوجوانوں تک
پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ میں — میں
آپ کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ آپ نے
جو ہمیں محبت، بھائی چارے، اتحاد،
محنت، دیانت اور سچائی کے پیام دیے
ہیں یہ پیام نہ صرف اپنے دوستوں ساتھیوں
کو پہنچاؤں گا بلکہ ساری دنیا کے بچوں
تک پہنچانے کی کوشش کروں گا —
مولانا آپ تشریف رکھیے نا۔ کتنی دیر سے
آپ ٹہل رہے ہیں — نجمہ — مولانا
کی کچھ خاطر نہیں کرو گی؟

مولانا حالی : نہیں نہیں کسی خاطر کی ضرورت نہیں۔

نجمہ : میں ابھی آئی (دوڑی ہوئی بائیں جانب
چلی جاتی ہے)

(حامد آرام کرسی پر اپنا سر پیچھے کی طرف
کر کے لیٹ جاتا ہے۔ مولانا ٹہلتے ٹہلتے
دائیں جانب غائب ہو جاتے ہیں —
نجمہ — ایک کشتی لیے داخل ہوتی ہے
جس پر کپڑا ڈھکا ہے)

نجمہ لو یہ تو سو گئے۔ حامد بھائی — حامد بھائی
(حامد کا کندھا ہلاتی ہے) اٹھیے۔ کیا
پڑھتے پڑھتے ہی سو گئے۔ حامد بھائی!

حامد : ہوں (آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھتا ہے) کیا ہے نجمہ۔

نجمہ : پڑھتے پڑھتے ہی سو گئے۔ اٹھیے کھانا کھا لیجیے۔

حامد : مولانا حالی کہاں ہیں۔

نجمہ : مولانا حالی ؟

حامد : ارے ابھی تو تھے وہ یہاں تم نے اور میں نے ان سے باتیں کی ہیں۔
کوئی خواب دیکھا ہے کیا۔ مولانا حالی کی نظم یاد کرتے کرتے سو گئے نیند میں کی ہوں گی باتیں تم نے ان سے۔
نہیں نہیں نہیں۔ خیر کچھ ہو میں مولانا حالی کے پیام کو ساری دنیا کے بچوں تک پہنچا کر رہوں گا۔ ساری دنیا کے بچوں تک

نجمہ : ضرور ضرور — پہلے ناشتہ کر لو پھر جلسے میں چلنے کی تیاری کرو، میں بھی کپڑے بدل کر ابھی آتی ہوں، چلو جلدی کرو۔ کیا سمجھے (نجمہ ہنستی ہوئی بھاگ جاتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے۔)

جناب ظہیر الحق ایم۔ اے عثمانیہ

مسدسِ حالی

حالی کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے انھیں اردو کی نئی شاعری کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ حالی کا اصلی نام الطاف حسین تھا حالی ان کا تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں قصبہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے بڑے بھائی اور بہن نے ان کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لی۔ قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم شروع کی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں (جو خود ایک اچھے شاعر تھے) تقریباً سات سال رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی سلامت روی اور ذوقِ سلیم میں اور پختگی پیدا ہو گئی۔

مولانا حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو جگانے کی کوشش کی۔ انھوں نے نثر میں بھی کئی عمدہ کتابیں لکھیں تنقیدی کتابیں بھی شائع کیں۔ بعض بڑے لوگوں کے حالات زندگی بھی لکھے۔

مولانا حالی نے اپنی زندگی میں یوں تو بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ یادگارِ غالب: اس میں مشہور شاعر غالب کے حالات زندگی کے علاوہ غالب کی شاعری کی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔

۲۔ مدوجزرِ اسلام: یعنی مسدس۔ یہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ حیاتِ سعدی: ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں فارسی کے مشہور شاعر حضرت سعدی شیرازی کے حالات زندگی درج ہیں۔

۴۔ مقدمۂ شعر و شاعری: ۱۸۹۳ء میں شائع

ہوا ۔ اس میں شاعری کس قسم کی ہونی چاہیے اس
پر بحث کی ہے اور عمدہ شاعری کی خصوصیات
بیان کی ہیں۔

۵۔ حیات جاوید ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔
اس میں سرسید احمد خاں کے حالات زندگی اور
کارنامے درج ہیں۔ یہاں ہم صرف مسدس کے
بارے میں آپ کو کچھ بتائیں گے۔

شاعری کی مختلف صورتیں ہیں جیسے غزل،
نظم، رباعی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ۔ ان ہی میں
"مسدس" بھی ایک قسم ہے۔ مسدس عربی لفظ
ہے جس کے معنی چھ (۶) کے ہیں۔ چونکہ اس نظم میں
۶، ۶ مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے اس لیے اسے
مسدس کہتے ہیں۔

حالی نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور غزلوں کا
ایک دیوان بھی شائع کیا ہے۔ انھوں نے نظمیں
بھی لکھی ہیں۔ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ بچوں کے لیے
چھوٹی چھوٹی خوب صورت نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن
انھیں زیادہ شہرت دراصل "مسدس" کی وجہ
سے حاصل ہوئی۔ اس طویل مسدس کا اصلی نام
"مد و جزر اسلام" ہے۔ مد کے معنی بڑھنے کے اور
جزر کے معنی گھٹنے کے ہیں۔ اسلام کے بڑھنے اور
گھٹنے سے مراد اسلام کا عروج و زوال ہے۔ حالی
نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج اور پھر ان کے
زوال اور پستی کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔

مسدس میں جن چیزوں کا ذکر ہے اگر ہم
انھیں یہاں تفصیل سے بیان کریں تو کئی صفحات
درکار ہوں گے اس لیے ہم مختصراً صرف اتنا بتلا دینا
کافی سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کے شروع میں اسلام
کی آمد سے قبل عرب کی خراب حالت کا نقشہ کھینچا
گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کا
سورج جب طلوع ہوا تو اس نے عرب کی تاریک
زندگی میں اجالا کر دیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمات نے
عربوں کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اسلا
سلطنت مسلمانوں کی فتوحات، مسلمانوں میں بڑ
بڑے عالموں، تاریخ لکھنے والوں، فلسفیوں،
سائنس والوں، ریاضی دانوں کا پیدا ہونا ا
ساری دنیا کو اپنے علم و فن سے فائدہ پہنچانے
ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال کا نقشہ کھ
اور اس کے اسباب بتائے ہیں خصوصاً ہندوستا
مسلمانوں کی ابتر حالت کا تفصیل سے ذکر ہے او
کہ ہم میں کاہلی، سستی، فضول خرچی، بدمذا
پرستی، جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا، ماں باپ کی

کرنا، استادوں کی عزت نہ کرنا غرض ہر قسم کی برائی پیدا ہو گئی ہے ۔ حالی نے مسلمانوں کی حالت کا ذکر کر کے دراصل انھیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی زمانے میں تمہاری حالت کیا تھی اور اب کیا ہے ۔ ایک زمانے میں تمہاری حکومت یورپ پر تھی آج تم یورپ کے غلام ہو ۔ یورپ کے عوام کسی زمانے میں تمہاری تہذیب کو مانتے تھے آج تم ان کی تہذیب کو اپنائے ہوئے ہو غرض مسلمانوں کی ترقی اور پھر ان کے زوال اور اس کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی پست حالت کا حالی نے مسدس میں اتنے اچھے اور موثر انداز میں ذکر کیا ہے کہ اسے پڑھتے وقت ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اسے لکھنے کا مقصد صرف رونا اور رلانا نہیں ہے بقول مولوی عبدالحق صاحب کے " اس گرتے ہوئے گھر کو پھر سے بنانا اور اُسے دوبارہ تعمیر کرنا ہے " ایک زمانے میں یہ کتاب اتنی مقبول تھی کہ گھر گھر اُس کا چرچا تھا ۔ بچے بوڑھے ، مرد عورت سب ہی اُسے شوق سے پڑھتے اور سنتے تھے ۔ مسدس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو بہت زمانے سے سو رہے تھے بیدار کرنے میں زبردست حصہ لیا ہے اسی لیے ایک انگریز ڈاکٹر گراہم بیلی نے لکھا ہے اور بالکل سچ لکھا ہے کہ " مسدس اردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل اور بیانیہ نظم ہے ۔" حالی نے مسدس کے ذریعے ہمارے سامنے ایک اعلیٰ معیار کی قومی شاعری کا نصب العین پیش کیا سرسید احمد خاں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ " قیامت میں جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ۔ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں ۔" سرسید کے اس کہنے سے بھی مسدس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مسدس میں حالی کی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں ۔ بہت ہی سیدھے سادھے انداز میں حالی نے شعر کہے ہیں ۔ اس میں بناوٹ بالکل نہیں ہے حالی نے مسدس میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ بھی ہے ۔ حالی کی شاعری میں سادگی کے باوجود اثر بہت ہے ۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو انسانیت سے بڑی محبت تھی خصوصاً مسلمانوں سے انھیں بڑی ہمدردی تھی ۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پھر سے ترقی کریں اور اپنے ملک و قوم کے علاوہ ساری دنیا کے عوام کی خدمت کریں ۔ حالی کو اپنے وطن سے بھی بے حد محبت تھی چنانچہ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب لاہور

کے مشاعرے میں چند دیگر نظموں کے علاوہ "حب وطن"
کے نام سے ایک نظم سنائی تھی جو بے حد پسند کی گئی
حالی کی شاعری ایسی ہے کہ اسے بچے، جوان
بوڑھے سب ہی پڑھ سکتے ہیں اور اس سے سبق
لے سکتے ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے حالی نے علیحدہ
طور پر چند اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں اور اپنی ہر
نظم میں انھیں نیکی، سچائی اور پیار و محبت کا درس
دیا ہے۔ اُن کی مشہور نظم "بڑوں کا حکم مانو" کے
یہ شعر — اے بھولے بھالے بچو نادانو ناتوانو

سر پر بڑوں کا سایہ رسایہ خدا کا جانو
حکم اُن کا ماننے میں برکت ہے میری جانو
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

یا ایک اور مشہور نظم "خدا کی شان" کے یہ شعر

اے زمین آسمان کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک
تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

غالباً سب ہی بچوں کو یاد ہوں گے۔
بہر حال مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ
حالی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنی شاعری
کے ذریعے ہندوستان کے عوام خصوصاً مسلمانوں
کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی شاعری اور
سرسید احمد خاں کی تحریروں نے مسلمانوں کو بیدار
کرنے اور انھیں متحد کرنے میں زبردست حصہ
لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بھارت کی بیسویں صدی
کی جنگ آزادی میں دیگر قوموں کی طرح مسلمانوں
نے بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیا

جناب حبیب احمد خاں شبنم قادری



فردِ عمل

ایک شاعر بیان کرتا ہے — بات دلچسپ ہے سنو تم بھی
قول ہے یوں تو سید احمدؔ[1] کا — بات لیکن ہے یہ خدا لگتی

حشر کے دن خدا نے گر پوچھا — تو نے دنیا سے سب کیے دھندے
کوئی خالص عمل کا تحفہ بھی — لایا میرے لیے ہے اے بندے

میں کہوں گا خدا سے بہرِ عمل — خوب روشن ہے نیک و بد میرا
قوم نے میری کر دیا مجبور — تجھ کو تُہمت نہ دوں کہ کچھ کرتا

تیری رحمت اگر پسند کرے — ہاں مگر ایک کام ہے میرا
حق یہ ہے لے مرے حقیقت ہیں — کہہ نہیں سکتا ہوں اسے اپنا

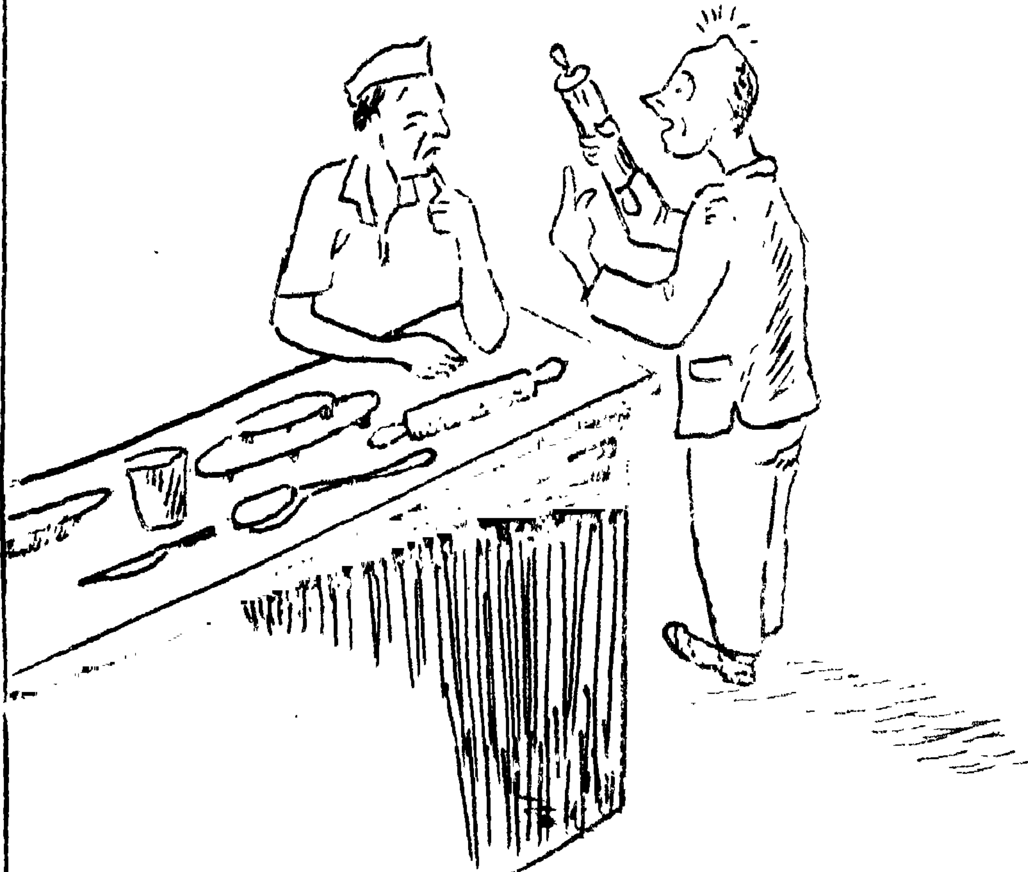
سوچا کچھ ساتھ اپنے لیے ہی چلوں — ہاتھ خالی نہ ہو تو ہے اچھا
خواجہ الطاف حسین حالی سے — یہ مسدس ہے میں نے لکھوایا

میری فردِ عمل تو ہے خالی
ہاں مگر ہے مسدسِ حالیؔ

---

[1] سر سید احمد خاں مرحوم

گھریلو سامان کی دوکان



کیا آپ اسے واپس لے سکتے ہیں؟
یہ صرف ایک بار استعمال ہوا ہے!

ظفر الاسلام ظفر

خواجہ الطاف حسین حالی

اگر ہم ۱۸۳۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان ہندوستان میں علم و ادب، شعر و شاعری اور قوم کی نہایت ہی بے لوث، مخلصانہ اور بے حد مفید خدمت انجام دینے والے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کریں تو اُن میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام نہایت ہی نمایاں اور درخشاں نظر آئے گا۔ وہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

حالی کی عمر ابھی صرف ۹ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں کا دماغی توازن درست نہیں تھا اس لیے تربیت اور نگہداشت کے لحاظ سے ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ بڑے بھائی اور بہنوں نے بڑی توجہ اور شفقت کے ساتھ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ کم سنی ہی میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ عربی اور فارسی کی بھی ابتدائی تعلیم حاصل کر لی۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اپنی تعلیم کو کمال کی منزل تک پہنچائیں۔ سترہ سال کی عمر میں بزرگوں نے شادی کر دی۔ تعلیم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس رکاوٹ کو دیکھ کر انھوں نے خاندانوں والوں سے ایک نہایت ہی پُر وقار اور قابلِ تعریف بغاوت کی۔ کسی کو اطلاع دیے بغیر ایک دن بے سر و سامان اور پیا پیادہ پانی پت سے روانہ ہو گئے۔ راستے کی تمام مشکلوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہوئے دلی پہنچ گئے اور علم کے دریا سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ دلی میں انھوں نے کئی سال تک بڑی جاں فشانی اور حوصلہ مندی کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ ”انھیں طالب علم کی دھن میں آرام

آسائش کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ تکیہ نہ ہوتا تو سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے، کھانے کو نہ ملتا تو بھوکے سو رہتے۔

حالی کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ دلی کی علمی اور ادبی فضا میں اُن کے شاعرانہ ذوق کو اور بھی جلا ملی۔ وہاں انھوں نے مرزا غالب سے ربط ضبط پیدا کیا اور اُن کے شاگرد بھی ہو گئے۔

حصول تعلیم کے سلسلے میں ۱۸۵۵ء تک رہے جبکہ اُن کے بڑے بھائی انھیں پانی پت واپس لے گئے۔ پانی پت میں بھی انھوں نے ڈیڑھ سال پابندی کے ساتھ مطالعے میں گزارے۔ ۱۸۵۶ء سے معاشی ذمہ داریوں نے ملازمت کرائی۔ حصار جا کر ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہو گئے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت وہ وہاں سے پانی پت روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان پر کئی مصیبتیں پڑیں۔ پانی پت پہنچ کر علوم دینی کی تکمیل کے لیے انھیں تقریباً چار سال کی مدت نصیب ہوئی۔ اس کا انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پانی پت کے مشہور عالموں سے منطق، حدیث اور تفسیر پڑھی اور ذاتی طور پر بہت سی علمی ادبی اور شاعری [illegible] لغات کی مدد سے پڑھیں۔

اتنی جد و جہد کے بعد حالی اب اس منزل پر آ گئے کہ اپنے دور کی بڑی بڑی علمی ہستیوں کے سامنے کسی مسئلے پر اعتماد کے ساتھ زبان کھول سکیں۔

حالی کی طالب علمی کے دور کی سب سے اہم اور سبق آموز خصوصیت یہ ہے کہ حالات ہمیشہ اُن کے لیے ناسازگار رہے لیکن انھوں نے کسی حال میں بھی حصول علم سے منہ نہیں موڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ ملک اور قوم کے لیے کوئی بڑا کام کر سکتے نہ اُن کا نام زندہ جاوید ہوتا۔

حالی نے اپنی آیندہ زندگی میں بہت سے علمی اور سماجی کام کیے۔

شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اردو زبان کی شاعری کو ایک نئے راستے پر لگایا۔ غزلیں ایسی لکھیں جن میں لایعنی خرافات اور حقیقت سے دور باتوں کو کوئی جگہ نہ دی۔ نظمیں ایسی لکھیں جن میں یا تو قدرتی مناظر کی عکاسی ہے یا سماجی مسائل کی تصویر کشی۔ 'حب وطن' 'اتفاق و اتحاد' کردار کی بلندی اور حسن اخلاق کے مفید موضوعات پر بہت سے عمدہ، پراثر اور سبق آموز قطعات، نظمیں اور رباعیاں لکھیں، مدوجزر اسلام کے عنوان سے طویل اور نہایت ہی پراثر نظم لکھی جس نے

ہندوستان کے مسلمانوں کو غفلت کی گہری نیند
سے جگانے میں جادو کا اثر کیا۔ اُن کے تمام تر کلام
کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انداز بیان سیدھا
سادہ مگر دل آویز ہے۔ جو بات کہتے ہیں دل پر گہرا
اثر کرتی ہے۔ حالی کے منظوم کارناموں میں مسدس
حالی و مناجات بیوہ اور چپ کی داد کو قدر اول
کا مقام حاصل ہے

نثر کی کتابوں میں اُن کی چار تصنیفات
قابل ذکر ہیں اور چاروں ہی اردو کا سرمایہ ناز
ہیں۔ یہ چاروں کتابیں حیات سعدی (مطبوعہ
۱۸۸۱ء) یادگار غالب (مطبوعہ ۱۸۹۶ء) حیات
جاوید (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) اور مقدمہ شعر و شاعری
(مطبوعہ ۱۸۹۳ء) ہیں۔ حیات سعدی نے اردو
کو سوانح نگاری کا اولین صحیفہ بخشا، یادگار غالب
نے اردو والوں کو غالب کی دلکش شخصیت اور
شاعرانہ عظمت کا عرفان بہم پہنچایا، حیات جاوید
نے سرسید کی زندگی اور کاموں کا ایک نہایت
ہی معتبر ریکارڈ آنے والی نسلوں کی رہنمائی اور
درس کے لیے محفوظ کر دیا اور مقدمہ شعر و شاعری
نے اردو کے شاعروں کو غلط راستے سے ہٹا کر
راہ مستقیم پر لگایا۔ اسی راستے پر چل کر اردو کی
شاعری نے اقبال اور چکبست کو پایا۔ اسی کتاب
سے اردو میں تنقیدی ادب کا آغاز ہوا۔ موجودہ
ترقی پسند شاعری کی اساس بھی انھیں اصولوں
پر ہے جو حالی نے اپنی اس عظیم تصنیف میں پیش
کی ہیں۔

قوم کے ایک درد مند معلم کی حیثیت سے
حالی کا مقام بہت بلند ہے۔ سرسید نے قوم کی
اصلاح اور تعلیم و ترقی کے لیے جو عظیم کام کیے وہ
محتاج بیان نہیں سرسید کے اس کام میں حالی
برابر شریک اور معاون تھے

کردار کی کڑی کسوٹی پر حالی کی زندگی کندن
کی طرح خالص اور چمکدار ہے۔ وہ فرقہ پرستی
کو ملک کے لیے بہت ہی نقصان دہ سمجھتے تھے وہ
مسلمانوں کی ترقی ضرور چاہتے تھے لیکن اُن کا یہ
جذبہ حریفانہ نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان
کے اکثریتی فرقے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی علوم و
فنون اور صنعت و حرفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں
اور ایک پس ماندہ بوجھ بننے کے بجائے ایک
ترقی یافتہ فرقہ کی حیثیت سے ملک اور قوم کو فائدہ
پہنچائیں۔ غیر منصفانہ جانبداری اور نامناسب
طرفداری کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ اُن کے تعلقات

ہندوؤں سے بھی ویسے ہی دوستانہ فراخدلانہ اور مصالحانہ تھے جیسے مسلمانوں سے۔

حالی بچوں کے بہت ہی دلدادہ تھے۔ بچوں کی مسرت اور دلجوئی کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ دوسروں کی مصیبت میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسے واقعات سینکڑوں کی تعداد میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان کے وہ نہایت اعلیٰ عادات و اخلاق کے حامل تھے۔ وہ بڑے حلیم، بردبار، راست گو اور شیریں زبان تھے۔ دولت اور شہرت سے بے نیاز اور ظاہر داری سے کوسوں دور تھے۔ بسر اوقات کا انداز سادہ تھا لیکن ان کی سادگی میں بھی بلا کی کشش اور پرُکاری تھی۔ اُن کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کیجیے یا اُن کے خطوط کی روشنی میں ان کے اعلیٰ کردار کا جائزہ لیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی تھا جس کے افعال و اعمال کا ایک ایک جز بچوں اور بوڑھوں کے لیے یکساں طور پر قابل تقلید ہے۔



جناب خلیق انجم اشرفی

حالی ایک انسان

آپ لوگ مولانا حالیؔ کو صرف ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہوں گے کیونکہ آپ لوگوں نے اپنی کتابوں میں مولانا حالیؔ کی نظمیں مثلاً "حب وطن"، "برکھا رت"، "علم کی ضرورت" وغیرہ پڑھی ہوں گی۔ مولانا حالیؔ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ایک اچھے ادیب بھی تھے، اردو، عربی اور فارسی کے ایک بڑے عالم بھی تھے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ہی وہ ایک اچھے اور بہت ہی اچھے انسان بھی تھے۔

مولانا حالیؔ کی سب سے بڑی خوبی ان کی بے تعصبی تھی۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا جس سے کسی مذہب یا فرقے کے ماننے والوں کا دل دکھے تو وہ برا مان جاتے اور اس شخص کو سمجھا بجھا کر ایسی باتیں کرنے سے منع فرماتے۔ ان کی بے تعصبی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ باوجود اردو کے بڑے ہمدرد اور حامی ہونے کے انھوں نے مسلمانوں کو برج بھاشا اور کھڑی بولی سیکھنے کی نصیحت کی۔

وہ دل سے چاہتے تھے کہ نہ صرف ہندو مسلمان بلکہ ہندوستان کی تمام قومیں مل جل کر رہیں تاکہ ملک ترقی کر سکے۔ وہ تحریر و تقریر غرض ہر طرح سے اپنے اس خیال کا اظہار کرتے۔ چنانچہ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی (جو عیسائی تھے) کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی اس بات کا آرزومند نہ ہوگا کہ ہندوستان کے ہندو، مسلمان اور مسیحی سب ایک دوسرے کے ایسے دوست

ہوں جیسے ایک سگا بھائی دوسرے
سگے بھائی کا دوست ہوتا ہے۔"
ہندو مسلم جھگڑے کا کوئی واقعہ سن کر انھیں دلی افسوس ہوتا اور گھنٹوں افسردہ بیٹھے رہتے۔
وطن کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وطن سے ان کی محبت کا زندہ ثبوت ان کی مشہور نظم "حب وطن" ہے جس میں انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں اپنے ان جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی نظم میں وطن کو یوں مخاطب کرتے ہیں " اے وطن، اے مرے بہشت بریں" اور وطن سے اپنی محبت ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں "تیری اک مشتِ خاک کے بدلے :: لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے" اور وطن سے دور ہو جانے پر ان کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ "تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک ایک سال"۔
ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی کوششیں بھی ان کی حب الوطنی کی ہی ایک شکل تھی کیونکہ ملک میں رہنے والی قوموں کے اتحاد اور میل جول کی بناء پر ہی ملک ترقی کرتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کا مطلب تھا ملک کی بھلائی اور ترقی۔
مولانا حالی بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمان چھوٹا ہو بڑا سب کی ایک سی مدارات کرتے تھے۔ اس کے آرام اور آسایش کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے سفیر مولانا انوار احمد مرحوم ایک بار پانی پت گئے تو مولانا کے مکان پر پہنچے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ دالان میں پردے پڑے تھے۔ انوار صاحب پردہ اٹھا کر اندر گئے تو مولانا حالی انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ انوار صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے۔ مولانا نے ان کے لیے ملائی منگوائی۔ اس کے بعد کچھ دیر باتیں کیں اور پھر انوار صاحب کے لیے بستر کرا کر خود اندر آرام کرنے چلے گئے۔ مولوی انوار صاحب فرماتے ہیں کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا گویا کوئی شخص ان کے لحاف کو آہستہ سے چھو رہا ہے انھوں نے چونک کر پوچھا "کون؟" مولانا حالی نے کہا "میں ہوں۔ سردی کچھ زیادہ ہو گئی ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو لہذا یہ کمبل آپ کو اڑھانے کے لیے لایا تھا۔"
قوم کا درد ان کے دل میں بہت تھا۔ ان

کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلیں۔ "مسدس حالی" بھی اسی خواہش کی ایک شکل تھی "مسدس" لکھنے سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنے شاندار ماضی کو سامنے رکھ کر اپنے حال پر نظر ڈالیں اور مستقبل کو بہتر بنانے کی سوچیں اور پھر اس کے لیے پوری جدوجہد اور کوشش کریں۔

ہر حال میں مگن رہنے والے آدمیوں میں سے تھے۔ جو ملتا تھا اسی پر صبر کرتے زیادہ کا لالچ نہ کرتے اور خوش رہتے وہ عربک اسکول (اب اینگلو عربک اسکول) میں استاد تھے۔ ساٹھ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ مگر جب انھیں حیدر آباد سے وظیفہ ملنے کی بات چلی تو انھوں نے ساٹھ روپے ہی مانگے حالانکہ ریاست حیدر آباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بڑے بڑے وظیفے ملتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو انھیں کافی بڑا وظیفہ مل سکتا تھا۔

شہرت کی بھوک انھیں بالکل نہ تھی۔ طبیعت میں بہت انکسار تھا۔ ان کی انکسار پسندی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ان کتابوں پر بھی جو ان کی اپنی لکھی ہوئی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا کبھی مؤلفہ یا مصنفہ نہیں لکھا مخالفوں کو کبھی کچھ نہ کہتے۔ ان کے اخلاق اور وسیع النظری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ مخالفوں نے ان کی ہجو میں ایک شعر کہا ؎

اب تر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن مولانا خاموش رہے۔ اگر وہ چاہتے تو ان مخالفوں کی "شان" میں پوری ایک ہجو لکھ سکتے تھے لیکن پھر مولانا اور ان کے مخالفوں میں کیا فرق رہ جاتا! مولوی عبدالحق مرحوم فرماتے ہیں "مخالفت سہنے کا ان میں عجیب وغریب مادّہ تھا بعض اوقات کٹ حجتی اور نامعقول بات پر غصہ آجاتا لیکن ضبط سے کام لیتے۔ ضبط اور اعتدال ان کی دو بڑی خوبیاں تھیں"

انسانی ہمدردی ان کا خاص وصف تھی۔ ایک بار کوئی صاحب بگھی پر بیٹھ کر مولانا سے ملاقات کو آئے۔ کوچبان نے غلطی سے بگھی مکان سے کچھ آگے لے جاکر کھڑی کردی بس وہ صاحب غصے سے بے قابو ہوگئے اور اس غریب کے کئی ہنٹر مارے۔ مولانا اوپر سے یہ منظر دیکھ رہے تھے وہ صاحب آئے مگر رسمی باتوں کے علاوہ

مولانا نے کچھ بات نہ کی مولوی عبدالحق مرحوم فرماتے ہیں "میں دیکھ رہا تھا۔ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا" ایک بار فرمایا" یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہوں۔ اس کیفیت سے جو درد وکرب مولانا کو تھا وہ شاید اس بد نصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا"۔

سادگی بہت پسند تھی۔ کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہی وہ مشہور "شمس العلماء سعدی ہند مولانا الطاف حسین حالی" ہیں جو مسدس کے مصنف ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی اسی وضعداری اور سادگی کے ساتھ بسر ہوئی

اب ایسے آدمی بار بار نہیں پیدا ہوتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان بڑے آدمیوں کی زندگی کو دیکھیں کہ وہ کیا تھے اور کیا ہوگئے اور پھر خود بھی اپنے میں وہ خوبیاں پیدا کریں اور جہاں تک بن پڑے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

بچّوں کی کوششیں

حبِ وطن

چڑیا گھونسلا کس چیز سے بناتی ہے؟
تنکوں سے۔
اس کو گھونسلا بناتے کس کس نے دیکھا ہے؟
سبھی نے دیکھا ہے۔ تو صاحب یہی گھونسلا چڑیا کا گھر ہوتا ہے۔
اور خرگوش اپنا گھر کہاں بناتا ہے؟ زمین میں۔ اور شیر؟ غار یا جھاڑی میں معلوم ہوا کہ پرندے اور چوپائے بھی اپنا گھر بناتے ہیں اور ان کو بھی اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے۔
جب ان جانوروں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنا گھر بنا کر رہتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں تو پھر انسان جو ان سے درجے اور مرتبے میں بھی بہت اونچا ہے، وہ اس سلسلے میں کیا کرتا ہے؟
جی ہاں وہ بھی گھر بنا کر رہتا ہے۔ اس کے اس طرح گھر بنا کر رہنے سے گاؤں قصبے اور شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ جس شہر قصبے یا گاؤں میں کوئی پیدا ہوتا ہے وہی اس کا وطن کہلاتا ہے۔ اس طرح وہ گاؤں قصبے یا شہر جس ملک میں آباد ہوتے ہیں وہ اس ملک کے کہلانے لگتے ہیں۔ ہم سب اگرچہ کسی نہ کسی گاؤں، قصبے یا شہر کے رہنے والے ہیں۔ مگر یہ سب آبادیاں ہندوستان کی ہیں اسی مناسبت اور رشتے سے ہم سب ہندوستان

کہلاتے ہیں۔ اپنے وطن یا ملک کو ہندوستان کہتے ہیں۔ جس طرح انسان کو اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے اسی طرح اس کو اپنے وطن اور ملک سے بھی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ اس کے تمام خاندان والے، عزیز، رشتے دار، دوست احباب سب اس جگہ رہتے بستے ہیں۔ بچپن سے ایک ہی جگہ رہنے ہنسنے سے سب لوگوں سے جان پہچان اور واقفیت ہو جاتی ہے۔ یہ سب سے مانوس ہو جاتا ہے، سب اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ پردیس میں نہ اس کا کوئی جاننے والا ہوتا ہے، نہ یہ کسی کا جاننے والا۔ اگر کوئی شخص پردیس میں جا کر رہتا ہے تو وہاں اس کو میل جول اور دوستی پیدا کرنے میں دقت لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنے وطن کو چاہے وہاں اُس کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو پردیس سے ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہے۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے پردیس میں رک بھی گیا تو اس کو وطن کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی ہے

اتنا سب کچھ بیان کرنے کے بعد اب آپ کی توجہ اپنی پیاری زبان اُردو کے مشہور اور معروف ادیب اور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی (مرحوم) کی مثنوی "حب وطن" کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس کو پڑھ کر ان باتوں کی کیفیت دوبالا ہو جائے گی جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں آپ کو محض وطن کی محبت یا عقیدت ہی نہیں ملے گی بلکہ اس میں وطن دوستی کی وہ تصویر ملے گی جو انسانیت کو خانوں میں بانٹنے کے بجائے اس کو متحد رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ احساس ملتا ہے جو وطن کو اونچا اٹھانے اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے برابر ابھارتا رہتا ہے۔ وہ اس پر بس نہیں کرتے بلکہ ہندوستانیوں کو ان کے حال کی پستی پر شرم دلاتے ہیں اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں ساتھ دینے کی طرف مایل کرتے ہیں۔

آئیے ہم بھی اس کو پڑھ کر اپنے اس پیارے اور بڑے شاعر کی آواز میں آواز ملا کر اپنے وطن کی خدمت کا عہد کریں اور اس کو جنت کا نمونہ بنانے میں لگ جائیں۔ اس لیے کہ حالی کی یادگار منانے کا یہی سب سے اچھا اور سچا طریقہ ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ہمارے شاعر نے اسی کی آرزو اور تمنا کی ہے۔ مضمون لمبا ہو جانے کے خیال سے صرف چنے ہوئے اشعار دیئے جا رہے ہیں جو آپ کو پوری مثنوی پڑھنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔ دیکھیے کیسے کیسے لعل و گہر حالی نے اپنے ان اشعار کے ذریعے لٹائے ہیں ؎

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے موردِ آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور صدا — اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو — اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والے ڈوبتوں کو تیراؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

باپ کی ہے دُعا یہ بہرِ پسر — قوم کی ہیں بناؤں اس کو سپر

ماں خُدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات

(سید مسعود الحسن متعلم ثانوی دوم)

حالی کا نظریۂ شعر و شاعری

ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں

ہر ادیب یا شاعر کا اپنا ایک نظریۂ ادب ہوتا ہے۔ وہ اسی نظریے کے مطابق اپنی تخلیقات کرتا ہو۔ جو نظریہ حقیقت سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ زندہ اور پائیدار ہوتا ہے۔ عام طور پر نظریے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مسائل سے بحث کرے۔ ان کو سمجھے اور سمجھ کر اپنا کوئی خیال قائم کرے اور اسی خیال کے تحت اپنے فنی کارنامے پیش کرے۔

ڈاکٹر اقبال کا بھی یہی نظریہ تھا اسی لیے کہتے ہیں۔

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن

حالی کا نظریہ بھی اس نظریے سے کسی طرح جدا نہیں۔ بلکہ وہ اس نظریے سے بہت مطابقت رکھتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں محض حالی کی شاعری کو دیکھ کر بیان کی گئی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک اچھا فن کار بننے کے لیے دل گداختہ پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اسداللہ خاں غالب فرماتے ہیں۔

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ

حالی کو دل گداختہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو قدرت نے ایک حساس اور دردمند دل عطا کیا تھا۔ زمانے کے انقلابات اور پرآشوب حالات نے اس میں اضافہ کرکے سارے جہاں کا درد بھر دیا۔ متعدد مختلف، علمی و ادبی، مذہبی و اصلاحی، سماجی و ملکی تحریکوں سے انھیں براہ ست یا بالواسطہ سابقہ پڑا۔ انھوں نے ہندوستان کے انقلاب اور حکمراں طبقے (مسلمانوں) کے زوال کو گہری نظر سے دیکھا اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ اور پھر شعر و ادب کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شعر و شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اور شعرائے کرام قوم کی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حالی سنجیدہ اور خاموش مزاج انسان تھے۔ شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے۔ مذہبی ماحول اور تعلیم و تربیت کے باوجود ان کا جذبۂ شاعری کم نہیں ہوا۔ دلی میں مشاعروں

کی شرکت اور شعرا سے ملاقات کی وجہ سے یہ جذبہ اور بیدار ہوگیا۔ مرزا غالب کے مشورے نے اس میں تازگی اور حرکت پیدا کی۔ شیفتہ کی صحبت نے توانائی اور پختگی بخشی۔ وہ فرماتے ہیں "چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے" (مقالاتِ حالی حصّہ اوّل صفحہ ۲۶۷)

"غرض رسمی باتوں سے گریز، مبالغے سے اجتناب، بازاری الفاظ و محاورات سے نفرت، یہی حالی کی کائنات ہے اور اسی کا اثر دور دور تک ان کی نظم و نثر میں ملتا ہے" (مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)

حالی کی سنجیدہ اور پختہ کار طبیعت پر یہ الزام ہے کہ وہ دوسروں کی عینک سے دیکھتے تھے۔ دوسروں کے دماغ سے سوچتے تھے۔ ان کے پاس نہ اپنا دل تھا نہ اپنی آنکھیں نہ اپنا دماغ نہ اپنی فکر اور نہ اپنا جذبہ۔ یہ مغالطہ ان کی مصالحت پسندی اور مصلحت بینی کی وجہ سے ہوا۔ حالی نے تو اپنی کوششوں سے اپنی دنیا آپ بنائی تھی۔ ایسا شخص کبھی دوسروں کی عینک سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ انھوں نے غالب و شیفتہ سے استفادہ ضرور کیا اور اس کا اعتراف بھی ان لفظوں میں کیا ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

ڈاکٹر عابد حسین کے نزدیک "حالی کا نخلِ طبع دورِ تنزّل کی بنجر زمین میں اُگا۔ مگر اس کی آبیاری میر و درد کے رشحاتِ فیض نے کی اور اس کی پرداخت غالب و شیفتہ کے دستِ شفقت نے کی (مسدس حالی صدی ایڈیشن)

حالی، غالب کے آرٹ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا نظریہ اپنے استاد کے نظریے سے مستعار لیا۔ میر کی تقلید کی، یعنی سوز و گداز، درد و خلوص میں میر کی پیروی کی۔ مگر ان دونوں سے زیادہ وہ شیفتہ سے متاثر و مستفیض ہوئے۔ حالی نے شیخ سعدی کی بھی پیروی کی ہے۔ سعدی کے یہاں بھی اصلاحی و اخلاقی پہلو کافی روشن ہے۔ ادب کے متعلق سعدی کا جو نظریہ تھا اور جس کی وجہ سے وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔ کم و بیش وہی نظریہ حالات کے تقاضوں کے مطابق کس قدر رد و بدل

کے ساتھ حالی کا بھی ہے۔ سعدی اور حالی دونوں اس راز سے اچھی طرح واقف تھے۔

مقصودِ ہنر سوزِ حیات ابدی ہے   یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

حالی نے تقریباً سب ہی اساتذۂ اردو کے نظریوں سے اپنا نظریہ اخذ کیا۔ اس طرح حالی کے شعری نظریے کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا نظریہ:۔ وہ ہے جو حالی نے قدیم شاعروں کے نظریوں سے اپنے طور پر اخذ کیا اور اسی پر عمل کیا۔

دوسرا نظریہ:۔ جس کو جدید نظریہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مغربی علوم و ادب سے آشنا ہو کر مشرقی ادب کے مزاج کے مطابق قائم کیا۔

حالی کے نظریۂ شاعری پر شیفتہ کے طرز نے نمایاں اثر ڈالا۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں "ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا"۔ یہی خاص قسم کا مذاق حالی کا قدیم نظریۂ شاعری ہے۔ یہ مذاق حسب ذیل صفات کا حامل ہے (مقالاتِ حالی صفحہ ۲۶۶)

(۱) مبالغے سے اجتناب کرنا (۲) حقایق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا (۳) سیدھی سادی اور سچّی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا۔

حالی نے اپنی غزل میں "میر کے درد، غالب کے اندازِ بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یکجا کر دیا" (نئے ادبی رجحانات صفحہ ۲۱) نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح   کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے در گزرے وہ چاہی جو کر گزرے   گر آج نہ تم آتے کیا جانے کیا ہوتا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا   وقت آپہنچا مری رسوائی کا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل   کیا امتیاز زندگیِ مستعار کا

ان اشعار میں بھی حالی کا نظریہ قدامت سے بغاوت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کو اشارات نہاں میں اب کوئی لطف نہیں آتا۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن محرم نہ ہونے کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے تھے۔ وہ اس کشمکش میں مبتلا اس وقت تک رہے جب تک لاہور نہیں گئے۔ لاہور پہنچنے کے بعد

حالی کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا ہونے کا موقع مل گیا۔ اور وہ مولانا آزاد کے سرگرم شریک کار
بنے اور ۱۸۷۴ء میں جب بزم مناظمہ قائم ہوئی اور اس میں یہ طے پایا کہ شعراء کو مصرع طرح کے بجائے
نظم کا عنوان دیا جائے اور شعراء اسی عنوان پر طبع آزمائی کریں تو سب سے پہلے حالی ہی نے قلم اٹھایا
اور چار مثنویاں حب وطن، برکھارت، نشاط امید اور مناظرہ رحم و انصاف لکھیں۔ اس طرح ۱۸۷۴ء
ہی وہ مبارک سال ہے جب حالی نے اپنے جدید نظریے کو اردو شاعری میں عملی طور پر پیش کیا اور وہ اسی
وقت سے برابر اس پر عمل کرتے رہے۔

مولانا حالی کے نظریہ شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا قطعہ "شعر کی طرف خطاب"
پیش نظر رکھا جائے۔ اس قطعہ میں انھوں نے اپنے نظریۂ شاعری کی وضاحت کی ہے۔ دراصل یہ قطعہ
حالی کے نظریۂ شاعری کا دستور العمل ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جبکہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ ناقدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

اس قطعے میں حالی نے شعر کے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ وہ (۱) دلگداز ہو خواہ دل فریب نہ ہو (۲) سادہ
ہو اگرچہ ساری دنیا صنعت پر شیدا و فریفتہ ہو (۳) سچا اور اپنے سچ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے والا
ہو (۴) نابلد کو راہ سمجھانے والا اور ملک کی خدمت کرنے والا ہو تاکہ عمر خضر اور سچی عزت نصیب ہو (۵)
اگر نئی دنیا (نئی شاعری) کو فتح کرنا ہے تو اپنا الگ جہاز لے کر روانہ ہو (یعنی موجودہ سر و سامان اور
لوازمات شاعری کو چھوڑ کر اپنے اصول اور نظریے کے تحت آگے بڑھو)
"حالی نے خلوص و صداقت، سادگی اور سچائی، جوش و ولولہ شعر و شاعری کے لیے بھی ضروری سمجھا
اور شاعر کے لیے بھی۔ اور شاعری کی چند اصناف سخن غزل (جس میں قطعہ و رباعی بھی شامل ہے) قصیدہ،

مرثیہ اور مثنوی کو اسی معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی اور کھوٹے کھرے کی پہچان بتائی۔ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حالؔی ہی کے اثر سے یہ خیال عام ہوا کہ شاعری میں اصلیت اور سادگی کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ انھوں نے (اردو شاعری کی ہر صنف سخن کا) تجزیہ کرکے بتایا کہ عام طور سے وہی اشعار زندہ رہتے ہیں، جن میں سچائی، سادگی اور خلوص کی کارفرمائی ہے" (حالؔی اوران کا عہد قومی آواز میگزین سیکشن۔ سید احتشام حسین)

حالؔی کے شعری نظریات کا ماحصل یہی ہے

محمد رفیق ثانوی پنجم مدرسہ ثانوی جامعہ

حالؔی بحیثیت شاعر

بہت سے شاعر اور ادیب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ بہت سے بوڑھے اور ناتواں ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے اب نئے زمانے میں پھل پھول رہے ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ اتنے بہت سے گزرے ہوئے شاعروں میں سے آپ کو کتنے یاد ہیں۔ کتنوں کی سوانح عمریوں سے آپ واقف ہیں۔ کتنوں کے کلام کو آپ دل سے پڑھتے ہیں۔

اگر اس وقت آپ غور کریں تو سب سے پہلے حالؔی کا نام دماغ میں آتا ہے۔ حالی ان بلند پایہ اور ممتاز شعرا کی صف اول میں ہیں۔ جن کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

حالؔی کا کلام بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔ ان کے ہاں نہ دور از کار تشبیہات و استعارات ملیں گے اور نہ زبردستی کی بلند خیالیاں۔ انھوں نے شاید ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جس کو غیر مانوس کہا جا سکے۔ ان کی کہی ہوئی بات ہر شخص کے دل کی بات ہوتی ہے۔ انداز بیان میں اچھوتا پن ہوتا ہے۔ جذبات و خیالات سادہ اور قدرتی ہوتے ہیں۔ اور یہی شاعری کی اصل خصوصیت ہے۔ انھوں نے ہمارے ہی دل کی بات ہم کو بتائی ہے جن باتوں کو ہم بھول جاتے ہیں۔ حالؔی ان کو اس طرح یاد دلاتے ہیں کہ پھر کبھی ہم ان کو نہیں بھول سکتے۔ خود انھوں نے کہا ہے۔

شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگین، روداد تیری دلکش

حالی الفاظ کی نرمی، بندش کی چستی اور انداز کی برجستگی سے ایک عام بات میں تاثیر بھر دیتے تھے۔
یہ شعر کتنا سادہ اور پیارا ہے۔ اور کس طرح دل میں اتر جاتا ہے۔

یا اس طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
ایک یہاں جینے سے بے زار ہیں یارب

حالی کی زبان میں ہمیشہ ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔ جو ان کی ذاتی خصوصیت ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنے رنگ میں اور اپنی زبان میں کہتے ہیں چاہے بات کتنی ہی سادہ کیوں نہ ہو۔ وہ اسے اتنے اچھوتے انداز میں لکھتے ہیں کہ تمام دلکشی اس میں بھر جاتی ہے۔ جیسے

گل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل

شروع شروع میں حالی نے بھی اور شعرا کی طرح عشق و محبت۔ گل و بلبل، وصل اور جدائی کے موضوع پر لکھا۔ مگر آخر عمر میں انھوں نے اس موضوع کو بالکل چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس وقت ہندوستان کی سیاسی حالت نے کروٹ لے لی۔ تمام بڑے بڑے لیڈروں نے اپنے فرض کو پہچانا اور عوام کو آواز دی تو حالی بھی اس آواز پر لبیک کہے بغیر نہ رہ سکے۔

انھیں خیال ہوا کہ اب خیالات کی دنیا کو چھوڑ کر حقایق کی دنیا میں آجانا چاہیے۔ دیس کو گل و بلبل کی داستانوں سے فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اب اسے جوشیلی اور سبق آموز نظموں کی ضرورت ہے۔
چنانچہ اب آپ نے وطن اور حب الوطنی پر نظمیں لکھنی شروع کیں ——— اور نوجوانوں میں ایک نیا جوش نیا ولولہ پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

آپ نے اخلاقیات جیسے بلند موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا اور بہت خوب لکھا۔

ممکن نہیں کہ ہو بشر عیب سے دور
ہر عیب سے بچیے تا بہ مقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پہ خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

حالی نے بہت بڑے بڑے مضامین کو اتنے آسان پیرائے میں ادا کیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اسے

بہت اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں ؎

ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
کر دو دستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

یہ اور اس طرح کی بہت سی خوب صورت نظموں نے حالی کے روشن دماغ میں جنم لیا۔ آپ کی مشہور نظمیں حب وطن، تعلیم، نوجوانوں سے خطاب وغیرہ ہیں۔

ابھی حالی کے بلند دماغ میں نہ جانے کون کون سے مضمون ابھرتے۔ مگر موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ یہ سورج طلوع ہوا۔ چمکا۔ گھنگور گھٹاؤں میں پرورش پائی۔ مصیبتیں جھیلیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر جب یہ اپنے کام کے شباب پر پہنچا تو اس نے بہت سے سرد دلوں کو حرارت پہنچائی۔ ٹھنڈے جسموں کو گرم کیا۔ سرد جذبات میں نیا جوش نیا ولولہ پیدا کیا۔ اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔

آج یہ ہم میں نہیں۔ لیکن ہمارے بیچ بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔ اسے اگر ہم پڑھیں، سمجھیں اور عمل کریں تو ایک کامیاب انسان بن سکتے ہیں۔

یہ سورج ۱۹۱۴ء میں غروب ہو گیا۔ لیکن اپنی زندگی کے کچھ اثرات چھوڑ گیا۔ جس کے لیے اردو شاعری اس کی ہمیشہ احسان مند رہے گی۔

رافعہ خاتون ثانوی سوم مدرسہ ثانوی جامعہ

مولانا حالی کا طرز تحریر

طرز تحریر:۔ مولانا کی زبان خاص دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ان کی عبارت میں سلاست اور سادگی پائی جاتی ہے۔ عبارت آرائی اور تکلف سے نفرت کرتے تھے۔ وہ سوچ سمجھ کر الفاظ نہیں جمع کرتے تھے۔ بلکہ بے تکلف جو الفاظ دل سے نکل جاتے تھے ان ہی کو سپرد قلم کر دیتے تھے۔ ان کے الفاظ میں تناسب اور موزونیت اس قدر ہے کہ اگر ایک لفظ بدل کر دوسرا لفظ اس کی جگہ استعمال کریں تو چسپاں نہیں ہوتا۔

مولانا حالی نظم و نثر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ نثر میں مولانا کا انداز نہایت دلکش اور سلیس ہے۔ عبارت صاف، سادہ اور دلکش ہوتی ہے۔

مولانا آزاد جدید شاعری کے بانی خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن حالی نے بھی اس کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ نے گل و بلبل کے افسانوں اور شمع و پروانہ کی داستانوں سے احتراز کرکے اپنے کلام کو حب وطن اور قومی درد کے جذبات سے بھر دیا۔ غدر سے پہلے آپ کا طرز بیان پرانے انداز کا تھا لیکن بعد میں جدید مغربی خیالات سے متاثر ہوکر حقیقت نگاری کی طرف توجہ کی اور اردو میں ایسے طرز کی داغ بیل ڈالی جسے آپ کی زندگی ہی میں عام مقبولیت نصیب ہوئی۔ جس کی بدولت اردو ادب کو وسیع ہونے کا موقع ملا ——— آپ کی سادہ نگاری اور معجز بیانی کی وجہ سے قوم نے آپ کو "سعدی" ہند کا لقب دیا۔

آپ نے حیات سعدی، حیات جاوید، اور یادگار غالب لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کے فن کو رائج کیا۔

مولانا ایک زبردست نقاد بھی تھے۔ اپنی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" میں انھوں نے مدلل اور عالمانہ تنقید کی ہے۔ حالی کو اپنے معاصرین میں جو امتیازی درجہ نصیب ہوا وہ یہ ہے کہ وہ ایک باکمال انشاء پرواز ہونے کے علاوہ ایک عدیم المثال شاعر بھی تھے اور جنھوں نے شاعری کے رخ کو بدل دیا۔

اختر حسین انصاری ثانوی پنجم مدرسہ ثانوی جامعہ

حالی ایک طنز نگار کی حیثیت سے

مولانا حالی کے کلام کا کافی حصہ حکیمانہ خیالات اور مؤثر اسباق سے پُر ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں نصیحتیں کی ہیں۔ اور ملک و قوم کی کمزوریوں کو اُجاگر کیا ہے۔

حالی کا کلام بظاہر قہقہوں سے خالی ہے۔ غدر کی وجہ سے ان کی سادہ اور پاکباز زندگی خوشی سے محروم ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں طنز ملتا ہے۔ اور اس فن میں بھی انھوں نے کمالات

دکھائے ہیں۔ لیکن اس ظرافت میں بھونڈے پن یا پھکڑپن کا شائبہ تک نہیں ہے۔

عام شاعروں کے کلام میں اکثر الفاظ کے الٹ پھیر سے ظرافت کی چاشنی پیدا کی جاتی ہے۔ مولانا کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کی ظرافت سے دل و دماغ مسرور ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں حکیمانہ ظرافت ہے جو دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ بعض جگہ کسی عبرتناک واقعے کو ظرافت کے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا بہت متاثر ہوتا ہے۔

مولانا کے طنز کی بہترین مثال "کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" والی نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل مگر پہلا سوارِ راھوار

تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار

راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
گھونس کالے کے ایک مکا دیا گورے نے مار

صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آگے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار

ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار

ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار

دی سند گورے کو لکھ جس میں تھی تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی ایک کالا جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار

اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بہ ظاہر جاندار

ایک کالا پٹ کے گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے ہا ہا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار ؟

عابد عزیز محسنی ثانوی چہارم مدرسہ ثا

حالی ایک سوشل رفارمر

حالی کی شاعری ۲ حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے حصّے میں ان کی وہ تمام نظمیں ہیں جو انھوں نے چھوٹے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ دوسرا حصّہ بڑوں کے لیے ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں جا سکتا کہ انھوں نے جو نظم کہی وہ اصلاحی کہی۔ ان کی نظموں کا ایک ایک مصرعہ اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس وجہ سے حالی کو اگر سوشل ریفارمر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حالی نے زیادہ تر نظمیں ہی کہیں جو کافی مقبول ہیں۔

حالی کے شروع کی زندگی تکلیفوں اور مصیبتوں میں گزری مگر خوش قسمتی سے انھیں بڑے بڑے شاعروں اور صاحب طرز لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا

اتنے بڑے اور مشہور شاعروں سے میل جول نے حالی کی شاعری پر بہت اثر ڈالا۔ خاص طور پر غالب کا رنگ آپ کی شاعری پر نمایاں ہے۔ مرثیہ گوئی میں آپ کو خاص عبور حاصل تھا۔ موقع ملے تو دہلی کا مرثیہ پڑھیے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ انھوں نے اور بھی اچھے اچھے مرثیے کہے ہیں۔

حالی کی حیثیت اردو نثر و نظم دونوں میں مسلّم ہے۔ شاعری میں تو ان کا بہت بڑا مقام ہے ہی ساتھ ہی اردو نثر میں حالی کا رتبہ کسی بڑے نثر نگار سے کم نہیں۔ نثر و نظم دونوں میں حالی نے بہت آسان اور سہل الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جسے اوسط درجے کا پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ حالی کے کلام کو ایک ایسے دریا سے مثال دی جا سکتی ہے جو رواں دواں ہو اور خس و خاشاک سے پاک ہو۔ نثر میں آپ کی سب سے بہترین تصنیف "یادگارِ غالب" ہے۔ آپنے اس عمدہ طریقے سے غالب کی سیرت کو بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد پوری کتاب پڑھے بغیر دل نہیں مانتا ان کے لطائف و ظرائف تو نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب تنقیدی حیثیت سے بھی بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔

جمال اختر ثانوی مدرسہ ثانوی جامعہ

مولانا الطاف حسین حالی

حالی، ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جب یہ نو برس کے تھے تو ان کے والد بھی اس دنیا سے چل بسے۔

حالی کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ پہلے تو انھوں نے قرآن شریف کو حفظ کیا۔

کچھ دنوں بعد ان کی شادی ہوگئی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے تھے مگر گھر والوں کی خواہش تھی کہ نوکری کریں۔ اس لیے یہ چھپ کر دلّی چلے آئے۔ کوئی ڈیڑھ برس تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ڈیڑھ سال بعد ان کو دلّی چھوڑنا پڑی۔ ۱۸۵۵ء میں دلّی سے واپس پانی پت آکر پھر ڈیڑھ برس تک وہیں رہے۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ملازمت کرلی۔ ۱۸۵۷ء میں نوکری غدر کی وجہ سے چھوٹ گئی۔ مولانا پانی پت چلے آئے۔ تعلیم کا بے حد شوق تھا۔ اس لیے پھر پڑھائی شروع کردی اور مختلف علم و فن کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

دلّی میں مرزا غالب سے ملاقات ہوگئی۔ غالب کی عادت تھی کہ وہ عموماً لوگوں کو شاعری سے باز رہنے کی نصیحت کرتے تھے، لیکن جب مولانا حالی نے ان کو اپنا کلام دکھایا تو انھوں نے کہا ”اگرچہ میں کسی کو فکر شاعری کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے“

پانی پت میں چار برس بے کار رہنے کے بعد پھر گھر سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا کی ملاقات شیفتہ سے ہوگئی۔ اور سات آٹھ برس تک ان ہی کے پاس رہے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں نوکری کرلی۔

لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد نے مشاعرہ کی بنیاد ۱۸۷۴ء میں ڈالی۔ اس میں مولانا نے ۴ مثنویاں لکھیں اور اس طرح مولانا کی شاعری نے نیا رخ اختیار کیا۔

مولانا نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے۔ اردو کی چند کتابیں لکھیں۔ ۱۸۶۷ء میں ایک

کتاب "تریاقِ مسموم"، لکھی پھر برابر لکھتے رہے۔ لاہور میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے "مجالس النسا" لکھی پھر دلی میں سعدی شیرازی کی زندگی کے حالات لکھے۔ جس کا حیاتِ سعدی نام رکھا۔ اس کے بعد مرزا غالب کی سوانح عمری لکھی۔ اس کا نام "یادگارِ غالب" ہے۔ یہ بہت مشہور کتاب ہے۔ سر سید احمد خاں کی زندگی پر ایک کتاب "حیاتِ جاوید"، لکھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کتابیں لکھیں۔ وقتاً فوقتاً بہت سے مضمون بھی لکھے جو "تہذیب الاخلاق"، علی گڑھ گزٹ اور بہت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔

جون ۱۹۰۴ء میں آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۵ء میں پانی پت میں ایک لائبریری قائم کی اس کے بعد آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ بیماری میں ہی اپنا فارسی اور عربی کا کلام مرتب کیا۔ یہ اُن کی زندگی میں اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو گیا تھا۔

کچھ دن بیمار رہنے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اور یہ شمع ہمشہ کے لیے گل ہو گئی۔

کشور سلیم ثانوی چہارم مدرسہ ثانوی جامعہ۔

خواجہ الطاف حسین حالی

سوانح حیات :۔ الطاف حسین نام، حالی تخلص، شمس العلماء خطاب ہے۔ پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ انصاریوں کے مشہور خاندان میں سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ نو برس کی عمر میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کے اپنے بڑے بھائی کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ سترہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی۔ مگر آپ نے اپنی ادھوری تعلیم سے مطمئن نہیں تھے اور چپکے سے دلی آکر پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں ملازم ہو گئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے نوکری ختم ہو گئی اور پانی پت لوٹ آئے۔ اور وہیں پر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ چار پانچ سال کے بعد پھر دلی آئے اور غالب سے اپنی غزلوں کی اصلاح لینے لگے۔ اس کے بعد شیفتہ کے ہاں ان کے لڑکوں کے معلم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد لاہور چلے گئے اور پنجاب بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں پر ان کا

کام انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے مسودوں کی اصلاح اور نظرثانی تھا۔ آپ نے چار سال تک یہ خدمت انجام دی۔ ۱۸۷۴ء میں پنجاب میں نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد پڑی۔ اس میں غزلوں کی جگہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ مولانا محمدحسین آزاد نے اس کی بنیاد ڈالی، مولانا حالی بھی بہت پیش پیش تھے۔ وہاں پر انھوں نے مثنویاں لکھیں۔ جو نہایت مقبول ہوئیں۔ چار سال کے بعد دلّی میں آکر اینگلو عربک اسکول میں ملازم ہوگئے۔ اسی دوران میں آپ کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی اور ان کی خواہش پر ایک مسدس لکھی جس کا نام "مدوجزر اسلام" رکھا۔ پھر حیدرآباد سے ۷۵ روپے کا وظیفہ مقرر ہوگیا جو بعد میں ۱۰۰ روپے کر دیا گیا۔ اب مولانا حالی عربک اسکول سے سبکدوش ہوگئے۔ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے ان کو ادبی خدمات کے سلسلے میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں وہ آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے پانی پت میں وفات پائی۔

شیخ محمد کمال الدین ثانوی پنجم مدرسہ ثانوی جامعہ

سعدی ہند

مولانا حالی کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ دنیائے شاعری میں آپ کی حیثیت بہت بلند تھی۔ اور یہ اس لیے کہ آپ نے پرانے رنگ کی شاعری سے اپنا دامن چھڑایا۔ اور گل و بلبل کے افسانوں اور شمع و پروانہ کی داستانوں سے احتراز کر کے اپنے کلام کو حب وطن اور قومی درد کے جذبات سے مالا مال کر دیا۔ غدر سے قبل اسلوب بیان طرز قدیم کے موافق تھا بعد میں شیفتہ کا رنگ غالب ہوا۔ جس میں سلاست اور روانی کے ساتھ حسن و عشق کے حقیقی جذبات نہایت سادگی سے ادا کیے۔ بعد کا کلام جدید طرز کا حامل ہے۔ اس میں آپ نے منظر نگاری، سیرت نگاری اور فلسفۂ اخلاقیات کو نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے۔ جدید مغربی خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا ہے اور حقیقی جذبات کی ترجمانی کے لیے ایسے طرز کی داغ بیل ڈالی جو عام طور پر مقبول ہوا۔ اور اس کی بدولت ادب اردو کو وسیع ہونے کا موقع ملا۔ آپ کی سادہ نگاری اور معجز بیانی

کی وجہ سے قوم نے آپ کو سعدیٔ ہند کا لقب دیا۔ مسدس حالی، شکوۂ ہند، مناجات، مجموعہ کلام حالی چپ کی داد۔ بیوہ۔ رحم و انصاف۔ مجموعہ نظم فارسی وغیرہ آپ کی قابل قدر یادگاریں ہیں۔

عبدالواحد انصاری حکیمیہ ہائی اسکول برہانپور

جناب محمد عبداللہ شریف، حیدرآباد

حالی ایک نظر میں

۱۸۳۰ء قصبہ پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔

۱۸۵۶ء کلکٹری ضلع حصار میں ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے۔

۱۸۶۳ء غدر کے بعد کئی سال بے کار رہے پھر مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اسی سال غالب کے شاگرد ہوئے۔

۱۸۶۷ء میں سب سے پہلے نثر میں ایک کتاب "تریاق مسموم" کے نام سے لکھی۔ لاہور میں ایک عربی کتاب جو علم طبقات الارض پر تھی اردو میں ترجمہ کی وہیں ایک اور کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے "مجالس النساء" لکھی جس پر حکومت کی طرف سے چار سو روپے انعام ملے۔

۱۸۷۴ء چار مثنویاں برسات۔ امید۔ رحم و انصاف اور حب وطن لکھیں۔

۱۸۷۹ء میں مسدس مد و جزر اسلام لکھی۔ ریاست حیدرآباد نے ۷۵ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جو بعد میں ایک سو روپیہ کر دیا گیا۔

۱۸۹۳ء میں شاعری پر ایک مقالہ لکھ کر بطور مقدمہ دیوان شائع کیا۔

۱۸۹۷ء میں مرزا غالب کی سوانح "یادگار غالب" شائع کی۔

۱۹۰۱ء سرسید احمد خاں کی سوانح حیات، حیات جاوید کے نام سے شائع کئے

۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔

۱۹۱۴ء میں ۳۱ دسمبر کو ۷۷ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔

مس فہمیدہ نسرین علی گڑھ

مولانا حالی

اس پانچ صدی کی مدت میں کسی شخص نے ہماری زبان و ادب پر ایسے گراں قدر احسانات نہیں کیے جتنے مولانا حالی نے۔ وہ ہمارے جدید ادب کے امام مجتہد ہیں۔ لیکن میرے دل میں اُن کی جس بات کی زیادہ قدر ہے وہ ان کی انسانیت ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ سر سید احمد خاں کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پائے کا نہ تھا۔ مولانا نے غریبوں اور مظلوموں کی ہمیشہ حمایت کی جس طرح انھوں نے اپنے مُسدس میں محنت اور محنت کشوں مزدوروں اور کمزوروں کے کام کی عظمت و وقعت کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ایسی کوئی چیز ہمارے اس وقت کے ادب میں نہیں ملتی ہے۔ عورتوں کی مظلومی کی حمایت میں انھوں نے دو نظمیں لکھی ہیں "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" ہمارے ادب میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ایسی نظمیں حالی ہی لکھ سکتے تھے۔ ان کا کلام درد سے بھرا ہوا ہے اور ہر لفظ دل دردمند کی آواز ہے۔ دوسرا طبقہ جس سے اُنھیں ہمدردی تھی وہ طالب علموں کا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے بڑے حامی تھے اور سر سید احمد خاں کی طرح ان کا یہ یقین تھا کہ قوم کی اصلاح و فلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ اسی وجہ سے اُنھیں علی گڑھ کالج سے خاص تعلق تھا۔ طالب علموں سے بہت محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ غریب طالب علموں کی مدد کرنے میں سعی فرماتے۔ حیدرآباد میں طالب علموں کی امداد کے لیے

مولوی عبدالحق۔ مولوی عزیز مرزا اور نواب عمادالملک سے کہتے رہتے تھے۔ اسی طرح ایجوکیشن کانفرنس اور دوسرے اداروں سے غریب طلباء کے وظائف کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

تعلیم یافتہ حضرات کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ذرا بھی کوئی اچھا کام کرتا یا کسی کی اچھی تحریر یا مضمون پر نظر پڑتی تو اُس کی تعریف لکھ کر بھیجتے۔ خاص طور سے مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے۔

وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تو اس کے جوش و ہمت کی تعریف کرتے لیکن جو لغزش نظر آتی اُس کے متعلق بڑی نرمی اور ہمدردی سے سمجھاتے۔

وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ بحث و تکرار سے بہت بچتے تھے کیونکہ اُس میں تلخی آجاتی ہے۔ البتہ علمی یا ادبی مسئلے پر گفتگو کرنے میں کبھی عذر نہ ہوتا۔ اس قسم کی بحث میں اگر کوئی سخت یا ناواجب بات کہہ بیٹھتا تو اس کا جواب نہ دیتے۔ یہ خاموشی بہت موثر جواب ثابت ہوتی۔ نوکروں سے ان کا سلوک بڑی مہربانی کا تھا۔ ان سے کبھی درشتی یا بدزبانی سے پیش نہیں آتے تھے اگر کبھی خفا ہوتے یا کوئی سخت لفظ زبان سے نکل جاتا تو نادم ہوتے اور معافی مانگ لیتے۔

مولانا حالی کی سیرت میں انکساری کا وصف خصوصیت سے پایا جاتا ہے انکساری کی حد ہے کہ وہ اکثر اپنی کتابوں پر مرتبہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں مولف یا مصنف نہیں لکھتے۔ ان میں مروت بہت تھی لیکن اتنی مروت میں بھی انھوں نے سچائی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہمیں حالی کی زندگی سے کئی بیش بہا سبق ملتے ہیں۔ سب سے پہلی بات صحیح ذوق ہے جو ادب کی جان ہے نہ صرف ادب کی جان ہے بلکہ انسانی تمدن کی جان ہے۔ حالی نے تمام عمر صحیح ذوق کی تعلیم و تلقین کی، دوسرے جس کام کو ہاتھ میں لیا اُسے اتنی شفقت اور انہماک سے انجام دیا گویا اُن کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ وہ صاحبِ ثروت نہ تھے، وہ لیڈر نہ تھے تاہم انھوں نے تنہا خاموشی سے وہ کام کیا جو انجمنیں اور ادارے بلکہ حکومتیں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔ تیسرے انھوں نے اپنی ہمدردی، خلوص و صداقت سے انسانیت کی مثال پیش کی۔

اِمتحان دیجیے اور انعام لیجیے!

پروفیسر رشید احمد صدیقی

بچو، مولانا الطاف حسین حالیؔ مرحوم و مغفور کے بارے میں تفصیلی معلومات پیامِ تعلیم کے اس شمارے میں دی گئی ہیں اُمید ہے آپ نے اِن مضامین کا مُطالعہ شوق سے کیا ہوگا۔ میرے کہنے سے ایک بار اور غور سے پڑھ جائیے۔ اِس کے بعد نیچے دیے ہوئے سوالات کے جواب لکھیے۔ اِس سے مجھ کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ آپ نے اِس شمارے کا مُطالعہ شوق اور محنت سے کیا ہے۔ پیامِ تعلیم کے ایڈیٹر صاحب بھی خوش ہوں گے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی۔

سوالات یہ ہیں:

۱۔ حالیؔ کی کیا باتیں آپ کو پسند آئیں؟ وہ خود، اُن کے اشعار یا دونوں؟

۲۔ آج اگر حالیؔ زندہ ہوتے اور مدرسے میں آپ سے ملنے آتے تو آپ اُن کی خاطر کس طرح کرتے۔ اُن سے کیا باتیں دریافت کرتے؟

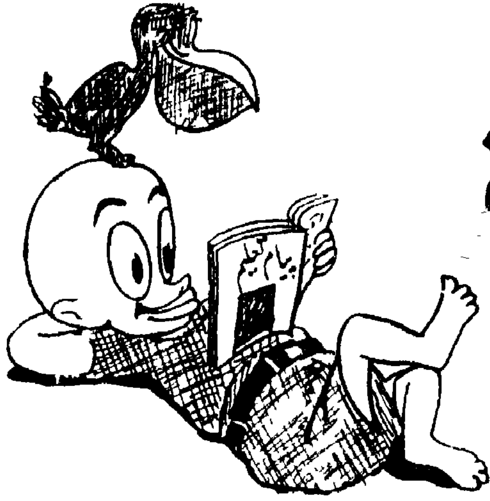
۳۔ اپنے کُتب خانے سے حالیؔ کی یہ نظمیں حاصل کرکے غور سے پڑھیے۔ اس کے بعد بتائیے کہ ان میں سے کون ایک یا ایک سے زیادہ نظمیں آپ کو کس سبب سے زیادہ پسند ہیں۔ اپنی پسند کے کچھ اشعار بھی نقل کیجیے۔

(الف) مسدّس مد و جزرِ اسلام (ب) عرضِ حال بجناب سرورِ کائنات (ج) شکوۂ ہند (د) مناجاتِ بیوہ (ھ) حُبِّ وطن (و) نشاطِ اُمّید (ز) برکھارُت (ح) مسدّس

مرثیہ حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی۔

حسبِ ذیل امور ذہن میں رکھیے :۔

- مضمون زیادہ طویل نہ ہو۔
- جوابات لکھیے دلیل کے ساتھ لکھیے۔
- صاف اور خوش خط لکھیے۔
- جس طالب علم کا مضمون سب سے اچھا ہوگا اسے دس روپے کی کتابیں انعام میں ملیں گی۔ اور اڈیٹر صاحب کے لیے ممکن ہو سکا تو وہ مضمون یا اس کا جز یا انعام پانے والے کی تصویر پیامِ تعلیم میں شایع کر دیں گے۔
- پیامِ تعلیم کا حالی نمبر شایع ہو جانے کے ڈیڑھ ماہ بعد تک مضمون بھیجا جا سکتا ہے۔
- اس امتحان میں ۱۶ سال تک کی عمر کے بچے حصہ لے سکتے ہیں۔



لطیفے

"جب وہ بولتا ہے تو ایک دُنیا سُنتی ہے"

"پھر تو بڑا مشہور اور نامور آدمی ہوگا وہ۔"

"جی ہاں۔ ریڈیو اناؤنسر"

—— * — * ——

ایک بوڑھی خاتون: اچھا بیٹا ایک بات تو بتاؤ، اگر ہوائی جہاز کا انجن چلتے چلتے بند ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟

ہواباز: ارے کچھ نہ پوچھیے بیگم صاحبہ بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ اس وقت فرانس میں چار اُڑتے ہوئے جہازوں کے انجن بند ہو گئے۔ ہوائی جہاز نیچے نہیں اُترتا، ہواباز بے چارے بھوکے مر رہے ہیں۔

محمد سلیم (ثانوی دوم) جامعہ

—— * — * ——

ملازم: "مجھ پر چوری کا الزام بے بنیاد ہے۔ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے ہیں جس سے آپ کی تسلی کراؤں"

مالک: "تمھیں الفاظ نہیں مل رہے اور مجھے میری گھڑی اور انگوٹھی نہیں مل رہی ہے"

—— * — * ——

ایک دیہاتی کو فلورا فاؤنٹین جانا تھا۔ وہ بس کی لائن میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرے مسافر سے پوچھا "فلورا فاؤنٹین کو کون سی بس جائے گی"

مسافر نے جواب دیا "نمبر پینتالیس ۴۵"

جب دیہاتی کو کھڑے کھڑے دو تین گھنٹے ہو گئے تو ایک قریبی دوکاندار نے پوچھا "کیوں میاں! تمھیں کہاں جانا ہے"

دیہاتی نے جواب دیا "فلورا فاؤنٹین"

دوکاندار نے تعجب سے کہا "لیکن فلورا فاؤنٹین جانے والی کتنی بسیں گزر چکی ہیں تم ان میں بیٹھے کیوں نہ"

دیہاتی نے کہا "میں تو گن رہا ہوں ابھی تو صرف بیالیس ۴۲ ہی بسیں گزری ہیں"

محسن انجم بھیونڈی

جناب کوثر اعظمی

پھول مالا

علم کا چرچا، عمل کا بول بالا چاہیے
بزمِ انساں کو خرد کی پھول مالا چاہیے

نونہالو! کان رکھو، وقت کی آواز پر
باغِ ملّت کو شگفتہ شاخِ لالہ چاہیے

جگمگاؤ بن کے تم مہتاب حکمت اوج پر
ظلمتوں کا زور ہے، روشن اُجالا چاہیے

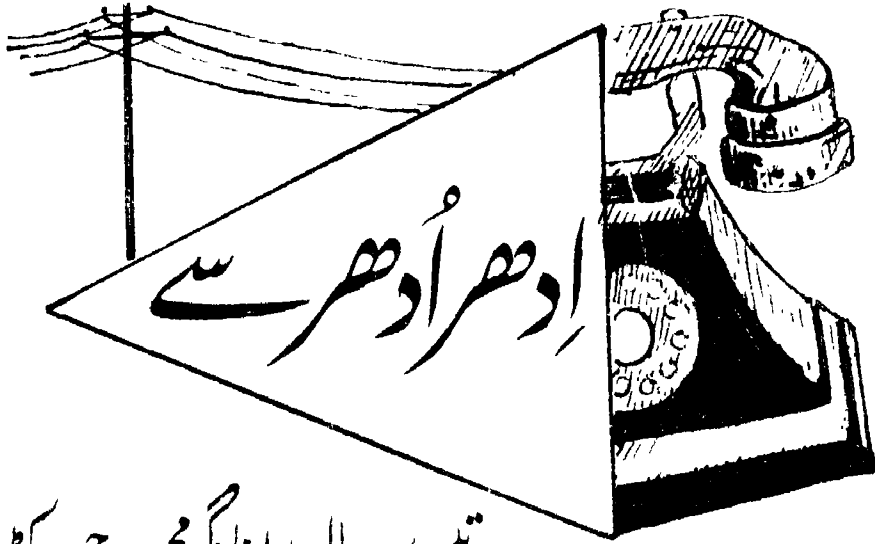
ساتھیو! پھر امتحانِ زورِ بازو آپڑا
قوم کی کشتی ہے طوفاں میں، نکالا چاہیے

سہل ہیں پھر مشکلیں، ہاں! مشکلوں کے سامنے
آدمی کو عزم کا ہونا ہمالہ چاہیے

گھر رہی ہے پھر گھٹا ادبار کی اب چارسو
قوم کو پھر کوئی حالی سا جیالا چاہیے

پھر مسدّس سا کوئی نغمہ سنا کر دوستو!
قوم کی گرتی ہوئی حالت سنبھالا چاہیے

صحافی



روسی بچوں کے لیے مہابھارت کا ترجمہ

مہابھارت ہند دیس کی مشہور کتاب ہے۔ جسے ویاس دیو نے آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے لکھا تھا۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں روسی زبان میں بچوں کے لیے مہابھارت کی کہانی کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ روس کے بچے ہماری اس قدیم کہانی کو اپنی زبان میں پڑھ سکیں گے۔ دیکھیے دنیا کے دوسرے ملکوں کے بچے ہمارے ملک کی مشہور کتابیں پڑھتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی دوسرے ملکوں کی مشہور کتابیں پڑھیں۔

تین سو سال پرانا مگرمچھ، جسے پکڑنے پر ۵۰ ہزار روپے خرچ ہوں گے

آسٹریلیا کی ایک ندی میں ایک بہت ہی پرانا مگرمچھ رہتا ہے۔ یہ مگرمچھ ۳۰ فٹ لمبا ہے۔ اس مگرمچھ نے ندی کے کنارے رہنے والے لوگوں کو کافی تنگ کر رکھا ہے۔ وہ انسانوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ گھوڑوں کو کھینچ لے جاتا ہے۔ بستی والے اس سے بہت تنگ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پولیس والے اس مگرمچھ کو مار ڈالیں۔ مگر سائنس والوں کا اس مگرمچھ پر پہلے سے دانت ہے۔ وہ اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مگرمچھ آج سے تین سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ زندہ پکڑے جانے پر

سائنس والوں کو اس کے مطالعے سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہونے کی توقع ہے۔ مگر اس مگرمچھ کو پکڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت بڑا منصوبہ بنایا گیا ہے جس پر اندازاً ۵۰ ہزار روپے خرچ آئے گا۔

ہیلی کوپٹر کی اڑان کا عالمی ریکارڈ

پچھلے مہینے ایک روسی خاتون نے ہیلی کوپٹر کے ذریعے سب سے اونچی اڑان کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ تاتیانا نے ہوابازی کے مقابلے میں سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں اس نے ہیلی کوپٹر سے اڑان کا پہلا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ۱۹۶۳ء میں تاتیانا ہیلی کوپٹر کی اڑان کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے میں دوبارہ کامیاب ہوئی۔ اس سال ۱۵۰، میٹر کی بلندی پر پرواز کر کے تاتیانا نے تیسری بار عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ پچھلا عالمی ریکارڈ ایک امریکی خاتون نے ۵۹۰۸ میٹر کی بلندی پر پرواز کر کے قائم کیا تھا۔

قطب جنوبی کی سیاحی

قطب جنوبی دنیا کے بالکل جنوب میں برف سے ڈھکا ہوا ملک ہے۔ اس کے بالکل جنوبی حصے میں سوائے برف کے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ لوگ دنیا کے اس حصے میں جاکر وہاں کا حال چال جاننے کی برابر کوشش کرتے ہیں۔

پچھلے مہینے نوامریکی سائنس والوں کی ایک ٹولی اس کے جنوبی علاقے کی طرف گئی تھی۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں سے آگے جانا ممکن نہیں تھا ان سائنس والوں کو ایک پہلے سے تیار جھونپڑی دکھائی دی۔ یہ سائنس داں اس جھونپڑی کے اندر گھس گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ انگریزی زبان میں ایک خط لکھا رکھا ہے۔ اس خط سے انھیں معلوم ہوا کہ جلانے کا ایندھن کہاں رکھا ہوا ہے اور کس جگہ کھانے کا سامان موجود ہے۔

انھیں بہت تعجب ہوا کہ ان کے لیے

یہ جھونپڑی کس نے پہلے سے بنائی اور ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام یہاں کون کر گیا ہے۔ اس خط سے انھیں پتہ چلا کہ پچھلی گرمیوں میں یہاں روسی سائنس دانوں کی ایک ٹولی آئی تھی۔ اس ٹولی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ مہینے بعد یہاں امریکی سائنس دانوں کی ایک ٹولی آنے والی ہے۔ اور ان لوگوں نے سردی شروع ہونے سے پہلے ہی یہاں اپنے بعد آنے والے سائنس دانوں کے لیے جھونپڑی تیار کر دی اور کھانے پینے اور آگ کے لیے ایندھن کا انتظام کر دیا۔

بچوں سے باتیں

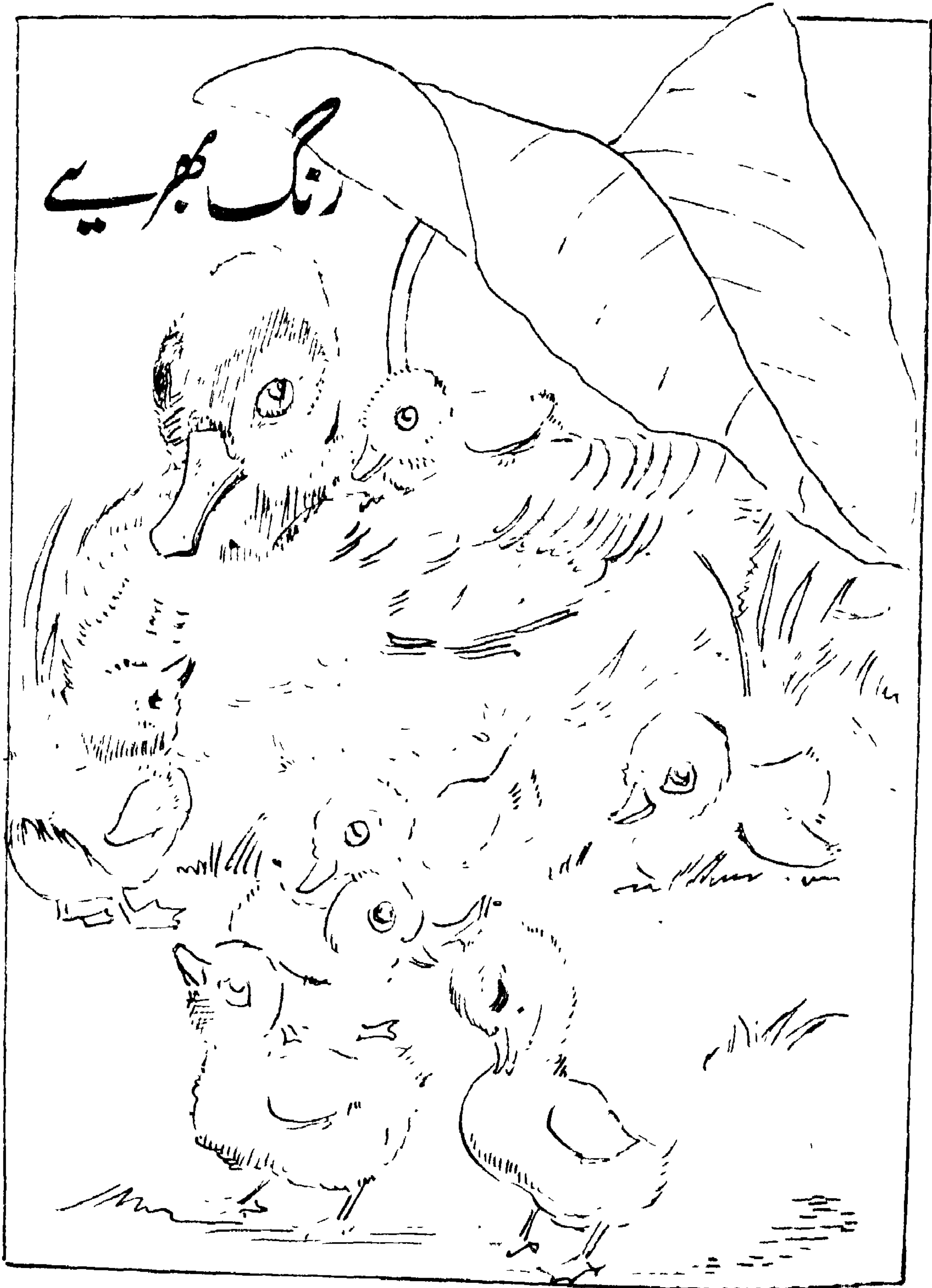
(بقایا صفحہ ۲)

نے اس بوجھ کو اپنے کاندھوں پر لیا اور اس کی شان میں اس کے علمی معیار میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

اس ادارے کو قائم ہوئے اب پچاس سال ہو چکے ہیں۔ اس خوشی میں پچھلے مہینے اس کی گولڈن جبلی بہت شان و شوکت سے منائی گئی —— نایب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پروفیسر محمد مجیب جناب ہمایوں کبیر، ڈاکٹر سید عابد حسین اور دوسرے بہت سے مشہور عالموں نے اس تقریب سعید میں حصّہ لیا۔ ہم شاہ معین الدین صاحب اور صباح الدین صاحب کی خدمت میں خصوصاً دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ان ہی کی رات دن کی محنت کی بدولت اس تقریب کو اتنی شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔

ہاں ایک بات یاد آئی۔ مولانا شبلی جی تو ۱۹۱۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اس حساب سے ان کے انتقال کو بھی پچاس برس ہونے کو آئے۔ ہمارا خیال ہے کہ پیامِ تعلیم کا کوئی پرچہ شبلی نمبر کے نام سے نکالا جائے۔ غالباً اپریل کے پیامِ تعلیم میں ہم کوئی اعلان کر سکیں۔

آپ کے حالی نمبر کی ضخامت ہمارے اندازے سے اتنی بڑھ گئی کہ ہمیں مجبوراً اپنے سلسلے کے مضامین بھی روکنے پڑے مثلاً کوے دادا، بھارت درشن، کالا پتھر وغیرہ۔ بہت مجبوری کی حالت میں ایسا کیا گیا۔ یہ سب مضامین اگلے پرچے سے باقاعدگی سے شائع ہوں گے۔


رنگ بھریے

"پیام تعلیم" نئی دہلی بابت حسب قاعدہ ۸

فارم IV

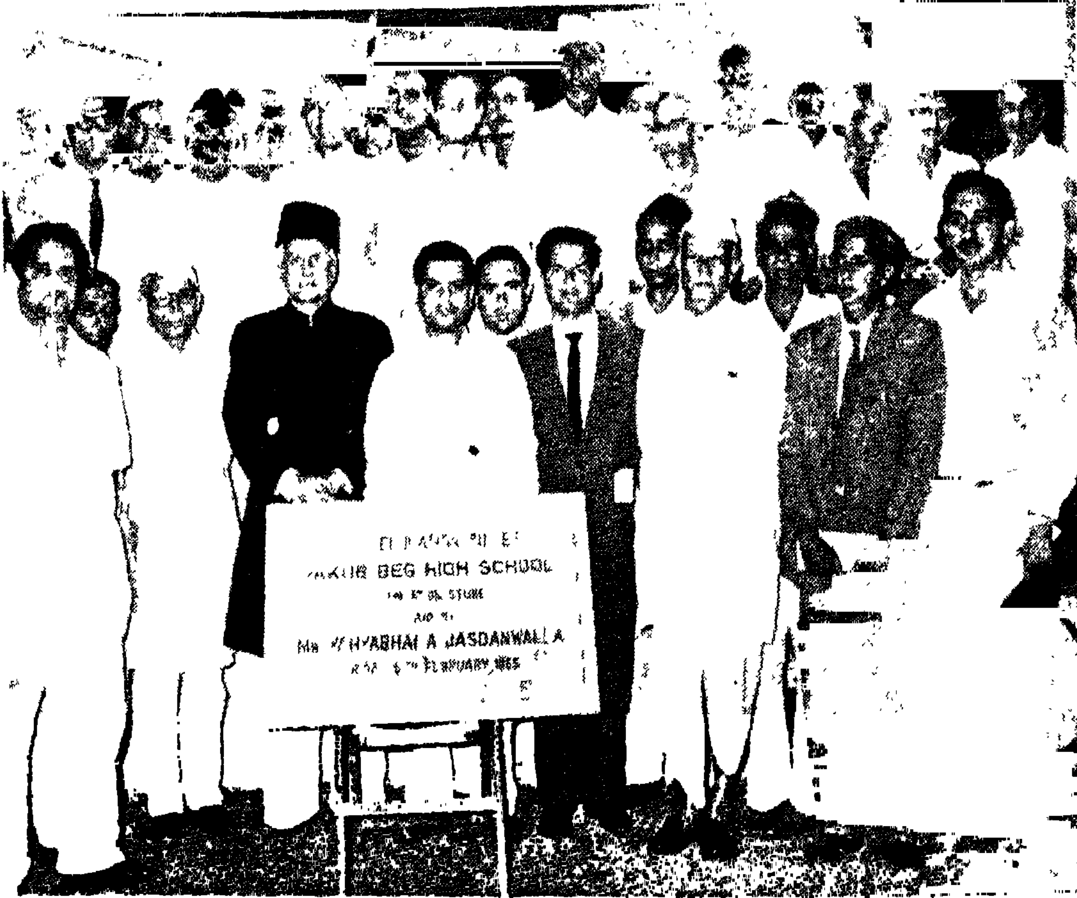
۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی
۲۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی۔ پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی
۴۔ پبلشر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی
۵۔ ایڈیٹر کا نام: محمد حسین حسان۔ قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی
۶۔ مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ چیرمین پروفیسر محمد مجیب، جامعہ نگر، نئی دہلی
ڈائرکٹرز۔ ۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر، نئی دہلی
۲۔ ڈاکٹر عبد العلیم ۲ یونیورسٹی روڈ، علی گڑھ
۳۔ مسٹر ایم آر چنائے مہر بلڈنگ۔ چوپاٹی، بمبئی ۷
۴۔ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی، ۵ گنوگا اسٹریٹ، بمبئی ۱
۵۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کولابہ
۶۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ۱۲/۱۱ جن پتھ لین نئی دہلی

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فیصدی سے زیادہ کے حصے دار:
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
اسلام جیم خانہ۔ کینیڈی سی فیس، بمبئی
شری مالک رام بویجہ۔ وزارت خارجہ حکومت ہند، نئی دہلی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین میں درست ہیں۔
دستخط احمد ولی
پبلشر
۰۰ (؟) ۱۹۶۵ء

نے اس
شان میں
۱)
ہو چکے ہیں
جبلی بہت

یعقوب بیگ ہائی اسکول پنویل ضلع تھانہ



سیٹھ یحییٰ بھائی جسدن والا (سیاہ شیروانی میں) نے ۵ رفروری کو نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ سیٹھ صاحب کے بائیں طرف عبدالرحمٰن انتولے ایم ایل اے کھڑے ہیں جنھوں نے جلسے کی صدارت فرمائی۔

"پیام تعلیم" بابت حسب قاعدہ ۸

فارم IV

۱. مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی

۲. وقفہ اشاعت: ماہنامہ

۳. پرنٹر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی۔ پتہ: جامعہ نگر،

۴. پبلشر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر،

۵. ایڈیٹر کا نام: محمد حسین حسان۔ قومیت: ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر

۶. مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ چیرمین پروفیسر محمد مجیب، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈائرکٹرز: ۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر، نئی دہلی

۲۔ ڈاکٹر عبد العلیم ۲ یونیورسٹی روڈ، علی گڑھ

۳۔ مسٹر ایم آر چنائے مہر بلڈنگ۔ چوپاٹی۔ بمبئی

۴۔ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی، ۵ گنوگا اسٹریٹ، بمبئی

۵۔ ہزہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کو

۶۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ۱۲/۱۱ جن پتھ لین

کمپنی کے سرمایہ کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصے دار:

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اسلام جیم خانہ، کنیڈی سی فیس، بمبئی

مسز ی مالک رام بویجہ۔ وزارت خارجہ حکومت ہند،

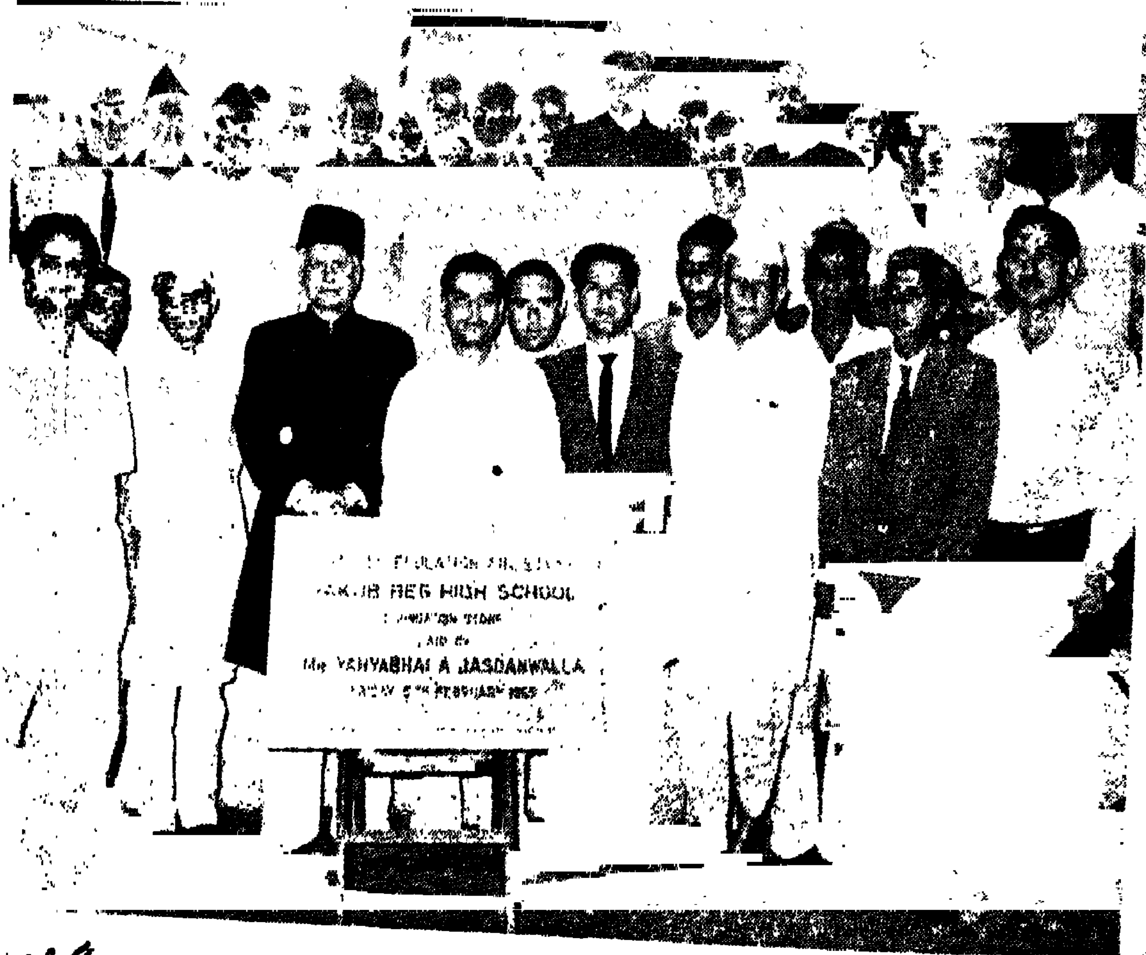
میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین درست ہیں۔

دستخط احمد ولی

پبلشر

۱۹۶۵ء

یعقوب بیگ ہائی اسکول پنویل ضلع تھانہ



سیٹھ یحییٰ بھائی جسدن والا (سیاہ شیروانی میں) نے ۵ رفروری کو نئی عمارت کا سنگِ بنیا
رکھا۔ سیٹھ صاحب کے بائیں طرف عبدالرحمٰن انتولے ایم ایل اے کھڑے ہیں جنھوں نے جلسے کی
صدارت فرمائی۔

فارم IV　حسب قاعدہ ۸　بابت "پیام تعلیم" نئی دہلی

۱. مقام اشاعت:　جامعہ نگر، نئی دہلی

۲. وقفہ اشاعت.　ماہنامہ

۳. پرنٹر کا نام:　سید احمد ولی ـ　قومیت: ہندوستانی ـ　پتہ:　جامعہ نگر، نئی دہلی

۴. پبلشر کا نام:　سید احمد ولی ـ　قومیت: ہندوستانی　پتہ:　جامعہ نگر، نئی دہلی

۵. ایڈیٹر کا نام:　محمد حسین حسان ـ　قومیت: ہندوستانی　پتہ:　جامعہ نگر، نئی دہلی

۶. مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ـ چیرمین پروفیسر محمد مجیب،　جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈائرکٹرز ـ ۱ ـ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر، نئی دہلی

۲ ـ ڈاکٹر عبدالعلیم ۲ یونیورسٹی روڈ، علی گڑھ

۳ ـ مسٹر ایم آر چنائے مہر بلڈنگ ـ چوپاٹی ـ بمبئی ۷

۴ ـ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی، ۵ گنوگا اسٹریٹ، بمبئی ۱

۵ ـ ہزہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کولابہ، بمبئی

۶ ـ کرنل بشیر حسین زیدی ایم ایی ۱۱/۱۲ جن پتھ لین نئی دہلی

کمپنی کے سرمایہ کے ا نیصدی سے زیادہ کے حصے دار:

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اسلام جیم خانہ ـ کینیڈی سی فیس، بمبئی

مسز ی مالک رام بویجہ ـ وزارت خارجہ حکومت ہند، نئی دہلی ـ

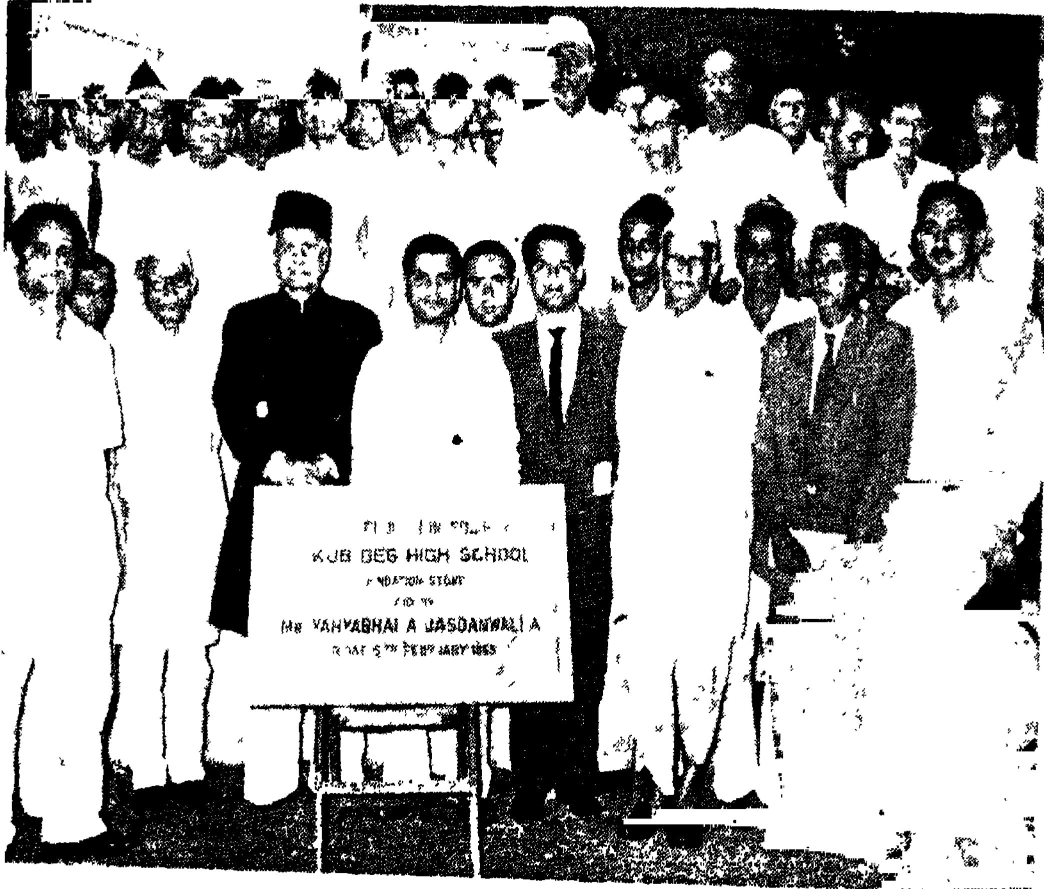
میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ـ

دستخط احمد ولی

پبلشر

۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

یعقوب بیگ ہائی اسکول پنویل ضلع تھانہ



سیٹھ یحییٰ بھائی جسدن والا (سیاہ شیروانی میں) نے ۵ رفروری کو نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ سیٹھ صاحب کے بائیں طرف عبدالرحمٰن انتولے ایم ایل اے کھڑے ہیں جنھوں نے جلسے کی صدارت فرمائی۔

پیامِ تعلیم





براشیوسارین کاایک ڈھانچا ۔ یہ ڈھانچا ٹانگانیکا کے جنوبی ساحل پر ملا ہے ۔ اس طرح کے جانور اب سے لگ بھگ ساڑھے بارہ کروڑ سال پہلے اس دُنیا سے نیست و نابود ہو چکے تھے ۔ اس کے ڈھانچے کی لمبائی ۲۲٫۶۵ میٹر یا تقریباً ۲۴ گز ہے ۔ یہ ڈھانچا برلن کے نیچرل ہسٹری کے میوزیم میں رکھا ہے ۔ اس میوزیم میں پوری دنیا کے کروڑوں جانوروں کے ڈھانچے موجود ہیں۔



بچّوں کے لئے مذہبی کتابیں
ارکان اسلام
مُصنّف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۲۵ نئے پیسے
آں حضرتؐ
مصنّف
الیاس احمد مجیبی
۵۰ نئے پیسے
عقائد اسلام
مصنّف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۵۰ نئے پیسے
سرکارِ دو عالم
محمد حسین حسّان
ڈیڑھ روپیہ
ہمارے رسول
مصنّف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۷۰ نئے پیسے
ہمارے نبی
مصنّف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۴۰ نئے پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نبیوں کے قصّے
مصنّف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت: ۸۰ نئے پیسے
مسلمان بیبیاں
مصنّف
اعجاز الحق قدوسی
قیمت: ۷۵ نئے پیسے
رسول پاک
عبدالواحد سندھی
۱/۵۰
پاک کہانیاں
دو حصے
مرتبہ. مقبول احمد سیوہاروی
قیمت
دو روپے ۱۰ نئے پیسے
چاریار
مصنّف
الیاس احمد مجیبی
قیمت
ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے
خلفاء اربعہ
مصنّف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت
ایک روپیہ ۲۷ نئے پیسے



ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی



سالانہ چندہ ـــــ پانچ روپے

فی پرچہ ـــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر ـ نئی دہلی ۲۵

فہرست

[illegible]

مکتبہ اس سلسلے [illegible]

دی ہے۔ اس میں ان سلسلہ وار مضمونوں کے
علاوہ آپ کو ایسی ایسی چیزیں ملیں گی جنھیں پڑھ
کر آپ [illegible]
[illegible]

[illegible]

بھی ابھی ہمارے منیجر صاحب نے [illegible]
دی ہے [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] غلطی سے
چھپ گیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

امرت کی برسا[illegible] ہمارا نعرہ ہے
اس دھرتی کا ہر اک انسان دھرتی ماں کا بیٹا ہے

---

۱ نسل - اولاد ۲ چمکدار ۳ فخر ۴ راستہ ۵ شعلہ

دھنک

[illegible]

[illegible]

...ن آ دا سے کہا اور ایک رنگ برنگی تت...

...تی تھرتھراتی پھول پہ بیٹھ کر اپنے پر...

[illegible]

سے رنگ لے آئیں" منی نے کہا "پھر ہم
بھی تتلی اور پھولوں کی طرح رنگ برنگے
ہو جائیں گے" اور بھیا کا ہاتھ پکڑ کر چل دی۔
باغ کے پھاٹک پر بلی بیٹھی تھی "میاؤں"

جیسا تمہارا دل چاہے"

"کھوں، کیوں، کہتے کہتے ننھے [illegible]

اور وہ بھی [illegible]

[illegible]

چلتے بہت دور [illegible]

کبھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہنے لگے۔

"تم تو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے بھیا کو اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا اور

آگے [illegible] پیچھے بکری کی پیٹھ پر بھیا اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بھیا [illegible] کی گود میں تھے اور ننھی [illegible]

[illegible] پٹیں۔

"کیلے تو نہیں تھے۔ ہمارے سا

تھ [illegible] بچی تھا، بکری کا بچہ تھا۔ بلّو نے

انہیں گھر کا راستہ بتایا۔ بکری کے بچے

نے بھیا کو پیٹھ پر بٹھایا اور بچی نے آپ

کی موٹر روکی۔ اور ہم رات کو نہیں گئے تھے شام کو گئے تھے۔ رات تو آ گئی۔"

امّی ہنس پڑیں "مگر آخر یہ سارا قافلہ کہاں چلا تھا؟"

"امّی ہم لوگ دھنک کے پاس جا رہے تھے تاکہ اسی سے ہم رنگ لے کر سب رنگ برنگے بن جاتے۔"

"پھر دھنک سے تُمھیں رنگ ملے؟" ابّا نے پوچھا۔

"نہیں ابّا۔ دھنک تو بجھ بھی گئی۔"



ممولا

محمد ضیاء الدین احمد شکیب

ایک ممولا ننّھا بیٹھا تھا اِک جھرنے پر
اس کی دُم بھی کانپ رہی تھی تھر تھر تھر تھر تھر تھر
اتنے میں اِک کُتّا آیا دُبلا، بھوکا، آوارا
اس کو دیکھ ممولا اُچکا گز بھر پر پھر جا بیٹھا
آیا پھر اِک ارنا بھینسا موٹا تازہ تگڑا سا
پانی میں وہ کود کے بھاگا پانی اُچھلا اور برسا
بھیگ گیا بیچارہ ممولا لیکن وہ نہ اُڑا بھاگا
آئے پھر اِک حضرت انسان پہنے سوٹ اک اچھا سا
اتنے شریف انسان میں بھیّا! جانے ممولے نے کیا دیکھا!
مارے ڈر کے پھر سے اُڑا اور دَم بھر میں یہ جا وہ جا!!

(ماخوذ از ہارڈی)





دِلّی کی مرچیں

جناب محمد حفیظ الدین

لگ بھگ تیس برس کی بات ہے، جامعہ قرول باغ میں کرائے کے مکانوں میں تھی۔ اوکھلے میں جامعہ کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا گیا۔ کچھ عرصے بعد ایک عمارت کی نیو رکھی گئی۔ زمین کی خریداری سے عمارت بننے تک کی کہانی اگر لکھی جائے تو دلچسپ ہو یا نہ ہو لمبی اتنی ہوگی کہ پورا پیامِ تعلیم بھی اس کے لیے کافی نہ ہوگا اس لیے ہم اس حصے کو چھوڑتے ہیں۔

جامعہ کی یہ پہلی عمارت آہستہ آہستہ زمین سے اُبھرنے لگی، ابھی کام جاری تھا بجلی اور نل کا تو ذکر ہی کیا عمارت میں دروازے بھی نہیں لگے تھے کہ شیخ الجامعہ سے ابتدائی ثانوی اور کالج والوں نے تقاضے شروع کردیے کہ پہلے ہمیں بھیجیے۔ اس ایک عمارت میں پوری جامعہ تو سما نہ سکتی تھی بس کوئی ایک ادارہ آسکتا تھا۔ تمام اونچ نیچ سوچنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ ابتدائی مدرسہ پہلے بھیجا جائے، اس وقت مدرسے کے نگراں مرحوم اکبر علی صاحب تھے۔ بڑے اچھے مزاج کے آدمی تھے۔ ان کی تندرستی اور سڈول جسم کا سا آدمی اب تک کوئی جامعہ میں نظر نہ آیا۔ جامعہ کے فدائیوں میں سے تھے، ایک حادثے سے عین عالمِ جوانی میں خُدا کو پیارے ہوگئے۔

اوکھلا آنے والے پہلے گروپ میں اکبر علی صاحب کے ساتھ عبدالغفار صاحب مدھولی اختر حسین صاحب فاروقی۔ سید مجتبیٰ حسین صاحب زیدی اور کچھ لوگ تھے جن کا اب پتہ نہیں

کہاں ہیں۔ دوسرے اسٹاف میں بشیر، مشتاق (موجودہ ہیڈ باورچی) اور جُلیبنا گاؤں کا نائی گردوُر وغیرہ تھے جو اب بھی موجود ہیں۔

اس وقت اوکھلا اور جامعہ لق ودق صحرا تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم! دلّی دروازے سے اوکھلے تک رات میں صحیح سلامت پہنچ جانا کرامت سے کم نہ تھا۔ سرِشام تانگوں سے گھوڑے کھول لیے جاتے تھے اس لیے دن ڈھلے کوئی اوکھلے کا رخ نہ کرتا تھا۔ اگرچہ ایسی سنسان جگہ میں جامعہ کے چند قلندر جمع تھے ان کے پاس دھرا ہی کیا تھا جو اندیشہ کرتے پر چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا اس لیے کچھ حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا۔ چار چوکیدار مقرر ہوئے جو رات بھر عمارت کے گرد اگرد چکر لگاتے، کبھی کبھی بعض استاد بھی ان کے شریک ہو جاتے۔

یہ چوکیدار چُن چُن کر رکھے گئے تھے۔ ہر چوکیدار کا ایک خاص کردار تھا ان میں کندن خاں خاص الخاص شخصیت کے مالک تھے اکثر اِدھر اُدھر کی خبریں سنانا، رپورٹیں دینا کبھی مزے میں ہوں تو کہانیاں سنانا ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ایک دن کسی نے ان سے پوچھا "کندن خاں بھلا یہ دلّی والے اتنی مرچ کیوں کھاتے ہیں۔ اور مرچ اِنھیں نقصان بھی نہیں کرتی۔ اس بارے میں تمھیں بھی کچھ معلوم ہے؟"

کندن خاں ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے کہنے لگے "ماسٹر جی ہمیں معلوم کیا نہیں ہے یہ کچھ قسمت کا پھیر ہے جو لاٹھی لیے پہرا دیتے ہیں۔ پہرے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے مرچوں کی کہانی اگرچہ لمبی ہے مگر میں چھوٹی کرکے سناتا ہوں۔"

اس کہانی میں بیان اُن کا زبان اپنی ہے۔ کندن خاں کی زبان میں اُن کے جوش اور تیور کے ساتھ کہانی سنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کہانی سنیے اور ان کے لیے دُعائے خیر کیجیے۔

کہانی

شاہ جہاں بادشاہ نے موجودہ پرانی دلّی بسائی تو اس کا شاہ جہاں آباد نام رکھا مگر یہ نام زبانوں پر چڑھا نہیں دلّی، دلّی ہی رہی۔ بادشاہ نے اس میں دو شاندار عمارتیں بنائیں ایک جامع مسجد دوسری لال قلعہ۔ جامع مسجد کی کرسی اتنی اونچی رکھی کہ اونٹ پر بیٹھ کر مسجد

کے نیچے چلے جاؤ اور پورا ہاتھ اٹھا کر فرش کو چھونا چاہو تو پھر بھی فرش اد کچا رہے گا چھونہ سکوگے اتنی اونچی جگہ پر مسجد کے صحن میں ایک حوض بنا ہے وہاں تک پانی پہنچانے کا خاص انتظام کیا گیا۔

آج کل تو نل لگے ہوئے ہیں چاہو تو آسمان تک فوّارے پہنچا دو پر شاہ جہاں کے زمانے میں یہ آسان نہ تھا۔

بات یہ ہے کہ مغل سدا پانی کے رسیا رہے ہیں وہ پانی کو مختلف روپ میں دیکھنا پسند کرتے تھے دریا کے کنارے خیمے لگاتے، عمارتیں بنواتے، چشموں، نہروں کے پاس سیر تفریح کرتے۔ جھرنوں، فواروں سے لطف اٹھاتے۔ لال قلعہ بھی دریا کے کنارے بنایا مغلوں سے سلطنت نے منہ موڑ لیا تو جمنا بھی کنارہ کر گئی اور اب قلعہ کا ساتھ چھوڑ دور بہا کرتی ہے۔

دلّی کا لال قلعہ آج کل بھی تقریبوں کا مرکز بنا ہوا ہے دعوتیں سپاسنامے، مشاعرے یہاں دھوم دھڑلّے سے ہوا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں تو خود بادشاہ قلعے میں رہتا تھا، یہیں سے فرمان جاری ہوتے تھے۔ عام دربار اور خاص دربار یہیں پر ہوتے، بادشاہ اپنی رعایا کو روز جھروکوں میں سے درشن دیتے۔

قلعہ دلّی کا دل تھا۔ اس لیے اس کے بناؤ سنگار کی کوئی حد نہ تھی، قلعے کے اطراف خندق کھودی گئی جس میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا۔ ایک جدّت یہ کی دور سے جمنا کو کاٹ کر ایک نہر بہائی جو چاندنی چوک سے ہوتی ہوئی قلعے میں داخل ہوتی تھی۔ فتح پوری سے قلعے تک جو چوڑی سڑک جاتی ہے پہلے یہ نہر تھی اس کے کنارے درخت لگے ہوئے تھے، پھل پھول بیچنے والے اور دوسرے پھیری والے میٹھی سُریلی صدائیں لگا لگا کر اپنی چیزیں بیچتے تھے۔ کوئی کہتا "میاں! نوٗ ریں ڈھلی چنبیلی لایا ہوں چنبیلی، ابھی مسکراتی ڈال سے اتری ہے" کوئی پکارتا "موتیے کی بہار ہے یہ گجرا، یہ ہار ہے" کوئی آواز لگاتا "جلیبا شہتوت ہے گلاب میں بسی گنڈیریاں، بیر ہیں بیر، گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں یہ ہری ہری مٹر، جمنا کی پلی ڈھلی مٹر، زمرد کے دانے بنا کھائے دل نہ مانے" ایک صدا لگاتا۔

اِدھر آکے دیکھو میں کیا بیچتا ہوں
میں دردِ جگر کی دوا بیچتا ہوں

قریب جاکر دیکھا تو شہدی تربوز کی سُرخ سُرخ قاشیں اور قتلے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں کو راحت کھا کر دل کو تراوٹ پہنچے۔ غرض بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتیں قسم قسم کی چیزیں دکھائی دیتیں نہر کے کنارے ایک موج بہار ہوتی۔

یہ نہر انگریزوں کے زمانے میں پاٹ دی گئی اس کے دیکھنے والے اِکا دُکا اب بھی زندہ ہیں۔ نہر کا نام نہر سعادت خان تھا اس کے کچھ کچھ آثار دلّی میں کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔

کہتے ہیں جب یہ نہر بن کر تیار ہو گئی اور قلعے میں داخل ہو کر جاری ہونے کا دن آیا، جشن کے سامان ہونے لگے، دلّی دُلہن کی طرح سجائی گئی۔ اُس زمانے میں دلّی یوں ہی بنی سنوری رہتی تھی۔ بادشاہ کے اعلان، رعایا کی خوشی نے اس میں اور چار چاند لگا دیے۔ جسے دیکھیے خوش خوش نظر آتا تھا۔ نہر کے پانی سے زیادہ رگوں کے خون میں جوش تھا ستا سُکھال زمانہ، بے فکری اور آسودگی کے دن، دلّی میں ہُن برس رہا تھا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

عین اُسی روز شاہی طبیب اور اُن کے کچھ طرفداروں کے گھر سیاہ خانے بنے ہوئے تھے۔ خود شاہی طبیب ماتمی کالے لباس میں تھے چہرا مرجھایا ہوا اور دل پر غموں کے بادل چھائے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا ان پر کوئی بھاری بپتا پڑی ہے اس حال کی اطلاع ہوتے ہوتے بادشاہ تک بھی پہنچ گئی۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے خوب خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ شاہی طبیب کی یہ حرکت ہی ایسی تھی جو سنتا تھا اچنبھے میں پڑ جاتا تھا۔ شاہ جہاں بہت اچھے مزاج کا بادشاہ تھا اگرچہ خبر معتبر ذریعے سے پہنچی تھی پر اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا اور پرانا وفادار طبیب ایسی حرکت کرے گا اُدھر حکیم کا بُرا چاہنے والوں میں کھلبلی مچی کہ ہیں، اب تک حکیم کا کچھ بگڑا نہیں۔ تیز سے تیز خبریں تراش تراش کر پہنچاتے تھے۔ شاہ جہاں لاکھ بھلا ہی آخر تھا تو بادشاہ۔ شاہی تیوری پر بل آگئے خبریں سُن سُن کر

بھڑک اُٹھا طیش میں آکر "فوری طلبی" کا حکم دیا۔ "فوری طلبی" کے حکم کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ جسے بلایا جائے وہ جہاں بھی، جس حال میں ہو بغیر کسی تبدیلی اور دیری کے فوراً اٹھ کھڑا ہو اور اسی حال میں حاضر ہو جائے۔

چوبدار پہنچے، شاہی فرمان حکیم کو سنایا، حکیم جی اسی ماتمی لباس میں ساتھ چلے۔ بادشاہ کے سامنے پیشی ہوئی، بادشاہ تھوڑی دیر کے لیے اچنبھے میں پڑ گیا اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ غصے کو بہت ضبط کیا مگر ایک خود مختار حکمراں کتنا ہی اپنے آپ کو سنبھالے اُس کی خفگی کہاں چھپ سکتی تھی۔ بادشاہ کے تیور بتا رہے تھے کہ آج خیر نہیں وہ حکیم جس نے ہزاروں لاکھوں کی جان بچائی تھی آج بے کس و بے سہارا خود موت کے گھاٹ پر کھڑا تھا۔ یہ گھاٹ اسی کا تیار کیا ہوا تھا۔

یکایک بادشاہ کی رعب دار آواز گونجی "کیا ہمارے سامنے یہ وہی شخص کھڑا ہوا ہے جس پر ہم نے پورا پورا بھروسا کیا تھا، جسے اپنی صحت و راحت کی ذمہ داری سونپی تھی۔ ہم جسے اپنے دُکھ سُکھ کا رکھوالا سمجھتے تھے کیا یہ ہماری بھول تھی کہ اپنی عزیز جان کی حفاظت ایک ایسے شخص کے حوالے کر دی جسے ہماری خوشی سے رنج ہے اور رعایا کی مسرت سے صدمہ پہنچتا ہے جس نے آج اتنی بڑی خوشی کے دن ماتم کا ڈھونگ رچایا ہے؟"

بادشاہ نے کچھ دیر ٹھہر کر پھر کہا۔ "اس کھلی غدّاری کا جواز اور سبب پوچھنے کی اب بالکل ضرورت نہیں رہی ہے۔ جلادوں کی تلواریں ہمارے فیصلے کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں پھر بھی تمہاری پچھلی خدمتیں آڑے آ رہی ہیں ہم اپنے 'مراحم خسروانہ' سے تمھیں صفائی کا ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔ تمھیں کچھ کہنا ہے؟"

دربار پر سناٹا چھا گیا ہمدردوں کے دل دہلنے لگے عجب سماں تھا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ کیا دھرا رکھا ہے یہ صرف ایک ضابطے کی کارروائی ہو رہی ہے۔ حکیم کا جو حشر ہونے والا تھا اس کا الم ناک نقشہ سب کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا پلکوں پر موتیوں کے ہدیے لیے دل دعاؤں میں ڈوب گئے الٰہی خیر، ہمیں وہ نامراد گھڑی نہ دکھائیو جس کا کھٹکا لگا ہوا

ہے الٰہی تیری قدرت کا صدقہ حکیم کے دشمنوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ ادھر دعاؤں کی ڈھالیں ڈھل رہی تھیں اُدھر موت اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ لیس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

اسی عالم میں حکیم کی زبان کھلی۔ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ۔ گھبراہٹ سے کوسوں دور، سچائی کے سانچے میں ڈھلے بول، موتیوں کے تول نکل رہے تھے اور دلوں میں اترے جا رہے تھے۔

"جب یہ خادم خلق اس منصب پر آیا تھا اُس نے جہاں پناہ کی وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ وفاداری چاپلوسی اور خوشامد سے دور رہتی ہے وہ اپنا کھڑا اس وقت دکھاتی ہے جب چکنی چپڑی باتوں میں سچائی کا چہرہ چھپ جائے۔ چھوٹی برائیاں سر اُٹھانے لگیں خطرہ چاروں طرف منڈلانے لگے خادم نے عمر بھر نمک کھایا ہے زندگی کا سویرا ہو چکا ہے عمر کا دیا ٹمٹما رہا ہے میں ان آخری گھڑیوں میں کو رنمکی کر کے کیا بھر پاؤں گا عالی جاہ!

"طبیب کی انگلیاں صرف انسانی نبضوں ہی کو نہیں ٹٹولتیں وہ آنے والی وباؤں کو ہواؤں میں سونگھ لیتا ہے بھپ اندھیروں میں اُن کے چہرے دیکھ لیتا ہے۔ اُس کی د[illegible] تلواروں کے سایے میں بھی بے کھٹکے [illegible] بولتی ہے اگر اس جشن کی زینت میں کوئی کو[illegible] باقی رہ گئی ہے تو طبیب شاہی کا خون حا[illegible] ہے اس کے سُرخ گل بوٹوں سے پوری کر[illegible] جائے۔ حقیقت میں آج کا دن ملک، رعا[illegible] بادشاہ کے لیے منحوس دن ہے۔

"یہ نہر سدا زندگیوں کی بھینٹ [illegible] گی۔ آپ کی عزیز رعایا نت نئی بیماریوں [illegible] ہوگی اس کی تری سے شہر میں نزلہ، زکا[illegible] کھانسی، بخار، نمونیہ کی وبا پھیلے گی آج [illegible] خوشیاں کل سوگ دکھائیں گی۔ ظاہر [illegible] اس کا غم صحت کے ذمہ دار طبیب سے ز[illegible] کس کو ہوگا دل کے اس دُکھ نے ماتم ک[illegible] پوشاک پہنائی ہے۔"

تقریر میں سچائی اور جراءت تھی [illegible] تھا اثر تھا، دشمنوں کے بھی دل پسیج [illegible] بادشاہ کی پیشانی پر ندامت کا پسینہ آ[illegible] طبیب شاہی کو مجرموں کے کٹہرے سے [illegible] ان کے منصب کے شایان شان جگہ

ہوا ۔

"بے شک ہم سے بھول ہوئی، طبیب شاہی سے اس سلسلے میں مشورہ ضروری تھا۔ اب کوئی ایسی تدبیر ہو کہ نہر بھی جاری رہے اور رعایا بھی تندرست ۔ یہ ہمارے دانا طبیب کی سوجھ بوجھ اور فن کا کڑا امتحان ہے ۔"

طبیب شاہی نے زمینِ ادب چومی، ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "جہاں پناہ کا اقبال بلند رہے۔ سارے شہر میں منادی کرا دی جائے کہ آج سے اہلِ دہلی جمعہ کے جمعہ بھنے چنے کھا لیا کریں اور روزانہ کے سالنوں میں مرچوں کی کثرت رکھیں۔ منادی ہوگئی زور شور سے مشورے پر عمل شروع ہو گیا ۔ جب سے دلّی والوں کو مرچوں کے اس چٹخارے کی عادت پڑ گئی ۔

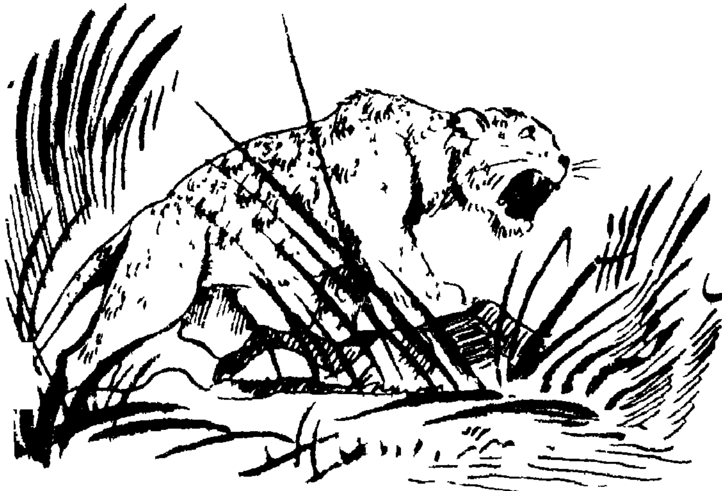
نہر مٹ گئی، رطوبت ہٹ گئی دلّی کے زمین و آسمان بدل گئے مگر وہ دن اور آج کا دن اس رواج میں کمی نہ آئی ۔

جناب جبرئیل صدیقی

امتحان

ہے یہ دن اِمتحان کا بچّو
صبح اٹھتے ہی ہاتھ مُنہ دھولو
مدرسے جلد تم کو جانا ہے
سبق اُستاد کو سُنانا ہے
لے کے کاغذ قلم دوات چلو
امتحان آگیا نہ اب کھیلو
لڑکے آتے ہیں اور قطاریں ہیں
ماسٹر صاحب انتظار میں ہیں
سال بھر تم نے جو پڑھا بچّو
سال بھر تم نے جو لکھا بچّو
اس پڑھائی کا امتحاں ہے آج
اس لکھائی کا امتحاں ہے آج
پاس ہو جاؤ گے تو ہوگا نام
سال بھر کا ملے گا یہ انعام





ٹیبور سیکلج

ترجمہ

جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا

ہم اپنی کشتی دریا کے بیچ میں لے آئے اور وہاں رُک کر انتظار کرنے لگے ۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ کنارے کی سبز دیوار میں ایک شگاف ہوا اور اُس میں ایک خوب صورت اور تن درست جاگور نکل کر سامنے آگیا۔ جنگل کا یہ خوب صورت درندہ بڑی شان کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا پانی کی طرف بڑھنے لگا۔



"جاگور ــــــ جنگل کا راجا" کومے واوا نے بہت آہستہ سے جیسے میرے کان میں کہا۔ جاگور آہستہ آہستہ کنارے تک آیا اور اطمینان سے پانی پینے لگا۔ ہم دونوں دم سادھے اس منظر کا لُطف اُٹھا رہے تھے ۔

پانی پی کر جاگور نے گردن اُٹھائی، چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور جدھر سے آیا تھا آہستہ آہستہ اُسی طرف کو چلا گیا۔

جاگور کے جاتے ہی جنگل میں زندگی آگئی اور ایک دفعہ پھر جانوروں کی آوازوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونج اُٹھی۔ ہم نے بھی دریا کے بہاؤ پر اپنی کشتی آگے بڑھائی۔

تھوڑا آگے بڑھے تو کچھ گنگناہٹ سی سُنائی دینے لگی ۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے

آواز بھی تیز ہوتی گئی ۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر تو
وہی گنگناہٹ دل ہلا دینے والی تیز گڑگڑاہٹ
میں بدل گئی ۔ میں نے کومے واآدا کی طرف
سوالیہ نظروں سے دیکھا ۔ کومے واآدا نے مسکرا
کر کہا:

"آگے دریا کا اُتار ہے ۔ جو لوگ اِس
دریا سے واقف نہیں ہیں اُن کے لیے یہ
مقام بہت خطرناک ہے ۔"

تھوڑی ہی دیر میں ہم دریا کے اُتار
والے حصے میں داخل ہو گئے ۔ اِس جگہ دریا
کی گہرائی بہت کم تھی ۔ پانی اِتنا چھچھلا اور
اُتھلا تھا کہ تہ صاف نظر آ رہی تھی ۔ پانی
سطح پر اِدھر اُدھر بیسیوں چٹانیں اُبھری
ہوئی تھیں ۔ اِن سے ٹکراتا اور شور مچاتا
ہوا پانی کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا
تھا ۔ ہماری کینو کبھی دائیں طرف اور کبھی
بائیں طرف ایک سوکھے ہوئے پتّے کی طرح
چلی جا رہی تھی ۔

"اب چپّو چلانا بند کر دو ۔" کومے واآدا
نے حکم دیا ۔

میں نے دونوں چپّو اُٹھا کر کشتی میں
رکھ لیے ۔ ہر لمحے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کشتی
اب اِس چٹان سے ٹکرائی اور اب اُس چٹا
سے ٹکرائی ۔ مگر کومے واآدا بڑے اطمینان
ساتھ پتوار کی مدد سے کشتی کو چٹانوں سے ب
دریا کے ایسے حصے میں لے آیا جو نسبتاً
طوفانی تھا ۔ لیکن پانی کے بہاؤ کی رفتار یہا
بھی کچھ کم نہ تھی ۔ ہماری کشتی اب بھی بے لگ
بھڑکے ہوئے گھوڑے کی طرح سرپٹ اُڑی چ
جا رہی تھی ۔ یکایک کوئی پندرہ گز کے فاص
پر ایک بڑی چٹان کشتی کے بالکل سیدھ میں
دکھائی دی ۔ اُس کو دیکھتے ہی کومے واآدا نے
چیخ کر کہا:

"نکو چپ بایاں چپّو چلاؤ ــــ خو
زور سے چلاؤ ۔"

پانی کے شور میں کومے واآدا کی یہ چیخ
ایسی لگی جیسے کہیں بہت دور سے کوئی آ
دے رہا ہو میں اپنی پوری طاقت سے مش
کی سی تیزی کے ساتھ چپّو چلانے لگا ۔ سا
والی چٹان اب ہم سے کچھ ہی دور رہ گئی تھی
شاید اگلے سیکنڈ کے ختم ہونے تک ہم ا
سے ٹکرا جاتے کہ کومے واآدا نے اپنا چپّو

پرزور سے مارا کشتی ایک جھٹکے کے ساتھ اُلٹے ہاتھ کی طرف مُڑی اور چٹان کو صرف آدھے گز کے فاصلے پر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہم یقیناً تباہ ہو گئے ہوتے اگر جنگل کا یہ نونہال اتنی ہوشیاری سے کشتی کو ٹکرانے سے نہ بچا لیتا۔ کومے واوا کی اس چابک دستی پر میں عش عش کر اُٹھا۔

کچھ اور آگے چلنے پر دریا کے اُتار کا علاقہ ختم ہوگیا اور ہم گہرے اور پُرسکون پانی میں داخل ہوگئے۔ ہم دونوں ہی تھکن محسوس کر رہے تھے۔ کومے واوا کینو کے اگلے حصّے پر لیٹ گیا اور میں پچھلے حصّے پر۔ جنگلی لڑکے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے روئی کے گالے جیسے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہماری کشتی پانی کی پُرسکون سطح پر آہستہ آہستہ تیر رہی تھی۔

"اگر تم اتنی ہوشیاری سے کشتی کو بچا نہ لیتے تو ہم کبھی کے مر چکے ہوتے" میں نے کومے واوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بوڑھے ماوا کا کہنا ہے کہ دریا اور درندوں پر قابو پانا سیکھو ورنہ وہ تمھیں قابو میں کرلیں گے۔" یہاں تک پہنچنے کا ایک اور آسان اور سیدھا راستہ بھی ہے مگر چوں کہ یہ گڈھب مگر دل چسپ راستہ ہے اس لیے میں تم کو اِدھر ہی سے لے کر آیا" کومے واوا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں پانی گہرا اور صاف ہے۔ آؤ اب مچھلیاں پکڑیں۔"

اس کے کہنے کے مطابق کشتی کے پچھلے حصّے پر بیٹھ کر میں کشتی کھینے لگا۔ کشتی کے اگلے حصّے پر کومے واوا تیر کمان لے کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ اِس وقت اس کا ننگا جسم کانسے کے اُس خوب صورت بُت کی طرح لگ رہا تھا جو صبح کے نیلے آسمان کے پس منظر میں کھڑا ہو۔ اُس کے خوب صورت کالے بال شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ناک میں لکڑی کی پتلی سی کیل تھی اور دونوں گالوں پر سیاہ حلقے گُدے ہوئے تھے۔ یہ کالے حلقے 'کاراجا' قبیلے کا امتیازی نشان تھا۔ اُس کے سر کے چاروں طرف ہرے رنگ کا ایک فیتہ لپٹا ہوا تھا۔ اس فیتے میں پیچھے کی طرف عقاب کا ایک پَر کُھسا ہوا تھا۔ کمرے کے چاروں طرف ایک

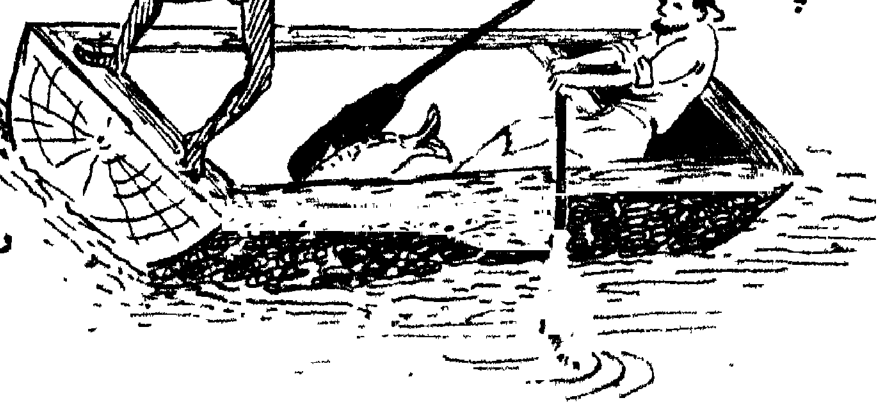
پتلی سی ڈوری تھی۔ اس ...
چوکور کپڑے کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لٹکتے
تھے۔ یہی دو ٹکڑے اس کا لباس تھے۔

وہ بالکل دم سادھے کھڑا تھا اور پانی
پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے
کشتی کو داہنی طرف یا بائیں طرف موڑنے کے
لیے ہاتھ سے اشارہ کر دیتا تھا۔ یکایک
کومے واآوا نے تیزی سے تیر چلایا ایک ہلکے
چھپاکے کے ساتھ تیر پانی میں غایب ہو گیا۔
تھوڑی ہی دیر میں تیر کے پر پانی کی سطح پر نظر
آئے۔ کومے واآوا نے کمان کی مدد سے تیر کو اپنی
طرف کھینچا۔ تیر کی نوک میں تقریباً دو گز لمبی
مچھلی تڑپ رہی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر مچھلی
کو کشتی میں ڈالا اور اُس کے جسم
سے تیر کو نکال لیا۔

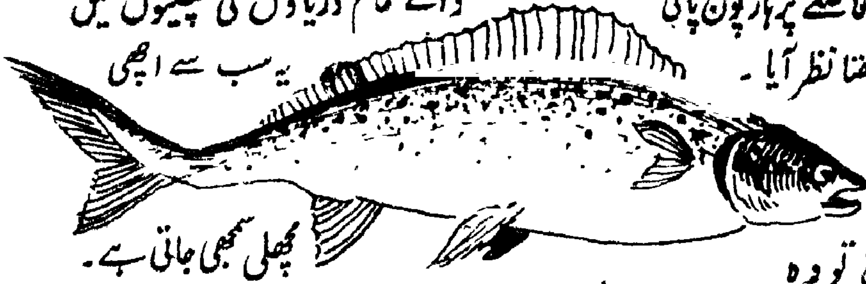
کم و بیش آدھ گھنٹے تک ہم پانی
پر اِدھر اُدھر چکّر لگاتے اور مچھلیاں

... پانچ
مچھلیاں اور ماریں۔ ان میں سے دو تو پہلی والی
مچھلی سے بھی بڑی تھیں۔

ایک دفعہ کومے واآوا نے مجھ سے کشتی کو
بائیں طرف گھمانے کو کہا اور ساتھ ہی تیر کمان
رکھ کر ہارپون اُٹھا لیا۔ اُس نے ہارپون کی نوک
کو غور سے دیکھا، لکڑی کو آزمایا اور اُس رسّی کو
بھی جھٹکے دے کر پرکھا جو ہارپون کے ساتھ بندھی
ہوئی تھی۔ اس رسّی کا دوسرا سرا اُس نے کشتی
سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا اور پھر ہارپون
داہنے ہاتھ میں لے کر خاموش کھڑا ہو گیا۔
یقیناً اُس نے کوئی بہت بڑی مچھلی دیکھ لی تھی
ذرا سا جھک کر اُس نے پانی میں آنکھیں
گڑو دیں۔ تھوڑی دیر وہ اُسی طرح دم سادھے
کھڑا رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کشتی
کو داہنی طرف موڑنے کو کہا اور
ساتھ ہی نیزہ۔ پھینکنے کے انداز میں
ہاتھ اُٹھا کر پوری طاقت
سے ہارپون کو پانی
کی گہرائی میں پھینک
دیا۔ کچھ دیر تک ہم یہ انداز



سکے کہ ہارپون صحیح نشانے پر بیٹھا بھی یا نہیں۔ ہم دونوں کی نگاہیں پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں کچھ فاصلے پر ہارپون پانی کی سطح پر آتا اور آگے بڑھتا نظر آیا۔ ہارپون کے ساتھ بندھی ہوئی رسّی چلنے لگی۔ جب پوری رسّی پانی میں چلی گئی تو وہ تن گئی اور پھر ہماری کشتی ہارپون کی طرف کھنچنے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی طاقت ور چیز ہماری کشتی کو کھینچے لیے جا رہی ہے۔ یقیناً یہ کوئی بہت بڑی مچھلی تھی جو زخمی ہونے کے باوجود ہماری کشتی کو کھلونے کی طرح ادھر اُدھر دوڑائے پھر رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ تک یہ مچھلی ہماری کشتی کو چکر دیتی رہی۔ آخرکار کشتی کی رفتار کم ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ بالکل ٹھہر گئی ب کومے دادا نے رسّی کو کھینچنا شروع کیا۔ سی ختم ہوئی تو ہارپون کا دستہ نظر آیا۔ کومے دادا نے ہاتھ بڑھا کر ہارپون پکڑ لیا اور مجھے مدد لیے پاس بلایا۔ ہم نے سات فٹ لمبی اور کافی ی مچھلی کو اُٹھا کر کشتی میں ڈالا۔ کافی مشکل اور محنت کا کام تھا۔ کومے دادا نے بتایا کہ اس کا نام "پیرارڈکو" ہے۔ امیزن اور اس سے ملنے والے تمام دریاؤں کی مچھلیوں میں یہ سب سے اچھی مچھلی سمجھی جاتی ہے۔



اس مچھلی کو کشتی میں ڈالنے کے بعد ہم دونوں پھر سُستانے کے لیے لیٹ گئے۔ میں نے کومے دادا کے شکاری بڑی تعریف کی۔ مگر اُس نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ آج کا شکار کوئی غیر معمولی شکار نہیں ہے کہا:

"تمام جان دار اپنی خوراک حاصل کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ آدمی کو بھی اپنی خوراک حاصل کرنے کا طریقہ جاننا چاہیے۔"

"ہاں! کہتے تو ٹھیک ہو۔ مگر تم ابھی پورے آدمی کہاں ہو۔ بچے ہی تو ہو۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ میرے گالوں پر یہ جو دو حلقے گُدے ہوئے ہیں نا۔ ان کو دیکھو۔ یہ اس بات کی نشانی ہیں کہ میں پورا آدمی ہوں" کومے دادا نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں ۔ وآوا مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"اب وقت نہیں ہے ۔ باتیں کریں گے تو مچھلیاں بھاگ جائیں گی ۔ اور تمھارے ساتھی بھی تو بھوکے بیٹھے ہوں گے۔"

"لیکن میں تمھارے ان نشانوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔"

"بوڑھے مالوآ کا کہنا ہے کہ اگر انسان تجسس کے جذبے کو دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دے تو حقیقت خود بخود اس پر ظاہر ہو جاتی ہے۔" کومے وآوا نے جواب دیا۔

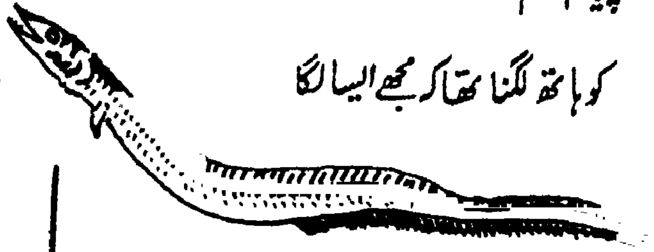
اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میں سیاہ حلقوں کے راز کو معلوم کرنے کے اُس جذبے اور شوق کو جو میرے دل میں موج زن تھا دبانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو مجھے بھی کوئی ایسا شوق نہیں ۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ میرا دل یہ بھید اب اور اسی وقت جان لینے کے لیے بُری طرح بے تاب ہو رہا تھا۔

بجلی کا جھٹکا

لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی قسمت آزمائی کروں اور کومے وآوا کی طرح دو ایک مچھلیاں میں بھی ماروں ۔ میں نے کومے وآوا سے کینو کے پچھلے حصّے پر بیٹھنے اور کشتی کھینے کو کہا اور خود کشتی کے اگلے حصّے پر کھڑا ہو گیا ۔ میں بڑی مچھلی پکڑنا چاہتا تھا ۔ اس لیے تیر کمان کے بجائے ہارپون اٹھا لیا ۔ پہلے پہل کشتی پر کھڑے ہو کر اپنے کو سادھے رکھنا مجھے بہت مشکل لگا ۔ دو تین بار پانی میں گرتے گرتے بچا ۔ رفتہ رفتہ اپنی اس کمزوری پر میں نے قابو پا لیا ۔ اب میں نے پانی میں نظریں گڑا گڑا کر اپنے شکار کی تلاش شروع کر دی ۔

اناڑی پن کی وجہ سے شروع شروع میں پانی میں ڈوبے ہوئے پیڑ کا ہر تنا اور چٹان مچھلی معلوم ہوتی تھی ۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعی ایک بڑی سی مچھلی نظر آئی ۔ یہ مچھلی کشتی کے بائیں طرف سے بچ نکلنا چاہتی تھی ۔ میں نے نشانہ لے کر ہارپون کو پوری طاقت سے پھینکا ۔ ہارپون مچھلی کی پیٹھ کے بیچوں بیچ ترازو ہو گیا ۔ مچھلی تڑپ کر آگے بڑھی ۔ ہارپون کی ڈوری کھسکنے لگی ۔ مچھلی دور نہ جا سکے یہ سوچ کر میں نے ڈوری پر ہاتھ ڈالا ۔ ڈوری

کو ہاتھ لگنا تھا کہ مجھے ایسا لگا



جیسے بجلی کا طاقت ور تار پکڑ لیا ہو۔ بجلی کا ایک زور دار جھٹکا لگا اور میں لڑکھڑا کر چاروں شانے چت کشتی میں گر گیا۔ میرا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو دیکھا کہ کومے واآوا پیٹ پکڑے بے تحاشہ ہنس رہا ہے۔

"ٹک چِپ! کیا تم برقی مچھلی کو بھی نہیں پہچانتے؟" کومے واآوا نے کہا۔ "میں نے تو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا"

"بڑے نٹ کھٹ ہو تم کومے واآوا۔ پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا تم نے؟" میں نے کہا۔

"آدمی جو چیز خود اپنے تجربے سے سیکھتا ہے اُسے وہ عمر بھر نہیں بھولتا۔ اب مجھے یقین ہے کہ تم کبھی بھی اس مچھلی کو پہچاننے میں غلطی نہ کروگے۔" کومے واآوا نے جواب دیا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہارپون کی رسی ہاتھ میں لے کر کھینچنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ ہارپون پانی کی سطح پر آ گیا۔ اس کی نوک میں لمبی، پتلی برقی مچھلی چھدی ہوئی تھی۔ یہ مچھلی بھی تقریباً پانچ فٹ لمبی تھی۔ مگر موٹی نہ تھی۔ وہ اب بھی پانی کی سطح پر پلٹے لے رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

پہیلیاں

(۱) بِنا آگ گرما گئی
دھواں کو شرما گئی

(۲) بولے ہے بُلائے ہے
منہ نہیں دکھلائے ہے

(۳) کالا توا
کوٹھے چڑھ چلایا

(۴) دو سکھی ایک ساتھ ہی رہویں
ساتھ ہی جاگیں ساتھ ہی سوویں
روے ایک تو دوجی روے
ہنس پڑیں تو ساتھ ہی ہنسیں
لوگوں دیکھو ایک اچنبھا
ایک دوجے کو کبھی نہ دیکھیں

جناب قاضی محمد احمد جامعہ کالج

کالا پتھر



۲

آپ کے دل میں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ یہ کالا پتھر یا کوئلا آخر ہے کیا چیز؟ سچ سچ بڑا ٹیڑھا سوال ہے اس کی اصلیت بتانے کے لیے کروڑوں برس پیچھے جانا پڑے گا۔ کوئلے کی آپ بیتی آج سے کروڑوں سال پہلے سے شروع ہوتی ہے۔

آج سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے ہماری یہ دنیا، یہ زمین ایسی نہ تھی جیسی اب نظر آتی ہے، اُس وقت تو اُس دنیا میں جگہ جگہ پانی تھا یا دَل دَل تھی۔ خدا کا کرنا اس دَل دَل میں سے سبزے نے سر نکالا۔ پیڑ پودے نکل آئے۔ یہ پیڑ پودے تناور درخت بن گئے۔ دَل دَل گھنے جنگلوں سے ڈھک گئی۔

پھر اس زمین پر نہ جانے کیا بیتا پڑی۔ نہ جانے زلزلہ آیا یا کیا ہوا۔ دَل دَل والی ساری زمین جنگل سمیت نیچے دھنس گئی۔ زمین کا دھنسنا تھا کہ پانی اس پر چڑھ دوڑا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ نہ جانے کتنے جُگ اس طرح بیت گئے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ پانی کم ہونے لگا اور سوکھنے لگا۔ ہوتے ہوتے پھر یہاں دَلدل ہو گئی۔ اس دَل دل میں پھر سبزہ لہلہانے لگا۔ پیڑ پودوں نے پھر سر نکالا۔ اتنے میں اس دُکھیاری زمین پر پھر آفت آئی۔ صاف صاف کہیے کہ زلزلہ آیا اور پھر سارا کا سارا جنگل زمین میں دھنس گیا۔ غرض لاکھوں لاکھ سال قدرت یہ کھیل کھیلتی رہی اور زمین کے اندر ہی اندر ان درختوں کی تہوں پر تہیں جمتی رہیں۔

مگر بس اتنا ہی تو نہیں ہوا۔ آپ جانتے

ہیں زمین کے اندر بے انتہا گرمی ہے اتنی شدید گرمی ہے کہ ہم آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس شدید گرمی سے یہ جنگل جل اٹھے وہ تو کہیے زمین کے اندر ہوا کا گزر نہیں ہے۔ نہیں تو یہ سارے کے سارے جنگل جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے یہ جل کر بجھ گئے اور کوئلا بن گئے۔ پھر نہ جانے کتنے لاکھ سال تک ان پر زمین کا دباؤ پڑتا رہا۔ اس مسلسل دباؤ کی وجہ سے یہ پتھّر کی طرح سخت ہو گئے۔

سمجھے آپ! ہم آپ جسے کالا پتھّر یا پتھّر کا کوئلا کہتے ہیں دراصل لکڑی کا کوئلا ہے پر اتنا سخت ہے کہ بالکل پتھّر جیسا لگتا ہے۔ اور ہم آپ اسے پتھّر کا کوئلا کہنے لگتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جنابِ عادل کہلگانوی

بھوت

بڑی بی نے پان پر چونا پھیلاتے ہوئے کہانی شروع کی ـــــ
"رات بڑی اُداس اور سُنسان تھی۔ اندھیرا بھی غضب کا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا اور آموں کے ٹپ ٹپ گرنے کی آواز مجھے اکسائے جا رہی تھی۔ نہ جانے کتنا بڑا ڈھیر لگ گیا ہوگا آموں کا، میں سوچ رہی تھی۔ آخر بے صبر ہو کر بستر سے اُٹھی، ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑی اور دوسرے میں ایک مضبوط سا وزنی ڈنڈا اور اپنے باغیچے کی طرف چل پڑی۔"
"باغیچہ کتنی دُور تھا؟" اسلم نے سوال کیا۔
"بس قریب ہی تھا" بڑی بی نے اُگال دان میں پیک تھوکتے ہوئے جواب دیا ـــــ
"اِس باغیچے کے متعلق مشہور تھا کہ بھوت رہا کرتے ہیں اور رات کو راہ چلتے مسافروں کو بُری طرح پریشان کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی کو رات کے وقت ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آم چُننے کی بات تو بھلا کوسوں دور تھی۔"
"بھلا جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟" میں نے کہا۔

"ہاں بیٹا، جان سب کو عزیز ہوتی ہے
بڑھیا نے ہاں میں ہاں ملائی "لیکن مجھے کبھی
ان باتوں پر یقین نہ آیا۔ میں انھیں ہمیشہ
جھوٹ اور من گھڑت سمجھتی رہی کیونکہ میں
پچھلے چند سالوں سے رات کو آم چُن چکی تھی
میرے ساتھ کبھی کسی قسم کی بات پیش نہیں
آئی تھی۔"

"پھر آگے کیا ہوا....؟ جب آپ اکیلی اُس
رات کو باغیچے گئیں....؟" گوپال نے ٹوکا۔

"میں بے خوف وخطر باغیچے میں داخل
ہو گئی اور آم چُننے میں ہمہ تن مصروف ہو گئی۔
ہر ہر قدم پر مجھے گرے ہوئے آم ملتے گئے اور
میں انھیں چُن چُن کر تھیلے میں رکھتی آگے بڑھتی
گئی۔ ابھی دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے
کہ اچانک ایک غیر مانوس سی آواز میرے
کانوں سے ٹکرائی جس طرح کوئی مریض انتہائی
کربناک حالت میں کراہتا ہو — 'آہ....
اوہ..... ای.... ہ' میں آواز سُن کر ٹھٹک
گئی جس طرح کوئی ہرنی ذرا سی آہٹ پر
خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر تاکتی ہے۔
لیکن آواز پھر بند ہو چکی تھی۔ مجھے اپنے
کانوں پر شک ہونے لگا۔ یہ محض وہم ہوگا میں
نے سوچا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ مگر
یہ کیا؟ ابھی دو چار ہی آم چُنے ہوں گے کہ
پھر وہی کراہنے کی آواز....... میں بہت
حیران ہوئی کہ آخر آج یہ کس شیطان سے پالا
پڑ گیا۔ اب کی آواز میں پہلے سے کہیں زیادہ
کرب تھا، بے چینی تھی۔ مگر میں پوری ہمت
کے ساتھ اپنے کام میں ڈوبی رہی اور پھر آواز
بھی یکایک بند ہو گئی۔"

"آپ کی بھی ہمت کا جواب نہیں۔"
شنکر نے تعریفی جُملہ چھوڑا۔

"ہاں مگر میں اب بہت محتاط ہو گئی
تھی اور آنے والے ہر خطرے کے مقابلے
کے لیے تیار تھی۔ دس بارہ قدم آگے بڑھنے
کے بعد آواز پھر اسی طرح آنے لگی۔ اس بار
یہ زیادہ صاف اور واضح سنائی دینے لگی —
'او... ، او.... ہ.....، ای.... ہ'۔ اب
مجھے یقین ہو چلا کہ یہ ضرور کسی بھوت کی شرارت
ہے۔ میں نے لالٹین کی لَو ذرا تیز کر دی، ڈنڈا
بھی اچھی طرح سنبھال کر پکڑا اور ہمت
باندھ کر اسی آواز کے رُخ پر بڑھنے لگی معلوم

ہوا کہ آواز اُتر والی جھاڑی سے آرہی تھی۔ میں جب دھیرے دھیرے ایک ایک قدم چل کے جھاڑی کے قریب پہنچی تو یہ دیکھ کر میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ وہاں واقعی ایک بھوت تھا۔ بالکل ننگا! اور رنگ اس قدر سیاہ کہ ساون کی اندھیری راتیں بھی شرما جائیں۔ وہ اُکڑوں بیٹھا کراہ رہا تھا اور پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے بلند آواز سے اُسے مخاطب کر کے پوچھا۔

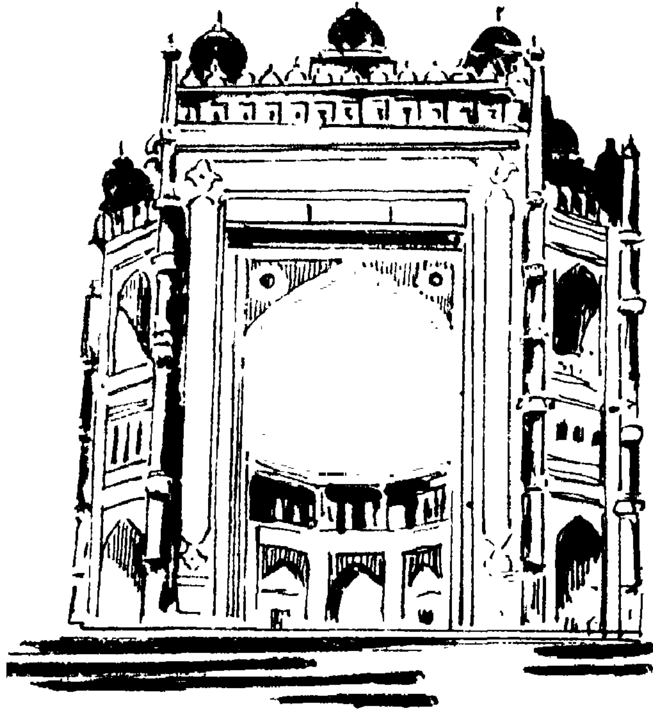
'سچ بتا تو کون ہے؟ جن ہے یا انسان ہے، بھوت ہے یا شیطان ہے؟ قسم ہے پاک پروردگار کی، اگر تُو جھوٹ بولا.....'

"اُس کی آواز رکنے کو تو رک گئی مگر کوئی جواب نہ ملا اور وہ اپنی جگہ پر اُسی طرح بیٹھا رہا۔ البتہ اس کے جسم کو ذرا سی جنبش ضرور ہوئی۔ میں نے لالٹین زمین پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑ لیا کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو مجھے یقیناً اس کی خبر لینی چاہیے۔ سنگ موسیٰ کی طرح کالے بھوت کا مجسمہ پھر ایک بار حرکت کرنے لگا اور زور زور سے کراہنے لگا —— اب اس کی یہ حرکت میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ میں نے ڈنڈے کا ایک بھرپور وار اس کی پیٹھ پر کر ہی دیا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا..... ایک خوفناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور دور تک ہوا میں تیرتی چلی گئی اور ساتھ ہی ساتھ بھوت بھی نظروں سے غائب تھا۔

"اب میری ساری ہمّت برف کی مانند پگھل گئی تھی۔ حملہ تو کر دیا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میرا سارا بدن خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میں فوراً اُلٹے پاؤں، لاٹھی کھا کر تیورائے ہوئے کُتّے کی طرح بدحواس ہانپتی کانپتی، گڑھوں اور خندقوں پر سے چھلانگ لگاتی ہوئی گھر کی طرف بے تحاشا سرپٹ دوڑنے لگی اور گھر پہنچ کر اندھیرے میں ایک دیوار سے ٹکرا کر ایک دلدوز چیخ کے ساتھ گر کر بے ہوش ہو گئی۔

"پھر صبح جب مجھے ہوش آیا تو میں نے بھی یہ خبر سنی کہ کلو مہتو کا نیا ملازم بھی جو بالکل بہرا تھا اور کل دوپہر سے سخت پیچش کی تکلیف میں مبتلا تھا، رات باغیچے کے بھوت کا شکار ہو گیا ——

اب یہ معمّا غور طلب ہے کہ دراصل بھوت کون تھا —— وہ یا میں؟



جناب ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن

بلند دروازہ

آپ اس سے پہلے قطب مینار کی کہانی پڑھ چکے ہیں، جسے ترکوں نے اپنی فتح کی یادگار میں دلّی میں بنوایا تھا۔ آئیے آج آپ کو اپنے دیس کے سب سے اُونچے دروازے "بلند دروازہ" کی سیر کرانے فتح پور سیکری لے چلیں۔ اس دروازے کو مغلیہ خاندان کے سب سے بڑے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی ایک فتح کی یادگار میں بنوایا تھا۔

مغلوں کو اچھی اچھی عمارتیں بنوانے، باغات لگوانے اور شہر بسانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ آج بھی آگرہ، لاہور اور فتح پور سیکری میں ایسی ایسی عمارتیں موجود ہیں جن کو دیکھ کر ان کی ہمّت کی بلندی، دل کی کشادگی اور ذوق کی ستھرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سب سے مشہور مغل بادشاہ اکبر نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک کوئی ۴۹ سال ہندوستان پر حکومت کی۔ آگرہ شہر مغلیہ سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اکبر کے دربار میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل جیسے قابل منتظم، فیضی اور عرفی جیسے بڑے شاعر، راجہ مان سنگھ اور عبدالرحیم خانخاناں جیسے بہادر سپہ سالار، بیربل اور ملّا دوپیازہ جیسے ظریف اور حاضر جواب انسان اور تان سین جیسے گانے کے استاد موجود تھے۔ یہ سب نورتن کہلاتے تھے۔ اکبر اعظم کی سلطنت کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی

ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے اور بادشاہ کے اچھے انتظام کی وجہ سے چین کی بنسی بجاتے تھے۔

مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک چیز کی کمی تھی۔ اکبرِ اعظم کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی، بچّے پیدا ہوتے تھے اور مر جاتے تھے اور ہندوستان کا یہ عظیم حکمران ولی عہد نہ ہونے کی وجہ سے دن رات اداس رہتا تھا۔ کہتے ہیں ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا یہ اَن داتا اپنی اولاد کے زندہ رہنے کی دُعا کرانے کے لیے رشیوں منیوں اور بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا، مگر اس کے دل کی کلی کہیں نہ کھِل سکی۔ ایک دفعہ اکبر نے کسی سے ایک پہنچے ہوئے بزرگ شیخ سلیم چشتی کی کرامت کی بڑی تعریف سنی۔ شیخ سلیم چشتی آگرہ سے ۲۳ میل دور سیکری گاؤں کے قریب ایک پہاڑی پر رہتے تھے۔ اکبر ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور دل کی بات شیخ سے کہہ سنائی۔ شیخ سلیم چشتی نے اکبر کو تین بیٹوں کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد پتہ چلا کہ اکبر کی رانی جودھا بائی امید سے ہے۔ بادشاہ نے رانی کو شیخ کے گھر بھجوا دیا تاکہ جب بچّہ پیدا ہو تو وہ شیخ کی دُعا سے زندہ سلامت رہے۔ اور جب رانی نے ایک لڑکے کو جنم دیا تو اکبر نے اس کا نام شیخ سلیم کی عقیدت میں سلیم رکھ دیا۔ یہی سلیم تھا جو بعد میں جہاں گیر کے نام سے مشہور ہوا۔ اکبر پر شیخ سلیم چشتی کی کرامت کا ایسا گہرا اثر پڑا کہ اس نے سیکری کو راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں رانیوں اور بیگمات کے لیے محلات تعمیر ہونے لگے، دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کے نقشے بننے لگے، امیروں اور وزیروں کی حویلیاں زمین سے سر اُٹھانے لگیں، عام لوگوں کے لیے شفا خانے، کاروان سرائے، غسل خانے، باغات، حوض اور باولیوں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ بادشاہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اولاد زندہ رہنے کی خوشی میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے اور شیخ سلیم چشتی کی خاطر ایک عالیشان جامع مسجد بنانے کا حکم دے دیا۔ مگر یہ سب کام ختم بھی نہ ہو پایا تھا کہ شیخ سلیم چشتی کا ۱۵۷۱ء میں انتقال ہوگیا۔ اکبر نے ان کا مقبرہ بھی جامع مسجد

کے صحن میں ایک طرف بنوایا۔ ابھی اس
نئی راجدھانی اور اس کی عمارتوں کا
کام چل ہی رہا تھا کہ اکبر کو گجرات
فتح ہونے کی خوشخبری ملی چنانچہ بادشاہ
نے اس نئی بستی کا نام محض سیکری کی بجائے
فتح پور سیکری رکھ دیا اور اس فتح کی یاد
میں اس نے بلند دروازہ بھی بنوانے کا
حکم دیا۔

بلند دروازہ کے بارے میں بتانے سے
پہلے کچھ باتیں فتح پور سیکری کی جامع مسجد
کے بارے میں جان لینا ضروری ہے، اس
لیے کہ بلند دروازہ اصل میں جامع مسجد
میں داخل ہونے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس
مسجد کا صحن بہت وسیع ہے۔ اس کی لمبائی
۵۴۲ فٹ اور چوڑائی ۴۳۸ فٹ ہے
اور اس میں ایک وقت میں دس ہزار تک
آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ خوب صورتی کے
لحاظ سے ہندوستان کی کم مسجدیں اس کا
مقابلہ کر سکتی ہیں اس کی دیواروں اور
چھت پر پچی کاری اور نقاشی کا بہت دلکش
کام کیا گیا ہے بالخصوص اِس مسجد کی اُس
محراب کا کام جہاں امام کھڑا ہوتا ہے بس
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مسجد میں جا بجا
ہندو اور مسلم فن تعمیر کو بڑی خوبی سے ایک
دوسرے میں سمویا گیا ہے۔ مسجد کے صحن
کے ایک حصّے میں شیخ سلیم چشتی کا مزار ہے
جو پورا کا پورا سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور
جس کی جالیوں کا کام خاص طور پر قابل
تعریف ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے دو
دروازے ہیں ایک کا نام بادشاہی دروازہ
ہے جس کے ذریعے اکبر روزانہ شاہی محلات
سے مسجد میں داخل ہوتا تھا اور دوسرا
دکھن کے رُخ پر وہ عظیم الشان دروازہ
ہے جسے بلند دروازہ کہتے ہیں۔

بلند دروازے کی اُونچائی سطح زمین
سے چوٹی تک ۱۷۶ فٹ ہے۔ چونکہ جامع
مسجد اور بلند دروازہ ایک پہاڑی پر واقع
ہے اس لیے زمین سے بلند دروازہ تک
پہنچنے کے لیے بہت سی سیڑھیاں چڑھنی
پڑتی ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ سُرخ کا
بنا ہوا یہ دروازہ ہمارے دیس میں تو
خیر سب سے اُونچا ہے ہی لیکن اس کا شمار

دُنیا کے چند خوب صورت اور اونچے دروازوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اُونچائی ۱۳۴ فٹ ہے، مگر اس کی اُونچائی ہی اس کے امتیاز کا سبب نہیں ہے بلکہ فن تعمیر کے ماہروں کا کہنا ہے کہ یہ دروازہ صحیح بناوٹ اور خوب صورت تناسب کے لحاظ سے مغل فن تعمیر کا ایک بہترین اور کامیاب نمونہ ہے۔ بلند دروازہ فتح پور سیکری کے محلات اور وہاں کی عظیم الشان جامع مسجد کے شایان شان ہے۔

آئیے اب بلند دروازہ کو ذرا اور قریب سے دیکھیں۔ اس کی بیرونی ساخت تین ضلعوں کی ہے۔ آس پاس کے بازوؤں میں اوپر نیچے دو دو محرابیں ہیں اور ان کے درمیان اصل محراب واقع ہے جو ۸۶ فٹ اونچی اور ۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اس محراب کو ایک مستطیل میں بنایا گیا ہے اور اس کے دونوں کونوں پر کنول کے دو پھول بنا کر اس کی خوب صورتی کو اور نکھار دیا گیا ہے۔ اب ذرا اس محراب کی بناوٹ اور اندرونی حصے پر نظر ڈالیے اس کی شکل مثمن پہلی شکل کی سی ہے اس میں تین اور دروازے ہیں۔ بیچ والے دروازے کا نام نعل دروازہ ہے اس لیے کہ شیشم کے بھاری بھرکم کواڑوں پر جا بجا گھوڑے کے نعل لگے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ نعل ان لوگوں نے لگوائے تھے جن کے جانور شیخ سلیم چشتی کی دعا سے شفا پا گئے تھے۔ نعل دروازے سے گزرنے کے بعد آپ جامع مسجد کے صحن میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں سے آپ بلند دروازے کا پیچھے والا حصّہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک کہ آرائش اور کتبوں کا تعلق ہے وہ بلند دروازے کے صرف سامنے والے حصّے پر ہیں پیچھے کا حصّہ نسبتاً اُونچا بھی کم ہے اور کام بھی اس پر سیدھا سادا سا ہے۔

بلند دروازے کے اُوپر چڑھنے کے لیے پوربی اور پچھمی جانب سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ دروازے کے اوپر چھوٹی چھوٹی برجیاں بنا کر ان سے آرائش کا کام لیا گیا ہے ان چھوٹی برجیوں کے بالکل پیچھے نسبتاً بڑی برجیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ ایسی لگتی ہیں گویا کہ یہ چھوٹی برجیوں کی حفاظت

کر رہی ہوں ۔ بلند دروازے کی چوٹی سے جامع مسجد ، شیخ سلیم چشتی کا مزار، رانیوں اور بیگمات کے محلات ، امیروں وزیروں کی حویلیاں ۔ غرض کہ اکبر اعظم کا نمونے کا یہ شہر فتح پور سیکری خوب نظر آتا ہے ۔ یہاں سے آگرہ جانے والی سڑک اور ریل کی پٹڑی بھی بخوبی دکھائی دیتی ہے اور اگر مطلع صاف ہو تو بلند دروازے کی چوٹی پر سے ۲۴ میل دور آگرہ میں واقع تاج محل بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ بلند دروازہ محض بلند ہی نہیں بلکہ حسن اور تناسب کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں ہندوستان کے مائیہ ناز سپوت جلال الدین محمد اکبر کا کردار پوری طرح جھلکتا ہے ۔

کیا گیا ، اور ایک وفد صورتِ حال کی تحقیق کے لیے روانہ کیا گیا۔

اس وفد نے بعد تحقیقات کے سفارش کی کہ چڑیوں کو امتیازی رنگ عطا کیا جائے۔ وفد نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہنگامی صورتِ حال کا اعلان کرنا ضروری ہو جائے گا۔ ایسی تدبیریں اختیار کرنی ہوں گی جو کسی مہذب اور آزاد حکومت کے نزدیک مکروہ ہیں۔ یہ سفارش منظور ہو گئی اور اس کام کو عمل میں لانے کے لیے ایک کمیشن بنا دیا گیا۔

کمیشن وقتِ مقررہ پر زمین پر آیا۔ اور چڑیوں کا عام اجلاس طلب کیا گیا۔ تاکہ انھیں امتیازی رنگ عطا کیا جائے۔ ظالم اور شکاری پرندوں کو ظاہر ہے کہ یہ تجویز ناپسند تھی ، مگر اس وقت خدائی حکومت سے سرتابی کی جراءت نہ کر سکتے تھے۔

چنانچہ اجلاس ہوا۔ کمیشن نے ایک ایک کا بیان سنا۔ اور پرندوں کو رنگ دینے شروع کیے۔ کئی ہفتوں کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ کمیشن کا کام مکمل ہو گیا اور اس نے اپنی واپسی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ کمیشن اٹھنے ہی کو تھا اور پرندے آپس میں بات چیت کر رہے تھے کہ اچانک شور و غل سے رخنہ پڑ گیا۔ سب کو چپ کرایا گیا ، اور کمیشن کے صدر نے شور و غل کی وجہ دریافت کی۔ یہ شور و غل سارس کے اتنی دیر میں آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے مقررہ وقت کے لحاظ سے ایک رات پہلے ہی آجانا چاہیے تھا۔ اس طرح دیر میں آنے سے خدائی قانون کی تحقیر ہوتی تھی اس لیے وجہ پوچھی گئی۔ سارس نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ وہ دیر تک سوتا رہا تھا۔ وہ صدر سے آنکھ ملا کر بات بھی نہ کرتا تھا۔ اس پر صدر نے سختی سے حکم دیا کہ سیدھی طرح صاف صاف حقیقتِ حال بیان کرے۔ اس پر سارس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس نے اقبال کر لیا

کہ وہ پَر کلیاں چُرا رہا تھا۔ اس پر ہال میں سکوت طاری ہوگیا۔ صدر کا چہرہ غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

"چُرا رہے تھے؟" صدر نے گرجتے ہوئے کہا "تم جانتے نہیں کہ چوری جُرم ہے۔ خدا کی حکومت نے تم کو ایسے اعضا فراہم کیے ہیں کہ تم اپنی غذا آپ فراہم کر سکتے ہو۔"

سارس شرم کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔

"میں تمہیں کوئی رنگ نہیں دوں گا" صدر نے کہا۔ "تم سفید ہی رہوگے، تاکہ ہر وقت سب کی نظروں میں رہو اور چُرا نہ سکو۔"

وہ دن اور آج کا دن۔ سارس کے پَر سفید ہی ہیں۔ لیکن کیا اس نے چُرانا چھوڑ دیا؟

یہ بات پَر کلیوں سے پوچھو۔

مرزا سلمان

جمشید جی ٹاٹا

جمشید جی ٹاٹا ۳ مارچ ۱۸۳۹ء کو ریاست بڑودہ کے ایک مقام نساری میں ایک پارسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور آگے پڑھنے کے لیے بمبئی بھیج دیے گئے۔ یہاں یہ انفسٹن کالج میں انیس ۱۹ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور پھر اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے۔

سوچ بچار اور مطالعہ کی عادت ان میں شروع سے تھی ہمیشہ اسی دھن میں رہتے تھے کہ قوم اور ملک کے لیے کوئی کام کر جائیں آخر دوسری ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جمشید جی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی ملک کی ترقی کے لیے بھاری صنعتیں بہت ضروری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی اور ناگپور میں کپڑے کی ملیں کھولیں۔

ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں ایسی جگہ کی تلاش میں لگ گئے جہاں لوہے اور کوئلے کی فراہمی ایک ساتھ ہو سکے۔ آخر کار انھوں نے بہار میں "ساکشی" نام کی جگہ کو پسند کیا اور وہاں ہندوستان کا پہلا لوہے اور فولاد کا کارخانہ قائم کیا۔ اس کے لیے باہر کے ملکوں سے مشینیں اور ماہرین حاصل کیے خود دور دراز ملکوں کے دورے کیے، وہاں کے کارخانوں میں کام کے طریقوں کو دیکھا اور اپنے ملک کی ضرورت کے مطابق یہاں ان کو رائج کیا۔ جمشید پور میں یہی کارخانہ جو اب "ٹاٹا لوہے اور فولاد کے کارخانے"۔

نام سے دُنیا بھر میں مشہور ہے اور جس کا شمار دُنیا کے گنے چُنے بڑے کارخانوں میں ہوتا ہے۔

بمبئی اور پونا کے علاقے کو بجلی کی نعمت جمشید جی کی سوجھ بوجھ کی دین ہے۔ بمبئی کے قریب مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں پر اچھی خاصی بارش ہوتی ہے۔ مگر اس کا سب پانی یوں ہی بہہ جایا کرتا اس کا کوئی استعمال نہ تھا۔ جمشید جی ٹاٹا نے ایک انوکھی ترکیب سوچی۔ انھوں نے جگہ جگہ پہاڑیوں کے درمیان باندھ بنوا کر اس پانی کو پہاڑیوں کے اوپر ہی اکٹھا کر لیا اور پھر بڑے بڑے پائپوں کے ذریعے اس کو نیچے تک لے آئے۔ نتیجے مصنوعی آبشار تیار تھا۔ کھپولی مقام پر بجلی گھر بنایا گیا اور اس آبشار کو استعمال کر کے بمبئی کے لیے بجلی تیار کی جانے لگی۔

بعد میں ٹاٹا کمپنی نے اور کئی بجلی گھر اس علاقے میں بنوائے اور اب تو یہ سب مل کر پورے ہندوستان میں پیدا کی جانے والی بجلی کا ایک چوتھائی حصہ پیدا کرتے ہیں جو بمبئی، پونا اور اس کے آس پاس کے علاقے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ عام استعمال کے علاوہ اسی بجلی سے وہاں کے سیکڑوں کارخانے اور بجلی کی ریل گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔

جمشید جی ہمیشہ اس کوشش میں رہا کرتے تھے کہ سائنس کی ایجادات اور انکشافات کو صنعت میں استعمال کر کے اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دیں۔ اسی خیال سے انھوں نے بنگلور میں سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم اور ریسرچ کے لیے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے سے اب تک ہزاروں انجینئر اور سائنس داں نکل چکے ہیں جنھوں نے ملک کی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔

۱۸۹۲ء سے جمشید جی نے وظائف مقرر کئے جو دوسرے ممالک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔ اب تک تقریباً پانچ سو ہونہار طلباء ان وظیفوں سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

بمبئی کا مشہور و معروف تاج محل ہوٹل بھی جمشید جی کا بنوایا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ بننے کے پندرہ برس بعد تک اس سے کوئی منافع نہیں ہوا، ساری آمدنی اس کو بہتر سے بہتر

بنانے میں خرچ کر دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کیا ایشیا کے بہترین ہوٹلوں میں اس کا شمار ہے۔ دور دور سے سیّاح اور بڑے بڑے لوگ آکر اس میں ٹھہرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔

۱۹ رمئی ۱۹۰۴ء کو جرمنی میں ان کا انتقال ہوا۔ مگر اب بھی ہم ان کا نام عزت واحترام سے لیتے ہیں۔ وہ عام سرمایہ داروں سے بہت مختلف تھے۔ ان کی دولت کا ۸۵٪ حصّہ مختلف قومی وملکی اوقاف کے نام تھا۔ ان کی کامیابی کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے مزدوروں اور ملازموں پر خاص توجہ برتتے تھے۔ ان کے آرام وآسائش کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں زمینداری اور جاگیرداری کا دور دورہ تھا۔ بے گار لینا اور ظلم وستم کرنا سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لیے کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ مگر جمشید جی اپنی ملوں کے منافعے میں اپنے مزدوروں اور ملازموں کا حصّہ لگاتے تھے، ان کے رہنے کے لیے گھروں، کھیل کے میدانوں لائبریریوں، اسپتالوں اور ان کے بچوں کے لیے اسکولوں کا انتظام کرواتے تھے۔

ہندوستان کے موجودہ دور میں مزدور اور پیشہ ور طبقے کے ساتھ اتنے عمدہ برتاؤ کی یہ پہلی مثال تھی۔ ان کے دل میں مزدوروں کے لیے کتنی ہمدردی تھی اور ان کے آرام کا کتنا خیال تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہر مذہب و ملّت کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ ان ہدایات سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو جمشید پور کی بستی بساتے وقت دی تھیں۔

"اس کا ضرور خیال رہے کہ چوڑی چوڑی سڑکیں بنائی جائیں جن کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگائے جائیں۔ پارکوں اور باغوں کے لیے کافی جگہ ضرور چھوڑنی چاہیے۔ ہاکی اور فٹ بال کے میدانوں کے لیے بڑے رقبے مخصوص کر دینا۔۔۔ ہندوؤں کے مندر، مسلمانوں کی مسجدوں اور عیسائیوں کے گرجوں کے لیے جگہیں ضرور مخصوص کر دینا۔"

وہ سچ مچ نئے ہندوستان کے عظیم معماروں میں سے ایک ہیں۔ ۳رمارچ کو ان کا ۱۲۵واں جنم دن بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ ہماری حکومت نے ان کی یاد میں ۷رجنوری کو ڈاکخانے کا ایک ٹکٹ بھی جاری کیا ہے۔ اور یوں تو ہندوستان انھیں اس وقت تک یاد رکھے گا جب تک کہ ان کی دی ہوئی صنعتیں اس کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیتی رہیں گی۔



شہنشاہ اکبر کے زمانے میں شیر کے شکار کے انوکھے طریقے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ پہلے مضبوط سلاخوں کا اتنا بڑا پنجرا بناتے تھے کہ اگر شیر پنجرے میں گھسے تو آسانی سے اندر پہنچ جائے۔

پنجرے کا دروازہ ذرا سے اشارے میں بند ہو جاتا تھا اور جب تک کوئی دوسرا نہ کھولے کھل نہ سکتا تھا۔ پھر اس پنجرے میں ایک بکرا باندھتے تھے اور جس جنگل میں شیر کا پتہ چلتا تھا پنجرا رکھ کر دروازہ کھول دیتے تھے، شیر پنجرے میں گھستا تو دروازہ فوراً بند ہو جاتا اور شکاری یا تو شیر کو مار دیتے یا اُسے پکڑ لیتے۔

دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا، جس سے شیر کو لاٹھیوں سے مار لیتے تھے۔

بکرے کو ایسے راستے پر باندھ دیتے جس راستے پر شیر آتا جاتا تھا۔

بکرے کے آس پاس گھاس کے پولے

چُن کر رکھ دیتے اور ان پر بہت سی سریش ڈال دیتے۔ بکرا میں، میں کرتا تو شیر بکرے کی آواز سن کر چھلانگیں مارتا آجاتا۔ جوں ہی گھاس کے پولوں پر پاؤں رکھتا پنجوں پر سریش لپٹ جاتا۔ اس



شکاری طاقت ور جنگلی بھینسے کی پشت پر کھڑا ہو جاتا اور شیر کا سامنا کرتا۔ بھینسا شیر سے ٹکرا جاتا اور اپنے بڑے بڑے سینگوں پر شیر کو اُٹھا کر اُچھال دیتا اور پھینک دیتا۔ شیر پھر دوڑ کر آتا اور بھینسا دوبارہ

وقت شیر کا تماشا دیکھنے کے قابل ہوتا کبھی پاؤں پٹکتا کبھی منہ رگڑتا۔ جتنی کوشش کرتا سریش زیادہ چپکتا جاتا۔ شکاری جو اونچے درختوں پر لاٹھیاں لیے بیٹھے رہتے جب دیکھتے کہ شیر گھبرا گیا ہے تو اُتر کر اسے لاٹھیوں سے مار لیتے یا پھندے سے پکڑ کر باندھ لیتے۔

تیسرا طریقہ دونوں طریقوں سے زیادہ حیرت انگیز تھا، مگر بڑے بہادر اور تجربہ کار شکاری کا کام تھا، ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔

سینگوں پر اُٹھا کر پھینکتا۔ یہ خوفناک کھیل دیر تک ہوتا رہتا اور شکاری بھینسے کی ننگی پیٹھ پر کھڑا ہوا بھینسے کو اکساتا جاتا۔ یہاں تک کہ شیر کا کام تمام ہو جاتا۔

اس عجیب تماشے کا منظر بہت خوفناک اور حیرت انگیز ہوتا تھا۔

سوار کی دلیری بھینسے کی ننگی پیٹھ پر کھڑا رہنا اور شیر سے لڑانا!

شہنشاہ اکبر کی دلیری۔

ایک دفعہ بادشاہ کو خبر لگی کہ قصبہ باری

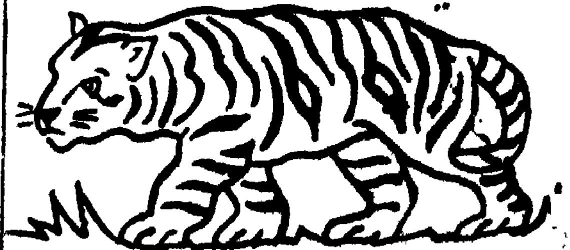
میں شیر آگیا ہے۔ حکم دیا کہ ہاتھی جس کا نام ناہر خاں ہے حاضر کیا جائے۔

بادشاہ ناہر خاں ہاتھی پر سوار ہو کر جس جنگل میں شیر تھا پہنچ گیا۔

شیر ڈکارتا ہوا نکلا اور مستک پر پنجہ جما کر ہاتھی کا سر جھکا دیا مگر بادشاہ ذرا بھی نہ ڈرا اور زبردست پہلوان کی طرح حملہ کرکے شیر کا کام تمام کر دیا۔

دوسری بار متھرا کے جنگل میں شیر کا ہانکا ہوا شجاعت خاں بڑا بہادر امیر تھا وہ آگے نکل گیا مگر سراسیمہ ہو کر اُلٹا پھرا۔ اکبر سینہ تانے کھڑا رہا۔ شیر سامنے آیا تو اکبر نے اُسے گرم نگاہ سے دیکھا، خدا کی قدرت کہ شیر اُلٹا پھرا اور اکبر نے تیر سے خاتمہ کر دیا[ا]۔

ا یہ سب باتیں ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھی ہیں۔



آبگینہ

بچوں کی شرافت، غیرت، سوجھ بوجھ اور صلاحیت کے بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز واقعات اُن کے استاد کی زبانی سنیے۔

جناب سید محمد صاحب ٹونکی آپ کے پرانے مضمون نگار ہیں اور لگ بھگ پچاس سال تک اُستادی کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ یہ کتاب ان ہی ٹونکی صاحب کے پچاس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بہت ہی سادہ، دلچسپ اور شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ بچوں اور بڑوں کے لیے یکساں دلچسپ اور مفید ہے۔

(زیر طبع)

بچّوں کی کوششیں

اپنے مدرسے کی دلچسپیاں

یہ ایک لمبی نظم ہے اس میں مدرسہ ابتدائی جامعہ کی ہر دلچسپی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس طالب علم کو جس شعبہ یا کام سے دلچسپی تھی اس کے متعلق شعر لکھا ہے (سید احمد علی آزاد)

ہے شانِ ابتدائی کیسی کیا خوب پڑھائی ہوتی ہے

دلچسپ پروجکٹ چلتے ہیں اس طرح پڑھائی ہوتی ہے
جب گھر سے جامعہ آتے ہیں دل بیٹھا بیٹھا رہتا ہے
نشاط بیگم عمر ۱۱ سال

اُستاد کی تسکیں ہوتی ہے ہنس ہنس کے پڑھائی ہوتی ہے
جب گھنٹے خالی ہوتے ہیں اُستاد نہیں کوئی ہوتا
محمد سلیم عمر ۱۲ سال

درجہ میں باتیں ہوتی ہیں اور خوب لڑائی ہوتی ہے
جب کام نہیں کوئی ہوتا درجے میں باتیں ہوتی ہیں
نشاط بیگم

ایک شور سا برپا ہوتا ہے ڈسکوں پہ لڑائی ہوتی ہے
جب کام نہیں ہم کرتے ہیں اُستاد ہمیں سمجھاتا ہے
محمد عقیل عمر ۱۱ سال

ہم غور سے باتیں سُنتے ہیں پھر دل کی صفائی ہوتی ہے	عفت زہرہ زیدی
جب کام غلط ہو جاتا ہے افسوس ہمیں بھی ہوتا ہے	عمر ۱۳ سال
اُستاد ہدایت دیتا ہے پھر راہ نُمائی ہوتی ہے	"
ہم مولی گاجر بوتے ہیں اور اُن کی خدمت کرتے ہیں	
ہم اچھی کھاد بھی دیتے ہیں اور خوب سنچائی ہوتی ہے	محمد عارف
کیاری کی مینڈ بناتے ہیں اور خوب صفائی کرتے ہیں	عمر ۱۲ سال
ہم کھاد اور پانی دیتے ہیں اور خوب گُڈائی ہوتی ہے	زاہد حسین
پکنک کے لیے بھی جاتے ہیں اور حلوہ پوری کھاتے ہیں	عمر ۱۲ سال
ہم "گرم پکوڑی کھائیں گے" ہر دِل میں سمائی ہوتی ہے	افتخار احمد
ہم طلبا سیر کو جاتے ہیں واں اچھے گانے گاتے ہیں	عمر ۱۱ سال
ہم شام کو تھک کر آتے ہیں پھر خوب سُلائی ہوتی ہے	"
ہم سیر سفر کو جاتے ہیں شہرت اور نام بھی پاتے ہیں	
جامعہ کی عزت بڑھتی ہے اور خوب بڑائی ہوتی ہے	عامرہ خاتون
بورڈنگ میں خوش خوش رہتے ہیں اور کام بہت ساتے ہیں	عمر ۱۲ سال
جھاڑو بھی ہم دے لیتے ہیں، کمروں کی صفائی ہوتی ہے	محمد اقبال آگرہ
بورڈنگ کی صفائی کرتے ہیں اور دل سے کام میں لگتے ہیں	عمر ۱۱ سال
ہم مل کر اس میں رہتے ہیں راتوں کو پڑھائی ہوتی ہے	ریاض احمد
ہم صبح کو ورزش کرتے ہیں اور شام کو کھیل میں جاتے ہیں	عمر ۱۲ سال
گر چوٹ ہمیں لگ جاتی ہے بورک کی سِکائی ہوتی ہے	خورشید احمد
اسپورٹس ہمارے ہوتے ہیں ہر آئیٹم اس کا ہوتا ہے	عمر ۱۱ سال
انعام ہر ایک کو ملتا ہے ہر ایک کی بھلائی ہوتی ہے	"

نقصان کوئی کر دیتے ہیں جرمانے ہم پر ہوتے ہیں
پھر گھر پر پرچہ جاتا ہے اور خوب پٹائی ہوتی ہے
محمد ن
عمر ۱۲

ہر سال الکشن ہوتا ہے سب بچے حصہ لیتے ہیں
دلچسپ مشاغل ہوتے ہیں اس طرح پڑھائی ہوتی ہے
عامرہ
عمر

بچوں کا الکشن ہوتا ہے تقریریں سب کی ہوتی ہیں
جو کر بن بن کر آتے ہیں اور ان پہ ہنسائی ہوتی ہے
ناظم
عمر

بچوں کا الکشن آتا ہے نعروں کی گونجیں اٹھتی ہیں
ہر صدر کی کوشش ہوتی ہے ہر دل میں سمائی ہوتی ہے
"

ہم اپنے وزرا چنتے ہیں، بچوں کی حکومت بنتی ہے
بچوں کے جلسے ہوتے ہیں، بچوں کی صدارت ہوتی ہے
اقبا

آتا ہے زمانہ میلے کا اور کام بہت سا ہوتا ہے
جب کام نہیں ہم کرتے ہیں کانوں کی کھنچائی ہوتی ہے
نصیر
عمر

راتوں کو جاگتے رہتے ہیں اور چائے بہت سی پیتے ہیں
پھر چارٹس بہت سے بنتے ہیں ان پہ بھی لکھائی ہوتی ہے

ہر بچہ کام پہ لگتا ہے میلے میں رونق ہوتی ہے
ہر روز ڈرامہ ہوتا ہے پھر خوب کھنچائی ہوتی ہے
عام

اِک دن کا مدرسہ ہوتا ہے ہر بچہ کام پہ لگتا ہے
استاد ہمیں میں بنتے ہیں ایسے بھی پڑھائی ہوتی ہے
اقبا

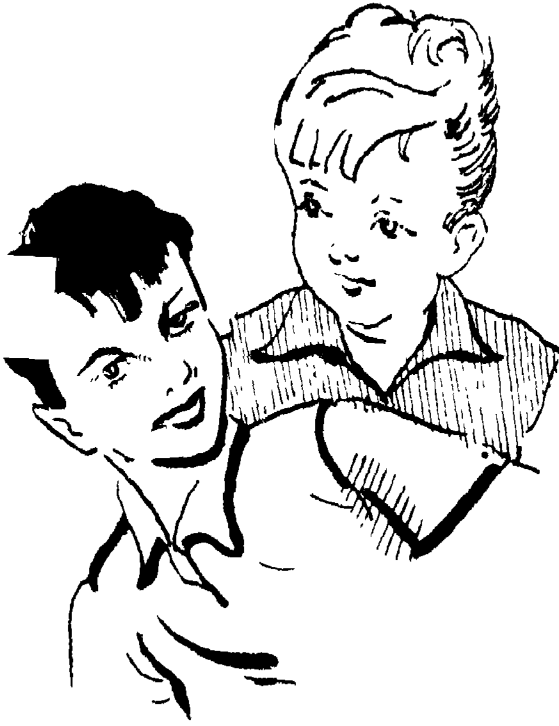
جب سال کا آخر ہوتا ہے پرچوں کا خوف بھی ہوتا ہے
ہم ڈٹ کر محنت کرتے ہیں، دن رات پڑھائی ہوتی ہے

(نوٹ) یہ نظم ۱۹۶۱ء۔۱۹۶۲ء کے تعلیمی سال کے عرصے میں چھٹی جماعت کے طلباء نے لکھی تھی



کیسی عجیب و غریب دھاریاں پڑی ہیں!!

جناب اعجاز اختر، اندور



ہم کو....

اُجڑے اُجڑے باغیچوں کو پھولوں سے مہکانا ہے

سورج بن کر جگ مگ کرنا، دیش کو پھر چمکانا ہے

دیش سے اندھیارے کو مٹا کر اُجیالا پھیلانا ہے

ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشوں کو اپنانا ہے

بھارت ماں کی آنکھ کے تارے، راج دُلارے ہم ہوں گے

شعلہ ہم دشمن کے لیے، بھارت کے لیے شبنم ہوں گے

ہم کو مل کر دیش کا اپنے اونچا نام اُٹھانا ہے

ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشوں کو اپنانا ہے

دنیا کو برباد کرے اُس جنگ سے نفرت کرتے ہیں
ہم بچے امن کے قائل ہیں، ہم سب سے اُلفت کرتے ہیں
سب کو مل کر اس دنیا سے جنگ کا بیج مٹانا ہے
ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشوں کو اپنانا ہے

اپنے ملک کی رکشا کرنا پہلا فرض ہمارا ہے
"آؤ سرحد پر آؤ" یہ دھرتی نے للکارا ہے
دیش کی خاطر ہم کو اپنی جاں کی بلی[1] چڑھانا ہے
ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشوں کو اپنانا ہے

ہم میں ہی ٹیپو ارجن ہیں ہم میں ہی نہرو گاندھی
مل کے ہٹا دیں اس دُنیا سے جنگ اور نفرت کی آندھی
ظلم اور جنگ و نفرت کی اس آندھی سے ٹکرانا ہے
ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشوں کو اپنانا ہے

امن و محبت کے پیکر ہم ہیں مستقبل کے رہبر
سب کو راہ دکھائیں گے پیغام محبت ہم دے کر
جو دکھلائی گاندھی نے وہ راہ ہمیں دکھلانا ہے
ہم کو نہرو گاندھی کے اُپدیشو ں کو اپنانا ہے

---

[1] قربانی

جادو کا پٹارا

اینڈرسن
ترجمہ
مشیر فاطمہ صاحبہ



کھٹ پٹ۔ کھٹ پٹ۔

گاؤں کی سڑک پر ایک سپاہی آرہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر ایک تھیلا تھا کمر میں ایک تلوار تھی شاید وہ لڑائی سے واپس آرہا تھا۔ راستے میں اس کو ایک چڑیل ملی۔ یہ بہت بدصورت تھی۔ اس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے۔ نیچے کا ہونٹ سینے تک لٹک رہا تھا۔

چڑیل نے سپاہی کو پکارا، "سپاہی بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا تھیلا کتنا اچھا ہے، تمہاری تلوار کتنی خوبصورت ہے۔ تم تو سچ مچ سپاہی معلوم ہوتے ہو۔ آؤ میں تم کو بہت سا روپیہ حاصل کرنے کا طریقہ بتاؤں۔"

سپاہی نے کہا: "شکریہ بڑی بی۔ کہاں ہے روپیہ اور کیسے مل سکتا ہے؟"

بڑھیا نے ایک قریب کے پیڑ کی طرف اشارہ کیا "وہ دیکھو، وہ جو بڑا درخت ہے نا۔ تم اس کے اوپر چڑھ جاؤ۔ اوپر سرے پر ایک سوراخ ہے۔ اس کے اندر اتر جانا۔ میں تمہاری کمر باندھے دیتی ہوں تاکہ جب تم آواز دو تو میں تم کو اوپر کھینچ لوں۔"

"مگر میں درخت کے اندر جا کر کروں گا کیا؟" سپاہی نے پوچھا۔

"وہاں سے خوب بہت سے روپیہ لانا۔" چڑیل نے جواب دیا۔ دیکھو جب تم بالکل نیچے پہنچ جاؤ گے تو تم کو وہاں ایک راستہ دکھائی دے گا۔ وہاں بہت سے لیمپ جل رہے ہوں گے۔ تم کو اندر جانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد تم کو تین دروازے نظر آئیں گے تم ان کو آسانی سے کھول سکتے ہو ان میں جالی لگی ہوگی۔ جب تم پہلے کمرے میں داخل ہوگے تو تم کو کمرے کے بیچوں بیچ زمین پر ایک بکس دکھائی دے گا، اس پر ایک کتا بیٹھا ہوگا اس کی آنکھیں پلیٹ کے برابر ہیں مگر تم اس سے ڈرنا نہیں، میں تم کو اپنا نیلا دوپٹہ دیتی ہوں تم اس کو زمین پر بچھا دینا اور جلدی سے آگے بڑھ کر اس کتے کو میرے دوپٹے پر بٹھا دینا۔ بکس کا ڈھکن کھول کر تم جتنے پیسے چاہو نکال لینا، لیکن یہ سب تانبے کے پیسے ہوں گے۔ اگر تم کو چاندی کے روپوں کی ضرورت ہو تو تم دوسرے کمرے میں جانا وہاں جو کتا بیٹھا ہے اس کی آنکھیں طباق کے برابر ہیں۔ مگر تم اس کی پرواہ نہ کرنا اور تم اس کو میرے دوپٹے پر بیٹھا دینا اور بکس سے جتنے روپے چاہو نکال لینا۔ لیکن اگر تم کو سونے کی اشرفیوں کی ضرورت ہو تو تم تیسرے کمرے میں جانا وہاں جو کُتا بیٹھا ہے اس کی آنکھیں گاڑی کے پہیے کے برابر ہوں گی مگر تم اس کی بھی پرواہ نہ کرنا اسے میرے دوپٹے پر بٹھا کر جلدی سے جتنی اشرفیاں چاہو نکال لینا۔"

سپاہی نے کہا: "یہ سب تو ٹھیک ہے مگر چڑیل بی یہ تو بتاؤ کہ میں تم کو کیا دوں؟ ظاہر ہے تم بھی اپنا حصّہ مانگو گی۔"

چڑیل نے جواب دیا: "نہیں مجھے تمہارا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ بس تم میرا ایک ٹین کا ڈبّہ لیتے آنا! میری دادی جب وہاں گئی تھیں تو یہ ڈبّہ وہیں اندر بھول آئی تھیں۔"

سپاہی نے کہا: "بہت اچھا۔ لاؤ رسّی کہاں ہے اسے میں اپنی کمر میں باندھ لوں۔"

چڑیل نے کہا "یہ رہی رسّی اور یہ لو میرا نیلا دوپٹہ۔"

سپاہی درخت کے اوپر چڑھ گیا اور وہاں سے سوراخ کے اندر اُتر کر درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ وہاں اس کو وہی راستہ نظر آیا جو چڑیل

نے بتایا تھا۔ راستے میں بہت سے لیمپ جل رہے
تھے۔ آگے بڑھ کر اس نے پہلا دروازہ کھولا۔
اوہ، وہاں وہی کتا بیٹھا تھا۔ بڑی
بڑی پلیٹ کے برابر آنکھیں۔ سپاہی نے کہا تم
تو بہت اچھے معلوم ہوتے ہو۔ اور اس نے
کتے کو چڑیل کے دوپٹے پر رکھ دیا۔ اور اس
نے بکس میں سے پیسے نکال کر اپنی جیب میں بھر
لیے اور بکس کو بند کر کے اس پر کتے کو بیٹھا
دیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ خدا رحم کرے!
وہاں بھی کتا بیٹھا تھا جس کی آنکھیں تھالی کے
برابر تھیں۔ "تم میری طرف مت گھورو اس سے
میری آنکھوں پر زور پڑتا ہے۔" سپاہی نے کہا۔
پھر اس نے کتے کو چڑیل کے دوپٹے پر بٹھا
دیا اور اس میں اس نے اتنے بہت سے چاندی
کے روپے دیکھے کہ اس کی جیب میں جتنے تانبے
کے پیسے تھے سب پھینک دیے اور اس کے
بدلے میں چاندی کے روپوں سے اپنی جیب بھر
لی۔ اور پھر وہ تیسرے کمرے میں گیا۔ یہاں کا
کتا تو بہت ہی خوفناک تھا۔ گاڑی کے پہیے کے
برابر اس کی آنکھیں تھیں اور پہیے کی طرح اس
کے سر کے چاروں طرف چکر کھا رہی تھیں۔

"آداب عرض ہے!" سپاہی نے کہا او
سے اپنی ٹوپی چھوئی کیونکہ زندگی میں اس
کبھی ایسا کتا نہیں دیکھا تھا ذرا دیر دیکھ
بعد اس نے اپنے دل میں کہا بس بہت ہ
آگے بڑھ کر اس نے کتے کو اٹھا کر زمین پ
اور بکس کو کھولا، ارے! اب تو اس کی آ
کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ اس میں بے ح
سونا تھا۔ اتنا کہ اس سے وہ پورا شہر خ
سکتا تھا۔ تمام حلوائیوں کی دوکانوں ـــ
مٹھائی خرید سکتا تھا۔ دنیا بھر کی کھلو
کی دوکانیں خرید سکتا تھا۔ یقین جانو ا
بکس میں بے حساب اشرفیاں تھیں۔
بس سپاہی میاں نے جلدی سے ا
جیب سے سارے چاندی کے روپے نکال
اور اپنی جیب، اپنا تھیلا اور تمام چیز
اشرفیوں سے بھر لیں۔ یہاں تک کہ ٹوپی ا
جوتے میں بھی اتنی اشرفیاں بھر لیں کہ وہ مش
ہی سے چل پاتا تھا۔ جب اس نے اشرفیا
لے لیں تو کتے کو بکس پر بیٹھا دیا، دروازہ
کیا اور پیڑ کے تنے کے پاس جا کر چلایا۔ "ا
چڑیل اماں مجھے اوپر کھینچ لو۔" چڑیل نے ک

کر پوچھا "اور تم نے میرا ٹین کا ڈبّہ لے لیا؟"
سپاہی نے کہا "ارے وہ تو میں بالکل بھول گیا۔ اچھا ابھی لاتا ہوں"۔ وہ دوبارہ اندر گیا اور اسے لے آیا۔ چڑیل نے اس کو اوپر کھینچ لیا۔ سپاہی بخیریت سڑک پر اُتر گیا اس کی جیب، تھیلا، ٹوپی اور جوتے سب اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"تم اس ٹین کے ڈبّے کا کیا کرو گی؟" سپاہی نے چڑیل سے پوچھا۔

"تم کو اس سے کیا مطلب؟" چڑیل نے جواب دیا۔ "تم کو تمھارے روپے مل گئے مجھ کو میرا ٹین کا ڈبّہ دے دو" سپاہی نے کہا فضول بکواس نہ کرو مجھ کو فوراً بتاؤ تم اس ڈبّے کا کیا کرو گی نہیں تو میں اپنی تلوار سے ابھی تمہارا سر کاٹ دوں گا۔

"نہیں" چڑیل نے کہا۔

سپاہی نے فوراً تلوار ماری اور چڑیل کی گردن الگ ہوگئی۔ وہ زمین پر گر پڑی۔

سپاہی نے ساری اشرفیاں چڑیل کے پٹے میں باندھ لیں اور ٹین کا ڈبّہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور سیدھا شہر کی طرف چل پڑا۔

یہ شہر بہت اچھا تھا۔ وہ ایک بہت اچھی سرائے میں پہنچا۔ وہاں کا سب سے اچھا کمرہ کرائے پر لیا اور خوب اچھے اچھے کھانے منگوائے۔ کیونکہ اس کے پاس اب بہت سا روپیہ تھا۔ جس نوکر نے اس کے جوتے صاف کئے تو اس نے سوچا یہ آدمی تو بہت امیر ہے مگر اس کے جوتے بہت خراب ہیں۔

دوسرے دن سپاہی شہر میں گھومنے گیا اور اپنے لیے خوب اچھے اچھے جوتے اور کپڑے خریدے اور اب وہ بہت فیشن ایبل اور امیر آدمی ہو گیا۔ شہر میں خوب گھومتا۔ لوگوں نے اس کو شہر کے بارے میں بتایا، اپنے بادشاہ کے بارے میں بتایا اور بتایا کہ اس کی شہزادی بہت خوب صورت ہے۔ سپاہی نے پوچھا اس کو کہاں سے دیکھا جا سکتا ہے؟

(باقی آئندہ)

پہیلیوں کا جواب:۔

۱۔ بجلی کی استری۔ ۲۔ ٹیلی فون
۳۔ گراموفون ریکارڈ ۴۔ دونوں آنکھیں



(پیام تعلیم میں اب تک "بچوں کی کوششیں" کے عنوان سے، آپ کے مضمون اور نظمیں وغیرہ چھپتی رہتی ہیں۔ شاید اس پرچے میں بھی آپ کو کہیں نظر آجائیں۔ پر آج تو ہم ایک نئی بات کر رہے ہیں۔ "بڑوں کی کوششیں" چھاپ رہے ہیں۔ یہ بڑے وہ ہیں جنھوں نے ابھی ابھی تھوڑے دن ہوئے اردو زبان سیکھی اور دیکھتے دیکھتے انھیں پڑھنے ہی کا نہیں کچھ لکھنے کا ڈھنگ بھی آگیا۔

اس طرح کے چار مضمون ہمارے پاس آئے ہیں۔ دو محترم پروفیسر محمد مجیب کی معرفت اور دو جناب عبدالغفار مدہولی استاد ٹیچرس کالج جامعہ کی معرفت۔ یہ لڑکیاں مدہولی کی شاگرد ہیں۔ ان میں سے دو نیچے درج کیے جا رہے ہیں۔ دو اگلے پرچے میں چھپیں گے۔ ۔ایڈیٹر)

سکیٹرا

اُف ـــ ہائے اللہ۔ کتنی گرمی ہے۔ آسمان
سے آگ برس رہی ہے، زمین ہے کہ تپ رہی
ہے۔ کیا انسان، کیا حیوان، کیا چرند کیا پرند،
سب بدحواس ہیں۔ بس ایک سکیٹرا مہاراج
ہیں جو موج میں ہیں۔ خوشی سے گا رہے
گرمی جوں جوں بڑھتی ہے یہ اتنے ہی
میں آتے ہیں خوب گاتے ہیں خوب الاپتے
سکیٹرا مہاراج کو قدرت نے د
بڑی آنکھیں دی ہیں یہ دائیں بائیں
دیکھ سکتی ہیں۔ اسی لیے یہ جب کسی کو

آتے دیکھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں۔

آپ ان کا گانا سننا چاہیں تو چپ چاپ پیڑ کے نیچے بیٹھ جائیے اور ان کا گانا سن کر آپ بھی ترنگ میں آ جائیں تو خوب زور زور سے تالیاں بجا سکتے ہیں۔ خوب شور وغل مچا سکتے ہیں۔ سکیڑا مہاراج اسی طرح گاتے رہیں گے انھیں ذرا خبر نہ ہوگی۔

اور یہ بات کچھ یوں ہی نہیں کہی جا رہی ہے اس کا تجربہ کیا گیا ہے وہ بھی سنیے!

ایک نہ دو اکٹھا چھ آدمی وہاں جا بیٹھے جہاں سکیڑا مہاراج اکثر گاتے رہتے تھے۔ یہاں وہ اپنے ساتھ بہت سی بارود اور ایک توپ بھی لائے تھے۔ اور اس توپ میں بارود بھر کر توپ انھوں نے چلا دی۔ بڑی زور کا دھماکا ہوا۔ ایسا لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر نیچے آ گیا۔ پر ـــ پر ـــ سکیڑا مہاراج پر اس دھماکے کا ذرا جو اثر ہوا ہو۔ وہ تو اپنا مزے میں گاتے رہے۔ گاتے رہے۔

کوئی عجب نہیں جو سکیڑا مہاراج بہرے ہوں۔ کم سے کم اونچا ضرور سنتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گانا وہ خود ہی لطف اٹھانے کے لیے گاتے ہوں۔ اور اس طرح گا گا کر لطف اٹھانا انھوں نے زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہو۔

بملیش کوہلی
استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ

بلاؤ تو روح بھی آ جائے گی

آیے آج آپ کو ایک قصہ سناؤں۔ یہ ۱۹۶۴ء کی گرمی کی چھٹیوں میں میں اپنی ایک گجراتی سہیلی یامنی سے ملنے گئی۔ وہ ابھی تھوڑے دن ہوئے بمبئی سے لوٹی تھی۔ بڑی خوش مزاج اور ہنس مکھ لڑکی ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے یامنی ایک دم خوشی سے ناچ اٹھی اور بولی "سنو سنو! مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں انسان کی روح کو بلا سکتی ہوں۔ اور جانتی ہو، وہ روح سوالوں کا صحیح صحیح جواب بھی دیتی ہے!"

کالج میں جب ہم لوگ بی۔ اے۔ میں پڑھتے تھے تو اسی قسم کی بات سنی تھی۔ ہوسٹل کی لڑکیوں نے ایک روح کو بلایا تھا۔ کیسے بلایا تھا؟ کہاں بلوایا تھا؟ اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن جب یامنی کے منہ سے یہی بات

سُنی تو میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا تو یامنی اب دیر کیا ہے جلدی سے روح کو بُلا دو لیکن وہ تو آپ جانئے یامنی صاحبہ تھیں اپنے نام کی، بس اکڑے چلی جا رہی تھیں۔ خیر بڑی خوشامد کے بعد محترمہ راضی ہوئیں۔

یامنی نے سفید کاغذ کا ایک ورق لیا اور اس پر (A) سے لے کر (Z) تک انگریزی کے حرف لکھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک سنہ لکھے اس کے نیچے "یس" (YES) اور "نو" (NO) لکھ دیا اور اُن دونوں کے بیچ میں ایک ڈھکن اُلٹا رکھ کے بولیں، "دیکھو اس پر اپنی ایک انگلی رکھو۔ دوسری انگلی میں رکھوں گی۔ کم سے کم دو مختلف لوگوں کی دو انگلیاں ہونا ضروری ہیں۔

اس کے بعد یامنی نے کہا۔ "آر یو ہیر پلیز؟" (کیا آپ یہاں ہیں)۔ میں بڑی بیتابی سے انجام کا انتظار کر رہی تھی۔ دو تین بار وہی سوال دُہرانے کے بعد اُس ڈھکن میں حرکت ہوئی اور یامنی چلّا اٹھی "دیکھو، دیکھو روح آرہی ہے"۔ اللہ قسم! آپ یقین مانیے وہ ڈھکن کھسکتا کھسکتا "یس" پر آگیا پھر کیا تھا ہم اس روح سے اجازت لے کر سوالوں کی بوچھار کر دی اور جواب بھی برابر ملتے رہے۔ چائے کے وقت روح سے رُخصت مانگی اور میں اپنے گھر چلی آئی۔

گھر آکر اس انوکھی بات کا ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا آخر سارا قصہ سب کے سامنے بیان کر دیا۔ میں اس قدر خوش تھی جیسے میں نے کوئی بڑی، بہت بڑی چیز دریافت کر لی ہو۔ میں نے بنا کسی کے کہے لفظوں کا چارٹ تیار کیا اور ہو بہو ویسے ہی کر دکھایا جیسے یامنی نے کیا تھا۔

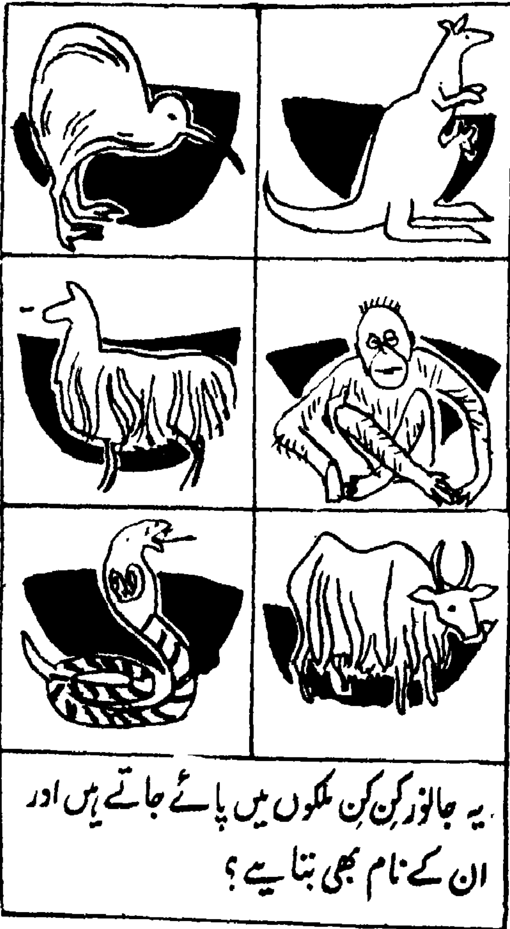
اُنھی دنوں میری نانی امّاں کا انتقال ہوا تھا میری امّاں انھیں یاد کر کر کے اکثر روتی رہتی تھیں۔ کہنے لگیں "اچھا بیٹی تم ذرا امّاں کی روح کو تو بلاؤ"۔

پر اب ایک مشکل آپڑی تھی نانی امّاں انگریزی نہیں جانتی تھیں چنانچہ اُن کے لیے مادری زبان کے حرف لکھے اور پھر کہا "امّاں کیا آپ یہاں ہیں" دو تین مرتبہ کہنے کے بعد وہی حرکت ہوئی۔ یعنی امّاں کی روح آگئی تھی۔

میں نے پہلا سوال کیا۔" اماں آپ کہاں رہتی ہیں ؟" جواب ملا " بہت اچھی جگہ ہے "
" آج آپ کو کیسا کھانا ملا تھا ؟"
" بہت سے پکوان تھے "
" اچھا اماں کیا آپ کا جی نہیں چاہتا ہم سے ملنے کو ؟"
" جی تو چاہتا ہے بیٹا۔ لیکن اب میں تم لوگوں کے پاس نہیں آسکتی "۔
اتنا سنتے ہی میری اماں رونے لگیں۔ سب کا موڈ خراب ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد روح کو باادب بھیج دیا گیا۔
غرض دو چار دن خوب تماشا رہا گھر میں۔ اور سنیے بڑے بھائی جان کسی کام سے دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے وہ گھر لوٹے تو انھیں بھی کرتب کر دکھایا گیا۔ لیکن ڈھکن کا ہلنا تھا کہ بھیا زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں بھونچکی سی ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی۔ مجھے چپت لگاتے ہوئے انھوں نے کہا۔ اری پگلی سائکالوجی پڑھ کر بھی نہیں سمجھی۔ اتنا سنتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ اور پھر ؟ پھر کیا مجھے بھی اپنی بے وقوفی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

آپ بھی آزمائیے۔ ڈھکن یقیناً ہلتا ہے ؟ کیوں ہلتا ہے ؟ کیسے ہلتا ہے ؟ شاید آپ بھی سمجھ جائیں۔

اوشا اروڑا
استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ



یہ جانور کن کن ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نام بھی بتائیے ؟



جمال : بتاؤ سب سے کنجوس کون ہے ؟
سلیم : ہمارے ماسٹر صاحب ۔ یہ ہمیں ہمیشہ کم نمبر دیتے ہیں ۔

چچا نے اپنی بھتیجی زدیا سے پوچھا "کیوں بیٹی، کیوں رو رہی ہو"۔
زدیا : (سسکیاں لیتے ہوئے) زوبی کو ہولی کی چھٹیاں ملیں مجھے نہیں ملیں۔
چچا : ارے! بھلا تمھیں کیوں نہیں ملیں۔
زدیا : میں ابھی اسکول جانے کے لایق نہیں ہوں۔

استاد: پچاس روپے کے پیسے بناؤ۔
شاگرد: (سہم کر) میں نہیں بنا سکتا ماسٹر صاحب
اُستاد: (تعجب سے) کیوں ؟
شاگرد: پولیس پکڑ لے گی سکّے بنانا جرم ہے

باپ : ارے ارے! تم مرغی پر گرم پانی کیوں ڈال رہے ہو ؟
سلیم : تاکہ اُبلا ہوا انڈا دے۔
محمد سلیم (ثانوی دوم) مدرسہ جامعہ

ایک بے وقوف اپنے دوست کے ساتھ سمندر کے کنارے گیا اور پانی میں چاند کا عکس دیکھ کر اپنے دوست سے پوچھا "یہ کیا ہے ؟"
"چاند ہے"۔ دوست نے جواب دیا۔
"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم اس وقت چاند سے بھی اوپر ہیں"۔ بے وقوف نے خوش ہو کر کہا۔
خلیق انجم اشرفی

جناب اقبال مہدی
(استاد کا مدرسہ)



پڑھنے لکھنے سے چھٹی مل جائے گی......!؟

ایسا ہوتا تو مشکل ہے۔ جس زمانے میں کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا۔ زبانی پڑھایا جاتا تھا، زبانی یاد کیا جاتا تھا۔ اور پتوں پر، مٹی، پتھر یا دھات کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا۔

پر آج کل تو بات ہی دوسری ہے اب تو کاغذ کے بغیر صرف پڑھنا لکھنا ہی مشکل نہیں ہو جائے گا زندگی کے اور بہت سے کاموں میں دشواری پیدا ہو جائے گی۔ دفتروں میں کیا ہوگا؟ کتب خانے کتنے رہ جائیں گے؟ روپیہ پیسہ کیسے رکھا جائے گا؟ ٹکٹ کس چیز کے بنائے جائیں گے؟ درخواستیں، رپورٹیں کس چیز پر لکھی جائیں گی؟ اخبار، رسالے، اشتہار، تصویریں کیسے چھپیں گی؟ علم اور ہنر کس طرح پھیلائے جا سکیں گے؟ ہماری پوری زندگی کا نظام ہی گڑبڑ ہو جائے گا۔

پھر بھی یہ سوال ہے عجیب سا۔

کاغذ بے جان چیز ہے۔ وہ نہ خوش ہو سکتا ہے نہ روٹھ سکتا ہے۔ اُس کے ناراض ہو جانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ناراض ہو کر وہ کیا کر سکتا ہے؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ کاغذ کے روٹھ جانے کا کوئی واقعہ آج تک تو ہوا نہیں۔

پر ان سب باتوں کے باوجود مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر کاغذ روٹھ جائے تو کیا ہو؟

میں نے جس سے بھی یہ بات کی اُس نے جواب دینے کے بجائے میرا مذاق ہی اڑایا کہیں

آپ بھی نہ ہنسنے لگیے گا۔ ان ہنسنے والوں کی ناسمجھی پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔

کچھ لوگ خوب صورت پھولوں کو توڑ کر مسل ڈالتے ہیں۔ پتّوں کو نوچ لیتے ہیں۔ شاخوں کو مروڑ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے پیڑ اور پودوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔

ایسے ہی لوگ حسین تتلیاں پکڑ کر جگنو پکڑ کر مار ڈالتے ہیں۔ چڑیوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ اُن کے گھونسلے برباد کر دیتے ہیں۔ انڈے پھوڑ ڈالتے ہیں۔ اُن کے بچّوں کو چُرا لیتے ہیں اور مار ڈالتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ننھے کیڑوں یا چڑیوں کو کسی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

جانوروں سے پیار کا برتاؤ کرو تو کس طرح محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر بھی بہت سے لوگ بیمار یا کمزور جانوروں کو کس کس طرح نہیں ستاتے۔ شاید ان کا بھی یہی خیال ہے کہ جانوروں کو خوشی یا تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

کچھ عرصے پہلے تک دُنیا میں انسانوں کو غلام بنا کر رکھنے اُن کو خریدنے اور بیچنے کا رواج تھا۔ آقا اپنے غلام کے ننھے بچّوں تک کو پیسے کی خاطر بیچ ڈالتا تھا کو ماں باپ سے اور ماں باپ کو بچے سے دیتا تھا۔ وہ لوگ بھی یہ ہی سمجھتے۔ "غلاموں" کو نہ تکلیف کا احساس ہوتا نہ خوشی کا۔

دیوانوں پر پتھر مارتے۔ اندھے لوگوں کو ستاتے کس نے نہیں دیکھا؟ کہ ستانے والے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی تکلیف پہنچا رہے ہیں؟ اُنھیں صرف اپنی خوشی کا احساس رہتا ہے۔

کمزوروں کی کمزوری اور غریبوں کی غریبی سے فائدہ اٹھانے والے بھی شاید یہ ہی ہیں کہ کمزوروں اور غریبوں کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

اس طرح کے ستانے والوں میں کوئی شخص بھی جان بوجھ کر شامل نہ ہونا چاہیے گا۔ ایسے لوگوں کی ناسمجھی پر ترس آتا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ تکلیف کا احساس تکلیف پہنچانے والے کو نہیں ہوتا، تکلیف پانے والے کو ہوتا ہے۔

شاید آپ اب بھی پوچھیں کہ کاغذ کیوں

روٹھ جائے گا؟

تو بھائی صاحب یہ محسوس کرنے کا معاملہ ہے۔ کسی بُرے طالب علم کی کاپی کتاب دیکھیے۔ جلد پھٹی ہوئی، ڈھیلی، میلی، کاغذ مڑے ہوئے، صفحے پھٹے ہوئے، گندے۔ مجھے تو ایسی کتاب روتی بسورتی، زخم اور درد سے کراہتی، اپنی گندگی سے گھبراتی ہوئی اور اپنی خاموش زبان سے اس طالب علم کی شکایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کے ہاتھوں میں قسمت نے اُسے پہنچا دیا ہے۔

جائز سزا تو ٹھیک سلوک ہے۔ بُرا ماننے یا روٹھنے کی بات نہیں۔ ہاں ناجائز سزا بُری لگتی ہے۔ یہ بد سلوکی ہے۔

صاف سُتھری کتاب، کاپی، یا وہ کاغذ جس پر احتیاط کے ساتھ خوش خط لکھا گیا ہے۔ یا سلیقے سے کوئی شکل بنائی گئی ہے۔ کھلے ہوئے پھول یا مسکراتے ہوئے بچے کی طرح خوب صورت لگتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو ہمیں استعمال کرنے والا ہمیں پیار کرتا ہے۔ ہمارے ساتھ بد سلوکی نہیں کرتا۔

ذرا آپ اپنی کتابوں اور کاپیوں پر ایک نظر ڈالیے اگر وہ آپ کی تعریف کرتی ہیں تو یقین رکھیے کہ آپ ایک دن اچھے اور بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔

کاغذ بڑا صبر کرنے والا ہے۔ سوچتا ہوں اگر میں کاغذ ہوتا تو "بُرے" طالب علم سے ناراض ہو کر ایک نہ ایک دن ضرور روٹھ جاتا۔

روٹھ کر کیا کرتا؟

وہی جو روٹھ کر کرتے ہیں۔ اُس کے پاس نہ رہتا۔ اُس کے کسی کام نہ آتا۔ جیسے ہی وہ مجھے ہاتھ لگاتا میں ایک دم غائب ہو جاتا

غائب ہو جاتا؟

اگر کاغذ بھی اس طرح روٹھنے لگے تو کیا ہو؟ مجھے کبھی کبھی یہی خیال آتا ہے۔

ہنسیے نہیں۔ میرے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کیجیے۔



جناب عبد اللطیف اعظمی

دار المصنفین کی گولڈن جوبلی

پیامی بچوں کو پچھلے پرچے میں ایڈیٹر صاحب دار المصنفین کی جوبلی کے بارے میں کچھ بتا چکے ہیں۔ دار المصنفین کو جس کا دوسرا نام شبلی اکیڈیمی بھی ہے، مولانا شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا۔ موصوف کا انتقال ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا تھا۔ بس اس سے کچھ ہی دن پہلے اسے قائم کیا تھا۔ اس لحاظ سے پچھلے نومبر میں اس کو قائم کیے ہوئے پچاس سال ہو گئے۔ پچھلے سال ہی یہ جوبلی منائی جانے والی تھی، مگر ہمارے نائب صدر جناب ذاکر حسین صاحب کو فرصت نہیں تھی۔ اس لیے اس سال فروری میں منائی گئی۔ اس جوبلی کے جلسوں میں ہمارے پیامی بھائیوں نے شرکت تو کی نہیں ہوگی اس لیے ان کے لیے آنکھوں دیکھا حال ہم لکھ رہے ہیں

امید ہے وہ شوق اور دلچسپی سے پڑھیں

جوبلی کا اصل جلسہ ۲۰ر فروری کو میں ساڑھے تین بجے تھا، مگر خاص خاص ۱۹ر فروری ہی کو اعظم گڈھ پہنچ گئے، مثلاً سے ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صا ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، مالک رام صا اور دریاآباد (بارہ بنکی) سے مولانا عبد الما صاحب دریاآبادی وغیرہ۔ اعظم گڈھ چھوٹا شہر ہے اور بڑے بڑے شہروں سے بڑی دو پر ہے۔ دلی، لکھنو اور بمبئی وغیرہ سے وہا جانے کے لیے بڑا وقت لگتا ہے، مگر دار المصنفین سے اتنی محبت اور اس کے کاموں کی لوگوں دلوں میں اتنی عزت ہے کہ بڑے بڑے لوگ بہت بڑی تعداد میں وہاں ایک روز پہلے

گئے۔ ہمارے دیس کے نائب صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ٹھیک جوبلی کے دن صبح کو آٹھ بجے کے قریب دلّی سے ہوائی جہاز پر روانہ ہوئے۔ اعظم گڑھ کے قریب کوئی ہوائی اڈّا نہیں ہے اس لیے بنارس کے پاس اعظم گڑھ سے ساٹھ ستر میل دوران کا جہاز کوئی دس بجے اُترا۔ دارالمصنفین کے ناظم، شہر کے کچھ خاص خاص لوگ اور اعظم گڑھ اور بنارس کے سرکاری افسر ذاکر صاحب کے استقبال کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھے، یوپی کی وزیراعلیٰ سوچیتا کرپلانی اور دو ایک وزیر بھی ذاکر صاحب کے خیر مقدم کے لیے ہوائی جہاز سے آگئے تھے۔

یہ سب لوگ کار سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے اور کوئی ۱۲ بجے دارالمصنفین پہنچے۔ سب سے پہلے شبلی کالج کے این سی سی کے طالب علموں نے ذاکر صاحب کو سلامی دی، دارالمصنفین کی چھپی ہوئی کتابوں اور ہاتھ کی لکھی ہوئی پرانی کتابوں کی نمائش کی گئی تھی، اسے دیکھنے کے بعد ذاکر صاحب مولانا شبلی کی قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھا۔

سہ پہر میں جلسہ ہوا تو دارالمصنفین کے ناظم مولانا شاہ معین الدین صاحب نے ذاکر صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا، جس میں انھوں نے ذاکر صاحب کی خدمات کی تعریف کی اور دارالمصنفین نے پچھلے پچاس برسوں میں جس قدر کام کیا ہے، اس کو بتلایا، اس کے بعد ذاکر صاحب نے دارالمصنفین کے کاموں کو سراہا اور بتلایا کہ کون سے ضروری کام ہیں جنھیں دارالمصنفین کو اب کرنا چاہیے۔ دارالمصنفین کے ایک کارکن مولوی یحیٰ اعظمی صاحب بڑے اچھے شاعر ہیں، انھوں نے بچوں کے لیے بھی اچھی نظمیں کہی ہیں، انھوں نے ذاکر صاحب کے شبلی منزل میں آنے کی خوشی پر ایک بہت اچھی نظم کہی تھی، یہ نظم بہت بڑی ہے اور مشکل بھی ہے، مگر ان کی ایک چھوٹی سی کوئی آٹھ دس برس کی بچی انجم نے ہزاروں کے مجمع میں جہاں بڑے بڑے لوگ تھے۔ بے جھجک پڑھ کر سنائی، چند شعر جو اس نظم میں سب سے آسان ہیں تم بھی سنو، ذاکر صاحب کے متعلق کہتے ہیں۔

وطن کا نامور فرزند بھی ہے فخر ملّت بھی
وہ مومن ہے کہ خوش ہیں آج شیخ و برہمن تجھ سے
ہے گہوارہ ترے فیضِ نظر کا جامعہ تیری

شگفتہ ہے وطن میں علم و دانش کا چمن تجھ سے
وطن کی آبرو، جمہوریت کی فتح و فیروزی
عبارت ہے، مگر اے نائبِ صدرِ وطن تجھ سے

مغرب کے بعد شبلی کالج کا جلسہ تھا جس میں آخری امتحان دینے والوں کو ڈگریاں دی گئیں۔ ڈگریاں پانے والے طالب علموں کو نصیحت کرنے اور اچھی اچھی باتیں بتلانے کے لیے مرکزی حکومت کے وزیر جناب ہمایوں کبیر صاحب سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے وعدہ کرلیا تھا، مگر وقت کے وقت کوئی ضروری کام آپڑا اور وہ نہ جاسکے۔ کالج کے پرنسپل صاحب بڑے پریشان ہوئے کہ اب اتنے تنگ وقت میں کیا ہوگا، بالآخر انھوں نے ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب سے کہا۔ وقت کم تھا مگر اتنے کم وقت میں بھی مجیب صاحب نے جو تقریر لکھ کر پڑھی، اس کو سُن کر لوگ دنگ رہ گئے۔ تقریر اردو میں تھی، زبان بڑی میٹھی اور خیالات بہت اونچے تھے۔

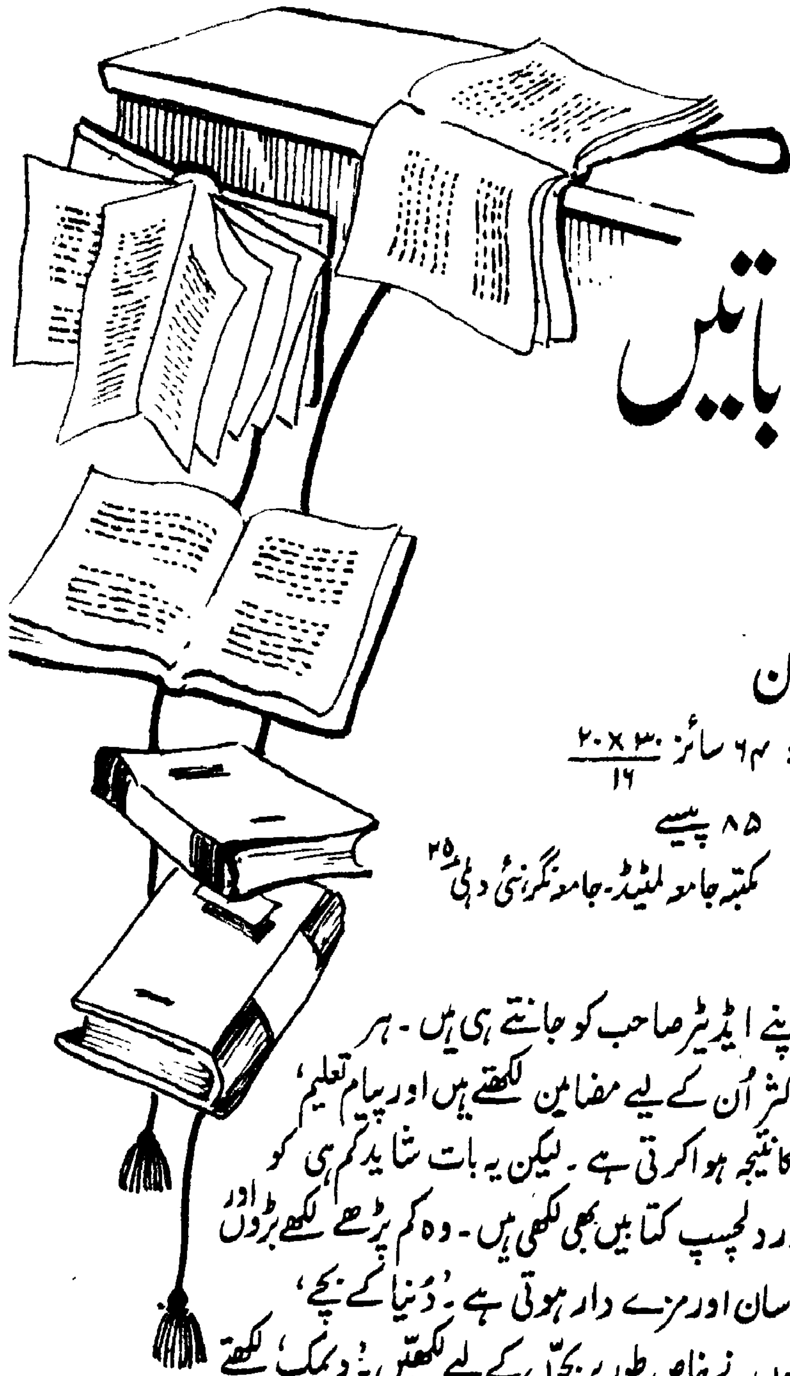
دوسرے روز صبح کے جلسے میں تقریریں تھیں کہ اسلام نے دنیا کے امن و امان کے لیے کیا کچھ دیا ہے، اس جلسے میں بڑے بڑے عالموں نے تقریریں کیں، اس کے بعد اچھے اچھے مضمون پڑھ کر سنائے گئے، شام کو مشاعرہ تھا، جس میں ہندوستان کے مشہور شاعروں نے حصہ لیا۔

دارالمصنفین کے کاموں سے خوش ہوکر اور اس خیال سے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اچھے اچھے کام کرے لوگوں نے بڑی بڑی رقمیں دینے کا اعلان کیا، کوئی دو یو نے دو لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا، مرکزی حکومت کی طرف سے ذاکر صاحب نے پچاس ہزار روپے کا اعلان کیا اور یو پی کی حکومت نے بھی دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔

یہ ہے دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی کا مختصر آنکھوں دیکھا حال۔ دارالمصنفین نے پچھلے پچاس سال میں بڑی اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں، آؤ ہم تم مل کر دُعا کریں کہ اللہ میاں دارالمصنفین کو بڑی سے بڑی عمر دیں اور اس کے کام کرنے والوں کو اچھا سے اچھا کام کرنے کی توفیق دیں۔

معلّم

کتابوں کی باتیں



کتاب : **دیمک**

مصنف : **محمد حسین حسّانؔ**

صفحات : ۶۴ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت : ۸۵ پیسے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

یوں تو پیامی بہن بھائی اپنے ایڈیٹر صاحب کو جانتے ہی ہیں۔ ہر مہینے وہ ان سے باتیں کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے لیے مضامین لکھتے ہیں اور پیام تعلیم کی سج دھج اُن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات شاید کم ہی کو معلوم ہو کہ انھوں نے کئی مفید اور دلچسپ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ وہ کم پڑھے لکھے بڑوں اور دونوں کیلیے لکھتے ہیں۔ اُن کی زبان آسان اور مزے دار ہوتی ہے۔ 'دُنیا کے بچے'، 'انوکھا عجائب غانہ' اور 'میر تقی میر' انھوں نے خاص طور پر بچّوں کے لیے لکھیں۔ 'دیمک' لکھتے وقت اُن کے سامنے گاؤں کے لوگ رہے ہیں۔ لکھنے کا سارا ڈھنگ ایسا ہے جیسے کسی کسان کے گھر میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہوں۔ اور سچ پوچھیے تو بات ہے بھی یہی کہ ایک کسان کے صندوق

کو دیمک چاٹ گئی۔ سارے گھر کو افسوس ہوا۔ معاملہ تھا ہی ایسا۔ غریب آدمی کے سارے کپڑے غارت ہو گئے تھے۔ اتنے میں اُن کے پڑوسی ماسٹر پیارے لال جی آ گئے۔ انھوں نے دیمک کے بارے میں کچھ کہا۔ کسان کے بیٹے رامو نے جب سُنا کہ دیمک میں ملکہ، مزدور، سپاہی، فوجی سب ہی ہوتے ہیں تو اُس کو بڑا تعجب ہوا۔ دوسرے سُننے والوں کو بھی اچنبھا ہوا۔ سب ہی نے دیمک کے بارے میں جاننا چاہا۔ ماسٹر جی نے دیمک کی بستی کا انتظام بتایا، اُس کی دو ہزار قسموں کا ذکر کیا اور اُس سے بچاؤ کی تدبیریں گنائیں۔ بس اسی بات چیت کو جوڑنے سے حسین صاحب کی یہ کتاب 'دیمک' تیار ہوئی ہے۔ لیجیے باتوں باتوں میں کام کی بات ہو گئی !

ایسی معلوماتی، عام سائنس اور روزانہ زندگی سے تعلق رکھنے والی آسان کتابوں کی بڑی ضرورت ہے۔ حسین صاحب کی یہ کتاب بچّوں اور نیا نیا پڑھنا لکھنا سیکھنے والے بڑوں سب ہی کے لیے اپنے اندر دلچسپی اور واقفیت کا سامان رکھتی ہے۔ ایسے بچّے جو صرف شہر ہی کی زبان سے واقف ہیں، اس کتاب کے ذریعے گاؤں کی بول چال کا چٹخارا بھی جان سکیں گے۔

اس کتاب کو بلاک پر چھاپا گیا ہے۔ لہٰذا آپ اس کتاب کی صاف ستھری چھپائی کے بارے میں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس میں جگہ جگہ بلاک کی بنی ہوئی تصویریں بھی ہیں۔ انھوں نے کتاب کے فائدے اور دلچسپی کو بہت بڑھا دیا ہے۔

شبنم : جمہوریت نمبر
ایڈیٹر ایم اے خاں ایم ایڈ

میونسپل کارپوریشن بمبئی نے بچوں کے لیے مرہٹی، گجراتی، ہندی اور اردو میں بچوں کے لیے رسالے نکالنے شروع کیے ہیں۔ یہ سہ ماہی ہوں گے۔ اردو رسالے کا نام شبنم ہے۔
یہ سب رسالے یوم جمہوریت یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء سے نکلنا شروع ہوئے ہیں۔ اردو کا شبنم بھی

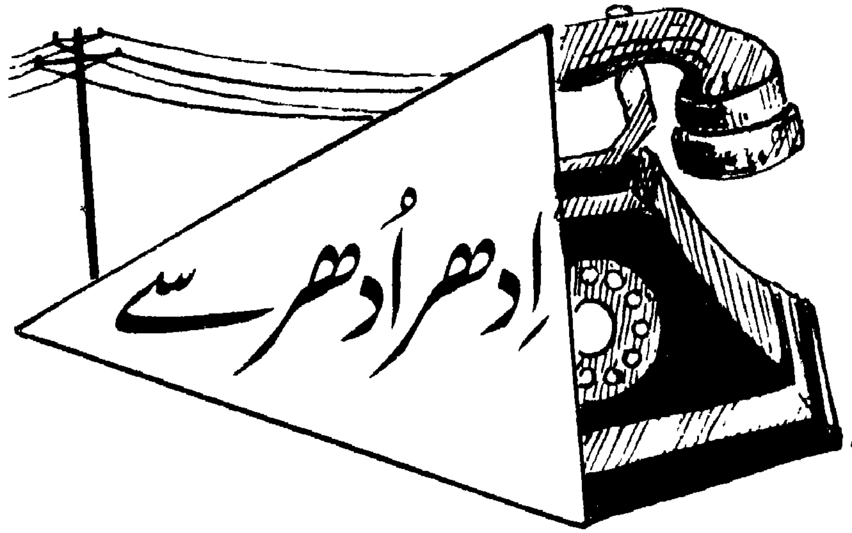
ریت نمبر ہے اور بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے کا سائز پیام تعلیم کا ہے۔ ضخامت ۶۴ صفحے
ٹائٹل بہت خوب صورت، تین رنگ کا ہے۔ اندر بھی جگہ جگہ رنگین تصویریں ہیں۔ بہت سے مضمون
کہانیاں باتصویر ہیں۔
یہ پرچہ چھوٹے بچوں کے لیے ہے اس لیے مضمون، کہانیاں اور نظمیں سب سادہ اور آسان زبان
ں۔ ہم اس کامیاب کوشش پر جناب ایڈیٹر صاحب کو اور اس جراءت مندانہ اقدام پر کارپوریشن
ولی مبارک باد دیتے ہیں۔ رسالے پر قیمت اور پتہ درج نہیں ہے۔ غالباً کارپوریشن کے محکمۂ تعلیم
ے مل سکے گا۔

معمار

نہرو نمبر

سرپرست جناب غلام مصطفےٰ صاحب صدر مدرس۔ جناب محمد امین عبدالقادر شیخ صاحب ڈپٹی مدرس۔
نگراں علی ایم شمسی۔ مجلس ادارت محمد اقبال متعلم ہفتم، نیاز احمد متعلم ششم امیر علی متعلم پنجم۔
یہ رسالہ قیصر بھائی رحمت اللہ میونسپل دوکیشنل اردو اسکول بمبئی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ترجمان
۔ دو سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ موجودہ نمبر نہرو نمبر ۱۹۶۴ء ہے۔ شروع میں
ب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ مہاراشٹر کے وزیر تعلیم شری ایم ڈی چودھری، وزیر اوقاف
ی ذکریا۔ گورنر مہاراشٹر آر پی چارلی صاحب اور دوسرے لوگوں کے پیام ہیں اور پھر مضمون ہیں۔ نظمیں
۔ اس محفل میں بڑے بھی ہیں بچے بھی ہیں۔ پرچے کو بڑی محنت، بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے
ت جی کی شخصیت اُبھر کر سامنے آ گئی ہے۔ سب سے آخری چیز: "نہرو کی زندگی پر طائرانہ نظر" بڑی
مد اور تاریخی چیز ہے۔ سرورق رنگین ہے اور اس پر پنڈت جی کی تصویر ہے۔ اندر بھی پنڈت جی
ت سی تصویریں ہیں۔ غرض رسالہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ ہم اس کامیابی پر مجلس ادارت
نگراں صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں۔ قیمت اور پتہ اس پر بھی درج نہیں۔

صحافی



خلاباز کا کارنامہ

۱۸ مارچ کو ساڑھے گیارہ بجے "ووسخود ۲" کی پرواز کے دوران تاریخ میں پہلی بار ایک انسان خلائی جہاز سے باہر نکلا۔

زمین کے گرد دوسرے چکر کے دوران پائلٹ لفٹننٹ کرنل الکسئی لیونوف جو ایک خاص خلائی لباس پہنے ہوئے تھے اور جس میں زندگی قائم رکھنے کے لیے خود کار نظام بھی تھا، خلا میں باہر آئے، جہاز سے ۵ میٹر کے فاصلے تک گئے، منصوبے کے مطابق تجربے اور مشاہدے کیے اور پھر بحفاظت خلائی جہاز میں واپس آ گئے۔

پانچ سالہ "دیو"

میتھونیا کے ایک گاؤں گینائی میں ا پانچ سال کا بچہ ایولوکس بلواس ہے جس کا ۱۲۲ سینٹی میٹر اور وزن ۴۰ کیلو گرام ہے۔ بچہ غیر معمولی طور پر مضبوط ہے۔ اور دوسرے تمام بچوں کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہے۔ اس ماں باپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ اب تک کبھی بیمار نہیں پڑا۔

مصنوعی پسّو

ماسکو (نووستی) یورال کے الکساندر رائیسو لیاتن نے مشینی بھالو بنایا ہے جو دیاسلا کی ڈبیا کے برابر ہے۔ اس کے پنجوں میں ایک

سا پیپہ تھرک رہا ہے۔ اس کھلونے میں ۲ سو
زائد پرزے لگے ہیں جن میں سے بعض صرف
ردبین کی مدد سے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس بار اس کھلونا بنانے والے نے زندہ
ز کے برابر مصنوعی پسو بنایا تھا، جس میں انجن
ہوا تھا۔ جس کی بدولت وہ خوب اچھلتا
ا، ایک بار یہ پسو اچھلا اور گھاس میں ہمیشہ
لیے گم ہو گیا، کیونکہ ڈیڑھ ملی میٹر کے پسو کو
ونڈ نکالنا ناممکن تھا

ذربائیجانی ”بڑے میاں“ نے ایک سو چالیسویں سالگرہ منائی

نظر بابا مصطفائیف نے
ل ہی میں اپنی ایک سو چالیس ویں سالگرہ
ائی جس میں پہاڑی گاؤں تغیر جال کے سب
باشندے شریک ہوئے۔ گاؤں کے بڑے
یے میں ان کے خاندان کے مکانوں کا سلسلہ
میلا ہوا ہے جس میں ان کی اولاد کے ۶۳ افراد
باد ہیں، ان میں ان کے پوتے، پڑپوتے، سکڑ
تے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ روزانہ یہ بڑے
میاں جن کی عمر آذربائی جان میں سب سے زیادہ
ہے، اپنے باغ میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔
انھوں نے ایک سو دس سال تک گلہ بانی کی
ہے۔

نظر بابا اپنی غذا کا خاص لحاظ رکھتے ہیں،
ہر صبح وہ نماز سے فارغ ہو کر بھیڑ کے پنیر کے
ساتھ میٹھی چائے پیتے ہیں۔ دن میں ایک بار
تھوڑا سا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کی خوراک
کا بڑا حصہ تو پھل ہوتے ہیں۔ سبزیاں ہوتی
ہیں اور دودھ ہوتا ہے۔

۱۴ ہزار سال پہلے کی پھسلن گاڑی

ماسکو (نووستی) قزاخستان میں بورووئی
جھیل پر آباد چیکلینک میں کھدائی کے دوران
دنیا کی اب تک کی قدیم ترین پھسلن گاڑی دستیاب
ہوئی گھوڑے کی پنڈلی کی ہڈیوں سے بنی
ہوئی یہ گاڑی آج کی پھسلن گاڑیوں سے بڑی
مماثلت رکھتی ہے۔ خیال ہے کہ یہ گاڑی ۱۴۔۱۵
ہزار سال پرانی ہے۔ کثرت استعمال کی وجہ سے
ان میں شیشے کی مانند چمک پیدا ہو گئی ہے۔ گاڑی
کا اوپری حصہ خاص شکل کا ہے۔



پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

1965

Regd. No. D.

Payam -i- Taleem

New Delhi. 25

بچّوں کے لئے

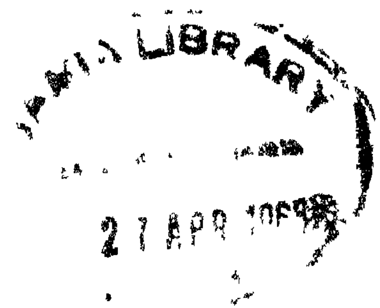
ماسکو میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

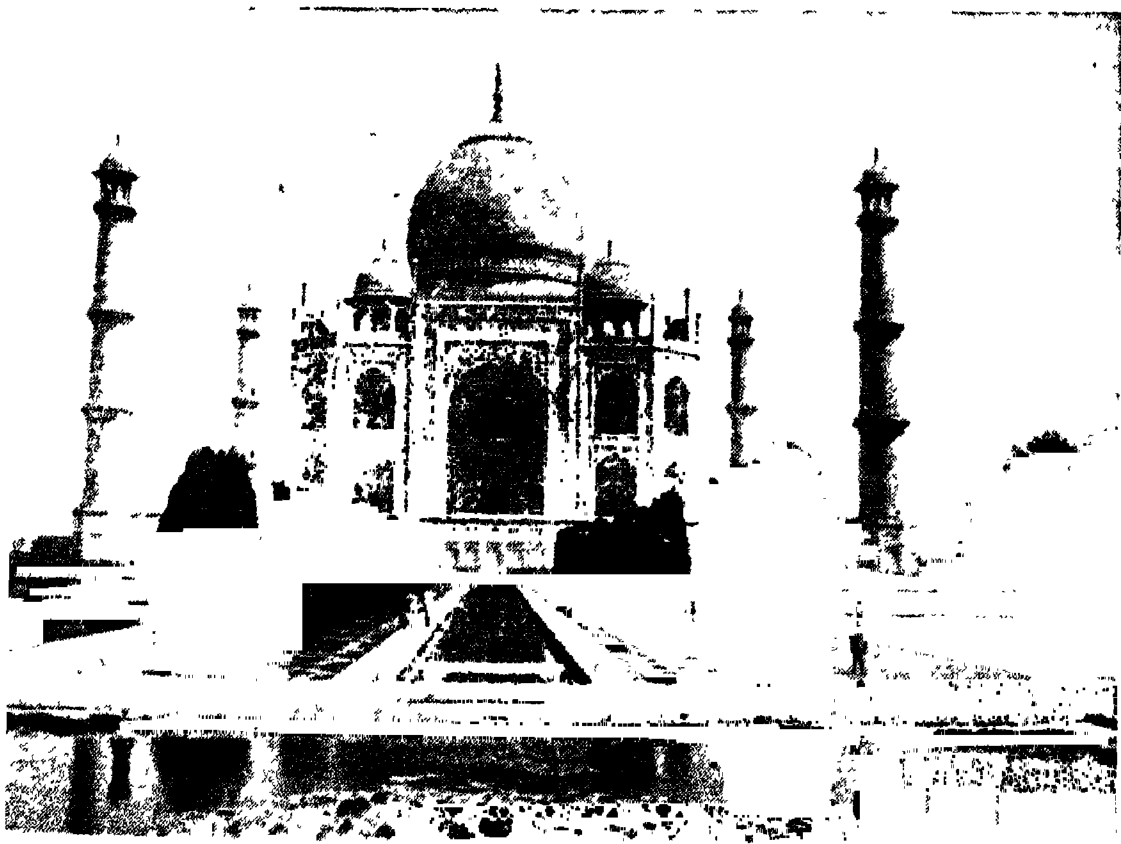
کتاب	صفحات	قیمت	پیسے
جوزہ	۱۶	۱۹	پیسے
دستانہ	۲۰	۲۵	،،
دو کہانیاں	۲۰	۳۱	،،
گیہوں کی بالی	۱۶	۳۱	،،
تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں	۵۲	۶۵	،،
روی اور ششی	۶۸	۶۹	،،
تین بھالو	۱۶	۳۷	،،
نیلا پیالہ	۹۴	۱۲۵	،،
بیشکا	۱۶	۳۱	،،

ان میں سے جوزہ ½ ۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
½ ۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر کے سائز پر ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

پیام تعلیم





بچوں کے لئے دلچسپ معلوماتی کتابیں

● **بڑ دادا کی کہانی** اس کتاب میں چار دلچسپ معلوماتی کہانیاں ہیں جن میں ہندوستان کی برسہا برس پرانی کہانی "بڑ" کے ایک بوڑھے درخت سے کہلوائی گئی ہے۔ قیمت ۵۶ نئے پیسے

● **سونے کی چڑیا** اس معلوماتی کتاب میں مغلیہ عہد کے ہندوستانی تمدن کی ایک رنگین جھلک نظر آئے گی جس کو بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ

● **سمندر کے کنارے** اس کتاب میں سمندر کے کنارے رہنے والی مخلوق اور طرح طرح کے عجیب جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ خوبصورت مائیٹل۔ رنگ برنگی تصاویر۔ قیمت: ایک روپیہ ۱۲ نئے پیسے

● **آدمی کی کہانی** اب سے ہزاروں برس پہلے آج جیسی نہ آدمی کی صورت تھی اور نہ آج جیسا رہن سہن۔ یہ سب درجہ بدرجہ کس طرح ہوا اس کی کہانی اس کتاب میں پڑھیے۔ قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

● **دیکھا عجائب خانہ** اس کتاب میں چھوٹی موٹی روزمرہ کی چیزوں کے بارے میں سوال قائم کرکے ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ سوال و جواب کا انداز بے حد مزیدار اور دلچسپ ہے۔ قیمت: حصہ اول ۵۰ نئے پیسے۔ حصہ دوم ۴۰ نئے پیسے

پیامِ تعلیم
دہلی

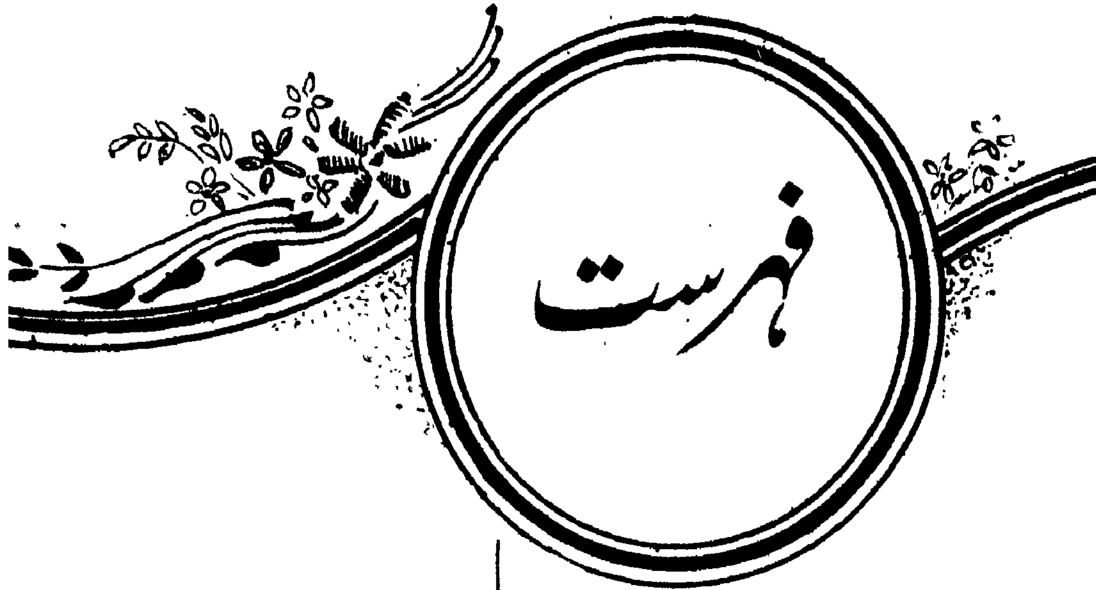
جلد ۲ مئی ۱۹۶۵ء شمارہ ۵

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

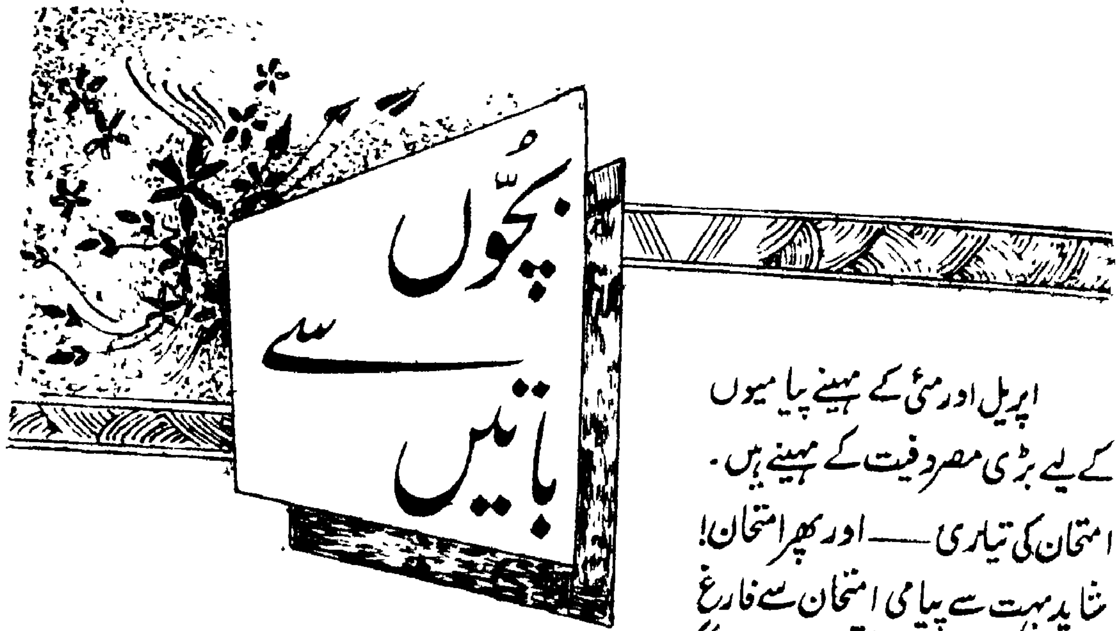


سالانہ چندہ : ـــــ پانچ روپے
فی پرچہ : ـــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر ـ نئی دہلی ۲۵



فہرست



اپریل اور مئی کے مہینے پیامیوں کے لیے بڑی مصروفیت کے مہینے ہیں۔ امتحان کی تیاری —— اور پھر امتحان! شاید بہت سے پیامی امتحان سے فارغ بھی ہو گئے ہوں گے۔ نتیجے کا انتظار ہوگا۔ اور بہت سے پیامی ابھی امتحان دے رہے ہوں گے —— ہماری طرف سے تو سب کے لیے یہی دعا ہے کہ خدا انھیں کامیاب کرے۔ پر بھئی کامیابی تو اصل میں اپنی کوشش، محنت اور توجہ سے ہوتی ہے۔ جو جیسی محنت اور کوشش کرتا ہے اس حساب سے اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

شاید اسی مصروفیت کی وجہ سے پیامی حالی والے انعامی مقابلے میں حصّہ نہ لے سکے۔ غالباً پندرہ سولہ مئی تک امتحان کا قصہ بالکل ختم ہو چکا ہوگا۔ ہم نے اس انعامی مقابلے کی آخری تاریخ ۵ جون رکھی تھی۔ اس وقفے میں آپ اطمینان سے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ اچھا ۵ جون نہ سہی دس جون تک بھیج دیجیے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا مگر دس جون کو آپ کا مضمون ہمارے دفتر میں پہنچ جانا چاہیے۔

اپریل کا پرچہ ہمارے پیامیوں کو خاص طور پر بہت پسند آیا۔ بہت سے پیامیوں نے تو شروع سے آخر تک پڑھا بہت غور سے پڑھا۔ جہاں اس کی بہت زیادہ تعریفیں کیں، چھپائی کی کچھ غلطیاں بھی بتائیں۔ مثلاً عبداللطیف کی جگہ عبدالطیف چھپ گیا تھا۔ یا اسی طرح کی اور چھوٹی موٹی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ کابیاں بہت

احتیاط سے دیکھی جاتی ہیں۔ پھر بھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ آیندہ اور احتیاط کی جائے گی۔

ننھے پیامیوں کو دھنک والی کہانی خاص طور سے اچھی لگی، "دلّی کی مرچیں" میں بھی بڑا چٹخارا تھا۔ پھر کومے وآوا اور شیر کا شکار ... وغیرہ۔ غرض سبھی مضمون بچوں کو پسند آئے۔

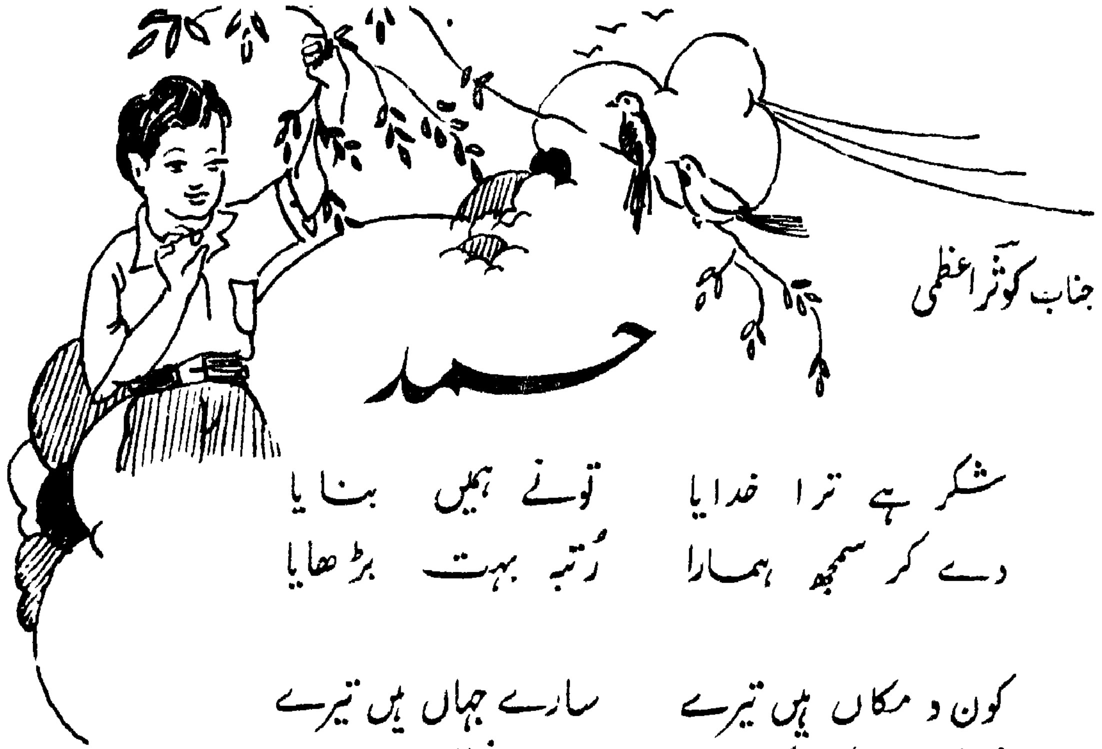
محترمہ ہاجرہ بیگم، محترمہ مشیر فاطمہ دونوں پُرانی مضمون نگار ہیں۔ محترمہ ہاجرہ بیگم تو ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء سے پیام تعلیم میں مضمون لکھ رہی ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آیندہ پیام تعلیم کے لیے برابر لکھتی رہیں گی۔

مولانا مقبول احمد بھی بچوں کی دُنیا میں جانے پہچانے بزرگ ہیں۔ بچوں کے لیے بڑی اچھی اچھی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون "شاہ دفقیر" اس پرچے میں بھی چھپ رہا ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔

حالی نمبر کے سلسلے میں ایک بہت اچھا مضمون بالکل آخر وقت میں آنے کی وجہ سے نہ چھپ سکا تھا اس مضمون کے بارے میں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہ حفیظ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔

دیس کے محترم بہت ہی محترم بزرگ چاچا نہرو کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک سال بیت گیا۔ پر ان کی یاد ابھی تک تازہ ہے، اس سلسلے میں ہم مفتوں کو لوٹی صاحب کی ایک نظم اور محترمہ اودے لکشمی ماتھر کا ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔

ابھی کچھ دنوں پہلے روس کے خلابازوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہم نے اپنے محترم مضمون نگار جناب محمد امین صاحب سے ایک مفصل مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی مگر وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے بالکل آخر وقت میں یہ مضمون مکمل کر سکے۔ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اسے آپ اگلے شمارے میں پڑھیں گے۔



جناب کوثر اعظمی

حمد

شکر ہے ترا خدایا	تو نے ہمیں بنایا
دے کر سمجھ ہمارا	رُتبہ بہت بڑھایا

کون و مکاں ہیں تیرے	سارے جہاں ہیں تیرے
پھیلے ہوئے ہر اک سو	یارب نشاں ہیں تیرے

پھولوں میں تو ہی تو ہے	غنچوں میں تو ہی تو ہے
چڑیوں کی چہچہوں میں	تیری ہی گفتگو ہے

تاروں کی انجمن میں	پھولوں بھرے چمن میں
جلوہ نما ہے تو ہی	ہنستی ہوئی کرن میں

ذرّوں میں نور تیرا	ہر سو ظہور تیرا

پھیلا ہوا ہے شہرہ
نزدیک و دور تیرا



بنارس کے پاس رام نگر ایک چھوٹی سی ریاست ہے، یہاں کے راجہ کے پاس ایک ہاتھی تھا اس ہاتھی کا نام راج میگھ تھا۔ ہاتھی تو اور بھی کئی تھے مگر راج میگھ کو سب لوگ بہت چاہتے تھے کیونکہ وہ بہت نیک اور سمجھدار تھا اور بچوں سے تو اتنا پیار کرتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے آنکھ مچولی کھیلتے تو اس کی آڑ میں چھپ جاتے اور جب چور چھپے ہوئے بچے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے راج میگھ کے آس پاس بھاگتا تو راج میگھ زور زور سے اپنے کان پھٹپھٹاتا اور سونڈ ہوا میں اٹھا کے سوں سوں کرتا جیسے وہ خود بھی اس کھیل میں حصہ لے رہا ہو۔ اپنے مہاوت کے ننھے بچوں کو بھی وہ بہت چاہتا تھا سب سے چھوٹے کو اکثر اپنے سر پر بٹھا کر گنگا کی سیر کرانے لے جاتا اور جب دریا سے نہا کر لوٹتا تو بچوں کے لیے گنے اور بھٹے سونڈ میں لے کر آتا، کبھی کبھی سونڈ میں پانی بھر کر اپنے مہاوت کی کوٹھری دھوتا، کوٹھری کے سامنے آنگن میں چھڑکاؤ کرتا۔

گھاس اور چارے کے ساتھ [illegible] کے لیے، راجہ کے یہاں سے پانچ سیر آٹا بھی ملتا تھا اور مہاوت لوگ ہی اس [illegible] روٹ پکا کر ہاتھیوں کو کھلاتے [illegible] [illegible] کہ راج میگھ کا مہاوت آٹے [illegible] کرتا تھا اور رات ہوتی تو راج [illegible] دیتا کہ ادھر ادھر جا کر اپنا پیٹ [illegible] [illegible] چارا مارا مارا پھرتا، کسی کے [illegible]

...ال کر پھینکنے پر سے روٹی کھینچ لی، کسی کی ...ئی ہوئی سبزیاں صاف کر دیں، کسی کی گائے ...یل کا چارہ کھالیا! اور رات کو کوئی تین چار بجے، پھر پھرا کر، اپنے ہاتھی خانے واپس آجاتا! لوگ اس کو چاہتے تو بہت تھے، یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا پر یہ بات سب کو بری لگتی، راجہ کے یہاں رپورٹ ہوئی، مہاوت سے پوچھ گچھ بھی کی گئی پر وہ صاف مکر گیا، دو چار دن اس نے راج میگھ کو باندھ دیا — اور پھر کھولنے لگا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ گرمیوں کے دن تھے، مہاوت کو اپنی کوٹھری میں گرمی لگی تو اس نے کوئی ایک بجے رات کے قریب، باہر زمین ...، وہیں ہاتھی خانے کے پاس چٹائی بچھائی، ...س پر اپنا بستر کیا اور سو گیا۔ راج میگھ روز ...ی طرح۔ کوئی تین بجے گھوم گھام کر واپس آیا۔ اب اس بے چارے کو کیا معلوم کہ وہیں ...زمین پر اس کا مہاوت سو رہا ہے، وہ جیسے ...آتا تھا ویسے ہی جھومتا جھامتا اطمینان سے چلا آرہا تھا کہ ایک دم سے اس کا پاؤں کسی نرم چیز پر پڑا اور ایک چیخ سنائی دی۔

"ہائے کمبخت — مجھ کو ہی مارنا تھا" — دو ایک چیخیں اور مار کر مہاوت ٹھنڈا ہو گیا۔

راج میگھ نے اس کی آواز پہچان لی اور جب اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ اس نے اپنے ہی مہاوت کو مار ڈالا جسے وہ اتنا چاہتا تھا تو وہ پاگل ہو گیا — زور زور سے چنگھاڑنے لگا، جو چیز سامنے آئی اس سے سر ٹکرانے لگا اور ادھر اُدھر دوڑنے لگا! تم سمجھ سکتے ہو کہ کیا بھگدڑ مچی ہوگی! لوگ جو باہر سو رہے تھے، گرتے پڑتے گھروں کے اندر بھاگے، چیخنے، رونے اور شور کی آوازیں اٹھنے لگیں بہت سے لوگ ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئے! وہ ہنگامہ ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ جب صبح ہوئی تو راج میگھ قلعہ کے پاس لگے ہوئے جنگل میں گھس گیا مگر وہاں سے اس کے چنگھاڑنے اور درختوں کو توڑ توڑ کر پھینکنے کی آوازیں برابر آرہی تھیں!

پھر راجہ کے قلعہ میں کمیٹی بیٹھی اور یہ صلاح مشورہ ہونے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ راج میگھ کو گولی مار دی جائے۔ رام نگر

کے لوگ راج میگھ کو بہت چاہتے تھے، جب یہ خبر پھیلی کہ اُسے گھیر کر گولی ماری جائے گی تو سب ہی کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے پر کیا کیا جاتا ـــــ اگر اس کو نہ مارتے تو وہ لوگوں کو مارتا! چنانچہ بندوقوں میں گولیاں بھری گئیں، کچھ سپاہی یہ بندوقیں لے کر تیار ہوئے اور یہ بات ہونے لگی کہ جنگل کا گھیرا کس طرح ڈالا جائے۔

اتنے میں اس کمرے کے دروازے پر کسی نے بڑے زور کی دستک دی جہاں راجہ اور اور لوگ بیٹھے یہ سب باتیں کر رہے تھے۔ دستک اتنی زور زور سے ہو رہی تھی کہ لگتا تھا کہ کوئی بڑا ہی پریشان ہے! جب دروازہ کھولا گیا تو ایک عورت دوڑی ہوئی اندر آئی اور دھڑام سے راجہ کے پاؤں کے پاس گر پڑی! اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے، کنکروں پر دوڑنے سے پاؤں زخمی تھے اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

وہ راج میگھ کے مرے ہوئے مہاوت کی بیوی تھی!

اس کو دیکھ کر کچھ لوگ چپکے چپکے رونے لگے، راجہ کا بھی دل بھر آیا، اس نے کرسی سے اُتر کر اسے اٹھایا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے!

اس نے آنسو پونچھ کر سوال کیا "مہاراج کیا آپ لوگوں نے میگھ راج کو گولی مارنے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"پھر اور کیا کریں؟" راجہ نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ "اگر اس کی جان نہ لی گئی تو سارے رام نگر کے لوگوں کی جان خطرے میں ہے" ایک وزیر نے سمجھانے کے لیے نرمی سے کہا۔

"مہاراج، آپ مجھے ایک موقع دیں ـــ ایک بار، صرف ایک بار" وہ عورت بلکنے لگی۔

"تمھیں موقع دیں؟ تم کیا کرو گی؟" راجہ حیران رہ گیا۔

"میں کچھ بھی کروں گی ـــ میں اس کے پاس جاؤں گی مہاراج، مجھے وہ نہ پہچانے ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔"

"لیکن اگر اس کوشش میں اس نے تمھیں

مار ڈالا تو تمھارا خون کس کی گردن پر ہوگا۔
اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟"

"کوئی نہیں، مرنا تو مجھے ویسے بھی ہے،
میں کس دل سے دیکھوں گی کہ میرے راج میگھ
کو گولی مار دی جائے، میں تو گنگا میں ڈوب
کر اپنی جان دے دوں گی ——— اے میرا
راج میگھ ——— تو میرے بچوں کو اتنا چاہتا
ہے! ان کے لیے گنے لاتا تھا، بھٹے لاتا تھا،
سونڈ میں پانی بھر بھر کر میرا گھر دھوتا تھا،
تپتی زمین پر پانی چھڑک کر میرے لیے ٹھنڈا
کرتا تھا ——— نہیں نہیں، میں اپنے راج میگھ
کو نہیں مرنے دوں گی ———" اور وہ زمین پر
لوٹ لوٹ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔

"تم اپنے شوہر کے صدمے سے پاگل
ہوگئی ہو،" راجہ نے کہا "تم یہ کیوں بھول رہی
ہو کہ راج میگھ نے ہی تمھارے شوہر کی
جان لی ہے؟"

وہ عورت ایک دم سے اٹھ کھڑی
ہوئی، اس کے آنسو غصہ کی آنچ سے سوکھ
گئے۔ ہونٹ بھینچ کر زور سے بولی "نہیں"
میرے شوہر کو راج میگھ نے نہیں مارا، اسے
بے ایمانی نے مارا ——— بے زبان جانور کے
کھانے میں سے چوری کر کے وہ آٹا بیچتا تھا
اور اسے بھوکا رکھتا تھا اور رات کو کھول
دیتا تھا، اسی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ———
اس میں راج میگھ کا کوئی قصور نہیں ہے"۔
پھر وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی
"آپ قلعے سے دیکھیے ——— آج ایسا تماشا
ہوگا جو رام نگر کے لوگوں نے نہ کبھی دیکھا
ہے نہ دیکھیں گے ———" اور وہ دوڑتی ہوئی
دروازے سے نکل گئی۔

سب حیران رہ گئے!

قلعے کے نیچے والے بڑے میدان میں
ایک طرف سے ایک عورت بڑھ رہی تھی،
اس کی گود میں ایک تین چار سال کا بچہ تھا
اور وہ قلعے کے دوسری طرف سے شروع
ہونے والے جنگل کی طرف جا رہی تھی جنگل
کے کنارے پر پہنچ کر اس نے زور سے پکار
کے آواز دی "میگھ راج"۔

قلعے کی دیواریں دیکھنے والوں سے
لپٹی پڑی تھیں ایک پر ایک ٹوٹ رہا تھا!
پر ایک سناٹا سب پر طاری تھا جیسے سب

کی سانسیں رک گئی ہوں۔

دوسری بار پھر اس عورت نے آواز دی "میگھ راج ..." اب کی بار جنگل میں ہاتھی کے دوڑنے کا دھماکا ہونے لگا، جھاڑیاں، چھوٹے چھوٹے درخت ٹوٹنے لگے، چڑیاں گھونسلے چھوڑ چھوڑ کر چیخیں مارتی ہوئی ہوا میں منڈلانے لگیں، اُدھر اُدھر گھنٹے زور زور سے بجنے لگے، قلعے پر کھڑے ہوئے لوگ تھرتھرانے لگے — جنگل کی طرف سے درختوں کو چیرتا، سونڈ اُٹھائے، چنگھاڑتا ہوا راج میگھ نکلا — وہ اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کدھر جائے!

عورت نے تیسری بار پکارا، پہلی دو بار سے بھی زیادہ زور سے — "میگھ راج"

ایک دم سے وہ رک گیا، جیسے ... رہ گیا ہو، سونڈ بلند کر کے ایک بار ا... نے ایک چیخ ماری — یہ چیخ چنگھاڑ نہ تھی، وہ ایک ایسی چیخ تھی جیسی ہم انسا... اپنے کسی پیارے کی موت پر بے بسی ... ساتھ مارتے ہیں!

پھر اس کی سونڈ نیچے گرنے لگی اور ... ہوتے ہوتے بالکل زمین سے لگ گئی، پنکھو... ایسے دونوں کان دھیرے دھیرے ہلنے لگے اور وہ آہستہ آہستہ عورت کی طرف بڑھنے لگا۔ عورت اس کی طرف بڑھنے لگی!



جب کوئی تین گز کا فاصلہ رہ گیا تو عورت نے اپنے

...ر کے بچے کو آگے بڑھایا اور زور سے بولی
...لے اسے بھی مار ڈال! ــــ لے!
...تا کیوں نہیں لے ــ لے، مار ڈال"
اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی!
راج میگھ آہستہ آہستہ اور آگے
بڑھا اور پھر وہ ہوا جو سچ مچ 'رام نگر کے
لوگوں نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ کبھی دیکھیں
گے ــ راج میگھ دھیرے دھیرے بیٹھنے
لگا اور جب بالکل بیٹھ گیا تو اس نے سونڈ
بڑھائی، بچے کو سونڈ میں اٹھایا اور اپنے
سر پہ بٹھا لیا جیسے وہ کبھی کبھی اس کو گنگا
کی سیر کرانے لے جاتا تھا! اس نے ایک
دو بار سونڈ ہلائی، ایک دو بار کان ہلائے
اور پھر بالکل ساکت ہو گیا جیسے اپنے
اس کارنامے سے اس کو مکمل اطمینان اور
سکون ہو گیا ہو۔
بچے کو تو راج میگھ کی گردن پر بیٹھنے
کی عادت تھی ہی! وہ بڑے مزے میں جما
رہا! پھر عورت روانہ ہوئی، راج میگھ بھی
کھد بھدا کے اٹھا! اس کے سر پہ ننھا مہاوت
بیٹھا ہوا، آگے آگے وہ پھٹے حال عورت
چپکے چپکے روتی ہوئی اور اس کے پیچھے جھومتا
ہوا راج میگھ! ــــ اس قافلے کا رُخ
ہاتھی خانے کی طرف تھا![1]

---

[1] یہ کہانی مجھے میرے دادا مرحوم نے سنائی تھی جو نوکری سے پنشن کے بعد رام نگر گاؤں میں رہتے تھے، وہاں اپنے شوق کا لکھنا پڑھنا کرتے تھے، راجہ سے ان کی دوستی تھی اور یہ واقعہ انھوں نے خود دیکھا تھا۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ انسان تو انسان پاگل ہاتھی کو بھی محبت سے جیتا جا سکتا تھا۔

یہ ننھا بچہ برسوں راج میگھ کا مہاوت رہا اور دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے!

جناب پروفیسر امانت
واڈیا کالج، پونا



گُلاب کا پھول

سُندر سُندر پیارا پیارا — کتنا اچھا پھول ہمارا
باغ میں سارے راج ہے اس کا — سب کی زباں پر گیت ہے اس کا
رنگ گلابی اس کا بھائے — دیکھ کے اس کو جی للچائے
اس کی خوشبو دل کو لُبھائے — چھوٹے بڑوں کو مست بنائے
دیکھ کے اس کو بُلبُل چہکے — یہ اترائے، خوب ہی مہکے
تتلی اُڑتی اس پر آئے — رس چوسے، جھومے، لہرائے
اس نے جب یہ جلوہ دکھایا — نہرو نے سینے سے لگایا
اس کی ادا پر سب مرتے ہیں — ہم بھی اسی کا دم بھرتے ہیں

سُندر سُندر پیارا پیارا
سب سے اچھا پھول ہمارا



ب محمد حفیظ الدین

حالیؔ کی سوویں سالگرہ

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ۷۹ سال کی عمر پائی۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اگر وہ ۲۱ سال اور جیتے تو پورے سو سال کے ہو جاتے۔ اسی حساب سے ان کی سوویں سالگرہ ۱۹۳۵ء میں منائی گئی۔

حالیؔ اپنی زندگی ہی میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اردو شاعری میں انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایسا طرز اختیار کیا کہ اس زبان کے دھارے کو غلط راستے پر جانے سے روک دیا اور صحیح سمت پر موڑ دیا۔ وہ آخر دم تک قوم کی خدمت اور اردو کے سنوارنے میں لگے رہے اس لیے ملک بھر میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ لوگ انھیں دل سے مانتے اور بہت اچھا انسان جانتے تھے۔ انھوں نے اردو میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کئی کتابیں تو اتنی مقبول ہوئیں کہ بار بار چھپیں اور اب بھی چھپتی رہتی ہیں۔ ان کی نظم کی مشہور کتاب مُسدس حالیؔ کا پشتو، فارسی، انگریزی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایران میں ایک مشہور عالم اور بزرگ گزرے ہیں سعدیؔ، شیراز بستی کے رہنے والے۔ عمر سو کے قریب پائی اور بہت اچھی اچھی کام کی باتیں نظم و نثر میں لکھ گئے ہیں۔ اُن کی بڑائی ساری دُنیا مانتی ہے۔ حالیؔ کو بھی لوگ ہندوستان کا سعدی کہتے ہیں وہ

سچ مچ ایسے ہی بڑے آدمی تھے۔ اس لیے مرنے کے بعد اُن کی عزت و احترام میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ اُن کے بعد لوگوں نے اُن کی قدر کچھ اور زیادہ پہچانی۔ اور اُن کی یاد دلوں میں بس گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے عقیدتمندوں نے مرنے کے بعد بھی اُن کی صد سالہ سالگرہ منائی۔

یہاں ذرا سالگرہ اور برسی کا فرق سمجھتے چلیے۔ مرنے کے بعد جتنے برس آتے ہیں وہ سال برسی کے کہلاتے ہیں۔ برسی پر مرنے والے کے بعض رشتہ دار رسم و رواج کے مطابق خیر خیرات کرتے اور دان پن دیتے ہیں تاکہ مرے ہوئے کی روح کو ثواب پہنچے۔ یہ بھی سوگ اور یاد منانے کا ایک طریقہ ہے۔ سالگرہ اکثر زندگی ہی میں ہوتی ہے۔ اور جس کی سالگرہ منائی جاتی ہے وہ خود بھی موجود ہوتا ہے۔ اب یہ رسم چل پڑی ہے کہ مرے ہوئے لیڈروں اور بڑے آدمیوں کی پیدائش کے دن بھی جشن مناتے ہیں کہ اس مبارک دن خدا نے ایسا اچھا اور بڑا انسان پیدا کیا۔

سالگرہ کا مشرقی طریقہ یہ ہے کہ اس روز دعوت کی جاتی ہے اور ایک ریشمی دھاگے میں گرہ دی جاتی ہے اور وہ ایک مخملی ڈبیا میں حفاظت سے رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک گرہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک سال پورا ہو گیا۔ دھاگے کی گانٹھیں گننے سے عمر کا حساب لگ جاتا ہے۔

جدید مغربی طریقہ یہ ہے کہ ایک دعوت ہوتی ہے اس میں علاوہ اور چیزوں کے حیثیت کے مطابق ایک بڑا کیک بھی ہوتا ہے۔ اور سال کے ایک چراغ کے حساب سے جتنی عمر ہو اتنی موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔ یہ زندگی کی شمعیں سمجھی جاتی ہیں۔ تقریب شروع ہوتی ہے تو جس کی سالگرہ ہو وہ کسی بڑی چھری یا تلوار سے کیک کاٹتا ہے اور اس کے ٹکڑے مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔

اب حالی کی صد سالہ سالگرہ کا حال سنیے۔ یہ سالگرہ حالی کے وطن پانی پت میں منائی گئی تھی۔ پانی پت ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر بہت پرانی اور تاریخی میدانوں والی جگہ ہے۔ اکثر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ

ابھی میدانوں میں ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اب تک فضاؤں میں جنگی نعروں، بزن۔ بکش، تکبیر کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دیتی ہیں، سنائی دیتی ہوں یا نہ دیتی ہوں یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ جس بستی کی ہواؤں میں لڑائی جھگڑوں کی روایتیں اور کہانیاں گشت کرتی ہوں، وہاں حالی ایسا نیک دل اور علمی آدمی پیدا ہوا جو سراسر امن اور محبت کا پتلا تھا عمر بھر قوم کے لیے روتا اور آنسوؤں سے منہ دھوتا رہا۔ بہر حال ملک کا یہ ہمدرد اور قوم کا خادم پانی پت کی زمین پر پیدا ہوا اور اسی خاک میں مل گیا۔ حضرت بوعلی قلندرؒ کی درگاہ میں ان کا مزار ہے، اس بڑے انسان نے جس سادگی سے اپنی پوری زندگی بتا دی، اسی سادگی کے ساتھ آج یہاں پڑا سو رہا ہے۔

جشن سالگرہ میں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آئے تھے۔ ڈاکٹر اقبال، مولانا شوکت علی، سر راس مسعود، شعیب قریشی، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین (شیخ الجامعہ) جامعہ کے اور چند اساتذہ وطلبہ مولوی حسین حسان ندوی (ایڈیٹر پیام تعلیم) اور بہت سے لوگ تھے۔

حالی ہائی اسکول کے میدان میں مہمانوں کے لیے خیمے کھڑے کیے گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سمندر کی سطح پر حباب ابھر آئے ہیں۔ یہ بلبلے دو روز بہار دکھا کر پھر غائب ہو گئے۔ اب تو اس جشن میں شرکت کرنے والے بزرگوں میں بھی بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔

کیا بھروسا ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

جشن سالگرہ میں سب سے اہم چیز جلسہ تھا۔ اس کی صدارت بھوپال کے نواب صاحب ہز ہائی نس حمید اللہ خاں نے فرمائی تھی۔ اور بہت سے فاضلوں نے حالی پر معلومات سے بھرے مضامین اور مقالے پڑھے تھے۔

یہاں یہ بات بتا دینا بے موقع نہیں ہے کہ اس سالگرہ میں شرکت کے وقت لکھنے والے کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ کبھی اُسے اس جشن کا حال لکھنا پڑے گا۔ اس لیے نہ کوئی یادداشت رکھی گئی اور نہ کارروائی کو اس

نظر سے دیکھنے کا خیال رہا۔ اس بات کو کم زیادہ
پچیس سال گزر چکے ہیں۔ ظاہر ہے اب وہی
باتیں ان سطروں میں آسکیں گی جو بہت زیادہ
اُبھر کر سامنے آئی تھیں اور اپنا گہرا نقش ذہن
پر چھوڑ گئیں۔

جشن کے تمام انتظامات بہت سادگی
سے کیے گئے تھے۔ جلسہ گاہ ایک شامیانے میں
تھی جہاں بیٹھنے اور سُننے کا انتظام سلیقے سے
کیا گیا تھا۔ اسٹیج پر ایک بزرگ تھے یہ جلسے
کی کارروائی چلا رہے تھے۔ عمر رہی ہوگی پچھتر
اسّی کے قریب، چلنے پھرنے میں انھیں خاصی
دقت ہوتی تھی۔ حاضرین کو اُن کا پاس ولحاظ
اس درجہ تھا کہ جدھر نظر اٹھتی تھی لوگ
دوڑ کر پہنچتے تھے اور ادب سے کان لگا کر ان
کے ارشاد سُنتے تھے۔ کبھی نواب صاحب کے
پاس چلے گئے تو صدارت کی کُرسی اور نوابی
کے ٹھاٹ باٹ کے باوجود وہ سروقد کھڑے
ہوجاتے تھے اور بڑے ادب واحترام سے
اُن کی بات سُنتے یہ بزرگ خود بھی اخلاق کا
ایک نمونہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پچھلے بزرگوں
کی کوئی پاکیزہ روح حالی کو خراج ادا کرنے

جلسے میں چلی آئی ہے۔ وضعداری کا یہ عا
ہلنا جلنا مشکل مگر کسی بچے سے بھی کوئی
کہنی ہو تو خود اس کے پاس جاکر کہتے۔
لوگ چاہتے تھے کہ اس زحمت کی نو
آئے۔ مگر وہ اپنی وضع پر قائم رہنے ا
سے کبھی نہ چوکتے۔ جو انھیں جانتے تھے ا
آگے ادب سے گردنیں جھکاتے تھے۔ جو
جانتے تھے وہ بھی حیران کہ آخر یہ کون
ہیں جن کے آگے ایک خلقت جھکی جار
منتظمین نے ان کا تعارف بھی نہیں کرا
مگر ہوتے ہوتے معلوم ہوگیا کہ یہ حالی
فرزند خواجہ سجاد حسین (ریٹائرڈ انسپ
ہیں۔ خدا اُن کی گور کو رحمت کے پھولو
بھرے، حالی کی تصویر تھے۔

جلسے کی کارروائی کلام پاک کی
سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اقبال
فارسی قطعہ ایک خوش آواز طالب
سُنایا۔ اقبال اسٹیج پر موجود تھے۔ قط
نواب کو فارسی کے عام انداز میں "تو"
مخاطب کیا گیا تھا۔ پورے قطعے کا
تھا کہ تو ایک مملکت کا بادشاہ اور میں

(فقیر) ہوں۔ آؤ ہم تم مل کر حالی کو خراج
یدت پیش کریں تو اُس کے مرقد (مزار) پر
افشانی کر (سونا نچھاور کر) اور میں برگ گل
پھول کی پتیاں) نثار کردوں۔ طالب علم
آواز میں بڑا درد اور لوچ تھا شعر پھڑکا
ینے والے، خود شاعر موجود، ان سب
ؤں نے مل کر عجیب سماں پیدا کر دیا جلسے
رنگ جم گیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اقبال اگرچہ
اب بھوپال کے وظیفہ خوار تھے مگر معلوم
تا تھا کہ سنجیدگی اور وقار کا پہاڑ ہے جو
نی جگہ پر جما ہوا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔
حوم مولانا شوکت علی بھاری بھرکم آدمی تھے
ر بھی بہت سے اونچے لوگ تھے سب نواب
ے حضور میں ہلکے پھلکے نظر آتے تھے۔ نواب
ر دبڑا شائستہ آدمی تھا مگر جس طرح پیش
تا تھا اُسے گوارا بھی کر لیتا تھا۔ جامعہ کے
شیخ (ذاکر صاحب) چالیس سے کم کے تھے ان
زرگوں کے مقابلے میں ان کا شمار خُردوں
ی میں تھا مگر ملک کے بڑوں میں اُن کا ایک
ماص مقام بن چکا تھا۔ انکسار اور سب کی

عزت کرنا ان کی طبیعت کا خاصہ ہو گیا ہے۔
بڑوں کا ادب لحاظ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا
ہے چھوٹوں سے بھی ایسا ملتے ہیں کہ ملنے والا
مل کر لوٹتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ آج
میں کچھ بڑا ہو گیا ہوں۔ ملاقات کی حلاوت
اور مٹھاس اس کی زندگی کا سدا بہار سرمایہ
بن جاتی ہے۔ یہ وصف اور بڑائی انھیں
ادھر چند سال کے عہدوں نے نہیں بخشی ہے۔
اس سے پہلے بھی وہ جب بوریے پر بیٹھتے تھے،
شرکت کے یکوں اور دلی کی ٹراموں میں سفر
کرتے تھے تو تاثیر کی یہ دولت انھیں حاصل
تھی۔ ظاہری مراتب میں وہ جتنے اونچے ہوتے
جاتے ہیں ان کا انکسار اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے
اور اشناس جانتے ہیں کہ کسی موقعے پر بھی وہ
اپنے آپ کو آگے نہیں بڑھاتے۔ روزانہ کی
اخباری تصویروں میں ذرا غور سے دیکھیے کیسے
دبے پلے سب سے پیچھے رہتے ہیں حالانکہ اب
ملک میں صدر کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے۔ یہ
فروتنی ان کی جبلّی عادت ہے جسے وہ خود
چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سراپا
یاد رکھیے اس سے مضمون کے اگلے حصے کا

خاص تعلق ہے۔

ہاں تو اس نظم کے بعد بہت سے فاضلوں کے مقالے حالی پر پڑھے گئے۔ سب کے سب خوب تھے اور لوگوں کو مرغوب تھے۔ مگر ان میں ایک مقالہ ساری تقریب کی جان تھا عنوان تھا "حالی بہ حیثیت محب وطن کے" اس موضوع کا حق جامعہ کے جوان سال شیخ کو ادا کرنا تھا۔

ادب آداب (ایٹی کیٹ) کا جتنا خیال ذاکر صاحب کو رہتا ہے بہت کم لوگوں کو رہتا ہوگا۔ مگر اس روز ان پر عجیب کیفیت طاری تھی ایک والہانہ انداز میں اسٹیج پر آئے بھرے مجمع میں سر پہ ٹوپی ندارد۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ انھیں یہ مطلق خبر نہیں ہے کہ آگے پیچھے اردگرد اور صدر میں کون بیٹھا ہے ان کے جاننے والوں کو تعجب ہوا کہ سر پہ ٹوپی نہیں! مگر کس کی مجال تھی کہ اس عالم میں انھیں ٹوکتا۔ عام خیال تھا کہ موضوع میں نہ زیادہ پھیلاؤ ہے اور نہ گنجائش۔ شیخ برائے بیت چند جملے کہہ کر بیٹھ جائیں گے مگر تقریر نے گھنٹہ سوا گھنٹہ وہ جنم لیا اور ایسا ہنگامہ کیا کہ سب دنگ رہ گئے۔

لطف یہ کہ بے شمار شعر حب الوطنی پر جگہ جگہ اپنی تقریر میں نگینے کی طرح جڑ دیے تھے اور یہ سب آبدار موتی حالی کے سمندر ہی سے چنے گئے تھے۔ جتنی دیر تقریر ہوتی رہی جلسے میں سب پر خود فراموشی و مدہوشی کی سی محویت رہی۔ تقریر ختم ہوئی تو زبانوں پر سبحان اللہ ماشاء اللہ اور آفرین کے کلمے تھے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

جناب خضر برنی شاستری

چار بڑے

چار بڑوں کی بات نرالی
بھر لو اپنے پیٹ کی تھالی
چھوڑ دو بھیّا دیکھا بھالی
للّو نے آواز لگائی
اک آنے میں چار بڑے

خالص ڈالی مونگ کی دال
تیل سے کی ہے خوب تلائی
جل جیرے کا پانی دے کر
اس میں کالی مرچ ملائی
ادرک اور پودینہ اس میں
لون مرچ کا رنگ نرالا
زیرہ، سونٹھ، کھٹائی ڈالی
اور ڈالا ہے گرم مسالا
للّو نے آواز لگائی
اک آنے میں چار بڑے



ظاہر میں ہیں لمبے چوڑے
سر ہے چکنا پیٹ ہے موٹا
للچائے من دیکھ کے سب کا
ان داموں میں کیا ہے ٹوٹا
اک آنے میں چار بڑے

ٹیبور سیکلج

ترجمہ

جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا

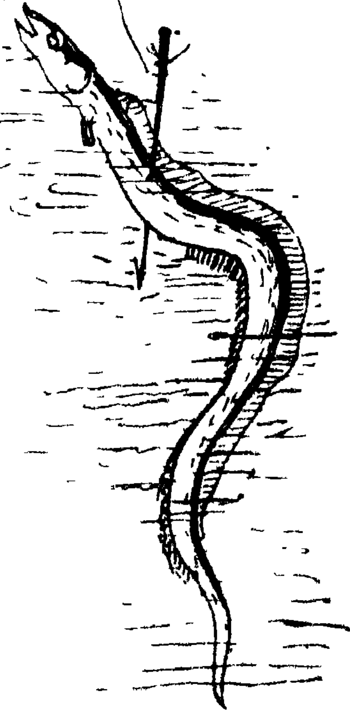


"واوا تمہیں تو جھٹکا نہیں لگا؟" میں نے پوچھا۔

"مچھلی نے اپنی ساری بجلی تو نک ٹیپ پر صرف کر دی، کومے واوا کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا" لڑکے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہم دونوں مچھلی کو کشتی میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مچھلی میں اب بھی بڑی طاقت تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ ہر بار ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی۔ دس بارہ منٹ تک یہی کھیل ہوتا رہا۔ آخر بے چاری تھک گئی اور پانی پر لمبی لمبی پڑ گئی۔ ہم دونوں نے اس کو اٹھا کر کشتی میں ڈال لیا۔

مجھے اپنے اس کامیاب شکار پر بڑا فخر محسوس ہو رہا تھا۔



ند منٹ پہلے بجلی کا جو جھٹکا مجھے لگا تھا اُسے
ں بھول چکا تھا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا
۔ اپنے اس شکار کا ساتھیوں کو خوب نمک
رچ لگا کر سناؤں گا۔

کومے دادا کے کہنے پر مچھلی کے جسم سے
ارپوُن نکالنے کے لیے میں آگے بڑھا۔ جیسے ہی
یں نے مچھلی پر ہاتھ رکھ کر ہارپوُن کھینچنا چاہا
وہ زور سے تڑپی اور اپنی دُم کو کوڑے کی طرح
میری پنڈلی پر مارا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ مچھلی پھر
پانی میں چلی گئی۔ یہ دیکھ کر میں فوراً جھکا اور
پانی میں ہاتھ ڈال کر مچھلی کو اٹھانا چاہا۔ اسی
لمحے کومے دادا نے ایک جست لی اور میرے
دونوں ہاتھ پکڑ کر پانی سے ہٹا دیا۔

"پیرانیاں

آ گئی ہیں۔ پانی
میں ہاتھ ڈالنا خطرے سے خالی نہیں ہے"
کومے دادا نے کہا۔

اور سچ مچ کشتی کے چاروں طرف بیسوں
مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی
تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ ان مچھلیوں کے
بارے میں میں نے سُن تو رکھا تھا مگر دیکھنے
کا اب تک اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ مچھلی بس
ہاتھ بھر لمبی ہوتی ہے۔ منہ بھی چھوٹا سا ہوتا ہے۔
لیکن اس چھوٹے سے منہ میں آدمی کے دانتوں
جیسے تیز دانتوں کی دو قطاریں ہوتی ہیں۔ پانی
میں خون کا رنگ دیکھ کر یا اس کی بو سونگھ کر
یہ پیرانیاں آناً فاناً سینکڑوں کی تعداد میں جمع
ہو جاتی ہیں اور تیر کی طرح تیز تیرتی ہوئی اپنے
شکار پر حملہ کرتی ہیں۔ شکار چاہے جانور ہو
یا آدمی۔

ہماری مچھلی کے آس پاس سینکڑوں پیرانیاں
تیر رہی تھیں اور جھپٹ جھپٹ کر اس پر ایسے
منہ مار رہی تھیں جیسے کسی انعامی مقابلے میں
حصّہ لے رہی ہوں۔ ان کی اچھل کود سے مچھلی
کے آس پاس کا پانی خوب اچھل رہا تھا۔ یہ منظر
ایک منٹ سے زیادہ قائم نہیں رہا۔ پھر پانی
ساکت ہو گیا۔ پیرانیاں جس تیزی سے آئی تھیں
اُسی طرح غائب ہو گئیں اور اب ہمارے
سامنے مچھلی کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ
- - - - - - - - گوشت سے بالکل
پاک اور صاف۔
"بھئی تم نے پانی میں ہاتھ ڈالنے سے

روک دیا۔ بہت بہت شکریہ" میں نے کہا۔
"بوڑھے الُوا کا کہنا ہے: "پانی میں پیرانیاں مچھلی سے اور زمین پر خوشامدی لوگوں سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہیے" کومے وادا نے کہا۔
میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ جنگل اور دریا کیسے کیسے عجیب خطروں سے بھرے پڑے ہیں۔ جو لوگ ان خطروں سے واقف نہیں ان کا ان جنگلوں میں آنا کتنی جوکھم کی بات ہے۔ جنگل کے رہنے والوں نے ان خطروں سے بچنے کے طریقے نہ جانے کتنی مدت اور کتنی جانیں ضائع کرکے سیکھے ہوں گے۔

"آؤ اب لوٹ چلیں سورج کافی چڑھ آیا ہے اور پھر اُدھر تمھارے ساتھی بھی بھوک سے بے چین ہوں گے" کومے وادا نے کشتی کا رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

واپسی کے لیے ہمیں دریا کے چڑھاؤ کے ساتھ چلنا تھا۔ ہم دونوں پوری طاقت سے اپنے چپو چلا رہے تھے۔ لیکن کشتی بہت ہی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ اگر ہم آدھے منٹ کے لیے بھی چپو چلانا بند کر دیتے تو پانی کی تیز دھار کشتی کو اتنی دور واپس لے آتی جتنا ہم چڑھاؤ کی طرف دس میں بھی نہ لے جا پاتے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی انتھک اور مسلسل محنت کے بعد ہم دریا کے اس اُتھلے اُتار کے قریب پہنچ گئے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ دریا کے اُتار کی آواز سنائی دینے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ پانی کا شور بڑھ رہا تھا اور کشتی کا کھینا دم بدم مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

جب اُتار کا علاقہ بالکل قریب آگیا تو کومے وادا نے کشتی کو کنارے کی طرف موڑتے ہوئے کہا "اب ہم لوگوں کو کشتی سے اتر کر اسے کنارے کنارے کھینچ کر لے جانا ہوگا۔"

کومے وادا کشتی کو کنارے پر لے آیا ہم دونوں کشتی سے اتر کر کنارے پر آگئے۔ کومے وادا نے ہارپون والی رسّی کا ایک سرا کشتی کے اگلے سرے پر باندھ دیا۔ دوسرا ہم دونوں نے پکڑا اور کشتی کو کھینچتے ہوئے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلنے لگے۔

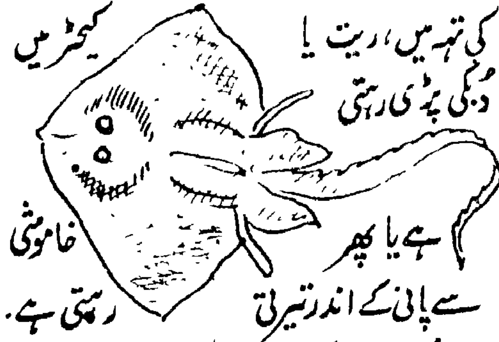
کشتی کا اس طرح کھینچنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پانی کی دھار کنارے پر بھی کافی تیز تھی ہم بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے تھوڑی

ور چلے تھے کہ دریا کا ریتیلا کنارا پتلا ہونے
ور آخرکار بالکل ہی ختم ہو گیا۔ گھنی اور
ں جھاڑیاں بالکل کنارے تک آگئیں اور
کا راستہ نہ رہا۔

اب ہمیں پانی میں چلتے ہوئے کشتی کو
بنا تھا۔ کومے دادا کشتی کو آگے سے کھینچ
تھا اور میں پیچھے سے ڈھکیل رہا تھا۔ تھوڑی
. چلنے کے بعد جب میں نے نگاہ اٹھائی تو
ما کہ کومے دادا کے ایک ہاتھ میں تو رسی تھی
ِ دوسرے ہاتھ میں چاقو۔ اس چاقو سے
پانی کو اس طرح چھیدتا ہوا آگے بڑھ رہا
جیسے پانی میں کوئی چیز گر پڑی ہو اور وہ
، چاقو کی نوک سے اٹھانا چاہتا ہو۔ پانی
ر بہت تھا اس وجہ سے میں یہ نہ پوچھ سکا
ہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

جب ہم اتار کے علاقے کے آخری حصے
گئے تو کومے دادا نے چاقو والا ہاتھ اوپر
ا۔ چاقو کی نوک میں ایک عجیب طرح
ل اور چپٹی سی مچھلی ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کا
ہلکا گلابی تھا۔ مگر شیشے کی طرح صاف
چمک دار۔ اس کی پتلی اور لمبی دم بچھو کے

ڈنک کی طرح تھی اور مڑی ہوئی تھی۔ مچھلی بالکل
ساکت تھی۔ مگر اس کی دُم جلدی جلدی اِدھر
اُدھر چل رہی تھی، جیسے اپنے پکڑنے والے کو
ڈنک مارنا چاہتی ہو۔ جب پانی کا شور ذرا کم
ہوا تو میں نے پوچھا یہ مچھلی کیسی ہے؟ اس نے
بتایا کہ اس مچھلی کا نام "رے" ہے۔ یہ اتھلے پانی
کی تہہ میں، ریت یا کیچڑ میں
دُبکی پڑی رہتی



ہے یا پھر خاموشی
سے پانی کے اندر تیرتی رہتی ہے۔
اپنے شفاف جسم کی وجہ سے آسانی سے نظر نہیں
آتی اور جب کسی آدمی یا جانور کا پیر اس پر پڑ
جاتا ہے تو ڈنک مار دیتی ہے۔ بڑی جلن ہوتی
اس کے ڈنک لگنے سے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔
اس وجہ سے کومے دادا اپنا چاقو پانی میں چھیدتا
ہوا آگے بڑھ رہا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہم میں
سے کسی نہ کسی کا پیر اس پر ضرور پڑ جاتا۔

اب ہم دریا کے اتار کے علاقے سے آگے
نکل چکے تھے۔ پانی کا بہاؤ بھی ہلکا پڑ گیا تھا۔
ہم دونوں کشتی پر پھر سوار ہو گئے اور اپنے

کیمپ کی طرف بڑھنے لگے۔ تقریباً ۲ گھنٹے بعد ہمیں اپنا جہاز دکھائی دیا۔ وہ اب بھی جھکا ہوا کھڑا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور سورج ٹھیک ہمارے سر پر چمک رہا تھا۔

ہمارے ساتھیوں نے ہمیں دیکھ لیا اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے جب ہم کنارے پر اترے اور ہمارے ساتھیوں نے اتنی بہت سی مچھلیاں دیکھیں تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ سب نے مل کر کومے داد آ زندہ باد کا نعرہ لگایا اور جلدی جلدی کشتی سے مچھلیاں اتارنے لگے۔ سب ملا کر ۱۶ مچھلیاں تھیں۔ ہم سب ہی بری طرح بھوکے تھے۔ اس لیے بغیر کسی انتظار کے مچھلیاں صاف کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ جب تک مچھلیاں صاف ہوں کومے داد آ نے لکڑی کی لمبی لمبی سیخیں تیار کریں اور مچھلیوں کے ٹکڑوں کو سیخوں پر لگا کر آگ پر بھننے کے لیے لگا دیا۔ سب لوگ آگ کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ اور میں مزے لے لے کر آج کے شکار کا دلچسپ حال سنانے لگا۔ جب میں اپنا قصہ ختم کر چکا تو جہاز کا کپتان جو فکر مند بیٹھا تھا بولا:—

"اگر ہم کسی طرح جہاز کو گھسیٹ کر کنارے پر لا سکیں تو مرمت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ گھسیٹنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لمبا اور مضبوط رسا نہیں ہے۔ زیادہ نہیں بس ۲۰ گز لمبا رسا ہو تو کام بن جائے۔"

کومے داد آ مچھلی کی سیخوں کو آگ پر الٹ پلٹ کرتے ہوئے ہماری باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب کپتان اپنی بات پوری کر چکا تو کومے داد آ بولا:۔

"فکر نہ کرو رسا بھی مل جائے گا اس وقت تو پیٹ کی آگ بجھانے کی بات کرو۔ پہلے کھانا کھا لیں پھر رسی بھی بنا لیں گے۔"

"کیسے بنا لیں گے؟ ہمارے پاس تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس سے رسی بنائی جا سکے۔" کپتان نے کہا۔

"کہہ تو دیا کہ پہلے کھانا کھا لیں پھر رسی بھی مل جائے گی۔" کومے داد آ نے قدرے جھلا کر کہا۔

کومے داد آ اپنی بات پورے بھروسے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں ہم میں سے کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

کوے دادا تھوڑے وقفے کے بعد بولا:

"اس جنگل میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی آدمی کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ضرورت ہے صرف واقفیت اور جستجو کی۔"

اس وقت تک مچھلیاں بھُن کر تیار ہو گئی تھیں۔ سب نے پیٹ بھر کر کھائیں پھر بھی بہت سی بچ رہیں۔ انھیں پتوں میں لپیٹ کر رات کے لیے رکھ دیا گیا۔ کھانے کے بعد کپتان نے ہمارے سامنے ایک تجویز رکھتے ہوئے کہا: "اس لڑکے نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا ہے اور ہماری بڑی مدد کی ہے اس لیے معاوضہ ضرور دینا چاہیے۔"

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

"بیٹا تم نے ہماری مدد کی ہے۔ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ اس کے بدلے میں ہم بھی تمھیں کچھ دیں۔ بتاؤ کتنا روپیہ؟" کپتان نے کوے دادا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کپتان کی یہ بات سن کر کوے دادا چونک سا گیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کپتان کی یہ بات اس کو ناگوار گزری ہے۔ اس نے بڑے تحمل اور بردباری کے ساتھ بہت نرم لہجے میں جواب دیا:

"آپ لوگ مصیبت میں گھر گئے تھے۔ کوے دادا نے آپ کی مدد کی۔ اس مدد کے بدلے میں کوے دادا کو کچھ نہیں چاہیے۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز جنگل مہیا کر دیتا ہے۔ کوے دادا کے لیے روپیہ پیسہ بے کار ہے۔"

کوے دادا کے اس سیدھے سادے جواب نے ہمیں لاجواب کر دیا۔ اس کی عزت اور وقعت ہمارے دلوں میں اور زیادہ ہو گئی۔ بے غرض اور بے لوث خدمت کی ایسی مثال مہذب دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک بہت ہی عمر رسیدہ اور خاموش بزرگ تھے وہ بولے کہ گو لڑکے کا جواب معقول ہے مگر پھر بھی ہمیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ سب لوگ تھوڑی تھوڑی رقم پیش کریں اور چلتے وقت یہ رقم ایک تھیلی میں رکھ کر لڑکے کو دے دی جائے تو بہت مناسب ہوگا۔

لوگوں کو یہ بات بہت اچھی لگی۔ ایک خاتون نے رقم اکٹھا کرنے کی ذمے داری بھی لے لی۔ اور اسی وقت اپنا کام شروع کر دیا۔

کوے واوا کو ہمارے اس منصوبے کا کوئی علم نہ تھا۔ اس کے بعد سب لوگ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

کپتان کو تو جہاز کو کنارے تک لانے کی اور پھر اس کی مرمت کی پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد کوے واوا سے کہنے لگا۔

"تم نے کہا تھا کہ رسّی مل جائے گی بتاؤ کہاں ہے؟"

"رسّی جنگل میں ہے چلو میں دکھا دوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ہم سب کو پیچھے آنے کا اشارہ کرکے جنگل کی طرف چل پڑا۔ عورتوں اور کچھ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوڑ کر باقی ہم سب اس کے پیچھے ایک جلوس کی شکل میں چل دیے پچاس، ساٹھ قدم چلنے کے بعد ہم گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ کوے واوا رک رک ادھر اُدھر نظر دوڑاتا رہا اور پھر ناریل کے درخت سے ملتے جلتے ایک پیڑ کے پاس جاکر رک گیا۔ یہ درخت کچھ زیادہ اونچا نہ تھا۔ اس کے پتے لمبوترے پنکھوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کوے واوا نے ایک پتے کی نوک کو اپنی انگلیوں میں لپیٹ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پتے میں سے بہت سے لمبے لمبے باریک ریشے کھنچ کر باہر آ گئے۔

"لیجیے یہ رہی! اسی کی تو آپ کو ضرورت ہے نا؟" کوے واوا نے ریشوں کو ہمارے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

ہم سمجھے کہ کوے واوا ہمارا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اس نے ہماری صورت دیکھ کر ہمارے دل کی بات تاڑ لی۔ مسکرا کر بولا۔

"آپ اسے دل لگی نہ سمجھیں۔ یہ رسّی ہی ہے دیکھیے اس طرح ——"

محترمہ اُودے لکشمی ماتھر (حیدر آباد)

امر جواہر



دہلی کی وسیع سڑکوں پر اُداسی برس رہی تھی — ! جانے کیوں قدرت بھی آج کسی گہری سوچ میں تھی — ! لوگ گھروں سے باہر نکل رہے تھے — بچے سہمے ہوئے تھے — جوان ہونٹ کاٹ رہے تھے — اور بوڑھوں کی آنکھیں نم تھیں — ! سب ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے — دھیرے سے — مایوس کن الفاظ میں — لیکن یقین کرنے کو جیسے کوئی تیار ہی نہ تھا — ایسا نہیں ہو سکتا — کبھی نہیں ہو سکتا — !' سب ایک ہی طرف کو بڑھ رہے تھے جیسے آج سب کی منزل ایک ہو گئی تھی — !

آئیے ہم بھی دیکھیں — آج یہ کیا ہو گیا ہے ان سب کو — ؟ اوہ یہ تو تین مورتی طرف — نہرو کے نواس استھان کی اور جا رہے ہیں — ارے یہ ترنگا کس نے گرا دیا — یہ سسکیوں کی آواز کیسی آ رہی ہے — ؟ ایک بھولے بھالے بچے نے اپنے باپ کا کُرتا پکڑ کر کھینچا ' بابا ! کیا ہو گیا چاچا نہرو کو ؟'

' وہ بھگوان کے پاس چلے گئے ہیں بیٹا ۔'

' پھر اب وہ واپس کب آئیں گے — ؟ بہت دنوں بعد آئیں گے کیا — ؟ '

' ہاں ! وہ ہم میں پھر آ ملیں گے ، ضرور

آملیں گے ــــ وہ ہم سے دور نہیں رہ سکتے۔
گلا بھر آیا اور اُس نے کس کر مٹھیاں
بھینچ لیں ــــ !!

جھوٹ ــــ !ایک دم جھوٹ ــــ
بھارت کا جواہر بھارت سے جُدا نہیں ہوسکتا
ــــ !کوئی دیوانہ وار بڑ بڑاے جارہا تھا۔!!
یہاں کچھ ننھے منے کُھسر پُھسر کر رہے
ہیں آیئے سُنیں یہ جواہر کے لاڈلے کیا کہہ
رہے ہیں ــــ ’چاچا نہرو آج بھگوان کے
پاس چلے گئے ــــ‘ پھر کب تک لوٹیں گے
ــــ ؟‘ ’تو تو پاگل ہے ماں کہتی ہے جو بھگوان
کے پاس جاتا ہے وہ پھر کبھی نہیں آتا ــــ !!
میرے بابا کو دیکھو ــ ابھی تک نہیں آئے۔
ــــ !‘ اور تم تو پورے بدھو ہو ــ !چاچا نہرو
کی بات ہی اور ہے ــــ وہ تو اتنے مہان
ہیں کہ کبھی مر ہی نہیں سکتے ــــ !! وہ باپو سے
ملنے گئے ہیں ــ سمجھے ــــ ؟ اور اب ۱۵ اگست
کو واپس آئیں گے ــــ‘ ’لیکن اگست تو ابھی
بہت دُور ہے اتنے دن وہاں کیا کریں گے۔؟‘
ــــ ’جانتے نہیں بھگوان کتنی دُور رہتے ہیں
ــــ ؟ اور جب وہ واپس آئیں گے تو بہت

ساری مٹھیاں لائیں گے ــــ‘ ہاں !! اور کیا۔؟
سب سے ننھے نے اپنے ساتھی کے کان میں
رازدارانہ لیکن فخریہ لہجے میں کہا ــــ میں
نے ایک گلاب کا پودا لگایا ہے ــــ تب
تک تو اس میں بہت سے پھول آجائیں گے۔
اب کی دفعہ چاچا نہرو کی شیروانی میں میں پھول
لگاؤں گا دیکھ لینا ــ آنے تو دو ــــ !‘
کاش سچ مچ ایسا ہوسکتا ــــ !کاش
بچوں کو ان کا چاچا نہرو پھر واپس مل سکتا۔!!
پھر اسی طرح مٹھائیاں بانٹنے ــــ اُسی طرح
پیار کرنے ــــ

یوں تو انسان پیدا ہوتا ہے مرنے کے
لیے ــــ لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے یہ موت
نہ آتی تو اچھا تھا !! سب کی طرح بھگوان نے
نہرو کی پیدائش کے دن ہی ان کی موت
کا بھی دن مقرر کر دیا تھا ــــ ہم جانتے
تھے ایک دن انھیں بھی جانا ہے ــــ
لیکن یہ کسے خبر تھی کہ جس نیا کو ملاح نے بڑے
بڑے طوفانوں سے بچایا تھا ــــ اُسے ایک
دن یوں اچانک بیچ بھنور میں ہچکولے کھاتے
چھوڑ کر چلا جائے گا ــــ ؟ اس سے تو بہتر تھا

کہ اُس نے ہمیں سہارا ہی نہ دیا ہوتا ——!
یوں خلوص سے ڈھارس نہ بندھائی ہوتی۔
جسے دیکھ بھارت ماتا بے خوف ہو جایا
کرتی تھی —— وہ لال آج اس کی گود سونی
کر گیا —— ! وہ خود بھی تو ماں کی ٹھنڈی
گود سے نکلنا نہ چاہتا تھا — اُسے پورا
یقین تھا کچھ دیر اور وہ بھارت کا سہارا بنا
رہے گا — بھارت نے اسے سہارا دیا تھا اور اس نے
کو —!! اور دونوں ایک ہو گئے تھے — !لیکن ظالم موت کو
اس کی یہ بات پسند نہ آئی —— ! اُسے یہ کب گوارا تھا کہ
کوئی اسے اسی طرح بھولا رہے —!

دوسرے دن بادلوں کا سینہ چیر کر
سورج اپنی پوری آب و تاب سے نکل آیا
تھا —— اُسے بھی تو اس مہان آتما کے
آخری درشن کرنے تھے —— ! بھارت ہی
نہیں دنیا غم کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی
تھی ! بھارت کی تو وہ زندگی تھے —— جان
تھے —— ان کی موجودگی کے احساس ہی
سے دل کو ایک اطمینان ہو جاتا تھا —!!
ایک شان کے ساتھ اُس ہر دل عزیز
انسان نے اپنا آخری سفر شروع کیا ——
انسانوں کا دریا دہلی کی سڑکوں پر بہہ نکلا —!
جسے دیکھ کر موت بھی سہم گئی ہوگی —— ! کیا
ہوتا اگر وہ ان غم زدوں کے سامنے پڑ جاتی؟
اس کی دھجیاں اڑا دی جاتیں —— بوٹیاں
نوچ لی جاتیں —— !! تب ہی شاید اُسے
اپنی غلطی کا احساس ہوتا —— !

ہر آنکھ پُرنم تھی —— ! ہر دل رو رہا
تھا — ! کیا ہوگا اب —— ؟ اس نقصان
کی تلافی کیسے ہوگی ؟ بھارت کو جوآہر کے ہاتھوں
میں سونپ کر باپو کتنی بے فکری کی نیند سو گئے
تھے !! انھیں پورا پورا بھروسا تھا، جوآہر
کے ہاتھوں میں بھارت سُکھ سے رہے گا،
لیکن اُن کی آتما دیکھ رہی ہوگی —— ان کا
لاڈلا جوآہر اُن کے بھروسے کی لاج بھی نہ
رکھ سکا —— اور بھارت کو ایسے وقت
دغا دے گیا جبکہ قدم قدم پر اس کی ضرورت
تھی سخت ضرورت تھی —! اس نے کیا کیا —؟ کیا
نہیں کیا —؟ میں کچھ نہیں جانتی —! میرا دل صرف اتنا
کہتا ہے اسے ابھی نہیں مرنا چاہیے تھا — نہیں مرنا چاہیے تھا!!
پھر بھی وہ مر گیا —— ! کیوں مر گیا ——؟
کیوں اس نے زندگی کے لیے جد و جہد نہیں

کی؟ کیوں موت کے آگے ہتھیار ڈال دیے ــــــ؟ اس نے تو کسی سے ہار نہیں مانی تھی ــــــ آسمان کی بلندیوں کو بھی زمین پر جُھکایا تھا ــــــ!! کاش ــــــ! وہ سب کی طرح یوں موت کے ہاتھوں بے بس نہ ہو گیا ہوتا ــــــ!

جسے کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔ اس کے لیے دل میں اتنے عقیدت کے جذبات چھپے ہوئے ہیں ــــــ اس کی مجھے خبر نہ تھی ــــــ! جواہر جہاں بھی ہے ــــــ جیسا بھی ہے ــــــ ہمارا ہے اور ہماری بھلائی کے کام میں مصروف ہے ــــــ! دل کو اتنا یقین کافی تھا ــــــ! کوئی فکر نہیں تھی ــــــ کوئی چنتا نہیں تھی ــــــ جیسے ہی سُنا جواہر دنیا میں نہیں رہا ــــــ ایسا لگا کہ آسمان پھٹ پڑا ہے ــــــ! زمین کی گردش رک گئی ہے ــــــ! اور دنیا تاریکی کے گہرے غار میں جا گری ہے ــــــ!! اور تب ہی پتہ چلا وہ دل کے کتنے قریب تھا ــــــ! مر کر تو اور بھی قریب چلا آیا ــــــ! اس کی جدائی کے احساس نے دل میں خلوص و محبت کے ہزاروں دیپ جلا دیے ــــــ!!

دن بیتتے جائیں گے، رک رک کر دھیرے دھیرے ــــــ! وہ پندرہ اگست بھی آئے گا جس کے لیے جواہر نے بے شمار قربانیاں دیں ــــــ! ترنگا پھر اسی شان سے لہرائے گا ــــــ لیکن ترنگے کا محافظ ہمیشہ کی طرح خوشیاں منانے ہمارے بیچ نہ ہوگا ــــــ! اس کی آتما ضرور جنت میں بیٹھی ایک تماشائی کی طرح مسکرا رہی ہوگی ــــــ!!

پھر وہ مبارک دن چودہ نومبر بھی آئے گا جب بھارت کی کوکھ سے جواہر جیسا بیٹا پیدا ہوا ــــــ! وہ اَن مِٹ دن جو تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جا چکا ہے ــــــ! چودہ نومبر ــــــ ستائیس مئی دونوں کبھی بُھلائے نہ جا سکیں گے ــــــ!!

پھر آئے گا ۲۶ جنوری ــــــ لیکن جواہر کی آواز نہ ہمیں ایکتا کا سبق دے گی ــــــ نہ امن کا راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دے گی ــــــ! اور نہ سچائی کو اپنانے کا حکم دے گی ــــــ!!

کس نے سوچا تھا یہ دن بھی بنا جواہر کے آئیں گے ——؟ دن —— جو اس کی ذات سے وابستہ ہو گئے تھے —— ! کون یقین کرے گا ——؟ کس کو یقین آئے گا —— !! جانے کیا بیتے گی دیس کے بچوں پر —— ! انھیں چاچا نہرو کے مضبوط ہاتھ اب پیار سے کبھی نہیں بھینچیں گے —— کبھی ان کے ننھے ننھے ہاتھوں سے مسکراتے ہوئے گلاب کا تحفہ نہیں قبول کریں گے ——!!

اُس کی آواز ڈوب گئی لیکن گونج کانوں سے ٹکراتی رہے گی —— ! اس کی روشنی ہزاروں کو سچائی اور ایمان کی راہ دکھائے گی —— ! اس کی آواز ہزاروں گم راہوں کو ان کی منزل کا پتہ دیتی رہے گی ——!!

جواہر ہم سے دور نہیں ہوا بلکہ اور قریب آگیا ! وہ امن اور شانتی کا دیوتا تھا —— ! وہ بھارت کا پجاری تھا —— ! ایسا پجاری جس پر دیوتا بھی فخر کرے ! وہ بھارت کے لیے پیدا ہوا ! بھارت کے لیے جیا —— ! اور بھارت ہی کے لیے مر گیا ——!! بھارت کی مٹی سے بنا ہوا اس کا جسم بھارت کی مٹی میں مل گیا —— ! وہ مٹا نہیں —— امر ہو گیا —— !! پھولوں میں خوشبو بن کر سما گیا —— ! چشموں میں گنگناہٹ بن کر چھپ گیا —— ! کھیتوں میں ہریالی بن کر کھل گیا —— ! زمین میں زرخیزی بن کر گھل گیا —— ! جواہر بھارت میں بکھر گیا !! ذرے ذرے میں اس کا عکس نمایاں ہو گیا ——!!

ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے —— ! اس کے بتائے راستے کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے —— ! اس کے اصول ہمارا قانون ہے —— ! اس کی آرزوئیں ہمارا ایمان —— ! اس کی خواہش ہمارا فرض ——!!

اس کی یاد باقی رہے گی اور تب تک باقی رہے گی —— جب تک سورج میں حرارت ہے —— چاند میں چمک ہے —— پھول میں خوشبو ہے —— بجلی میں تڑپ ہے —— اور —— اور انسان کے سینے میں دل ہے ——!!

—— جے ہند ——

جناب مفتوںؔ کوٹوی

چاچا نہرو، چاچا نہرو

دیس کا نیتا، پیارا نیتا — سچّا نیتا، اچھا نیتا
باتیں سوجھ، سمجھ کی اس کی — فطرت پیار بھری تھی اس کی
تھا وہ رہبر آزادی کا — دیس کا لیڈر آزادی کا
مال اور دولت، ساز اور ساماں — دیس پہ صدقے، دیس پہ قرباں
علم و دانش کا وہ پُتلا — رحم و نوازش کا وہ پُتلا
غیر کے آگے کوہِ ہمالہ — دوست کے حق میں مثلِ لالہ
دُھن کا پکّا، قول کا سچّا — حوصلے والا، ہمّت والا
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی — اہلِ وطن سب بھائی بھائی
اس کی نظر میں سارے برابر — غوث محمّد، رام منوہر
پھول کی فطرت، اس کی فطرت — پیاری صورت، پیاری سیرت
رنگیں اس کی زیست کے پہلو — ذکر اسی کا ہر جا، ہر سو
مردِ دل کش، مردِ دلجو — پھول کی رنگت، پھول کی خوشبو

چاچا نہرو، چاچا نہرو

پھول کی رنگت، پیاری پیاری — پھول کی خوشبو، کیاری کیاری
پھول چمن کی زیب و زینت — پھول کی نکہت، وجہِ مسرّت
پھول سے گلشن مہکا مہکا — دہکا دہکا، لہکا لہکا
پھول میں کانٹے، پھول میں نزہت — پہلے مصیبت، بعد میں راحت
چھپ نہیں سکتی پھول کی خوشبو — پھیل کے رہتی ہے وہ ہر سو

نہرو، نیتا تھے جو وطن کے
پھول سا ان کا رنگیں چہرہ
سیرت ان کی، پھول کی نکہت
پہلے چبھے ہیں خارِ غلامی
دیس اٹھایا اونچا اس نے
ہر اک مستِ ذکرِ نہرو
مردِ خوش دل، مردِ خوش رو

پھول بھی تھے وہ اپنے چمن کے
ہنستا، کھلتا، رنگیں چہرہ
دیس میں جس سے کیفِ عشرت
آزادی پھر بعد میں پائی
رنگ جمایا کیسا اس نے
جیسے گل کی خوشبو ہر سو
پھول کی رنگت، پھول کی خوشبو

چاچا نہرو، چاچا نہرو

پھول ہمیشہ بھایا اس کو
نہرو جب بھی ہم سے ملے ہیں
سینے پر اک پھول کھلا ہے
چھوٹے بچّے، پیارے پیارے
بچّے کیا ہیں؟ پھول ہیں گویا
جنم دِوَس جب اپنا آیا
بچوں کو دی پیار کی نعمت
قول تھا ــــ اب معمار یہی ہیں
دیس کی قسمت ان کے ہاتھوں
ان میں آزاد، ان میں راجن
گاندھی، ذاکر، آصف، نہرو
مبنی ان پر دیس کی ما ہو

پھول لگائے پایا اس کو
پیشِ نظر دو پھول کھلے ہیں
سامنے چہرہ ہنستا ہوا ہے
نہرو کے سب راج دُلارے
نہرو ان کے پیارے چاچا
بچوں ہی کے نام منایا
اپنی شفقت، اپنی محبت
دیس کے کھیون ہار یہی ہیں
دیس کی عظمت ان کے ہاتھوں
ان سے پھولے پھلے گا گلشن
رامو، چھوٹو، عیدو، گنگو
پھول کی رنگت، پھول کی خوشبو

چاچا نہرو، چاچا نہرو



بھارت درشن

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

تاج محل

شاہ جہاں مغلیہ خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا جو "معمار بادشاہ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ شاہ جہاں کو نئے نئے شہر آباد کرنے اور بڑی بڑی خوب صورت عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنے راج میں آگرہ، دہلی، لاہور اور کشمیر میں ایسی ایسی خوب صورت عمارتیں بنوائیں اور ایسے خوشنما باغات لگوائے کہ ان کو دیکھنے کے لیے آج بھی دور دور سے لوگ ہمارے ملک میں آتے ہیں، دیکھتے ہیں اور شاہ جہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر سر دھنتے ہیں۔ ہم آج آپ کو آگرہ کا تاج محل دکھانا چاہتے ہیں جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیوی ارجمند بانو بیگم کی یاد میں بنوایا تھا۔

شاہ جہاں کی شادی ارجمند بانو بیگم سے ۱۶۱۲ء میں ہوئی تھی۔ وہ نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی تھی۔ قدرت نے ارجمند کو صورت ہی نہیں سیرت بھی اچھی دی تھی وہ بہت پڑھی لکھی، سلیقہ والی اور وفادار عورت تھی۔ شاہ جہاں کو شروع ہی سے ارجمند بانو سے بڑا لگاؤ تھا۔ محل تو محل جنگ کے میدان میں بھی شاہ جہاں اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا اور حکومت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں اس سے مشورہ بھی کرتا تھا۔ ۱۶۲۷ء میں اپنے باپ جہانگیر کے مرنے کے بعد جب شاہ جہاں بادشاہ بنا تو اس

نے اپنی بیوی ارجمند بانو بیگم کو "ممتاز محل" کا خطاب عطا کیا۔

ممتاز محل سے شاہ جہاں کے یہاں چودہ[۱۴] بچے پیدا ہوئے۔ ۱۶۲۹ء میں شاہ جہاں کو ایک باغی امیر کو سزا دینے کے لیے برہان پور کا سفر کرنا پڑا۔ ارجمند بانو بھی شاہ جہاں کے ساتھ تھی۔ اسی زمانے میں اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ مگر خود کچھ ایسی بیمار پڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ بادشاہ نے علاج کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر ملکہ کی طبیعت ٹھیک نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں کہ جب ملکہ کا آخری وقت آیا تو ممتاز محل نے بادشاہ سے دو باتوں کی فرمائش کی۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ اس کے مرنے کے بعد دوبارہ شادی نہ کرے تاکہ وہ اس کی اولاد کی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال کر سکے۔ دوسرے اس کی یاد میں ایک ایسا مقبرہ بنوائے جس کی نظیر دنیا میں نہ مل سکے۔

ارجمند بانو کی موت کا شاہ جہاں پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ ہفتوں اور مہینوں وہ تنہائی میں ملکہ کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔ ملکہ کو تو اس نے برہان پور کے ایک باغ میں عارضی طور پر دفن کر دیا لیکن خود ملکہ کی وصیت کو پورا کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ آخر چھ ماہ کے بعد ملکہ کی لاش کو برہان پور سے آگرہ لایا گیا اور دریائے جمنا کے کنارے ایک باغ میں دفن کر دیا گیا اور بہت جلد ہی وہاں وہ خوب صورت عمارت بننا شروع ہو گئی جو بعد میں تاج محل کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی۔

شاہ جہاں نے تاج محل بنانے کا کام ۱۶۳۱ء میں شروع کیا لیکن اس سے پہلے اس نے دور دور کے ملکوں سے بڑے بڑے معماروں اور فن کاروں کو تاج محل کا نقشہ بنانے کے لیے آگرہ طلب کیا۔ سینکڑوں نقشے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے لیکن ان میں سے اچھا نقشہ ترکی کے استاد محمد عیسیٰ آفندی کا نکلا۔ چنانچہ شاہ جہاں کے حکم سے اس نقشے کے مطابق لکڑی کا ایک چھوٹا سا نمونہ تیار کیا گیا اور بادشاہ نے آفندی اور محمد شریف سمرقندی کو اس نمونے کے مطابق تاج محل بنانے پر مقرر کر دیا۔ ہندوستانی فن کاروں کے علاوہ شیراز، بلخ، بخارا، سمرقند، ترکی اور عرب کے اور بھی بہت سے کاریگر تاج محل کے بنانے

میں مدد کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی کاریگروں اور مزدوروں سب کو ملا کر لگ بھگ بیس ہزار آدمی دنیا کی اس خوب صورت عمارت کو جنم دینے میں لگے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کوئی بیس سال تک یہ بیس ہزار آدمی تاج محل کے بنانے میں مصروف رہے تب جا کر یہ مقبرہ مکمل ہو سکا۔ ملک کے بڑے بڑے امیروں، نوابوں، راجوں، مہاراجوں نے بادشاہ کی خدمت میں پچی کاری کے لیے قیمتی پتھر نذر کے طور پر پیش کیے کسی نے سنگ مرمر کا انتظام کیا تو کسی نے سُرخ پتھر کی سلیں آگرہ بھجوا دیں پھر بھی ان تحفوں کو چھوڑ کر کروڑوں روپیہ اس زمانے کے لحاظ سے اس عمارت پر خرچ ہوا۔

تاج محل کی عمارت دریائے جمنا کے جنوبی کنارے ایک بہت بڑے باغ میں ہے۔ باغ کے اردگرد ایک چار دیواری ہے اور اس میں داخل ہونے کے لیے ۱۰۰ فٹ اونچا ایک دروازہ ہے جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ صدر دروازے پر رنگ برنگ کی پچی کاری ہے اور اس کی محراب پر قرآنی آیتوں کی لکھائی کچھ ایسے کمال سے کی گئی ہے کہ ہر حرف جتنا بڑا نیچے سے نظر آتا ہے اتنا ہی بڑا اسّی فٹ کی اونچائی پر بھی نظر آتا ہے۔

صدر دروازے سے نکلتے ہی نگاہ کے سامنے طرح طرح کے ہرے بھرے درخت نظر آتے ہیں، ساتھ ہی دو نہریں بھی مقبرہ تک جاتی ہوئی نظر آتی ہیں جن میں فوارے لگے ہوئے ہیں۔ صدر دروازے اور روضے کے بیچ میں ایک حوض ہے جس میں نہایت صاف پانی بھرا رہتا ہے اور رنگ برنگ کی مچھلیاں اس میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس حوض میں بھی ایک بڑا فوارہ اور چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے فوارے ہیں۔ اس حوض سے تاج محل تک پہنچنے کے لیے کوئی ۳۸۴ فٹ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ سامنے ہی سرخ پتھر کا ایک لمبا چوڑا چبوترہ ہے جو باغ کی سطح سے ۴ فٹ اور جمنا کے کنارے سے کوئی ۸۲ فٹ اونچا ہے اس چبوترے کے بیچ میں سنگ مرمر کا ۲۰۰ فٹ لمبا اور بیس فٹ اونچا ایک اور چبوترہ ہے جس پر اصل روضہ بنا ہے۔

روضے کے دائیں اور بائیں طرف دو عمارتیں اور ہیں یعنی پچھم کی جانب مسجد تو پورب کی جانب

اس کا جواب تسبیح خانہ جسے جماعت خانہ بھی کہتے ہیں ۔ روضے کے چاروں طرف جو چار مینار ہیں ان کی موجودگی نے عمارت کو چار چاند لگا دیے ہیں ۔ یہ مینار کوئی ۱۶۲ فٹ اونچے ہیں اور ان پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہیں ۔ روضے کے درمیان بڑے گنبد کے کلس کی چوٹی باغ کی سطح سے کوئی ۲۴۴ فٹ بلند ہے یعنی قطب مینار دہلی سے بھی پانچ فٹ زیادہ بلند ہے ۔

آئیے اب روضے کے اندر چلیں ۔ ذرا صدر دروازے پر لکھے ہوئے کتبوں پر نظر ڈالیے! یہ کتبے امانت خاں شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں ۔ روضے کے اندر آٹھ پہل ۔ چوکور کمرے ہیں جن میں سنگ تراشی اور پچی کاری کے کمالات دکھائے گئے ہیں ۔ درمیانی کمرے میں جہاں ممتاز محل اور شاہ جہاں دفن ہیں سنگ مرمر کی جالیوں کا ایک آٹھ پہل کٹہرا ہے ۔ یہاں جو سنگ مرمر کام میں لایا گیا ہے وہ بے حد نفیس اور قیمتی ہے ۔ یہاں کی پچی کاری بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ ایک ایک پھول میں سینکڑوں قسم کے مختلف قیمتی اور خوش رنگ پتھروں کے جوڑ دیے گئے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ جوڑ کہیں معلوم نہیں دیتا ۔ ملکہ اور بادشاہ کی قبروں پر خدا کے نام اور عربی عبارت لکھی ہوئی ہے ۔

چھت کے اوپر ایک عظیم الشان خوبصورت گنبد ہے ۔ گنبد پر بھی پچی کاری کی گئی ہے ۔ چھت کے چاروں کونوں پر چار گنبد اور ہیں آٹھ گلدستے بھی چھت پر لگائے گئے ہیں ۔ گنبد کا کلس پیتل کا بنا ہوا ہے یہ کوئی ½ ۳۰ فٹ لمبا ہے اور اسی کا وزن ۳۲ من ہے ۔

اگر آپ تاج محل دیکھنے جائیں تو آپ کو یہ دیکھ کر کسی قدر تعجب ہوگا کہ ملکہ کی قبر تو روضہ کے بیچوں بیچ میں ہے مگر شاہ جہاں کی قبر ایک طرف کو ہٹ کر بنائی گئی ہے ۔ اصل میں شاہ جہاں کا خیال تھا کہ وہ اپنے لیے تاج کے بالکل سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر ایک اور شاندار روضہ بنوائے گا اور ان دونوں مقبروں کو سنگ مرمر کا پل بنا کر آپس میں ملا دیا جائے گا تاکہ نیچے سے جمنا بہتی رہے اور لوگ ایک روضے سے دوسرے روضے تک آسانی سے جا سکیں ۔ اس مقصد کے لیے جمنا کے دوسرے کنارے پر بنیادیں

بھی پڑ چکی تھیں اس کے آثار اب تک باقی ہیں مگر اسی زمانے میں شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان تاج و تخت کے لیے لڑائی چھڑ گئی اور اس میں آخر کار کامیابی اورنگ زیب کی ہوئی۔ اورنگ زیب نے باپ کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور شاہ جہاں کا یہ خیال کہ اسے ایک الگ مقبرے میں دفن کیا جائے پورا نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کے بعد شاہ جہاں آٹھ سال تک اور زندہ رہا اور جب ۱۶۶۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو اورنگ زیب کی ہدایت کے مطابق اسے بھی روضہ تاج محل میں ممتاز محل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

کہتے ہیں جب شاہ جہاں آگرے کے قلعے میں نظر بند تھا تو اُس نے ثمن برج میں ایک ایسا نگینہ لگوایا تھا جس میں تاج محل کا عکس صاف نظر آتا تھا۔ بوڑھا بادشاہ اپنی وفادار بیٹی جہاں آرا بیگم کے ساتھ اس نگینہ کے ذریعہ تاج محل کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہ نگینہ آج بھی اُس مقام پر لگا ہوا ہے اگر آپ کبھی تاج محل دیکھنے جائیں تو آگرہ قلعہ کے ثمن برج میں لگے ہوئے اس نگینہ کو نہ بھولیے گا۔ ویسے کبھی تاج محل کو جائیے آپ صبح کے دھندلکے میں دیکھیں یا بھرپور سورج کی روشنی میں، جھٹ پٹے کے وقت دیکھیں یا چاندنی رات میں یہ آپ کو ہمیشہ اور ہر حال میں دلکش نظر آئے گا۔ اتنی بڑی عمارت ہوتے ہوئے بھی تاج محل میں وہ تناسب موجود ہے جو خوب صورتی کی جان ہے اور اس کو دیکھنے کے بعد انسان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔

جناب مقبول احمد سیوہاروی



شاہ و فقیر

دلّی بھی عجیب شہر ہے جب کبھی اس کا ذکر آ جاتا ہے رنگ رنگ کی تصویریں سامنے آ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے محلوں اور بازاروں کی تصویریں، بڑے بڑے اصطبل جن میں سیکڑوں گھوڑے بندھے ہوں، ہاتھی خانے جن میں کالے، لال اور سفید ہاتھی جھومتے ہوں، بڑے بڑے بادشاہ، جواہرات سے سجے ہوئے تخت، نقار خانے اور فوجیں، ایک سے بڑھ کر ایک شاعر ایک سے بڑھ کر ایک گانے والا خوشنویس اور کاریگر، سڑکوں پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ، اشرفیوں اور چاندی کے روپوں کی خیرات، بڑے بڑے قلعے اور بیگمات کی حویلیاں جن میں رنگ اچھلتے ہوں اور خوشی و شادمانی لہریں لیتی ہوں، بڑے بڑے درویش جن کی خانقاہوں میں ہزاروں آدمی کھانا کھاتے ہوں، زردہ، بریانی، مزعفر، شیرمال، باقرخانی، حلوے۔

جن کے پاس صبح شام خدا کے بندے دُعا کرانے جاتے ہوں۔ بادشاہوں میں کوئی رحم دل۔ کوئی ظالم، کوئی عبادت گزار، کوئی خدا سے بیزار۔

ان ہی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور فقیر کی یہ کہانی ہے۔ یہ بڑا بادشاہ تھا اس کا غصہ

اور جلال بھی بڑا تھا۔ فقیروں میں جس فقیر کی کہانی ہے۔ وہ بڑا عبادت گزار تھا جو کوئی اس کے پاس جاتا اسے اچھی باتیں بتاتا، کھانا کھلاتا۔ کسی کے پھٹے کپڑے دیکھتا تو نئے کپڑے پہناتا۔

بادشاہ کا نام محمد تغلق تھا۔ فقیر کا نام خواجہ نصیر الدین محمود تھا۔ جنھیں دلّی والے چراغ دہلی کہتے تھے۔

دلّی والے انھیں چراغ دہلی کیوں کہتے تھے؟

یہ بات بڑی انوکھی ہے۔ شاید تم جانتے ہوگے کہ دلّی میں ایک بستی نظام الدین کے نام سے مشہور ہے، یہ ہماری جامعہ سے کوئی پانچ میل اُتر کی طرف ہے۔ اس بستی میں ایک بڑے کامل بزرگ کی قبر ہے جن کا نام ہے خواجہ نظام الدین اولیا۔

اب سے چھ سو برس پہلے کا زمانہ تھا کہ خواجہ نظام الدین اولیا زندہ تھے اور خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں شہرت سن کر اودھ کے شہر فیض آباد (اجودھیا) سے آکر ان کے مرید ہو گئے تھے۔ ایک دن خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں کہیں دور سے کچھ درویش آئے، خواجہ نصیر الدین اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درویشوں کو دیکھا تو بیٹھے نہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیا نے بیٹھنے کے لیے فرمایا تو بولے میں اس ڈر سے نہیں بیٹھتا کہ میری پیٹھ درویشوں کی طرف ہو جائے گی اور یہ بے ادبی کی بات ہے۔

خواجہ نظام الدین نے مسکرا کر فرمایا ؎

چراغ کا منہ اور پیٹھ کہاں ہوتی ہے
وہ تو ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے

خواجہ نظام الدین کے فرماتے ہی خواجہ نصیر الدین کو ایسا لگا جیسے سامنے والے اور پیچھے والے سب نگاہ کے سامنے ہیں اور سچ مچ ان میں چراغ کی خاصیت آگئی ہے۔

اسی دن سے دنیا انھیں چراغ دہلی کہنے لگی اور جہاں ان کی قبر ہے اس بستی کا نام بھی چراغ دہلی ہے۔

یہ بات بیچ میں آگئی کہ انھیں چراغ دہلی کیوں کہتے ہیں اچھا، اب کہانی سنو۔

محمد تغلق کہا کرتا تھا کہ یہ درویش اور فقیر خانقاہوں میں بیٹھ کر مفت کی روٹیاں کھا

ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے انھیں اگر سزا دی جائے تو بری بات نہیں ہوگی مگر یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ بغیر کسی بہانے کے سزا دی جائے تو شہر کے ہندو مسلمان بگڑ جائیں گے۔

ایک دفعہ اس نے خواجہ نصیرالدین کو کھانے پر بلایا اور ایک ایسی ترکیب سوچی جس سے ستانے کا موقع مل جاتا۔ دعوت کا قبول کرنا سنت رسول اللہ ہے اس لیے خواجہ نصیرالدین بادشاہ کے بلانے پر آ گئے۔ دسترخوان پر چاندی سونے کے برتن جگ مگا رہے تھے اور ایک سے بڑھ کر ایک کھانا قابوں میں سجا ہوا تھا۔ خواجہ نصیرالدین نے "بسم اللہ" کہہ کر ایک قاب میں سے چاول اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی سے اٹھا کر منہ میں رکھ لیے یہ دیکھ کر محمد تغلق دم بخود رہ گیا، اس نے سوچا تھا کہ اگر خواجہ نصیرالدین نے سونے چاندی کی رکابی میں سے کھانا لے کر منہ میں رکھ لیا تو میں پوچھوں گا سونے چاندی کے برتن میں کھانا حرام ہے آپ نے اس برتن کا کھانا کیسے کھا لیا، اور پھر ان پر خوب سختی کروں گا۔ مگر خواجہ نصیرالدین نے بادشاہ کا منصوبہ سمجھ لیا اور ایسا توڑ کیا کہ بادشاہ بھی حیران رہ گیا اور ان کی بڑی عزت کی، پھر کہا مجھے نصیحت فرمایئے خواجہ نصیرالدین نے فرمایا انسانوں کو ستانے کے لیے حیلے بہانے ڈھونڈنا حیوانی خصلت ہے اس خصلت کو چھوڑ دینا چاہیے بادشاہ محمد تغلق پر ان کا اتنا اثر ہوا کہ کچھ نہ بول سکا اور بڑی عزت سے انھیں رخصت کر دیا، اور خواجہ نصیرالدین صحیح سلامت اپنی خانقاہ کو تشریف لے گئے، اب تم بتاؤ کہ یہ کہانی تمھیں پسند آئی یا نہیں۔



صبح دم کوّے دو بہم یک جا
فال ہے نیک دیکھنا ان کا

ایک مالک نے اپنے نوکر سے
یہ کہا، "کہنا مجھ سے گر دیکھے"

ایک دیوار پر جو دو کوّے
دیکھے نوکر نے ایک دن بیٹھے

پاس مالک کے وہ گیا دوڑا
"چلیے! کوّے ہیں دو مرے آقا"

اُڑ گیا ایک ان میں سے کوّا
رہ گیا بیٹھا دوسرا تنہا

اب تو مالک کو آ گیا غصّہ
اور نوکر کو خوب ہی پیٹا

پاس مالک کے دوست نے اُسکے
ٹھیک اُسی وقت کچھ روپے بھیجے

ہاتھ نوکر کے آ گیا شوشا
اپنے مالک سے یوں ہوا گویا

"دیکھنا آج ایک کوّے کا
راس آیا تمھیں، مرے آقا

دیکھتے میری طرح دو کوّے
پیٹھ پر پڑتے آپ کی کوڑے"

طلعت آرا (علی گڑھ)

بُری خبریں

افرادِ ڈرامہ:-

اسلم : ایک نوجوان ادیب
ایک پولیس کا سپاہی

مقام: دریا کا کنارا

(اسلم دریا کے کنارے کھڑا ہے قریب ہی زمین پر کچھ اخبار پڑے ہیں۔ وہ کوٹ اتار رہا ہے۔ اتنے میں سڑک سے ایک سپاہی اس کو دیکھ لیتا ہے)

سپاہی: (سڑک ہی سے پکار کر) وہاں کیا کر رہے ہو؟

اسلم : (زور سے) کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں کر رہا ہوں۔ (یہ کہہ کر جلدی جلدی کوٹ پہن لیتا ہے)

سپاہی : (قریب آکر) یہ کوٹ کیوں اتارا جا رہا تھا؟

اسلم : ایسے ہی ذرا گرمی لگ رہی تھی۔

سپاہی: گرمی... یہاں گرمی ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا بات ہے میں ایسی چالبازی میں نہیں آتا......

اسلم: (آہستہ سے) میں دریا میں کودنے والا تھا...

اسلم: (حیرت سے) کوئی خبر نہیں تھی!! اچھا
میں سناتا ہوں تمھیں اخبار.. (زمین
سے ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے)
عنقریب جنگ۔ کل بے حد بارش
سیکڑوں لوگ بے روزگار۔ ٹیکسی
دوکانوں کے اندر گھس گئی۔ پانچ دن
سے نیند نہیں آئی... دلّی میں ایک گھر
جل کر خاک ہوگیا... (سپاہی دوسرے
اخبار پر بیٹھ جاتا ہے) تین افراد گر گئے
کھڑکی کی سلاخ توڑ کر چور نکل بھاگے،
پہرے کی پولیس غائب تھی۔ (سپاہی
سر دوسری طرف موڑ لیتا ہے) ایک
آدمی بستر پر مردہ پایا گیا۔ اس کے
پاس ایک کوڑی نہ تھی.... ایک بچہ
جنگل کی آگ سے بچ گیا...

سپاہی: اس اخبار کو رکھ دو۔

(اسلم نے وہ اخبار رکھ دیا۔ مگر دوسرا
اٹھاکر پڑھنے لگتا ہے) ایک لڑکا
گھوڑے سے گر پڑا... لڑکی نے
اپنی دوست کو مار ڈالا... زہریلی دوا
سے کتا ہلاک ہوگیا.... بھائیوں بھائیوں
میں روپے کی خاطر ہمیشہ کی جدائی...

(سپاہی اخبار چھیننے کی کوشش کرتا
ہے مگر کامیاب نہیں ہوا) ٹیکس
اور بڑھ گئے.... موٹے آدمی کے
بیٹھنے سے کرسی ٹوٹ گئی... یکایک
شیشہ ٹوٹ جانے سے ڈاکٹر کا چہرہ
زخمی... بہت بڑا جہاز غرق آب ہوگیا..

سپاہی: بس.. بس.. یہ اخبار مجھے دو۔

(اسلم وہ اخبار سپاہی کو دے کر تیسرا
اٹھا لیتا ہے۔ اور پڑھتا ہے)

اسلم: مدراس کے قریب گاڑی کا حادثہ...
مسلح ڈاکو بنک میں... سمندر کی ساری
مچھلیاں مرگئیں... ہمیں رہنے کو گھر دو۔
کار سے ٹکرا کر ایک گائے مرگئی....
آپس کی مار پیٹ میں ایک فریق کا بازو
ٹوٹ گیا...

سپاہی: (غصے سے) بس بہت سُن چکا....
مجھے یہ اخبار بھی دو..

اسلم: کیوں، کیوں اخبار مانگ رہے ہو؟
کیا ان کی خبریں بہت پسند آئیں..
(پھر چوتھا اخبار اٹھاکر پڑھتا ہے)

سپاہی: ہونہہ.... تو میرا شبہ درست نکلا۔ ذرا پانی کی طرف دیکھنا... ڈر نہیں لگا...

اسلم: لگا کیوں نہیں۔

سپاہی: پھر — کیوں جان دینے کو تیار تھے؟

اسلم: (بکھرے ہوئے اخباروں میں سے ایک پر بیٹھ جاتا ہے) میں اب زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔ اب مرجانا ہی میرے حق میں اچھا ہے۔

سپاہی: پر ابھی تو تم بالکل نوجوان ہو۔ اتنی جلدی زندگی سے اکتا گئے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں خودکشی کرنا جرم ہے۔ کیا نام ہے تمھارا؟ میں ابھی تھانے لے چلوں گا... خودکشی کرنے کا جرم تم پر عاید ہوتا ہے۔

اسلم: میرا نام اسلم ہے۔ اور میں ایک ادیب ہوں۔

سپاہی: ادیب ہو؟ پھر کیوں دریا میں کود کر جان دینے پر تلے تھے؟

اسلم: میں نے بتایا تو... میں جینے سے عاجز ہوں، میں بدقسمت ہوں، مفلس ہوں۔

سپاہی: کیوں بدقسمت ہو؟ آخر کیا آفت اور مصیبت تم پر نازل ہوئی؟

اسلم: (سکون سے) کبھی اخبار پڑھتے ہو؟

سپاہی: اخبار کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔ اخبار پڑھنے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں؟

اسلم: اخبار میں آج تک کوئی اچھی خبر بھی تمھاری نظر پڑی۔ میں نے تو آج تک نہیں پڑھی۔ ہر شخص دنیا میں پریشان ہے۔ روز بری سے بری خبریں پڑھ لو۔ جب بھی اخبار کھولا۔ اور چند سطریں پڑھیں اور مارے رنج و غم کے نڈھال ہوگیا۔ اس سے متاثر ہو کر جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو میرے قلم سے اس سے بھی بڑھ کر المناک کتابیں اور مضامین نکلتے ہیں۔ پھر ان کو بازار میں کوئی نہیں پوچھتا۔ جب میری کتابیں نہیں بکیں گی تو پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اس لیے میں غریب ہوں۔ کوڑی کوڑی کے لیے دوسروں کا دست نگر ہوں۔

سپاہی: میں نے آج ایک اخبار پڑھا۔ مگر اس میں تو کوئی بری اطلاع نہیں تھی۔ اس میں سرے سے کوئی خبر تھی ہی نہیں۔

ایک لڑکا اچانک اندھا ہو گیا۔
ہوٹل کی کھڑکی سے کود کر ایک عورت
نے خودکشی کر لی (سپاہی اخبار چھیننے
کی ناکام کوشش کرتا ہے) رات کا
کھانا کھاتے ہی ایک آدمی مر گیا۔
(سپاہی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ
لیتا ہے)... چھ ہزار روپے کے نوٹ
جلا کر خاک کر دیے... چین کے دریا
میں زبردست طغیانی... عورت کا
پرس غائب کر لیا۔ گھوڑا مع تانگے
کے دریا میں کود گیا...
(سپاہی اخبار چھین لیتا ہے) میں یہ
بکواس نہیں سننا چاہتا۔

اسلم: کیا بات تم بہت رنجیدہ ہو گئے...
ہوں... اب آیا سمجھ میں کیوں اس
قدر مایوس و غمگین تھا۔ ایک آدمی
کس طرح زندہ رہنے کی خواہش
کر سکتا ہے جب کہ روز دنیا میں ایسے
المناک واقعات ہوتے ہوں۔ ایک
پر تم بیٹھے ہو اس میں بھی ایسی ہی
خبریں ہوں گی۔ تم مجھے تھانے لے

چلو۔ مگر یاد رکھو جب میں واپس آؤں
گا تو....

سپاہی: (افسردگی سے) مگر اب میں تمھیں تھانے
نہیں لے جاؤں گا... (یہ کہہ کر کھڑا
ہو جاتا ہے)

اسلم: اچھا... شکریہ... میں ذرا یہ اخبار
بھی پڑھ لوں جس پر تم بیٹھ گئے تھے
(وہ اخبار ہاتھ میں تھام لیتا ہے) لیکن
بھئی بیٹھو نا۔ تم کہاں چلے۔ تم بھی سنو..

سپاہی: بس اب میں بھی تمھارے ساتھ دریا
میں کود کر جان دے دوں گا..... کیا
کرنا ہے اس طرح زندہ رہ کر...

اسلم: واہ... واہ... خوب۔ مگر ذرا دیر
ٹھہرو۔ میں مرنے سے پہلے یہ اخبار
اور پڑھ لوں۔ پھر دونوں ساتھ
ہی ڈوبیں گے... (پڑھتا ہے) دو
بچوں کی لاش ایک آدمی کے تھیلے
میں.. (سپاہی دونوں کانوں پر ہاتھ
رکھے ایک دم دریا میں کود جاتا ہے)
(اسلم نیچے منہ کیے پڑھنے میں منہمک
ہے۔ وہ اس کو نہیں دیکھتا) میں ابھی چلوں

گا یار تمھارے ساتھ... تھوڑی دیر اور رک جاؤ.... مصنف کے لیے روپیہ: ہیں یہ کیا... ایک لاولد بوڑھا دولتمند اسلم صدیقی کے لیے سینکڑوں روپیہ چھوڑ کر مر گیا۔ ارے یہ کیا... سارا روپیہ میرے لیے.... یقین نہیں آتا.. ارے یار سنتے ہو.... (نگاہ اٹھاکر دیکھا تو سپاہی غائب تھا) خود بھی جھپٹ کر اٹھتا ہے۔ کہاں گیا یہ سپاہی ارے کہاں چلے گئے یار، بات تو سنو... اہوں.. ضرور دریا میں کود گیا ہے... ہائے بے چارا... یہ میں نے کیا کر دیا.... سنو.. سنو یار.... واپس آجاؤ... آج پہلی بار ایک اچھی خبر چھپی ہے.. لوٹ آؤ... (جواب نہ پاکر پانی میں کودتا ہے) (آوازیں برابر آرہی ہیں.. اسی کے ساتھ تیز تیز تیرنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے پھر گیلے گیلے اور بھاری قدموں کی آہٹ نزدیک آتی ہے۔ اسلم سپاہی کو دریا سے کھینچ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔)

سپاہی: باپ رے... بڑی سردی لگ رہی ہے برف کی طرح ٹھنڈا تھا پانی....

اسلم: خیر بھئی تمھاری جان بچ گئی۔ یہی غنیمت ہوا... لیکن تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا... بھلا کیوں تم نے پانی میں چھلانگ لگائی۔ دیکھو... دیکھو ذرا مجھے دیکھو... سارا پانی میں شرابور ہو گیا۔ کیسے پولیس کے آدمی ہو... قانون توڑتے ہو.... اب ذرا میرے ساتھ تم تھانے چلو... آئیے.... اٹھیے... چلیے... چلیے....

دونوں چلے جاتے ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

(انگریزی سے)





کالا پتھر

جناب قاضی محمد احمد جامعہ کالج

۳

کہتے ہیں کوئلے کا کھوج لگانے والی اور اسے ڈھونڈھ نکالنے والی سب سے پہلی قوم انگریز ہے۔ انگریز اب سے لگ بھگ دو ہزار سال پہلے اس قیمتی خزانے کا پتہ لگا چکے تھے۔ رومن قوم نے کوئلے کا استعمال ان ہی سے سیکھا۔ انگریزوں کی پرانی کتابوں میں کوئلے کا ذکر ملتا ہے۔ مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے لوگ بہت پرانے زمانے سے کوئلے سے واقف تھے اور اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ شروع شروع میں انگریز بھی اسے گھریلو کاموں میں استعمال کرتے تھے۔

کان کھودنے کا کام بھی سب سے پہلے انگلستان میں شروع ہوا۔ انگریز بادشاہ ہنری سوم نے ۱۲۵۹ء میں پہلی بار نیوکاسل کے لوگوں کو سرکاری فرمان کے ذریعے کوئلے کی کان کھودنے کی اجازت دی۔ لیکن اس اجازت کے ملنے پر بھی کوئلے کا رواج عام نہ ہو پایا۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ اس کا استعمال تندرستی کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں کوئلے کا کاروبار کرنے والے کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں بار بار کوئلے کے استعمال کی مخالفت ہوتی تھی اور کوئلے کے کاروبار پر ٹیکس لگایا جاتا تھا مقصد یہ تھا کہ اس کا استعمال عام نہ ہونے پائے اور لوگوں کی تندرستی اس کے برے اثر سے محفوظ رہے۔

اس شروع کے زمانے میں کوئلے کے مقبول نہ ہونے کے دو سبب اور بھی تھے۔

ایک تو یہ کہ زندگی بہت سادہ تھی۔ ضرورتیں بہت کم تھیں دوسرے لکڑی کی بہت افراط تھی اور آسانی سے مل جاتی تھی۔ ایندھن کے لیے جنگل سے لکڑی کاٹ کر لے آنا زیادہ آسان تھا اور کان کھود کر کوئلہ نکالنا اپنے کو جوکھم میں ڈالنا تھا۔

غرض وقت یوں ہی گزرتا گیا۔ دھیرے دھیرے جنگل صاف ہو گئے ان کی جگہ بڑے بڑے میدان بنتے گئے۔ ان میدانوں میں پہلے چھوٹی بستیاں آباد ہوئیں۔ یہ بستیاں بڑھتے بڑھتے گاؤں بنیں، گاؤں بڑھتے بڑھتے قصبے بنے اور قصبوں نے بڑھتے بڑھتے آخر بڑے بڑے شہروں کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف ان جنگلوں کے کٹنے سے لکڑی کی کمی پڑ گئی۔ پر اب کیا کیا جائے۔ کھانا تو پکانا تھا اور بنا ایندھن کھانا کیسے پکے۔ لوگوں کو یہ تو معلوم تھا کہ کھانا پکانے کے لیے کوئلہ بہت اچھا ایندھن بن سکتا ہے۔ بس اس کے دھوئیں سے گھبراتے تھے۔ پر اب ناچار اس کی طرف رخ کرنا پڑا۔

ہوتے ہوتے لندن شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ آبادی کے بڑھنے سے کوئلے کی مانگ بھی بہت تیزی سے بڑھ گئی۔ ۱۶۰۵ء میں تقریباً چار سو جہاز مختلف کانوں سے کوئلہ ڈھو کر لندن لانے لگے۔ ولیم سوم کے زمانے میں کوئلے پر سے ٹیکس بھی ختم کر دیا گیا۔

اٹھارہویں صدی کے بیچ میں کوئلے کی کھپت ایک دم بڑھ گئی۔ اس کی وجہ بھی سن لیجیے ایک تو کھانا پکانے میں کوئلے کا استعمال بہت بڑھ گیا۔ دوسرے بھاپ کا انجن ایجاد ہو گیا اور بھاپ کوئلے سے بنائی جانے لگی۔ تیسرے بہت سی مشینیں گیس کے ذریعے چلنے لگیں۔ یہ گیس بھی کوئلے ہی سے بنتی ہے۔

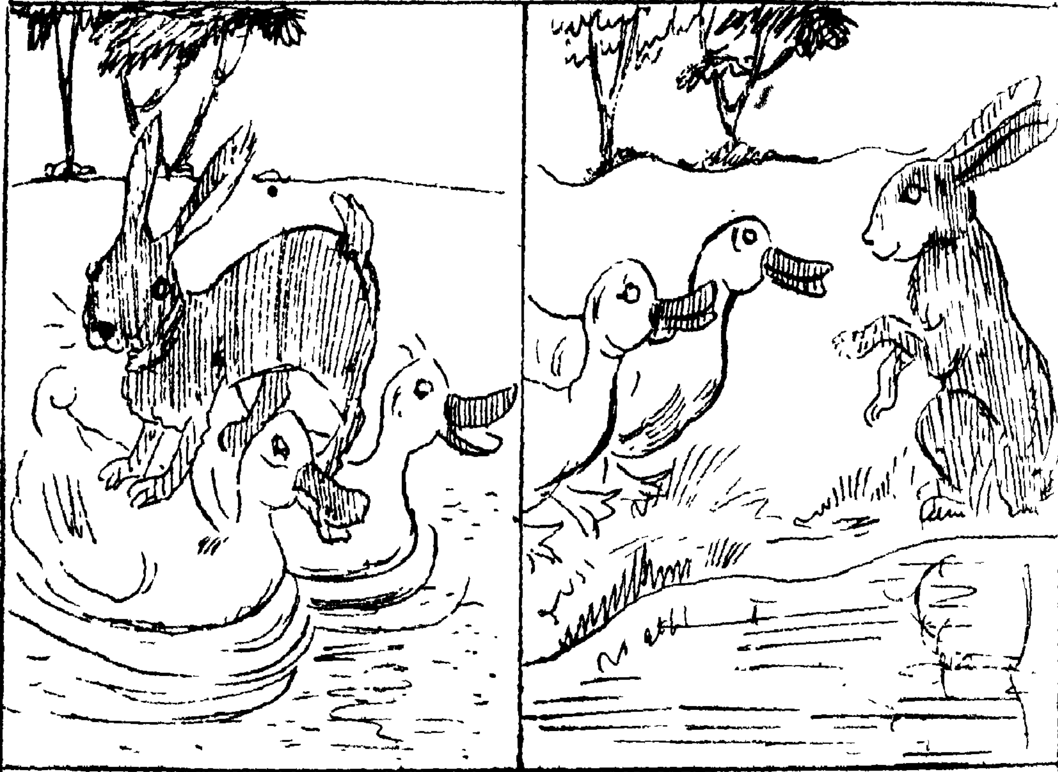
امریکہ میں کوئلے کا پتہ چلا

یہ تو انگلستان کی بات ہوئی ادھر ۱۷۰۱ء میں امریکہ میں بھی کوئلے کا پتہ چلا ۱۷۵۰ء میں کانوں سے یہ کوئلہ باقاعدہ نکالا جانے لگا۔ ویسے کوئلے کی عام کھپت ۱۸۲۰ء سے شروع ہوئی۔ اور کوئلے کی نکاسی تیزی سے بڑھنے لگی لیکن ۱۸۹۹ء تک برطانیہ ہی دنیا میں سب سے زیادہ اہم ملک اس کی پیداوار میں رہا۔

۱۸۹۹ء کے بعد سے اب تک امریکہ کا دنیا میں کوئلے کی پیداوار میں پہلا نمبر ہے (علاوہ ۱۹۳۸ء کے جب کہ جرمنی کی نکاسی بڑھ گئی تھی۔)

کوئلے کا استعمال ہمارے دیس میں

اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے ہندوستان میں کوئلے کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا سب سے پہلے کوئی دو سو سال پہلے ۱۷۷۳ء میں انگریزوں نے رانی گنج (بنگال) میں کوئلہ نکالنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور لگ بھگ چالیس برس تک کسی نے ادھر دھیان نہیں دیا۔ ۱۸۴۳ء میں بنگال کول کمپنی کے نام سے ایک کمپنی قائم ہوئی۔ کھدائی کا اصل کام صحیح معنوں میں اسی سال سے شروع ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے جاری ہوئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس ریلوے لائین کو کوئلے کے علاقے تک پہنچا دیا گیا۔ اس ریلوے کی بدولت کوئلے کے لانے لے جانے میں بہت سہولتیں ہوگئیں یوں سمجھیے کہ کوئلے کے کاروبار میں جان پڑ گئی ۱۸۶۸ء کے بعد تو یہ کاروبار ترقی کرتا رہا۔ اور اب (۱۹۶۲ء) ۱۳۴ کروڑ روپیہ کا کوئلہ کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ تمام معدنی پیداوار کی قیمت لگائیے تو کوئلے کی پیداوار کی قیمت ۷۲ فیصدی بیٹھتی ہے اور دوسری معدنی پیداوار کی قیمت کل ۲۸ فی صدی۔ اس کے علاوہ کوئلہ کی تمام کانوں میں تقریباً سوا چار لاکھ مزدور کام کرتے ہیں جبکہ تمام معدنی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد پونے سات لاکھ ہے۔




کیا خوب چڈی کھائی!



جادُو کا پٹارا ۲

اینڈرسن
ترجمہ
مشیر فاطمہ صاحبہ

لوگوں نے بتایا کہ اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ وہ تانبے کے قلعے میں رہتی ہے اس کے چاروں طرف بہت سی دیواریں اور مینار ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ کوئی دوسرا اس قلعے میں نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ایک نجومی نے بتایا تھا کہ اس کی شادی ایک معمولی سپاہی سے ہوگی اور بادشاہ کو یہ بات پسند نہیں ہے سپاہی نے سوچا میں تو اس کو ضرور دیکھوں گا۔ لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ قلعے کے اندر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

سپاہی خوب عیش کی زندگی گزار رہا تھا۔ روز تماشے دیکھنے جاتا، باغوں کی سیر کرتا اور غریبوں کو روپیہ تقسیم کرتا۔ یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ کیونکہ وہ اپنے غریبی کے دن بھولا نہیں تھا جبکہ اکثر اس کے پاس ایک بھی پیسہ نہ ہوتا تھا۔ مگر اب تو اس کے پاس پیسہ تھا۔ اس کے بہت سے دوست تھے جو اس کی تعریفیں کرتے، آپ کتنے شریف ہیں، کتنے اچھے اور سچے سپاہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سپاہی روپے تو برابر خرچ کر رہا تھا لیکن اس کو ملتا کچھ نہیں تھا اور ایک دن ایسا آیا کہ اس کے سب پیسے ختم ہوگئے اور اب اس

کے پاس صرف دو پیسے رہ گئے۔ اور اس کو سرائے کے سب سے اچھے کمرے کو چھوڑ کر نیچے تہہ خانے میں جانا پڑا، اس کو اپنے جوتے آپ صاف کرنے پڑتے۔ اپنے کپڑوں کی مرمت کرنی پڑتی۔ اب اس کا کوئی بھی دوست اس سے ملنے نہ آتا کیونکہ ان کو بہت سی سیڑھیاں اترنی پڑتی تھیں۔

ایک دن شام کو جب کافی اندھیرا ہو گیا تھا اور اس کے پاس کوئی موم بتی بھی جلانے کو نہ تھی کہ اس کو ایک دم سے خیال آیا کہ اس ٹین کے ڈبے میں ایک ذرا سی موم بتی پڑی ہے جو وہ پیڑ کے اندر سے چڑیل کے لیے لایا تھا۔

. . . .

. . . .

۔۔۔ وہ اٹھا اور ٹین کے ڈبے کو ڈھونڈ نکالا۔ اس میں سے موم بتی نکالی جیسے ہی وہ اس کو جلانے جا رہا تھا بتی میں سے شعلے نکلے ہی تھے کہ ایک دم سے دروازہ کھلا اور وہ کتا داخل ہوا جو اس نے پیڑ کے اندر دیکھا تھا جس کی آنکھیں پلیٹ کے برابر تھیں اس نے سامنے آکر کہا "اے مالک کیا حکم ہے؟"

سپاہی نے کہا اگر جو میں چاہوں وہ مل جائے تو یہ عجیب قسم کا ڈبہ ہے۔ اس نے کتے سے کہا میرے لیے کچھ روپیہ لاؤ۔ کتا ایک دم سے غائب ہو گیا اور پھر فوراً ہی واپس آگیا اس کے منہ میں پیسوں کی تھیلی تھی۔

اب سپاہی کو معلوم ہوا کہ کتنا عجیب ڈبہ وہ ٹین کا ڈبہ تھا۔ ایک بار جلانے سے تانبے کے پیسوں کے بکس پر بیٹھنے والا کتا آگیا۔ دو بار جلانے سے چاندی کے بکس والا کتا اور تین بار جلانے سے سونے کے بکس والا کتا آجاتا۔ اور سپاہی نے فوراً ہی اپنا کمرہ بدل دیا اور پھر اچھے اچھے کپڑے خرید لیے اور اب پھر اس کے دوست آنے جانے لگے۔

پھر اس نے سوچا یہ عجیب بات ہے کہ شہزادی کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ لیکن اس کی خوب صورتی سے کیا فائدہ اگر وہ ہمیشہ تانبے کے قلعے میں بند رہے جس کے چاروں طرف مینار ہوں۔ کیا میں کسی طرح بھی اس کو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ کہاں ہے میرا ٹین کا ڈبہ۔ اس نے ایک بار روشنی جلائی پلیٹ کے

برابر آنکھوں والا کتا آکر سامنے کھڑا ہو گیا۔

سپاہی نے کہا "اس وقت آدھی رات ہے لیکن میں اسی وقت شہزادی کو دیکھنا چاہتا ہوں میں ضرور دیکھوں گا چاہے صرف چند لمحوں کے لیے"۔

آنکھ جھپکتے ہی کتا دروازے کے باہر گیا اور سپاہی ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ کتا پھر واپس آگیا اور اس کی پیٹھ پر شہزادی تھی جو بے خبر سو رہی تھی۔ شہزادی بہت خوب صورت لگ رہی تھی جیسے سچ مچ کی شہزادی ہوتی ہے اور سپاہی صبر نہ کر سکا اور اس نے شہزادی کو پیار کر لیا۔ وہ بہر حال سپاہی تھا۔

پھر کتا شہزادی کو لے کر واپس چلا گیا۔

صبح کو جب بادشاہ اور ملکہ ناشتے پر آئے تو شہزادی نے بتایا کہ اس نے کیسا عجیب خواب دیکھا کہ وہ ایک کتے کی پیٹھ پر سوار ہے اور ایک سپاہی اسے پیار کر رہا ہے۔

ملکہ نے کہا یہ کہانی تو اچھی ہے۔

دوسری رات کو محل کی ایک بوڑھی لونڈی کو شہزادی کے پاس بٹھایا کہ وہ دیکھے کہ خواب ہے یا حقیقت۔

سپاہی نے سارا دن اس انتظار میں کاٹا کہ کیسے پھر اسے شہزادی دیکھنے کو ملے۔ دوسری رات پھر کتا آیا اور شہزادی کو لے کر تیزی سے بھاگا۔ اس بڑھیا نے کتے کا پیچھا کیا اور اتنی ہی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑی لیکن کتا شہزادی کو لے کر ایک بڑے مکان میں غائب ہو گیا تو بڑھیا نے سوچا میں نے مکان تو دیکھ لیا ہے اس نے مکان کے دروازے پر چاک سے نشان بنا دیا اور گھر واپس آگئی۔ کتا بھی شہزادی کو لے کر واپس آگیا مگر جب اس نے دیکھا کہ سپاہی کے دروازے پر نشان بنا ہے تو کتے نے بھی ایک چاک لی اور شہر کے ہر دروازے پر نشان لگا دیا۔ کتے نے بڑی چالاکی کی اب تو بڑھیا سپاہی کا مکان ڈھونڈھ نہیں سکتی تھی کیونکہ شہر کے ہر دروازے پر نشان لگا تھا۔

دوسرے دن صبح بادشاہ، ملکہ، بڑھیا اور دربار کے سب افسر سب ہی شہر میں وہ گھر دیکھنے گئے جہاں رات کو شہزادی گئی تھی۔

"یہ رہا وہ مکان"۔ بادشاہ نے کہا جب اس نے پہلا دروازہ نشان لگا دیکھا۔

"مگر یہ نہیں ہے"۔ ملکہ نے کہا جب اس نے دوسرے دروازے پر نشان لگا دیکھا۔
"یہاں ایک اور دروازے پر نشان ہے" "اور" "اس دروازے پر بھی تو نشان ہے"، سب لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ وہ جدھر بھی جاتے ہر دروازے پر نشان لگا پاتے۔ پھر ان لوگوں نے سوچا اب جب سب دروازوں پر نشان لگا ہے تو اس گھر کو ڈھونڈھنا بے کار ہے۔

لیکن ملکہ بہت چالاک تھی اس نے دوسری ترکیب سوچی اس نے ایک چھوٹا سا ریشم کا تھیلا لیا اور اس میں گیہوں کا آٹا بھر کر اسے شہزادی کی پیٹھ میں باندھ دیا اور تھیلی میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر دیا۔ تاکہ آٹا راستے میں گرتا جائے جہاں بھی شہزادی جائے۔

رات کو پھر کتا آیا اور شہزادی کو لے کر سپاہی کے پاس گیا۔ سپاہی کو شہزادی بہت پسند آگئی تھی اور اب وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔
کتے نے اس کا خیال بھی نہ کیا کہ قلعے سے سپاہی کے گھر تک آٹا گرتا آیا ہے۔ دوسرے دن بادشاہ اور ملکہ کو آسانی سے پتہ چل گیا کہ شہزادی کہاں گئی تھی اور انھوں نے سپاہی کو پکڑ لیا اور قید خانے میں بند کر دیا۔

سپاہی جیل میں بہت رنجیدہ تھا وہاں بالکل اندھیرا تھا اور سب لوگ اس سے کہہ رہے تھے کہ کل تم کو پھانسی ہو جائے گی۔ یہ سب اس کو بہت برا لگ رہا تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ وہ اپنا ٹین کا ڈبہ سرائے میں بھول آیا تھا۔ دوسرے دن اس نے کوٹھری کی سلاخوں کے باہر دیکھا کہ لوگ تیزی سے شہر کی طرف جا رہے ہیں اس کو پھانسی چڑھتے دیکھنے کے لیے۔ اس نے باجوں کی آواز سنی۔ سپاہیوں کو جاتے دیکھا۔ ہر شخص چل رہا تھا۔ سپاہی نے دیکھا ان میں ایک موچی کا لڑکا بھی جا رہا ہے۔ چمڑے کا ٹکڑا لیے اور سلیپر پہنے تیزی سے چل رہا تھا اتنی تیزی میں تھا کہ اس کے ایک پیر کی جوتی نکل کر سپاہی کے قید خانے کی دیوار سے لگی جہاں سپاہی لوہے کی سلاخوں میں سے جھانک رہا تھا۔

سپاہی نے کہا ارے میاں صاحبزادے ذرا سننا۔ تم کو بہت جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، وہ لوگ بغیر میرے اپنی کارروائی نہیں شروع کر سکتے۔ تم ذرا میرا ایک کام کر دو میں اس کے عوض میں تم کو دو پیسے دوں گا۔ پیسوں کا نام سُن کر موچی کا لڑکا رک گیا —— کیا کام ہے؟ وہ بولا۔

سپاہی نے کہا جہاں میں رہتا تھا وہاں میرا ایک چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ رکھا ہے اسے ذرا دوڑ کر لیتے آؤ۔ مگر بہت جلدی کرو۔ موچی جلدی سے دوڑ کر ٹین کا ڈبہ لے آیا اور سپاہی کو دے دیا۔

اب سنو کیا ہوا۔ شہر کے باہر ایک بہت بڑی پھانسی بنوائی گئی تھی اس کے چاروں طرف سپاہی کھڑے تھے جج اور افسروں کے سامنے تخت پر بادشاہ اور ملکہ بیٹھے تھے۔

سپاہی اوپر سیڑھی پر چڑھ چکے تھے اور وہ سپاہی کے گلے میں رسی ڈالنے ہی جا رہے تھے کہ ان کو یاد آیا کہ پھانسی دینے سے پہلے ملزم سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ سپاہی نے پوچھا کہ مرنے سے پہلے تمھاری آخری خواہش کیا ہے تو اس نے کہا میں آخری بار پائپ پینا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے سوچا اس میں کیا ہرج ہے اور اس نے اجازت دے دی۔

سپاہی نے جیب سے اپنا ٹین کا ڈبہ نکالا اور تین بار جلایا اس کے جلاتے ہی تینوں کتے آ کر سامنے کھڑے ہو گئے ایک جس کی آنکھیں پلیٹ کے برابر تھیں دوسرا جس کی آنکھیں تھالی کے برابر تھیں اور تیسرا جس کی آنکھیں پہیے کے برابر تھیں۔

سپاہی نے کہا مجھ کو پھانسی پر چڑھنے سے بچاؤ۔ یہ کہنا تھا کہ کتے سپاہی، جج اور افسروں پر جھپٹ پڑے اور ان کو ہوا میں اچھالنا شروع کیا۔ بادشاہ نے کہا مجھے نہیں اچھال سکتے ہو مگر سب سے بڑے کتے نے بادشاہ اور ملکہ دونوں کو ہوا میں اچھال دیا اور وہ ایک دوسرے پر لڑھکتے گئے۔ اب سارے سپاہی اور سب آدمی بہت ڈرے اور انھوں نے کہا قیدی سپاہی ہم تم کو اپنا بادشاہ بناتے ہیں تم شہزادی سے شادی کر سکتے ہو

سب نے مل کر سپاہی کو بادشاہ کی گاڑی میں بٹھایا اور ٹٹینوں کتے اس کی گاڑی کے آگے ناچتے ہوئے چلے لڑکوں نے سیٹیاں بجانی شروع کریں۔ سپاہیوں نے سلامی دی اور شہزادی تانبے کے قلعے سے باہر آئی اس کو ملکہ بنایا وہ کتنی خوش تھی۔

شادی کا جشن ایک ہفتے تک منایا گیا اور کتے سب کے ساتھ میز پر بیٹھے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں برابر گھماتے رہے۔

پیام تعلیم مقامی طور پر کہاں کہاں ملتا ہے

اورنگ آباد: سعید بک ڈپو شاہ گنج
بیجاپور: الطاف بک ڈپو۔ بڑی کمان
بتیا: سراج الحسین خاں، گنج دوم
بھوپال: مکتبہ شرقیہ، ابراہیم پورہ
برہان پور: رشید بک ڈپو، منڈی بازار
پٹنہ: محمد شفیع الدین، سبزی باغ
〃 بک امپوریم، سبزی باغ
جمشید پور: قیام الدین، بستو پور
جودھپور: اردو مرکز، لائقان
بیجاپور: بیجاپور بک سینٹر
بیلگام: ونیس بک اسٹال، سینٹرل بس اسٹینڈ
مدراس: ۳ نصیر نیوز ایجنسی ویپری ہائی روڈ،
دھولیہ: عبدالحمید کتب فروش
رانچی: سب رنگ بکس، مین روڈ
سوپور (کشمیر): عبدالسبحان، کتب فروش
علی گڑھ: بال برادری، دانیال کالج
کرلا (بمبئی): صبح ایشیا، پائپ روڈ
مدراس: ۵ نذیر بک ڈپو۔ ٹی۔ ایچ روڈ
مالیگاؤں (ناسک): مکتبہ اطفال، بدر کا باڑہ
ہبلی: جمیل بک ہاؤس، بھنڈی وارٹیس
ہزاری باغ: جاوید بک ڈپو، بڑا بازار
پونہ: آزاد بک ڈپو، بنڈل روڈ
حیدرآباد: ایم احمد علی ایجنٹ عابد روڈ
ویانم باڑی: شاداسٹور سی آئی روڈ

جناب زوآر اعظمی

پیارے بچو



اے وطن کے پیارے بچو تم وطن کی لاج ہو
روشنی ہو ملک کی اور قوم کے سرتاج ہو

تم وطن کے واسطے مانگو دعا حق سے اگر
ہر طرف برسے فلک سے ابرِ رحمت جھوم کر

مسکراہٹ سے تمھاری جگمگاتی ہے زمیں
ایسی رونق عرش کے تاروں میں بھی ملتی نہیں

چاند بن کر روشنی پھیلا دو سارے ملک میں
چاہنے والے تمھارے عِلم کی ضومیں رہیں

تم اگر اچھے بنوگے نام ہوگا ملک کا
ہر طرف پرچم تمھارے عزم کا لہرائے گا

عِلم سیکھو اور ہر محفل کی تم زینت بنو
شمع کی مانند روشن قوم کی قسمت بنو

جناب مقبول احمد دہلوی

ریشم کی پری



ہندوستان کے یورپ میں ایک مشہور ملک جاپان ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس ملک میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے آئے دن اس ملک میں زلزلے آتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ جاپان کے ایک شہر میں زبردست زلزلہ آیا اور یہ شہر پورا کا پورا تباہ ہو گیا۔ اس شہر کے رہنے والے دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ ان ہی مصیبت زدہ اور تباہ حال لوگوں میں

ایک لڑکا "چن چو" بھی تھا۔ یہ بہت غریب تھا۔ اس کے ماں باپ نے ایک ساہوکار سے قرض لیا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد ساہوکار نے چن چو سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا، چن چو نے ساہوکار سے کہا:—

"جب تک آپ کا روپیہ ادا کر دوں، آپ کے کارخانے میں کام کرتا رہوں گا۔ جب قرض کی رقم پوری ہو جائے تو مجھے آزاد کر دیجیے گا۔"

ساہوکار نے اپنی ڈوبتی ہوئی رقم کو بچانے کے لیے چن چو کی شرط مان لی۔ اور اسے اپنے کارخانے میں رکھ لیا۔

ساہوکار کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ یہاں ریشم کا کپڑا بنا جاتا تھا۔ ساہوکار

نے چن چو کو پہلے ہی دن ریشم کا بہت سا دھاگا دیا اور اس سے کہا " یہ دھاگا شام کو چھٹی سے پہلے ختم ہو جانا چاہیے۔ ورنہ تمھیں سخت سزا ملے گی اور تم جو کام کروگے وہ بھی جرمانے کے طور پر کاٹ لیا جائے گا۔"

چن چو اتنا دھاگا دیکھ کر پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اتنے سارے دھاگے کا میں کس طرح کپڑا بُن سکوں گا۔" ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے ایک خوب صورت سی پری اپنے قریب آتی دکھائی دی۔ چن چو پری کو دیکھ کر گھبرا گیا اُس نے سمجھا کہ یہ ساہوکار کی لڑکی ہے اور اس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے۔ اُسے بے کار بیٹھا دیکھ کر ساہوکار سے شکایت کر دے گی اور اسے سزا ملے گی ـــــ یہ سوچ کر اس نے کپڑا بُننا شروع کر دیا۔ چن چو کپڑا بُننا نہیں جانتا تھا اسے بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ دن گزر گیا تھا۔ اُس کے تمام ساتھیوں نے اُس سے کئی گنا زیادہ کپڑا تیار کر لیا تھا لیکن چن چو چند گز کپڑے سے زیادہ بُن نہ سکا۔

چھٹی کا وقت قریب آ رہا تھا اور چن چو ڈر رہا تھا کہ اب ساہوکار آتا ہوگا اتنے میں وہی پری چن چو کے اور قریب آئی اور ہنس کر کہنے لگی ـــــ " اتنے بہت سے ریشم کا کپڑا تو تم ساری عمر میں بھی نہ بُن پاؤ گے!"

چن چو نے حسرت سے اس کی طرف دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہا ـــــ " مالکن مجھے کپڑا بُننا نہیں آتا۔ ساہوکار صاحب کا حکم ہے۔ اب آپ ہی کوئی ترکیب بتائیں میں کیا کروں؟ "

پری نے مسکرا کر کہا ـــــ " اچھے چن! میں ساہوکار کی لڑکی نہیں، ریشم کی پری ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ کپڑا کس نے بُنا ہے تو میں سارے ریشم کا کپڑا چھٹی سے پہلے پہلے بُن دوں۔"

چن چو یہ سن کر بہت خوش ہوا اس نے پری سے وعدہ کر لیا۔

پری نے دیکھتے دیکھتے سارے ریشم کا کپڑا بُن دیا۔ اور ریشمی کپڑے کے تھانوں کے ڈھیر لگا دیے۔ جب چھٹی ہوئی تو ساہوکار

ا رخانے میں آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چن چو نے سارے ریشم کا کپڑا بُن دیا ہے۔ وہ اتنے بہت سے ریشمی کپڑے کے تھان دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور چن چو کو آزاد کر دیا۔

چن چو نے ساہوکار سے کہا "ساہوکار جی! اتنے سارے کپڑے کے تیار کرنے کی مزدوری تو بہت ہوتی ہے۔ میرے باپ کے قرض کی رقم کاٹ کر باقی پیسے میرے حوالے کر دیجیے۔"

ساہوکار نے حساب لگایا مزدوری بہت بنتی تھی اس نے چن چو کو مزدوری دینے کے بجائے اسے دھکے دے کر کارخانے سے نکال دیا۔ اور کپڑے کو بازار میں فروخت کر کے خوب مالدار ہو گیا۔

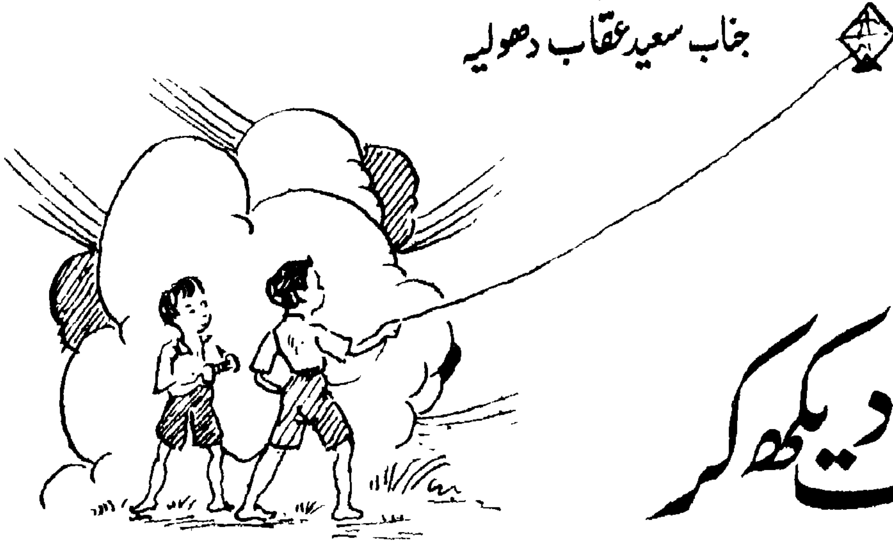
جب چن چو کارخانے سے باہر نکلا تو ریشم کی پری نے کہا "چن چو! تم فکر نہ کرو۔ ہم ساہوکار کی اس بدتمیزی کا بدلہ لیں گے۔"

ریشم کی پری چن چو کو اپنے محل میں لے گئی۔ اور ریشم کے کپڑے کے بہت سے تھان دے کر کہا ــــ "ان کو بازار میں بیچ کر ایک بڑا سا کارخانہ خرید لو۔ خدا نے چاہا تو چند ہی دنوں بعد ساہوکار تمھارے قدموں میں ہوگا۔"

چن چو نے کپڑا بیچ کر ایک بہت بڑا کارخانہ خرید لیا اور ریشم کی پری کی مدد سے روزانہ اس کارخانے میں اتنا کپڑا تیار ہونے لگا کہ ساہوکار کے کارخانے کا دیوالا نکل گیا۔ چن چو کے کارخانے کا بنا ہوا کپڑا سستا بھی ہوتا تھا اور اچھا بھی۔ ساہوکار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھاگا ہوا چن چو کے پاس آیا اور اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ چن چو نے ساہوکار کو معاف کر دیا اور آئندہ کے لیے نصیحت کی کہ کبھی کسی غریب کا حق نہ رکھے۔ پھر چن چو نے ساہوکار کو اپنے کارخانے کا مینیجر رکھ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر میں چن چو کے کارخانے کا ریشمی کپڑا مشہور ہو گیا۔ جب چن چو بہت بڑا آدمی بن گیا تو اس نے ریشم کی پری سے شادی کر لی۔ اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

آج بھی جاپان کا ریشم کا کپڑا تمام ملکوں کے کپڑوں سے سستا ملتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہ سب ریشم کی پری کی مہربانی ہے۔ (جاپان کی ایک لوک کہانی)

جناب سعید عقابؔ دھولیہ



پتنگ دیکھ کر

پیارے بچو! یہ پتنگ کہتی ہے کیا
اس کے کہنے کا سمجھ لو مدعا
یہ سبق دیتی ہے از راہِ عمل!!
آرزو رکھو بلندی کی صدا!

خاکساری ہو بلندی میں نہاں
بُردباری سے خدا ہے شادماں
اِس طرح چھا جاؤ بزمِ دہر میں
جیسے چھایا ہے یہ نیلا آسماں

یاد رکھیں بات یہ اہلِ غرور
کھائیں گے ٹھوکر زمانے میں ضرور
ہے تکبّر ناپسند اللہ کو
اے عقابؔ اس سے رہو تم دُور دُور

بچّوں کی کوششیں

باغبانی پروجیکٹ کے سلسلے میں ابتدائی ششم کے طلباء سبزی منڈی دیکھنے گئے تھے۔ نشاط فاطمہ نے یہ نظم سبزی منڈی دیکھنے کے بعد لکھی تھی۔ وہ ایک ہونہار طالبہ تھیں اپنی جماعت میں اول آئی تھیں۔ اب تو انھوں نے ہائر سکنڈری کرلیا ہے۔ اپنی نظم دیکھ کر خوش ہوں گی۔ (سید احمد علی آزاد)

سبزی منڈی

ہم نے سبزی منڈی دیکھی
بہت سی سبزی بکتی دیکھی
آلو دیکھا گوبھی دیکھی
طرح طرح کی مولی دیکھی
میتھی، شلجم، آلو، ٹماٹر
رکھے تھے سب اندر باہر
ایک طرف تھی مولی گاجر
شلجم کیا تھے لال چقندر
خریداروں کو آتے دیکھا
بھیڑ میں دھکے کھاتے دیکھا
دام پہ دام چڑھاتے دیکھا
اچھے دام لگاتے دیکھا
ہر سو پتّے بکھرے دیکھے
ان پہ لوگ پھسلتے دیکھے
مار پیٹ اور جھگڑے دیکھے
گالی سنی اور تماشے دیکھے
کیلے اور امرود وہاں تھے
بیچنے والے خوب وہاں تھے
انگور اور انار وہاں تھے
سبزے کے انبار وہاں تھے
ختم ہوئی منڈی کی کہانی
سن لی تم نے میری زبانی



(پچھلے پرچے میں دو مضمون شائع ہو چکے ہیں۔ دو اب شائع کیے جاتے ہیں ان چاروں مضمون لکھنے والیوں نے استادوں کے مدرسے میں اردو سیکھی ہے۔ اور جناب عبدالغفار مدھولی کی شاگرد ہیں۔ اور ہاں اوشا اروڑا مدرسہ ثانوی میں انگریزی پڑھاتی ہیں ابتدائی میں نہیں۔

ایڈیٹر

۹ر نومبر کا دن

آج ۹ر نومبر ہے مجھے بار بار اسی دن کی یاد آرہی ہے۔ جو پچھلے سال ۱۹۶۳ء میں میری آنکھوں نے دیکھا۔

جامعہ میں ہر سال تعلیمی میلا ہوتا ہے۔ بڑے اچھے اچھے پروگرام ہوتے ہیں۔ اتوار کے دن تو بڑا ہی دلچسپ پروگرام ہوتا ہے۔ باہر کے لوگوں کو بھی بلایا جاتا ہے۔

پچھلے سال جب یہ میلا ہوا تو اتوار کے دن ۹ر نومبر کو بڑی اچھی غزلیں گانے ہو رہے تھے۔

تبھی باہر سے آئے ہوئے ایک لڑکے اور لڑکی نے مل کر ایک گیت گایا جو بہت گندا تھا۔ اُس دن کافی ہمیں بُرا لگا۔ سبھی لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں بات ختم ہو گئی۔

لیکن جب میلا ختم ہوا ہم کالج آنے لگے تو ہمارے اردو کے ماسٹر صاحب نہ آئے تھے۔ سب کہتے وہ بیمار ہیں۔ ہمیں پتا نہیں تھا کہ بیماری کا کارن کیا ہے۔

بہت دنوں بعد وہ کالج آئے تو انھوں نے

ہمیں بتا دیا کہ "جس دن وہ گیت گایا جارہا تھا میں نے بار بار اندر خبر بھیجی کہ یہ گیت بند کروا دو جب ایک ٹکڑا ختم ہو تو ضرور بند کروا دیجیے لیکن میری بات کسی نے نہیں سنی۔ پھر میں خود اندر گیا اور خود منع کیا۔ لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اس بات کا مجھے اتنا دکھ ہوا کہ پہلی بار مجھے دل کی تکلیف ہو گئی۔ اب میں کچھ ٹھیک ہوا ہوں تو آسکا ہوں۔"

جب ہمارے ماسٹر صاحب نے یہ بات بتائی تو مجھے اور بھی وہ گیت برا لگنے لگا۔ ماسٹر صاحب کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے تو ۹ نومبر کا دن میں کبھی نہ بھولوں گی۔

میرے جیون کا نیا موڑ

جب میرے محترم پتاجی کا انتقال ہوا تو میں امرتسر میں تھی۔ ہمیں تار ملا تو ہم اسی وقت رشی کیش کے لیے چل پڑے۔ سبھی رو رہے تھے۔ میری نانی جی بھی ہمارے ساتھ تھیں جب گاڑی میں ہی شام ہوئی تو سورج دور درختوں کے پیچھے چھپنے جا رہا تھا۔ تبھی میری نانی جی نے اپنے منہ سے کپڑا ہٹایا کھڑکی سے باہر دیکھا اور کہنے لگیں کہ یہ سورج تو اب چھپ کر پھر نکل آئے گا لیکن میری لڑکی کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ گیا ہے۔ ایسی باتیں سن کر اور سوچ کر مجھے بہت رونا آتا تھا۔

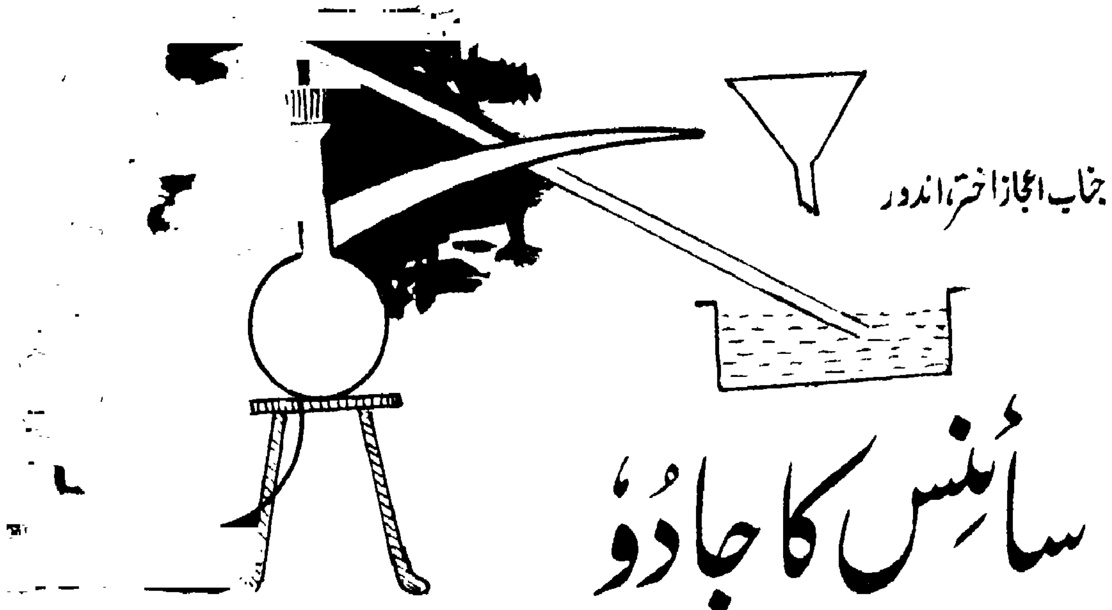
جب میں وہاں پہنچی تو ماتاجی کے گلے لگ کر خوب رونے لگی۔ تبھی کسی عورت نے کہا "اگر یہی لڑکا ہوتا تو پھر بھی......"

یہ سن کر میں اور بھی سسک سسک کر رونے لگی۔ میری ماتاجی کے آنسو لگاتار بہ رہے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے مجھ سے کہا "بیٹا لڑکیاں آج کل کیا نہیں کر سکتیں۔ میرے لیے تو تو ہی لڑکا ہے۔"

ان اچھے لفظوں کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔ یہ آپ سوچ سکتے ہیں۔

سوتنتر کماری
(بیسک دوسرا سال)



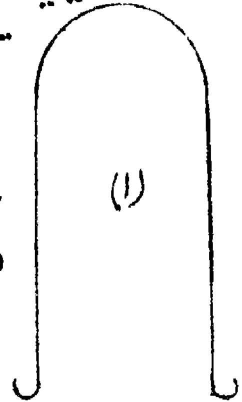


جناب اعجاز اختر، اندور

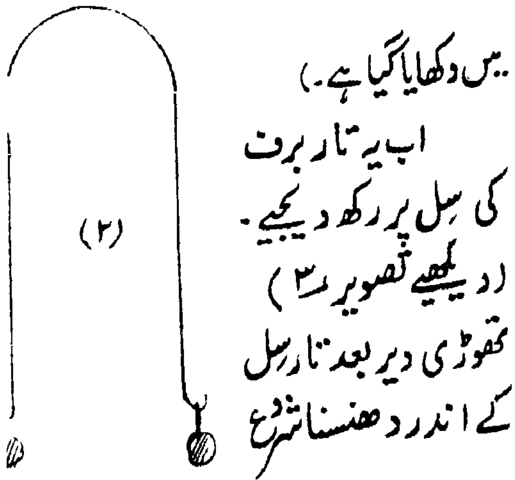
سائنس کا جادو

کیا آپ کے اور آپ کے دوستوں کے لیے یہ بات حیرت انگیز نہ ہوگی کہ برف کی ایک سل بیچ میں سے دو ہونے پر بھی اُس پر کٹنے کا نشان نہ ہو۔ آپ اپنے دوستوں کو یہ جادو دکھا کر حیران کر سکتے ہیں۔

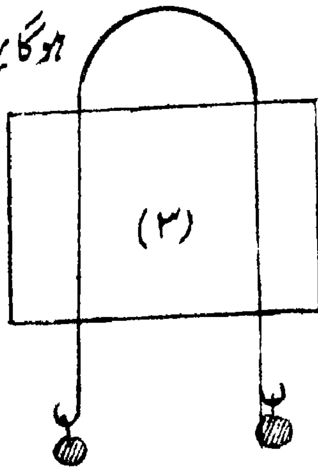
ایک برف کی سل لیجیے۔ برف کا ٹکڑا بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن سل بہتر ہے۔ کیونکہ سل کافی دیر میں گھلتی ہے۔ اور ایک تار لیجیے۔ تار کو شکل ۱ کی طرح موڑ لیجیے۔



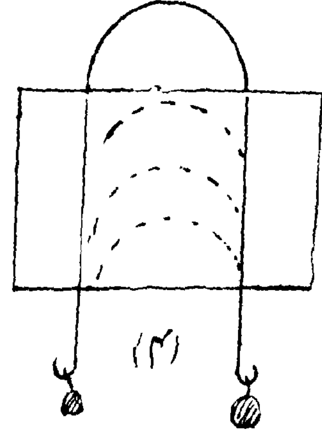
دو بھاری چیزیں تار کے دونوں سروں پر لٹکا دیجیے (جیسا تصویر نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔)



اب یہ تار برف کی سل پر رکھ دیجیے۔ (دیکھیے تصویر ۳) تھوڑی دیر بعد تار سل کے اندر دھنسنا شروع ہوگا یہاں تک کہ وہ سل کے آر پار ہو جائے گا۔ (دیکھیے تصویر ۴) اس کے بعد آپ

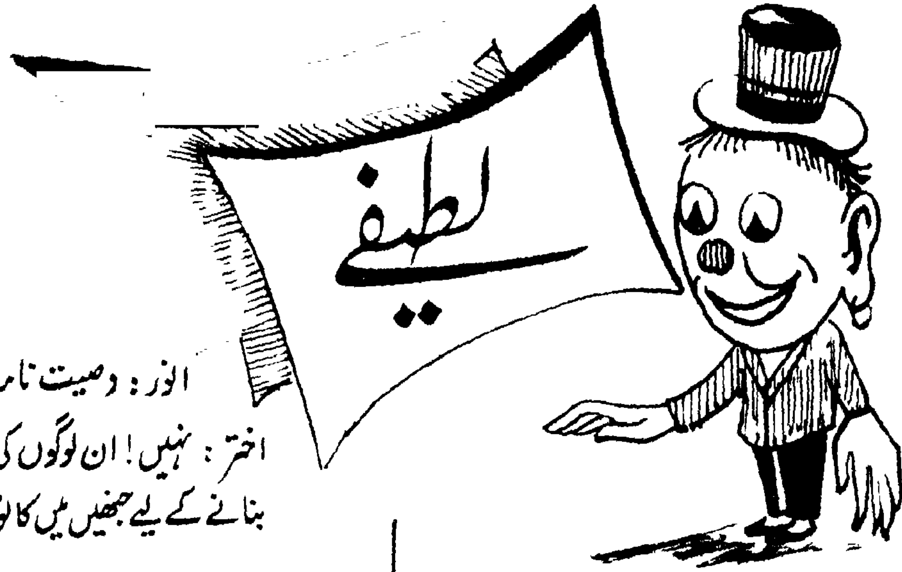


برف کا معائنہ کیجیے۔ آپ کو اس پر ایک درار بھی معلوم نہ ہوگی۔



آئیے ہم آپ کو اس کا راز بتائیں (کان قریب لائیے تاکہ آپ کے دوستوں پر اس جادو کا راز فاش نہ ہو جائے۔)

یہ سائنس کا اصول ہے کہ دباؤ کی وجہ سے ٹھوس چیز پگھلتی ہے۔ پل پر وزن کی وجہ سے دباؤ تھا۔ اس لیے تار کچھ نیچے آگیا۔ اب برف کے پگھلے ہوئے حصے پر دباؤ نہیں رہتا۔ اور وہ دوبارہ جم جاتا ہے اور کوئی نشان نہیں پڑنے پاتا۔ اسی طرح آخر میں جب تار برف کے آخری حصے کو پگھلا کر آر پار ہو جاتا ہے تو برف کے نچلے حصے پر دباؤ نہیں رہتا اور اس وجہ سے وہ حصہ بھی جم جاتا ہے اور کوئی نشان نہیں پڑنے پاتا۔



ماسٹر: بتاؤ سلیم نل کے پانی اور بارش کے پانی میں کیا فرق ہے؟

سلیم: جناب بارش والے پانی کا بل ادا نہیں کیا جاتا۔

استاد: (بچوں کو پڑھاتے ہوئے) بتاؤ آنکھوں تلے اندھیرا کب چھا جاتا ہے؟

شاگرد: جب آپ کلاس میں تشریف لاتے ہیں۔

نور: اگر تمھیں پاگل کتا کاٹ لے تو تم پہلا کام کیا کروگے؟

تر: کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھ جاؤں گا

انور: وصیت نامہ لکھنے کے لیے؟

اختر: نہیں! ان لوگوں کی فہرست بنانے کے لیے جنھیں میں کاٹوں گا۔

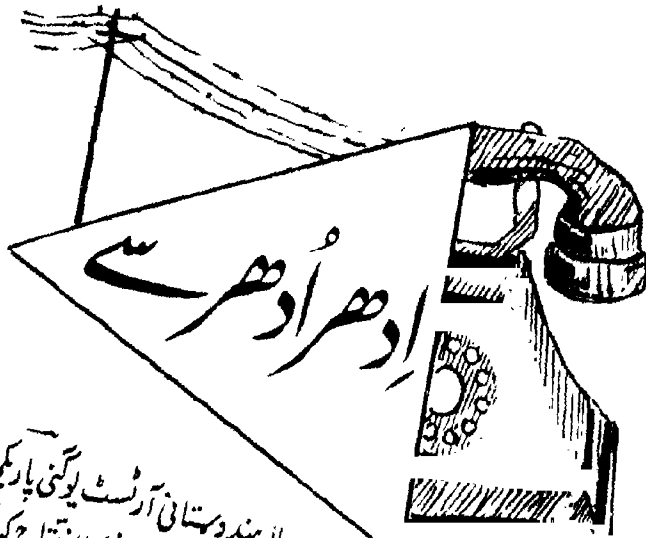
ایک افیمی: سنا تم نے اب تو مچھلیاں بھی پانی میں تیرنے لگی ہیں!

دوسرا افیمی: یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں نے تو آج آدمی زمین پر چلتے دیکھے ہیں۔

جمال: یار میں ایک خوش خبری لایا ہوں۔

شمیم: حفاظت سے الماری میں بند کردو۔

ایک بے وقوف نے سورج کو دیکھ کر کہا "یہ سورج بھی عجیب ہے۔ رات کو جب اندھیرا رہتا ہے اس وقت تو نکلتا نہیں۔ دن میں جب اجالا رہتا ہے اس وقت نکل آتا ہے۔" (محمد سلیم ثانوی دوم، مدرسہ جامعہ)



صحافی

ماسکو میں بچوں کے آرٹ کا عالمی مقابلہ

سوویت دوستی سوسائٹیوں کے بچوں کے ادب کے شعبے اور بچوں کے اخبار "پائینر سکایا پراودا" کی جانب سے بچوں کے آرٹ کا عالمی مقابلہ منعقد کیا جائے گا۔ تصویر کا موضوع "میرا گھر میرا وطن" قرار دیا گیا ہے۔ تمام ملکوں کے بچے، جن کی عمر ۶ سال سے ۱۶ سال تک ہے اس مقابلے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ داخلے کی آخری تاریخ ۳۰ اگست ۱۹۶۵ء ہے۔

۶ سالہ ہندوستانی آرٹسٹ کی تصویروں کی نمائش

سوویت لیتوویا کی راجدھانی ریگا میں ۶ سالہ ہندوستانی آرٹسٹ یوگنی پاریکھ کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کیا گیا۔ اس موقع پر ۵۰ دلکش رنگین تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اس غیر معمولی نمائش کا افتتاح تقریباً اس وقت کیا گیا جبکہ ریگا کے کنڈرگارٹن کے بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش بھی شروع ہوئی۔ یہ نمائش نوعمر پائنیروں کے محل میں منعقد ہے۔ اس میں ۶ سو تصویریں اور خاکے دکھائے گئے ہیں۔ ان میں امن اور سورج کے لیے پیار کا جذبہ مشترک ہے۔ ساتھ ہی فطرت کی دلکشی کے راز کو پانے کی مسرت بھی۔

مریخ پر ترقی یافتہ تہذیب

نوجوان سائنس داں فلیکس رائی گیل نے دعویٰ کیا ہے کہ مریخ پر نام نہاد سمندر نخلستان

اور نہریں، نباتات اور سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں اور وہاں ایک ترقی یافتہ تہذیب بھی موجود ہے۔

دو گائیں سات بچھڑے

بیلوروس کے "روسیا" پنچایتی فارم میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا ہے "بیلکا" نامی گائے نے تین بچھڑوں کو اور "باشینا" نامی گائے نے چار بچھڑوں کو جنم دیا ہے۔ یہ ساتوں بچے قد وقامت کے لحاظ سے معمول کے مطابق ہیں ان کا اوسط وزن ساڑھے دس کیلو گرام ہے۔

برف پر چلنے والی موٹر سائیکل

سوویت آرکٹک علاقے میں جلد ہی برف پر چلنے والی موٹر سائیکل آمد ورفت کے ذریعے کے طور پر کتوں اور بارہ سنگھوں کی جگہ لے لے گی۔ گورکی کے پولی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں اسے تیار کیا گیا ہے۔ یہ سائیکل برف پر پھسلنے والی گاڑی سے مشابہ ہے اور اس میں پہیے نہیں ہیں۔ مسافروں اور ۵۰ کیلو گرام وزن کو لے کر یہ گاڑی برف میں دور دراز فاصلے طے کر سکتی ہے۔

بائیس صدی پہلے کا ایک مجسمہ

ایوپاتوریا (کریمیا) کے قریب گذشتہ گرمیوں میں سوویت ماہرین آثار قدیمہ کی ایک مہم کو ایک نادر مجسمہ ہاتھ لگا تھا۔ یہ مجسمہ بائیس سو برس پہلے کی ایک شہ سوار یونانی عورت کا ہے جو نیزہ چلا رہی ہے۔

جھکا ہوا مینار سیدھا کر دیا گیا

ازبکستان کے انتہائی قدیم شہر سمرقند میں اُلغ بیگ کا جھکا ہوا مینار سدھا کر دیا گیا ہے۔ اس مینار کا سرا عمودی رخ سے ۱۵۶ سینٹی میٹر جھک گیا تھا اور ۳۰ سال سے اسے تاروں کے ذریعے برقرار رکھا جا رہا تھا۔

انجینیر ایمانوئیل جنڈل نے جو اس کام کے نگراں تھے کہا ہے کہ یہاں جو طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے اسے یقیناً اٹلی کے جھکے ہوئے پیسا مینار جیسی جگہوں پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ

دہاں تعمیری طور پر مختلف طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔
۱۷۹ فٹ اونچا یہ مینار علم نجوم کے ممتاز ماہر الغ بیگ کے مدرسہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ مینار پندرھویں صدی کے شروع میں تعمیر ہوا تھا اور اس کا وزن ۲۰۹ ٹن ہے۔ اس کام کی تیاری میں دو ماہ لگے، اس دوران مینار کو بنیاد سے الگ کرکے فولاد کے ایک ڈھانچے پر رکھا گیا جس کے نیچے پن بجلی کی دس مشینیں (جن کی مجموعی صلاحیت ۲۰ ہزار ٹن تھی) لگائی گئی تھیں۔ پھر مشینوں کی مدد سے مینار ۳ سے ۵ سینٹی میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے عمودی رخ اختیار کرنے لگا۔ آلے کے ذریعے جانچ کرنے پر پتہ چلا کہ مینار پھر اسی طرح سیدھا ہو گیا ہے جس طرح آج سے ۵۴۵ سال پہلے تھا۔

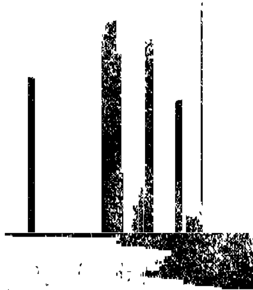
سوویت یونین کے حیوانات

روس نے "سوویت یونین کے حیوانات" نامی کتاب شائع کی ہے۔ یہ ۹۰ جلدوں پر مشتمل ہے اس میں جانوروں کے الگ الگ گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ادارے کے ڈائرکٹر پروفیسر بورس بائیخووسکی نے بتایا کہ اندازے کے مطابق سوویت یونین میں ایک لاکھ قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں ان میں ۸۰ ہزار قسم کے کیڑے مکوڑے بھی شامل ہیں۔ حیوانات کے متعدد گروہوں کو پہلی بار سائنسی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔



پرنٹر پبلشر سید احمد دالی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا



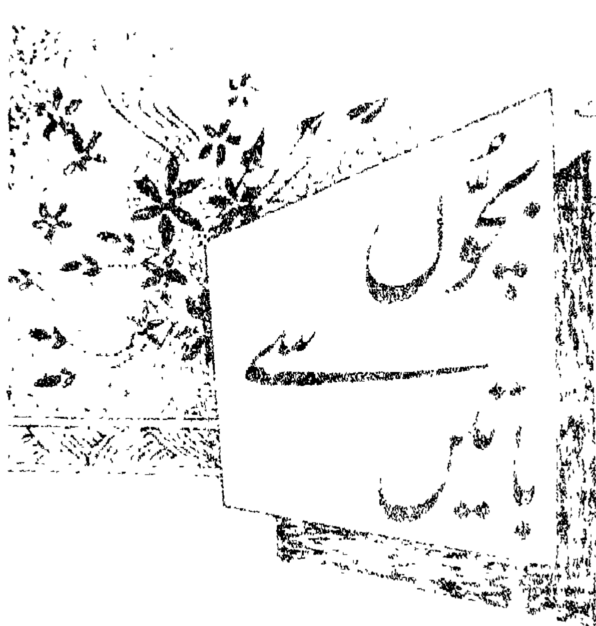






اس میں سے کچھ کچھ دکھائی دیتا ہے (بے بی عصمت)

فوٹو: اے ایچ شیخ



لیجیے امتحان کا موسم ختم ہو گیا۔
بہت سی جگہوں پر نتیجے بھی سنا دیا گیا۔
کچھ پیامیوں نے اپنی کامیابی کی خوش
خبری بھی ہمیں دی ہے۔ یقین ہے کہ
ہمارے بہت سے پیامیوں کو اپنی سال
بھر کی محنت کا پھل کامیابی کی صورت میں ملا ہوگا۔
ہماری طرف سے ان سب کو دلی مبارکباد۔

کچھ پیامی کسی وجہ سے اتنے نمبر نہ لا
سکے ہوں گے جو کامیابی کی منزل تک پہنچاتے
ہیں۔ انھیں اپنے پورے سال کے ضائع ہونے کا
دلی صدمہ ہوگا۔ ہم بھی اس صدمے اس افسوس
میں ان کے شریک ہیں۔ مگر ہم انھیں ایک مشورہ
دیتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی کے اسباب پر ضرور غور
کریں، بہت ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور جب
بات سمجھ میں آجائے تو ان اسباب یا ان کمزوریوں
کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

[illegible] کے پرچے کے سبھی مضمون پیامیوں کو
پسند آئے [illegible] سالگرہ
[illegible] کو [illegible]
[illegible] خبریں بھی پیامیوں
کو بہت پسند آئیں۔

محترمہ [illegible] اردو کی مشہور افسانہ
نگار ہیں [illegible] دیکھیے وہ آپ کے لیے بھی کتنا اچھا
[illegible] یہ کہانی بہت اچھی لگی اور
ہمارے بہت سے پیامیوں نے اس کی بہت
تعریف کی ہے۔

[illegible] پرچے میں یوسف ناظم صاحب کا مضمون [illegible] پسند آئے گا [illegible] صاحب کا [illegible] بہت اہم ہے [illegible] پرچے میں [illegible] اس کے علاوہ [illegible]

[illegible]

[illegible] خاص طور [illegible]

[illegible]

[illegible] پچھلے پرچے میں [illegible] والی [illegible] ادبی مقابلے کے سلسلے میں آپ [illegible] آگئے تھے [illegible] تاریخ بھی مقرر کر دی تھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آپ کا پیام تعلیم بچوں
کا پرانا پرچہ ہے۔ اس کے پڑھنے والے
[illegible] بچوں [illegible] ہو گئے [illegible]
[illegible]

[illegible] جو بچوں کے
لیے معیاری اور معلوماتی مضامین پیش کر رہے ہیں۔
امید ہے کہ ماہنامہ پیام تعلیم ہر اس گھر کی
زینت بنے گا جہاں اردو [illegible] زبان ہے۔

جناب بزمی بھارتی



بھیگی ہوئی ہوائیں جھولا جسے جھلائیں
برسات کی گھٹائیں نہلانے جس کو آئیں

نسلیں ہزاروں جس کی رنگت الگ الگ ہے
خوشبو جدا جدا ہے لذّت الگ الگ ہے

کچا ہو یا وہ پکا ہر وقت کام آئے
ہر اک پہ دھن جس کو چھپ چھپ کے خوب کھائے

طوطا بھی جان چھڑکے کوئل بھی راگ گائے
بلبل کا دل خوشی میں پھولا نہیں سمائے

بازار میں پہنچ کر بازار کو سجا دے

جب وہ گھروں میں آئے چٹخارے ہر زباں لے

اُس کے رسیلے پن میں جو لذتیں نہاں ہیں

انگور و موسمی میں وہ خوبیاں کہاں ہیں

نارنگیوں کی رنگت اور سنترے کی شوخی

اُس کے رنگوں کے آگے ہوتی ہے پانی پانی

آڑو۔ انار لیچی۔ امرود۔ سیب۔ کیلا

خوبانیاں۔ شریفے۔ خربوزہ اور سردا

جامن۔ لکاٹ۔ کھرنی۔ ناک اور ناشپاتی

نوکر ہے کوئی اُس کا کوئی ہے نوکرانی

مرغوب خاص کیا ہے مقبولِ عام کیا ہے

بچو! بتاؤ ہم کو اس پھل کا نام کیا ہے؟



محمد حسین حسان

توتا چشمی

ہمارے گھر میں دو طوطے پلے ہیں۔ ایک
ہی پنجرے میں۔ ایک نر۔ ایک مادہ۔ دونوں میں
بہت پریم ہے جب دیکھو سر جوڑے بیٹھے رہتے
ہیں باتیں بھی خوب بناتے ہیں۔ مزے مزے
کی باتیں۔

ایک دن کی بات سنو۔ کوئی تیسرا پہر
ہوگا۔ مٹھو میاں اور مٹھو رانی دونوں بہت
مزے میں تھے۔ اڈے یا جھولے پر چڑھ اتر
رہے تھے۔ اپنی زبان میں کچھ باتیں بھی کرتے
جاتے تھے۔ ان کے چڑھنے اترنے سے ایسی
آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے تم سلیٹ پر پنسل گھسو۔
مٹھو رانی اپنے مٹھو راجہ سے کہہ رہی
تھیں: "میرے مٹھو راجہ! مجھے تم سے بڑی
محبت ہے۔ میں تمھاری پریمی چڑیا ہوں
کیوں، ٹھیک ہے نا...؟"

"ہونہہ میں پریمی ویمی کچھ نہیں جانتا۔
مجھے تم سے ذرا محبت نہیں، چوبیس گھنٹے
محبت سے جی اکتا گیا، ذرا پنجرے کی کھڑکی کھل
جائے۔ پھر دیکھنا۔ دور دور تک میرا پتہ نشان
نہ پاؤ گی۔"

"اے ہے ظالم مردوے، میں تجھ پر جان
نچھاور کردوں اور تو مجھے یوں چھوڑ جائے گا"

"زیادہ بکومت، مجھے تمھاری باتیں ذرا
اچھی نہیں لگتیں۔"

دونوں نے چپ سادھ لی۔ الگ الگ روٹھ کے بیٹھ گئے۔ اتنے میں حبیب میاں اچھلتے کودتے آئے۔ پنجرے کی کھڑکی کھول، کٹوری میں دو تین ہرے ہرے بیر ڈالے اور چلتے بنے۔ اے لو! پنجرے کی کھڑکی کھلی چھوڑ گئے۔ بس یہی غضب ہو گیا۔ حبیب میاں جوں ہی کمرے سے نکلے اور مٹھو میاں نے پر تولے۔

مٹھو رانی پر تو پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چیخنے اور سُبکیاں لینے لگیں۔

"مٹھو، میرے مٹھو راجہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

مگر مٹھو نے سُنی ان سنی کر دی بھلا وہ اس موقع سے کیسے فائدہ نہ اٹھاتے مذاق میں بولے:—

"ہیں ہیں مٹھو رانی تم کیوں اپنا دل میلا کرتی ہو" اور بڑی شان سے ایک پیر پنجرے سے نکالا۔ پنجرے کے باہر کوئی سہارا تو تھا نہیں کہ پیر ٹک جاتے۔ بس گرنے والے تھے کہ سنبھل گئے اور اڑتے اڑتے میز پر پہنچ گئے۔

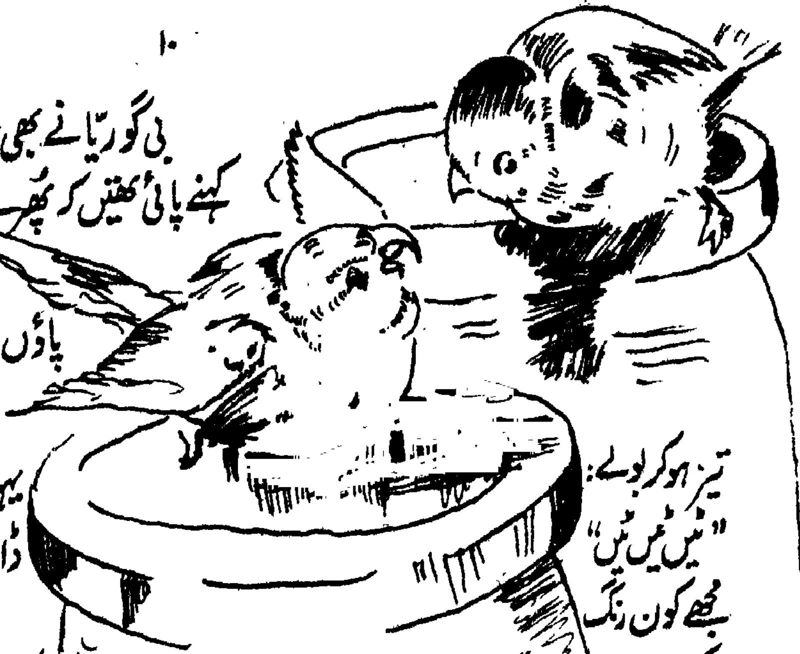
مٹھو رانی کی بے قراری برابر بڑھ رہی تھی کبھی اڑ کے اوپر جاتیں کبھی نیچے آتیں

"مٹھو راجہ، میرے مٹھو راجہ خدا کے لیے لوٹ آؤ، مجھ پر رحم کھاؤ۔"

مگر مٹھو راجہ اس وقت کس کی سُنتے ہیں۔ اُنھیں تو جیسے مدتوں کی قید سے آزادی ملی۔ میز پر ٹہلتے ٹہلتے اُن کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ اوپر کی طرف ذرا سے کواڑ کھلے تھے۔ مٹھو میاں کو اور دور کی سوجھی کھڑکی کے پردے کے ذریعے چڑھ کر وہاں تک پہنچ گئے۔ وہاں سے انھوں نے باہر جھانکا۔ "اہا بھئی باغ! ہرا بھرا باغ!" اب تو دل میں کچھ اور اُمنگ اُٹھی۔ مٹھو رانی اب تک پنجرے میں چیخ رہی تھیں۔ اِدھر مٹھو راجہ ایک پھڑ پھڑاہٹ میں کھڑکی سے باہر! مٹھو رانی کی چیخ اس پھڑپھڑاہٹ میں کھو گئی۔

مٹھو میاں اُڑتے اڑتے چھت تک پہنچ گئے۔ باہر انھیں ایک نئی دنیا نظر آئی۔ خوش ہو ہو کے لگے چاروں طرف دیکھنے۔ ایسے بے ہوش ہوئے کہ دھویں کی چمنی پر سے گرتے گرتے بچے۔ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک تیز تیز آواز آئی: "چوں چوں چوں اہا جناب تشریف لائیے۔ کہیے یہ آپ کو ہرا کس نے رنگ دیا؟"

مٹھو راجہ کی تیوری پہ بل آ گیا۔ بہت



بی گوریا نے بھی جواب دیا: "ذلیل، کمینہ...." اتنا کہنے پائی تھیں کہ پھر سے اڑ گئیں۔ حبیب میاں کی بلی پر اُن کی نظر پڑ گئی تھی۔ دبے دبے پاؤں اُن کی طرف آ رہی تھیں۔

مٹھو میاں ایک اور پیڑ پر پہنچے یہاں بی فاختہ نے انھیں دیکھ لیا اور ڈانٹ کر کہا: "بھاگ یہاں سے نامراد" مٹھو راجہ کے دل پر چوٹ سی لگی کہ دیکھو ہم تو ان کے پاس آئے اور انھوں نے ہماری یوں آؤ بھگت کی۔

بی فاختہ نے اُن کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور "یا دوستو" کا راگ الاپنے لگیں۔ ایسی میٹھی اور نرم آواز سُن کر پھر ان کی کچھ ہمت بندھی۔ دبی دبی اور کم زور آواز میں بولے: "بی فاختہ کیا میں آپ کے ذرا اور قریب آجاؤں۔؟"

"ہرگز نہیں، رنگی ہوئی گوریا کا ہمارے باغ میں آنے کا کیا کام؟"

میاں مٹھو کے دل پر ایک اور دھکا لگا۔ جی میں بولے "بھئی یہ دنیا تو سیر و سفر کے لائق نہیں۔" پھر بی فاختہ کو جواب دیا۔ "بی فاختہ میں گوریا تو نہیں ہوں۔"

تیز ہو کر بولے: "ٹیں ٹیں ٹیں" مجھے کون رنگ سکتا ہے، میں رنگا ہوا نہیں ہوں۔"

"اچھا بھئی اپنے خاندان میں بس تمھیں کو اس رنگ کا دیکھا عمر میں پہلی دفعہ۔"

یہ بی گوریا تھیں اور مٹھو میاں کو نہ جانے کیوں اپنے ہی خاندان کا سمجھ رہی تھیں۔

"جی، جناب میں گوریا نہیں ہوں۔ گوریا تو معمولی چڑیا ہوتی ہے ہلکے رنگ کی۔"

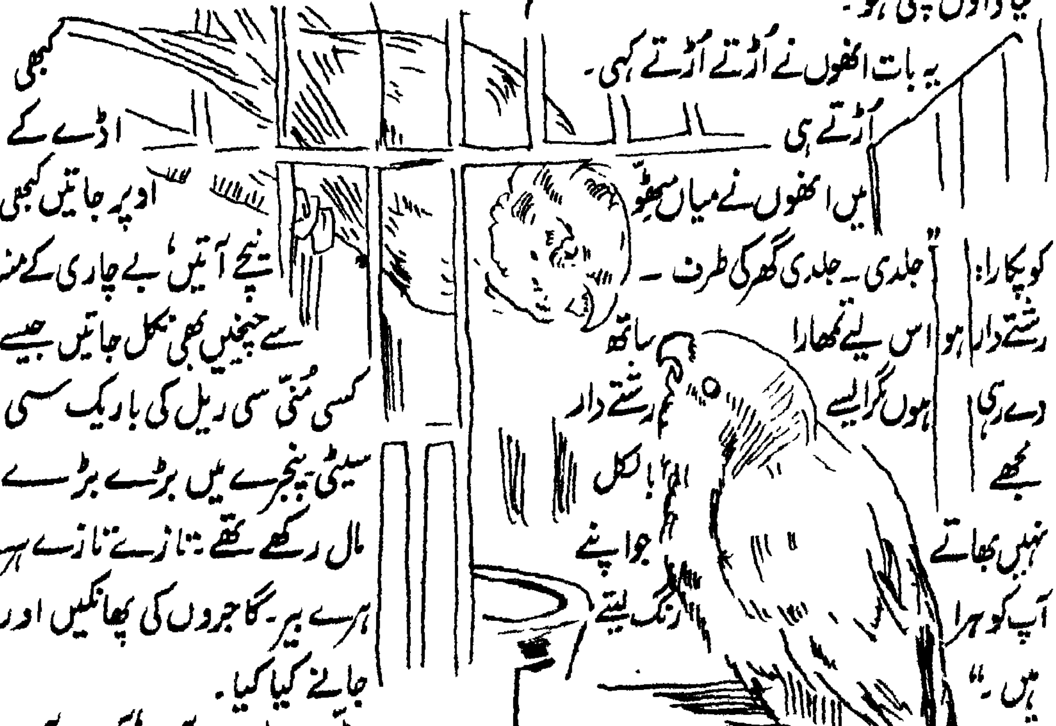
"اچھا، اچھا یہ بات ہے! تو تو...."

بی گوریا نے مٹھو میاں کے بڑی زور سے ٹھونگ ماری۔ اور مٹھو میاں بہت زور سے چیخے بڑی زور سے۔ سارے باغ میں آواز گونج گئی۔ مٹھو میاں فوراً اڑے اور دور ایک درخت پر حفاظت کی جگہ بیٹھ کر لگے بی گوریا کو کوسنے

"پھر؟"
"ایک پریمی چڑیا ہوں، پریمی چڑیا"
"احمق پریمی چڑیا ہے تو جا کر کسی سے
پریم کر یہاں تیرا کیا کام، چل دور ہو یہاں سے۔
اپنے پروں کو جا کر پانی سے دھو"
مٹھو میاں کو اتنا غصہ آیا کہ چیخ نکل گئی
وہاں سے جو اڑے ہیں تو سیدھے زمین پر۔
ارے! زمین پر پہنچ کر تو جان
کے لالے پڑ گئے۔
"آہا اب تو
میں نے تم کو پکڑ
لیا، اب کہاں جاؤ گے بھاگ
کے"
ایک بھاری بھر کم آواز ان کے کانوں
میں آئی۔ ارے دہشت کے مٹھو میاں کے
پر ادھر ادھر بکھر گئے دو آنکھیں، جیسے موٹر کے
بڑے بڑے دو تیز لیمپ، ان ہی کی طرف تاک
رہی تھیں۔
بھئی واہ یہ تو خود ان کے گھر کی منو بلائی

تھیں وہی حبیب میاں کی پرانی بلی۔ بہت سیدھی
سیدھی سی گھنٹوں ان کے پنجرے کے پاس بیٹھی
رہتی اور ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔
مٹھو میاں پھر اوپر اڑے، بڑی تیزی
سے۔ درخت پر اونچی سی جگہ بیٹھے۔ بلی کی پہنچ سے
باہر۔ اور وہیں سے بلی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں:
"کمینی، ذلیل، کتیا"
"اجی کب تک میرے ہتھے نہ چڑھو گے"
منو بلائی نے میٹھی موڑلی کھٹی زبان سے
اپنا بدن صاف کرتی جاتیں اور باتیں کرتی جاتیں۔
"میں تمھیں پکڑوں گی ضرور
چاہے ہفتوں انتظار کرنا پڑے"۔
اتنے میں بی گوریا نیچے گھاس
پر آ کر بیٹھ گئیں
"اہا! ل دد
قمقموں والی مزاج
شریف"
بی گوریا پھدک کر منو بلائی کے اور
قریب آ گئیں مگر بہت زیادہ نہیں۔
منو بلائی نے ایک چھلانگ لگائی مگر دار

خالی گیا۔ بی گوریّا اوپر اڑ گئیں اور بولیں: "کیوں بی
کیسی رہی، اچھا اب تمھاری باری ہے دیکھیں تم
کیا داؤں چلتی ہو۔"



یہ بات انھوں نے اُڑتے اُڑتے کہی۔ اُڑتے ہی
میں انھوں نے میاں مِٹھّو
کو پکارا: "جلدی۔ جلدی گھر کی طرف۔
رشتے دار ہو اس لیے تمھارا ساتھ
دے رہی ہوں مگر ایسے رشتے دار
مجھے بالکل
نہیں بھاتے جو اپنے
آپ کو ہرا رنگ لیتے
ہیں۔"

مِٹھّو میاں گھر لوٹنے کو بالکل تیار
نہیں تھے مگر بھوک بُری طرح ستا رہی
تھی۔ مِٹھّو رانی کے بُلانے کی آوازیں بھی برابر
کانوں میں آرہی تھیں۔ یہ پہلے چھت پر
پہنچے وہاں سے کھڑکی کے چھجے پر اُترے اور
وہیں سے جھانک کر دیکھا۔ حسیب اور شعیب
دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے۔ پنجرے کی

کھڑکی ویسے ہی کھلی پڑی تھی۔ بچاری مِٹھّو
رانی اسی طرح بے قرار تھیں۔ بے قراری میں
کبھی
اڈے کے
اوپر جاتیں کبھی
نیچے آتیں، بے چاری کے منہ
سے چیخیں بھی نکل جاتیں جیسے
کسی مُنّی سی ریل کی باریک سی
سیٹی۔ پنجرے میں بڑے بڑے
مال رکھے تھے: تازے تازے ہرے
ہرے بیر۔ گاجروں کی پھانکیں اور
جانے کیا کیا۔

مِٹھّو میاں آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ
اندر آئے۔ پنجرے میں گھسے اور اڈے پر
چڑھ گئے۔

مِٹھّو رانی جیسے چونک پڑیں: "اے
ہے مِٹھّو راجہ! میرے راجہ تم آگئے۔ اب
تک کہاں تھے۔ اب تک کہاں تھے مجھے بتاؤ۔"
مِٹھّو رانی مارے خوشی کے اپنے ہوش
میں نہیں تھیں۔ اڈے پر بڑی تیزی سے نیچے

اوپر دوڑ لگا رہی تھیں۔ آخر تھک کر جیسے مٹھو میاں پر گر پڑیں۔

مٹھو میاں بولے: "اے بی کیا پوچھتی ہو ساری دنیا کا چکر لگا کر آ رہا ہوں۔"

سیاح جب کبھی سفر سے لوٹ کے آتے ہیں تو اپنے سفر کے لمبے چوڑے قصے سناتے ہیں۔ مٹھو میاں کیا کسی سے کم تھے۔ بولے: "اور بھئی نئے نئے پرندوں سے ملاقات ہوئی اور عجیب وغریب جانور دیکھنے میں آئے۔ ایک تو مجھ پر جھپٹ ہی پڑا تھا۔"

"اے ہے غضب ہو گیا، پھر۔۔۔۔؟"

"ارے تم اتنا گھبراتی کیوں ہو؟ میں تو یہاں زندہ سلامت بیٹھا ہوں نا؟ مگر بس بال بال بچا۔ اچھا اب ذرا ہٹو تو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ بعد میں محبت جتا لینا۔ باقی سفرنامہ کل سویرے سنائیں گے۔"

مٹھو میاں نے مٹھو رانی کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اور پھر خوب جی بھر کر کھایا پھر مٹھو رانی سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگے۔

(انگریزی سے اپنایا گیا)

جناب سید منیر الحسن منیر

ہم...

دل میں کوئی غم لا نہ سکیں گے
راہ سے ہٹ کر جا نہ سکیں گے
آفت سے گھبرا نہ سکیں گے
علم کے ہم طالب ہی رہیں گے
ہر شے پر غالب ہی رہیں گے

مستقبل کی جان بنیں گے
پڑھ لکھ کر انسان بنیں گے
اپنے وطن کی شان بنیں گے
علم کے ہم طالب ہی رہیں گے
ہر شے پر غالب ہی رہیں گے

دھرتی کی مُسکان بنیں گے
پیارے وطن کی آن بنیں گے
علم کی اک دن کان بنیں گے
علم کے ہم طالب ہی رہیں گے
ہر شے پر غالب ہی رہیں گے

علم و ہنر کا چرچا لے کر
دل میں منیرؔ اک دنیا لے کر
اچھی نیک تمنا لے کر
علم کے ہم طالب ہی رہیں گے
ہر شے پر غالب ہی رہیں گے

جناب یوسف ناظم

۱۹۸۵ء





آج سے بیس سال بعد جب چاند کے پتے پر پہلا خط بھیجا جائے گا تو دنیا بھر میں دھوم مچ جائے گی۔ کوئی ڈاکیہ بڑی شان سے اپنے محلے والوں کو یہ خبر سنائے گا۔

"ہٹاؤ ان ریڈیو کی خبروں میں کیا دھرا ہے۔ مجھ سے سنو، آج کی سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ آج ہماری دلی کے پوسٹ آفس میں چاند کو بھیجا جانے والا پہلا خط ڈالا گیا۔"

محلے والے پوچھیں گے اچھا تو کیا چاند کے پتے پر خط بھی بھیجے جا سکتے ہیں؟۔ ڈاکیہ مسکرائے گا اور کہے گا اور نہیں تو کیا۔ یہ ۱۹۸۵ء ہے میاں۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے کوئی ایسی بات کرتا تو لوگ سمجھتے گپ اڑا رہا ہے۔ محلے والوں کی دلچسپی بڑھے گی اور وہ کہیں گے

ارے بھئی ٹھیک ٹھیک سے بتاؤ۔ زیادہ اینٹھو مت۔ ہم بھی تو سنیں کہ وہ خط کیسا تھا۔ ڈاکیہ کہے گا ہونھ کیا بات پوچھی ہے ارے بھئی خط ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے۔ بس اس پر کوئی سات روپیہ کے ٹکٹ لگے تھے۔ صبح صبح میں نے ڈاکخانے کا لیٹر بکس کھول کر جب ڈاک نکالی تو ایک خوب صورت سے لفافے پر میری نظر جم سی گئی۔ لفافہ چھوٹا سا تھا لیکن اس پر سات روپے کا ٹکٹ دیکھ کر میں سمجھا کہ ضرور کسی نے غلطی سے اتنے سارے ٹکٹ اس پر لگا دیے ہوں گے۔ ڈاکیے کی اتنی باتیں سن کر کوئی منچلا کہہ اٹھے گا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ سات روپے کے ٹکٹ دیکھ کر تمھارا من للچا گیا۔" ڈاکیہ بگڑ جائے گا۔ "وہ کوئی اور ہوتے

ہوں گے جن کی رال ہر جگہ ٹپک پڑتی ہے۔"
لوگ کہیں گے" ارے یار تم تو بات بات پر بگڑ رہے ہو۔ آگے بتلاؤ۔"

"کہہ تو رہا ہوں کہ لفافے پر اتنے سارے ٹکٹ دیکھ کر میں نے پتہ جو پڑھا تو اس پر لکھا تھا۔ میکا ولی ٹراف۔ دھنک لاج۔ چاند۔ میں نے وہ خط پوسٹ ماسٹر کو بتایا اور پھر اس پر مہر لگائی۔ وہ خط تھوڑی دیر بعد ہوائی اڈے پر بھیج دیا گیا۔

۱۹۸۵ء میں لوگ اس خبر پر تعجب نہیں کریں گے کیونکہ اس بیس سال کے لمبے عرصے میں تو لوگ چاند پر اپنے اپنے مکان بھی بنوا لیں گے اور وہیں رہنے لگیں گے۔ اور بہت ممکن ہے کہ آج کے کم عمر بچے بیس سال بعد کوئی کرکٹ ٹیم لے کر وہاں ٹیسٹ میچ کھیلنے جائیں۔ دس پندرہ سال بعد جب چاند پر آنا جانا آسان ہو جائے گا تو ہر دل میں یہی تمنا ہوگی کہ کاش ہم بھی چاند پر جا سکتے۔

ہمارا خیال ہے آج سے پچاس سال بعد تو چاند پر آنا جانا اتنا آسان ہوگا جتنا دلی سے لندن جانا یا بمبئی سے سنگاپور جانا آسان ہے۔ آج چاند کی طرف پرواز کرنے والوں کو لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں اور اسے بڑی بہادری کا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن پچاس سال بعد اگر کوئی شخص چاند پر نہیں جائے گا تو لوگ حیرت کریں گے اور کہیں گے۔

حضرت آپ کی عمر کیا ہے۔

جی بس چھتیسواں سال ختم ہوا۔

حضرت! آپ چھتیس سال کے ہو گئے اور اب تک چاند کا سفر نہیں کیا

ہاں بس یوں سمجھیے کچھ میرا ہی دل نہیں چاہا ورنہ پچھلے سال ہی میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہو آتا۔

تو یوں کہیے نا کہ آپ کی فیملی چاند پر ہو آئی ہے۔ تو پھر کوئی حرج نہیں۔

کوئی تعجب نہیں بیس چالیس سال بعد اسکولوں میں یہ پروگرام بنے۔

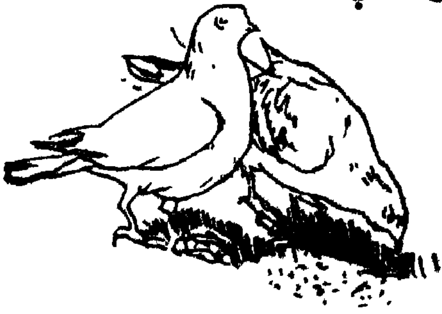
اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم چاند جائیں گے جو جو بچے چلنا چاہیں اپنا نام اپریل تک اپنے کلاس ٹیچر کو دے دیں۔

اس پروگرام کے بعد ہر گھر میں بچے شور مچائیں گے۔

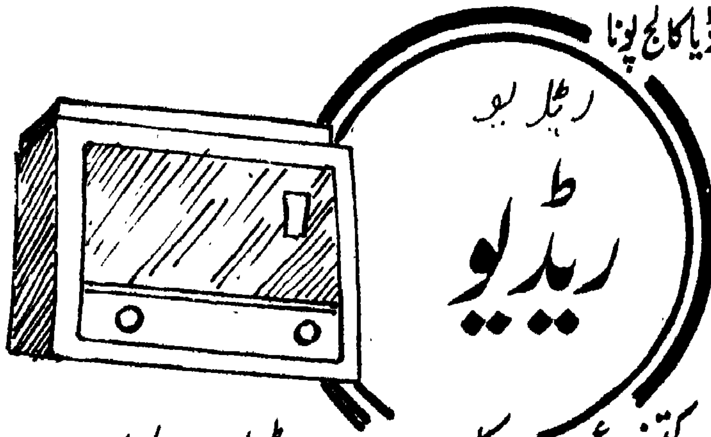
"ممی ممی۔ ڈیڈی سے کہیے ناکہ اس مرتبہ مجھے چاند جانے دیں۔ وہ اپنے تولالی انکل ہیں نا اُن کا لڑکا بھی جا رہا ہے۔ اور پھر اسکول کے اور بھی کئی بچے ہیں۔ پندرہ دن کا تو پروگرام ہی ہے۔ ممی آپ کہیں گی تو ڈیڈی ضرور راضی ہو جائیں گے۔ ڈیر ممی۔ ممی پلیز۔"

شاید، وہاں ٹورنامنٹ بھی ہونے لگیں۔ اور اولمپک کھیلوں کے مقابلے بھی کسی موقع پر چاند پر منعقد ہوں۔ ایک مرتبہ انسان وہاں پہنچ جائے تو پھر دیکھیے کیا ہنگامہ ہوتا ہے۔ کاٹھیاواڑی گھوڑے بھی ہوائی جہاز سے چاند پر بھیجے جائیں گے اور وہاں گھوڑ دوڑ ہوگی۔ ایک بات البتہ ہمیں کھٹکتی ہے کہ چاند پر پہنچنے کے بعد بھوک لگے گی یا نہیں۔ آدمی اتنا اوپر جائے گا تو بالکل ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔ ٹیریلین کپڑے کی طرح۔ اس کا معدہ کام کرے گا یا نہیں۔ بھوک نہیں لگے گی تو کوئی عجب نہیں بعض لوگ دوڑ دوڑ کر چاند جائیں گے اور وہاں بس جائیں گے کہ چلو دن میں تین تین وقت کھانے کے جھگڑے سے چھٹکارا ملا۔ زمین پر پکاؤ اور کھاؤ میں ہی ساری عمر بیت جاتی ہے اس سے تو چاند ہی اچھا کہ نہ پکانا نہ کھانا۔ شربت پیو، ناریل کا پانی پیو، اور خوش رہو۔ اور بہت سے لوگ چاند سے زمین پر واپس آ جائیں گے کہ چاند بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے وہاں بھوک ہی نہیں لگتی۔ آدمی کھائے نہیں تو اور کیا کرے۔

اللہ میاں نے یہ منہ اور پیٹ کیا صرف خوب صورتی کے لیے دیے ہیں۔ زبان کو اگر مسالوں کا ذائقہ نہ ملے تو زندہ رہنے سے حاصل کیا۔ نہیں بھئی۔ ہمارے لیے تو ہماری زمین بھلی۔ غلہ کم سہی، کھانے پکانے کی تکلیف سہی۔ لیکن بغیر کھائے تو ہم جینے سے رہے۔ ہم واپس زمین پر جاتے ہیں اور ایسا ہی ہے تو کبھی ایک آدھ دن کے لیے آ جائیں گے۔ وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ نہیں بھی آئے تو کیا ہوا ٹیلی فون پر تو بات ہو ہی جائے گی۔



جناب پروفیسر آیات داڈیا کالج پونا



کتنی عجیب کل ہے، یہ ریڈیو ہمارا
آواز اور بجلی ، اس کا بنے سہارا
تیزی سے چل رہا ہے، نغمے اُگل رہا ہے
میٹھے سروں کا اس میں، چشمہ اُبل رہا ہے
اس کا بٹن گھما کر ، خبریں جہاں کی سُن لو
قصّے کہانیوں کے ، تازہ سے پھول چُن لو
طبلہ، ستار ، بنسی ، بجتے ہیں اس میں ہر دم
سنتے ہیں جو بھی اس کو، مٹتا ہے اُن کا سب غم
کہتے ہیں کلام اپنا ، شاعر شمار سے ہیں
آواز دی ہے ، کیا داد پا رہے ہیں!
موسم خراب اگر ہو، گھر گھر ضرور ہوگی
سوئی اگر گھماؤ ، دھڑ دھڑ ضرور ہوگی
چھوٹے سے بکس میں کیا، جادو بھرا ہوا ہے
بہلاؤ اپنے دل کو ، یہ میز پر دھرا ہے
کتنی عجیب کل ہے ، یہ ریڈیو ہمارا

ٹیبور سیکلج

ترجمہ

مجیب احمد خاں

کومے واوا

کومے واوا

۵



اس نے ان ریشوں کو اکٹھا کر کے اپنی ران پر رکھا۔ ریشوں کا دوسرا سرا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اور ران سے ان ریشوں کو بٹنا شروع کر دیا۔ منٹ بھی نہ لگا کہ ۳ فٹ لمبی پتلی سی ستلی ہو گئی۔ یہ ستلی اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور خود ایک دوسرے پتے کو پکڑ کر پہلے کی طرح جھٹکا دیا کچھ اور ریشے نکل آئے۔ ان کو بھی اسی طرح بٹ لیا پھر تیسرے پتے کو جھٹکا دے کر ریشے نکالے اور ان کو بھی بٹ لیا۔

اب ان تینوں ستلیوں کو ایک بار پھر اینٹھا اور پھر تینوں کو ملا کر الٹا بل دے دیا تقریباً ۲½ فٹ لمبی اور پنسل جتنی موٹی رسّی تیار ہو گئی۔ یہ رسّی اس نے کپتان کو دی اور بولا "توڑ دو اگر تم سے ٹوٹ سکے"۔ کپتان نے کافی زور لگایا، جھٹکے بھی دیے مگر رسّی نہ ٹوٹی۔ ہم نے بھی باری باری اس کو توڑنے کی کوشش کی مگر بے کار۔

کپتان بولا:۔ "رسّی ہے تو مضبوط مگر اس طرح ۲۰ گز لمبا اور کافی موٹا رسا تیار کرنے میں ایک مہینہ لگ جائے گا"۔

"جی نہیں اگر ہم سب مل کر کام کریں تو سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے رسّے کا تیار ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔"

"مجھے تو مشکل ہی معلوم ہوتا ہے مگر جب تم کہہ رہے ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔" کپتان نے بے دلی سے کہا۔

کوے دادا نے ہم سب سے کہا "جنگل میں چاروں طرف پھیل کر اس پیڑ کو ڈھونڈھو اور اس کے ریشے نکالنے کی کوشش کرو۔ اگر کسی کو کوئی دِقّت پیش آئے تو وہ مجھ سے پوچھ لے۔"

اس کے کہنے کے مطابق ہم سب جنگل میں پھیل گئے۔ کچھ لوگوں نے وہ پیڑ جلد ہی ڈھونڈ لیا۔ جو نہ پہچان سکے ان کی مدد دوسروں نے کی۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ ریشے نکالنے میں لگ گئے اور کوے دادا کے پاس ریشوں کا ڈھیر لگنے لگا وہ ایک گرے ہوئے پیڑ کے تنے پر بیٹھ گیا اور ان کو بٹنے لگا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نوجوان کوے دادا کو سُتلی بٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بولا:۔ "یہ کام تو شاید میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔ آدمی چاہے تو ہر کام کر سکتا ہے صرف شوق اور لگن کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے پاس بیٹھ کر تم بھی بٹو۔ مگر بٹنا ذرا ہلکے ہاتھ سے۔ گتھی یا مروڑی نہ پڑنے پائے۔"

یہ نوجوان کوے دادا کے پاس بیٹھ گیا۔ اور کوے دادا کو دیکھ دیکھ سُتلی بٹنے لگا۔ شروع شروع میں اس کی بٹی ہوئی سُتلی میں کچھ مروڑیاں ضرور پڑیں مگر آہستہ آہستہ اس کی بٹی ہوئی سُتلی بہتر ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد تو اُس کی اور کوے دادا کی سُتلی میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک اور شخص نے بھی سُتلی بٹنا شروع کی اور وہ بھی اچھی خاصی سُتلی بٹنے لگا۔ ریشوں کا ڈھیر کم ہونے لگا اور سُتلی کا ڈھیر بڑھنے لگا۔ ہم سب تین گھنٹے تک اپنے کام میں لگے رہے۔ یکایک کوے دادا نے چلّا کر کہا:

"بس اب ریشے نکالنا بند کر دو۔ بہت ہو گئے ہیں۔"

جب تک ریشے جمع کرنے والے سب لوگ کوے دادا کے پاس آکر جمع ہوں، کوے دا

ور اس کے ساتھیوں نے بقیہ ریشوں کی بھی سُتلیاں بٹ ڈالیں۔

اب ہمارے سامنے پنسل کے برابر موٹی اور تقریباً ۲۵، ۲۵ گز لمبی ۹ سُتلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ کومے داآدا کے آس پاس ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کومے داآدا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے تین تین سُتلیوں کو آپس میں بٹ کر تین رسّیاں تیار کیں۔ ان رسّیوں کی موٹائی تقریباً پون انچ تھی۔ پھر ان تینوں رسّیوں کو بٹ کر ایک موٹا سا رسّا بنایا۔ یہ رسّا دو انچ موٹا تھا۔ جب اس رسّے کو پھیلا کر ناپا گیا تو بیس گز سے کچھ زیادہ ہی لمبا نکلا۔ رسّے کو دیکھ کر سب ہی کے چہرے خوشی سے کھِل اُٹھے۔ کپتان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ رسّا اٹھا کر ہم سب کیمپ واپس آگئے۔ کھانا کھایا اور گپ شپ میں لگ گئے۔ اتنے میں ایک شخص کومے داآدا کے گالوں کے نشانوں کی طرف اشارہ کر کے بولا:۔

"کیوں بیٹا! تمھارے گالوں پر یہ کالے کالے گول گول نشان کیسے ہیں:"

کومے داآدا نے مسکرا کر جواب دیا "ہمارے قبیلے والے ان نشانوں کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ لڑکا اب جوان ہوگیا ہے اور اپنی دیکھ بھال خود کر سکتا ہے:"



کومے داآدا کے اس جواب سے میں مطمئن نہ ہوا۔ میں جانتا تھا کہ ان نشانوں کے پیچھے کوئی اور بات بھی ہے جو یہ نہیں بتا رہا ہے۔ میں نے کہا:۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر داآدا! یہ تو بتاؤ کہ تمھارے گالوں پر یہ نشان پڑے کیسے؟"

کومے داآدا مسکراتے ہوئے بولا:۔

"آپ بغیر معلوم کیے مانیں گے نہیں! اچھا تو سنیے ــ کاراجا قبیلے کی ہر لڑکی اور لڑکا اس وقت کا بڑی بے چینی سے انتظار



کرتا ہے جب اس کے گالوں پر یہ نشان گودے جاتے ہیں۔ ان نشانوں کو قبیلے کی زبان میں 'اوملدورو' کہتے ہیں۔ کوئی لڑکا یا لڑکی اس وقت تک قبیلے کا رکن نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ یہ نشان نہ حاصل کرے۔ ادمارورو کے بعد ہی لڑکا قبیلے کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ شکار کو جا سکتا ہے جلسوں میں، ناچ میں اور بڑے لوگوں کے کھیلوں میں وہی شریک ہو سکتا ہے جس کے گالوں پر یہ نشان ہوں۔ جھاڑ پھونک اور جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کا علم بھی وہی سیکھ سکتا ہے۔

اور اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کا پیام بھی وہی دے سکتا ہے جس کے چہرے پر اومارورو گودا جا چکا ہو۔ لڑکیوں کے لیے بھی یہی شرط ہے۔ وہ بھی اس نشان کو حاصل کر لینے کے بعد ہی قبیلے کی دوسری عورتوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ سکتی ہیں۔ کام کاج، کھیل کود اور ناچ میں سب کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں اور اپنی مرضی سے اپنا شوہر چن سکتی ہیں۔

"لیکن اس نشان کو حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی خاص عمر کو پہنچنے کے بعد یہ نشان آپ سے آپ مل جائے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

"اس کے لیے سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی گھنے جنگلوں سے زندگی کی تمام ضروری چیزیں حاصل کرنے کی مہارت پیدا کرلے۔ اس کام میں قبیلے کا کوئی اور فرد اُس کی کسی قسم کی مدد یا رہنمائی نہیں کرتا۔ اُس کو یہ سب باتیں اپنے بڑوں کو دیکھ کر اور ذاتی مشاہدے کی مدد سے سیکھنی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچپن ہی سے فطرت

گہری نظر سے مطالعہ کرے۔ ہر اچھی اور بُری، ئدہ مند اور نقصان دہ، خطرناک اور بے ضرر یزوں اور جانوروں میں تمیز کرنا سیکھے۔

"پانچ سال ہی کی عمر سے بچوں کو تیر اندازی کی مشق شروع کرا دی جاتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے سفید لوگ اپنے بچوں کو کم عمری ہی میں پڑھنے بٹھا دیتے ہیں۔ تیر اندازی، نیزہ بازی اور شکار کرنے کے فن میں مہارت حاصل کرنا ہمارے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپ کے بچوں کے لیے پڑھنا لکھنا۔ بچپن ہی سے بچوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کمانیں اور ننّے مُنّے تیر دے دیے جاتے ہیں۔ پورے دو سال تک تیر اندازی کی مشق کرتے ہیں۔ کھانے کھیلنے اور تیر چلانے کے علاوہ ہمارا کوئی اور کام ہی نہیں ہوتا۔ یہ زمانہ بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم اپنی کمانیں اور تیر خود بناتے ہیں۔ کمان کی تانت بھی خود ہی بنانی پڑتی ہے۔ آٹھ نو سال کی عمر تک شہد کے چھتّوں سے شہد جمع کرنا بھی سیکھ لیتے ہیں۔ یہ کام مشکل بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ عمدہ اور مزے دار شہد اکٹھا کرنے والی مکھیاں اپنے چھتّے عام طور پر اونچے اور سڑے پیڑوں پر لگاتی ہیں۔ شہد کی تلاش میں پیڑوں پر چڑھنے کی اور شہد نکالنے کی ایک ساتھ مشق ہو جاتی ہے۔ ہمارے بڑے اس کام میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔ وہ تو کہتے ہیں: 'خود کرو، اور خود سیکھو'۔

"دس گیارہ سال کی عمر میں بچے شکار کھیلنے اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے بھی جانے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں اکثر ناکامیاب اور خالی ہاتھ لوٹتے ہیں۔ لیکن ہماری ناکامیوں پر ہمارے بڑے ہم پر ہنستے نہیں۔ مذاق نہیں اڑاتے۔ ہماری ہمت بڑھاتے ہیں۔



" جب کوئی لڑکا کسی بڑے اور خطرناک جانور کے شکار کے ارادے سے نکلتا ہے تو اس پر ظاہر کیے بغیر قبیلے کا کوئی تجربہ کار شکاری اس کے پیچھے لگ لیتا ہے۔ لڑکا جانور کی تلاش کرتا ہے اور موقع پا کر اس پر نشانہ لگاتا ہے۔ اگر نشانہ چوک جائے یا جانور لڑکے پر حملہ کر دے اور صورتِ حال خطرناک ہو جائے تو شکاری کسی جھاڑی سے نکل کر لڑکے کی مدد کو فوراً پہنچ جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے محض اتفاقیہ اُدھر آ نکلا ہو۔"

" ہمیں لکڑیوں کو آپس میں رگڑ کر آگ جلانا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ یہ کام بڑی محنت کا ہے۔ شروع شروع میں بہت مشکل لگتا ہے۔ مگر مشق ہو جانے پر یہی کام بڑا آسان ہو جاتا ہے۔"

" تیرنا اور کینو چلانا بھی بچپن ہی میں سیکھ لیتے ہیں۔ ہر لڑکا یا لڑکی بڑا اچھا تیراک اور کینو چلانے میں طاق ہوتا ہے کبھی کبھی ہمارے بزرگ جان بوجھ کر ہماری کینو الٹ دیتے ہیں ہم پانی میں گر جاتے ہیں، تیرتے ہیں اور کینو کو سیدھا کر کے پھر چلانے لگتے ہیں۔ اس طرح ہمارے دلوں سے گھبراہٹ اور خوف بالکل نکل جاتا ہے اور مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک موقع پر بھی ہمارے حواس ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔"

" دو ایک سال اور گزر جانے کے بعد جب ہمارے بڑے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب لڑکا ہوشیار اور چالاک ہو گیا ہے تو اس کو اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گھنے جنگلوں میں بڑے جانوروں کا شکار کرنے اور خطرناک دریاؤں میں مچھلیاں پکڑنے کی اجازت دے دیتے ہیں لیکن ایسے معرکوں میں ہمارے ساتھ قبیلے کا کوئی نہ کوئی تجربہ کار شکاری ضرور رہتا ہے۔"

(باقی آئندہ)





ناک کٹ گئی

جناب یونس این بھیونڈی

آج سے ہزاروں سال قبل کی بات ہے۔ بنارس میں ایک راجہ برم دت راج کرتا تھا۔ اس راجہ کو تلواریں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے توشہ خانے میں قسم قسم کی تلواریں تھیں اور ملکوں ملکوں سے صناع تلواریں لے کر اس کے دربار میں آیا کرتے تھے اور منہ مانگے دام لے جاتے تھے۔ تلواروں کو پرکھنے کے لیے اس راجہ نے اپنے دربار میں ایک تجربہ کار تلوار باز سپاہی کو ملازم رکھا۔ وہ سپاہی اپنی ناک سے سونگھ کر ہی تلوار کی خوبیاں اور خامیاں بیان کر دیتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی نیت خراب ہو گئی اور وہ صناعوں سے رشوت لینے لگا۔ جو کاری گر اس کی مٹھی گرم کرتے وہ اُن کی تلواروں کی جھوٹی تعریفیں راجہ سے بیان کرتا اور راجہ اس کی بات مان کر کاری گروں کو منہ مانگے دام دے دیتا۔ جو غریب کاری گر سپاہی کو رشوت نہ دے پاتے وہ ان کی تلواروں میں عیب نکالتا۔ ہوتے ہوتے یہ بات ایک نوجوان غریب کاری گر کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اس سپاہی کو سبق دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس کے پاس اس کے پردادا کے وقت کی ایک بہت قیمتی اور اعلیٰ تلوار تھی۔ اس نے اس تلوار کی میان میں مسالا بھرا اور صبح سویرے دربار میں جا کر وہ تلوار فروخت کرنے کے لیے راجہ کے سامنے پیش کی۔ راجہ نے سپاہی کو بلا کر تلوار کو پرکھنے کا حکم دیا۔ سپاہی نے ایک مرتبہ ناک بھوؤں چڑھا کر اس نوجوان صناع کی طرف دیکھا اور تلوار میان سے نکال کر سونگھنے لگا۔ تلوار سونگھتے ہی اُسے زور کی چھینک آ گئی۔ چھینکتے ہی اس کی ناک تلوار سے جا ٹکرائی

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

جناب محمد امین

کوئی بات ناممکن نہیں

۱۸ر مارچ ۱۹۶۵ء کا اخبار دیکھ کر ہماری آنکھیں تو سچ مچ کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

روس نے ایک نیا شگوفہ کھلایا تھا! خبر "ہیئت" جہاز کے اڑانے کا اعلان تھا۔

جلا نا بھی ملا باز بھی تھے۔ اخبار والوں کی زبان یہ خبر اپنی جگہ خود بہت سنسنی خیز تھی۔ بہت زیادہ سنسنی خیز!

مگر بات تو اس سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ بہت آگے۔ بہت آگے! جہاز کی اُڑان کے آدھ گھنٹے بعد ایک خلا باز جہاز میں سے نکلا اور تیرنے لگا۔ جی ہاں — سچ مچ تیرنے لگا — کافی دیر تک تیرتا رہا! — بھلا کہاں؟ خلا میں بالکل خلا میں —

آپ نے اڑن کھٹولے کی، آدم زاد کے آسمان پر اُڑنے کی بات دادی اماں کی کہانیوں میں سنی ہوگی۔ یہ کہانیاں پرانی ہیں۔ ہزاروں برس پرانی بچپن میں انھیں سن سن کر آپ کا جی بھی آسمانوں کی سیر کرنے کو چاہتا ہوگا۔

اصل میں انسان کا یہ خواب بہت پرانا ہے، ہزاروں سال پرانا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ خواب پورا ہوگا۔

مگر روسی سائنس والوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ ایک خواب کو بہت پرانے ہزاروں برس پرانے خواب، ایک ان ہونی بات کو اصلیت کی شکل دے دی کیسی عجیب بات ہے!

یہ دو بہادر روسی خلا باز لیونوف اور بلیاییف تھے۔ خلائی جہاز سے نکل کر خلا کی سیر کرنے والے لیونوف صاحب تھے۔

ان کا خلائی جہاز یا راکٹ جس اونچائی پر تھا وہاں کشش کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ آدمی اتنی اونچائی پر عجیب کیفیت محسوس کرتا ہے اسے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا ہو اور اس میں ذرا سا بھی وزن نہ ہو۔ لیونوف کو بھی اس بے وزنی کا احساس تھا۔ باوجود اس کے وہ اپنا کام بڑی آزادی سے انجام دیتے رہے۔ لیونوف نے اپنے خلائی جہاز سے نکل کر خلا میں یوں ہی چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ ان کے بدن پر ایک خاص قسم کا لباس تھا۔ یہ بالکل سائنٹفک طریقے پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ اپنی جگہ خود ایک چھوٹی سی لیبارٹری، معمل یا سائنس کی تجربہ گاہ تھی۔ یوں سمجھیے کہ ایک چھوٹا سا کیپ سول تھا اور اس کیپ سول کو بجلی، ریڈیو اور دوسرے سائنسی سامانوں سے لیس کر لیا گیا تھا۔ ہوا کا بھی انتظام تھا غرض روس کے سائنس دانوں کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

ہوا میں تیرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس لیے احتیاطاً ایک تار کے ذریعے لیونوف کے لباس کو خلائی جہاز سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اب آگے کی بات سنیے۔

لیونوف جیسے ہی خلائی جہاز سے باہر آئے انھوں نے ایک طرف سے ایک ڈھکن ہٹایا۔ اور ان کے لباس میں فٹ کیا ہوا کیمرہ تیزی سے آس پاس کی تصویریں کھینچنے لگا۔ لیونوف نے جلدی سے کیمرے کا رخ زمین کی طرف کر دیا لیکن زمین کی تاریکی دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئی۔

لیونوف اپنے جہاز سے ۲ کلومیٹر دور تک خلا میں اطمینان سے بلا کسی جھجک کے تیرتے چلے گئے۔ زمین ان کو چپٹی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن شفق پر اس کی گولائی کا عکس پڑتا نظر آرہا تھا۔ لیونوف کو آسمان تاریک، لامحدود لیکن بہت ہی پرکشش نظر آرہا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ لیکن وہ جھل مل جھل مل نہیں نہیں کر رہے تھے۔ بہت تیزی سے جگمگا رہے تھے۔ سورج کی چمک بھی بہت تیز تھی۔ زمین کا آدھا حصہ روشن تھا۔ اور دوسرا حصہ تاریک تھا۔ نیچے جب انھوں نظر ڈالی تو اپنے ملک کے شہر دریا اور ساحل سبھی چیزیں انھوں نے صاف پہچان لیں۔ ۲۰ منٹ تک وہ اپنے راکٹ سے باہر فضا میں معلق رہے۔ لیکن وہ

قیدی نہیں تھے۔ نہایت آزادی کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ پیر اس طرح ہلا رہے تھے گویا وہ پانی میں تیر رہے ہوں۔ ان کے خیالات ٹھیک تھے۔ یعنی سوچنے سمجھنے کی طاقت میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ قوت برداشت باقی تھی۔

اُن کو ایسے حالات کا تجربہ ہو رہا تھا۔ جس کا اندازہ آج تک کسی انسان کو نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھی بلیائیف سے بات چیت بھی کرتے رہے۔ انھوں نے بڑی سنسنی محسوس کی۔ اس میں شک نہیں کہ زمین پر رہ کر جتنی کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے زیادہ ان کو محنت کرنی پڑی۔ بے وزنی کے عالم میں کچھ لکھنا یا کوئی چیز نوٹ کرنا مشکل نہیں تھا۔ بس صرف زیادہ زور سے پنسل دبانی پڑتی تھی۔ اور بار بار مشق کرنے کی ضرورت تھی۔ جہاز سے ۵ کلومیٹر دور تک جانے کے بعد پروگرام کے مطابق تجربہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد وہ پھر بحفاظت تمام خلائی جہاز میں واپس آ گئے۔

دیکھا آپ نے! لیونوف نے پرانے قصے کہانیوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ زمین کے گرد دوسرے چکر کے دوران لیونوف جب خلا میں باہر آئے اور پھر واپس گئے تو بلیائیف نے محسوس کیا کہ راکٹ ہل رہا ہے جب لیونوف کا بوٹ راکٹ کی دیوار سے ٹکرایا اور انھوں نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا تو کرنل بلیائیف کو اس کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

ووسخود دوم میں فٹ کئے ہوئے ٹیلی ویژن کے ذریعے یہ ساری باتیں زمین پر نشر کی جا رہی تھیں۔ لیونوف نے خلائی جہاز کے باہر اور واپسی پر بھی کوئی برا اثر محسوس نہیں کیا۔ جہاز کے کمانڈر بلیائیف بھی اچھی طرح کام کرتے رہے۔

ووسخود دوم ۹۰ منٹ میں زمین کا ایک چکر لگا رہا تھا۔ ایک طرف سے اس کی اونچائی ۱۰۸ میل (۱۷۳ کلومیٹر) اور دوسری طرف سے ۳۰۷ میل (۴۹۵ کلومیٹر) تھی۔ کل ۲۶ گھنٹے تک ووسخود دوم خلا میں چکر لگاتا رہا۔ اس کی کامیاب اڑان سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ انسان خلا میں پلیٹ فارم بنائے گا اور اس طرح وہ خلا کے جہاز کی مرمت بھی کر سکے گا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خلاباز آزادی کے ساتھ خلا میں حرکت کر سکتے ہیں۔ اس پلیٹ فارم سے خلا کے وزنی جہاز چاند

پر اور دوسرے سیاروں پر جانے کے لیے بھی اڑائے جائیں گے۔

لندن میں برطانیہ کے مشہور سائنس داں لووِل نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ روس کے خلا کے انجینیر اس سال کے آخر میں یا اگلے سال کے شروع میں خلا کے اندر پلیٹ فارم بنانا شروع کر دیں گے اور پھر اسی پلیٹ فارم سے چاند پر جانے والے سیاح اپنا قدم آگے بڑھائیں گے۔

۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ء سے جبکہ گگارن نے خلا میں پہلا چکر لگایا تھا اب تک بہت سے روسی اور کئی امریکی خلاباز خلا میں سفر کر چکے ہیں لیکن لیونوف اور بلیائیف کے نئے کارنامے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ۱۹۷۵ء میں ایک روسی سائنس داں کی پیشین گوئی کے مطابق انسان چاند پر ضرور بالضرور قدم رکھے گا۔

لیونوف اور بلیائیف کی کامیاب اڑان کے بعد سوویت حکومت نے دنیا کی تمام حکومتوں اور عوام کے نام ایک پیغام میں اعلان کیا ہے "بیرونی فضا میں آدمی نے قدم رکھ کر اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض کی تکمیل کر کے ایک نیا سائنسی کارنامہ انجام دیا ہے"۔ اس پیغام میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انتہائی دشوار ترین مسئلوں کو حل کرنے کے لیے عملی حالات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ ان مسئلوں میں چاند اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں تک پرواز اور ان کے اترنے کے مسئلے بھی شامل ہیں۔" پیغام میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام دنیا نے ایک مرتبہ پھر دیکھ لیا کہ سوویت خلائی ٹیکنیک، ان کے طاقت ور اور قطعی درست راکٹ خلائی جہازوں کے سازوسامان اور خلائی پرواز کے متعلق سلامتی کے کل نظام کتنے برتر اور اعلیٰ ہیں۔ اس پرواز نے ایک بار اور اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ سوویت سائنس والوں کا دماغ، ڈیزائن سازوں کی اعلیٰ ذہانت، کارکنوں کے ہنرمند ہاتھ ان تمام مسئلوں کو حل کر سکتے ہیں جنھیں سوویت حکومت ان کے سامنے پیش کرے۔ پیغام میں زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ووسخود دوم اپنے پیش رو خلائی جہازوں کی طرح امن و ترقی کے مقصد کی خدمت کرتا ہے۔ سوویت حکومت نے بارہا اعلان کیا ہے اور اب ایک بار پھر انتہائی خلوص سے اعلان کرتی

ہے کہ سوویت یونین نے بیرونی خلا میں امن کی پالیسی پر عمل کیا ہے اور بغیر انحراف کے اس پالیسی پر عمل کرے گی۔

پیغام میں کہا گیا ہے کہ سوویت یونین کسی ملک کو ڈرانا دھمکانا نہیں چاہتا بلکہ تمام قوموں کے ساتھ اشتراک کی جد و جہد کرتا ہے۔ سوویت حکومت عام اور مکمل ترک اسلحہ اور گفت و شنید کے ذریعے تمام بین الاقوامی جھگڑوں کی تصفیے کی حمایت کرتی ہے۔

دو سخود دوم کی واپسی کے سو گھنٹے بعد امریکہ نے گرلیم اور جان دو خلا بازوں کو چکر لگانے کے لیے خلا میں بھیجا۔ ان خلا بازوں نے تین چکر لگائے اور پچھلے خلا بازوں کی طرح یہ دونوں بھی سمندر میں اتر آئے۔ اس راکٹ یا مصنوعی چاند کا نام مولی براؤن تھا۔ امریکہ کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا لیکن یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ روس کے مقابلے میں امریکہ بہت پیچھے ہے۔ روسی خلا باز اب تک ۳۰۰ سے زیادہ چکر لگا چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں امریکی خلا باز مشکل سے ۶۰ چکر لگا سکے ہیں۔ پچھلے ہفتے جو اڑان ہوئی تھی۔ گویا کہ ایک ساتھ دو خلا بازوں کا مل کر اڑنا پہلی بار ہوا تھا۔

مذہبی کتابیں ہندی میں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لیے بہت سی عمدہ مذہبی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پسند کی گئیں اور ان کے بیسیوں ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ کتابیں بہت سے اردو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ہندی کی تعلیم عام ہونے کے باعث اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ ان کتابوں کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے دو کتابیں، ہمارے نبیؐ، اور آں حضرتؐ ہندی پڑھنے والے بچوں کے لیے بہت احتیاط کے ساتھ شائع کی ہیں۔

آں حضرتؐ ہندی میں حضرت محمدؐ کے نام سے چھپی ہے۔

ہمارے نبیؐ قیمت ۳۰ پیسے

اور

حضرت محمدؐ قیمت ۶۰ پیسے

پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

جناب محمد عبیداللہ شریف



۱۔ عینک ۱۲۸۵ء میں الیکز ینڈر ڈی اسپائنا نے ایجاد کی۔

۲۔ دوربین ۱۶۰۸ء میں لی پربی اور جین سن نے بنائی۔

۳۔ بیرومیٹر ۱۶۴۳ء میں ٹوری سلی نے ایجاد کیا۔

۴۔ دیا سلائی ۱۶۸۰ء میں گارڈفری ہینک وٹز نے بنائی۔

۵۔ غبارہ ۱۷۸۳ء میں مونٹ گول فیر نے ایجاد کیا۔

۶۔ ریلوے انجن ۱۸۲۹ء میں جارج اسٹیفنسن نے ایجاد کیا۔

۷۔ ٹیلیگراف ۱۸۳۳ء میں گاس ود ویبر نے ایجاد کیا۔

۸۔ کیمرہ ۱۸۳۷ء میں ڈیگوری اور نیپ جی نے ایجاد کیا۔

۹۔ موٹر جی۔ آر۔ سوئنز نے ایجاد کی اور پٹرول سے چلنے والی موٹر ۱۸۴۱ء میں کارڈال میٹر نے بنائی۔

۱۰۔ سیفٹی پن ۱۸۴۹ء میں وہنٹ نے بنائی۔

۱۱۔ ۱۸۶۴ء میں واٹرمین نے فاؤنٹین پن ایجاد کیا۔

۱۲۔ ٹائپ رائٹر ۱۸۷۳ء میں شولس نے بنایا۔

کیوری نے لگایا۔

۱۳۔ ٹیلی فون ۱۸۷۶ء میں گراہم بیل نے ایجاد کیا۔

۱۴۔ گراموفون ریکارڈ ۱۸۷۶ء میں ایڈیسن نے بنائے۔

۱۵۔ وائرلیس ریڈیو مارکونی نے ۱۸۹۵ء میں ایجاد کیا۔

۱۶۔ ریڈیم کا پتہ ۱۸۹۸ء میں فرانس کی مادام کیوری نے لگایا۔

۱۷۔ ایکسرے مشین ۱۸۹۵ء میں جرمن پروفیسر رانگٹن نے ایجاد کی۔

۱۸۔ ہوائی جہاز ۱۹۲۵ء میں سموئل پی لانگلی نے بنایا۔

۱۹۔ ٹیلی ویژن ۱۹۲۶ء میں جان۔ بل۔ بیرڈ نے ایجاد کیا۔

پیام تعلیم مقامی طور پر کہاں کہاں ملتا ہے

اورنگ آباد: سعید بک ڈپو شاہ گنج

بیجاپور: الطاف بک ڈپو۔ بڑی کمان

بتیا: سراج الحسین خاں، گنج دوم

بھوپال: مکتبہ شرقیہ، ابراہیم پورہ

برہان پور: رشید بک ڈپو، منڈی بازار

پٹنہ: محمد شفیع الدین، سبزی باغ

" بک امپوریم، سبزی باغ

[illegible]پور: قیام الدین، بستو پور

جودھپور: اردو مرکز، لائقان

بیجاپور: بیجاپور بک سینٹر

بیلگام: ونیس بک اسٹال، سینٹرل بس اسٹینڈ

مدراس: ۳ نصیر نیوز ایجنسی ویری ہائی روڈ

دھولیہ: عبدالحمید کتب فروش

رانچی: سب رنگ بکس، مین روڈ

سوپور (کشمیر): عبدالسبحان، کتب فروش

علی گڑھ: بال برادری، دانیال کالج

کرلا (بمبئی): صبح ایشیا، پائپ روڈ

مدراس: ۵ نذیر بک ڈپو۔ ٹی۔ ایچ روڈ

مالیگاؤں (ناسک): مکتبہ اطفال، بدرکا باڑہ

ہبلی: جمیل بک ہاؤس، بھنڈی واڑہ بیس

ہزاری باغ: جاوید بک ڈپو، بڑا بازار

پونہ: آزاد بک ڈپو، بنڈل روڈ

حیدرآباد: ایم احمد علی ایجنٹ عابد روڈ

دینام باڑی: شاد اسٹور سی آئی روڈ



بھارت درشن

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

جامع مسجد دہلی

دہلی کی جامع مسجد مغلیہ خاندان کے "معمار بادشاہ" شاہ جہاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے شاہ جہاں کی تخت نشینی تو آگرہ میں ہوئی تھی اور وہ رہنا بھی وہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کی چہیتی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ بھی وہیں تھا مگر آگرہ کا شہر، اس کے گلی کوچے اور بازار وغیرہ شاہی جلوسوں کے لیے بہت تنگ ثابت ہوئے۔ شاہ جہاں نے جب ان کو چوڑا کرانا چاہا تو آگرہ والے اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر شاہ جہاں کو دہلی کا رخ کرنا پڑا اور دریائے جمنا کے کنارے دہلی کے ساتویں شہر شاہ جہاں آباد کی نیو رکھ دی گئی جسے آج کل پرانی دہلی کہتے ہیں۔ یہاں بادشاہ نے اپنے رہنے کے لیے لال قلعے جیسا محل بنوایا، چاندنی چوک جیسا وسیع بازار تیار کیا شہر کے چاروں طرف فصیل اور اس میں بڑے بڑے دروازے بنوائے مگر جس چیز نے شاہ جہاں آباد کا سر اونچا کر دیا وہ یہاں کی جامع مسجد ہے شاہ جہاں نے اپنے محل کے لیے تو جمنا کے کنارے جگہ پسند کی مگر خدا کے گھر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اونچی جگہ پر واقع ہو اس لیے جامع مسجد کو شاہ جہاں آباد کی سب سے اونچی جگہ ایک پہاڑی پر بنوایا گیا جسے بھوجلا پہاڑی کہتے ہیں۔

دہلی کی جامع مسجد ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی مشہور ہے۔ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور پرانے زمانے کے لوگوں کی کاریگری دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہ مسجد بہت بڑی اور بہت لمبی چوڑی ہے۔ اس

مسجد کا اعلیٰ تناسب، اس کے گنبدوں کا سڈول پن، اس کے میناروں کا بانکپن، اس کے دالانوں کی مناسب لمبائی چوڑائی، اس کے اونچے اونچے دروازوں کی بناوٹ اور ان میں چھوٹی چھوٹی برجیوں کی سجاوٹ، مسجد کی خوب صورت محرابیں اور ان پر عربی کے خوشنما کتبے! یہ ہیں وہ باتیں جن کی وجہ سے دہلی کی جامع مسجد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں سربلند ہے۔

شاہ جہاں کے ایک وزیر تھے سعداللہ خاں اور میر عمارت کا نام تھا استاد خلیل۔ دلی کی جامع مسجد ان ہی دونوں آدمیوں کی نگرانی میں بنی تھی۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ چھ ہزار راج، بیلدار، مزدور، سنگ تراش اور کتبہ نویس وغیرہ چھ برس تک روزانہ اس مسجد کے بنانے میں لگے رہے تب جاکر ۱۶۵۸ء میں یہ مسجد بن کر تیار ہوئی۔ اگرچہ ہر قسم کا پتھر بہت سے راجاؤں اور نوابوں نے بادشاہ کو نذر کیا پھر بھی لاکھوں روپیہ صرف مزدوری پر خرچ ہوگیا۔ مسجد میں زیادہ تر سرخ پتھر لگا ہوا ہے مگر سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا استعمال بھی موقع موقع سے کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب مسجد بن کر تیار ہوئی تو عید بالکل قریب تھی۔ بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ ہم عید کی نماز یہیں پڑھیں گے اس پر وزیر اور میر عمارت بہت گھبرائے کیونکہ ہزاروں من ملبہ مسجد کے اندر پڑا ہوا تھا جس کو اٹھانا باقی تھا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا تو حکم دے دیا کہ جو چیز جس کے ہاتھ لگے اٹھالے جائے۔ پھر کیا تھا چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے ساری مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ اٹھ گئی۔ مسجد صاف ہوگئی اور فوراً فرش فروش، شیشہ آلات سے سجا کر مسجد کو دلہن بنا دیا گیا۔ پھر سارے شہر نے اپنے بادشاہ کے ساتھ اس مسجد میں عید کی نماز پڑھی اور خوب خوشیاں منائیں۔

جامع مسجد خوب صورت تو ہے لیکن اس کی خوب صورتی اس وجہ سے اور زیادہ نکھر گئی ہے کہ اس کی کرسی بہت اونچی ہے۔ کرسی کی اونچائی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسجد کے پورب، دکھن اور اتر کی طرف ایک ایک بڑا پھاٹک ہے اور اس پھاٹک تک پہنچنے کے لیے

تیس چالیس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں یہ سیڑھیاں
بہت لمبی اور کافی چوڑی ہیں۔ سب سیڑھیاں
مل کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا بھاری چبوترہ
بنا ہوا ہے۔ ان سیڑھیوں پر ہر قسم کے سیکڑوں
دوکاندار بیٹھتے ہیں اور شام کے وقت عام طور
پر اور جمعہ کی نماز کے بعد خاص طور پر یہاں بڑی
رونق رہتی ہے۔ اندر مسجد کا صحن بہت بڑا
ہے اور بیچوں بیچ وضو کرنے کے لیے بڑا حوض
بنا ہوا ہے۔ سامنے تو مسجد کا اصل دوہرا
دالان ہے اور باقی تین طرف اکہرے دالان ہیں
جن کے دروازے دو طرف کھلے ہوئے ہیں۔
ان دالانوں کے بیچ میں تینوں طرف بڑے
بڑے پھاٹک ہیں جن کی بارہ دری بھی بہت
خوب صورت ہے۔ اتّر اور دکھن کے پھاٹک
تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں لیکن پورب کی طرف کا
پھاٹک جس کا رخ لال قلعہ کی طرف ہے عام طور
پر بند رہتا ہے۔ اسی پھاٹک سے بادشاہ داخل
ہوتے تھے۔

مسجد کا اصل دالان بہت اونچا ہے۔
محرابیں بھی کافی بڑی بڑی ہیں۔ اندر کا فرش
سنگ مرمر کا ہے اور کالے پتھر سے اس پر مصلوں
کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ دلاویز
وہ کتبے ہیں جو مسجد کے محرابوں پر بہت خوبصورتی
سے لکھے گئے ہیں۔ خاص دالان کے اوپر پیازی
شکل کے تین گنبد ہیں جن کو کرسی دے کر بنایا
گیا ہے۔ گنبد سنگ مرمر کے ہیں لیکن ان میں
سنگ موسیٰ کی کالی کالی دھاریاں عجب بہار
دکھاتی ہیں۔ گنبد کے اوپر سنہری کلس ہیں جو
سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں اندر بہت
قیمتی جھاڑ فانوس لگے ہیں جن سے آنکھوں میں
چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔ دالان کے دونوں طرف
ایک سو تیس فٹ اونچے دو مینار ہیں یہ بھی لال
پتھر کے ہیں اور ان میں سفید پتھر کی کھڑی کھڑی
پٹیاں پڑی ہیں۔ ان میناروں کے اندر چکر دار
زینہ ہے اگر آپ ان کے اوپر چڑھ کر شاہ جہاں
آباد پر ایک نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا
نمونے کا ایک چھوٹا سا شہر آپ کی آنکھوں کے
سامنے موجود ہے۔ سامنے ہی لال قلعہ اپنے
سینے میں پرانی یادوں کو لیے جمنا کی گود میں
آرام کر رہا ہے۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا
بیگم کے چاندنی چوک میں وہی پہلے کی سی چہل پہل
ہے۔ گردوارہ سیس گنج کے کلس دلی والوں کو

مذہبی میل ملاپ کا سبق دے رہے ہیں۔ دریبہ بلی ماران، چاوڑی بازار اور مٹیا محل کے محلے اسی پرانے انداز میں آباد ہیں اور ذرا فاصلے پر نئی دلّی کا شہر اور اس کی عمارتیں اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ تین سو سال گزرنے کے بعد آج بھی دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے۔

آج کل جامع مسجد میں سب سے بڑی نماز رمضان کے مہینے میں الوداع کے دن ہوتی ہے۔ دور دور کے شہروں سے ہزاروں آدمی یہاں نماز پڑھنے آتے ہیں۔ ساری مسجد، دالان، صحن، چھتیں، برجیاں اور سیڑھیاں سب کھچا کھچ بھر جاتی ہیں۔ باہر دور تک میدان میں آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ راستہ بند ہو جاتا ہے سڑکوں پر، دکانوں پر غرض کہ آس پاس کے چپّہ چپّہ زمین پر لوگ نماز پڑھتے ہیں۔

شاہ جہاں کی دوسری عمارتوں کی طرح جامع مسجد کی شان بھی نرالی ہے۔ صبح کو نکلتے ہوئے سورج کی کرنیں پوری عمارت کو جگمگا دیتی ہیں اسی طرح چودھویں رات کے چاند کی بھرپور چاندنی میں بھی جامع مسجد جھم جھم کر کے چمکنے لگتی ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر جامع مسجد کی خوب صورتی برسات کے موسم میں نکھر جاتی ہے جب کالی کالی گھٹائیں آسمان پر ہوں تو اس کے اُجلے اُجلے گنبد اور پتلے پتلے دھاری دار مینار ایک سماں پیدا کر دیتے ہیں ایسے موقعے پر جامع مسجد کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

ناک کٹ گئی (بقایا صفحہ ۲۵)

اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نوجوان کاریگر نے تلوار لے کر میان میں واپس رکھ لی اور بیچنے سے انکار کر کے دربار سے چل دیا۔ رشوت خور سپاہی کو اپنے کیے کا پھل ملا۔

(مرکزی خیال ایک 'جاتک کتھا' سے)

جناب سعادت نظیر



چاچا نہرو

سب سے اچھے چاچا نہرو
یادیں اُن کی، پیار کے پہلو

ایک مجاہد آزادی کے
اور مخالف بربادی کے

رات میں روشن ایک منارہ
جیسے گگن پر کوئی ستارہ

نام ہے اُن کا، دن کا اُجالا
کام ہے ان کا، سب سے نرالا

اُن کا ارادہ جیسے ہمالا
ان کا دل عظمت کا شوالا

اُن کی نس نس میں تھی شرافت
ہر دل پر تھی اُن کی حکومت

اُن کی محبت بول رہی تھی
کانوں میں رس گھول رہی تھی

آؤ، ان سا کام کریں ہم
دیس کا اونچا نام کریں ہم

محنت سے ہم جی نہ چرائیں
اور قدم مل جل کے بڑھائیں

جناب مقبول احمد سیوہاروی

حکومت آنکھ کھول کر کی جاتی ہے

کہتے ہیں جس طرح دنیا کے بادشاہ ہوتے ہیں، وزیر ہوتے ہیں، بڑے بڑے حاکم ہوتے ہیں، خدا کے کچھ نیک بندوں کے بھی عہدے ہوتے ہیں۔

ان میں بھی گورنر، وزیر، مجسٹریٹ، کوتوال اور سپاہی ہوتے ہیں مگر نہ کوئی ان کے محکمے کو جانتا ہے نہ ان کے عہدے سے واقف ہوتا ہے۔ بس خدا کے نیک بندے جن کا اس محکمے سے تعلق ہوتا ہے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ یوں تو دنیا کے حاکم قانون بناتے ہیں اور پارلیمنٹ میں منظور کرتے ہیں مگر اصل میں تو یہ اسی قدرتی خفیہ محکمے کے منظور کیے ہوئے قانون ہوتے ہیں، جنھیں شہروں شہروں میں لاگو کر دیا جاتا ہے اور جن کی پابندی فوج، پولیس اور کرسی پر بیٹھنے والے مجسٹریٹ کیا کرتے ہیں، ایسا ہی ایک قصہ ہم تمھیں سنانا چاہتے ہیں۔

یہ بہت دن پہلے کی بات ہے دلّی شہر میں بڑی ابتری تھی دن کی روشنی میں چوریاں ہوتی تھیں، جیبیں کاٹی جاتی تھیں ذرا ذرا سی بات پر مار پٹائی ہو جاتی تھی پولیس اپنی ڈیوٹی سے غافل رہتی تھی، سب کچھ دیکھتی تھی پھر بھی غنڈے اپنی من مانی کرتے تھے۔

غنڈے اکڑتے پھرتے تھے، نہ ان کی دیکھ بھال تھی نہ انھیں کوئی پکڑتا تھا۔ پولیس ان کی یار تھی یہ پولیس کے یار تھے اور دونوں کی یاری سے دلّی والے خوار تھے۔ مگر کچھ بول نہ سکتے تھے ایک طرف پولیس کا ڈر دوسری طرف

غنڈوں کا خوف، جان ضیق میں تھی۔ اسی دلی میں اُن دنوں ایک بڑے مولانا رہتے تھے۔ یہ مولانا بھی تھے اور خدا تک پہنچے ہوئے بھی تھے۔ ان کا نام تھا شاہ عبدالعزیز، رحمتہ اللہ علیہ۔ دلی کے کسی آدمی نے سوچا۔ مولانا خدا تک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ وہ مخفی محکمے کے افسروں کو جانتے ہوں گے کہ آج کل کس کی ڈیوٹی ہے جسے شہر کے انتظام کی ذرا پروا نہیں، اور یہ چوری، ڈکیتی، جیب تراشی مار کوٹ، دھول دھپا شریفوں کی ذلت و خواری کب تک رہے گی۔

یہ صاحب مدرسہ میں جہاں مولانا پڑھایا کرتے تھے پہنچ گئے اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ مولانا درس سے فارغ ہوئے تو انھوں نے عرض کیا۔ حضرت مخفی عہدیداروں میں آج کل کس کی ڈیوٹی ہے کہ تمام دلی میں بدانتظامی پھیلی ہوئی ہے، سڑکیں کوڑے کرکٹ سے اٹی پڑی ہیں۔ نلوں میں کبھی پانی ملتا ہے اور کبھی نہیں ملتا، روشنی کبھی پوری بہار پر آجاتی ہے اور کبھی اندھیر اگھپ ہو جاتا ہے جس سے اُچکے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دن کی روشنی میں جیب تراشی ہوتی ہے پولیس دیکھتی ہے اور پروا نہیں کرتی، نہ انصاف ہے نہ دیکھ بھال ہے۔ دلی والا کوئی مطمئن نہیں۔ ہر ایک کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت دکان لٹ جائے، گھر جلا دیا جائے۔ نہ جانے کس وقت راہ چلتے کوئی مار بیٹھے۔

مولانا نے فرمایا۔ ہاں بھئی یہ اللہ کے بھید ہیں تم اس جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ سائیں کے کھیل جسے چاہے بنائے جسے چاہے بگاڑے۔

یہ صاحب ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے کہ آپ دانائے راز ہیں خدا کے لیے بتا دیجیے۔ زیادہ خوشامد کی تو مولانا نے فرمایا آج کل ایک سبزی فروش اس مخفی محکمے کی افسری کر رہے ہیں ساری دلی کا انتظام ان ہی کے سپرد ہے بنائیں یا بگاڑیں۔ پہچان یہ ہے سفید لمبی داڑھی چاروں طرف آدمیوں کی بھیڑ، کھوٹے پیسوں کی سبزی بھی اتنی ہی دے دیتے ہیں جتنی کھرے پیسے کی دیتے ہیں سبزی منڈی میں جا کر انھیں دیکھ لیجیے۔

یہ صاحب سبزی منڈی پہنچے تو جیسے

کچھ مولانا نے فرمایا تھا ایسی ہی سب باتیں نظر آئیں۔ پر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حالات نے پلٹا کھایا اور یہ عالم ہو گیا کہ جہاں کسی غنڈے نے جیب کی طرف ہاتھ چلایا پولیس نے ڈانٹا کیا کرتا ہے۔ اور دم کی دم میں ہتھکڑی ڈال دی، ذرا کسی نے کسی کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھا اور پولیس نے آواز دی۔ کیوں بے کیوں گھورتا ہے، شامت تو نہیں آئی ہے۔ کسی غنڈے کے جوتے لگ رہے ہیں کسی کی بید سے خبر لی جا رہی ہے۔ غنڈے کونوں میں چھپتے پھرتے ہیں، سڑکیں صاف ہو رہی ہیں، پانی کی ریل پیل ہے، کیا مجال جو منٹ بھر کے لیے اندھیرا ہو جائے، چوروں کی صورت دکھائی نہیں دیتی ایسا لگتا ہے کہ سب چور دلّی چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔

یہ صاحب خوشی خوشی مولانا کی خدمت میں پہنچے اور بولے، مولانا!! کیا مخفی محکمے کے عہدے دار بدل گئے۔

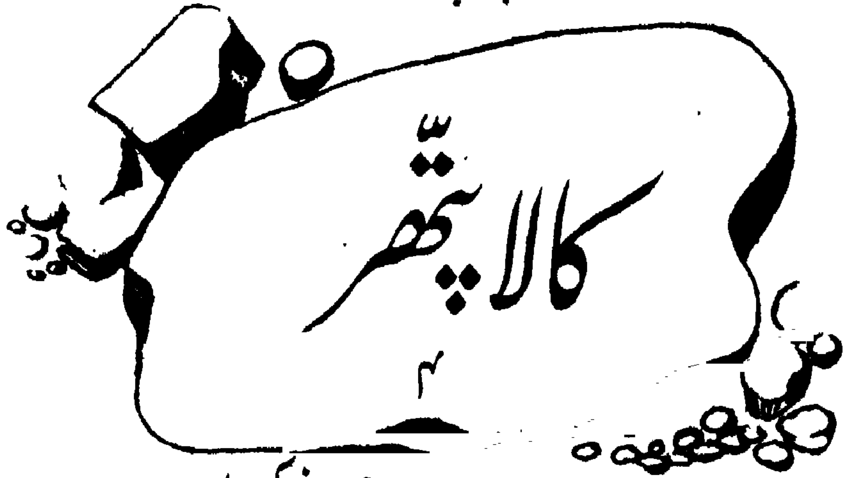
مولانا بولے یہ خدا کے بھید ہیں تم اس کھوج میں کیوں پڑ گئے، جاؤ اپنا کام کرو۔ یہ بولے حضرت اس دفعہ اور بتا دیجیے کس کی حکومت ہے آیندہ پھر کبھی آپ کو تکلیف نہ دوں گا۔ زیادہ خوشامد کی تو مولانا پسیج گئے اور بولے:۔ بھائی یہ بڑے تیکھے آدمی ہیں کہیں ان سے نہ الجھ بیٹھنا وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ دیکھو فتح پوری کے مسجد کے سامنے سعادت خاں کی نہر ہے اس کے کنارے کھڑے ہو جانا اور لال قلعے سے جو سڑک آتی ہے اسے دیکھتے رہنا ایک صاحب جن کا حلیہ یہ ہے، بندوں دار انگا۔ سر پر ججے پوری سواٹتی باندھے چوڑی دار پاجامہ سلیم شاہی جوتا ایک ہاتھ میں بانس کی چھڑی ایک ہاتھ میں طوطی کا پنجرا سفید رومال چڑھا ہوا سینہ تانے اکڑتے بررتے آتے ہیں اور سب طرف دیکھتے جاتے ہیں بس وہی خدائی محکمے کے افسر ہیں اور اب دلّی شہر کا انتظام ان ہی کے سپرد ہے۔

یہ صاحب فتح پوری مسجد کے سامنے نہر سعادت خاں پر پہنچ گئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسی حلیے کے آدمی جن کی ہر ادا سے بانکپن ٹپکتا تھا آتے دکھائی دیے۔

ان صاحب نے آگے بڑھ کر کہا:

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

جناب قاضی محمد احمد



کان سے کوئلہ نکالنا

کان سے کوئلہ نکالنے کا کام بھی ایک بڑی مہم ہے۔ آج کل تو اس کام کے لیے نئے اور سائنٹفک طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ ان کی بدولت کانوں میں گھس کر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے خطرہ کم سے کم ہو گیا ہے۔ پر یہ بات ہمیشہ سے تو نہ تھی شروع شروع میں تو اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ قدرت نے انسان کی ہمت کو، اس کے حوصلوں کو، اس کی مستقل مزاجی کو بہت سختی کے ساتھ آزمایا ہے۔ اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترا ہے تبھی اس کے لیے دولت کے خزانے کھولے ہیں۔

اس آزمائش کی کہانی بڑی دردناک ہے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ہزاروں انسانوں نے جان کی بازی لگائی ہے۔ زمین کی چھاتی کو چیر کر راستہ بنایا ہے اس کی گرمی کو سہا ہے اور کبھی کبھی اس کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لی ہیں غرض اسے قدم قدم پر قربانی دینا پڑی ہے اس نے خون کو پسینے کی طرح بہا کر یہ خزانہ اپنے قبضے میں کیا ہے۔

شاید آپ کو یہ معلوم کرنے کا شوق ہو کہ انسان دھرتی کی چھاتی کیسے چیرتا ہے، اس میں سے کوئلہ کیونکر نکالتا ہے آئیے ہم آپ کو بتائیں۔

یہ تو آپ جان ہی گئے ہیں کہ جس جگہ سے کوئلہ نکالا جاتا ہے اسے کوئلے کی کان کہتے ہیں۔ کان کھودنے کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ زمین کھودکر
۲۔ پڑی سُرنگ بناکر
۳۔ کھڑی سُرنگ بناکر

۱۔ زمین کھودکر:۔ یہ طریقہ اس وقت کام میں لایا جاتا ہے جب کوئلے کا ذخیرہ زیادہ گہرائی میں نہیں ہوتا۔ تھوڑی دور زمین کھودنے کے بعد نکل آتا ہے۔ اس قسم کی کان کھودنے میں خرچ بہت کم ہوتا ہے۔

۲۔ پڑی سُرنگ بناکر۔ یہ طریقہ اس وقت کام میں لاتے ہیں جب کوئلے کے ذخیرے پہاڑی ڈھلانوں پر ہوتے ہیں اس طریقے میں پڑی سرنگ بناکر کوئلے کے ذخیروں تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ کھڑی سُرنگ بناکر: جہاں کوئلے کے ذخیرے بہت گہرائی میں ہوں — ظاہر ہے وہاں اوپر کے دونوں طریقے بےکار ہیں اور ہمیں کنویں جیسی کھڑی سُرنگ بنانا پڑتی ہے۔ دنیا میں زیادہ تر کوئلہ اسی طریقے سے نکالا جاتا ہے۔ لیکن ان تینوں طریقوں میں پہلے طریقے میں کوئلہ زیادہ آسانی سے نکلتا ہے اور کوئلے کے نکالنے کا خرچ بھی کم آتا ہے۔

پر جوں جوں ان کانوں کی گہرائی زیادہ ہوتی جاتی ہے نئی نئی مشکلیں سامنے آتی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ پریشانی تو پانی کی ہوتی ہے۔ کانوں میں پانی آجاتا ہے سُرنگ کے اندر جس قدر کھدائی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی یہ پانی بڑھتا جاتا ہے۔ اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ کانوں میں سے اس کا نکالنا مشکل ہوتا ہے بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ زیادتی کی وجہ سے کان کو یوں ہی چھوڑنا پڑا ہے۔ کھڑی سُرنگوں میں تو یہ پریشانی اور بھی زیادہ ہے۔ اس سرنگ کی تہہ میں پانی بھر جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو بالٹیوں سے پانی نکالا جاتا تھا۔ ان بالٹیوں کو سُرنگ کے اوپر آدمی کھینچتے تھے پھر آدمیوں کی جگہ گھوڑے وغیرہ کھینچنے لگے۔ مگر تمام ان تدبیروں سے پوری پوری کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس لیے طرح طرح کے پمپ ایجاد کئے گئے۔ آخر ۱۷۰۵ء میں

یک شخص تھا مس نیوکومین نے ایک انجن ایجاد کیا یہ انجن ہوا کے دباؤ سے پانی باہر نکالتا تھا اس انجن کی ایجاد سے یوں سمجھیے کہ ایک بڑی مشکل حل ہوگئی پانی کو سرنگ سے نکالنے میں بڑی آسانی ہوگئی۔

مگر مشکل بس یہ ایک ہی نہ تھی شاید آپ جانتے ہیں زمین کے اندر جتنا گہرا کھودا جائے اتنی ہی گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے جوں جوں کانیں گہری ہوتی گئیں ان میں دھماکوں کا خطرہ بھی بڑھتا گیا۔ غالباً سب سے پہلا دھماکا ۱۷۰۵ء میں ہوا اسی سلسلے میں ۱۹۰۸ء میں ایک بہت ہی خطرناک حادثہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں ۶۹ مزدوروں کی جانیں گئیں۔

پھر زیادہ گہرائی میں گندی اور غلیظ گیسوں سے واسطہ پڑتا ہے بہت زیادہ اندھیاری ہوتی ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس زہریلی گیس کو ختم کرنا پہلے بہت دشوار تھا۔ لیکن اب دو سرنگیں بنائی جاتی ہیں تاکہ ایک سرنگ سے گیس نکلتی رہے اور دوسری سرنگ سے کوئلہ نکالنے کا کام جاری رہے۔

گہری کانوں سے کوئلہ نکالنے کی مشکل بھی دوسری دشواریوں سے کچھ کم نہیں ہے جوں جوں کانیں گہری ہوتی جاتی ہیں یہ دشواری اور بڑھتی جاتی ہے۔ بہت دنوں تک گھوڑوں کی مدد سے کوئلہ کانوں سے نکالتے رہے مگر گہری کانوں میں تو ظاہر ہے ان سے مدد نہیں لی جا سکتی تھی اور جب گھوڑوں سے کام نہ بنا تو لکڑی کی پٹریاں بچھا دی گئی ہیں ان میں ریل کے ڈبے چلتے ہیں کانوں میں بجلی کی مشینیں لگی ہیں کوئلہ اب ان ہی مشینوں کی مدد سے باہر نکالا جاتا ہے اور پہلے کے مقابلے میں کئی گنا نکالا جاتا ہے۔

کوئلے کی کانوں میں دشواریوں پر دشواریاں اور مشکلات پر مشکلات ہیں بعض ایسی ہیں جنھیں دور کر دیا گیا ہے اور بعض ایسی ہیں جن پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن جہاں تک خطرے کا سوال ہے تو ان کانوں میں کام کرنے والے مزدور بھائی ہر وقت خطروں میں گھرے رہتے ہیں بہت

سی زہریلی گیسیں کانوں میں ہوتی ہیں جن پر قابو نہیں پایا جا سکا ہے جن کا ہمارے مزدور بھائی شکار ہوتے رہتے ہیں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئلے کی بڑی چٹان ہی ان کے سر پر آ گرتی ہے اور انھیں کچل کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کان کی چھت اچانک گر جاتی ہے اور ہمارے مزدور بھائی اس کے نیچے دب کر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے خود ہمارے دیس میں بہار کی ایک کان میں اچانک پانی بھر گیا بہت سے مزدور اس پانی میں گھر گئے۔ کوئی بیس اکیس دن تک اسی طرح گھرے رہے اتنے دنوں تک یہ بنا دانہ پانی کے زندہ رہے اور بڑی مشکلوں سے زندہ سلامت بچ نکلے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ بہت دنوں تک اخباروں میں اس کا چرچا رہا۔



حکومت آنکھ کھول کر کی جاتی ہے

(بقایا صفحہ ۴)

اسلام علیکم۔

اسلام علیکم سنتے ہی بانکے حضرت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور گرج کے بولے "اسلام علیکم کا بچہ کیا مجھے بھی سبزی فروش سمجھ رکھا ہے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں۔ مولوی سے کہنا خبردار اگر آیندہ ہم میں کسی کی نشان دہی کی۔ مردان خدا کے راز کو فاش کرنا دل لگی سمجھی ہے حکومت آنکھ کھول کر کی جاتی ہے رو رعایت کرنے والی حکومت اندھی سمجھی جاتی ہے۔"

یہ صاحب مولانا کی خدمت میں پہنچے تو مولانا انھیں دیکھ کر دور ہی سے بولے ہم نے تو پہلے ہی سمجھا دیا تھا مگر تم نہ مانے اور ہمیں بھی صلواتیں سنوا دیں۔ یہ بڑے عادل اور ایمان دار حاکم ہیں اور اپنی آنکھیں ہر وقت کھلی رکھتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ حاکم کی غفلت سے انتظام حکومت چوپٹ ہو جاتا ہے۔

جناب محمد مسیح الزماں، امروہوی



سخاوت

بہت زمانہ گزرا ایران میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا ایک وزیر تھا۔ بڑا لایق اور تجربہ کار، کوئی بات کہنے سے پہلے اس کا آگا پیچھا سوچ سمجھ لیتا تھا اور پھر بڑے غور و خوض کے بعد جو اس کی سمجھ میں آتا کہتا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک بات اور بہت اچھی تھی کہ وہ ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ اکثر اس کی سچی باتیں بادشاہ کو ناگوار گزر جاتیں۔ مگر کسی مصلحت سے ان کو برداشت کر لیتا تھا۔

ایک دفعہ شاہی دربار لگا ہوا تھا۔ سب بادشاہ کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے اور بادشاہ تعریفیں سن سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ ہوتے ہوتے بادشاہ سلامت اپنی تعریف آپ کرنے لگے: یعنی میں سچ مچ بڑا سخی ہوں۔ اس وقت دنیا میں میرے جیسا کوئی بادشاہ نہیں۔

پہلے تو وزیر سب سنتا رہا۔ لیکن جب نہ رہا گیا تو بولا — "حضور گستاخی معاف! اپنی تعریف آپ کرنا کچھ مناسب نہیں۔ دوسرے لوگ کیا کچھ کم ہیں۔"

وزیر کی یہ بات سن کر بادشاہ کو بڑا طیش آیا۔ وہ اس کی صاف گوئی پر آگ بگولا ہو گیا۔ پھر غصے میں بولا۔

"کیا ہم نے اپنی تعریف جھوٹ کی ہے؟ کیا اس وقت ہم دوسرے بادشاہوں سے زیادہ سخی اور فیاض نہیں ہیں؟"

"آپ ضرور سخی اور فیاض ہیں، میرے آقا — لیکن بصرہ میں ایک نوجوان بادشاہ

سخاوت میں آپ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یہاں تک کہ حاتم طائی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے" وزیر نے نرم لیکن پختہ لہجے میں کہا۔

وزیر کی اس بات نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ بادشاہ کا غصّہ اور بڑھ گیا۔ اس نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ اور پھر یہ کہہ کر وزیر کو قید خانے میں ڈلوا دیا کہ اس بات کی ہم خود تحقیق کریں گے۔ اگر وزیر جھوٹا ثابت ہوا تو اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

دوسرے دن پو پھٹنے سے قبل ہی بادشاہ ایک سوداگر کے بھیس میں بصرہ کی طرف چل دیا۔ جہاں وہ نوجوان بادشاہ ابوالقاسم حکومت کرتا تھا۔ سفر کے بعد وہ بصرہ پہنچ گیا۔ ابوالقاسم کے محل تک اس کی رسائی بھی ہو گئی۔ جب ابوالقاسم کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اس نے بادشاہ کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ بادشاہ نے خود کو ایک غریب سوداگر ظاہر کیا جس کا تمام اسباب راستے میں لٹیروں نے لوٹ لیا تھا۔ ابوالقاسم نے اسے تسلی دی اور پھر نہایت عزّت و احترام کے ساتھ محل کے اندر لے گیا۔ یہاں سب سے پہلے اس نے اسے شربت پلایا اور پھر کھانا کھلانے کے بعد باغ میں سیر کے لیے لے گیا۔ کچھ دیر تک بادشاہ ابوالقاسم کے ساتھ گھومتا پھرا۔ پھر آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ ایک عجیب و غریب درخت تھا ــــ اس کا تنا چاندی کا اور پتّے سونے کے تھے۔ پھلوں کے بجائے ہیرے لگے ہوئے تھے۔ اور چوٹی پر سونے اور ہیرے سے مرصّع ایک نہایت حسین مور بیٹھا تھا۔ اس درخت کا کمال یہ تھا کہ اس کی ذرا سی حرکت سے مور کے منہ سے مُشک کی بارش ہونے لگتی تھی۔

درخت کا یہ حیرت انگیز کمال دیکھ کر بادشاہ بہت حیران ہوا اور بڑھا چڑھا کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ لیکن اسے کتنا تعجب ہوا کہ اس کے منہ سے تعریفی کلمات نکلتے ہی ابوالقاسم نے وہ درخت وہاں سے ہٹوا دیا۔ اور بادشاہ سوچنے لگا کیا یہی شخص سخی اور فیاض کہلانے کا مستحق ہے؟ پھر ابوالقاسم نے اسے شربت سے پُر ایک نفیس گلاس پیش کیا۔ لیکن جیسے ہی بادشاہ نے شربت کا وہ گلاس خالی کیا۔ وہ پھر شربت سے بھر گیا۔ بادشاہ

پھر حیران ہو کر گلاس کی تعریف کرنے لگا۔ مگر گلاس کی تعریف سنتے ہی ابوالقاسم نے وہ گلاس بھی سامنے سے الگ کر دیا۔ بادشاہ کی حیرانی اور بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا گویوں کا ایک طائفہ ادھر آنکلا اور اس نے ایسے ایسے شاندار گیت سنائے کہ بادشاہ بے خود ہو گیا اور تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جیسے ہی یہ تعریفی الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوئے۔ ابوالقاسم کا اشارہ پاکر وہ گویئے بھی وہاں سے چلے گئے۔ اور بادشاہ دل ہی دل میں اپنے وزیر کو سخت سے سخت سزا دینے کے بارے میں سوچنے لگا جس نے ابوالقاسم کے بارے میں اتنی دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔

وہ تین روز ابوالقاسم کا مہمان رہا۔ تیسرے روز اس نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ ابوالقاسم نے اسے روکنے کے لیے اصرار کیا اور پھر خوشی سے اجازت دے دی۔ مگر جیسے ہی وہ محل کے دروازے پر آیا۔ اس نے مصنوعی درخت، شربت کا گلاس اور گویوں کے طائفے کو وہاں موجود پایا۔ بڑا حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرہ ہے؟ تب ہی ابوالقاسم وہاں آ گیا اور مسکرا کر بولا —

"سوداگر! حیران نہ ہو۔ ہمارے یہاں کا یہ دستور ہے کہ جو چیز مہمان کو پسند آجاتی ہے وہ ہم پر حرام ہو جاتی ہے۔ اور اسے ہم بڑی خوشی سے مہمان کے حوالے کر دیتے ہیں خواہ وہ بصرے کی حکومت ہی کیوں نہ ہو"

ابوالقاسم کی یہ سخاوت دیکھ کر بادشاہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک لمحے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ سب، جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں حقیقت ہے۔ مگر پھر اپنے دل میں کہنے لگا۔ جو کچھ تعریف وزیر نے بیان کی تھی وہ بھی کم تھی۔ حقیقت میں یہی شخص سخی اور فیاض کہلانے کا مستحق ہے۔

اور جب وہ ایران واپس آیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے وزیر کو قید سے آزاد کیا۔ اور پہلے سے زیادہ اس کی عزت کرنے لگا۔

ذرا بتاییے تو ——

(۱) پہاڑی بارہ سنگھا ۲۔ ہرن ۳۔ چونسنگھا ۴۔ چکارا ۵۔ انگورا بھیڑ ۶۔ میرونا بھیڑ ۷۔ بربری بکری ۸۔ کشمیری بکری ۹۔ بارہ سنگھا ۱۰۔ امریکی بھینسا۔

حافظ باقوی



رات کی رانی

چمکیلے تاروں کی چُنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

لال شفق ہاتھوں میں رچائے — کالے کالے بال سجائے
ماتھے پہ چاند کا ٹیکا لگائے — جو دیکھے یہ اس کو بھائے

چمکیلے تاروں کی چُنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

خاموشی کا راگ سناتی — سارے جگ میں چین لٹاتی
دل کا دکھ اور درد مٹاتی — تھپک تھپک کر سب کو سُلاتی

چمکیلے تاروں کی چُنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

مہکی ہوئی بدمست ہوائیں　　بہکی ہوئی سرشار فضائیں
نور میں بھیگی ہلکی گھٹائیں　　رات کی رانی کی یہ ادائیں

چمکیلے تاروں کی چنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

چرخ عجب شہکار بنا ہے　　تاروں کا گلزار بنا ہے
ہیروں کا بازار بنا ہے　　پریوں کا سنسار بنا ہے

چمکیلے تاروں کی چنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

دن کے تھکے ہارے سب انساں　　راہ کے راہی کھیت کے دہقاں
سارے پرندے سارے حیواں　　رات کے آنے سے ہیں شاداں

چمکیلے تاروں کی چنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

پاکر اس کا مست اشارا　　چین سے سوئے عالم سارا
لیکن شاعر غم کا مارا　　چپ اس کا کرتا ہے نظارا

چمکیلے تاروں کی چنری
اوڑھ کے آئی رات کی رانی

بھور کے راجہ نے پورب سے　　اپنا چنچل ہاتھ بڑھایا
رات کی رانی کی چنری کو　　اپنی جانب زور سے کھینچا

ٹوٹ گئے چنری کے تارے
شبنم بن کے زمین پہ بکھرے



جناب آفاق احمد

چھوٹی چھوٹی ذِمّے داریاں

یہ ذمہ داریوں کا چکّر بھی عجیب چکّر ہے۔ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جسے دیکھو رونا رو رہا ہے کہ اس پر ذمہ داریوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ گھر میں رہو تو ذمّہ داریاں، گھر سے باہر نکلو تو ذمہ داریاں۔ جو ایک جگہ سے پیچھا چھڑایا تو دوسری جگہ بلا بن کر موجود ــــ

اسکول جانا اور پھر وہاں پڑھنا ہی کون سا چھوٹا سا کام ہے کہ اس پر دوسرے سینکڑوں جھمیلے جان کو لگے رہتے ہیں۔ وقت پر پہنچو ورنہ ماسٹر صاحب سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ وقت پر پہنچ گئے ہو تو گھر کے لیے جو کام دیا تھا اسے دکھاؤ، نہیں تو پڑیں بے بھاؤ کی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ دن بھر اسکول میں جان کھپائیں، جو تھوڑا بہت گھر میں وقت ملا اُس میں بھی اسکول کا ہوّا پیچھے پڑا رہے۔ گھر کے کام ہی کیا کم ہوتے ہیں اوپر سے یہ دُہرا ستم ــــ!

خیر ہمارا زمانہ تو پھر بھی اچھا ہے۔ ماسٹر صاحبان کو مار پیٹ سے منع کر دیا گیا ہے، ورنہ کبھی ہمارے گالوں پر کسی ملک کا نقشہ بنا ہوتا تو کبھی وہ سوج کر کپّا ہو جاتے کبھی اچھے بھلے انسان ہوتے ہوئے جانوروں کی طرح مُرغا بنے ہوتے۔ کبھی بار بار اپنے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو پکڑ پکڑ کر دیکھ رہے ہوتے کہ ابھی تک اپنی جگہ قائم ہیں یا اکھاڑ کر لے گئے ماسٹر صاحب! اب تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ اگر صرف "اسٹینڈ اپ" سُنائی دے تو کھڑے ہو گئے۔

اپنی جگہ سے اٹھ کر اور اس کے ساتھ "اون دی بنچ" بھی لگا ہوا ہے تو آس پاس دیکھا۔ ڈھٹائی سے مسکرائے اور بنچ کے اوپر کھڑے ہو گئے۔ آدھا پون گھنٹے کھڑا ہو لینا کون سی بڑی بات ہے۔ آخر سنیما کی لائن میں بھی تو لوگ گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں!

مگر اسکول میں صرف پڑھنا ہی تو نہیں ہوتا اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ میں تو واقعی مزا آجاتا ہے۔ مثلاً کھیل کھیلنے کی ذمہ داری۔ اسکول کے سالانہ جلسے کے لیے ڈرامے میں کام کرنے یا نظم پڑھنے کی ذمہ داری۔ اکثر خیال آتا ہے دوسری بہت سی ذمہ داریوں کو ختم کر دیا جاتا۔ بس یہ اور اسی قسم کی دو چار ذمہ داریاں رہتیں تو بس مزہ آجاتا۔ لیکن پھر کبھی سوچتے ہیں اگر زندگی میں صرف کھیل ہی ہوتے، ڈرامے، ناٹک ہوتے تو شاید ان سے بھی جلد ہی دل بھر جاتا کیوں کہ جب تک خوب کام نہ ہو آرام کا مزا نہیں آتا۔

کام کی بات چل نکلی ہے تو کچھ کاموں کا یاد آنا لازمی ہے۔ اسکول میں آنے والوں کو بھی کتنے ڈھیر سارے کام کرنا پڑتے ہیں! سب سے بڑا کام تو ہر پیریڈ کو اٹینڈ کرنا ہی ہے پھر اگر کوئی دوسرا کام بھی ذمہ لگا دیا گیا ہے تو اسے بھی پورا کرنا ہے۔ مثلاً کلاس کے مانیٹر بنا دیے گئے۔ عزت کی بات تو ہے ہی پر اس عزت کو پانے کی قیمت بھی تو ادا کرنا پڑے گی!

کوئی بڑی ذمہ داری، بڑا عہدہ یوں ہی تو نہیں مل جاتا۔ ٹیچر کی غیر موجودگی میں کلاس میں ڈسپلن قائم رکھنا استادوں اور لڑکوں کے بیچ کی ایک کڑی کی حیثیت اختیار کرنا۔ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے کام ہیں لیکن یہ تو مانیٹر کے لیے ہوا اور پھر پورے کلاس میں سب تو مانیٹر نہیں بن سکتے۔ باقی پڑھنے والوں کے بھی تو کچھ فرائض ہیں۔ اگر ہر ایک اپنی جگہ ذمہ داری محسوس کرے اور مانیٹر کا ہاتھ بٹائے تو کتنا اچھا رہے۔ اگر ہر ایک یہ سوچنے لگے کہ ہم اتنے سارے لوگ ہیں کسی ایک نے کوئی کام نہیں کیا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ تو اس سے بات بنے گی نہیں یقین جانیے فرق پڑے گا اور بہت فرق پڑے گا۔

آپ نے شاید وہ قصہ سنا ہوگا کہ کسی حاکم نے حکم دیا کہ رات پچھلے پہر اس کے نوکر

ایک بڑے حوض کو پانی سے بھر دیں۔ حاکم کے بہت سے نوکر تھے۔ ہر ایک نے اپنی جگہ سوچا کہ اگر میں پانی کی بالٹی نہ ڈالوں گا تو کیا فرق پڑے گا۔ باقی سب تو ڈال ہی دیں گے۔ رات تو اندھیری ہے۔ کوئی پتہ بھی نہ چلا سکے گا کہ کس نے پانی نہیں ڈالا ہے ـــــ آپ جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ سویرے جو دیکھا گیا تو حوض بالکل خالی تھا!

ہمارے یہاں بہت زمانے سے یہ کہاوت مشہور ہے کہ "سب کی ذمہ داری کا مطلب ہے کسی کی بھی ذمہ داری نہیں" ـــ پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ الٹی بات کیوں مشہور ہے۔ لیکن اوپر والا قصہ سنا تو اس کے مشہور ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ یقیناً کوئی ایسا ہی کام بہت سے لوگوں کو سونپا گیا ہوگا اور انھوں نے سوچا ہوگا کہ اتنے سارے لوگ تو ہیں اور دیکھنے والا کوئی نہیں۔ میں اکیلا نہ کروں گا کیا فرق پڑے گا۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ باقی سب تو کر ہی لیں گے۔

ہمیں اس قسم کی کہاوتوں کو جھوٹا ثابت کرنا چاہیے۔ جو کام جسے سونپا جائے اسے پورا کرنا ہی چاہیے، پوری لگن سے یہ سمجھ کر کرنا چاہیے کہ اسے کرنا ہی ہے۔ تب اس کے پورا ہونے پر خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کام بھی کیا اور مرے دل سے کیا، رو دھو کر کیا۔ کھیل اور ڈرامے اگر ہنسی خوشی ہو سکتے ہیں تو کیا اور دوسرے کام نہیں ہو سکتے؟ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسکول جائیں تو کلاس میں بھی جائیں کیونکہ گھر سے اسی لیے چلے ہیں۔ اب کلاس میں جائیں تو ہوم ورک بھی کر کے لے جائیں۔ اس سے ٹیچر خوش ہوں گے۔ کام نہ کرنے والے ساتھیوں میں بھی امنگ پیدا ہوگی۔ خود اپنا دل خوش ہوگا۔ اور پڑھائی کا صحیح مقصد پورا ہوگا۔

کوئی بھی اسکول ہو اس میں پڑھنے والوں ہی سے اس کی شان بڑھتی ہے۔ صاف ستھرے، اجلے کپڑے، مسکراتے چہرے، سلیقہ سے جما ہوا بستہ، وقت پر اسکول پہنچنا۔ کلاس میں ڈسپلن قائم رکھنا، اسے گندا نہ ہونے دینا۔ یہ سب دیکھنے میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ذمہ داری نہ سمجھا جائے تو آپ کا اسکول اچھا نام نہ پا سکے گا۔

اسکول ایک برادری ہے۔ امیر، غریب ہر قسم کے آپ کے ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد جس طرح بھی کر سکتے ہیں ضرور کیجیے۔ انکار نہ کیجیے۔ معلوم ہوا ایک خاندان ہے، ایک کنبہ ہے!

کھلاڑی کھیلوں میں الگ الگ پوزیشن پر کھیلتے ہیں۔ مگر سب کی ملی جلی کوششیں ہی ٹیم کو جتاتی ہیں۔ آپ میں سے بہت سے کرکٹ کھیلتے ہوں گے۔ دیکھا تو قریب قریب سب نے ہوگا۔ اس میں رنز (دوڑیں) بنانے کے لیے دو کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک بیٹ مین اکیلا رن نہیں بنا سکتا۔ اور دوڑیں بننے سے روکنے کے لیے پوری ٹیم کو جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ تب ہی جیت قدم چومتی ہے۔ اس طرح اسکول میں بھی سب کا اتحاد ضروری ہے اور جس طرح رن بنانے کے لیے ایک وکٹ سے دوسرے وکٹ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے اسی طرح اسکول کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں انھیں پورا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ جب آخری جوڑی کو کھیلنے کے لیے اترنا تھا تو معلوم ہوا ایک بیٹ مین غائب ہے ہار سے بچنے کے لیے صرف دو رنز چاہیے تھے۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ نتیجے میں ایک دوسرے لڑکے کو جس کو کرکٹ کی الف، ب، بہت کم معلوم تھی اتار دیا گیا۔ اتفاق سے گیند آئی اور اس کے بلّے سے لگ کر دور چلی گئی۔ سامنے والے کھلاڑی نے دوڑ لی۔ یہ صاحب جو کہ مجبوراً اتارے گئے تھے دوسری طرف سے بھاگے مگر وکٹ پر پہنچ کر جب دوسرے رن کے لیے کہا گیا تو بجائے مڑ کر رن لینے کے ناک کی سیدھ میں بھاگتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساتھی آؤٹ ہو گیا۔ ٹیم ایک رن سے ہار گئی۔

تو اس طرح اگر ہم اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھیں گے تو جیسے وہ ٹیم ایک کھلاڑی کے وقت پر نہ آنے سے اور دوسرے کی نادانی سے ہاری اسی طرح ہماری اسکول کی زندگی بھی مستقل ہاروں کا مجموعہ بن جائے گی جیتنے والوں اور کامیاب لوگوں کو پھولوں کے ہار ملتے ہیں اور ہارنے والوں کو صرف طعنے اور بری نظریں۔ اب بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے ــــ ؟ پھولوں کے ہار پسند ہیں نا ــــ!

(آل انڈیا ریڈیو بھوپال اندور
کے شکریہ کے ساتھ)



بنیادی اردو اسکول شیر گاؤں

سال گذشتہ کی طرح اس سال ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء (یکم اپریل تا ۳۰ مارچ) بچوں کی پارلیمنٹ کا انتخاب اسکول کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اور یہ کینبٹ (وزارت) اپنے اپنے کام کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے اور کابینہ کے ممبروں کو اپنے کاموں کے صلے میں ہر سال یوم اطفال کے موقعے پر انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔

لیجیے اب کابینہ کے عہدیداروں کے نام درج کرتے ہیں۔

۱۔ وزیر اعظم	فرید عثمان شیخ	درجۂ ہفتم
۲۔ وزیر تعلیم	رشیدہ بی محمد صدیق ملاّ	درجۂ ہفتم
۳۔ وزیر صحت عامہ	گلزار شمس الدین شیخ	درجۂ ششم
۴۔ وزیر امداد	غلام دستگیر زین الدین شیخ	درجۂ ہفتم
۵۔ وزیر جسمانیات	اکبر بدر الدین شیخ	درجۂ ششم

۶۔ وزیر قوانین و انصاف — مخدوم حسین شیخ — درجۂ ہفتم
۷۔ وزیر جلسہ جلوس — محمد جمیل احمد میاں مجاور — درجۂ ہفتم

اس سال یوم جمہوریہ کے موقعے پر وزیر جلسہ جلوس نے وزیر اعظم کی امداد سے جلسہ منعقد کرکے ایک شاندار ریکارڈ قائم کر دیا جو پچھلے سالوں میں سالانہ رپورٹ میں اس کی مثال نہیں رکھتا۔ اور گاؤں کے دوسرے اسکول میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اب آیندہ چناؤ بڑے پر زور اور شاندار طریقے سے والا ہے۔ اس سال کی کابینہ نے اسکول کے سب طلباؤں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ تمام طلباء بڑی دلچسپی کے ساتھ کام کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں اور اسکول کے تمام کاموں کو بخوشی انجام دیتے ہیں۔

رئیس ہائی اسکول، بھمڑی (ضلع تھانہ)

رئیس ہائی اسکول، بھمڑی ضلع تھانہ (ریاست مہاراشٹر) سنہ ۱۹۲۸ء سے قائم ہے۔ اسکول کے دو حصے ہیں، ایک بوائز سکشن اور دوسرا گرلز سکشن۔ ۶۵-۱۹۶۴ء کے تعلیمی سال میں طلبہ کی تعداد سات سو اور طالبات کی تعداد پونے تین سو ہے۔

اسکول کی غیر درسی سرگرمیوں میں جد وجہد اور سعی وعمل کا اجتماعی جذبہ پیدا کرنے کے لیے دونوں سکشنوں میں ریڈ، بلیو، گرین اور آرینج ناموں کے چار چار ہاؤس قائم ہیں جو مختلف غیر درسی سرگرمیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سال رواں میں ہاؤسوں کے مابین تین دن کے مقررہ پروگرام کے تحت کھیل کود کے اجتماعی اور انفرادی مقابلے بڑے اہتمام اور جوش وخروش کے ساتھ ہوئے جن میں سیکڑوں طلبہ اور طالبات نے حصہ لیا۔ پہلے دن کھیلوں کا آغاز ہونے سے قبل مارچ پاسٹ کی تقریب ہوئی اور پھر چاروں ہاؤسوں کے کھلاڑیوں نے اپنے اپنے ہاؤسوں کے اعتبار سے قطاروں میں کھڑے رہ کر اس بات کا عہد کیا کہ تمام کھلاڑی کھیلوں میں "اسپورٹسمین شپ" کے جذبہ صادق کے ساتھ حصہ لیں گے۔ مقابلے بہت ہی حوصلہ افزا اور کامیاب رہے۔

جلسہ تقسیم اِنعامات (مدرسہ ثانوی جامعہ)

مدرسہ ثانوی جامعہ کی سال بھر کی سرگرمیوں کی یہ جلسہ آخری کڑی ہوتا ہے۔ یہ جلسہ عام طور پر امتحانات کے بیچ میں ہوتا ہے اسے سالانہ جلسہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس جلسے کے بعد مجلس کے طلباء امتحانات دے کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

یہ جلسہ خوب دھوم دھام سے منایا گیا۔ مدرسہ ثانوی کو خوب سجایا گیا تھا۔ کویت کے سفیر اور ان کی اہلیہ نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ جلسے کی تقریب مدرسہ ثانوی کے صدر دروازے پر ہوئی۔

جلسے کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ پھر کویت کے سفیر کے اعزاز میں ہمارے ایک اچھے ساتھی نے بڑی دلکش آواز میں عربی میں خطبہ پڑھا۔

اب جلسے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی اور ناظم مدرسہ نے پورے سال کی مصروفیتوں اور سرگرمیوں کا ذکر بہت عمدہ پیرائے میں پیش کیا جس میں انھوں نے مجلس طلباء کی سال بھر کی مختلف کارروائیوں پر روشنی ڈالی۔

مدرسہ ثانوی میں "اسپورٹس" بہت اہمیت رکھتے ہیں اور اب کی بار بھی اسپورٹس میں کافی تعداد میں طلباء نے شرکت کی اور مختلف "آئیٹم" میں اوّل، دوم اور سوم آئے، اسپورٹس کے انعامات سالانہ جلسے میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

اب کی بار جلسے میں صرف اوّل آنے والوں کو انعامات تقسیم کیے گئے، ہر طالب علم مخصوص پوشاک میں نام پکارے جانے پر آتا اور معزز سفیر سے ہاتھ ملا کر اپنا انعام لیتا تھا۔ طلباء کے علاوہ طالبات اور اساتذہ صاحبان نے بھی دلچسپ انعامات حاصل کیے۔

اس کے بعد مدرسہ میں مختلف مضامین میں سب سے زیادہ نمبر لانے والے طلباء اور طالبات کو تمغے اور سارٹیفکٹ دیے گئے سب سے زیادہ تمغے رافعہ خاتون متعلم ثانوی چہارم نے حاصل کیے اور اسی طرح دوسرے بہت سے ساتھیوں مختلف مضامین میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرکے تمغے

اور اعزازی پروانے حاصل کیے۔

انعامات کی تقسیم ختم ہونے پر ہمارے نگران مدرس نے کویت کے سفیر اور ان کی اہلیہ کی خدمت میں لکڑی کے بنے ہوئے خوب صورت بت پیش کیے۔

آخر میں کویت کے سفیر نے صدارتی تقریر کی۔ وہ عربی میں بول رہے تھے ترجمے کی خدمت ہمارے ایک استاد نے انجام دی. سفیر صاحب نے جلسے میں بلائے جانے کا شکریہ ادا کیا اور پھر بہت ہی دلچسپ انداز میں طلباء کو پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی ترغیب دی۔ انھوں نے بتایا کہ طالب علمی کا زمانہ ہی وہ سنہرا دور ہوتا ہے جس میں انسان دراصل انسان بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی طالب علمی کے دور کا ذکر کیا۔

اختتام تقریر پر انھوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ عربی کی بہت سی کتابیں جامعہ کو تحفے کے طور پر دیں گے جس سے طلباء میں عربی زبان سے دلچسپی پیدا ہو اور اس طرح انھوں نے پھر ایک دفعہ تقریب میں بلائے جانے کا شکریہ ادا کیا اور پھر ناظم طلباء نے معزز مہانوں خصوصاً کویت کے سفیر کے آنے کا شکریہ ادا کیا اور پھر جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔

جمال اختر (ثانوی پنجم، مدرسہ جامعہ)

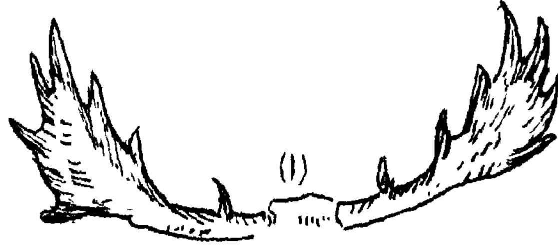
عمدہ ناول

تین اناڑی	عصمت چغتائی	۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمن اوّل	ایل لائین	-/۲
" " دوم	"	-/۲
خرگوش کا سپنا	کرشن چندر	۱/۷۵
ستاروں کی سیر	"	۱/۷۵

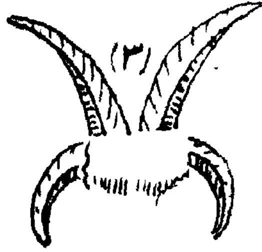
اچھے ڈرامے

آؤ ڈرامہ کریں	پروفیسر محمد مجیب	-/۶۰
شموکی عید	احسن عثمانی	-/۵۰
کیمپ فائر کی نقلیں (اوّل)	عبدالغفار مدھولی	-/۷۵
کیمپ فائر کی نقلیں (دوم)	عبدالغفار مدھولی	۱/۷۵

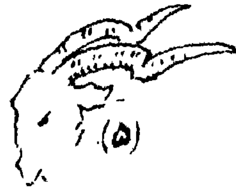
ذرا بتایئے تو ــــ یہ سینگ کن کن جانوروں کے ہیں؟



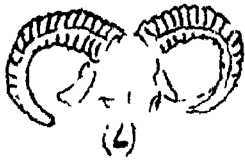




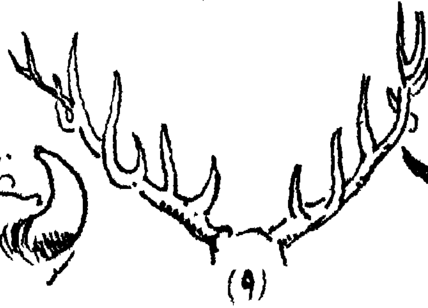














محترمہ شمیم ملک



سب کام مل کے کریں

اتوار کا دن تھا۔ نزہت سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے میں نے سوچا۔ چلو آج مل آؤں۔ چھٹی کا دن ہے گھر پہ ہی ہوگی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی سامنے نزہت پر نظر پڑی کپڑوں کی دھلائی ہو رہی تھی۔ نزہت کپڑے دھو دھو کے دے رہی تھیں۔ عفت نیل اور کلف دے رہی تھی۔ اور نکہت کپڑے پھیلا رہی تھی۔

میں نے پوچھا — ”یا اللہ ایک کام میں تینوں بہنیں لگی ہوئی ہیں“

نکہت نے جواب دیا — ”باجی اس طرح کام جلدی ہو جاتا ہے۔ ایک ہی دن تو چھٹی کا ملتا ہے۔ صبح صبح ہم تینوں مل کر گھر کے ان اوپری کاموں سے فراغت پا لیتے ہیں۔ دوپہر کو کھانے میں امّی کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ شام کو تفریح کا وقت نکال لیتے ہیں اور پھر رات کو تین چار گھنٹے پڑھنا بھی ہو جاتا ہے۔“

”ان کپڑوں پر استری کون کرتا ہے؟“

”راشد اور انور“

”تمہارے بھائی بہت اچھے ہیں امی بھی۔

لیکن ہماری امی تو کہتی ہیں بھائیوں کا کام کرو گی یا ان سے کراؤ گی تم کو شرم نہیں آتی۔ ادھر بھائی بھی یہ سوچ بیٹھے ہیں کہ یہ کام تو بہنوں کا ہے۔ بجائے ہاتھ بٹانے کے اور

کام پھیلاتے ہیں اِدھر وہ چیز ڈالی اُدھر وہ چیز پھینکی ۔"

"نہیں"، نزہت بولی۔ "امّی تو کہتی ہیں آج کل سب ایک برابر ہیں۔ لڑکیاں بھی لڑکوں کی برابر تعلیم پاتی ہیں۔ پھر لڑکیوں پر تو ذمے داریوں کا بوجھ لڑکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ گھر کی دیکھ بھال۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ ریکھ، سینا پرونا، کھانا پکانا وغیرہ۔ کیا یہ لوگ ذرا سی استری بھی نہیں کر سکتے۔"

ارشد صاحب منہ پھیلا کر بولے "۔ ہاں بھئی آج کل تو بہنوں کا راج ہے۔ ہم سب کو اپنے اپنے کمروں کی صفائی بھی خود کرنی پڑتی ہے۔ ان سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ ہمارا کمرہ جھاڑ دیں۔"

"نہیں باجی یہ غلط کہتے ہیں۔ جھاڑتے تو ہم ہی ہیں چادر، میز پوش تکیہ وغیرہ بدلنا بھی ہمارے ذمے ہے۔ مگر ممی کا حکم ہے روزانہ بستر جھاڑنا اور کتابیں وغیرہ لگانا اپنے کپڑے قاعدے سے رکھنا رکھانا یہ سب کام یہ خود ہی کریں۔ اس کے علاوہ اگر ہماری پڑھائی کے وقت ان کے دوست آجائیں تو چائے بھی انھیں خود بنانا پڑے گی۔"

میں نے سارے گھر پر ایک سرسری نظر ڈالی! کیسا صاف ستھرا تھا! ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ سچ جانیے جی خوش ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک تو ہے۔ جہاں اتنے بھائی بہن ہوں وہاں کام دونوں کو مل جل کر ہی کرنا چاہیے۔ آج کل لڑکیوں کی زندگی بھی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ سچ پوچھو تو لڑکوں سے زیادہ کام انھیں رہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ گھر کے ہر کام میں طاق ہونا بھی ضروری ہے۔ اور پھر گھر کو بھی سلیقے سے رکھنا ہے ورنہ سب لوگ نزہت عفت اور نکہت ہی کو برا کہیں گے۔"

میرا تو کچھ نہیں گھر میں ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بھائی بھی مجھ سے بڑے۔ لیکن رضیہ کے گھر کا نقشہ میرے سامنے گھوم گیا وہ سب سے بڑی ہے اور بہن بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔ گھر کی ساری ذمے داری اس بے چاری پر ہے۔ کوئی چھوٹی بہن یا بھائی اس کی مدد نہیں کرتا۔ بھائی تو تنکا بھی نہیں ہلا سکتے۔ کیونکہ اس کی ممی کا حکم ہے کہ لڑکوں کو گھر کے کاموں

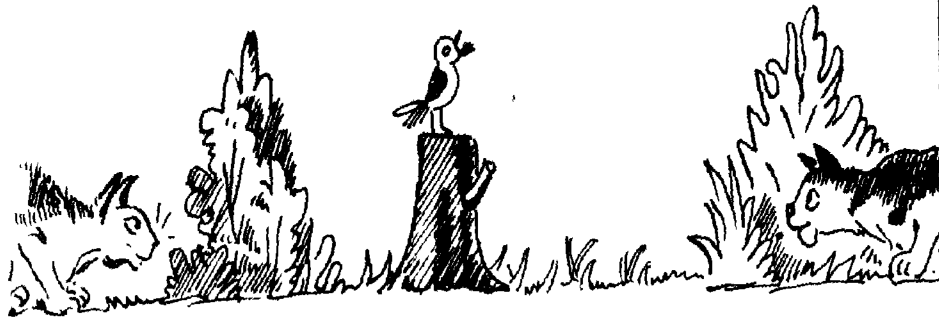
سے کوئی مطلب نہیں انھیں یہ کام زیب نہیں دیتے۔"

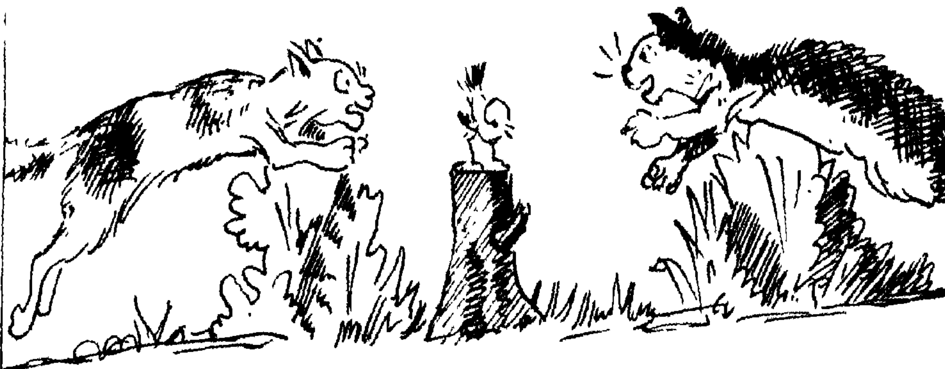
بے چاری سارے دن پاگل بنی رہتی ہے۔ تب بھی وہی ڈھاک کے تین پات گھر میلا اور گندا چیزیں پھوہڑپن سے ادھر۔ اُدھر بکھری ہوئیں۔ نہ ٹھیک سے پڑھ پاتی ہے۔ نہ خود بھی جیسا چاہیے صاف ستھری رہ سکتی ہے۔

کاش رضیہ کی امّی اتنی بات سمجھ لیتیں کہ آج کل کا زمانہ مل جل کر کام کرنے کا زمانہ ہے۔ اپنی مدد آپ کرنے کا زمانہ ہے۔ اور پھر بھائی بھی یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ ہم بہنوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آج کل تو بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں گھر کے سب بچے ایک برابر ہیں۔

کاش انور ارشد کی طرح ہمارے سب بھائی اپنی بہنوں کی مدد کیا کریں اور تمام بہنیں نزہت، عفت کی طرح وہی کام بھائیوں سے لیا کریں جو انھیں زیب دیتے ہیں۔

خوب رہی!







ب اقبال مہدی

"محبت نامے" تہہ کرنا

رشتہ داروں یا دوستوں کو پیار بھرے خط بڑی احتیاط سے لکھے جاتے ہیں میٹھی میٹھی باتیں
خوب صورت الفاظ اور حسین جملوں میں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
لکھنے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ خط کا کاغذ خوب صورت ہو، تحریر خوشنما ہو اور لفافہ ایسا ہو
کہ خط پانے والا اسے دیکھتے ہی خوش ہو جائے۔ لفافہ کھول کر خط پڑھنے کے لیے بے چین ہو جائے۔
کسی شاعر کا یہ مشہور فقرہ تو آپ نے بھی سُنا ہو گا ؎
خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں، لفافہ دیکھ کر
ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے عزیز، دوست، ہمارے ساتھ ایک ہی شہر میں، یا بالکل پڑوس
میں یا ایک ہی گھر میں، یا اسکول میں، یا کلاس میں ہوتے ہیں۔
کبھی کبھی ایسے دوستوں تک جلدی میں کوئی پیغام پہنچانا ہوتا ہے تو کاغذ کے ایک چھوٹے
ٹکڑے سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔
"بول چال" بند ہو جانے کی حالت میں بھی اکثر "پرچے" چلنے لگتے ہیں۔
ان پرچوں کے لکھنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا شخص ان کو نہ پڑھے۔
خط پانے والے کو بھی ایسا خط پاکر خوشی ہوتی ہے جسے لکھنے والے نے احتیاط سے لکھا ہو
اور سلیقے سے بھیجا ہو۔

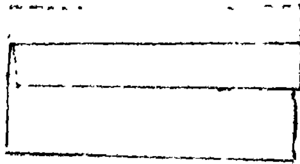
ایسے غیر رسمی خط یا پرچے ایک طرح کے "محبت نامے" ہوتے ہیں۔ ان کو تہہ کرنے کا ایک دلچسپ اور آسان طریقہ ہے۔ اس مخصوص طریقے کو انگریزی میں (LOVE KNOT) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا اتنا پیارا نام کیا ہو سکتا ہے؟ تجویز کیجیے۔



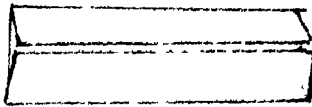
۱۔ مان لیجیے آپ نے لکھنے کے لیے جو کاغذ لیا وہ اس شکل کا ہے۔



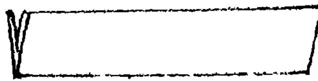
۲۔ بہتر یہ ہوگا کہ لکھنے سے پہلے نقطے دار لائنوں پر موڑ کر پھاڑ لیجیے اور اسے مستطیل شکل کا بنا لیجیے۔



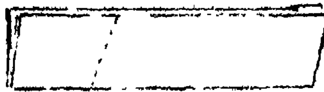
۳۔ لکھنے کے بعد، تہہ کرنے کے لیے اوپر کے کنارے کو چوڑائی کے بیچ تک لاکر موڑ دیجیے۔



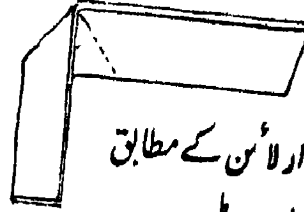
۴۔ نیچے کے کنارے کو بھی اٹھا کر چوڑائی کے بیچ تک لاکر موڑ دیجیے۔



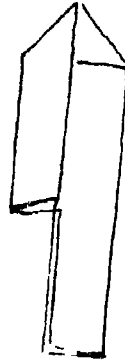
۵۔ نیچے کے کنارے کو اوپر کے کنارے سے ملا کر موڑ دیجیے۔



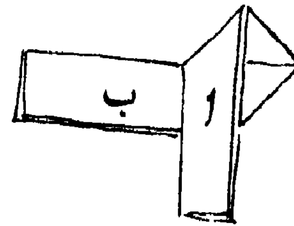
۶۔ اوپر بائیں طرف سے اندازاً ایک تہائی جگہ چھوڑ کر نقطہ دار لائن کے مطابق آگے کی طرف موڑیے۔



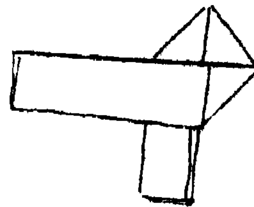
۷. نقطے دار لائن کے مطابق پیچھے کی طرف موڑیے۔



۸۔ نقطے دار لائن کے مطابق پھر پیچھے کی طرف موڑیے۔



۹۔ حصّہ ا کو حصّہ ب کے نیچے پہنچا دیجیے۔



۱۰۔ "محبت نامہ" تہہ کیا ہوا تیار ہے پتہ لکھیے اور بھیج دیجیے۔



حامد: بھئی چھتری آپ نے واپس نہیں کی ایک ہفتہ ہوا مانگ کرلے گئے تھے۔

محسن: بھئی معاف کیجیے اسے ایک دوست مانگ کرلے گئے ہیں۔

حامد: ارے بھئی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ جن صاحب سے میں مانگ کر لایا تھا وہ کل آئے تھے کہتے تھے جن صاحب کی وہ چھتری ہے وہ واپس مانگتے ہیں۔

میر: مرزا غالب اس وقت زندہ ہوتے تو اس دور کی نادر ہستی کہلاتے۔

شاہد: جی کیوں نہیں سو ڈیڑھ سو سال پرانی چیز نادر ہی ہوتی ہے۔

جمیل: فسانۂ آزاد اردو ادب میں معرکے کی چیز ہے۔

شریف: کیا کہنا ہے، بڑا قیمتی خزانہ ہے۔

جمیل: آپ نے یہ کتاب پڑھی تو ہوگی؟

شریف: اوں ہونھ ـــ آپ نے پڑھی ہے؟

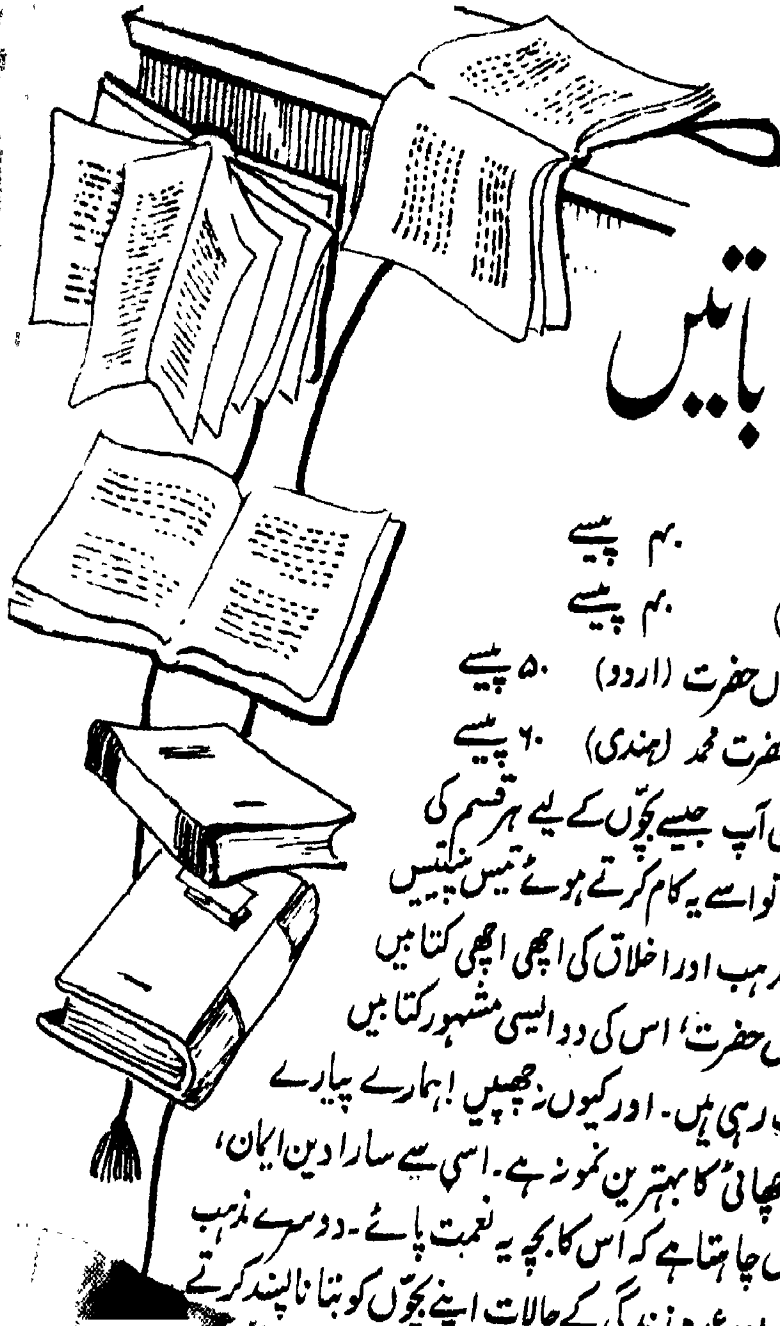
جمیل: جی نہیں۔

"تم نے جیل کیسے کاٹی؟"

"کاٹنے کی بہت کوشش کی لیکن سلاخیں بہت مضبوط تھیں!"

معلّم

کتابوں کی باتیں



۱. ہمارے نبی (اردو) ۴۰ پیسے
ہمارے نبی (ہندی) ۴۰ پیسے
۲. آں حضرت (اردو) ۵۰ پیسے
حضرت محمد (ہندی) ۶۰ پیسے

مکتبہ جامعہ شروع سے ہی آپ جیسے بچّوں کے لیے ہر قسم کی کتابیں تیار کراتا رہا ہے۔ اب تو اسے یہ کام کرتے ہوئے تیس بتیس سال ہو گئے۔ اس نے ہمیشہ مذہب اور اخلاق کی اچھی اچھی کتابیں چھاپیں۔ 'ہمارے نبی' اور 'آں حضرت' اس کی دو ایسی مشہور کتابیں ہیں جو برسوں سے بار بار چھپ رہی ہیں۔ اور کیوں نہ چھپیں! ہمارے پیارے نبی کی زندگی، سچائی اور اچھائی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی سے سارا دین ایمان روشن ہے۔ ہر مسلمان کا دل چاہتا ہے کہ اس کا بچہ یہ نعمت پائے۔ دوسرے مذہب والے بھی ایسی پاک صاف اور عمدہ زندگی کے حالات اپنے بچّوں کو بتانا پسند کرتے ہیں۔ ہم سب کے لیے خواہ کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہر ایک مذہب کی اچھی اچھی باتوں کو جاننا چاہیے اور ہر مذہب کے بنانے، پھیلانے والے رہنماؤں کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہیے۔ مذہب ہمیں اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور نیک کام کی ہدایت کرتا ہے۔ ایک



حامد: بھئی چھتری آپ نے واپس نہیں کی ایک ہفتہ ہوا مانگ کرلے گئے تھے۔

محسن: بھئی معاف کیجیے اسے ایک دوست مانگ کرلے گئے ہیں۔

حامد: ارے بھئی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ جن صاحب سے میں مانگ کرلایا تھا وہ کل آئے تھے کہتے تھے جن صاحب کی وہ چھتری ہے وہ واپس مانگتے ہیں۔

منیر: مرزا غالب اس وقت زندہ ہوتے تو اس دور کی نادر ہستی کہلاتے۔

شاہد: جی کیوں نہیں سو ڈیڑھ سو سال پرانی چیز نادر ہی ہوتی ہے۔

جمیل: فسانۂ آزاد اردو ادب میں معرکے کی چیز ہے۔

شریف: کیا کہنا ہے، بڑا قیمتی خزانہ ہے۔

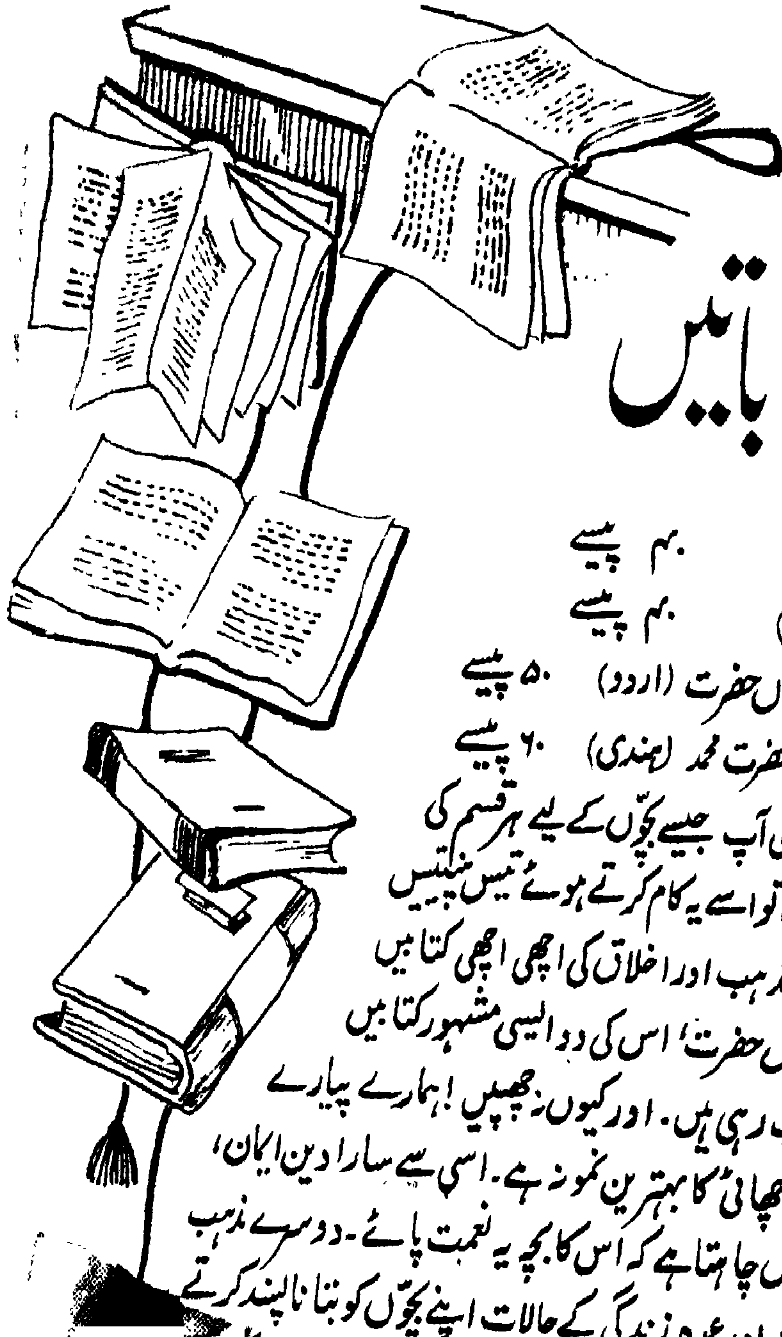
جمیل: آپ نے یہ کتاب پڑھی تو ہوگی؟

شریف: اوں ہونھ — آپ نے پڑھی ہے؟

جمیل: جی نہیں۔

"تم نے جیل کیسے کاٹی؟"

"کاٹنے کی بہت کوشش کی لیکن سلاخیں بہت مضبوط تھیں!"



معلّم

کتابوں کی باتیں

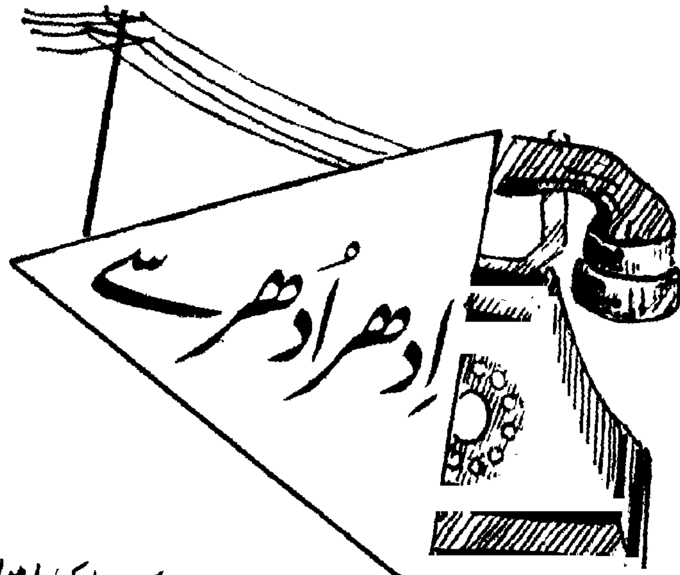
۱. ہمارے نبی (اردو) ۴۰ پیسے
ہمارے نبی (ہندی) ۴۰ پیسے
۲. آں حضرت (اردو) ۵۰ پیسے
حضرت محمد (ہندی) ۶۰ پیسے

مکتبہ جامعہ شروع سے ہی آپ جیسے بچّوں کے لیے ہر قسم کی کتابیں تیار کراتا رہا ہے۔ اب تو اسے یہ کام کرتے ہوئے تیس پینتیس سال ہو گئے۔ اس نے ہمیشہ مذہب اور اخلاق کی اچھی اچھی کتابیں چھاپیں۔ 'ہمارے نبی' اور 'آں حضرت' اس کی دو ایسی مشہور کتابیں ہیں جو برسوں سے بار بار چھپ رہی ہیں۔ اور کیوں نہ چھپیں! ہمارے پیارے نبی کی زندگی، سچائی اور اچھائی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی سے سارا دین ایمان روشن ہے۔ ہر مسلمان کا دل چاہتا ہے کہ اس کا بچہ یہ نعمت پائے۔ دوسرے مذہب والے بھی ایسی پاک صاف اور عمدہ زندگی کے حالات اپنے بچّوں کو بتانا پسند کرتے ہیں۔ ہم سب کے لیے خواہ کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہر ایک مذہب کی اچھی اچھی باتوں کو جاننا چاہیے اور ہر مذہب کے بنانے، پھیلانے والے رہنماؤں کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہیے۔ مذہب ہمیں اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور نیک کام کی ہدایت کرتا ہے۔ ایک

دوسرے کے مذہب کی معلومات اور مذہبی پیشواؤں کے حالات، آپس کے بھید بھاؤ کم کر کے مختلف مذہبوں کی عزت اور انسانی برادری کی محبت بھی سکھاتے اور بڑھاتے ہیں۔ اس لیے مذہبی اور اخلاقی کتابوں کی بڑی مانگ رہتی ہے۔

مکتبہ نے اپنی دونوں کتابوں کو بڑی احتیاط سے تیار کرایا اور پوری صفائی ستھرائی کے ساتھ چھپوایا۔ 'ہمارے نبی' میں زبان و بیان 'آں حضرت' کے مقابلے میں آسان ہے اور اس میں باتیں بھی کم ہیں۔ اس لیے 'ہمارے نبی' پڑھنے کے بعد 'آں حضرت' پڑھنی چاہیے۔ آج کل تقریباً سب ہی بچے ہندی زبان پڑھتے ہیں۔ جو بچے بعض دشواریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اردو نہیں پڑھ پاتے یا کم جانتے ہیں، ان کی خاطر مکتبہ نے اپنی ان دونوں کتابوں کو اب آسان ہندی میں بھی چھاپ دیا ہے۔ یہ ہندی کی کتابیں بھی پوری دیکھ ریکھ اور سلیقے کے ساتھ ہمارے سامنے آئی ہیں۔ عربی عبارت کو تو بلاک میں چھاپ دیا ہے۔

اس طرح اب سب ہی بچے خواہ اردو جانتے ہوں یا ہندی، رسول اللہؐ کی پاک زندگی کے حالات اور واقعات پڑھ سکیں گے۔ مکتبہ کا یہ نیک قدم ہر طرح مبارکباد کا مستحق ہے۔



جب ڈاکٹر صاحب نے چیتے کی نبض دیکھی...

ٹھائیں ٹھائیں گولی چلی اور گھایل چیتا
جھاڑ جھنکاڑ میں سے ہوکر بھاگا۔ شکار پارٹی
کے لوگ اس زخمی چیتے کو ڈھونڈنے نکلے۔
اس پارٹی کے سرغنہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔
انھوں نے دیکھا کہ دور ایک چیتا پڑا ہوا ہے۔
وہ سمجھے وہی چیتا ہے جو گولی کا نشانہ بن چکا
اور زخموں کی تاب نہ لاکر ختم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر
صاحب اس چیتے کے قریب پہنچے۔ اسے ہلا
ڈلا کر دیکھا! ارے! یہ کیا!! چیتے نے تو آنکھیں
کھول دیں اور لگا غرانے۔ اب تو ڈاکٹر صاحب
کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن
میں۔ یہ تو مرا نہیں بلکہ چوٹ کھایا ہوا زندہ چیتا
تھا اور بہت خوفناک بن گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر
صاحب گھبرائے نہیں۔ انھوں نے اس خطرناک
موقع پر ہوش وحواس قائم رکھے۔ ہمت سے
کام لیا۔

ابھی وہ اپنی بندوق سنبھال بھی نہیں
پائے تھے کہ چیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈاکٹر
صاحب پر حملہ کردیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی سنبھل
گئے۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا
چیتے سے خالی ہاتھ لڑا۔
پائی ہوئی۔ کیسی آدمی
جا نا جواں مردی کا کام ہے
نے بڑی ہوشیاری سے بندو

چیتے کے منہ میں گھسیٹر دیا۔ چیتا بہت سٹ پٹایا۔ دھکے پر دھکے دیے مگر ڈاکٹر صاحب بندوق کو اور اندر گھسیٹرتے چلے گئے۔ اس طرح انھوں نے چیتے کو بے دم کر دیا اور جیسے تیسے زور لگا کر وہ اُسے ایک گڑھے میں گرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اتنے میں شکار پارٹی کے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ چیتے کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ دنادن گولیاں چلیں اور چیتے صاحب سچ مچ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آپ کو شاید ان ڈاکٹر صاحب کا نام جاننے کا اشتیاق ہو۔ آپ پنجاب میں جگادھری کے مقام پر مشن اسپتال کے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا نام ڈاکٹر ہربرٹ ہے۔ شکار کے بہت شوقین ہیں۔ یہ واقعہ مئی کی پہلی تاریخ کا ہے۔

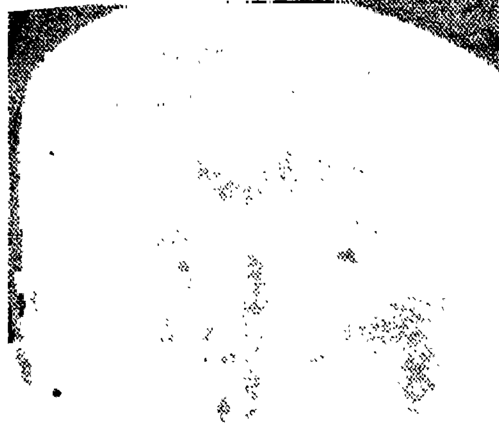
دہلی میں بچوں کی عالمی کانفرنس

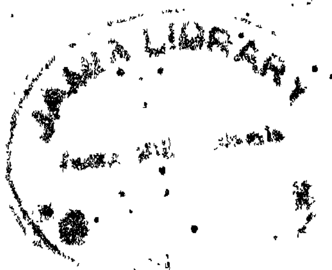
آپ جانتے ہیں دنیا سینکڑوں ملکوں میں [illegible] ہے۔ ہر ملک کی اپنی اپنی حکومت [illegible] ملکوں نے مل کر اپنی ایک [illegible] انجمن اقوام متحدہ [illegible] خیر یہ تو رہیں بڑوں کی باتیں۔ اب ساری دنیا کے بچے بھی اپنی ایک بین الاقوامی انجمن بنا رہے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس انجمن کا صدر مقام دہلی میں ہوگا۔

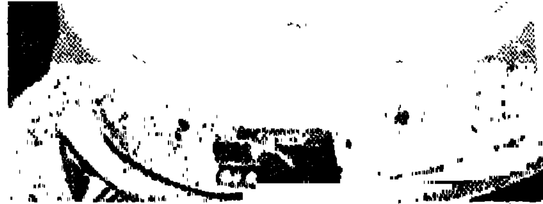
اس سلسلے میں نئی دہلی میں اکتوبر کے آخری ہفتے میں ایک خاص تقریب منائی جائے گی۔ ہر ملک کے بچوں کے نمایندے اس میں شریک ہوں گے۔ یہ تقریب دیوالی کی رات (۲۳ر اکتوبر) سے شروع ہوگی۔ اس رات کو دنیا کے بچوں کے نمایندے ہندوستانی گھروں میں رہ کر دیوالی کی خوشیاں منائیں گے اور روشنی کے تہوار کا لطف لیں گے۔ ۲۴ر اکتوبر کو یہ بچے مارچ کر کے راشٹرپتی بھون جائیں گے۔ وہاں یہ بچے راشٹرپتی جی کی خدمت میں اپنی عالمی انجمن کا اعلان نامہ پیش کریں گے۔ اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ یہ اعلان تمام ملکوں کی حکومتوں کے پاس بھیج دیں۔

اس تقریب میں ہر ملک سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا شریک ہوگا جن کی عمر ۱۰ سے ۱۵ سال کے درمیان ہوگی۔ راشٹرپتی سے ملاقات کے بعد یہ بچے گیارہ دن تک ہندوستان

پیام تعلیم







ل مینک ڈروٹ



جیمنی نمبر ۲ کے امریکی خلاباز

ایڈورڈ وہائٹ



صدرِ جمہوریۂ ہند
ڈاکٹر رادھا کرشنن
پروفیسر محمد مجیب
کو
پدم بھوشن
کا تمغہ
عنایت فر
ہیں



شمارہ ۔ ۷   جولائی ۱۹۶۵ء   جلد ۲

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

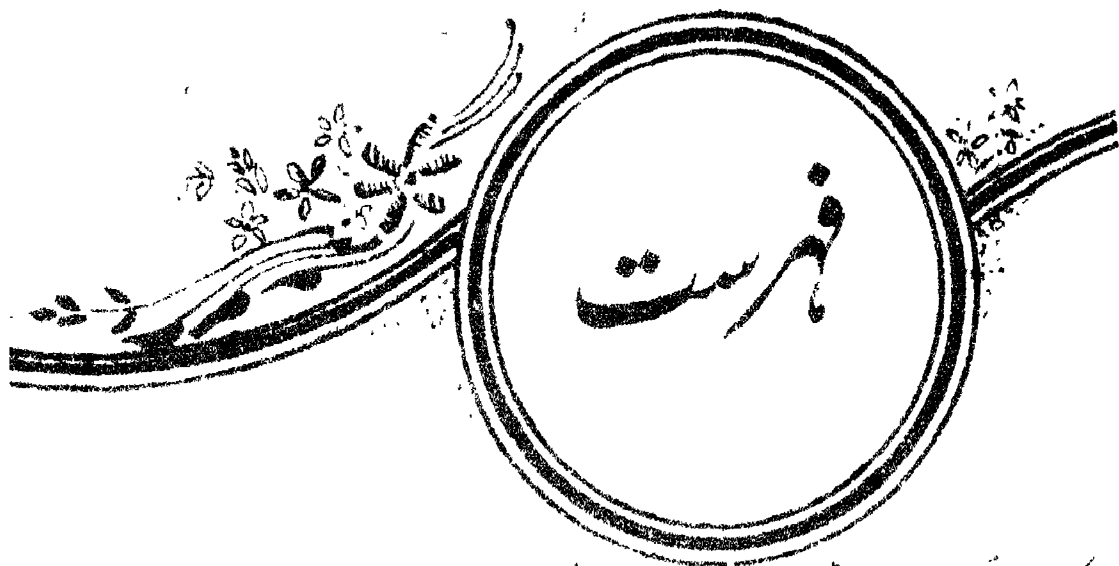


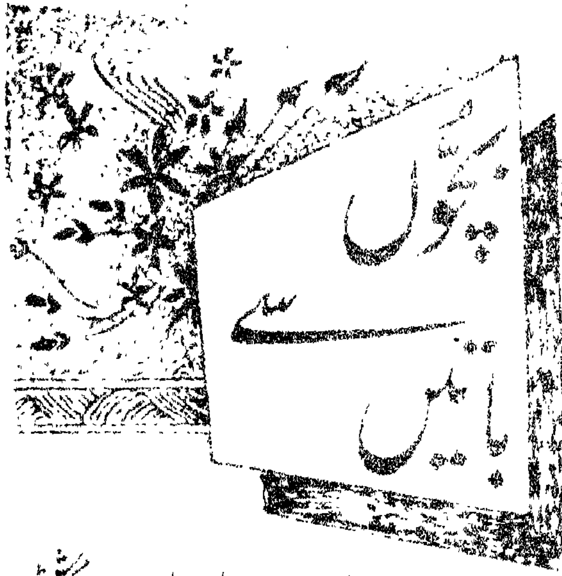
سالانہ چندہ : ۔۔۔ پانچ روپے

فی پرچہ : ۔۔۔ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵


فہرست



اس طرح دیکھتے دیکھتے پورا ایک سال بیت گیا۔ یہ پرچہ آپ کے رسالے کا بارھواں پرچہ ہے۔ آپ کا پیام تعلیم جو اب ایک سال کا ہو گیا۔ مبارک ہو!

اس تمام عرصے میں ادارے کی طرف سے بہتر سے بہتر بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور ہم اسے بہتر بنانے کی کوشش آئندہ بھی برابر جاری رہے گی۔

ہمارے لیے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ آپ نے، آپ کے بڑوں نے، آپ کے استادوں نے، پیام تعلیم کے پرانے بہت پرانے قدردانوں نے ہماری کوششوں کو بہت سراہا ہے۔ بچوں کے بڑوں کے رسالوں نے اچھے اچھے ریویو کیے ہیں۔ غرض سب نے بچوں کے اس خادم کا دل سے خیر مقدم کیا ہے۔ ہماری امید سے کہیں زیادہ!

آپ کی اس پسندیدگی نے ہماری ہمت کا حوصلہ بہت بڑھا دیا ہے اور ہم سب دل و جان سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ رسالہ آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید، زیادہ سے زیادہ دلچسپ ہو۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنے بزرگوں خصوصاً مخدوم محترم ذاکر صاحب، پروفیسر حبیب صاحب، رشید صدیقی صاحب، سرور صاحب، عابد صاحب کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اپنے پیاموں سے ہماری ہمت بڑھائی۔ ہم میں خود اعتمادی کا احساس پیدا کیا۔

اپنے نئے پرانے ساتھیوں سے بھی ہمیں غیر معمولی مدد ملی ہے۔ آپ کے پرچے کو بڑی بھلی جو کامیابی ہوئی ہے وہ ان ہی ساتھیوں کی بدولت۔ ان ہی کے مضمون یا نظمیں رسالے کی زینت بنی ہیں۔

جناب مقبول احمد سیوہاروی



بندروں کی لڑائی

بچو آؤ بندروں کی لڑائی کا تماشہ دیکھو
ایسا تماشہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا اس تماشہ
کا کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔

یہ بندر بازی گر کے پالے ہوئے نہیں
ہیں نہ کسی نے انھیں باندھ کر رکھا ہے۔ یہ اپنے
ملک میں آزاد رہتے ہیں۔ لڑائی بھی اپنی مرضی سے
لڑتے ہیں اور صلح بھی اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔

بندروں کی یہ لڑائی اب سے تین سو
برس پہلے فرانس کے ایک مسافر نے دیکھی تھی۔ اس
مسافر کا نام ٹیورنیر تھا اور یہ ہیرے کی کانیں
دیکھنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ بندروں کا
تماشہ دیکھ کر یہ ضرور بتانا کہ تم نے آج تک بندروں
کا ایسا تماشہ دیکھا ہے یا نہیں؟

جب یہ مسافر مدراس جا رہا تھا تو ایک
گاؤں میں جس کا نام رودنی کوٹ ہے اس نے ایک
ایسی سڑک دیکھی جس کے دونوں طرف بانسی
کھڑی تھی۔ ان کے لمبے اور گھنے بانس، کہ
آدمی یا کوئی جانور اندر گھسنا چاہے تو پھنس
کر رہ جائے۔ اسی بانسی میں بندروں کی فوجیں
رہتی تھیں۔ یوں سمجھو کہ یہ بانس کا جنگل ان بندروں
کا ملک تھا اور یہ اپنی سرحد میں کسی کو گھسنے
نہ دیتے تھے۔

بانسوں کے بیچ میں جو سڑک گئی تھی۔ اس پر جگہ جگہ سپاہیوں کی چوکیاں اور دروازے تھے اور یہ سپاہی بڑی چوکسی سے دیکھ بھال رکھتے تھے کہ لٹیرے کسی مسافر کو اکیلا دُکیلا پا کر لوٹ نہ لیں۔

فرانس کے مسافر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس سڑک پر ایسا اچھا انتظام تھا کہ سونا اچھالتے چلے جاؤ کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔

جو لوگ بندروں کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں وہ سڑک پر چالیس چالیس پچاس پچاس قدم پر ٹوکروں میں چاول بھر کر رکھ دیتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں۔ ٹوکروں کے پاس بانس کے ڈنڈے اور چھڑیاں بھی رکھ دیتے ہیں۔

بندر جھاڑیوں سے تاکتے رہتے ہیں جوں ہی یہ لوگ چھپ جاتے ہیں بندروں کی پلٹنیں دوڑ پڑتی ہیں۔ ایک طرف سے ایک پلٹن دوسری طرف سے دوسری پلٹن۔

پہلے دانت نکال کر چیخیے اور شور مچاتے ہیں پھر جھپٹ جھپٹ کر آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بچوں والی بندریاں کودتی پھاندتی آ کر ٹوکروں سے چاول کھانے لگتی ہیں۔ اور بندروں کی دونوں پلٹنیں غصہ میں بھر کر لاٹھیاں اٹھا کر ایسی سخت لڑائی لڑتی ہیں کہ ایک دوسرے کو ہوش نہیں رہتا۔ تمام جنگل چیخوں کے شور اور لاٹھیوں کی کھٹ کھٹ کی آواز دوں سے گونج اٹھتا ہے کسی بندر کا منہ ٹوٹ جاتا ہے کسی کا سر پھوٹتا کوئی لنگڑا کر بھاگتا اور کسی کی ناک ٹوٹ جاتی ہے بس قیامت برپا ہو جاتی ہے اور جب تک ایک پلٹن دوسری پلٹن کو اپنی سرحد سے نکال نہیں دیتی لڑائی بند نہیں کرتی۔

ہارا ہوا فریق جھاڑیوں میں گھس جاتا ہے تو دوسرا فریق چاولوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ہارا ہوا فریق جھاڑیوں میں سے انھیں کھاتا دیکھ کر اپنے سر دُھنتا رہتا ہے۔

پھر بھی ان بندروں میں رواداری سمجھ کر اگر ہاری ہوئی پلٹن کی بندریاں بچے چپکے چاول کھانے لگتی ہیں تو جیتی ہوئی فوج انھیں روکتی نہیں ہے۔

تم نے دیکھا بندروں کی لڑائی کا تماشا؟

اب یہ علاقہ صاف ہو گیا ہے۔ بانس بھی کٹ گئی ہے اور بندر نہ جانے کہاں بھاگ گئے ہیں کیونکہ تین سو برس گزر جانے پر بھی کسی مسافر نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

جناب تسنیم سنی

ماں اور جگنو



آپ نے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے کبھی کبھی بڑی دلچسپ کہاوتیں سنی ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ اگر کالی بلی راستہ کاٹ دے تو پھر اس راستے پر جانا ٹھیک نہیں، کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ یا اگر صبح صبح گھر کی منڈیر پر کوئی کوا بولنے لگے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس دن گھر میں کوئی مہمان آنے والا ہے۔ اسی طرح یہ کہاوت بھی مشہور ہے کہ جگنو بھٹکی ہوئی روحوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی سمجھ دار آدمی ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض کہاوتیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں اور ہم ان میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

ہماری پیاری زبان اردو کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری صاحب نے ایک بہت اچھی نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "جگنو"۔ اپنی اس خوبصورت نظم میں انھوں نے ایک ایسے نوجوان کے جذبات کی مصوری کی ہے جس کی ماں اس کی پیدایش کے دن ہی اس دنیا سے اٹھ گئی تھی۔ جب یہ نوجوان صرف پانچ چھ برس کا تھا تو رات میں ادھر اُدھر اڑتے ہوئے جگنوؤں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کو کھلانے والی دائیوں نے اسے بہلانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ جگنو بھٹکی ہوئی روحوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ سن کر بچے کے دل

میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی جگنو ہوتا تو اپنی
ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو راستہ دکھاتا۔ اس خیال
کے ساتھ ہی اُسے اپنی مرحومہ ماں کی یاد تڑپانے لگتی
ہے۔ یہ نظم بہت لمبی ہے اور پوری نظم سمجھنا آپ کے لیے
مشکل بھی ہوگا اس لیے ہم اس نظم کا وہی حصہ نقل کرتے
ہیں جس میں جگنوؤں کو دیکھ کر بچہ بھی اپنی مرحومہ ماں کو
یاد کرتے ہوئے جگنو بننے کی آرزو کرتا ہے۔ لیجیے اب
ان اشعار کا لطف اُٹھائیے اور دیکھیے کہ فراق صاحب
نے کتنی سادہ اور سہل زبان میں یہ باتیں کہی ہیں :-

مری حیات نے دیکھی ہیں بیس برساتیں
مرے جنم ہی کے دن مر گئی تھی ماں میری
وہ ماں کہ شکل بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا
جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ، وہ ماں
میں وہ پسر ہوں جو سمجھا نہیں کہ ماں کیا ہے
مجھے کھلائیوں اور دائیوں نے پالا تھا
وہ مجھ سے کہتی تھیں جب گھر کے آتی تھی برسات
جب آسمان میں ہر سو گھٹائیں چھاتی تھیں
بوقتِ شام جب اڑتے تھے ہر طرف جگنو
دیے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھٹکی روحوں کو
مزہ بھی آتا تھا مجھ کو کچھ ان کی باتوں میں
میں ان کی باتوں میں رہ رہ کے کھو بھی جاتا تھا
پر اُس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی ہوتی تھی
کبھی کبھی یہ کسک ہوک بن کے اٹھتی تھی
یتیم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا !
یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
کہاں کہاں وہ بچاری بھٹک رہی ہوگی
کہاں کہاں مری خاطر بھٹک رہی ہوگی
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب
کہوں کہ پڑھ کے سنا تو مری کتاب مجھے
پھر اس کے بعد دکھاؤں اُسے میں وہ کاپی
کہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں
یہ حرف تھے جنھیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل
دکھاؤں پھر اُسے آنگن میں وہ گلاب کی بیل
سنا ہے جس کو اُسی نے کبھی لگایا تھا
یہ جب کی بات ہے جب میری عمر ہی کیا تھی
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برساتیں



بچارہ شاعر

جناب یوسف ناظم

شاعر: (اپنے آپ سے) اُفّوہ! اب کہیں جاکر تین شعر ہوئے۔ لیکن کیا غضب کے شعر ہیں، جو بھی سنے گا پھڑک جائے گا ــــــ (گنگناتا ہے)

صبح کے بعد دوپہر آئی
اور پھر اس کے بعد شام آئی
شام کے بعد پھر رات آئی
رات کے بعد پھر صبح آئی
صبح کے وقت آفتاب آیا
رات کے وقت ماہتاب آیا

مزا آگیا! آفتاب آیا اور ماہتاب آیا، کیا اچھی بات ہے۔ یہی تین شعر اگر میں کسی پرچے میں چھپنے کے لیے بھیج دوں تو ایڈیٹر خوشی سے ناچنے لگے گا ــــــ لیکن کہیں چھپنے کے لیے بھیجنا تو دور کی بات ہے پہلے کسی کو سنا تو لوں۔ (سوچ کر) لیکن سناؤں کسے! مُنّے کو؟ ہونھ مُنّا سمجھے گا کیا۔ وہ تو ابھی بچہ ہے۔ وہ کیا جانے شعر کس چڑیا کا نام ہے۔ اُسے سناؤں گا تو ہنس کر ٹال دے گا ــــــ کیوں نہ مُنّے کی امّی کو سناؤں ــــــ لیکن وہ تو بس اپنے چولھے ہانڈی میں لگی ہوں گی۔ انھیں اتنی فرصت ہی کب ہوتی ہے کہ ہمارے شعر سنیں ــــــ خیر کوشش کرتا ہوں۔ (آواز دیتا ہے) منّے! او منّے بیٹے!

منّا : جی ڈیڈی ۔ ابھی آیا۔

شاعر: دیکھو ذرا اپنی امّی کو تو بلا لاؤ۔ کہنا بس تھوڑی دیر کے لیے آ جائیں۔

منّا : امّی تو کچن (باورچی خانے) میں ہیں ڈیڈی۔

شاعر: ہاں ہاں، وہ تو، وہ کچن ہی میں رہتی ہیں۔ بس پکا رہی ہوں گی اپنا وہی مشہور قورما۔ منّے۔ کبھی اپنی امّی سے پوچھنا تو بھلا اس گھر میں سوائے قورمے کے اور کوئی سالن بھی پکتا ہے ۔ لیکن میرا نام نہ لینا ـــــ اچھا منّے یہ بتاؤ تم شعر وغیرہ بھی سمجھتے ہو ۔ یعنی نظم وغیرہ ؟

منّا : ہاں ہاں، کیوں نہیں ڈیڈی۔ میرا ایک دوست تو شاعر ہے ڈیڈی، اور دن بھر سوچتا رہتا ہے ۔ پر نہ جانے کیا بات ہے ڈیڈی سب اسے بدھو سمجھتے ہیں۔

شاعر: خیر۔ خیر۔ تم جاکر اپنی امّی کو بھیج دو۔

(جانے کے بعد)

شاعر: آج کل کے لڑکے کیا جانیں کہ شاعر کی کتنی عزت کرنی چاہیے ۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے منّے کو اپنے شعر نہیں سنائے۔

امّی: آپ نے مجھے بلایا ہے ؟ کیا بہت ضروری کام ہے ؟

شاعر: ہاں ہاں، ضروری ہی سمجھو ـــــ تم بھی عجیب ہو۔ بس دن رات باورچی خانے میں رہتی ہو ۔ میں پوچھتا ہوں یہ دن بھر پکتا کیا رہتا ہے ۔ اتنی دیر اگر کوئی اور کچن میں رہے تو سارے محلے والوں کا کھانا پکالے۔

امّی: جی ـــــ آپ تو بس یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں وہاں بیٹھ کر مکھیاں مارتی رہتی ہوں۔ کسی ماما کو رکھ کر کھانا پکوائیے تو معلوم ہو۔

شاعر: اچھا اچھا، خفا نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کیوں نہ اس وقت چائے پی جائے۔

امّی: (تقریباً چیخ کر) چائے ! دن کے بارہ بجے اور چائے۔ اتوار آیا نہیں اور آپ کو چائے کا دورہ شروع ہوا چائے پیئیں گے اور پھر شعر کہنے بیٹھ جائیں گے ۔

شاعر: (خوش ہوکر) خوب یاد دلایا۔ شعر تو میں کہہ چکا۔ جانے دو چلئے نہ سہی ۔ صرف شعر سن لو۔

امّی : شعر سن لوں ! دن کے بارہ بجے ہیں۔ ہانڈی

چولہے پر چڑھی ہے ابھی قورما تیار کرنا ہے۔

شاعر: قورمے کو مارو گولی۔ شعر سنو گی تو قورما بھول جاؤ گی۔ سنو!

امّی: نہیں نہیں، اس وقت نہیں۔ کھانے کے بعد اطمینان سے سنوں گی۔

شاعر: کھانے کے بعد یعنی دو تین گھنٹے انتظار کروں! اور پھر اطمینان کی کیا بات ہے۔ ہمیں کوئی مشاعرہ تھوڑی سننا ہے۔ صرف تین ہی شعر تو سناؤں گا۔

امّی: ایک دو گھنٹے میں شعر خراب تو نہ ہو جائیں گے۔ دیر ہو گئی تو گوشت البتہ جل جائے گا اور آپ کو معلوم ہے گوشت آج کل کتنا مہنگا ملتا ہے۔

شاعر: غضب خدا کا کہاں تو بات شعر کی تھی اور کہاں یہ گوشت کا بھاؤ آ گیا۔ اچھا جانے دیجیے۔ بیگم کیوں نہ آج تم سے بازار کے بھاؤ کی باتیں ہو جائیں۔ فرمائیے گوشت کا کیا نرخ ہے۔

امّی: گوشت اب پانچ روپے کلو ملنے لگا ہے اور وہ بھی کوئی چھانٹ کر دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

شاعر: یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ تو کہو تم پکاتی اچھا ہو ورنہ خراب گوشت کس سے کھایا جاتا — ہاں کیوں نہ تم صرف دو شعر سن لو۔

امّی: پھر وہی شعر کی بات۔ اے لو وہ سالن جلنے کی بو آئی۔ میں تو چلی۔

(جلنے کی آواز)

شاعر: اس ناقدری کی وجہ سے تو میں خود جل گیا ہوں۔ شعر کہے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اور اب تک میں کسی کو سنا نہیں سکا۔ اب تو میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ پتہ نہیں پیٹ میں کیوں مروڑ سا ہو رہا ہے — (آواز دیتا ہے) منّے ادھر منّے۔

منّے: جی ڈیڈی۔ میں ابھی آیا۔

شاعر: جلدی آؤ منّے۔ میرے پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ذرا دیکھو تو پڑوس میں حکیم صاحب گھر پر ہیں یا نہیں۔

منّے: ڈیڈی میں ابھی جاتا ہوں۔ میرا وہ دوست آنے والا ہے۔

شاعر: اب تمھارا کون دوست آنے والا ہے۔

منّے: ڈیڈی، وہی رحمان جو شاعر ہے۔

شاعر: (خوش ہوکر) اچھا رحمان آرہا ہے۔ تم جاؤ
آئے گا تو میں اُسے بٹھاؤں گا۔
مُنّے: لیکن ڈیڈی وہ آتے ہی شعر سنانے لگے
گا۔ بُرا مت مانیے گا۔
شاعر: نہیں جی۔ شعر سنانا کوئی بُری بات تھوڑی
ہے۔ تم جاکر حکیم صاحب سے کوئی اچھا چورن
لے آؤ۔
امّی: (نزدیک آکر) اب یہ چورن کیوں منگوا
رہے ہو۔
شاعر: میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ بڑی سخت
تکلیف ہے۔
امّی: مجھے معلوم ہے کاہے کی تکلیف ہے۔
(آواز آتی ہے،) مُنّے بھائی۔ منے بھائی۔
امّی: یہ مُنّے کا دوست ارشد آیا ہوگا۔ کون
ارشد؟
ارشد: جی ہاں میں ہوں چچی جان۔ کیا مُنّے گھر
میں نہیں ہیں۔
شاعر: آؤ بیٹھو۔ وہ ابھی آجائے گا ——
(صورت دیکھ کر) تم تو بڑے ہوشیار اور
سمجھدار لڑکے معلوم ہوتے ہو۔
ارشد: چچا جان۔ آپ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے
مجھے سمجھدار کہا ہے۔ اسکول میں تو سب
مجھے بدھو ہی کہتے ہیں۔ ہی ہی۔
شاعر: اسکول کے لڑکوں کی بھی بھلی کہی۔ (پیٹ
پکڑکر) اوہو! مُنّے جلدی آجاتے تو اچھا
تھا۔
ارشد: چچا جان آپ کو کوئی تکلیف ہے؟
شاعر: ہاں بیٹے۔ پیٹ پھول رہا ہے۔
ارشد: جی آپ کوئی بات کہنا چاہتے ہوں تو مجھ
سے کہیے نا۔
شاعر: ہائیں تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں تم سے کچھ
کہنا چاہتا ہوں۔
ارشد: دیکھیے چچا جان۔ ہماری ایک خالہ ہیں۔
جب بھی انھیں کوئی راز کی بات معلوم ہوتی
ہے، وہ کسی اور کو سنانا چاہتی ہیں جب
تک وہ سنا نہیں لیتیں ان کے پیٹ میں
درد ہوتا رہتا ہے۔
شاعر: تم تو سچ مچ بہت ہوشیار ہو۔ آہاہا ——
اب تو مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں
ہوتی —— ہائے ہائے۔
ارشد: کیا میں پانی لے آؤں۔
شاعر: نہیں مجھے پانی نہیں چاہیے... ارشد بیٹے،

نے کہہ رہا تھا کہ تم شعر بھی کہہ لیتے ہو۔

ارشد (خوش ہو کر) جی ہاں چچا جان۔ کبھی کبھار دو چار بنا لیتا ہوں۔

شاعر: ہاں یہ لو یہ بسکٹ کھاؤ۔ وہ کیلا بھی اٹھا لو وہاں سے۔ کھاؤ۔ لڑکے کھانے پینے میں شرمایا نہیں کرتے۔

ارشد: آپ لیٹ جائیے نا چچا جان۔ کب تک آپ یونہی پیٹ پکڑے بیٹھے رہیں گے۔

شاعر: ارشد تم شعر بھی کہہ لیتے ہو نا۔

ارشد: جی چچا جان۔ لیکن ہمارے گھر میں شعر سنانا منع ہے۔ امی بگڑتی ہیں اور ابا تو ٹھوکتے ہیں۔

شاعر: پھر تم کیا کرتے ہو؟

ارشد: جی میں کسی اور کے گھر میں جا کر اپنے شعر سناتا ہوں۔ اب منّے آجائے گا تو اسے شعر سناؤں گا۔

شاعر: غضب ہو گیا۔ ہاں ہاں ضرور سنانا۔ لیکن شعر سنانے کا ڈھنگ بھی ہونا چاہیے۔

ارشد: جی دیکھیے میں شعر اس طرح سنایا کرتا ہوں۔

شاعر: نہیں نہیں، تم ابھی نہ سناؤ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ لو ایک بسکٹ اور کھاؤ ــــ

دیکھو شعر اس طرح سنانا چاہیے۔ (کھنکارتا ہے)

صبح کے بعد دوپہر آئی
اور پھر اس کے بعد شام آئی

پسند آیا نا۔ کچھ بولو تو سہی۔

ارشد: چچا جان یہ شعر تھا۔ میں تو سمجھا آپ جغرافیہ کی کوئی بات بتلا رہے ہیں۔

شاعر: (ہنس کر) تم تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔ لو دوسرا شعر سنو۔

شام کے بعد دیکھو رات آتی
رات کے بعد پھر صبح آئی
صبح کے وقت آفتاب آیا
رات کے وقت ماہتاب آیا

ارشد: چچا جان۔ یہ شعر آپ ہی کے تھے نا۔

شاعر: اور نہیں تو کیا۔ کیسے تھے؟

ارشد: بہت اچھے تھے۔ چچا جان اب آپ کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

شاعر: ہاں، مجھے اب آرام ہے۔ (منّے کی آواز آتی ہے)

منّے: ڈیڈی۔ یہ لیجیے۔ حکیم صاحب نے یہ چورن دی ہے۔ کہا ہے اس پر پانی نہ پیجیے گا۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)



برسات کا زمانہ لو پھر سے آگیا ہے
اک کیف سا ہر اک کے دل میں سماگیا ہے

بادل کہیں پہ بھورے اور ہیں کہیں پہ کالے
ہیں دیکھنے میں کومل جیسے روئی کے گالے

سورج نے اپنا چہرہ ان میں چھپالیا ہے
اس طرح بادلوں نے قبضہ جمالیا ہے

چاروں طرف گھٹائیں گھر گھر کے چھارہی ہیں
اور جھومتی گرجتی بل کھاتی آرہی ہیں

وہ دیکھو ٹھنڈی ٹھنڈی پڑنے لگیں پھواریں
مل جل کے لڑکیاں بھی گانے لگیں ملہاریں

پکنک منانے بچے اسکول سے چلے ہیں
برسات زور پر ہے گرمی کے دن ڈھلے ہیں

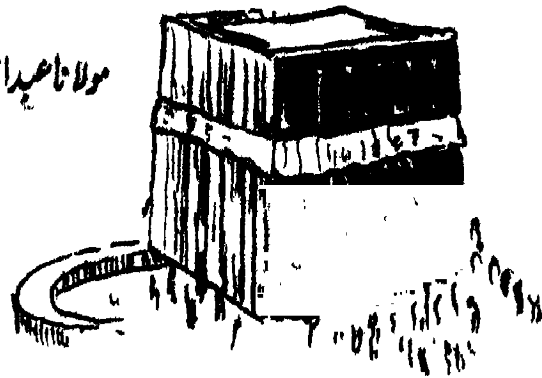
مینڈک بھی اپنی بولی ہر سمت بولتے ہیں
اور مور ناچنے کو پَر اپنے تولتے ہیں

خوشیاں منائیں جھومیں جھولوں پہ جاکے جھولیں
اور آسماں کو آؤ پینگیں بڑھا کے چھولیں

بھیگی ہے اب ہوا بھی موسم بہار پر ہے
لو دیکھو تم منیرؔ اب سبزہ نکھار پر ہے

مولانا عبدالسلام قدوائی

حج مقبول



حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے نام سے تو تم خوب واقف ہو گے۔ ان کے خلیفہ حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کا نام بھی شاید سنا ہو وہ اپنے عقیدت مندوں کو مفید باتیں بتایا کرتے تھے اور ان کی دین و دنیاوی حالت کو سدھارنے کے لیے نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی ان باتوں کو ان کے معتقد لکھتے رہتے تھے خیرالمجالس کے نام سے یہ کتاب شائع ہو گئی ہے۔ آج تم کو اسی کتاب کا ایک قصہ سناتے ہیں۔

شیخ نے ایک بزرگ کے حوالے سے ایک حج کا قصہ لکھا ہے حج کے بعد ان بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اس مرتبہ کا حج کیسا رہا اور کتنے خوش نصیبوں کا حج تیری درگاہ میں قبول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ "اس سال کسی کا حج قابل قبول نہ تھا مگر ایک مصری بندے کے حج کے طفیل سب کا حج قبول کر لیا گیا"۔

اب ان بزرگ کو بڑی فکر ہوئی کہ اس مصری سے ملاقات کر کے معلوم کریں کہ اس کی کیا حالت ہے کہ اللہ نے اسے اتنا بڑا درجہ دیا ہے۔ حج سے فارغ ہو کر وہ بزرگ مصر گئے اور بتائے ہوئے پتے کے مطابق اس شخص کے یہاں پہنچے۔ یہ بزرگ اپنی بزرگی میں مشہور تھے وہ شخص بڑی تعظیم سے ملا اور دریافت کیا کہ تشریف لانے کی غرض کیا ہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی اس مرتبہ حج کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ کن لوگوں کا حج اس کی بارگاہ میں مقبول ہوا اس پر تمھارے بارے میں الہام ہوا میں تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ اتنی بڑی مقبولیت کی وجہ کیا ہے۔

اس شخص نے عرض کیا کہ "حضرت! میں نے تو اس سال حج کیا ہی نہیں، ارادہ کئی برس سے تھا تھوڑا تھوڑا جمع کرتا رہتا تھا اس مرتبہ اتنی رقم جمع ہو گئی تھی کہ اس حج کا سفر اور ضروری مصارف پورے ہو سکتے تھے یہ دیکھ کر میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس سال ضرور حج کے لیے جاؤں گا مگر کچھ عرصے پہلے ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے اس مرتبہ بھی سفر ملتوی کرنا پڑا اور حج کی آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

"ہوا یہ کہ پڑوسی کے یہاں بکری کی ران بھونی جا رہی تھی اور اس کی خوشبو میرے گھر میں آ رہی تھی میری بیوی کو خواہش ہوئی کہ تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت اسے بھی کھانے کو مل جائے اس نے پڑوسی سے کہلا بھیجا لیکن پڑوسی نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ تمھارے لیے نہیں ہے صرف ہمارے لیے ہے اس انکار سے میری بیوی کو بڑا رنج ہوا جب شام کو میں گھر آیا تو اس نے یہ واقعہ مجھے سنایا۔ مجھے بھی پڑوسی کے رویے سے تکلیف ہوئی اور جا کر اس سے اس کی شکایت کی میری شکایت سن کر اس نے کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا واقعی اس بکری کا گوشت کھانے کی تمھاری بیوی مستحق نہ تھیں۔ اس شخص کی اس صاف بیانی سے مجھے اور تکلیف پہنچی میں نے کہا کیا پڑوسی کا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ دو بوٹیاں پا سکے اس نے کہا بھائی تم اشارہ نہیں سمجھتے تو صاف صاف سنو۔ بات یہ ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں یوں تو آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے مگر اس مرتبہ کئی دن بے دانہ پانی کے گزر گئے جب لگاتار فاقوں سے جان پر بن گئی تو نکلے کہ کہیں شاید کچھ مل جائے دیکھا تو گھورے پر ایک مری ہوئی بکری پڑی تھی اس کو اٹھا لائے اور آگ میں بھون کر کھایا۔ اب بھلا بتاؤ کہ اس بکری کا گوشت تمھارے یہاں کس طرح بھیجا جاتا ہم لوگوں کے لیے تو فاقوں کی شدت کی وجہ سے حرام حلال ہو گیا تھا مگر تمھارے لیے مردار کھانا کس طرح درست ہوتا اس لیے میں نے تمھاری بیوی کی فرمایش پوری نہیں کی۔" میرے محترم بزرگ کیا بتاؤں پڑوسی کا بیان سن کر میری کیا حالت ہو گئی مجھے شرم آ رہی تھی کہ میرا پڑوسی اس طرح فاقوں سے پریشان ہے۔ اس وقت میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں وہی حج کے سفر کے لیے جمع کی ہوئی رقم رکھی تھی لا کر اس غریب پڑوسی کو دے دی اور حج کا سفر ملتوی کر دیا شاید میرا یہی جذبہ مولیٰ کو پسند آ گیا ہو اور اس نے بے حج کے مجھے حج کے ثواب سے نوازا اور اپنی عنایت سے مجھے حج مقبول کا درجہ عطا کیا ہو۔"

دو وانگ لائی - ترجمہ جناب علی بن ایاز

سچّی دوستی



پرانے زمانے سے بڑے بوڑھے کہتے آرہے ہیں کہ یہ دنیا بڑی بے وفا ہے، بڑی غدار ہے۔ بڑے بوڑھوں کی کہی ہوئی بات ہے سچ ہی ہوگی۔

مگر کبھی کبھی کوئی مثال دوستی کی ایسی بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو تمام ان اغراض سے بالاتر ہوتی ہے، جو ہم انسانوں کی جبلت میں داخل ہیں۔ اور جب کوئی ایسی مثال دیت نامیوں کے سامنے آتی ہے تو وہ سمجھ داری کے طور سر ہلا دیتے ہیں۔ اور دنیا میں اکثر لوگوں کا یہی طریق ہے، جب وہ کوئی ایسی بات پاتے ہیں۔ اور ویت نامی دوستی کے سلسلے میں وو انگ لی اور لوڈ بِنھ کی مثال دیتے ہیں۔

دو انگ لی بیچارہ غریب تھا اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کے برخلاف لوڈ بِنھ امیر تھا۔ اس کے باپ نے اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ جب لوڈ بِنھ نے دیکھا کہ دوانگ لی کی تعلیم میں غربت کی وجہ سے خلل پڑ رہا ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ دوانگ لی کو اپنے ساتھ ہی رہنے سہنے کی دعوت دے تاکہ سر سالا امتحانات کی وہ بے فکری سے تیاری کر سکے۔

جیسا کہ افسانوں میں اکثر لیکن حقیقی زندگی میں کمتر ایسا ہوتا ہے، دوانگ لی اپنی غربت کے احساس سے جی لگا کر محنت کے ساتھ پڑھتا اور دن رات ایک کرتا رہا۔ ادھر لوڈ بِنھ کو دولت

کا گھمنڈ تھا۔ جب امتحان ہوئے تو انسانوں کے برخلاف کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوا۔ ڈوانگ لی کو کوتنھان (Kou Than) کی ڈگری مل گئی۔ اور وہ منڈارین کے منصب پر فائز ہوگیا۔ لوڈبھو ناکام رہا۔

لوڈبھو مایوس اور ناکام لوٹا۔ اس ناکامی کا اثر اتنا شدید تھا کہ اس نے عیاشی کی گود میں پناہ ڈھونڈی اور جلد ہی اپنی دولت اڑا دی۔ دوسرے سال جب امتحان کا موقعہ آیا تو وہ راجدھانی گیا اور پھر ناکام لوٹا۔ گھر لوٹتے وقت اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ قریب ہی کے علاقہ میں دوانگ لی کی حکومت ہے۔ اس نے اس سے مدد مانگنے کا ارادہ کیا لیکن اُسے بڑی حیرت اور ندامت ہوئی یہ دیکھ کر کہ دوانگ لی نے نہ صرف اس سے ملنے سے انکار کیا بلکہ اپنے دربانوں کے ذریعے اسے دھکے دے کر نکال دیا۔

لودبھو لاٹھی کے سرے پر اپنی گٹھری باندھے تھکا ہارا منہ لٹکائے چلا گیا۔ حقیقی زندگی میں یہ واقعہ یہیں ختم ہو جاتا۔ مگر یہ افسانہ ہے، اس لیے جاری رہا۔

شام ہوئی، لودبھو سڑک کے کنارے ایک سرائے میں پہنچا۔ اس سرائے کی مالکہ ایک خوبصورت عورت چاؤ لانگ نامی تھی۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے لوڈبھو نے اسے اپنی رام کہانی سنائی۔ عام طور پر حسین عورتوں سے نوجوان اپنا درد دکھ کہتے ہی ہیں۔ عورتیں یہ بپتا سنتیں اور انگڑائیوں کے ذریعے اپنی بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن چاؤ لانگ نے بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے لودبھو کی باتیں ہمدردی کے ساتھ سنیں، اور اس کی ہمت بندھائی اور اسے اپنی امداد کا یقین دلایا۔

سرائے کی آمدنی کے ذریعے لودبھو اس قابل ہوگیا کہ اپنے مطالعہ میں منہمک رہے۔ یہ نازک زمانہ گزر گیا۔ امتحان کا زمانا آگیا۔ امتحان میں لوڈبھو سب میں اوّل آیا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا تو چاؤ لانگ غائب تھی۔ اس نے اسے ہر طرف تلاش کیا۔ مگر نہ ملنا تھا نہ ملی۔

کئی برس گزر گئے۔ ایک دفعہ دورے کے سلسلے میں لودبھو کا گزر دوانگ لی کے علاقے میں ہوا۔ اپنے دوست کے برے برتاؤ کی یاد اسے اس سے ملنے سے نہ روک سکی۔ (باقی صلے پر)

جناب ضیاء الدین احمد شکیب

آدم زادے

ہمیں ملے دو آدم زادے
بھولے بھالے سیدھے سادے
اختر، خوشتر نام تھے ان کے
پیارے نیارے کام تھے ان کے

دونوں کی تھی ایک سی صورت
ایک سی صورت ایک سی مورت
ایک سا نیکر ایک سی جیکٹ
ہاتھوں میں تھی ایک سی ریکٹ

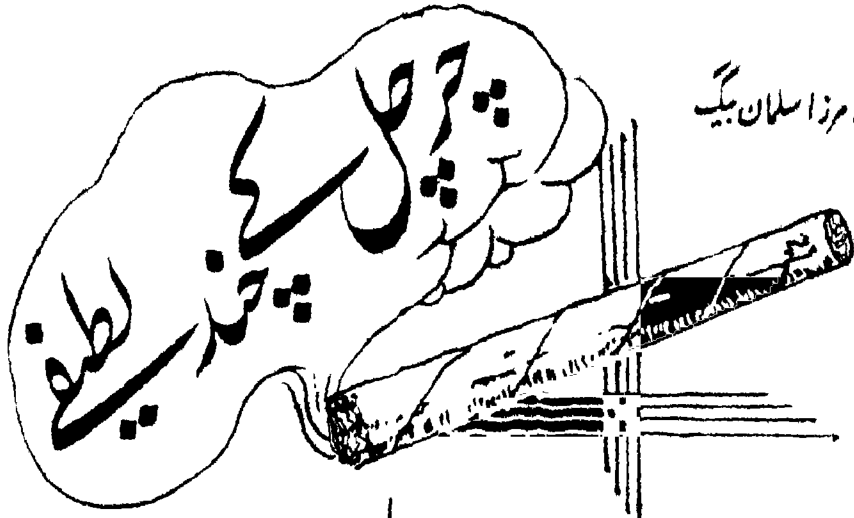
ایسے تھے وہ دونوں کے دولوں
ایک کو دے دو ایک کو لے لو

میں نے پوچھا بھیّا اختر
تم دونوں کا رشتہ آخر؟
بولا میں ہوں ان کا برادر
رشتے میں ہیں دونوں برابر

خوشتر نے پھر بات کو کاٹا
مجھ کو ٹوکا اس کو ڈانٹا
اور کہا پھر مجھ سے اکڑ کر
شان سے یوں ریکٹ کو پکڑ کر

سچ ہے یہ ہیں میرے برادر
رشتے میں ہوں لاکھ برابر
ہم نہیں لیکن ان کے برادر
آپ کو رشتے سے کیا آخر؟

سوچتا ہوں میں قصہ کیا تھا
ان دونوں کا رشتہ کیا تھا؟



جناب مرزا سلمان بیگ

ابھی ۲۴ جنوری کو انگلستان کے مشہور معروف سیاستداں اور سابق وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل اس دنیا سے چل بسے۔ ماشا اللہ نوّے برس کی عمر پائی ان میں سے باسٹھ سال وہ برطانوی سیاست میں پیش پیش رہے۔ دوسری بڑی لڑائی کے نازک دور میں انھیں انگلستان کا وزیر اعظم بنایا گیا اور انھوں نے کچھ ایسی سوجھ بوجھ، تدبر، جرات اور حوصلہ مندی سے کام لیا کہ لڑائی کا پانسا پلٹ گیا جرمنی کے نازی ہار گئے۔ انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ انگریز اس لیے ان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور انھیں "دوسری جنگ عظیم کا ہیرو" گردانتے ہیں۔

سر ونسٹن چرچل بڑے حاضر جواب اور زندہ دل تھے۔ ان کے متعلق بہت سے قصے اور لطیفے مشہور ہیں۔ ان میں سے دو چار ہم آپ کو بھی سناتے ہیں:

لیڈی نینسی ایسٹر برطانوی پارلیمنٹ کی پہلی خاتون ممبر تھیں اور انگلستان میں عورتوں کے حقوق کی خاطر جد وجہد کرنے میں سب سے پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ تیز طراری اور حاضر جوابی میں اچھے اچھے ان سے پناہ مانگتے تھے اگر انھوں نے کسی سے مات کھائی ہے تو وہ چرچل تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن پارلیمنٹ میں خوب جم کر بحث ہوئی۔ چرچل نے زبردست مخالفت کی اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اجلاس کے بعد جب لیڈی ایسٹر باہر نکلیں تو چرچل سے مڈبھ

ہو گئی۔ دانت کٹکٹا کر بولیں "چرچل! اگر میں تمھاری بیوی ہوتی تو تمھاری کافی کی پیالی میں زہر گھول دیتی۔"

چرچل نے اسی تیزی سے جواب دیا کہ "محترمہ اگر خدانخواستہ کہیں آپ میری بیوی ہو جاتیں تو میں کافی کو پینا ہی پسند کرتا۔"

لیڈی چرچل کا شمار بہت خوب صورت عورتوں میں ہوتا تھا اور خود چرچل کو خاصی بھدّی شکل کے لوگوں میں گنا جاتا تھا۔ جب ان کے یہاں پہلی لڑکی پیدا ہوئی تو چرچل اسپتال میں اسے دیکھنے کے لیے گئے۔ باہر نکلے تو بہت سے دوست اور اخباری نمائندے جمع تھے۔ کسی نے پوچھا:

"کہیے بچی کیسی ہے؟"

"بہت خوب صورت" چرچل نے خوش ہو کر کہا۔

"پھر تو لیڈی چرچل پر پڑی ہوگی؟" کسی اور نے پوچھا

"جی نہیں۔ وہ ہو بہو میری طرح ہے۔" چرچل نے جواب دیا۔

مخالف پارٹی کے لیڈر سر ولیم ہکس پارلیمنٹ میں ایک بیان دے رہے تھے اور چرچل ان کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنا سر ہلا رہے تھے۔ سر ولیم ہکس جب ان کی اس حرکت سے بہت اکتا گئے تو جھنجھلا کر کہنے لگے "میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے معزز دوست اپنا سر ہلا رہے ہیں.... لیکن میں تو صرف اپنے خیال کا اظہار کر رہا ہوں۔" چرچل نے برجستہ جواب دیا "آخر میرے معزز دوست پریشان کیوں ہوتے ہیں، میں بھی تو صرف اپنا سر ہلا رہا ہوں۔"

۱۸۹۹ء کا قصہ ہے۔ چرچل ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے ایک لڑائی میں پہنچے۔ دشمنوں نے گرفتار کر لیا اور لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اور انگریزی سرحد سے تین سو میل دور ایک مقام پر قید کر دیا۔ چند ہی دنوں بعد چرچل کسی نہ کسی صورت سے قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بھاگتے وقت وہ اپنے بستر پر دشمنوں کے نام ایک خط لکھ کر رکھ آئے تھے۔

"قیدیوں کے ساتھ آپ لوگوں کا برتاؤ

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

ب۔ بزمی بھارتی



جیٹھ بیتا، اساڑھ آیا ہے — برکھا رت کا سندیسا لایا ہے

لے کے ہل بیل اور کسی بھالا — راگ کچھ اپنی دُھن میں گاتا ہوا

کھیت کی سمت ہر کسان چلا — ساری دنیا کا میزبان چلا

دھوپ کا خوف اور نہ لُو کا ڈر — تن بدن کی نہیں ہے کچھ بھی خبر

کام میں یوں جُٹا ہوا ہے کسان — خاک میں جیسے رل گیا ہے کسان

اس کی محنت کی داد دینے کو — اس کے دل کی مراد دینے کو

گنگناتی ہوئی گھٹائیں اٹھیں — جھلملاتی ہوئی گھٹائیں اٹھیں

ہر طرف گھوم گھوم کر برسیں — رات دن جھوم جھوم کر برسیں

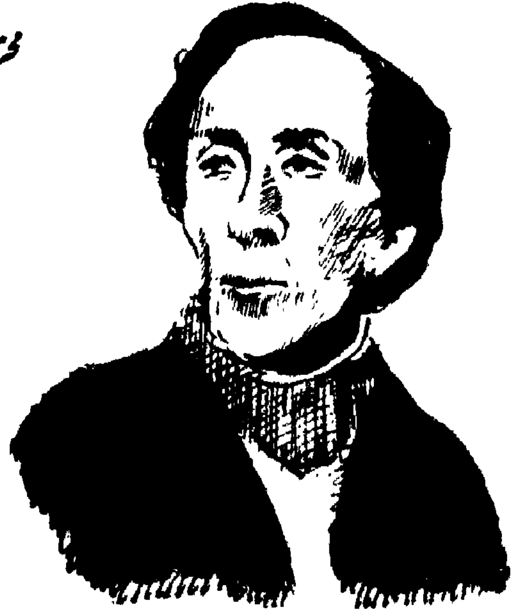
یوں گریں بندھ کے مینھ کی دھارائیں — جس طرح موتیوں کی ہوں مالائیں

پیڑ پودوں کا بیل بوٹوں کا — رنگ برسات نے نکھار دیا

پانی پی کر ہری ہوئی کھیتی
کچی چاندی زمین نے اگلی

محترمہ شاکرہ ندیم

اینڈرسن



ہانس اینڈرسن کی ایک دلچسپ کہانی ابھی پچھلے دنوں 'پیام تعلیم' میں چھپ چکی ہے۔ آپ نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں میں جو شہرت اور مقبولیت اینڈرسن کو نصیب ہوئی، وہ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں اس کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ خود اردو زبان میں اس کی ایک ایک کہانی کے کئی کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ لیکن ان عجیب و غریب کہانیوں کے لکھنے والے کے حالات بہت کم بچے جانتے تھے۔ محترمہ شاکرہ ندیم بہت بہت شکریے کی مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ حالات آپ کے لیے ایک مضمون کی شکل میں فراہم کر دیے۔

اصل مضمون سنڈے اسٹنڈرڈ میں چھپا تھا۔ لیکن بڑوں کے لیے تھا۔ شاکرہ ندیم نے اس میں سے ان حصّوں کا ترجمہ کر دیا ہے جو آپ کے لیے مفید اور دلچسپ ہو سکتے تھے۔ ترجمہ کیا کیا ہے، اپنے انداز میں لکھ دیا ہے۔ دیکھیے کتنا دلچسپ ہے۔

۔ ایڈیٹر۔

شہر کوپن ہیگن میں ایک اہم مقام پر ایک مجسمہ یادگار ہے۔ اس مجسمے کو بہت سے بچے گھیرے ہوئے ہیں۔ کچھ بچے اس مجسمے کی ٹانگوں پر چڑھ رہے ہیں۔ کچھ بچے اس کی پیٹھ پر چڑھ رہے ہیں۔

بتائیے یہ کس کا مجسمہ ہے ؟
یہ ہانس اینڈرسن کا مجسمہ ہے ۔
میرا خیال ہے کہ آپ اینڈرسن کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہوں گے۔ اس کی کہانیاں بھی پڑھی ہوں گی۔ یہ کہانیاں بچوں کے رسالوں میں اکثر چھپتی رہتی ہیں۔ ان کہانیوں کا ترجمہ آپ کی اردو زبان ہی میں نہیں ہوا ہے، دنیا کی سبھی زبانوں میں ہوا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ خود مصنف کو مرے ہوئے نوے سال ہو گئے، لیکن اس کی کہانیوں کی مقبولیت جوں کی توں ہے۔ دنیا کے بہت سے ادیب ہیں۔ بہت سے مصنف ہیں، جن کی مقبولیت اور شہرت وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پر اینڈرسن کی مقبولیت میں اس طرح کا اتار چڑھاؤ نہیں رہا ہے۔ وہ تو برابر بڑھتی ہی رہی ہے۔
مگر یہ شہرت یہ مقبولیت اینڈرسن کو یوں ہی نہیں حاصل ہو گئی۔ اسے بہت محنت کرنا پڑی ہے، بہت پاپڑ بیلنا پڑے ہیں۔
وہ اپریل ۱۸۰۵ء میں ایک بہت ہی غریب گھر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک جوتا بنانے والے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ اور اپنی اس زندگی سے بالکل مطمئن نہ تھا۔ اس زمانے میں یورپ میں بھی غریبوں کے لیے پڑھنے لکھنے کی اتنی آسانیاں نہ تھیں جتنی آج کل ہیں۔ پھر اینڈرسن کے باپ کی حالت تو اور بھی خستہ وخراب تھی۔ اینڈرسن چودہ برس کی عمر تک اپنی بستی اوڈنسے میں رہا۔ یہ بستی فوہن (FUHEN) کے جزیرے میں ہے۔
اینڈرسن کی زندگی کے حالات لکھنے والے نے یہ نہیں بتایا ہے کہ اس نے پڑھنا لکھنا کیسے سیکھا۔ بس اتنا لکھا ہے کہ اس عرصے میں وہ تنہا رہا اور اپنا زیادہ وقت اپنے بچوں کے تھیٹر کے لیے گڑیاں بنانے میں لگاتا رہا۔ اس تھیٹر کے لیے وہ کہانیاں بھی لکھتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے بہت سے لوگ اسے ہنسنے ہنسانے والا مسخرہ سمجھتے تھے۔ ایکٹر بننے کا اور ڈرامے لکھنے کا شوق اینڈرسن کو بچپن سے تھا۔
آخر ۱۸۱۹ء میں ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن کی طرف چل پڑا۔ پر وہاں کوئی جان نہ پہچان۔ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔ پر اپنی چھوٹی سی بستی کے مقابلے میں یہاں کی چہل پہل یہاں کی رونق اور شان وشوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ یہ شہر اسے بہت اچھا لگا۔ اس

نے یہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے شروع کیے۔
کیوں ؟
وہ تھیٹر کا بہت اچھا ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ گانے کا ماہر یا موسیقار بننا چاہتا تھا اسے امید تھی کہ یہ لوگ اس کا یہ شوق پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔
مگر ہوا کیا ؟
کچھ لوگوں نے تو اسے پاگل سمجھا۔ کچھ لوگوں نے اُسے بالکل نااہل قرار دیا۔



اس کی ناامیدی اور مایوسی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ وہ بوریا بستر باندھ کر گھر بھی اوڈینسے جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔
ایک دن ایک مجمع میں وہ اپنی نظم سنا رہا تھا۔ اتفاق کی بات وہاں ایک شاعر بھی موجود تھا۔ اپنا کلام سناتے سناتے جذبات کی شدت سے خود اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس کا اس شاعر پر بھی بڑا اثر ہوا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ اس لڑکے کی ہمت بڑھائی جائے تو کوئی عجب نہیں جو آگے چل کر یہ ترقی کرے۔ اس نے ڈینش رائل میوزک سوسائیٹی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ اس کی آواز ٹسٹ کی جائے۔
پر بات بنی نہیں۔
چھ مہینے بعد وہ پھر اسی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ بے چارہ پھر یکہ و تنہا رہ گیا۔ اور اب اس کا کام بس یہی رہ گیا تھا کہ چیتھڑے کے ٹکڑے جمع کرے اور اپنے تھیٹر کے لیے گڑیاں بنائے۔

مگر مثل مشہور ہے، بارہ برس بعد گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں۔ تو اب اس کے بھی دن پھرنے کا وقت آگیا۔ اور وہ اس طرح کہ شاہی تھیٹر کے بورڈ نے فیصلہ کیا کہ اینڈرسن ایکٹر کی حیثیت سے ناکام رہا ہے، اس کے ڈرامے بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ پھر بھی اسے وظیفہ دیا جائے۔ ایسا کیوں ہوا؟ بورڈ نے دیکھا کہ یہ لڑکا دھن کا پکا ہے بار بار کی ناکامیوں سے بددل نہیں ہوتا۔ پورے استقلال، پوری ہمت اور جوش کے ساتھ کام میں لگا ہوا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک نہ ایک دن ضرور ترقی کرے گا۔ غالباً اسی لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی ہمت بڑھائی جائے۔ ان کا یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ بورڈ کے ایک ممبر کولنس نے اینڈرسن کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اور اس طرح سترہ سال کی عمر میں اینڈرسن کو موقع ملا کہ سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ کرے۔

اور اب یوں سمجھیے کہ غریبی، مفلسی، فکر و فاقہ اور گندی گلیوں میں رہنے کے دن گزر چکے تھے۔ اور اب اس کی حیثیت شریفوں کے بچوں جیسی تھی۔

لگ بھگ پانچ برس تک اینڈرسن اپنے کم عمر ساتھیوں کے ساتھ پڑھتا رہا۔ مگر اس چیز نے اسے احساس کم تری میں مبتلا کر دیا تھا۔ مرے پر سو دُرّے! اس کا ہیڈ ماسٹر بہت ظالم اور خونخوار تھا۔ اسی لیے یہ دور بھی اینڈرسن کے لیے بڑی آزمایش کا دور تھا۔ وہ بہت پریشان رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو اتنا اکتا جاتا تھا کہ اپنے دوستوں سے خطوں کے ذریعے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں پوچھتا تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس باقاعدہ تعلیم سے اسے بہت فائدہ ہوا۔

اس کے سرپرست کولنس نے اس سے عہد لیا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے تصنیف و تالیف کا کام بالکل بند کر دے اور اپنا پورا دھیان، پوری توجہ مطالعے کی طرف رکھے۔ مگر اینڈرسن اپنے اس عہد کو پورے طور پر نبھا نہ سکا۔

آخر ۱۸۳۰ء میں ایک نوجوان مصنف اور ادیب کی حیثیت سے اس کا نام آنے لگا۔ اس کے ناٹک، ڈرامے اور نظمیں لوگوں کی نظروں میں جچنے لگیں مگر اس کی شہرت کی بنیاد صحیح معنوں

میں ۱۸۳۳ء — ۱۸۳۸ء میں اٹلی کے سفر کے بعد پڑی۔ اٹلی کا یہ سفر اس نے اپنے ایک ناول کا مواد جمع کرنے کے لیے کیا تھا۔ یہ ناول ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ اس کا پہلا کامیاب ناول تھا۔ اس کی پریوں والی کہانیوں کی پہلی کتاب بھی اسی سال چھپی۔

اٹلی کے علاوہ اس نے یورپ اور مڈل ایسٹ کے بہت سے ملکوں کی سیر بھی خوب جی بھر کے کی ہے ان ملکوں میں اس کی شہرت اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اصل میں وہ بچپن میں اپنے کو کچھ تنہا تنہا سا پاتا تھا۔ تنہائی کا یہ احساس ہوتے ہوتے اتنا گہرا ہو گیا کہ عمر بھر وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہو گئے تھے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس سے محبت بھی کرتے۔ پر اسے خود اپنا کوئی دوست نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ان سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اور جب کبھی وہ تنہائی کے احساس سے اکتا جاتا تھا تو سیر و سفر کے لیے نکل پڑتا تھا۔

کہتے ہیں اینڈرسن نے اپنی کہانیوں میں اپنی زندگی اور زندگی کے تجربوں کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ جوانی میں اسے اپنی صورت ایک بدصورت جیسی لگتی تھی جسے کوئی پسند نہیں کرتا اور یہ بھی اسی تنہائی اور بے یار و مددگار ہونے کے احساس کا نتیجہ تھا۔ اس نے ایک کہانی لکھی ہے۔ جس میں اپنے کو ایک بدصورت بطخ تصور کیا ہے۔ یہ بطخ آخر میں راج ہنس کی شکل میں اپنے آپ کو تبدیل کر لیتی ہے۔ اس تبدیلی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب راج ہنس اڑ کر ایک تالاب تک پہنچتا ہے۔ وہاں کچھ بچے اور ان کے ماں باپ آتے ہیں اسے دانہ کھلاتے ہیں۔

یہ کہانی پورے طور پر اس کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے بچپن سے لے کر اس وقت تک کی جب وہ مانا ہوا ادیب بن جاتا ہے اور جنتا کے علاوہ اس ملک کا بادشاہ اور ڈنمارک اور باہر کے بڑے بڑے لوگ اس سے ملنے اور اسے اپنا مہمان بنانے میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے بیچ میں ہی اس کی شہرت اپنے ملک ڈنمارک کے علاوہ دوسرے ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔ اور جب ستر سال کی عمر میں اس

کا انتقال ہوا تو اس کی کہانیاں تمام دنیا میں پھیل چکی تھیں اور تقریباً ہر زبان میں ان کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

پر ایک بات سن کر آپ کو تعجب ہوگا اسے صرف بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے والے کی حیثیت سے مشہور ہونے کی زیادہ خواہش نہ تھی۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ شاعر اور بڑوں کے ادیب اور مصنف کی حیثیت سے لوگ اسے جانیں۔ اس کے زمانے کے کچھ اچھے ادیب بھی یہی خیال ظاہر کرتے تھے کہ اینڈرسن پریوں کی کہانیاں لکھنا چھوڑ دے اور سنجیدہ ادب کی طرف اپنی توجہ صرف کرے۔

مگر اسی زمانے میں مشہور سائنسداں ایچ۔ سی۔ اوسٹیڈ (H. O. OSTAD) کو اس کی کہانیوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے اینڈرسن کو ایک خط میں لکھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ناول دی امپرو ساتا (THE IMPROVISATA) کی بدولت اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی مگر اس کی کہانیاں اسے لافانی، زندہ و جاوید اور امر بنا دیں گی اور اس پیش گوئی کو اینڈرسن نے اپنی زندگی میں پورا ہوتے دیکھ لیا۔

چرچل کے چند لطیفے

(بقایا صفحہ ۲۲)

مجھے بہت پسند آیا۔۔۔۔ میں اپنے ملک واپس پہنچ کر لوگوں سے آپ کی خوب تعریف کروں گا۔"

جنرل منٹگمری برطانوی فوج کے بہت مشہور افسروں میں سے ہیں۔ دونوں جنگوں میں انھوں نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ اچھی خاصی عمر ہو جانے کے باوجود یہ ہمیشہ چاق و چوبند اور تندرست رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان سے کسی نے پوچھا "جنرل صاحب! آپ کی تندرستی کا راز کیا ہے؟" جنرل صاحب نے جواب دیا "نہ تو میں سگریٹ پیتا ہوں، نہ شراب کو ہاتھ لگاتا ہوں اور معمولات کا ہمیشہ پابند رہتا ہوں اسی لیے میں "تندرست" ہوں۔" چرچل سے کسی نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ اپنے موٹے تازے جسم کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ "میں خوب سگار پیتا ہوں، خوب شراب پیتا ہوں معمولات کی کبھی پابندی نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی میں "دگنا تندرست" ہوں!"

جناب برق بہاری



وطن کی یاد

عالمِ غربت میں بھی مجھ کو وطن آتا ہے یاد
یعنی بلبل کو قفس میں بھی چمن آتا ہے یاد

محو ہو سکتا نہیں دل سے کبھی گھر کا خیال
بھول جاؤں اس کو تھوڑی دیر کو بھی کیا مجال

چٹکیاں لیتی نہیں ہے دل میں کب یادِ وطن
ہر گھڑی رہتی ہے لب پر میرے فریادِ وطن

یاد آتی ہیں وطن کی جب مجھے دلچسپیاں
ہوتا ہے اشکوں کا دریا میری آنکھوں سے رواں

یاد آتی ہیں ہمیں وہ دوستوں کی صحبتیں
از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہیں دل کی حسرتیں

یاد آتی ہے وطن کی جو ہوائے خوشگوار
فرطِ مایوسی سے میں بھرتا ہوں آہیں بار بار

کر دیا مجھ کو جدا گھر سے فلک نے آہ آہ
کیوں نہ فرطِ رنج سے ہو حالِ دل یکسر تباہ

ن وطن سے کیا گیا گویا کہ دنیا سے گیا
اب کہاں حاصل ہے مجھ کو زندگی کا وہ مزا

چھٹ گیا ہے عندلیبِ پُرمحن سے گلستاں
پھر رہا ہے ابتک آنکھوں میں مگر سارا سماں

یاد ہیں ابتک مجھے وہ تیری گلیاں یاد ہیں
اے وطن مجھ کو وہ تیری رنگ رلیاں یاد ہیں

رہتے ہیں ہر وقت تیرے کوچے وہ پیشِ نظر
بچپنے میں کھیلتا تھا میں جہاں شام و سحر

تیرے اُن باغوں کو میں ہرگز نہیں بھولا کبھی
جن میں باصد شوق جھولا کرتا تھا جھولا کبھی

یاد ہے ابتک مجھے تیری فضائے دلستاں
یاد ہے ابتک مجھے تیری بہار بے خزاں

تیرے غنچوں کا چٹکنا یاد ہے ابتک مجھے
تیرے پھولوں کا مہکنا یاد ہے ابتک مجھے

بلبلوں کا تیری ابتک مجھ کو گانا یاد ہے
اور کلیوں کا تیری ہنسنا ہسانا یاد ہے

کیا کہوں غربت میں میری کیسے ہوتی ہے بسر
ہے کھٹکتی دل میں گھر کی یاد مثلِ نیشتر

ہیں میسر یہ کہاں غربت میں تفریحیں بھلا
وہ زمانہ ہی گیا وہ دن گئے وہ دل گیا

جناب ریاض آفندی



سزا

آج سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے کی بات ہے، ہمارے دیس کے شمال میں ایک بہت بڑا سمندر تھا۔ اس سمندر کے اندر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ سیپیاں، ہیرے، موتی، جواہرات اس کی دولت تھی۔ مچھلیاں، جل پریاں اس کی رعایا تھیں، اور اتھاہ پھیلا ہوا سمندر اس کی حکومت تھی۔ اسے کسی دشمن کا خوف نہیں تھا کہ کوئی اس پر حملہ کرے اس لیے کہ دنیا کے ساتوں سمندر کے بادشاہ اس کے دوست تھے۔ اسے اس بات کا بھی ڈر نہیں تھا کہ رعایا اس کے خلاف ہو جائے اس لیے کہ وہ بہت خوش تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ بہت غمگین تھا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک روز سمندر کی تمام مچھلیوں نے اور جل پریوں نے جل کے خدا سے دعا مانگی کہ وہ ملکہ کی گود اولاد سے بھر دے۔ بادشاہ نے جس وقت ان کو دعا مانگتے ہوئے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے موتی جیسے آنسو نکل پڑے۔ ملکہ نے اپنی زندگی میں کبھی بادشاہ کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس نے ان آنسوؤں کو سیپ کے پیالے میں جمع کیا اور انھیں پی گئی ——!

چند مہینوں کے بعد ملکہ نے بادشاہ کو خوش خبری سنائی کہ بہت ہی جلد بادشاہ کے تخت و تاج کا وارث اس دنیا میں آنے والا ہے۔ بادشاہ نے جب یہ خوش خبری سنی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس روز کا انتظار کرنے لگا جب اس کی اس خوب صورت اور حسین دنیا کی رونق بڑھے گی، جب

اُس کی اِس خاموش خاموش اور ٹھہری ہوئی دنیا میں مسرتوں کی شہنائی بجے گی۔
اسی انتظار میں مہینے ہفتوں میں اور ہفتے دنوں میں بدلتے گئے ـــــ اور ایک روز ملکہ نے ایک خوب صورت سی لڑکی کو جنم دیا۔ ساری سلطنت میں خوشیاں منائی گئیں۔ سیپیوں میں چراغ جلائے گئے، شہزادی کے پالنے کو ہیرے جواہرات سے سجایا گیا۔ سمندر کی [illegible] سمندر کی [illegible] اور [illegible] وہ سمندر کی [illegible] سمندر کی نیلگوں [illegible] دنیا میں [illegible] اور راتوں [illegible] دن [illegible] کے آجانے سے ایک نیا [illegible] اور سمندر کی شہزادی [illegible] چالوں میں بڑھتی گئی ---- یہاں تک کہ ایک روز جوان ہو گئی۔ اور جب وہ جوان ہوئی تو اس کے حسن نے اسے مغرور بنا دیا اور والدین کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی بنا دیا۔ وہ کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔

اب سمندر کی شہزادی خوب صورت تھی، جوان تھی، اس لیے بادشاہ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لیکن شہزادی نے اپنی شادی کے لیے بڑی عجیب و غریب شرط رکھی کہ سمندری دنیا کا جو بھی شہزادہ اسے دنیا کا خوب صورت ترین تحفہ لا کر دے گا، وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی۔

سمندر کی شہزادی جوان تھی، حسین تھی، چنچل، شوخ اور سرکش تھی، مغرور اور ضدی تھی اس لیے اسے کوئی بھی تحفہ پسند نہ آیا، اور دنیا کے ساتوں سمندر کے شہزادے اپنی کوشش میں ناکام ہو کر بیٹھ گئے۔

جب شہزادی نے دیکھا کہ اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو اسے ایک نایاب تحفہ لا کر دے تو وہ اور زیادہ گھمنڈی ہو گئی اور اپنی خوب صورتی اور نزاکت پر بہت زیادہ ناز کرنے لگی۔ وہ کہتی کہ مجھے کوئی نہیں جیت سکتا۔



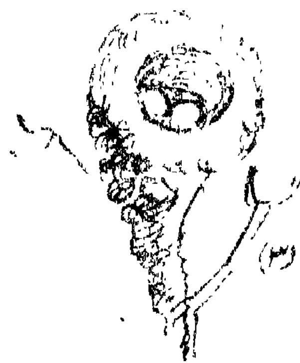
میں ایک ایسی چٹان ہوں جس سے کوئی نہیں ٹکرا سکتا اور میں
ایک ایسی چوٹی ہوں جسے کوئی سر نہیں کر سکتا
جب سمندر کی شہزادی کا غرور حد سے زیادہ بڑھ گیا تو سمندر کے خدا کو غصہ آیا۔ اس نے اپنے جاہ و
جلال، عظمت و حشمت کی قسم کھا کر کہا کہ میں اس شہزادی کے غرور و تکبر کی سزا اسے اور اس کے والدین کو ضرور دوں گا۔
سمندر کے خدا کو غصہ آیا اور جلال میں خدا اندری سے سمندر کی دنیا میں ایک بھونچال سا پیدا ہوگیا۔ سمندر کی
موجیں طیش میں آگئیں، اس کا پانی گرم لاوے کی طرح کھولنے لگا۔ سمندر کی تہہ پھٹ گئی اور اس میں سے ایک
دیو ہیکل چیز اوپر کی جانب اٹھنے لگی اور ابھر کر سطح سمندر پر پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی۔ اب سمندر کی سلطنت کا کہیں نام و
نشان تک نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک عظیم اور بلند پہاڑ نے لے لی تھی۔ لیکن سمندر کی شہزادی اب بھی زندہ تھی وہ تنہا تھی
اکیلی تھی اس لیے جینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ پہاڑ کی بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف کود جائے اور اس طرح اپنی زندگی
ختم کر دے۔ اسی خیال سے وہ پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ چڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ بہت اونچائی تک پہنچ گئی۔ پر وہ سمندر کی مخلوق تھی
اس لیے زیادہ اوپر نہ جا سکی اور وہیں پر برف کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئی۔
آج بھی یہ پہاڑ ہمارے نیپال کے شمال میں کھڑا ہے اور اس کی بلندی پر سمندر کی شہزادی برف کی چوٹی بنی ہوئی آسمان کی
جانب منہ کیے ہوئے سمندر کے خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی ہے جانتے ہو وہ پہاڑ کون سا ہے؟ اور اس برفیلی چوٹی کا کیا نام ہے؟



ذرا بتائیے تو ــــ یہ گھونسلے کن کن چڑیوں کے ہیں؟



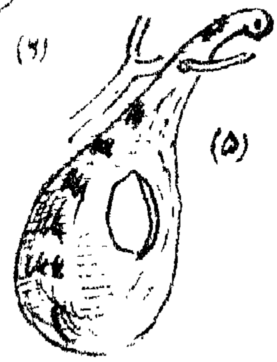














[illegible]

" [illegible] لوٹے
[illegible] ہو جاتا ہے تاکہ
معلوم ہو سکے کہ تم نے کیا کچھ سیکھا ہے اور کیا سیکھنا ہے۔

اس طرح طرح کے پرندوں اور درندوں
کے نشان دکھا کر پوچھا جاتا ہے کہ یہ نشان کس
جانور کے ہیں؟ جانور نر ہے یا مادہ، اس کی عمر
کتنی ہے، کدھر سے آیا اور کدھر کو گیا، اس جگہ
سے گزرے ہوئے کتنا وقت ہوا ہوگا

[illegible] کہا جاتا ہے کہ پیروں کی کھوج سے جانور
کو تلاش کریں اور پکڑ کر یا مار کر لائیں

"غرض یہ اکیس دوڑ بھی کودنا اونچی کود،
پیڑوں پر چڑھنا، تیرنا، کشتی کھینا، مکان بنانا اور
اسی طرح کے ان گنت امتحان ہمیں دینا پڑتے ہیں۔
ہمارے تمام امتحان پورے ہونے تک بڑا کو فیصلہ کرنے سے
ہوتی۔ بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھتے ہیں۔
— لیکن امتحان کے دوران نہ کوئی کسی
کو کچھ بتاتا ہے نہ کسی قسم کی کوئی مدد کرتا ہے۔
آخر میرا [illegible] بھی آگیا [illegible] ان سب
امتحانوں میں پاس ہو گیا اور قبیلے والوں نے
متفقہ طور پر فیصلہ کر دیا کہ میں اب پورا آدمی کہلانے
کے قابل ہو گیا ہوں۔ ایک ایک کر کے سب قبیلے
والے اکٹھا ہوئے۔ قبیلے کا بڑا جادوگر ٹونے اور
جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا تھا آیا۔ اس نے
اپنے نرسنگھے کے گول سرے کو آگ میں لال کیا۔
اور پہلے میرے سیدھے گال پر اور پھر بائیں گال
پر زور سے گڑو دیا۔ نرسنگھے کے لگتے ہی کھال جل
گئی۔ گوشت تک جلنے لگا۔ بے حد تکلیف ہوئی۔
آنسو نکل پڑے۔ تکلیف کی شدت سے کوسے واوا
نے اپنی مٹھیاں اتنے زور سے بھینچیں کہ ناخون
ہتھیلیوں میں گڑ گئے۔ ان میں سے خون بہنے لگا۔
میں چیخنا چاہتا تھا لیکن چیخ کر بزدل کہلوانا مجھے
پسند نہ تھا۔ یہ تو ایک لڑکے کے لیے بڑی شرمناک
بات تھی۔ اگر کوسے واوا کو مرد اور ایک اچھا
شکاری بننا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ضروری
ہے۔ جادوگر نے اپنا نرسنگھا میرے گالوں پر سے
ہٹا لیا اور نشانوں میں کالا رنگ بھر دیا۔ اور ہمیشہ
کے لیے یہ نشان میرے گالوں پر پڑ گئے۔ میں نے
بڑے فخریہ انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔
درد اور تکلیف سے ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے مگر
خوشی سے چمک رہے تھے۔ یہ تھا میری زندگی کا
سب سے اہم اور مبارک دن۔"

کوسے واوا نے اپنی کہانی ختم کر دی۔ وہ
چپ ہو گیا۔ ہم سب، جو خاموشی سے یہ روداد سن
رہے تھے، سوچنے لگے کہ کوسے واوا کا یہ جنگلی گھر
فطری اسکول کتنا مکمل اور کتنا بے مثل ہے۔ اس
کی کہانی سن کر کوسے واوا کی قدر ہمارے دلوں
میں اور بڑھ گئی۔

کچھوے کے انڈے

دوسرے دن سب لوگ صبح تڑکے اٹھ
بیٹھے۔ آج ہمیں بہت سے کام کرنے تھے۔ یہ
پروگرام رات ہی کو بن گیا تھا کہ جہاز کو کنارے

تک لانے کا کام صبح ہی سے شروع کر دیا جائے گا۔ ملاح اور مسافر سب مل کر کام کریں گے۔

میں ابھی سو ہی رہا تھا کہ جہاز کے کپتان نے مجھے جگایا اور کہا:

"بڑا ہی اچھا ہو اگر آپ کوے واوا کو اپنے ساتھ لے جائیں اور کل کی طرح آج بھی کچھ شکار لے آئیں۔"

میرے لیے اس سے اچھا اور کون سا کام ہو سکتا تھا۔ فوراً تیار ہو گیا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوے واوا آگ کے پاس بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے کسی کام میں مشغول تھے۔ میں نے کاراجا قبیلے کے مخصوص انداز میں کوے واوا کو پکارا:

"کوے واوا! "تا تریا نو میو" (کوے واوا میں ادھر ہوں)

"آرے رینا" (میں یہاں ہوں)" اس نے جواب دیا۔

"کیا بنا رہے ہو اتنی جلدی جلدی؟"

"تیر۔ چلوگے نا شکار کو میرے ساتھ؟"

"کیوں نہیں؟ ضرور چلوں گا۔ لیکن تم نے یہ اتنے مختلف قسم کے تیر کیوں بنائے ہیں؟"

"تمام جانور ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے۔ اسی لیے سب کے لیے تیر بھی الگ الگ ہونا ضروری ہیں۔ اس تیر کو دیکھو۔ اس میں بھالے کی نوک کی طرح بانس کی مضبوط اور سخت انی لگی ہے۔ یہ سب تیروں سے زیادہ مضبوط اور کارآمد ہے۔ اس سے ہم جاگور کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی سے ٹاپیر[1] اور



جنگلی سور کا شکار کرتے ہیں۔ یہ دیکھو دوسرا تیر۔ اس کا پھل کٹیلا اور سخت کالی لکڑی کا ہے۔ اس سے مچھلیاں ماری جاتی ہیں۔ اس سے ملتے جلتے یہ دوسرے تیر ہیں۔ لیکن ذرا زیادہ سخت اور مضبوط۔ ان سے ہرن۔ مورخور اور اسی طرح کے دوسرے بڑے جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے۔"

"بعض تیروں میں تم نے ہڈی کا پھل لگا

---

[1] برازیل کے جنگلوں میں پایا جانے والا سُم دار ایک جانور جو کچھ سور اور کچھ گینڈے سے مشابہ ہوتا ہے۔

رکھا ہے یہ کس کام
ہیں؟''
تیر میں بندر
کا پھل

آتے
''اس
کی نوکیلی ہڈی
لگا ہے اس سے
بندر مارتے ہیں۔'' اس
نے ایک تیر مجھے دکھاتے
ہوئے کہا۔'' اور ان چھوٹے
تیروں میں سے مچھلی کا ڈنک لگایا ہے۔ ان
سے بڑی چڑیوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ دیکھو
کچھ اور تیر۔ ان کے پھل کی نوک مُٹھری اور
موٹی ہے۔ جب ہم کسی چڑیا کو زندہ پکڑنا چاہتے
ہیں تو اس پر یہ تیر چلاتے ہیں۔ اس تیر کے لگنے
سے چڑیا کے زخم نہیں آتا۔ وہ اس کی چوٹ
سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ہم اس کو پکڑ لاتے
ہیں۔ بے چاری کو جب ہوش آتا ہے تو اپنے کو
پنجرے میں بند پاتی ہے۔''

''بھئی واہ! پورے استاد ہو ان کاموں میں!''

''بوڑھے آلوآ کا کہنا ہے کہ شکار پر تب
ہی نکلو جب دل مضبوط ہو اور ہاتھ میں اچھے اور
کارآمد تیر ہوں'' فلسفیانہ انداز میں جواب دیتے

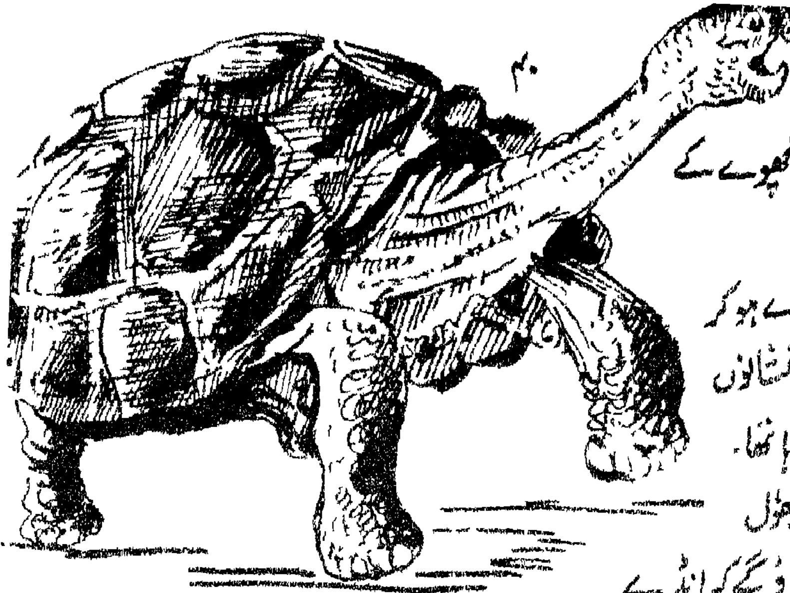
ہوئے کوے واآوا اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے
سے دریا کی طرف چلنے کو کہا۔ کنارے پر کینو تیار
کھڑی تھی۔ ضرورت کا سب سامان اس میں پہلے ہی
رکھا جا چکا تھا، ہم دونوں اس پر سوار ہو گئے۔

''میرا خیال ہے کہ آج ہم لوگوں کو جنگل کی
طرف چلنا چاہیے'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہاں۔ اُدھر بھی چلیں گے۔ چلو پہلے
کچھوے کے انڈے ڈھونڈھ لائیں۔ کچھوے کے
انڈے ڈھونڈنے کے لیے صبح تڑکے کا وقت سب
سے اچھا ہوتا ہے ـــــ کبھی تم نے بھی کھائے ہیں
کچھوے کے انڈے؟'' اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''کھائے کیوں نہیں۔ بڑے مزے کے
ہوتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے وہ آسانی سے
ملتے نہیں۔''

ہماری کینو دریا کے کنارے کے ساتھ اُتار
کی طرف بہہ رہی تھی۔ کنارہ گھنے درختوں اور
جنگلی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں کہیں پر ریتیلا
کنارہ بھی آجاتا تھا۔ ان ہی ریتیلے کناروں
میں سے ایک پر کوے واآوا نے کینو کو روک دیا۔
اور بولا:۔
''کچھوے کے انڈے یہاں ضرور ملیں گے۔



دیکھو۔ وہ دیکھو۔ ریت پر کچھوے کے
چلنے کے نشان موجود ہیں۔
میں نے کینو میں کھڑے ہو کر
دیکھا۔ ریت پر پیروں کے نشانوں
کا ایک جال سا بچھا نظر آرہا تھا۔
"نشانوں کی ان بھول
بھلیوں میں تم یہ کیسے پتہ لگاؤ گے کہ انڈے
کہاں دبے پڑے ہیں" میں نے پوچھا۔
"وہ گول گول تھالی نما نشان دکھائی دے
رہا ہے نا؟ بس اسی جگہ کچھوے نے اپنے انڈے
دبائے ہیں۔ پچھلی شام سے اب تک کا تمام حال
ان نشانوں کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے"۔
کوسے وادا نے بڑی سنجیدہ آواز میں کہا پھر
وہ نشانوں کو دیکھ کر ایسے لہرانے لگا جیسے وہ
کوئی کتاب پڑھ رہا ہو۔
"کچھوا پچھلی شام جھٹ پٹے کے وقت
پانی سے باہر آیا۔ کنارے پر اس اونچی جگہ بیٹھ کر
پہلے اس نے یہ جائزہ لیا کہ اسے کوئی دیکھ تو
نہیں رہا۔ جب اس کو پکا یقین ہو گیا کہ دور دور
تک کوئی جانور موجود نہیں ہے اور اس وقت
وہ بالکل تنہا ہے تو اس نے اس جگہ پر تقریباً
ڈھائی فٹ گول اور اتنا ہی گہرا گڑھا کھودا۔
پھر اس میں بیٹھ کر انڈے دیئے۔ سب انڈے دے
چکنے کے بعد وہ باہر نکلا، نکلی ہوئی ریت کو پھر
گڑھے میں لوٹ دیا اور اپنے پیٹ کی چکنی ہڈی
سے ریت کی سطح کو برابر اور چکنا کر دیا۔ یہ سب کام
ختم کرنے کے بعد خاموشی کے ساتھ وہ ادھر سے
پانی میں واپس چلا گیا۔ وہ دیکھو اپنے
سیدھے ہاتھ کی طرف۔ وہ ہیں اس کے
واپس آنے کے نشان"۔
"کوسے وادا! وہ دیکھو۔
اس گول نشان پر دو چھوٹے
چھوٹے گڑھے بھی پڑے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے جیسے
ان کو کسی نے



کھودا ہے اور انڈے نکال لے گیا ہے۔

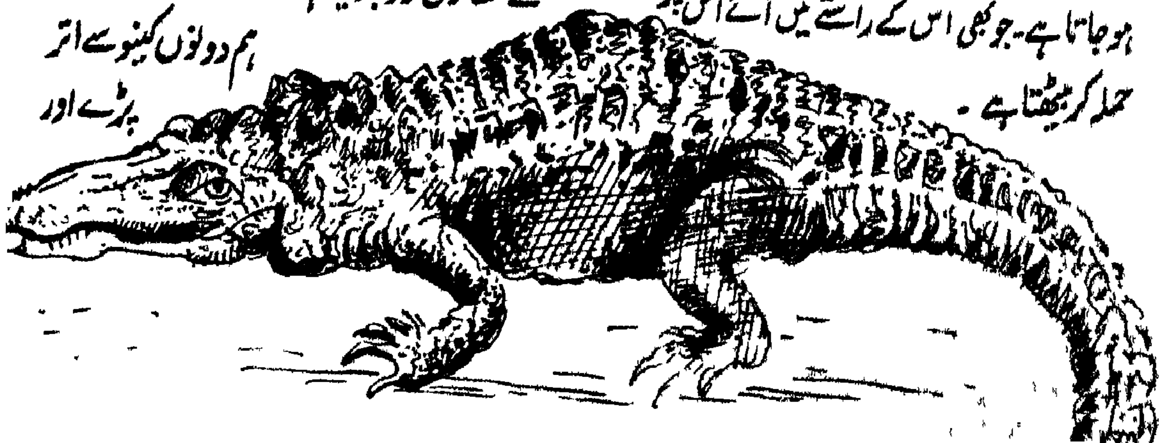
میں نے کہا۔

”نہیں انڈے ابھی گڑھے ہی میں ہیں“ وہ پھر پہلے کی طرح بولنے لگا ”دراصل ہمارے یہاں آنے سے پہلے ایک لق لق پانی پینے کے لیے کنارے پر آیا۔ کچھوے کے پیروں کے نشانوں کو دیکھ کر وہ اس کے انڈوں کی تلاش میں گڑھے کی طرف آیا۔ مگر اس سے پہلے گڑھے کے پاس مگرمچھ آ چکا تھا، وہ رہے مگرمچھ کے پیروں کے نشان۔ اس کے پنجوں کے نشانوں کے درمیان اس کی دُم کی گھسٹن صاف نظر آرہی ہے۔ مگرمچھ جب کھانے کی تلاش میں نکلتا ہے تو بڑا ہی خطرناک ہو جاتا ہے۔ جو بھی اس کے راستے میں آئے اس پر حملہ کر بیٹھتا ہے۔

لق لق کو گڑھے کی طرف آتا دیکھ کر مگرمچھ اس پر جھپٹ پڑا۔ لق لق کے پر اور خون کے یہ دھبے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس میں اور مگرمچھ میں جھڑپ ہوئی ہے۔ لق لق کے بھاگ جانے کے بعد مگرمچھ نے انڈوں کو ڈھونڈھا۔ دو ایک جگہ اس نے کھودا بھی مگر جب انڈے نہ ملے تو مایوس ہو کر پانی میں چلا گیا۔ ہاں، ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ یہ دیکھو اس کے واپس جانے کے نشان۔ اے لو!! اُدھر سیدھی طرف جاگوار کے پیروں کے نشان بھی موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاگوار اور مگرمچھ میں بھی ایک ہلکی سی جھڑپ ہوئی۔ دونوں کے پیروں کے بے ترتیب نشان یہی ظاہر کر رہے ہیں۔

”نک چپ! کچھوا کل ہی شام کو یہاں آیا تھا۔ اس کے پیروں کے نشانوں پر اوس کے قطروں کے دھبے صاف نظر آرہے ہیں۔ جاگوار، مگرمچھ اور لق لق صبح کو آئے۔ اُن کے پیروں نے اوس کے قطروں کے نشانوں کو دبا دیا ہے۔“

ہم دونوں کینو سے اتر پڑے اور

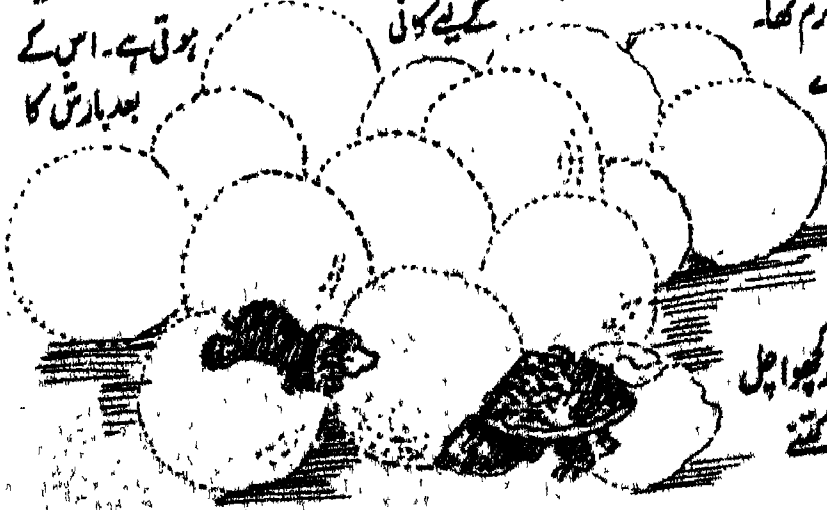


ریتیلے کنارے پر چڑھ کر اوپر آگئے۔ کوے واوا
نے اپنا لمبا شکاری چاقو نکالا۔ اور کچھوے کے بنائے
ہوئے گول نشان پر زور سے مارا۔ چاقو دستے تک
ریت میں گڑ گیا۔ پھر اس نے تیزی کے ساتھ چاقو کو
باہر نکالا اور غور سے دیکھا۔ خوشی کی مسکراہٹ
اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ چاقو کی نوک پر انڈے
کی زردی لگی ہوئی تھی

کوے واوا نے گڑھے کو کھودنا شروع
کیا۔ چند ہی منٹ بعد انڈے نکلنا شروع ہوگئے۔
ایک، دو، پانچ، آٹھ، دس، پندرہ ـــــ اور
تھوڑی دیر میں گڑھے کے کنارے پر انڈوں کا
ڈھیر لگ گیا۔ سب انڈے نکل آئے تو گنا۔ پورے
۱۲۰ انڈے نکلے، پنگ پانگ کی گیند کی طرح
چھوٹے چھوٹے گول انڈے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان
کا چھلکا کسی قدر لچکیلا اور نرم تھا۔

اتنے بہت سے انڈے
دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔
میں گم سم کھڑا تھا اور
سوچ رہا تھا کہ اتنے بہت
سے انڈے اپنے پیٹ میں لے کر کچھوا چل
کیسے پاتا ہوگا؟ دس سال میں کتنے
بار انڈے دیتا ہے؟ اُن کو ریت میں کیوں چھپا دیتا
ہے؟ انڈوں میں سے بچے کیسے نکلتے ہوں گے؟ ان
بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا؟ یہ اور اس طرح
کے بہت سے اور سوال میرے دماغ میں گھوم رہے
تھے لیکن ان باتوں سے ناواقفیت کا اظہار کرکے
میں کوے واوا کے سامنے شرمندہ ہونا نہ چاہتا
تھا، اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔
مجھے ایسا لگا جیسے کوے واوا نے میرے دل کی
بات جان لی ہو، وہ خود بخود کہنے لگا:۔

"یہ کچھوے تقریباً ایک گز لمبے اور اتنے ہی
چوڑے ہوتے ہیں۔ دس سال بھر اپنے پیٹ میں انڈے
جمع کرتے رہتے ہیں۔ جب گرمی کا موسم ختم ہونے پر آتا
ہے تو اسی طرح ان گڑھوں میں یہ اپنے انڈے دے
جاتے ہیں۔ آخری مہینے کی گرمی ان انڈوں کو سینے
کے لیے کافی
ہوتی ہے۔ اس کے
بعد بارش کا



موسم آ جاتا ہے۔ دریاؤں کا پانی چڑھنے لگتا ہے۔ گڑھوں تک پانی آتے آتے انڈوں میں سے بچے بھی نکل آتے ہیں۔ پانی کے پہنچتے ہی بچے ریت سے نکل کر پانی میں اِدھر اُدھر تیرنے اور اپنی خوراک حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔"

"قدرت کا نظام کتنا مکمل اور کتنا تعجب خیز ہے" میں نے کہا۔

"بوڑھے مالوآ کا کہنا ہے ___ انسان کو سوچنا پڑتا ہے اور سیکھنا پڑتا ہے ___ جانور نہ تو سوچتے ہیں اور نہ سیکھتے ہیں۔ وہ سب کچھ سیکھے سکھائے پیدا ہوتے ہیں۔"

ہم نے دس انڈے اس کیتلی میں اُبالے جو کورے واوا کی کینوپی میں موجود تھی۔ کچھوے کے انڈے کی سفیدی تو مرغی کی انڈے ہی کی طرح ہوتی ہے مگر زردی خستہ اور دردری ہوتی ہے۔ اس کا مزہ نمکین ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں نمک آسانی سے نہیں ملتا۔ اس لیے قدرت نے ان انڈوں میں نمک پہلے ہی سے فراہم کر دیا۔

"بھئی کورے واوا! تمھارا بہت بہت شکریہ۔ آج تم نے یہ سبق بھی سکھا دیا کہ کچھوے کے انڈے کس طرح تلاش کرنے چاہئیں۔"

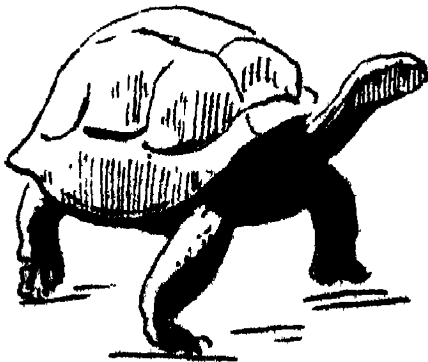
"اپنی دولت اپنے ہی پاس رکھو مگر اپنا علم دوسروں تک ضرور پہنچاؤ۔ اس طرح تمھارے پاس سے کچھ نہیں جاتا۔ علم ایک ایسی دولت ہے جو بانٹنے سے کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہے۔" کورے واوا نے جواب دیا۔

"کیا یہ قول بھی بوڑھے مالوآ کا ہے؟" میں نے طنزاً پوچھا۔

"ہاں، ہے تو اُسی کا۔ مگر اُس کا نہ بھی ہو تو کیا۔ تم جنگلی قبیلے کے ہر فرد کو مالوآ سمجھ سکتے ہو۔"

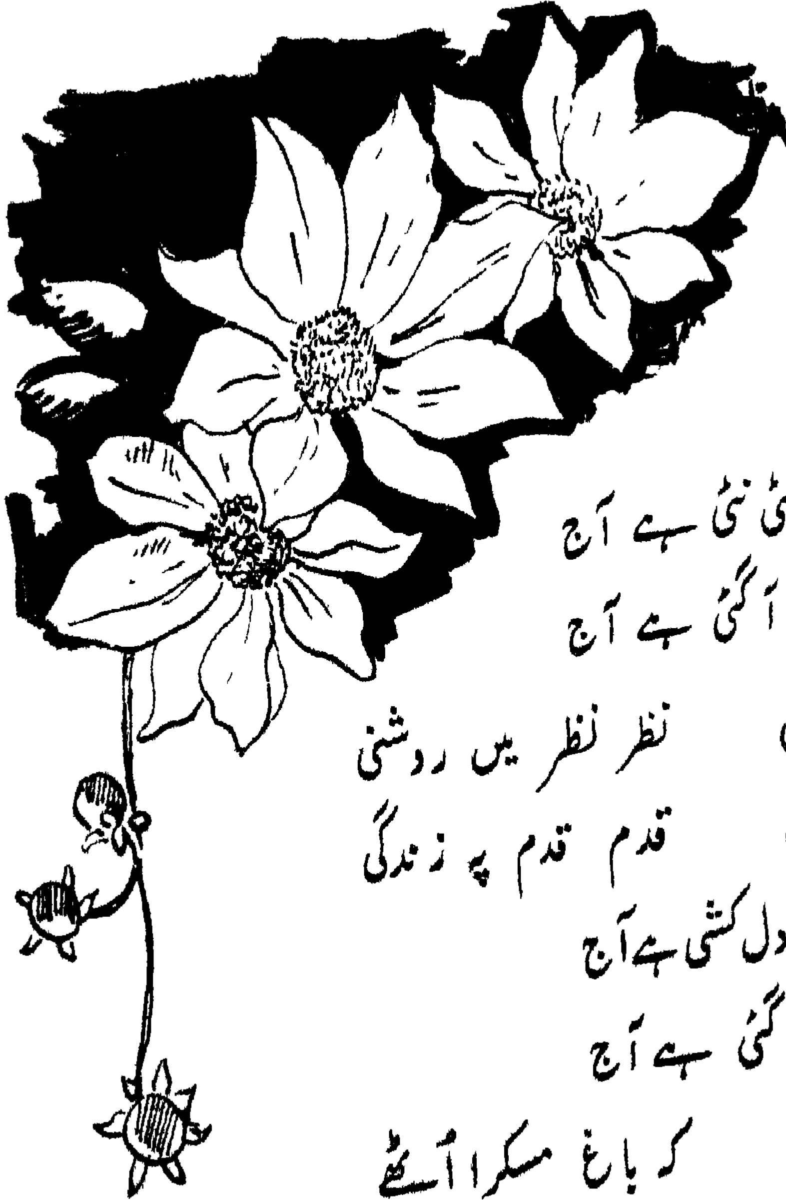
میں نے لاجواب ہو کر انڈے اٹھائے اور کشتی کی طرف چل دیا۔ کورے واوا بھی آ گیا۔ دونوں کشتی پر سوار ہوئے۔ انڈے ایک طرف حفاظت سے رکھ دیے گئے۔ اب ہماری کشتی ایراگوے کی دھار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

(باقی آئندہ)



جناب سعادت نظیر

بہار



فضا نئی نئی ہے آج
بہار آگئی ہے آج

کلی کلی پہ تازگی نظر نظر میں روشنی
نفس نفس میں راگنی قدم قدم پہ زندگی

ہوا میں دل کشی ہے آج
بہار آگئی ہے آج

پرند چہچہا اُٹھے کہ باغ مسکرا اُٹھے
کسان گنگنا اُٹھے کہ کھیت لہلہا اُٹھے

دلوں میں اک خوشی ہے آج
بہار آگئی ہے آج

جناب قاضی محمد احمد

کالا پتھر



کوئلہ کی کانوں کا کھوج لگانا

کوئلے کے خزانے جگہ جگہ زمین میں دبے پڑے ہیں۔ سب سے بڑا کام ان کی کھوج لگانا ہے، انھیں ڈھونڈ نکالنا ہے۔ آج کل یہ کام سائنس داں سائنسی آلوں کی مدد سے انجام دیتے ہیں۔ کھوج لگاتے لگاتے جب یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ کوئلہ ہے تو پھر اور دوسری باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئلہ کتنی مقدار میں ہے، کتنی گہرائی میں ہے، کوئلہ کی چٹانوں کی موٹائی وغیرہ کتنی ہے۔

کھوج لگانے کی یہ مہم کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی تو سمجھیے کہ ایک منزل ختم ہوئی۔ اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی ہے یعنی

۵

کوئلہ نکالنے کے سلسلے میں شروع کے انتظامات۔ مثلاً کان تک پہنچنے کے لیے سڑکیں بنوانا، کانوں میں کام کرنے والے ہزاروں مزدوروں کے لیے مکانوں یا کوارٹروں کا انتظام وغیرہ کرنا ہوتا ہے۔ مزدوروں کے علاوہ بہت سے کلرکوں کی یا بہت سے چھوٹے بڑے افسروں کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کے رہنے سہنے کا انتظام کرنا ہوتا ہے اس لیے کہ ان سب کو کان کے قریب ہی رہنا پڑتا ہے، پھر طرح طرح کی قیمتی مشینیں منگانا پڑتی ہیں۔ غرض ابھی کوئلہ نکالنے کی نوبت بھی نہیں آتی اور لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔

کان کی کھدائی

کوئلہ زمین کے اندر زیادہ گہرائی میں ہے

تو سرنگ کھودنا پڑتی ہے، یہ سرنگ عام طور سے ۱۸ فٹ سے ۲۴ فٹ گولائی یا قطر کی ہوتی ہے۔ گہرائی عموماً پندرہ سو فٹ سے لے کر تیس ہزار فٹ سے زیادہ تک ہوتی ہے۔ سرنگ کھودتے وقت یا بعد میں اکثر اس میں پانی بھر جاتا ہے اس پانی کو نکالنا ضروری ہے۔ کبھی کبھی اس پانی کو نکالنے کی مقدار دس ہزار گیلن فی منٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ سرنگ کے آس پاس کی زمین دور تک کنکریٹ اور سیمنٹ سے پکی کر دی جاتی ہے تاکہ سرنگ سے نکلا ہوا پانی یہاں کی زمین میں جذب نہ ہو جائے اور رس رس کر سرنگ میں نہ پہنچ جائے۔ کان میں سرنگیں بہت سی ہوں تو انھیں لوہے یا کنکریٹ کی سڑکیں بنا کر ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے۔

شروع شروع میں کوئلہ بہت بڑی بڑی سلوں کی شکل میں ہوتا ہے انھیں توڑ کر استعمال کے قابل بنا دیا جاتا ہے۔

سرنگ میں کوئلے کی چٹانوں تک یا اُن کے اوپر تک سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ جوں جوں کوئلے کی کھدائی کا کام آگے بڑھتا جاتا ہے ان سڑکوں کی لمبائی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ٹیڑھی ترچھی بھی ہوتی جاتی ہیں اور بالکل بھول بھلیاں بن جاتی ہیں۔

کوئلہ کی نکاسی

کوئلہ دنیا کے بہت سے ممالک میں نکالا جاتا ہے۔ تمام دنیا کی پیداوار کا ایک سرسری اندازہ لگا کر ہی ہمیں ٹھیک ٹھیک پتہ چلے گا کہ یہ کتنی قیمتی چیز ہے اور اس نے دنیا کی ترقی کو آگے بڑھانے میں کتنی زبردست مدد کی ہے۔

اکثر یہ آواز اٹھتی رہتی ہے کہ کوئلے کی کانیں کچھ دنوں میں خالی ہو جائیں گی اور کوئلے کے ذخیرے ختم ہو جائیں گے۔ لیکن دنیا کے تمام ذخیروں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ کوئلے کے جلد ختم ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جہاں تک کسی خاص ملک کا تعلق ہے یہ دیکھنا ہو گا کہ اس ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار کیا ہے۔ کوئلے کا استعمال کن چیزوں میں ہو رہا ہے کوئلے کی کانیں کس جگہ پر ہیں وہاں سے کوئلہ ڈھونے کی کیا آسانیاں ہیں۔ کوئلہ ختم ہونے کی مدت مقرر کرنے میں ہمیں یہ سب

(باقی صفحہ پر)

جناب وقار خلیل



نیک بنو اور ایک بنو تم

مکر وریا کی اس نگری میں
سچائی کے پھول کھلاؤ!

علم و عمل کی شمع جلا کر
جگ کو اُجیارے میں لاؤ

منزل منزل بڑھنا ہوگا
چل نکلے تو بڑھتے جاؤ

کاہل، سُست اور ناکارہ کو
جدّوجہد کا درس سناؤ

کوئی مشکل کام نہیں ہے
ہمت کو میدان بناؤ

آپ اکیلے چلنا کیسا؟
بھٹکوں کو بھی راہ پہ لاؤ

نیک بنو اور ایک بنو تم!
ملک کی خاطر جان لڑاؤ

لڑنا اور جھگڑنا چھوڑو
پیار، محبت سے پیش آؤ

کاہل کو بھی کام سکھاؤ
مدھُر سُروں میں گیت یہ گاؤ



ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن.

دربار صاحب امرت سر

جس طرح ہندو بنارس کو اور مسلمان مکہ کو بڑا پوترا اور مقدس مقام سمجھتے ہیں اسی طرح سکھ امرت سر کو دھارمک یا مذہبی حیثیت سے اپنا سب سے متبرک شہر مانتے ہیں۔ اس لیے کہ یہی وہ شہر ہے جہاں سکھوں کا مشہور و معروف گردوارہ دربار صاحب امرت سر ہے۔

سکھ دھرم کو قائم کرنے والے تو بابا نانک تھے جو بابر کے زمانے میں گزرے ہیں مگر بعد کو ان کے مختلف جانشین سکھ دھرم کی ترقی کے لیے برابر کوشش کرتے رہے۔ ان میں سے چوتھے جانشین گرو رام داس اور پانچویں گرو ارجن دیو کے نام بہت مشہور ہیں۔ امرت سر کو پہلے پہل گرو رام داس نے آباد کیا تھا، کہتے ہیں گرو رام داس دہلی سے لاہور جانے کے لیے جس راستے سے جایا کرتے تھے وہاں ایک خوب صورت تالاب پڑتا تھا، گرو جی کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اور وہ یہاں اکثر رک جایا کرتے تھے۔ اکبر اعظم کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے یہ جگہ گرو جی کو تحفے کے طور پر دے دی چنانچہ گرو رام داس نے اس تالاب کو صاف کروانے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ گہرا، اور زیادہ بڑا بھی کر دیا۔ اور اس کے پاس ایک چھوٹا سا گردوارہ بھی بنوا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس تالاب کے چاروں طرف ایک گاؤں آباد ہو گیا جو گرو کا چاک یا چاک رام داس کے نام سے مشہور تھا۔

گرو رام داس کے بعد گرو ارجن دیو سکھوں کے پانچویں گرو مقرر ہوئے۔ گرو ارجن دیو نے سکھوں کی مذہبی کتاب آدی گرنتھ صاحب کو مرتب کیا۔ انھوں نے سکھوں کی عظیم [illegible] یادگار اور اس تالاب کا نام بھی بدل کر امرت سر [illegible] تالاب۔ انھوں نے اس تالاب کے بیچ میں

"ہر مندر" کے نام سے ایک گردوارہ بنوا کر اس میں آدی گرنتھ کے پڑھنے کا انتظام بھی کرا دیا۔ اسی زمانے میں لاہور میں ایک بہت بڑے مسلمان بزرگ تھے ان کا نام تھا میاں میر۔ گرو ارجن دیو اور میاں میر میں بڑی گہری دوستی تھی چنانچہ گرو ارجن دیو کے بلانے پر وہ امرت سر آئے اور انھوں نے باقاعدہ طور پر مندر کا افتتاح کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن "ہر مندر" میں جسے دربار صاحب امرت سر بھی کہتے ہیں ہر مذہب، دھرم، ذات کے لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ہے۔

گرو ارجن دیو کے زمانے میں چاک رام داس گاؤں نے ایسی ترقی کی کہ وہ اچھا خاصا شہر بن گیا۔ چنانچہ اب اس کا نام رام داس پور کر دیا گیا لیکن چونکہ تالاب کا نام تھا امرت سر اس لیے بہت جلد ہی لوگ رام داس پور کی بجائے اس شہر کو امرت سر کے نام سے یاد کرنے لگے۔

سکھوں کے چھٹے گرو ہرگوبند نے ہر مندر کے پاس اکال تخت بنوا کر امرت سر کے رتبے کو سکھوں کی نظروں میں اور اونچا کر دیا۔ اکال تخت وہ جگہ ہے جہاں سکھوں کے گروؤں کا دربار ہوتا تھا اور آج بھی ہر قسم کے مذہبی احکام تمام سکھوں کے لیے یہیں سے بھیجے جاتے ہیں۔

سکھوں کے دسویں اور آخری گرو کا نام تھا گرو گوبند سنگھ جن کے زمانے میں سکھ ایک ہتھیار بند جماعت بن گئے جنھیں خالصہ کہتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ گرو ارجن دیو کے زمانے ہی سے سکھوں اور مغل بادشاہوں میں کچھ ان بن سی رہتی تھی اور جب جہانگیر کے حکم سے گرو ارجن دیو کو قتل کر دیا گیا تو سکھ مغلوں کے جانی دشمن بن گئے۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں یہ لڑائی اور بڑھی اسی لیے گرو گوبند سنگھ کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ سکھوں کو باقاعدہ فوجی تربیت دیں تاکہ وہ مغلیہ سلطنت سے ٹکر لے سکیں۔ اس آپس کی ان بن اور پھوٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا دیس کمزور ہوتا گیا۔ اور بدیسی حاکموں نے ہمارے ملک پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے جہاں مغلیہ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی وہیں سکھوں اور ان کے مذہبی مقامات کو بھی زبردست نقصان پہنچا۔ کہتے ہیں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں نے دربار صاحب امرت سر کو بارود سے اڑا دیا تھا لیکن سکھوں کے حوصلے پھر بھی جوں کے توں قائم رہے

اور احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد امرت سر میں ہرمندر کی عمارت کو پھر سے کھڑا کر دیا اور اب کی بار یہ عمارت کہیں زیادہ خوبصورت بنائی گئی۔ جب ۱۸۰۲ء میں پنجاب پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوگئی تو امرت سر، ہرمندر اور سکھوں کے دن بھی پھرے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہرمندر کو مغلیہ عمارت کے طرز پر سنگ مرمر سے بنوایا اور اس کی چوٹیوں، کلسوں اور گنبد پر تانبے کے پترے چڑھوا کر سونے کا پانی پھروا دیا۔ اسی دن سے دربار صاحب امرت سر یا ہرمندر کا نام "سنہرا مندر" پڑ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن سنہرا مندر کی ظاہری چمک دمک اور آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ آیئے اب آپ کو دربار صاحب امرت سر کی کچھ جھلکیاں اور دکھائیں۔

وہ احاطہ جہاں تالاب، گردوارہ، اکال تخت اور دوسری بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتیں واقع ہیں بہت بڑے رقبہ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس احاطہ میں گھسنے کے لیے جو صدر دروازہ ہے اس کو درشنی دروازہ کہتے ہیں اور اس کے اوپر ایک گھنٹہ گھر بنا ہوا ہے۔ گردوارے کے اندر داخل ہونے کے لیے جوتے باہر اتار دینا ضروری ہے۔ درشنی دروازے کے اندر گھسنے کے بعد تالاب کے چاروں طرف صاف ستھرا، بے داغ سنگ مرمر کا فرش نظر آتا ہے جس کو بابا گرونانک کے بھگت ہر وقت جھاڑو سے صاف کرتے رہتے ہیں یہاں پہنچ کر بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے اور "کر سیوا" کے موقعوں پر سب ہی یاتری بغیر کسی امتیاز کے دربار صاحب کی سیوا میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہرمندر یا دربار صاحب کی عمارت امرت سر یا امرت کے تالاب کے ایک طرف ہے۔ سنگ مرمر کے فرش سے یہاں تک پہنچنے کے لیے سنگ مرمر کا ایک پل بنا ہوا ہے۔ اس پل پر تانبہ چڑھی ہوئی چمکتی ہوئی قندیلوں کی دو طرفہ قطاریں ہیں جو رات کے وقت یاتریوں کو راستہ دکھاتی ہیں۔ دربار صاحب میں اندر داخل ہونے کے لیے چاروں طرف دروازے بنے ہیں۔ گرونانک کا کہنا تھا کہ خدا ہر جگہ ہے اور ہر سمت میں ہے اس لیے یاتریوں کو ہر طرف سے گردوارے میں آنے کی اجازت ہے۔ جب یاتری گردوارے کے اس حصے میں پہنچتے ہیں جہاں گرنتھ صاحب [illegible] گرنتھ رکھا ہے تو ان

کا فرض ہے کہ اسے خدا کا کلام اور پیغمبر سمجھ کر
اس کے آگے سر جھکا دیں۔ گردوارہ روزانہ
اٹھارہ گھنٹے تک کھلا رہتا ہے اس تمام وقت
میں گرنتھی گرنتھ صاحب کا مسلسل پاٹ کرتے
رہتے ہیں اور یاتریوں کو بانی یعنی گروؤں کی
بتیں یعنی خدا کا کلام سناتے رہتے ہیں۔

ہر مندر، دربار صاحب یا سنہری مندر کی
عمارت تو چھوٹی سی ہے لیکن اس پر بے داغ
سنگ مرمر کا کام، اس پر پھولوں اور انگور کی
بیلیں کچھ ایسی صفائی سے بنائی گئی ہیں کہ تاج محل
کی یاد آنے لگتی ہے۔ صبح کے وقت جب اس کے
گنبد، برجیوں اور کلسوں پر سورج کی کرنیں
پڑتی ہیں تو پوری عمارت جھم جھم کرنے لگتی ہے۔
اسی طرح اندرونی حصے کو دیکھیے تو ریشمی
پردوں اور قیمتی کپڑوں کی چمک دمک سے
آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن
ان سب سے بڑھ کر دربار صاحب کی خوبصورتی
کو اگر کوئی چیز چار چاند لگاتی ہے تو وہ ہے
تالاب کا صاف وشفاف پانی۔ شام کے وقت
دربار صاحب اور اس کی روشنیوں کا عکس
جب پانی میں پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے
گویا نور کی بارش ہو رہی ہے اور انسان کچھ دیر
کے لیے یہ بھول جاتا ہے کہ یہ وہی امرت سر
ہے جو کسی زمانے میں گرو کے چاک کے نام سے مشہور تھا۔

(بقایا کالا پتھر)

چیزیں دیکھنا ہوں گی۔

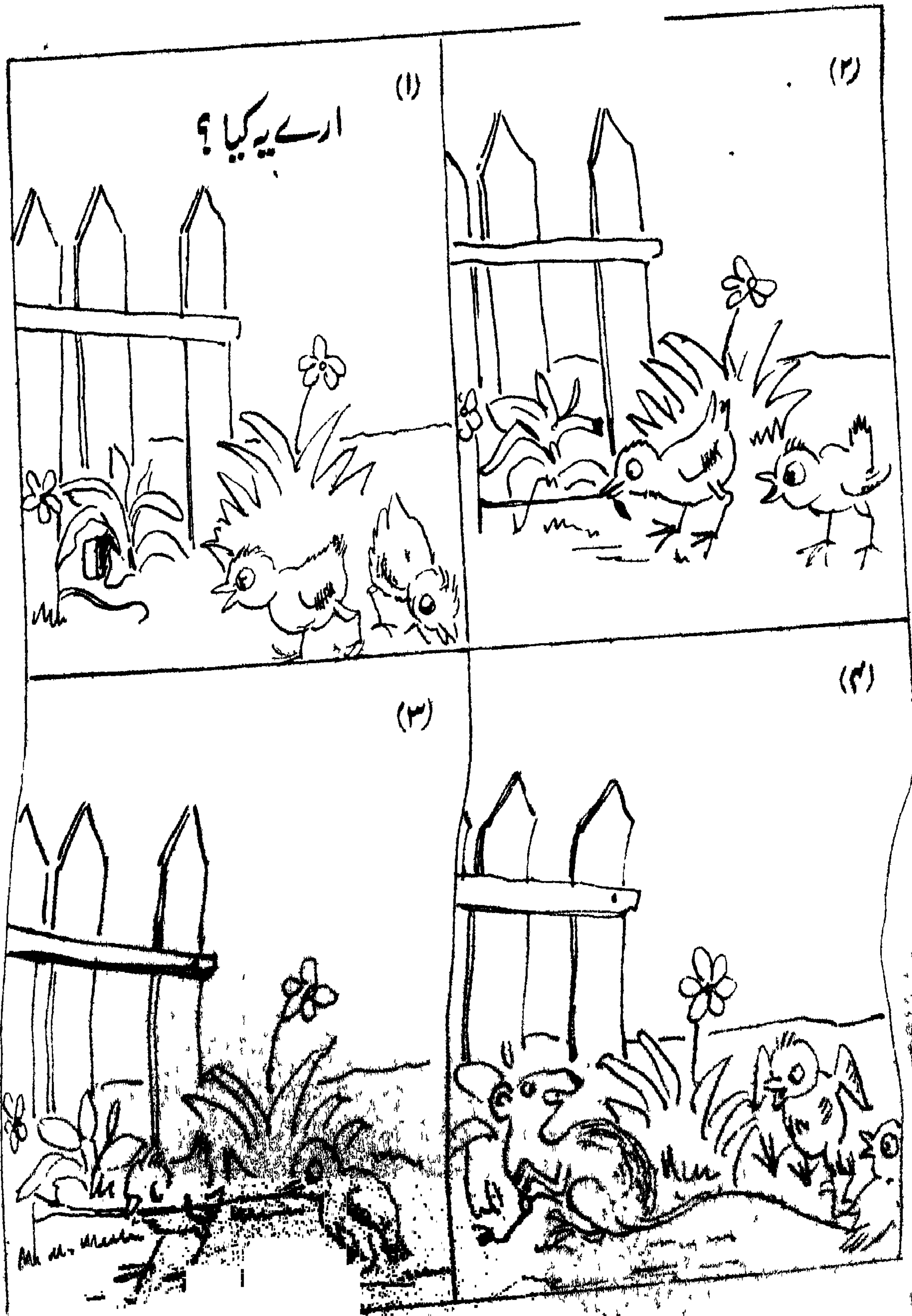
ایک اور بات دھیان میں رکھی جائے
اس زمانے میں کارخانے، مشینیں، پن بجلی اور ایٹمی
طاقت سے چلنے لگی ہیں جوں جوں ان کا استعمال
بڑھے گا ویسے ہی کوئلے کا خرچ گھٹنے لگے گا۔ بہرحال
کوئلے کے موجودہ خرچ کو دیکھ کر اندازہ لگایا
گیا ہے کہ دنیا کے کوئلے کے ذخیرے کم از کم
ایک ہزار سال تک کے لیے کافی ہیں۔

(بقایا بچارہ شاعر)

شاعر: نہیں منّے۔ اب مجھے چورن نہیں چاہیے۔
اب تو کھانا کھا کر ہی چورن کھاؤں گا۔
امّی سے کہیے۔ کھانا جلد تیار کر لیں۔
اور ہاں تم اپنے دوست ارشد کو بھی
کھانا کھلا کر گھر بھیجنا۔ جاؤ اب کھیلو

—— (دونوں کے جانے کے بعد) ——

ہا کتنا سکون ہوا۔ اچھا ہوا یہ لڑکا آ گیا
ورنہ معلوم نہیں مجھے شام تک کوئی
شعر سننے والا ملتا یا نہیں۔


(۱)
ارے یہ کیا؟
(۲)
(۳)
(۴)



رمہ شمیم ملک

شکایتیں

باتوں باتوں میں جب چھوٹے بہن بھائیوں کا ذکر آیا تو رافعہ بولی۔ "مگر بھئی میں اپنے بہن بھائیوں کا حال کیا بتاؤں۔ بالکل کہنا نہیں سنتے۔ کل ہی کی بات ہے میں اور امجد بیڈمنٹن کھیلنے جا رہے تھے۔ منی اور رومی ضد کرنے لگے ہم نے جھڑک دیا تو رات تک روتے رہے اور طرح طرح کی ضدیں کرتے رہے۔"

"اور ہمارے گڈو اور شاہدہ کی تو کچھ پوچھو ہی مت، بہت ہی بدتمیز ہیں۔ جب بھی ان سے کوئی بات کہتی ہوں بس یہی جواب ہے ... 'آپ بری ہیں ہم آپ کی بات نہیں سنیں گے'۔ صفیہ نے کہا۔

"باجی، آپ کے چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھ کر تو رشک آتا ہے۔ ماشاء اللہ کتنے تمیزدار ہیں اور آپ کا کتنا ادب کرتے ہیں ..." رشیدہ نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"لیکن کیا کبھی تم لوگوں نے یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہیں آپ خود ہی تو قصوروار نہیں ...؟"

"ہم بڑے بہن بھائیوں میں ایک عادت ہوتی ہے ... چھوٹوں کے مقابلے میں ہم اپنی اہمیت زیادہ سمجھتے ہیں ... گویا یہ بے عقل ہیں، سوچ سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے ان کی ضروریات، ان کی دلچسپیاں بھی کم ہیں یا نہیں ہیں۔

"پر بہن بچے تو چاہتے ہیں کہ وہ بھی بڑوں کی طرح کام کریں مثال کے طور پر جب رضیہ اور امجد کھیلنے جا رہے تھے تو منی اور رومی بھی

چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کی طرح کھیلنے جائیں، ان لوگوں کے بری طرح جھڑک دینے سے پھول کی طرح ہنستے چہرے کمھلا گئے۔ غصہ اور دکھ کے جذبات ان کے چہرے پر نمودار ہو گئے... اس طرح کے واقعات آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں۔ بچوں میں ایک طرح کا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ بات بات پر موڈ خراب کر لیتے ہیں۔ اکثر سارے دن یہی کیفیت رہتی ہے۔

"سچ پوچھیے تو بچوں کے احساسات، جذبات، ولولے آپ سے کہیں زیادہ بے قابو اور تیز ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی نازک بھی ہوتے ہیں، ذرا سی ٹھیس لگنے پر طور سے بے طور ہو جاتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ انھیں سمجھنے کی کوشش کریں، انھیں راہ پر لائیں، انھیں اچھے رخ پر موڑنے کی کوشش کریں۔

"اگر آپ لوگ ان کو کھیل میں لے جا سکتی تھیں تو لے جانا چاہیے تھا اور ان سے کہنا چاہیے تھا کہ بھی تم لوگ بیٹھ کر دیکھو جب تمھیں کھیلنا آجائے گا تم کو بھی کھلائیں گے۔ اگر وہاں نہیں لے جا سکتی تھیں تو اور کسی طرح سمجھا دینا چاہیے تھا۔

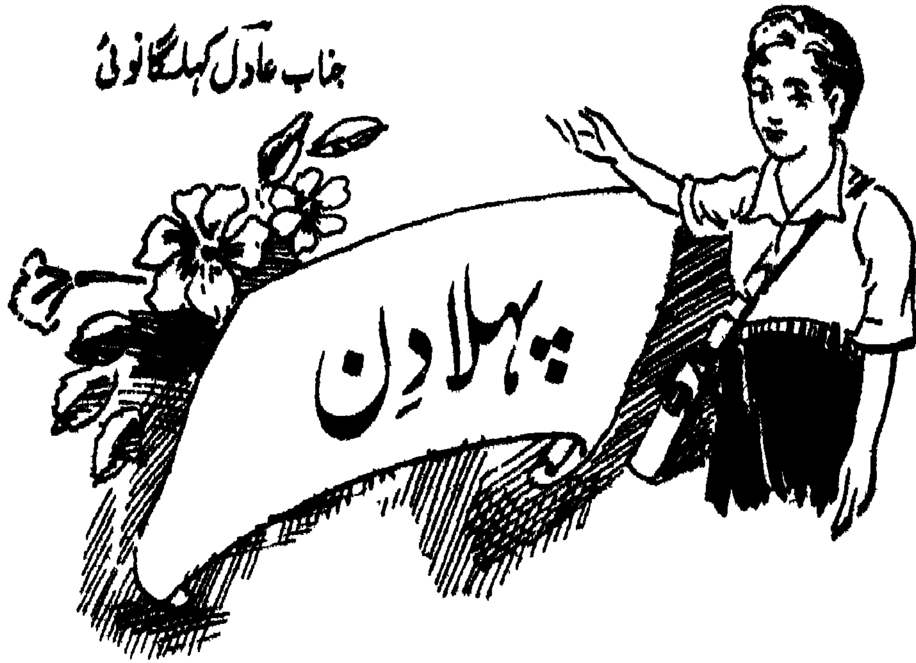
"ایک بات یاد رکھیے بچوں سے کبھی وعدہ نہ کیجیے۔ نہ جھوٹے بہلانے بنائیے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے بڑے بہن بھائی اکثر چھوٹے بہن بھائیوں کو کسی طرح کا لالچ دے کر کام کراتے ہیں۔ بچے ایک آدھ بار دھوکہ کھا لیتے ہیں پھر سمجھ جاتے ہیں کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ پھر وہ آپ کا کہنا نہیں مانتے۔ ان کی نظر میں آپ کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ ایک نقصان اس سے بھی بڑا ہوتا ہے کہ وہ بھی جھوٹ بولنا سیکھ جاتے ہیں۔

"بچے نہیں جانتے کہ اچھا کیا ہے؟ اور برا کیا ہے؟ یہ عادت بھی بڑے بہن بھائی ڈالتے ہیں۔ اکثر ان کو برائیوں میں سکھا دیتے ہیں کہ اس سے مت بولو یہ برا ہے وغیرہ۔ اس کی بجائے اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ کام برا ہے انھوں نے یہ کام برا کیا ہے تو یہ بہتر ہے۔ ورنہ یہ سب باتیں ان میں بغاوت کا مادہ پیدا کر دیتی ہیں انھیں ضدی، بزدل اور خراب بنا دیتی ہیں۔"

"لیکن باجی ہم نے بھی تو یہ باتیں اپنے بڑوں سے سیکھی ہیں..." صفیہ نے کہا۔

"ہاں بہت حد تک اپنے والدین سے سیکھی ہوں گی لیکن ہمیں اپنے بڑوں کی غلطیوں پر چلنا نہیں چاہیے ہم پڑھ لکھ گئے ہیں سب باتوں کو سمجھتے ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے معاملے میں احتیاط سے کام لیں۔"

جناب عادل کہلگانوی



سوئٹر، مفلر، خاکی نیکر پہنے کون وہ آتا ہے
کالا کوٹ اس اُجلے تن پر سندر روپ دکھاتا ہے
شکل و شباہت گوپ سے ملتی چلنے کا انداز وہی
ہونٹوں پر معصوم تبسم، گانے کی آواز وہی
یہ تو اپنا گوپ ہے بچو، ہاں میں نے پہچان لیا
لیکن اِتنا خوش وہ کیوں ہے آخر اس میں راز ہے کیا
سندر گیت سنو تو اس کا بول بڑا ہی میٹھا ہے
"میرا پہلا دن اسکول کا اور دنوں سے اچھا ہے"
اب میں سمجھا اس نے بھی اسکول سے ناطہ جوڑ لیا
کھیل کود میں وقت گنوانے سے اب منہ کو موڑ لیا
تم بھی بچو نیند سے جاگو اب اسکول آباد کرو
پڑھ لکھ کر کچھ نام کرو یوں وقت نہ تم برباد کرو

ای۔ایس انگلش اسکول توڈیل (مہاراشٹر)



اسکول کے دستور کے مطابق امسال ہمارے اسکول میں طلباء کی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے ان میں کچھ آزاد ممبروں۔ ریڈ اور بلیو کلب کے لڑکوں نے پرجوش طریقے پر حصّہ لیا۔ جس میں بلیو کلب نے اکثریت حاصل کرکے حکومت قائم کی۔ آزاد ممبران بُری طرح ہارے جبکہ ریڈ کلب مضبوط حزب مخالف کی شکل میں سامنے آیا۔ صدر کا انتخاب ہوجانے پر صدر نے بلیو کلب کے لیڈر کو وزیر اعظم کی جگہ پر نامزد کیا۔ بعد ازاں وزیر اعظم کی رائے سے وزارت کی تشکیل عمل میں آئی جو اس طرح تھی

۱۔ صدر	شوکت ابراہیم پٹھان	یازدہم
۲۔ نائب صدر	سید محمد آزاد قادری	〃 〃
۳۔ وزیر اعظم و خارجہ	عبدالقادر عمر ساٹھے	دہم
۴۔ وزیر سوشل اینڈ کلچرل ایکٹوٹیز	اخلاق حسین ہرکار	یازدہم
۵۔ وزیر داخلہ	عبدالرزاق دلوی	〃 〃
۶۔ وزیر نشر و اشاعت	عبدالقادر کرجیکر	دہم

۷۔ وزیر مالیات	یوسف تلگھرکر	نہم
۸۔ وزیر ثقافت	عبدالقادر مائیکر	یازدہم
۹۔ وزیر صفائی وصحت	عبدالمجید دیشمکھ	ہشتم
۱۰۔ وزیر تعلیم	فدا علی شیمناگ	نہم
۱۱۔ وزیر منصوبہ بندی	یوسف واکھوے	یازدہم
۱۲۔ اسپیکر	قاضی عبدالجلیل حلیمائی	دہم
۱۳۔ مارشل	حمزہ محمد ساٹھے	یازدہم
۱۴۔ لیڈر حزب مخالف	چھاؤکر نذیر احمد آدم	" "
۱۵۔ مشیر خاص	رئیس الدین (ٹیچر)	

اسکول کے باہری معاملات کے پیش نظر وزیر اعظم نے محکمۂ خارجہ بھی اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چونکہ ہمارا اسکول ایسی جگہ ہے جہاں پہاڑوں، ندیوں اور جنگلوں تینوں سے واسطہ رہتا ہے۔ اس لیے وزیر اعظم نے ہر ہر گاؤں کے لڑکوں میں سے ایک ایک لڑکے کو امیر بنا دیا ہے۔ جس کی سرکردگی میں وہ لوگ اسکول آتے جاتے ہیں۔

وزیر داخلہ نے قریب قریب ہر معاملے کی دیکھ بھال کی جو اسکول کے اندرونی نظام سے وابستہ تھے جیسے طلباء میں نظم ونسق، کھیل کے ٹائم اور صحت وصفائی وغیرہ۔ اس سے پہلے ہمارے پاس والی بال کا صرف ایک میدان تھا۔ لیکن اب لڑکوں کی وجہ سے والی بال، کبڈی اور ہاکی کے تین میدان ہیں۔

وزیر نشر واشاعت نے نوٹس بورڈ پر لکھ کر ملکی خبریں اور اسکول و پارلیمنٹ کی جملہ کارروائیوں کو طلباء تک پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔

سوشل ایکٹوٹیز کے نتیجے میں امسال اسکول میں ہر ہفتہ منگل کو آخری گھنٹے میں کسی نہ کسی عنوان پر بحث ومباحثہ۔ تقریریں اور مشورے ہوتے رہے۔ وزیر سوشل ایکٹوٹیز کے سپرد کھیل کی دیکھ بھال بھی تھی۔ جس میں ہمارے طلباء نے ٹیم گیمس اور انفرادی کھیلوں میں سارے ضلع میں ایک اچھی پوزیشن

حاصل کی یہ انھیں کی کوششوں اور ٹیچروں سے تعاون کا نتیجہ تھا کہ تعلق اسپورٹس میں ہماری والی بال اور کبڈی کی ٹیمیں سکنڈ رہیں علاوہ ازیں انفرادی کھیلوں جیسے ہائی جمپ میں سکنڈ۔ سو میٹر ریس اور سینڈ رہ سو میٹر ریس میں بھی لڑکے سکنڈ رہے۔ اس طرح ڈسٹرکٹ سطح پر ہونے والے کھیلوں میں بھی ہماری کبڈی اور رسہ کشی کی ٹیمیں سکنڈ رہیں۔

وزارت تعلیم کی طرف سے اسکول میگزین کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ امسال میگزین ضرور چھپ جائے گی۔ اور اسکول لائبریری سے کتابیں باقاعدہ تقسیم کرنا اور واپس لینے کا کام بھی انھیں کے ذمے ہے۔

وزیر صفائی و صحت نے بھی دلچسپی سے کام لیا۔ روزانہ لڑکوں کے ناخن، دانت، جسم اور کپڑوں کی صفائی کی طرف دھیان دلاتے رہے۔ مزید براں اسکول کے کمروں، میدان، اور گردو نواح میں بھی سٹرمدان کے طور پر کام کراتے رہے۔

وزیر اعظم نے مندرجہ بالا تمام کاموں کی نگرانی کی۔ ٹیچروں سے انتظام کے معاملے میں اچھا تعاون برتا۔ جس کی وجہ سے اسکول پہلے کے مقابلے میں کئی گنا ترقی یافتہ معلوم دینے لگا ہے۔

حزب مخالف کے لیڈر نے بھی حکومت سے تعاون برتا اور جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں سخت قسم کی تنقید بھی کی۔ آج کل وہ کچھ وزراء کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک چلا رہے ہیں۔ مشیر خاص نے بھی بعض مواقع پر حکومت کو اچھی صلاح دی۔ جس کے نتیجے میں نظم ضبط قائم کرنے میں کافی مدد ملی۔

ان سب معاملات میں جو ہستی عمارت کا ستون ثابت ہوئی وہ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر جو ایک طرف تو وزارت کے انچارج کی حیثیت سے تھے اور دوسری طرف ایک ہمدرد صلاح کار بھی تھے۔ ان ہی کی کاوشوں کے نتیجے میں اسکول پہلے کے مقابلے میں کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں اسکول میں ایک کوآپریٹو اسٹور بھی چلتا ہے جس کا تمام کام وزیر داخلہ کے سپرد ہے۔ اور جس کے مالک اسکول کے لڑکے ہی ہیں،

بچّوں کی کوششیں

جولائی میں ہر سال جب مدرسہ کھلتا ہے۔ تو داخلوں کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ بلا کی گرمی سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ دیکھیے ہر طالب علم نے اپنے تاثرات کس طرح بیان کیے ہیں۔

(سید احمد علی)

گرمی

جی مرا گرمی سے گھبرانے لگا — آگ برسی جسم تھرانے لگا — ریاض عمر ۱۲ سال

سر مرا گرمی سے تھرانے لگا — موت کا منظر نظر آنے لگا — 〃 〃 〃

شدتِ گرمی تمازت دھوپ کی — خود بخود کشمیر یاد آنے لگا — 〃 〃 〃

شدتِ گرمی سے لب پر دم ہوا — ہوگیا بے ہوش دم جانے لگا — جہانگیر علی عمر ۱۳ سال

کام میں اب جی نہیں لگتا مرا — اُف ری گرمی جی بھی گھبرانے لگا — 〃 〃 〃

آگ کی مانند تن تپنے لگا — اور پسینہ جسم سے آنے لگا — نصیر احمد عمر ۱۵ سال

کیفیت گرمی کی ہو کیونکر بیاں — ہر نفس گرمی سے گھبرانے لگا — 〃 〃 〃

کچھ عجب ہے حال گرمی سے مرا — بھاگ کر میں باغ میں جانے لگا — رعنا امین عمر ۱۲ سال

جب چلا پنکھا تو کچھ تسکیں ہوئی — بیٹھ کر نیچے ہوا کھانے لگا — 〃 〃 〃

شدتِ گرمی سے سب بے حال ہیں — حبس کی گرمی سے دم جانے لگا — زاہد حسین عمر ۱۳ سال

ہے ہوا بھی بند اور گرمی بہت — سانس بھی گھٹ گھٹ کر اب آنے لگا — عفت زہرا عمر ۱۲ سال

اب تو سورج اور گرمانے لگا — اپنے منہ سے آگ برسانے لگا — زیتون بیگم عمر ۱۵ سال

سر مرا گرمی سے چکرانے لگا — دم لبوں پر خود بخود آنے لگا — عنایت اللہ عمر ۱۲ سال

دوپہر کے وقت یہ حالت ہوئی — سر پہ سورج آگ برسانے لگا — رشید احمد عمر ۱۵ سال

(۲)

گرمی کا زمانہ آتا ہے بے حال ہر ایک ہو جاتا ہے — پھر کام نہیں کچھ بھی ہوتا، رہ رہ کے پسینہ آتا ہے — شعیب عبداللہ عمر ۱۱ سال

راتوں کو مچھر ہوتے ہیں اور دن کو لو کے تھپیڑے ہیں — آفت سی ہر دم رہتی ہے جی گرمی سے گھبراتا ہے — شہناز انجم عمر ۱۱ سال

گرمی کا زمانہ آتا ہے بے چین ہر ایک ہو جاتا ہے — ہر گھر میں پنکھا چلتا ہے رہ رہ کے پسینہ آتا ہے — سہیل احمد عمر ۱۳ سال

ہر ایک کو پسینہ آتا ہے، کپڑوں سے بدبو آتی ہے — بے سود نہانا ہوتا ہے دل چین نہیں کچھ پاتا ہے — عادل عمر ۱۲ سال

سڑکوں پر چلنا مشکل ہے ریتوں کے جھونکے آتے ہیں — ہم منہ پر کپڑا رکھتے ہیں یوں راہ میں جانا ہوتا ہے — ماہ طلعت عمر ۱۲ سال

لو سر پر سر سر چلتی ہے اور پیاس کا غلبہ ہوتا ہے — دھرتی سے آگ نکلتی ہے۔ ہر غنچہ سوکھا جاتا ہے — " "

گردوں پر گرد کا ڈیرہ ہے اور لو کا جھونکا آتا ہے — چھپ چھپ کر گھر میں رہتے ہیں گرمی سے جی گھبراتا ہے — یٰسین عمر ۱۲ سال

جب سورج سر پر ہوتا ہے اور گرم ہوائیں چلتی ہیں — شدت کی گرمی ہوتی ہے۔ انسان پریشاں ہوتا ہے — ماہ طلعت

جنگل کے پودے سوکھ گئے جنگل کا پانی سوکھ گیا — گرمی سے ہونٹ بھی سوکھ گئے پانی پر دل للچاتا ہے — محمد شریف عمر ۱۴ سال

گرمی کا زمانہ آتا ہے اسکول کی چھٹی ہوتی ہے — خوشحال جو ان میں ہوتا ہے وہ ہل اسٹیشن جاتا ہے — " "

ہوتی ہیں بند دکانیں سب بازار بھی سونے ہوتے ہیں — بازار کا جانا مشکل ہے ہر ایک بہت گھبراتا ہے — زبیدہ عمر ۱۱ سال

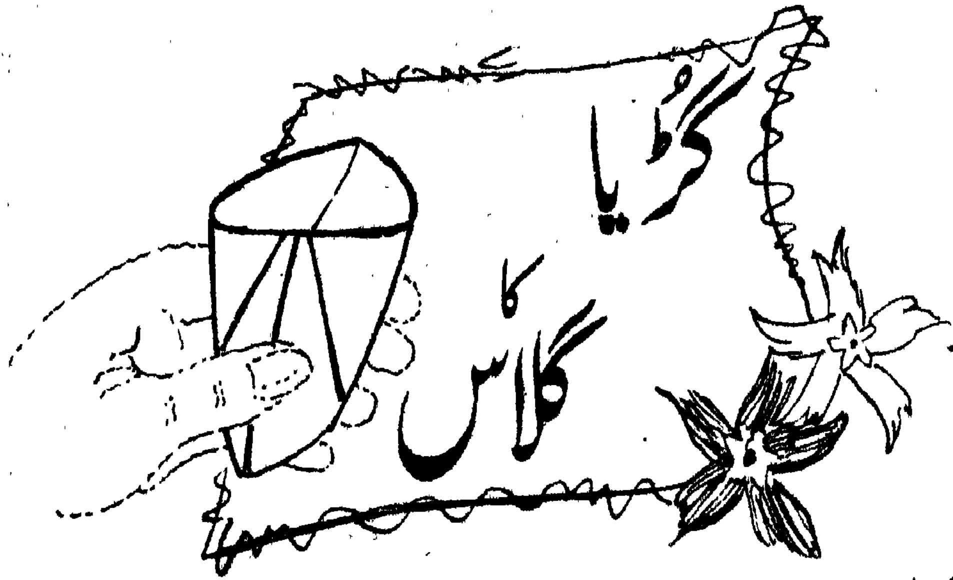


لطیفہ

ایک طالب علم کو ہفتے کے دن کسی طرح
یاد نہیں ہوتے تھے۔ آخر استاد نے ایک ترکیب بتائی۔
تمھارے گھر میں مرغیاں تو پلی ہوں گی۔ بس
ان ہی کو ہفتے کے نام مثلاً پہلی مرغی کو دوشنبہ
کہو دوسری کو منگل، اسی طرح سات
مرغیوں کے نام رکھ دو۔
کچھ دنوں کے بعد استاد
نے پوچھا: کیوں میاں تمھیں
دنوں کے نام یاد ہوئے۔
لڑکے نے بڑی روانی سے
کہنا شروع کیا۔
دوشنبہ، منگل، بدھ، جمعرات،
سنیچر، اتوار۔
استاد مسکرا کر بولا: شاباش شاباش مگر
میاں بیچ میں ایک دن غائب۔
لڑکے نے فوراً جواب دیا: جی ہاں ماسٹر
صاحب جمعہ کو بلی کھا گئی

دو شرابیوں نے خوب جی بھر کے شراب پی
اتنی پی کہ شراب کی دکان سے نکلنا مشکل ہو گیا۔
پیر لڑکھڑانے لگے۔ آخر میں دونوں وہیں سڑک
کے کنارے لیٹ گئے۔ سوتے میں ایک کے سر
میں کھجلی ہوئی۔ بے ہوشی میں اسے اپنا سر تو ملا
نہیں ساتھی کا سر کھجلانے لگا۔ ساتھی ہڑبڑا کر
اٹھ بیٹھا اور بولا: "کیوں بھئی تم میرا سر کیوں
کھجلا رہے ہو۔ پہلے نے بڑے تعجب سے جواب دیا۔
"ہیں! یہ تمھارا سر ہے تو پھر میرا سر کیا ہوا؟"

استاد نے بڑے دکھ سے اپنے شاگرد سے کہا: "اچھا
تم صرف دس تک گن سکے تو پھر میاں بڑے ہو کر تم کیا کرو گے"
شاگرد۔ کتے بازی کا ریفری۔



گڑیا کی رخصت کیا ہو رہی تھی ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بلائے، بن بلائے مہمان گھر میں بھرے تھے۔ ٹین کے ڈبے پیٹے جا رہے تھے۔ "بابل[1]" گانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں شور کر رہی تھیں۔ لڑکے اُودھم مچا رہے تھے۔

نمایش کے بعد جہیز "بکسوں" میں رکھا جا رہا تھا کہ اتنے میں عیب جو، بول اٹھی "اے ہے! جہیز میں گلاس تو دیا ہی نہیں۔ گڑیا پانی کس میں پیے گی؟"

اپنے، پرائے، سب کو اس زبردست کمی کا ایک دم احساس ہوا۔ اب وقت کے وقت گلاس آئے تو کہاں سے آئے؟

گڑیا والی اس حملے سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ فقروں کی بوچھار ہونے لگی۔ "ہے ہے۔ پیاسی مرے گی بے چاری" "سسرال میں مل جائے گا" "گڈا لا دے گا" "پڑوسن سے مانگ لیا کرے گی!"

---

[1] بابل ایک گیت کا نام ہے۔ لڑکیوں کی رخصتی کے وقت پورب میں یہ خاص طور پر گایا جاتا ہے۔ بڑے درد بھرے لہجے میں گایا جاتا ہے۔

"نہیں یہ گڑیا پانی پیتی ہی نہیں۔" "حلق میں نوالہ اٹک گیا تو کیا ہوگا؟" "دم نکل جائے گا۔" "مرجائے گی بچاری۔" "گڈا گردن پر مُکّا مار کر اتار دے گا۔" غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔

"گڑیا والی" کے پہلے ہی اوسان خطا تھے۔ جہیز دکھانے کی فکر۔ جہیز کو چرا چکنے "مہمانوں" سے بچانے کی فکر۔ گڑیا اور اس کے جہیز کی جدائی کا غم۔ تعریف تو کوئی کیا کرتا۔ بلائے جانے اور ہنڈکلھیوں کی دعوت اڑانے کا شکریہ تو کوئی کیا ادا کرتا۔ اُلٹے کیڑے نکالے جانے لگے۔ اس کا جی جل کر کباب ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دل چاہا ہنسنے والوں کا منہ نوچ لے۔ شادی وادی ختم کرکے بارات لوٹا دے۔ سارا کھیل درہم برہم کردے۔ اتنے میں بھائی پاس آنکلا۔ بہن کی حالت اور پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ بولا "ارے گلاس نہیں گڑیا کے جہیز میں؟ واہ! لو میں ابھی تیار کیے دیتا ہوں۔"

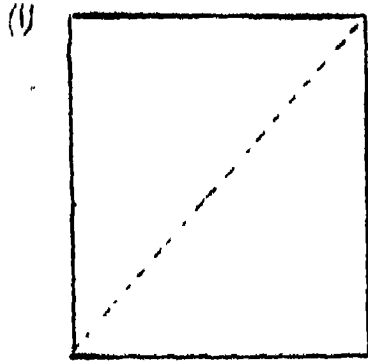
یہ کہہ کر اُس نے قریب ہی سے رنگین کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا۔ انگلیوں ہی انگلیوں میں اُس کو موڑ کر اتنا خوب صورت گلاس تیار کردیا کہ سب کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔

بہن کی عزت رہ گئی۔ گڑیا کی شادی ختم ہوتے ہوتے بچ گئی۔ "گڈے والی" کو گڑیا کا جہیز ہاتھ سے نکلتے نکلتے پھر مل گیا۔ اُن "جلنے" والوں پر اوس پڑ گئی جنھیں مزہ ہی اس وقت آتا جب خوشی کا یہ ہنگامہ بدمزگی پر ختم ہوتا۔

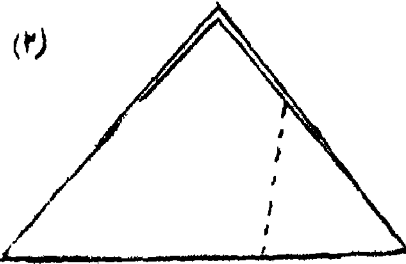
اور گلاس بھی ایسا اچھا گلاس۔ دیکھنے میں خوب صورت، برتنے میں کارآمد، اور خوبی یہ کہ جب ضرورت نہ ہو تو تہہ کرکے بکس یا جیب میں رکھ لیجیے۔ خراب ہو جائے تو دوسرا بنا لیجیے۔

اس کا بنانا بھی بہت آسان ہے۔ ہر ایک سیکھ سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی کوشش کیجیے کامیاب ہو کر دوسروں کی پیاس بجھائیے اور اپنا شوق پورا کیجیے۔ سیکھا ہوا آڑے وقت اپنے یا دوسروں کے کام آ ہی جاتا ہے۔

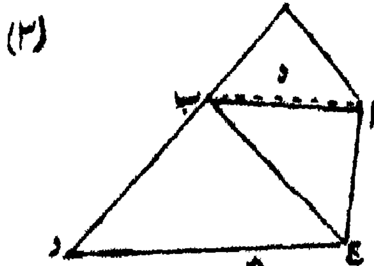
ایسا گلاس بنانے کے لیے:۔



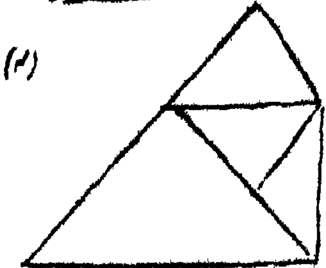
(۱) ایک مربع کاغذ لیجیے۔ (مربع اس چوکور شکل کو کہتے ہیں جس کی لمبائی چوڑائی برابر ہو)
اُسے ایک وتر (وہ لائن جو آمنے سامنے کے کونوں کو ملاتی ہے) پر سے موڑیے۔ دُہرا مثلث (تین کناروں والی شکل) بن جائے گی۔



(۲) مثلث کے کونے کو نقطے دار لائن پر موڑیے۔ نمبر ۳ جیسی شکل بن جائے گی۔ اس کا خیال رکھیے کہ ضلع ا ب ضلع ج د کی سیدھ میں ہو (یعنی متوازی ہو۔ یہ بھی یاد رکھیے کسی شکل کے کنارے کو ضلع اور کونے کو زاویہ بھی کہتے ہیں)



(۳) اوپر کی ایک مثلث پرت ہ نقطے دار لائن کے مطابق نیچے موڑ دیجیے۔ نمبر ۴ جیسی شکل بن جائے گی۔

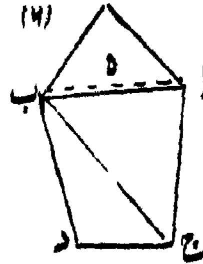


(۴) اس شکل کو پلٹ کر نیچے کا رُخ اوپر لے آئیے نمبر ۵ جیسی شکل دکھائی دے گی۔

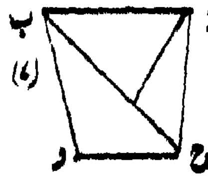


(۵) نقطے دار لائن پر اوپر کی طرف موڑ کر نمبر ۶ جیسی شکل بنا لیجیے۔ دھیان رکھیے ضلع ا ب ضلع ج د کے متوازی رہے۔

(۶) اوپر کی ایک مثلث پرت ہ جو باقی رہ گئی ہے اُس کو بھی نقطے دار لائن پر نیچے موڑ دیجیے ۔

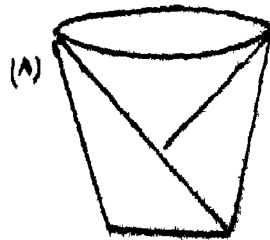


(۷) گڑیا کا گلاس تیار ہے ۔ اب پر سے اس کو کھولیے ۔ کھلا رکھنے کے لیے تلی کے کونے ج د کو تھوڑا تھوڑا اوپر موڑ دیجیے ۔ دیکھیے شکل نمبر ۸ ۔



ایک طرف سے چمک دار رنگین ، دوسری طرف سے سادہ کاغذ بازار میں ملتا ہے ۔ اس کاغذ سے گلاس بنائیں تو زیادہ خوب صورت معلوم ہوگا ۔

اگر واقعی پانی پینے کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو موٹے کاغذ سے بنائیے ۔ پنّی سے بنایا جائے تو مراد آبادی گلاس کو بھی مات کرے گا ۔



(بقایا بچوں سے باتیں)

میں چھپ رہی ہے ۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے ۔ اسی لیے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دوسری مشہور تاریخی عمارتوں پر مضمون لکھوائے جائیں ۔

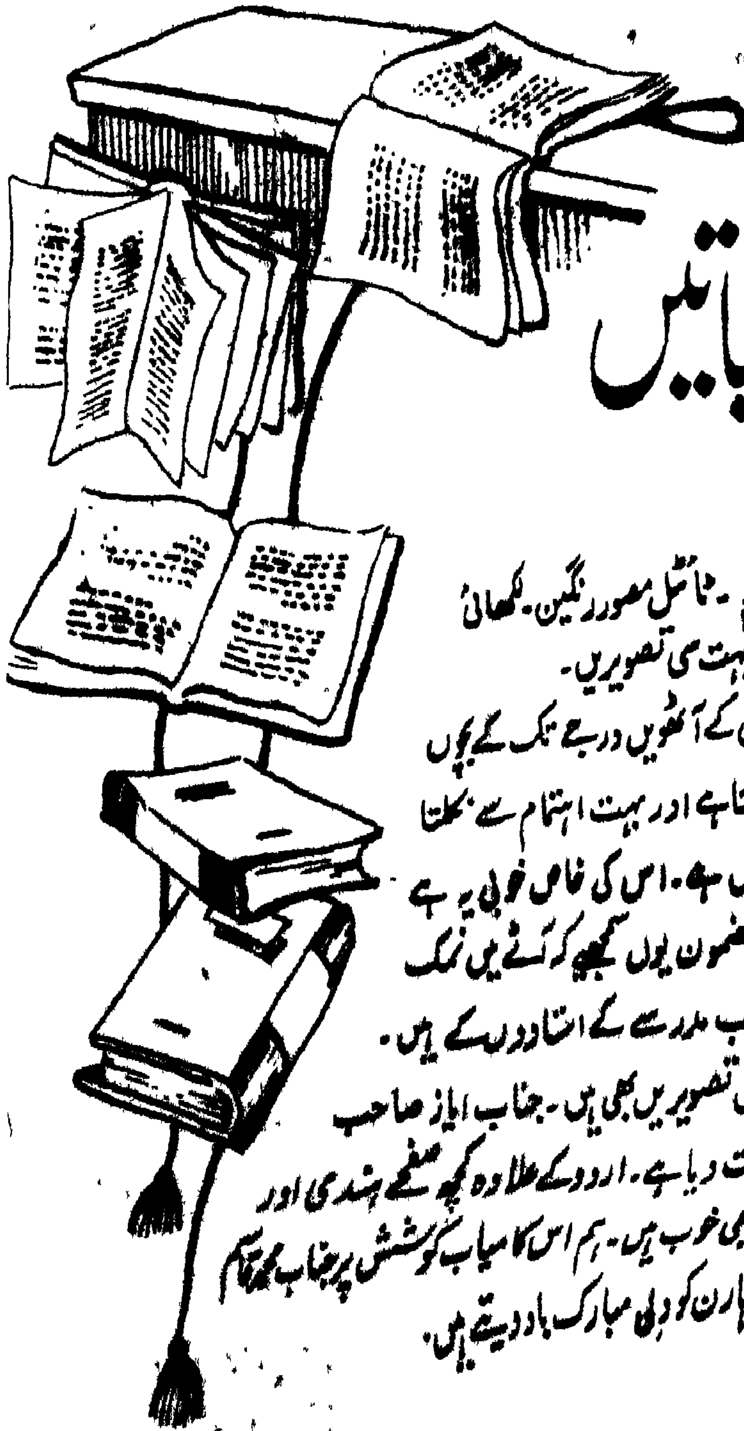
اب ایک خوش خبری بھی سن لیجیے ۔

۱۔ محترم خواجہ نور الدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں و کشمیر نے تمام تعلیمی اداروں کے لیے پیام تعلیم کی خریداری کی منظوری مرحمت فرما دی ہے ۔

۲۔ ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب مرزا محمود بیگ صاحب مشیر تعلیمات ریاست جموں و کشمیر نے پیام تعلیم کو لڑکیوں کے مدرسوں کے لیے منظور فرمایا ہے ۔

ہم ان دونوں کے احسان مند ہیں ۔ ہمارا یہ رسالہ پہلے بھی اس ریاست میں منظور تھا ۔ یوں سمجھیے کہ ان دونوں بزرگوں نے ایک طرح سے اس کی تجدید کی ہے ۔

پچھلے پرچے میں عزیزی جمال اختر نے جامعہ کے جلسہ تقسیم انعامات کی رپورٹ بھیجی تھی جو صفحہ ۵۶ ۔ ۵۷ پر شائع ہوئی ہے ۔ اس میں غلطی سے عزیز موصوف کو ثانوی چہارم کا طالب علم لکھا گیا ہے ۔ اُس وقت وہ ثانوی نہم کے طالب علم تھے اور اب کی بار ہائر سکنڈری کا امتحان اول درجے میں پاس کر لیا ہے ۔



کتابوں کی باتیں

اعتمادیہ (چھوٹوں کے لیے)

ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ سائز ۱۲ ۲۳/۴۔ ٹائٹل مصور رنگین۔ لکھائی اچھی چھپائی اچھی، کاغذ اچھا۔ اندر بلاک کی بہت سی تصویریں۔

یہ عربک ہائر سکنڈری اسکول دہلی کے آٹھویں درجے تک کے بچوں کا رسالہ ہے۔ غالباً سال میں ایک ہی بار نکلتا ہے اور بہت اہتمام سے نکلتا ہے۔ پیش نظر رسالہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ اکثر مضمون خود بچوں کے ہیں۔ بڑوں کے مضمون یوں سمجھیے کہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اور سوائے ایک آدھ کے سب مدرسے کے استادوں کے ہیں۔ بلاک کی تصویروں کے علاوہ جگہ جگہ لیتھو کی تصویریں بھی ہیں۔ جناب ایاز صاحب آرٹسٹ نے بڑی نفاست اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ اردو کے علاوہ کچھ صفحے ہندی اور انگریزی کے لیے بھی مخصوص کیے گئے ہیں یہ بھی خوب ہیں۔ ہم اس کامیاب کوشش پر جناب محمد قاسم صاحب نگراں، عزیزی مکیش کمار اور محمد ہارن کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

۲۔ اعتمادیہ (بڑوں کے لیے)

عربک ہائر سکنڈری اسکول کا یہ نویں سے گیارہویں تک کے [illegible] اور غیر معمولی اہتمام کے

سالنامہ نکلتا ہے، اس میں لڑکوں کے مضامین کے علاوہ بڑوں کے مضامین بھی ہیں۔ ان بڑوں میں ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر سلامت اللہ، مخدوم محی الدین، سید محمد تونکی، آنند نرائن ملاّ، فراق گورکھپوری کے نام نظر آتے ہیں۔ اس پرچے میں قومی یکجہتی پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تارا چند کا مضمون بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ محمد قاسم صدیقی صاحب، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر ضیاء الدین علوی۔ اطہر پرویز صاحب نے بہت کھل کر اس موضوع پر بہت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

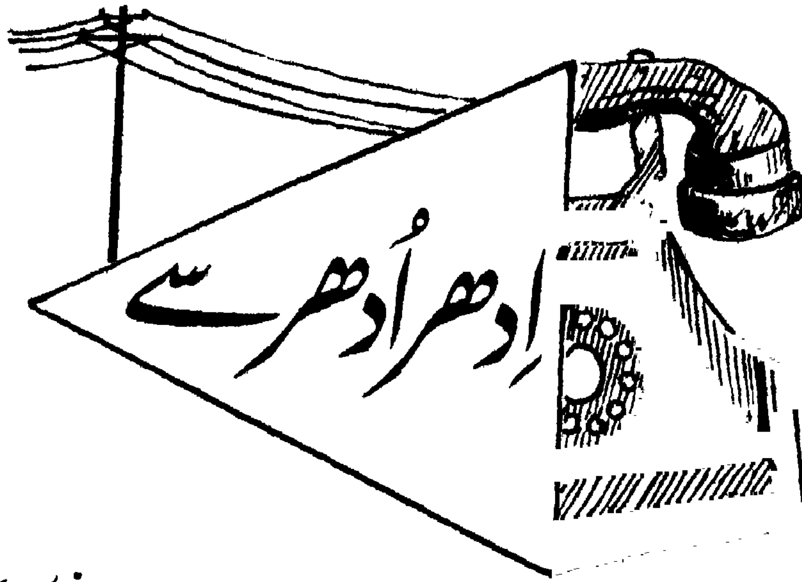
بچوں کے پرچے کی طرح اس پرچے میں بھی زیادہ جگہ لڑکوں کے مضامین نے گھیری ہے۔ چھوٹے بچوں کے "اعتمادیہ" میں کہانیاں زیادہ تھیں اس میں معلوماتی مضمون زیادہ ہیں۔ ادر ادب، تاریخ، سائنس وغیرہ سبھی شعبوں پر حاوی ہیں۔ لڑکوں کے مضامین پڑھ کر دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے ایک تو یہ کہ مضمون نگار نے جس موضوع پر لکھا ہے اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ دوسرے اس میں لکھنے کا سلیقہ ہے۔ اس پرچے میں اردو کے ۱۳۴، انگریزی کے چھیالیس اور ہندی کے ۴۰ صفحے ہیں انگریزی اور ہندی کے حصے بھی بہت کامیاب ہیں۔

یہ پرچہ بھی ایک طرح سے سالنامہ ہے۔ اور اس سالنامے میں لڑکوں کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کا حال بھی تفصیل سے درج ہے انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسکول پرنسپل ایم۔ ایم۔ زیدی صاحب کی نگرانی میں بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ لڑکوں کی زیادتی کی وجہ سے اس کے شفٹ کرنے پڑے ہیں، اور دِلّی میں اور دِلّی سے باہر ہر قسم کے انعامی مقابلوں میں اس مدرسے کے لڑکوں نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ رسالے میں موقع موقع سے بلاک کی بہت سی تصویریں بھی ہیں۔ غرض رسالہ ہر حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔ اس کامیابی پر تسنیم احمد صاحب، غیاث الدین صاحب اور بھارت بھوشن صاحب، اشوک کمار صاحب، محمد مجیب شمس الحق صاحب اور سب سے آخر میں محمد قاسم صدیقی صاحب ایڈیٹر، انچارج دلی مبارک باد قبول کریں۔

گلستانِ ربانی

[illegible] ہائر سکنڈری اسکول کامٹی نے اپنی تیس سالہ زندگی میں پہلی بار یہ میگزین شائع کیا ہے اسے

دسویں اور گیارہویں جماعت کے طالب علموں نے مل کر مرتب کیا ہے۔ اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ تمام مضمون لڑکوں ہی کے ہوں۔ ان طالب علموں نے واقعی بڑی محنت اور لگن سے کام کیا ہے اور اسے معیاری بنانے کا زوردار کوشش کی ہے۔ رسالے میں مضمون بھی ہیں کہانیاں بھی ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں لطیفے ہیں۔ غرض اسکول کے لڑکوں کی یہ پہلی کوشش بڑی حد تک کامیاب اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔



صحافی

خطاب دینے کے تقریب

پیام تعلیم کے کسی پچھلے پرچے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہمارے وائس چانسلر یا شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کو ہند سرکار کی طرف سے پدم بھوشن کا خطاب ملا ہے۔

۲۱ر مئی کو ایک مخصوص جلسہ کیا گیا۔ اور ملک کے ان تمام حضرات کو جنھیں مختلف اعزازوں سے نوازا گیا تھا مدعو کیا گیا۔ اور صدر جمہوریہ ہند نے تمغے اور سندیں عطا فرمائیں۔

جب سے اس اعزاز کا اعلان ہوا ہے۔ مجیب صاحب کے پاس تاروں اور خطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک بزرگ سلام مچھلی شہری نے تو نظم میں مبارک باد دی۔ دو شعر آپ بھی سن لیجیے۔

سرکار نے دیا ہے جو اعزاز انھیں سلام
شامل ہے اس میں ان کے لیے جذبۂ عوام
تبریک ہی کے ساتھ مری یہ دعا بھی ہے
بخشے خدائے پاک انھیں عزّتِ دوام

امریکی خلاباز کا کارنامہ

پیام تعلیم میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ روسی خلاباز لیونوف ۱۸ر مارچ ۱۹۶۵ء کو اپنے خلائی جہاز ووسخود ۲ سے نکل کر دس منٹ تک خلا میں تیرتے رہے۔ اور اپنے اس کارنامے سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اب خبر ملی ہے کہ

امریکی خلاباز ایڈورڈ وہائٹ ۳ رجون ۱۹۶۵ء کو اپنے خلائی جہاز جیمنی ۴ سے زمین سے ۱۸۰ میل کی بلندی پر باہر نکل آئے۔ اور بیس منٹ تک خلا میں تیرتے رہے۔ اور اس طرح خلائی پرواز کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جیمنی ۴ میں ان کے دوسرے ساتھی پائلٹ میکڈیوٹ تھے۔

ایورسٹ کی چوٹی

کوہ پیمائی کی تاریخ میں مئی ۱۹۶۵ء کا مہینہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس مہینے میں کمانڈر ایم۔ ایس کوہلی کی سرکردگی میں ہندوستانی کوہ پیما پارٹی نے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو یکے بعد دیگرے چار بار فتح کیا۔

پہلی بار کیپٹن اے۔ ایس چیما اور نوانگ گو ۲۰ رمئی کو چوٹی پر پہنچے۔ دوسری بار ۲۲ رمئی کو سونم گیاتسو اور سونم وانگیال اور تیسری بار ۲۴ رمئی کو سی۔ پی۔ وہرا اور انگ کامی نے یہ معرکہ سر کیا۔ اس طرح ہماری ٹیم اس امریکی کوہ پیما پارٹی کے برابر آگئی جس نے ۱۹۶۳ء میں ایورسٹ پر تین بار چڑھ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ لیکن ہمارے نوجوانوں نے اس ریکارڈ کو توڑ دیا۔ ۲۹ رمئی کو کیپٹن ایچ۔ ایس۔ آہلووالیا، سی۔ ایس۔ راوت اور پھو دورجی نے چوتھی بار ایورسٹ کو فتح کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی کوہ پیما کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں ہیں۔

(تفصیلی مضمون اگلے پرچے میں۔)

برطانیہ کے چار لڑکے صحارا کی سیاحت پر

صحارا کا ریگستان افریقہ کے شمال میں ہے۔ یہ بہت ویران علاقہ ہے۔ ہر وقت ریت کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ مگر باہمت سیاحوں نے اس ویران سنسان علاقے کو بھی چھان ڈالا ہے۔

اس علاقے میں سفر سچ مچ بڑی ہمت کا کام ہے۔ جدھر نظر اٹھاؤ ریت ہی ریت۔ سبزے کا نام و نشان نہیں۔ پانی کا دور دور پتہ نہیں۔ پھر جس وقت بادِ سموم یا زہریلی ہوا چلتی ہے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

برطانیہ کے ایک اسکول کے چار لڑکوں نے اسی علاقے کی سیاحت کی ٹھانی ہے۔ یہ لڑکے سترہ سے اٹھارہ سال کی عمر کے ہیں۔ آج کل یہ اپنے سفر کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

ہوا یہ کہ ایک دن ایک فوٹو گرافر نے ان کے اسکول میں صحارا کی تصویروں کی نمایش کی اور اس علاقے کی سیاحت پر تقریر بھی کی۔ اس نمایش اور تقریر نے ان لڑکوں کے دلوں میں ولولہ اور شوق پیدا کر دیا۔

۵۰ فٹ لمبی چھپکلی کا ڈھانچہ

دنیا میں آج سے بہت پہلے ـــــ کوئی دس بارہ لاکھ سال پہلے کے جانور سینکڑوں فٹ لمبے اور اونچے ہوتے تھے۔ جانور کیا تھے چلتے پھرتے پہاڑ تھے۔ اُس وقت دنیا میں ہر جگہ بس ویسے ہی جانور پائے جاتے تھے۔ زمانے کے ساتھ یہ جانور بھی ختم ہو گئے۔ اب تو بس کبھی کبھار ان کے ڈھانچے کہیں زمین میں دبے دبائے مل جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس طرح کا ایک ڈھانچہ پاکستان میں ملا ہے۔

مغربی پاکستان میں ایک ضلع کیمبل پور ہے اس ضلع میں تیل کی تلاش میں جگہ جگہ زمین کھودی جا رہی تھی۔ ایک سوکھی ہوئی ندی کے کنارے کھدائی کے دوران ایک عجیب و غریب چیز دکھائی دی۔ یہ ایک لمبی بہت ہی لمبی، چھپکلی کا ڈھانچہ تھا۔ جس کی لمبائی ۵۰ فٹ تھی۔

دُنیا کے اس خطے میں اس ذات کے بڑے جانور کا پورا ڈھانچہ پہلی بار ملا ہے۔

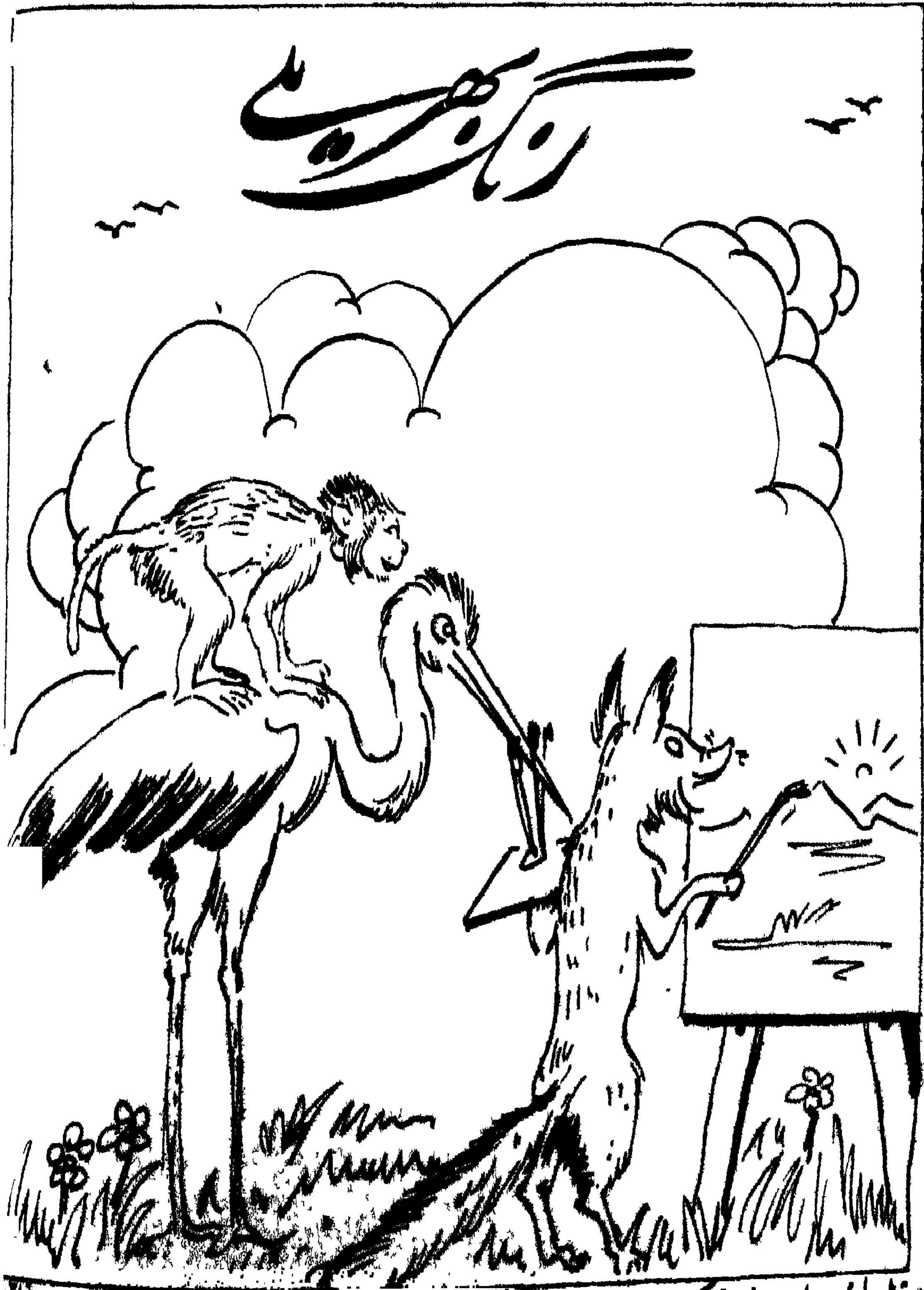
(بقایا سچی دوستی)

دوانگ لی اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ لو وہونے چاے ختم کر کے پیالی نیچے رکھی ہی تھی کہ ایک عورت کمرے کے اندر آئی۔ جب وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تو حیرت کے مارے وہ سکتے میں آگیا۔ یہ عورت چاؤ لانگ ہی تھی۔ دوانگ لی نے اسے ساری باتیں سمجھا دیں۔ اس نے اپنی بیوی کو اس کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ اس کے ساتھ ہمدردی کرے اور اس کی ہمت بندھائے، اس وقت تک کہ وہ امتحانات میں کامیاب ہو۔ اس کی یہ قربانی دوستی کی خاطر تھی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]



پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا [illegible] مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع کیا



کرسیوں پر دائیں سے بائیں۔

رئیس الدین ہاشمی ٹیچر (مشیر خاص)، شوکت پٹھان، یازدہم (صدر)، عبدالجلیل قاصی، دہم (اسپیکر)

عبدالرزاق دلوی، یازدہم (وزیر داخلہ)، عبدالقادر عمر ساٹھے، دہم (وزیر اعظم وخارجہ)

کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں:

یوسف آدم داکھوے یازدہم (وزیر نشر و اشاعت)، عبدالقادر کرجیکر، دہم (مارشل)، حمزہ محمد ساٹھے، یازدہم

اخلاق حسین پرکار، یازدہم (وزیر سوشل اینڈ کلچرل ایکٹیوٹیز)، یوسف ملگھر کر، نہم (وزیر مالیات)، (وزیر منصوبہ بندی)

عبدالقادر مایکر، یازدہم (وزیر ثقافت)، عبدالمجید خاں دیشمکھ (وزیر صفائی وصحت)، فدا علی شیخ ناگ، نہم (وزیر تعلیم)

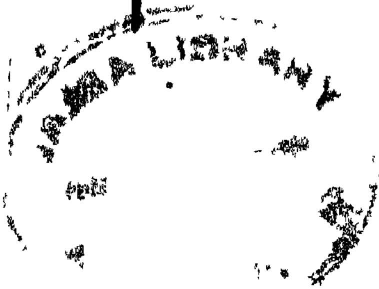
آخری لائن میں:

نذیر آدم چاوڈکر، یازدہم (لیڈر حزب مخالف)

1965. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem
New Delhi-25.

پیامِ تعلیم



فاتحانِ ایورسٹ

اپنے لیڈر، ڈپٹی لیڈر

اور

شیرپا سردار کے ساتھ

دائیں سے بائیں:

۱۔ نوانگ گمبو، کیپٹن چیما اور کمانڈر کوہلی (لیڈر)

۲۔ سونم ونگیال، سونم گیاتسو اور میجر اہلووالیا (ڈپٹی لیڈر)

۳۔ انگ کامی، شری راوت اور انگ شیرنگ (شیرپا سردار)

۴۔ شری راوت، کیپٹن اہلووالیا اور شری پھو دورجی



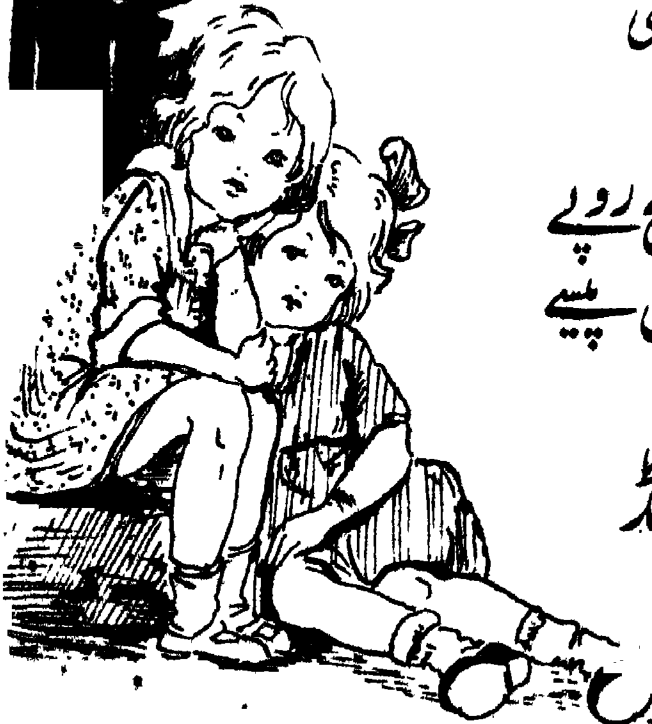
اختر حسین فاروقی مرحوم

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۲ — اگست ۱۹۶۵ء — شمارہ ۸

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی



سالانہ چندہ : — پانچ روپے
فی پرچہ : — پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵


فہرست



گرمی کی لمبی چھٹیوں کے بعد جامعہ پھر کھل گئی، کالج بھی، استادوں کا مدرسہ بھی، رورل انسٹی ٹیوٹ بھی، آرٹ انسٹی ٹیوٹ بھی، مدرسہ ثانوی اور مدرسہ ابتدائی بھی۔ ایک دن پہلے جامعہ میں سناٹا تھا پر اب ہر طرف چہل پہل ہے۔ جدھر دیکھیے نئے پرانے طالب علموں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ بارش کے چھینٹوں نے اس فضا کو اور بھی خوشگوار بنا دیا ہے۔

پر جامعہ کھلنے سے دو دن پہلے ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ جامعہ کے بہت پرانے رفیق اور بہت ہی پرانے استاد اختر فاروقی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ان چھٹیوں میں اپنے وطن لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے چھٹیاں ختم ہونے کے بعد دہلی آنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ ٹکٹ خرید لیا گیا تھا۔ اسباب اسٹیشن بھیجا جا چکا تھا۔ اسٹیشن جانے سے پہلے نہانے کے لیے غسل خانے میں گئے۔ بہت دیر ہو گئی۔ عزیزوں کو فکر ہوئی دروازہ کھٹ کھٹایا کوئی جواب نہ ملا۔ پریشانی بڑھی دروازے کے جھروکوں میں سے جھانک کر دیکھا — سکتے میں آ گئے۔ دہلی کا مسافر آخرت کا سفر اختیار کر چکا تھا۔

مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا انھیں دل سے چاہتا تھا اسی لیے جامعہ کی برادری کو ان کی اس اچانک جدائی کا غم بہت گہرا ہے۔ مرحوم پر ایک تفصیلی

مضمون اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

آپ نے پیام تعلیم کا پرچہ بہت پسند کیا ۔ بندروں کی لڑائی، ماں اور جگنو، بچارا شاعر، سچ مقبول، سچی دوستی، اینڈرسن، سزا کوے وادا کی خاص طور پر تعریفیں آئی ہیں۔ بچارا شاعر سچ مچ بہت سے پیامیوں کی تفریح کا سبب بنا۔ ایسے آپ چاہیں تو کچھ گھٹا بڑھا کر ڈرامے کی طرح کھیل سکتے ہیں۔ گڑیا کا گلاس بھی خاصی چیز ہے ۔

محترمہ ہاجرہ بیگم کی ایک کہانی دھنک آپ نے کسی پچھلے پرچے میں پڑھی ہوگی۔ محترمہ پیام تعلیم کی شروع سے سرپرستی فرما رہی ہیں۔ اسے وہ اپنا پرچہ کہتی ہیں۔ کچھ عرصہ تک اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس کے لیے کچھ بھیج نہ سکی تھیں۔ اس کی تلافی انھوں نے یوں کی ہے کہ اپنے لکھے ہوئے گیتوں کا پورا مجموعہ بھیج دیا ہے۔ اپنے ایک ساتھی سہگل صاحب کی بڑی قیمتی کتاب کا مسودہ بھیجا ہے۔ اور ایک بہت اچھا مضمون ماسکو سے (اردو میں) لکھوا کر بھجوایا ہے۔ اگلے پرچے سے ان کا سلسلہ شروع ہوگا۔

محترمہ ہاجرہ بیگم آج کل ماسکو اور فن لینڈ کی سیاحت پر تشریف لے گئی ہیں۔ وہ سفر کے حالات پیام تعلیم کے لیے لکھ کر بھیجیں گی۔

حالی نمبر کے انعامی مقابلے کے سلسلے میں افسوس ہے کہ گنتی کے مضمون آئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ محترم رشید صاحب کے اعلان کو دیکھ کر نہیں لکھے گئے ہیں۔ ہم اپنے پیامیوں کو کچھ دنوں کی مہلت اور دیتے ہیں۔ ۲۰/اگست بالکل آخری تاریخ ہے۔ مضمون لکھنے سے پہلے حالی نمبر میں محترم رشید صدیقی صاحب کا اعلان ضرور پڑھ لیں۔

پیام تعلیم کا چندہ منی آرڈر سے بھیجنے میں

آپ کا فائدہ ہے!

وی پی کے ذریعہ پرچہ منگوانے میں ۶۵ پیسے زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور اکثر غیر معمولی تاخیر بھی ہوتی ہے۔ منیجر

جناب دلکش آفریدی

خوش آیند

میرے بچّو! مری دُنیا کے حسیں شہزادو!
کتنا معصوم ہے، پیارا ہے، تمھارا بچپن
زیست کے روشن و تاریک طلسمات سے دُور
ہے نظر زیب کھلونوں کے تصوّر میں مگن

ہاں مگر کل یہ شب و روز بدل جائیں گے
وقت کی گود میں سو جائے گا بچپن کا شعور
مشعلِ علم و ہنر ذہن میں روشن ہوگی
جاگ اُٹھے گا نگاہوں میں بصیرت کا غرور

اور تم جذبۂ ایثار و محبّت لے کر
مُلک اور قوم کی تعمیر میں لگ جاؤ گے
زندگانی کی ہر اِک دَوڑ میں آگے رہ کر
اپنے اسلاف کی تاریخ کو دُہراؤ گے

یہ دُعا ہے مری اِس کارگہِ ہستی میں
مہرِ تاباں سے تمھارا ہو سوا مُستقبل
زیست کی راہ نوردی تمھیں راس آجائے
خود ہی قدموں میں چلی آئے تمھاری منزل

جناب شمیم حنفی

بچّوں کے اقبالؔ



آئیے ! آج آپ سے علاّمہ اقبالؔ کی باتیں کی جائیں۔

یوں تو آپ نے ان کے بارے میں اپنے بزرگوں اور استادوں سے بہت کچھ سُنا ہوگا۔ آپ نے ان کی وہ نظمیں بھی سنی ہوں گی یا پڑھی ہوں گی جو انھوں نے خاص طور سے آپ ہی لوگوں کے لیے لکھی تھیں۔ ان کی نظموں کے پہلے مجموعے "بانگِ درا" میں کئی چھوٹی چھوٹی اور بہت اچھی نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں ڈاکٹر صاحب نے بہت میٹھی، بہت آسان زبان میں لکھی ہیں تاکہ بچّے انھیں مزے لے کر پڑھیں، انھیں اچھی طرح سمجھیں اور دل چسپی کے ساتھ ان نظموں میں بیان کی ہوئی سبق آموز باتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسی ہی نظموں میں ایک نظم "دعا" ہے جس کا پہلا شعر ہے:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یہ نظم تو آپ میں سے بہتوں کو یاد ہوگی۔ اگر آپ کو نہ یاد ہو تو یاد کر لیجیے۔ بڑی پیاری نظم ہے اور اکثر مدرسوں میں ترانے کے طور پر گائی جاتی ہے۔

علاّمہ اقبالؔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے شاعر کہ ان کی شاعری نے ہماری زبان اردو کا ساری دُنیا میں سر اونچا کر دیا۔ علاّمہ اقبالؔ کو اپنی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ اردو ہی کیا دنیا کی بڑی زبانوں کے گنے چنے شاعروں کے حصّے میں آئی ہے۔ علاّمہ اقبالؔ پر اب تک سیکڑوں کتابیں

لکھی جا چکی ہیں۔ مضامین کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔ ان کی نظموں کے ترجمے دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اب بھی ان کی شاعری اور زندگی پر برابر نئی نئی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

آپ جیسے جیسے بڑے ہوتے جائیں گے اور ترقی کرتے ہوئے ایک درجے سے دوسرے درجے میں پہنچتے جائیں گے علّامہ اقبالؔ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں آپ کی واقفیت بھی بڑھتی جائے گی۔ آج ہم آپ کو یہ بتائیں کہ علّامہ اقبالؔ کو بچّوں سے کتنی دل چسپی تھی۔ اس دل چسپی کا سب سے بڑا ثبوت ان کی وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔ آپ اگر وہ نظمیں پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان نظموں میں کتنا پیار بھرا ہوا ہے۔

خود علّامہ اقبالؔ کے بچپن میں ان کے والدین نے ان کی تربیت کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا۔ علّامہ اقبالؔ کے والد بے حد نیک اور ایمان دار آدمی تھے۔ بے حد محنتی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر علّامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے سب کو نیکی، سچّائی، ایمان داری، اپنے آپ پر بھروسہ کرنے، اپنے آپ کو پہچاننے اور سستی و کاہلی کو چھوڑ کر محنت و مشقّت کرنے کی تعلیم دی۔ یہی خوبیاں انسان کی زندگی کو سنوارتی ہیں اور اسے کامیاب بناتی ہیں۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ علّامہ اقبالؔ دین کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ انھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر انگلستان اور جرمنی میں بھی اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اللہ کے نام اور اس کے پیغام کو ہمیشہ یاد رکھا۔ ایک بار علّامہ اقبالؔ کے والد نے ان سے یہ کہا تھا کہ جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو یہ سمجھو کہ اللہ میاں تم ہی سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ علّامہ اقبالؔ کے بچپن کا ہے لیکن بڑے کیا بوڑھے ہو کر بھی انھوں نے ہمیشہ یہ بات یاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ پوری توجہ اور دل چسپی کے ساتھ تلاوت کرتے تھے۔

علّامہ اقبالؔ کو دنیا کے سب سے بڑے انسان، ہمارے رسول حضرت محمد صلعم سے بھی اتنی محبّت اور عقیدت تھی کہ ان کا نام سنتے ہی بے قرار ہو جاتے تھے۔

اچھا آدمی وہی ہے جو اپنے دین سے محبّت کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذہبوں کا بھی سچّے دل سے احترام کرے۔ ایسا آدمی روشن خیال کہلاتا

ہے۔ اور اسے تنگ نظر سمجھنے والے کو ہر سمجھ دار انسان جاہل سمجھتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی بہت سی ایسی نظمیں کہی ہیں جن سے دوسرے مذہبوں کے بزرگوں کے لیے ان کے احترام کا پتہ چلتا ہے۔

اپنے بیٹے جاوید اور بیٹی منیرہ کو علامہ اقبال بہت چاہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو باپ اپنے بچوں کو پیار کرے اُسے تمام بچے پیارے لگیں گے۔ علامہ اقبال نے شروع سے یہ کوشش کی کہ اپنے بچوں کو بھی اچھے اخلاق اور کردار کا انسان بنائیں۔ ان کی تعلیم کی طرف وہ خود توجہ دیتے تھے۔ ایک یورپین گورنس ملازم رکھی تھی۔ جو ان بچوں کو انگریزی سکھا سکے کیوں کہ آج کی دنیا میں علم حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ خود علامہ اقبال بھی انھیں برابر پڑھاتے تھے، ان کا کام دیکھتے تھے، ان کے سبق سنتے تھے اور ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں لاتے تھے۔

علامہ اقبال کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے جاوید اچھے مقرر بنیں۔ تقریر کرنا واقعی ایک فن ہے جس کے ذریعے دوسروں کو متاثر کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اچھی باتیں دوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔ اکثر فرصت کے اوقات میں علامہ اقبال جاوید کو ایک میز پر کھڑا کر دیتے اور کہتے کہ اپنا یاد کیا ہوا سبق تقریر کے انداز میں سناؤ۔ اسی تربیت کا اثر ہے کہ یہی جاوید میاں آگے چل کر جاوید اقبال کے نام سے بیرسٹر بنے اور آج کل پاکستان میں ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

بہت سے بچوں میں بات بات پر رونے اور مچلنے کی عادت ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کو یہ عادت سخت ناپسند تھی۔ جب کبھی جاوید کسی بات پر روتے تو علامہ اقبال انھیں چمکارنے کے بجائے صرف یہ کہتے کہ "تم مرد ہو! تمھیں روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" ان کی اس بات نے ان کے بچوں پر گہرا اثر ڈالا۔ علامہ اقبال کی وفات پر جاوید صاحب نے ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال کی وفات کے وقت ان کی اور ان کی بہن منیرہ کی عمر بہت کم تھی۔ لیکن ایک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی اپنے شفیق باپ کی لاش دیکھ کر بھی وہ دونوں روتے روتے اچانک رک گئے انھیں علامہ اقبال کی وہی بات یاد آ گئی تھی۔

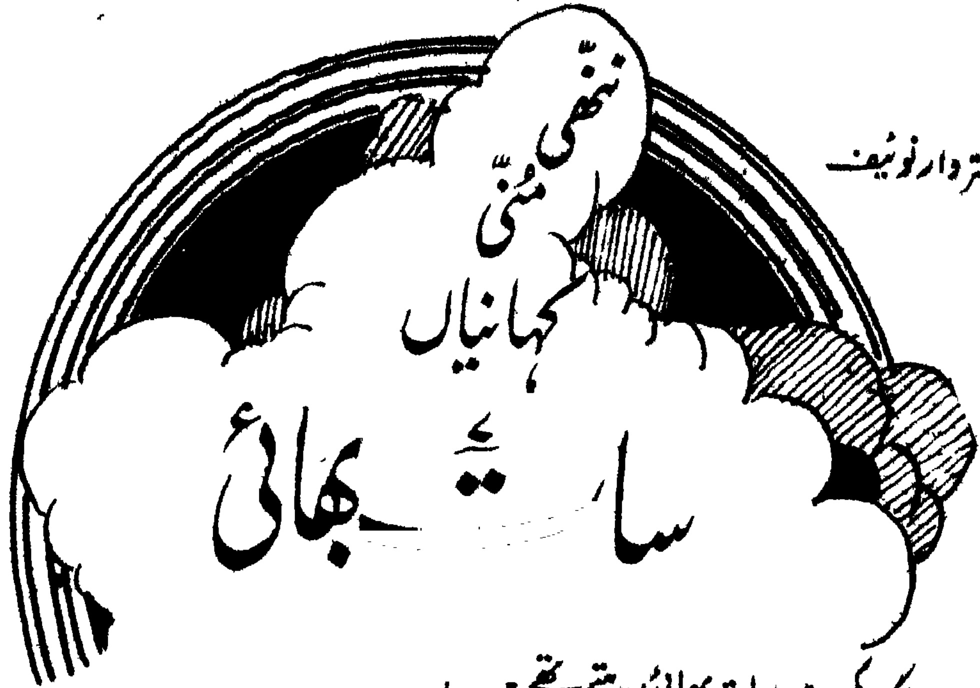
جس زمانے میں علامہ اقبال انگلستان میں

تھے جاوید صاحب کی عمر بھی کوئی چھ سات برس کی تھی۔ انھوں نے علامہ اقبال کو پہلے پہل اپنے ہاتھ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خط لکھا جواب میں علامہ اقبال نے انھیں ایک بہت پیاری سی نظم بھیجی۔ یہ نظم ہم نے اپنے بچپن میں یاد کی تھی اور اب تک یاد ہے۔ آپ بھی سنیے اور یہ دیکھیے کہ نظم کے ایک ایک لفظ میں اچھی باتوں کے کتنے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ شاید کہیں کہیں نظم سمجھنے میں آپ کو دشواری ہو۔ ایسے موقعوں پر اپنے گھر کے کسی بزرگ یا اپنے استاد سے مدد لینے میں شرمائیے گا نہیں۔ اچھا اب نظم سنیے :۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یہ نظم علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کو لکھ کر بھیجی تھی لیکن اچھے انسان کی زندگی اور اس کی باتوں پر صرف اس کے عزیزوں کا حق نہیں ہوتا۔ وہ تو پورے ملک بلکہ پوری دنیا کی دولت ہے۔ سبھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے یہ نظم بھی اپنے مجموعے "بانگِ درا" میں شامل کر دی ہے تاکہ بہت سی نظموں کے ساتھ ساتھ بچے اس نظم کا لطف بھی اٹھا سکیں۔

ابھی حال ہی میں کچھ ایسی ریڈروں کا بھی پتہ چلا ہے جو علامہ اقبال نے بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ان کتابوں کے لکھنے والے ڈاکٹر اقبال کوئی دوسرے ہیں لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ کتابیں بھی ہمارے علامہ اقبال ہی نے لکھیں۔ ہم نے ابھی تک یہ کتابیں نہیں دیکھیں۔ آپ انھیں تلاش کیجیے اور ضرور پڑھیے۔ یقیناً ان میں بھی ویسی ہی اچھی اچھی باتیں ہوں گی جو ان کی نظموں میں ہیں۔ علامہ اقبال بچوں سے پیار کرتے تھے اسی لیے ان کے لیے اتنی نظمیں اور کتابیں لکھیں۔ اب بچوں کو بھی چاہیے کہ انھیں پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر آپ بھی ویسی ہی شہرت اور عزت حاصل کر سکیں جو علامہ اقبال کو ملی۔



وکٹر وار نو بیف

ایک بکس میں سات بھائی رہتے تھے۔
پہلے کا رنگ سرخ تھا۔ دوسرے کا نارنجی تھا،
تیسرا زرد، چوتھا سبز، پانچواں ہلکا نیلا، چھٹا گہرا
نیلا اور ساتواں بنفشی رنگ کا تھا۔ وہ اپنے
مکان میں بہت آرام اور سکون سے رہتے تھے۔
ایک روز انھوں نے باہر جھانکا لیکن
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بتا دیں کہ ساتوں پیارے [illegible]
وہ وہاں سے باہر نکل گئے اور [illegible]
"اب ہمیں کچھ کام کرنا چاہیے۔ آؤ ہم ایک
بڑا اور دلکش گھر بنائیں!"
گہرے نیلے رنگ کے بھائی نے ایک نیلے
مکان کی تصویر بنائی۔
"دنیا میں کسی جگہ نیلے رنگ کے مکان نہیں
ہوتے" دوسرے بھائی چیخ اٹھے۔
پھر سرخ بھائی نے جلدی سے کچھ لکیریں
کھینچیں۔ اور اس نے سرخ مکان بنا دیا۔ یہ مکان
خوب صورت نظر آرہا تھا۔
سب بھائی چلا اٹھے "واہ! بالکل اس
[illegible] کی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے!"
[illegible] ہے، مجھے معلوم ہے" ہرے بھائی
نے چیخ کر کہا اور مکان کی چھت میں خوب صورت

رنگ بھر دیا۔ اب چھت ہری نظر آ رہی تھی۔ اسے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے باغ میں گھاس اور خوب صورت ہرے درخت بھی دکھا دیے۔

سب بھائی چیخ اٹھے "یہ گھاس اتنی نرم اور تازہ ہے کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے سے ڈرتے ہیں۔ ہم کھیلیں گے کہاں!"

زرد بھائی نے پیلے رنگ کا ایک راستہ بنایا اور کہا "تم یہاں چل سکتے ہو۔ یہاں خوب دوڑو!"

"بھئی واہ! کتنا خوب صورت منظر ہے! پر بھئی یہ تو اچھی بات نہیں کہ ہم اس ساری خوب صورتی کو اپنے تک ہی رکھیں۔ یہ دوسروں کو بھی دکھانی چاہیے!"

اور اس نے اوپر چمکتا ہوا نارنجی سورج بنا دیا۔ تصویر اب زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔

ہلکے نیلے رنگ کے بھائی نے کہا "لیکن آسمان کہاں ہے؟ ہمارے گھر کے اوپر صاف آسمان ہونا چاہیے!" اور اس نے فوراً آسمان بنا دیا۔

صرف گہرے نیلے رنگ کا بھائی اداس ہو گیا۔

"تم یہ کیوں کہتے ہو کہ گہرے نیلے رنگ کے مکان نہیں ہو سکتے! کیا تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں کسی کام کے لائق نہیں؟"

اور اس نے ایک نیلا دریا بنا دیا جو دنیا کا سب سے نیلا دریا تھا۔

"اور میرے متعلق کیا خیال ہے؟" بنفشی رنگ کا بھائی چیخا۔

اور اس کے آنسو نرم ہری گھاس پر گر پڑے اور باغ میں بنفشی رنگ کے خوشبودار پھول کھل اٹھے۔ اس کے بعد وہ سب بیٹھ گئے اور انھوں نے اپنی ممی کو خط لکھا۔ بس ایک ہی جملہ لکھا۔

"پیاری ممی! ہم آپ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں!" اور پھر خط کے نیچے باری باری دستخط کیے سب سے پہلے سرخ بھائی نے، اس کے بعد نارنجی، زرد، سبز، ہلکے نیلے، گہرے نیلے اور بنفشی رنگ والے بھائی نے۔

"اچھا بتاییے ان کی ممی کون ہو سکتی ہے؟"

"کہیں دھنک تو نہیں۔"

"ہاں بھئی، دھنک! دھنک!! یقیناً دھنک!!!"



خوش نصیب لڑکا

جناب برق بہاری

کہتے ہیں کہ رہتا تھا
اِک لڑکا یہودی کا
خدمت میں محمدؐ کی
بیمار اُسے سُن کر
اِک بار یہی سرور
جاتے ہیں عیادت کو

الفاظِ تشفّی سے
کلماتِ تسلّی سے
کرتے ہیں اسے شاداں
بیمار کی خوش بختی
خود آئے مسیحا ہی
دارو ئے شفا بن کر

اُستاد کی عزّت



آج کل علم دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا ہے۔ امیر غریب، چھوٹا بڑا، کہتر و بہتر سب کے لیے یہ دولت عام ہو گئی ہے۔ کتنی اچھّی بات ہے! پر کیا اسی نسبت سے پڑھنے والوں یا طالب علموں کے دلوں میں اُستاد کی عزّت بھی بڑھ رہی ہے؟ شاید ہم آپ اس کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکیں۔

ہمارے دیس ہندوستان بلکہ پورے برِّ اعظم ایشیا میں ہمیشہ سے گرو یا اُستاد کا بہت بڑا درجہ رہا ہے۔ آئیے ہم آج آپ کو کسی اور دیس کے نہیں خود اپنے دیس ہندوستان کے اُستادوں اور شاگردوں کے آپس کے تعلقات کے کچھ واقعات سُنائیں۔

آپ نے اورنگ زیب عالم گیر کا نام تو سُنا ہوگا۔ وہ مغل خاندان کا آخری بڑا بادشاہ تھا۔ اورنگ زیب مُلّا جیون کا شاگرد تھا۔ لکھنؤ کے پاس ایک قصبہ امیٹھی ہے مُلّا جیون اسی قصبے میں رہتے تھے۔

اورنگ زیب جب بادشاہ ہوگیا تو اس نے کئی بار مُلّا جی کو دلّی آنے کی دعوت دی۔ آخر مُلّا جیون راضی ہو گئے۔ اور اپنی والدہ سے عرض کیا بادشاہ کو دینے کے لیے کوئی تحفہ تیار کر دیجیے۔

ان کی والدہ نے سوت کات کات کر کپڑے کا ایک تھان تیار کیا اور جب مُلّا جی سفر کے لیے روانہ ہونے لگے تو گُڑ تیل کے گُل گُلے مٹی کی ہانڈی میں بند کرکے اوپرے آٹا لیپ دیا۔

مُلّا جیون بیل گاڑی میں بیٹھ، دہلی کی طرف چل پڑے۔ لکھنؤ اور دہلی میں لگ بھگ تین سو میل کا فاصلہ ہے۔ اب آپ خود سوچیے بیل گاڑی نے کتنے دنوں میں انھیں دلّی پہنچایا ہوگا۔ اور ہانڈی کے گُل گُلوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

خیر صاحب مُلّا جیون دلّی پہنچے تو شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اُستاد کی بہت آؤ بھگت کی۔ کھدر کا تھان تو توشہ خانہ خاص میں داخل کرا دیا اور شاہی باورچی خانے کے افسر کو حکم دیا کہ ہانڈی دسترخوان پر لگائی جائے۔

شاہی دسترخوان پر اورنگ زیب نے ہانڈی خود اپنے ہاتھ سے کھولی اور گُل گُلے کا نوالہ منہ میں رکھا۔ نوالے کا منہ میں رکھنا تھا کہ ابکائی آگئی اور نوالہ منہ سے نکل کر دسترخوان پر گر پڑا۔

یہ دیکھ کر مُلّا جیون نے کہا:— "کیوں اورنگ زیب حکومت کے حرام نوالے کھا کھا کر حلال رزق حلق سے نیچے نہیں اُترتا؟"

اورنگ زیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولا: "آپ سچ فرماتے ہیں۔"

★

مولانا محمد حسین آزاد کا نام آپ نے سُنا ہوگا اُردو کے مشہور شاعر اور آبِ حیات کے مصنّف تھے۔ یہ شاعری میں استاد ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ آخر عمر تک اپنے استاد کا کلمہ پڑھتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فوجی ان کے گھر میں گھس آئے اور ان سے کہا، جلد یہاں سے نکلو اب آگے کی بات خود نھی کی زبانی سُنیے۔

"دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی (اُستاد ذوق کی) غزلوں پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے

پیدا ہوں گے جو اگر دوسرے عزیں کہیں گے وہی
بچّہ بغل میں مارا اور نکل کھڑا ہوا۔"

★

علامہ شبلی نعمانی اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب اور مصنّف تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ یہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اسی اعظم گڑھ کے پاس ایک مشہور قصبہ ہے چڑیاکوٹ۔ یہ علامہ فاروق چڑیاکوٹی کا وطن تھا۔ عربی ادب اور فلسفے میں اُن کی دُور دُور شہرت تھی۔ یہ مولانا شبلی کے اُستاد تھے اور مولانا ان کا بے حد ادب کرتے تھے۔ دو دلچسپ واقعات آپ بھی سُن لیجیے۔

مولانا شبلی دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتمد تعلیم بنائے گئے۔ مولانا کو دُھن تھی کہ ندوے میں مانے کے مشہور اور فاضل ترین لوگوں کو اُستاد یا جائے۔ اسی سلسلے میں علامہ فاروق چڑیاکوٹی ادب پڑھانے کے لیے نہ جانے کیسے ندوے لے آئے۔

ایک بار مولانا شبلی معتمد تعلیم کی حیثیت دارالعلوم ندوۃ العلما کا معائنہ فرما رہے تھے، ساتھ تھا۔ مختلف درجوں کا معائنہ کرتے ہوئے شبلی علامہ فاروق چڑیاکوٹی کے درجے میں پہنچے۔



علامہ چڑیاکوٹی اُس وقت ادب کی کوئی ابتدائی کتاب پڑھا رہے تھے مولانا شبلی ادب کے ساتھ طالب علموں کی صف میں بیٹھ گئے۔

علامہ چڑیاکوٹی نے انھیں دیکھ کر کہا: "شبلی تو نے یہ کتاب لڑکپن میں پڑھی تھی سمجھ میں نہ آئی ہوگی اب اچھی طرح پڑھ لے۔"

مولانا نے عرض کیا: "بجا ارشاد ہے حضرت میری یہی آرزو ہے کہ حاضرِ خدمت ہو کر کچھ حاصل کرتا رہوں مگر ندوے کے کام مہلت نہیں دیتے۔"

علامہ چڑیاکوٹی ایک ٹانگ پھیلائے بیٹھے تھے۔ مولانا شبلی نے مزاج پوچھا۔ فرمایا:
"رات سے درد کی شکایت ہوگئی ہے۔"

مولانا شبلی اپنی جگہ سے اُٹھ کر پاؤں دبانے

گئے اور علامہ چڑیا کوٹی اسی طرح سبق پڑھاتے رہے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی دل چسپ ہے۔

مولانا شبلی بھوپال میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے عیش باغ کے بالاخانے پر قیام تھا منشی محمد امین زبیری صاحب میزبان کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت ایک تانگا بالاخانے کے نیچے آکر رکا۔ تانگے میں ایک بڑے میاں بیٹھے تھے۔ انھوں نے محمد امین صاحب سے پوچھا: "کیا یہاں شبلی ٹھیرا ہوا ہے؟"

محمد امین صاحب بھونچکے سے ہو گئے تعجب سے پوچھا: "آپ کسے دریافت کر رہے ہیں"۔ بڑے میاں نے جواب دیا: "وہی لڑکا شبلی"۔

محمد امین صاحب نے اوپر جاکر بات بتائی۔ مولانا شبلی نے حلیہ معلوم کر کے کہا: "ارے وہ تو میرے اُستاد مولانا فاروق صاحب ہیں"۔ محمد امین صاحب انھیں لینے چلے مولانا نے انھیں روک دیا جلدی سے بیساکھی اٹھائی (ایک حادثے میں مولانا کا پاؤں کٹ گیا تھا) اور تیز تیز زینے سے اُتر کر علامہ فاروق چڑیا کوٹی کو اوپر لائے۔ انھوں نے فرمایا: "میں بھوپال کے راستے سے گزر رہا تھا یہ خیال کر کے کہ خدا معلوم پھر کب ملاقات ہو سفر ملتوی کر دیا"۔

مولانا شبلی علامہ کے سامنے بچھے جاتے تھے اور شکریہ ادا کرتے کرتے منھ سوکھا جا رہا تھا۔



علامہ اقبال کو اپنے اُستاد علامہ میر حسن سے بڑی عقیدت تھی۔ انگریزی حکومت نے علامہ کو سر کا خطاب دینا چاہا تو آپ نے یہ شرط لگائی کہ پہلے میرے اُستاد کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے۔

حکومت کی طرف سے یہ عذر پیش کیا گیا کہ یہ خطاب صاحبِ تصنیف عالموں کو دیا جاتا ہے۔

علامہ نے جواب دیا کہ مولوی صاحب کی سب سے بڑی زندہ تصنیف میں موجود ہوں اس سے بہتر حکومت کیا تصنیف دیکھنا چاہتی ہے۔ غرض مولوی صاحب کو شمس العلما کا خطاب مل جانے کے بعد علامہ نے سر کا خطاب قبول کیا۔



جناب غلام حسن فوق فاروقی



علم کی کہانی

علم کی آؤ سناؤں میں کہانی تم کو
غور سے بچو ذرا تم یہ کہانی سن لو

علم انسان کو تہذیب سکھا دیتا ہے
علم کا نور دماغوں کو ضیا دیتا ہے

علم نے امن و محبّت کی ہمیں دی تعلیم
علم کہتا ہے کرو اپنے بڑوں کی تعظیم

اپنے اُستاد کی خدمت کرو جی جان سے تم
علم کی رہ میں چلو بس اسی عنوان سے تم

علم کہتا ہے کہ تم جھوٹ سے غیبت سے بچو
تم مصائب میں نہ سچّائی کا دامن چھوڑو

بچو تم خوب پڑھو صاحبِ کردار بنو
تیرگی کے لیے خورشیدِ سحر بار بنو

جناب محمود جمال الدین

سمندری جگنو



آپ نے جگنو تو دیکھا ہوگا ننھا منا سا چمکدار کیڑا۔ جو ہوا میں اڑتا بھی ہے اور جب بہت سے جگنو ایک ساتھ اڑتے ہیں تو کیسا اچھا لگتا ہے جیسے آتش بازی چھوٹ رہی ہو پر آج تو ہم آپ کو ایک ایسے جگنو کا حال سناتے ہیں جو خشکی پر نہیں بلکہ پانی میں ہوتا ہے پانی بھی سمندر کا۔

یہ سمندری جگنو کیا ہے؟

جگنو مچھلی ہے جگنو مچھلی سمندر کی کافی گہرائی میں پائی جاتی ہے سورج کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچ پاتی اس لیے یہاں کے پانی کا رنگ کافی کالا ہوتا ہے کالا بھی اور ٹھنڈا بھی ـــــ ان مچھلیوں کے جسم پر چمک دار دھبے پائے جاتے ہیں۔ یہ دھبے جگنو کی دُم کی طرح روشن ہوتے ہیں ان دھبوں سے نکلنے والی روشنی میں گرمی بالکل نہیں ہوتی۔ یہ بڑی ٹھنڈی روشنی ہوتی ہے۔

تم نے رات میں روشن رہنے والی گھڑیاں تو بہت دیکھی ہوں گی ان مچھلیوں کے دھبوں سے نکلنے والی روشنی بھی روشن ڈائیل والی گھڑیوں جیسی ہوتی ہے۔ شاید تمھیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جگنو کی روشنی اصل میں اس کے جسم کے اُس حصے میں فاسفورس کی موجودگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ روشنی والا ایک مادّہ ہوتا ہے۔ جگنو مچھلیوں میں بھی روشنی اسی فاسفورس کی وجہ سے ہوتی ہے۔

جگنو مچھلی دو چار انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی۔ بعض مچھلیوں پر تو چمک دار دھبے ہوتے ہیں اور بعض پر چمک دار دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ دھبّے اور یہ لکیریں یا دھاریاں پوری کی پوری روشن رہتی ہیں۔ دُم پر بھی کئی روشن

دھبے ہوتے ہیں یا کم از کم ایک دھبہ تو ضرور ہوتا ہے۔

تم نے ریل کے انجن تو دیکھے ہوں گے ریل کے انجن کے ماتھے پر ایک بہت بڑا لیمپ ہوتا ہے جو دور، دور تک روشنی دیتا ہے۔ ایسے ہی جگنو مچھلی کی تھوتنی پر ایک بڑا روشن دھبا ہوتا ہے اس کی روشنی بھی کافی دور تک جاتی ہے جس طرح ریل کا انجن اپنے ماتھے کے لیمپ کی روشنی میں دور دور تک دیکھتا ہے۔ اسی طرح یہ مچھلی بھی سمندر کی تاریک تہہ میں اپنی تھوتنی کے روشن دھبے کی مدد سے اپنے آگے دیکھ سکتی ہے اور یک بیک روشنی پیدا کر کے یہ مچھلی اپنے حریفوں کو ڈرانے اور بھگا دینے کا کام بھی لیتی ہے۔ اس کے سوا اپنے شکار پر بھی قابو پانے کے لیے یہ روشنی اس کی بڑی مدد کرتی ہے۔

جگنو مچھلی کا رنگ عموماً سیاہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جامنی اور بھورا بھی دیکھا گیا ہے۔ ان مچھلیوں کی آنکھیں دوسری عام مچھلیوں کی بہ نسبت بہت بڑی ہوتی ہیں۔ کتے کی ایک مشہور قسم "بل ڈاگ" تو تم نے دیکھی ہوگی ان مچھلیوں کا منہ بالکل "بل ڈاگ" جیسا ہوتا ہے۔ منہ کھول کر دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک غار ہے، اس غار میں چٹانوں کی بجائے شیر جیسے نکیلے خنجر نما دانت ہوتے ہیں۔ جگنو مچھلی سمندر میں پائے جانے والے چھوٹے موٹے کیڑوں کو کھاتی اور اسی پر زندگی بسر کرتی ہے۔

جگنو مچھلیاں ہمیشہ سمندر کی تہہ میں رہتی ہیں جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ پاتی۔ اس لیے ان کی آنکھیں تیز روشنی برداشت نہیں کر سکتیں۔

رات ہو یا آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو کبھی کبھار سمندر کی سطح پر آجاتی ہیں لیکن فوراً ہی ایسا غوطہ لگاتی ہیں کہ سمندر کی تہہ میں جا کر دم لیتی ہیں۔

جگنو مچھلی کو انگریزی میں "LANTERN FISH" کہتے ہیں جس کا اردو میں ترجمہ "لالٹین والی مچھلی" ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اسے جگنو مچھلی کا نام دیا ہے۔

[illegible]



ڈاکو کی گرفتاری

جناب ابرار محسن

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں صرف دس برس کا تھا اور غالباً پانچویں درجے میں پڑھتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی وقار اسی اسکول میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھ سے صرف دو برس چھوٹا ہے۔ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں، میں جماعت کے سب سے زیادہ پھسڈی لڑکوں میں تھا۔ پڑھنے لکھنے سے جی چراتا تھا جونہی اسکول جانے کا وقت آتا یا تو مجھے بخار چڑھ آتا یا سر میں سخت درد ہونے لگتا اور جب یہ معلوم ہوتا کہ پاپا نے ترس کھا کر اسکول سے چھٹی دلوادی ہے تو اسی وقت بخار اور سر کا درد نہ جانے کہاں چلے جاتے۔ شام کو ماسٹر صاحب کے آنے کا وقت جیسے جیسے قریب آتا جاتا میرے پیٹ کا درد بڑھتا جاتا۔ ادھر ماسٹر صاحب نے آواز دی کہ میں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"ہائے مرگیا۔ اُف پیٹ پھٹا جارہا ہے۔ سخت درد ہے۔ ارے بچاؤ۔ ماسٹر صاحب سے کہو بس آج کی چھٹی دے دیں۔ اُف۔ آہ۔ ہائے!"

نتیجہ یہ ہوتا کہ ماسٹر صاحب سے کہہ دیا جاتا کہ آج کی چھٹی دے دیں۔ اِدھر ماسٹر صاحب گئے اُدھر پیٹ کا درد غائب۔ اسکول میں جو کام گھر پر کرنے کے لیے دیا جاتا وہ شاید ہی کبھی کیا ہو۔ اور سبق تو کبھی یاد ہوا

ہی نہیں۔ خوب خوب پٹائی ہوتی تھی۔ کان کھینچے جاتے تھے اور مُرغا بنائے جاتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسکول میں دن بھر بنچ پر بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔

وقار مجھ سے بالکل ہی الگ تھا۔ وہ بہت ذہین تھا بہت محنتی تھا۔ گھر کا کام یا ہوم ورک بلاناغہ کرکے لاتا اور سبق تو سبق اُسے پوری کتاب زبانی یاد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم جماعتوں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ اُستاد سب کے سب اس سے خوش تھے اور اُسے کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا تھا۔

مجھے وقار پر بڑا غصّہ آیا کرتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے بُرا بھلا سننا پڑتا تھا۔

کوئی کہتا ــــ "اونٹ کا اونٹ ہوگیا مگر پڑھائی میں بالکل بدّھو۔ چھوٹے بھائی کو نہیں دیکھتا۔"

کوئی بزرگ فرماتے ــــ "صاحب زادے ڈوب مرو چلّو بھر پانی میں۔ چھوٹے بھائی کو دیکھ کر بھی شرم نہیں آتی۔"

تو صاحب وقار کی وجہ سے یہ ساری باتیں سننا پڑتی تھیں۔ وقار شرارتیں بے انتہا تھے۔ کوئی وقت ایسا ہوتا ہوگا جو وہ گھر میں نچلے بیٹھتے ہوں یا کوئی نہ کوئی شرارت نہ کرتے ہوں۔ وہ مثل تو آپ نے سنی ہی ہوگی "بد اچھا بدنام بُرا۔" تو صاحب وقار صاحب شرارت کرتے تھے اور میرے سر تھوپ کر خود الگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ پٹائی میری ہوتی تھی۔ میں بدنام جو تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہم دونوں بھائیوں میں بے پناہ محبت تھی۔ ہم ہر وقت لڑتے رہتے تھے پر ایک دوسرے کے بغیر پل بھر چین بھی نہ آتا تھا۔ ایک بات اور ہم میں ایک سی تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں کو بہادری کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ایسی کہانیاں جن میں جنگلی جانوروں سے لڑائی کا ذکر ہو یا ڈاکوؤں سے مقابلے کے قصّے وغیرہ۔ ہمارا دل چاہتا تھا کاش ہم بھی بہادر ہوتے۔ کبھی شیر مار لاتے کبھی کسی مشہور ڈاکو کو گرفتار کراتے پھر اخباروں میں ہماری تعریفیں چھپتیں۔ اسی سلسلے میں ہم دونوں بھائیوں نے سینکڑوں بار مشہور ڈاکو جگّا کو گرفتار کرایا تھا۔ مگر صرف خواب میں۔

اُن دنوں جگّا ڈاکو کا ہر طرف چرچا تھا۔ بڑا خونخوار ڈاکو تھا۔ اس کا بہت بڑا گروہ تھا۔ جس نے نہ جانے کتنے گھروں میں ڈاکے ڈالے تھے اور بے گنتی لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔ وہ آدم پور کے پاس والے ایک گھنے جنگل میں رہتا تھا۔ پولیس نے اسے اور اس کے گروہ کو پکڑنے کی بڑی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہی۔ ایک دو بار جگّا سے مقابلہ بھی ہوا مگر جگّا اور اس کے ساتھی انتہائی چالاک پھرتیلے اور بہت عمدہ نشانے باز تھے۔ ہر دفعہ بے چارے پولیس والوں کو نقصان اٹھانا پڑا اور جگّا کا کچھ نہ بگڑ سکا۔

جگّا کی سرگرمیاں دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھیں یہاں تک کہ اس نے شہر کا ایک بینک [illegible] [illegible]

[illegible]

ہم جگّا کو گرفتار کرا دیں تو مزا آ جائے۔ میں اسی دن دس ہزار روپے لے کر بازار جاؤں اور کرکٹ کا سارا سامان خرید لاؤں۔"

"نہیں کرکٹ کا سامان نہیں ایک موٹر خریدیں گے چھوٹی سی۔" وقار نے کہا۔

"نہیں کرکٹ کا سامان۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

"نہیں موٹر۔" وقار بھی اڑ گیا اور میں نے اس کے دو چار ہاتھ جھاڑ دیے۔ وہ روتا ہوا پاپا کے پاس پہنچا اور انھیں رو رو کر ساری داستان سنائی۔ پاپا نے میرے کان اینٹھنے کے بجائے بڑی نرمی سے ہم دونوں سے بیٹھنے کو کہا اور ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"دیکھو بھئی ہمارا سارا آدم پور کو ہو گیا ہے جانتے ہو کیوں۔؟"

"جگّا کی وجہ سے پاپا۔" وقار جھٹ بول اٹھا۔

"ہاں۔" پاپا نے کہا "جگّا نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پولیس پریشان ہے، بہرحال پرسوں ہی ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔"

"کون کون جائے گا پاپا۔ امّی وقار سب کے سب۔؟" میں نے پوچھا

"نہیں تم دونوں کہانی یہیں رہو گے

تمھارے امتحان قریب ہیں۔ بعد میں تمھیں بھی
بلالوں گا۔" پاپا نے جواب دیا۔

"میں تو مان گیا مگر وقار مچل پڑا اور
آسمان سر پر اٹھالیا۔

"میں تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا" بس
ایک ہی رٹ لگا رہا تھا۔

جب وقار نے بہت آفت مچائی اور امی
نے بھی سفارش کی تو پاپا نے مجبور ہو کر یہ
فیصلہ کر لیا کہ اُسے بھی ساتھ لے جائیں۔

پاپا پولیس انسپکٹر تھے۔ انھوں نے
اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے
چوروں، ڈاکوؤں کو پکڑا ہے اسی لیے جس جگہ
دوسرے لوگ کامیاب نہ ہوتے پاپا کو بھیج دیا
۔ آدم پور انھیں اسی لیے بھیجا جا رہا تھا کہ
نے بڑا سر اٹھا رکھا تھا۔

پاپا، امی اور وقار کے ساتھ آدم پور
ہو گئے۔ میں انھیں اسٹیشن پہنچانے گیا۔
میں چاہتا تھا کہ خوب روؤں۔ وقار کو
[illegible] کر دیا۔ اس کو
[illegible] کا بڑا غم تھا۔ اب تو
تک کسی نہ کسی طرح دن کاٹتا رہا تھا۔

مجھے پاپا نے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں
داخل کرا دیا تھا۔ جب ٹرین اسٹیشن سے روانہ
ہوئی تو میں ٹکٹکی باندھے دور تک دیکھتا رہا۔
یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں
آنسو بہاتا ہوا اسکول کے بورڈنگ کی طرف
چلا آیا۔ اور اپنے کمرے میں آکر دیر تک روتا
رہا۔

اسی کمرے میں میرا ایک ہم جماعت اسلم
بھی رہتا تھا لیکن تھا بہت ہی غریب۔ وہ یتیم
بھی تھا۔ اس کی ماں کا تو جب ہی انتقال ہو گیا
تھا جب کہ وہ پیدا ہوا تھا۔ جب وہ ذرا اور بڑا
ہوا تو اس کا باپ اسکول کے بورڈنگ میں اس
کا نام لکھا کر نوکری کی تلاش میں چلا گیا۔ اس
کو گئے ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ شاید وہ
بھی مر چکا ہوگا ورنہ اسلم کو دیکھنے ضرور آتا یا
صرف خط لکھ کر ہی اس کی خیریت معلوم کر لیتا۔
اسلم کی اسکول کی فیس اور بورڈنگ کا خرچ
ہیڈ ماسٹر کے نام کوئی گم نام آدمی ہر مہینے بھیج
دیا کرتا تھا۔ ہو سکتا تھا اسلم کے باپ کا
کوئی رحم دل دوست ہو۔

شروع شروع میں تو وقار کے بغیر

میرا دل بہت گھبرایا مگر اسلم کی وجہ سے جلد ہی میرا دل لگنے لگا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔
"یار گھبراتے کیوں ہو۔ بس امتحان ختم ہوتے ہی ماں باپ سے جا ملوگے۔ مجھے دیکھو نہ ماں نہ باپ۔ کہاں جاؤں کس کے پاس جاؤں۔"
یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور میں اُسے سمجھانے لگتا۔
"ہمت سے کام لو اسلم۔ اگر تمھارے والد زندہ ہیں تو ضرور انھیں تم سے ملاؤں گا۔"
کئی دن کے بعد وقار کا خط میرے نام آیا۔ لکھا تھا:
"بھیّا ــــ تمھارے بغیر میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔ تم بہت یاد آتے ہو۔ ویسے یہ آدم پور بڑی اچھی جگہ ہے۔ چھوٹا سا قصبہ ہے مگر ہے بہت کھلا ہوا۔ ہم لوگ پولیس اسٹیشن کے پاس ہی ایک بنگلے میں رہتے ہیں۔ پولیس اسٹیشن بستی سے کافی دور ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے میدان ہیں جہاں میں اپنے نئے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا اور فٹ بال کھیلتا ہوں۔ ہمارا ایک نوکر ہے جس کی لمبی سی سفید داڑھی ہے۔ اس کا نام رحمو ہے۔ میں رحمو کو دادا کہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بڑی محبّت کرتا ہے اور پریوں کے قصّے سناتا ہے۔ اور بھیّا یہاں سے دو میل دور ایک بہت بڑا جنگل ہے جس میں جگّا رہتا ہے۔ وہ بہت بڑا ڈاکو ہے۔ اس کے آدمیوں کے پاس بہت سی بندوقیں ہیں۔ اور اس کی وجہ سے پاپا بہت پریشان ہیں۔ مجھے بھی بڑا ڈر لگتا ہے کیوں کہ پاپا سے پہلے جتنے بھی پولیس انسپکٹر یہاں آئے انھیں جگّا نے ختم کر دیا۔ امّی بھی بہت ڈرتی رہتی ہیں کہ اب کیا ہوگا ــــ میرے دوستوں سے سلام کہنا۔"
"وقار"

وقار کا خط پڑھ کر میں پریشان ہو گیا۔ پاپا کی جان خطرے میں تھی۔ اُف اب کیا ہو۔ میں کیا کروں۔ ؟ اسلم سے جب میں نے ذکر کیا تو اس نے کہا۔
"گھبراؤ نہیں۔ تمھارے پاپا جگّا کو ضرور گرفتار کر لیں گے۔ مثل مشہور ہے سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ بڑے سے بڑا ڈاکو بھی ایک دن گرفتار ہو ہی جاتا ہے۔"



جناب شرف رحمانی

باغ و بہار

نرم کومل اور سجیلے
لال گلابی نیلے پیلے
سندر سندر پیارے پیارے
نیل گگن پر جیسے تارے
شاخوں پر یوں جھول رہے ہیں
جیسے پریاں اندر سبھا میں
لب پہ تبسم کانٹوں میں رہ کر
ان کا چلن ہے کتنا سندر
تتلی اور مدھ مکھی آکر
لے جاتی ہیں شہد چرا کر
ان سے ہے گلشن کی زینت
ان سے سب کرتے ہیں محبت

گرجا مسجد اور مندر میں
ان سے اجالا ہے ہر گھر میں
ان کو گلے کا ہار بنائیں
مہکی مہکی ان سے فضائیں
بانٹتے ہیں خوشبو کا خزانہ
فیض یہ جاری ہے روزانہ
ان سے روح سکوں پاتی ہے
سانس معطر ہو جاتی ہے
ان سے کوئی سخاوت سیکھے
خوش رہنے کی عادت سیکھے
پھولوں سے ہے نام چمن کا
بچے ہیں سرمایہ وطن کا

جناب رفیق محمد شاستری

پربت وہ سب سے اونچا



دنیا کا سب سے اونچا پربت بتایئے
کون سا ہے۔؟

جی جناب وہ ہمارا پربت ہے یہ پربت
یا پہاڑ ہمارے دیش کے شمال میں ہے۔ اس
پہاڑ کا سلسلہ ڈیڑھ ہزار میل تک پھیلا ہوا
ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے اس پربت کی
گود میں گنگا کھیلتی ہے، جمنا مچلتی ہے برہم پتر
اس کے دامن کو دھوتا ہوا تبت سے ہندستان
آتا ہے۔ جہلم، چناب، سندھ، ستلج اور راوی
جیسی چھوٹی بڑی سینکڑوں ندیاں اس کی
گود میں [illegible] تاکہ میدانوں کو سیراب کر سکیں یہ
پہاڑ [illegible] تک

نیپال ہے۔ اس پہاڑ کی دوسری جانب
تبت ہے۔

دنیا میں پہاڑوں کی بہت سی چوٹیاں
ہیں پر ان میں ایسی بہت کم ہیں جن کی
اونچائی ۲۰ ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ ۲۵
ہزار فٹ سے اونچی چوٹیاں تو بس اسی [illegible]

ہیں۔ ان میں سے کئی ایک چوٹیاں اسی ہمالیہ کی ہیں۔ جبھی تو ہمالیہ کو سب سے اونچا پربت کہتے ہیں۔ اس کی ایک چوٹی تو بہت ہی اونچی ہے۔ اس کا نام ایورسٹ ہے۔ دنیا کے کسی پہاڑ کی چوٹی اتنی اونچی نہیں ہے۔

ایورسٹ کی چوٹی تبت اور نیپال کے درمیان سر اٹھائے دنیا کو تک رہی ہے۔ اس کی بلندی ۲۹۰۲۸ فٹ، یعنی تقریباً ساڑھے پانچ میل ہے۔ برفیلے پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ چوٹی جواں مردوں کو للکارتی ہے۔ انھیں ہمت اور حوصلے کو آزمانے کی دعوت دیتی ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے تک انسان کے قدم اس چوٹی کو چھو نہیں سکے تھے۔ اب بھی بس انے گنے چند خوش نصیب اس پر اپنے قدم رکھ سکے ہیں۔ برفیلے طوفان ہر وقت اس کے قدموں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ سوائے برف کے کچھ نہیں آتا۔ زمین بھی برف کی، آسمان ... کا، ہوا بھی برف کی اور آگ بھی برف جیسی ٹھنڈی۔ اسی ... بھی دور کی بات ہے اسے قریب سے دیکھنا بھی کم ہمت کا کام نہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آسمان سے باتیں کرنے والی اس چوٹی کا نام ایورسٹ یا ماؤنٹ ایورسٹ کیسے پڑا۔ لیجیے یہ کہانی بھی سنتے چلیے۔



اب سے کوئی سَو سال سے کچھ اوپر کی بات ہے۔ ۱۸۵۲ء میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات کا پتہ لگانے کے لیے ایک پڑتال کی جا رہی تھی۔ اس پڑتال کو جغرافیائی سروے کہتے ہیں۔ سروے کرنے

والوں کی ایک ٹیم ہمالیہ کے پہاڑوں کی پڑتال میں مصروف تھی۔ اس ٹیم کے ایک ہندوستانی رکن نے سب سے پہلے اس چوٹی کا پتہ لگایا۔ اس جغرافیائی سروے پارٹی کے صدر ایک انگریز افسر سر جارج ایورسٹ تھے۔ انھوں نے اس چوٹی کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ اور اعلان کیا کہ یہ چوٹی دنیا کی سب سے بلند چوٹی ہے۔ اسی وقت سے اس چوٹی کا نام اس انگریز افسر کے نام پر ایورسٹ کی چوٹی یا ماؤنٹ ایورسٹ پڑ گیا۔

یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ مگر اس کا شاید ہی کوئی کونا ایسا ہوگا، جہاں حضرت انسان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ اس نے گھنے جنگلوں کو، طوفانی ندیوں اور گہرے سمندروں سے گھرے ہوئے، چھوٹے چھوٹے جزیروں کو، اونچے اونچے پہاڑوں کو گہری گھاٹیوں کو چھان مارا ہے۔ برف سے زیادہ ٹھنڈے ملکوں اور آگ سے زیادہ تپتے ہوئے میدانوں میں اپنے جھنڈے لہرائے ہیں۔ اور چاند اور ستاروں پر قدم رکھنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کا پتہ لگا تو لوگوں کے دلوں میں وہاں پہنچنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ دنیا کی چھت سے دنیا کا نظارہ کرنے کا خیال دلوں میں چٹکیاں لینے لگا۔ دنیا کے سب سے اونچے پربت، ہمالیہ کی اس بلند چوٹی کو سر کرنا انسانی عزم و حوصلے کا ایک امتحان بن گیا۔ اور بلند حوصلہ انسان بڑے جوش بڑے ولولے کے ساتھ اس امتحان کے لیے تیار ہو گیا۔

اس وقت یورپ کے ملک بہت ترقی یافتہ تھے۔ یورپ کے ملکوں میں اور خاص طور سے انگلینڈ میں ایورسٹ کو سر کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ ۱۸۸۷ء میں سب سے پہلے ایک فرانسیسی کوہ پیما کے دل میں اس چوٹی کو سر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اس کو اجازت نہ مل سکی۔ پھر بھی ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے تیاریاں جاری رہیں۔ مختلف راستوں کا پتہ لگانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس مقصد کے لیے انجمنیں بنیں۔ روپیہ جمع کیا جانے لگا۔ اور ۱۹۲۱ء میں پہلی بار ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے انگریزوں کی ایک باقاعدہ ٹولی نکل پڑی۔ اس ٹولی کا کام

بہت مشکل تھا۔ ان جان پہاڑی راستوں پر پہلی بار یہ لوگ چل پڑے۔

ایک کہاوت ہے "نو دن چلے اڑھائی کوس"۔ یہ کہاوت پہاڑی راستوں پر بالکل صحیح اترتی ہے۔ ایک فرلانگ کی بلندی طے کرنے کے لیے کئی میل کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ یہ تو جانے پہچانے پہاڑی راستوں کی بات ہوئی۔ مگر راستہ ان جان ہو تو بلندی پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ منزل اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے۔ جب ایورسٹ کا پتہ لگا، اس وقت نہ تو ایورسٹ تک پہنچنے کے لیے راستہ کا پتہ تھا نہ اتنی بلندی پر چڑھائی کی دشواریوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا۔ ایک شوق تھا، جو لوگوں کو دنیا کے سب سے اونچے پربت پر قدم رکھنے کے لیے اکسا رہا تھا۔

غرض اس ٹولی نے تبت کی طرف سے، یعنی ایورسٹ کی چوٹی کے جنوب سے چڑھائی شروع کی۔ تیز برفانی ہوا، برف کا طوفان۔ جتنا اوپر چڑھتے جایئے منزل اور کٹھن ہوتی جاتی تھی۔ طوفان بھی تیز ہوتا تھا۔ ٹھنڈ بڑھتی جاتی تھی اور سانس لینا دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا تھا۔ یہ لوگ جیسے تیسے تقریباً ۲۳ ہزار فٹ تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہاتھ پیروں کی قوت جواب دینے لگی۔ موسم اتنا خراب ہو گیا کہ وہاں کچھ دن اور رکنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں جھونکنا تھا۔ مجبوراً واپس آگئے۔

اس کے بعد ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۲ء تک ۹ بار اور ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے کوہ پیماؤں کی ٹولیاں گئیں۔ مگر ان میں سے کوئی اس کے اوپر قدم نہیں رکھ سکی۔ کبھی موسم کی خرابی، کبھی سامان کی کمی، کبھی راستوں کا بھٹکاؤ ان کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا۔ دنیا کا سب سے اونچا پربت انسان کے عزم و حوصلے کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں تھا۔

ان دس مہموں میں پہلی آٹھ مہمیں برطانیہ کی تھیں۔ نویں اور دسویں مہم سوئٹزرلینڈ کی تھی۔

ہر ٹولی کے ساتھ بہادر شیرپا قلی راستہ دکھانے اور سامان ڈھونے کے لیے جاتے تھے۔ یہ شیرپا قلی دور دراز کے ملکوں کے

مہم بازوں کے لیے گائیڈ یعنی راستہ دکھانے والے کا کام کرتے۔ ذرا سوچیے دیوار کی طرح سیدھی چڑھائی والے راستوں پر برف کے اس دیس میں بھاری بوجھ اپنی پیٹھ پر لے کر چلنا کتنی ہمت کا کام ہے یہ ہمالیہ کی گود میں پلنے والے ان بہادر شیرپا قلیوں ہی کا حصّہ ہے۔

پہلی دس ٹولیاں ایورسٹ پر تو نہ پہنچ سکیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ ہر ٹولی نے اپنے بعد آنے والی ٹولی کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ شروع شروع میں تو راستوں کا پتہ تک نہیں لگ پاتا تھا۔

ابتدائی مہموں نے نئے نئے اور آسان راستے دریافت کیے۔ ایورسٹ کے قریب پہنچ کر وہاں کے موسم کو سمجھا۔ اس کی اونچ نیچ اور دشواریوں سے سبق سیکھا۔ سازوسامان کو بہتر بنانے اور کم سے کم وزن کی چیزوں سے کام لینے کی تدبیریں ڈھونڈھ نکالیں۔ کہاں کیمپ لگانا چاہیے، کہاں سے کس وقت اوپر کی طرف بڑھنا چاہیے۔ ایورسٹ پر آخری چڑھائی کے لیے کب موسم ٹھیک رہتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں دریافت کیں اور اپنے بعد کی ٹولیوں کے لیے چڑھائی میں آسانی پیدا کی۔

اس درمیان ایک اور بات ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں ہوائی جہاز کے ذریعہ ایورسٹ کی چوٹی کے اوپر اڑان کی گئی۔ یہ ہوائی جہاز ایورسٹ کی چوٹی کے گرد چند منٹ چکر کاٹتا رہا۔ اس ٹھنڈک میں جہاز کا زیادہ دیر اس کے قریب رکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب انسان نے اپنی آنکھوں

سے دنیا کی چھت کا نظارہ کیا۔
غرض ۱۹۵۲ء سے پہلے کوئی انسان ایورسٹ پر قدم نہیں رکھ سکا۔ کچھ لوگ ان بہادر کوہ پیماؤں کی کوششوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا یہ پہاڑ کی بلندیاں دیوی، دیوتاؤں کے رہنے کے استھان ہیں۔ انسان کے قدم ان مقدس مقامات کو چھو نہیں سکتے ہیں۔ ان کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد نہیں تھا۔ پہاڑ کی بلندیوں پر جوں جوں قدم آگے بڑھتے ہیں دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہاتھ پیروں کی قوت جواب دینے لگتی ہے۔ بھیانک طوفان بڑھتے ہوئے قدموں کو ایک دم روک دیتے ہیں۔ پہلے پہل جب انسان پر یہ کیفیت گزری تو وہ سمجھا کہ یہاں سے انسانوں کے رہنے کی جگہ کی حد ختم ہوگئی۔ اوپر دیوتاؤں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اسی لیے اس کے قدم آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مگر آج کا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ انسان نے موسم کی اونچ نیچ کو معلوم کر لیا ہے۔ اسے بلندیوں پر دم گھٹنے کی دوا معلوم ہو گئی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ اوپر جانے کے بعد ہاتھ پیروں کی قوت کیوں جواب دینے لگتی ہے اور ان دشواریوں پر کیسے اور کیوں کر قابو پایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۳ء میں گیارہویں بار کوہ پیماؤں کی ایک ٹولی نے ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کی۔ اس ٹولی میں ایک ہندوستانی نوجوان تین سنگھ بھی تھا (باقی آئندہ)



میٹھے بول

جناب محسن انجم بھیونڈوی



کسی جنگل کے ایک صنوبر کے اونچے درخت کی ایک ہی شاخ پر تین گھونسلے تھے۔ یہ تینوں گھونسلے تین گہرے دوستوں کے تھے۔ اور یہ دوست تھے تیتر، نیل کنٹھ اور فاختہ

ان کی دوستی بہت پرانی تھی۔ جنگل کے جانور اس دوستی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ نہایت سخت جاڑا پڑا۔ برف گرنے لگی۔ زمین پر برف جمنے کی وجہ سے کیڑے مکوڑوں کا شکار مشکل ہو گیا۔ اور نہ غلّہ ملنے کا امکان تھا۔ فاقے کی نوبت آ پہنچی۔ ایک دن وہ تینوں سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کر رہے تھے۔ فاختہ بولی "دوستو! یہی حالت رہی تو ہم دو تین دن میں یا تو سردی سے قلفی بن جائیں گے یا بھوک سے تنگ آ کر مر جائیں گے۔ اس لیے ہمیں جلد از جلد پناہ گاہ ڈھونڈنی چاہیے اور غلّہ حاصل کرنے کے لیے بھی کوشش کرنی چاہیے۔"

فاختہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے پناہ گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ آخر ایک چھوٹا سا غار پسند آ گیا۔ انھوں نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ اب غلّہ کا سوال تھا۔ بھوک کے مارے تینوں کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

یکایک تیتر نے کہا "دوستو! کسان کے کھلیان میں چوہیا رانی رہتی ہے نا، وہ ہماری مدد کر سکتی ہے اس کے پاس ہر وقت غلّہ کا ذخیرہ رہتا ہے اس لیے کیوں نہ ہم چوہیا رانی سے تھوڑا اناج مانگیں!"

تیتر کی اس تجویز پر فاختہ اور نیل کنٹھ بہت بگڑے انھوں نے کہا "ہم کیوں اپنے سے حقیر جانور کے آگے ہاتھ پھیلائیں" فاختہ اور نیل کنٹھ دونوں

اپنے کو بہت بڑا سمجھتے تھے۔ خیر صاحب تیتر بے چارا چپ ہو رہا۔

شام کے وقت بی فاختہ بھوک سے بے تاب ہو کر بولیں "اب مجھ سے نہیں رہا جاتا میں چوہیا رانی کے پاس کچھ مانگنے کے لیے جاتی ہوں۔"

چوہیا رانی کے گھر پہنچ کر بی فاختہ نے نہایت زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ چوہیا رانی ہاتھ میں چھڑی لیے باہر نکلیں اور پوچھا "کیا بات ہے؟ اتنی زور سے دروازہ کیوں پیٹ رہی ہو؟"

فاختہ نے پَر پھیلا کر منہ اونچا کر کے حکم دیا۔ "میں بھوکی ہوں مجھے کھانے کے لیے دو۔"

چوہیا رانی کو بہت غصہ آیا۔ سوالی بن کر تو آئی ہے اور مجھے حکم دیتی ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چھڑی اٹھائی اور فاختہ کے سر پر دے ماری۔ فاختہ کے سر پر چھڑی کی مار سے نیلا نشان پڑ گیا اور وہ نشان آج بھی اس کے سر کے بیچ میں موجود ہے۔

اسی طرح نیل کنٹھ بھی بھوک سے مجبور ہو کر چوہیا رانی کے گھر پہنچ گیا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ چوہیا رانی باورچی خانہ میں گرم سلاخ پر کچھ سینک رہی تھیں۔ وہ سلاخ لیے ہوئے دروازے پر پہنچیں اور دروازہ کھول دیا۔

باہر نیل کنٹھ صاحب اپنے خیال میں بڑی شان سے کھڑے تھے۔ چوہیا رانی نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

نیل کنٹھ نے تحکمانہ انداز میں کہا "میں بھوکا ہوں، مجھے اناج چاہیے"

چوہیا رانی آگ بگولہ ہو گئی "تم مجھ سے کھانا مانگنے آئے ہو اور دروازہ ایسے کھٹکھٹاتے ہو جیسے کہیں کے حاکم ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے گرم سلاخ نیل کنٹھ کے دونوں رخساروں پر ماری جس کی وجہ سے اس کے گال سُرخ ہو گئے اور یہ سرخی آج بھی نیل کنٹھ کے دونوں رخساروں پر موجود ہے۔

دونوں کا حال جب تیتر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی قسمت آزمانے کی سوچی۔ وہ کھلیان پہنچ گیا اور نہایت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ چوہیا رانی نے دروازہ کھول کر پوچھا "کیا چاہیے۔؟"

تیتر نے بڑی نرمی اور خاکساری کے انداز میں کہا "میں بہت بھوکا ہوں۔ اگر تم اپنے بچے ہوئے کھانے میں سے تھوڑا مجھے عنایت کر دوگی تو شکرگزار ہوں گا۔"

چوہیا رانی تیتر کے اس انداز سے بہت خوش ہوئی اور اسے کھانا دے دیا۔

مستقبل کی مدھر کہانی

جناب وقار خلیل

ہم بالک ہیں ویر جوان
ملک ہمارا ہندوستان
گو ہم آج ہیں ننھے مُنّے
دیکھا کرتے اونچے سپنے
کل کو ہم بلوان بنیں گے
مضبوط اور مہان بنیں گے
اپنے ارادے نہرو، گاندھی
تھر تھر کانپے ہم سے آندھی



کانپے شکتی دیکھ ہمالا
مُنھ کی کھائے برچھی بھالا
ہم سے دریاؤں میں ہلچل
اور بیاباں اُتھل پُتھل
گنگا، جمنا اپنی روانی
مستقبل کی مدھر کہانی

کومے وادا (۷)

ٹیبور سیکلج
ترجمہ
مجیب احمد خاں



کچھ دور چلنے کے بعد کومے وادا نے کینو کو ایک چھوٹی سی کھاڑی میں لا کر ٹھہرایا۔ یہ کھاڑی جنگلی پیڑوں اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کومے وادا نے کشتی کو پیڑ کے تنے سے مضبوطی سے باندھ دیا اور بولا:

"لیجیے اب یہاں سے ہم جنگل میں داخل ہوتے ہیں۔"

اس نے کیلے کے تین چار بڑے بڑے پتّے توڑے۔ ایک دوسرے پیڑ کے پتّوں کو جھٹکا دے کر ریشے نکالے۔ ان ریشوں کی مستلی بٹی۔ پھر کیلے کے پتّوں میں کچھوے کے انڈے لپیٹ کر پارسل سا بنایا۔ اس پر سُتلی خوب اچھی طرح لپیٹ دی۔ پارسل کو کینو میں ایک طرف رکھ کر

وہ اُتر پڑا اور مجھ سے ساتھ ساتھ چلنے کو کہا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنے شکاری چاقو سے جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر جنگل میں داخل ہونے کا راستہ بنایا۔

صبح کا سہانا وقت تھا، صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا، چڑیوں کی چہچہاہٹ، جانوروں کا اٹکھیلیاں اور کلیلیں کرنا! غرض بڑا سہانا سماں تھا اور اس خوش گوار منظر نے زندگی میں ایک عجیب اور دل فریب ہماہمی بھر دی تھی۔

"مجھے خوشی ہے کہ ہم اتنے صبح صبح جنگل میں آ گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے زندگی نے ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کتنا سہانا، کتنا مسحور کُن ہے یہ منظر!"۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"بوڑھے مالوآ کا کہنا ہے کہ شکار کے لیے سب سے اچھا وقت صبح کا وقت ہے اور کھانے کے کُکر مُتے اکٹھا کرنے کا وقت بارش کے فوراً بعد کا وقت"۔

ہم آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یکایک کوے والا ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور ایک تازہ کچلی ہوئی پتی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولا:

"آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا اس جگہ سے جاگور گزرا ہے"۔

پیروں کے نشانوں کو دیکھ کر مجھے بھی یہی اندازہ ہوا۔ نشان بالکل تازہ تھے۔

"کومے واوا! کیا اس جنگل میں جاگور سے زیادہ خطرناک کوئی دوسرا جانور نہیں"؟ میں نے پوچھا۔

"کسی حد تک تمھارا خیال ٹھیک ہے جاگور بالکل قریب ہو تو سچ مچ خطرے کی بات ہے مگر دور ہو تو پھر خطرہ کیسا"۔

"بہت خوب میرے ننھے شکاری!! تم ہر بات کو فلسفے کا رنگ دینا خوب جانتے ہو۔ کبھی بوڑھے مالوآ کے الفاظ میں اور کبھی ——"

میں اپنا جملہ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ایک طرف سے عجیب آواز آنا شروع ہوئی۔ یہ آواز دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی۔

"جنگلی سوَر" کومے وادا نے گھبراہٹ اور جوش میں چیخ کر کہا ــــ "پیڑ پر چڑھ جاؤ ــــ جلدی کرو"۔ میں ایک بے اختیاری کی سی کیفیت میں قریب ترین پیڑ پر چڑھ گیا۔ میرے پیچھے کومے وادا بھی اس پیڑ پر چڑھ آیا۔ ہم دونوں ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ سوَروں کا ایک ریوڑ ہمارے پیڑ کے نیچے سے گزرنے لگا۔ سوَر



ایک کے پیچھے ایک بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ ان کی دانتوں کی کٹکٹاہٹ اور گلے سے نکلنے والی غُرغُرش کی آوازوں نے جنگل کی فضا کو ہیبت ناک بنادیا تھا۔ اگر ہمیں پیڑ پر چڑھنے میں دو منٹ کی بھی دیر ہوگئی ہوتی تو ان کے ریلے میں گھر کر ہم دونوں پس چکے ہوتے۔ ہڈی پسلی تک کا پتہ نہ چلتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم زندہ سلامت زمین سے صرف دس بارہ فٹ کی بلندی پر بیٹھے ان موذی جانوروں کی بھگدڑ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس قدر گھنے جنگل میں وہ اتنی تیزی اور آسانی سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جیسے ہم گیہوں کے کھیت میں سے گزر جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔ میرا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اور اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے اُس شاخ کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے میں چمٹا ہوا تھا، دوسری طرف کومے وادا کمان میں تیر لگا کر اطمینان سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

"اس کو مار گراؤ" میں نے ایک بڑے اور موٹے سوَر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ اگر میں نے اس پر نشانہ لگا دیا تو پیچھے آنے والے سؤر ہمیں دیکھ لیں گے اور پھر سب مل کر پیڑ پر حملہ کر دیں گے۔ منٹوں میں یہ پیڑ زمین پر آ رہے گا۔ جنگلی سؤر بدلہ لیے بغیر نہیں مانتے، بس سب سے آخری سؤر پر نشانہ لگاؤں گا۔ آگے نکل جانے والے سؤروں کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ پیچھے والے پر کیا بیتی۔"

یہ بات کومے واوا نے میرے کان کے پاس چیخ کر کہی۔ پھر بھی اس کی آواز سؤروں کی غُرغش کی آوازوں میں ڈوب کر رہ گئی، سؤروں کا یہ ریوڑ ہمارے پیڑ کے نیچے سے ایک سیلاب کی طرح گزر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جنگلی قبیلے کا فرد ہو کر زندگی گزارنا اور جنگل کے ہر جانور کی عادتوں اور خصلتوں کی واقفیت حاصل کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ غالباً برسہا برس کے تجربوں نے یہ بات سکھائی ہوگی کہ کس طرح شکار کرنا چاہیے اور خود اپنے کو شکار ہونے سے کس طرح بچانا چاہیے۔

سؤروں کا ریوڑ گزر چکا تھا۔ ان کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آخری سؤر ہمارے پیڑ سے تھوڑی دور پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ کومے واوا کی کمان سے نکلا ہوا تیر اس کے سینے میں پیوست تھا۔

ہم دونوں پیڑ سے اُتر کر اپنے شکار کے پاس گئے۔ اتنی دیر میں وہ دم توڑ چکا تھا۔ یہ ایک اوسط قد کا تندرست سؤر تھا، اس کے مڑے ہوئے تقریباً ۶، ۶ انچ لمبے دونوں دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن کم از کم تین من تو ضرور ہوگا۔

"اس پہاڑ کو ہم اپنے کیمپ تک لے کیسے جائیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"پہلے اس کو بھون لیں۔ پھر لے چلیں گے۔ زرا ماچس تو نکالو۔" کومے واوا نے کہا۔

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ بدقسمتی سے آج میں ماچس کیمپ ہی میں بھول آیا تھا۔ کومے واوا بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں آگ جلائے لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ تھوڑی دور پر اسے کھجور کے درخت سے ملتا جلتا ایک سوکھا درخت دکھائی دیا۔ اپنے شکاری چاقو سے اس نے اس کے تنے کو کاٹا۔ اس کے بیچ سے بالکل خشک لکڑی کے دو ٹکڑے الگ کیے۔ ایک ٹکڑے میں سے اس نے ایک چھوٹی سی تختی بنائی۔ دوسرے ٹکڑے سے میخ کی شکل کی ایک لکڑی تیار کی۔ پھر وہ اُکڑوں بیٹھ گیا۔ تختی کو پیر تلے مضبوطی سے دبایا۔ میخ کو تختی کے بیچ میں نوک کی طرف کھڑا کیا۔ پھر دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں لے کر اور تختی پر دبا کر زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ اس نے یہ عمل تقریباً ۲۰ منٹ تک جاری رکھا۔ اس درمیان میں اس کے ہاتھ ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں رُکے۔ وہ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھا۔ آخر کار میخ کی نوک کے پاس دھواں نکلنے لگا۔ کومے واوا کے ہاتھوں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ دھواں اور زیادہ نکلنے لگا۔ کومے واوا نے لکڑی کا بُرادہ اس جگہ ڈالا جہاں سے دھواں نکل رہا تھا اور جھک کر زور زور سے پھونکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے ایک شعلہ سا نکلا اور ہمارے سامنے جلتی اور لپکتی ہوئی آگ موجود تھی۔



اس عرصے میں سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر کومے واوا کے پاس لگا دیا گیا تھا۔ ان لکڑیوں سے کومے واوا نے ایک بڑا سا الاؤ لگایا۔ لکڑیاں جل جل کر کوئلہ

بننے لگیں۔ جب تک کوئلوں کا یہ الاؤ تیار ہو ہم دونوں نے سوّر کو صاف کرلیا۔ موٹی موٹی لکڑیوں کا تِشاخہ بنایا اور اس پر سوّر کو بھننے کے لیے لٹکا دیا۔

صبح کا دھندلکا چھٹ چکا تھا۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں سے پیڑوں کی چوٹیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ یکایک ایک طرف سے ٹپ ٹپ، پٹر پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بارش کی بڑی بڑی بوندیں پیڑوں کے پتّوں پر گر رہی ہوں۔ کومے واوا نے ان آوازوں پر کان لگا دیے۔ وہ کچھ فکر مند سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہماری نظریں اُس سمت اٹھی ہوئی تھیں جدھر سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ دفعتاً اس طرف سے ایک بڑا سا سانپ تیزی سے رینگتا ہوا آیا اور ہمارے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ اس نے ہم لوگوں کی موجودگی کی پروا تک نہ کی۔ سانپ کے نکل جانے کے بعد کومے واوا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر تین چار قدم پیچھے ہٹا اور گرے ہوئے درخت کے ایک تنے پر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے بھی اس نے اوپر آجانے کو کہا۔ ہمارے ہٹتے ہی سامنے سے کھنکھجورے چھپکلیاں، چھوٹے بڑے طرح طرح کے سانپ گوہ، بچھو، خرگوش، لومڑیاں، ہرن، بارہ سنگھے، اَن گنت دوسرے جانور اور کیڑے مکوڑے تیزی سے گزرنے لگے۔ سب کے سب گھبرائے ہوئے اور خوف زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ سب کا رُخ ایک ہی طرف کو تھا۔ ٹپ ٹپ، پٹر پٹر کی آواز دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا ہے کیا؟" میں نے کومے واوا سے پوچھا۔

"لڑا کو چیونٹیاں آرہی ہیں ___ ہمیں بھی یہاں سے فوراً بھاگ چلنا چاہیے!" کومے واوا نے جواب دیا۔

سوّروں کے آنے پر جس طرح ہم اپنی جان بچانے کے لیے پیڑ پر چڑھ گئے اسی طرح اس بار بھی میں ایک پیڑ پر چڑھنے لگا۔ ابھی میں تھوڑا ہی اوپر پہنچا تھا کہ کومے واوا نے میری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا۔ وہ مجھے لے کر آگ کے

پاس آیا اور سؤر کو اُٹھانا چاہا، سؤر بہت بھاری تھا، گرم تھا اور چکنائی سے تر تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر آگ پر گر گیا۔

میں نے کوے دادا کی مدد کرنی چاہی مگر اب وقت نکل چکا تھا۔

لڑاکو چیونٹیاں ہم تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی سرسراہٹ ہم اپنے پیروں پر محسوس کر رہے تھے۔ ان کے کاٹنے سے ہم دونوں پیر پٹک رہے تھے۔ ہم نے ان کو ہاتھ سے جھاڑ کر پیروں پر سے چھٹانا چاہا مگر انھوں نے اپنے درانتی نما جبڑے ہمارے گوشت میں پیوست کر دیے تھے۔ ان میں سے خون نکل رہا تھا۔ جتنی دیر میں ہم ایک چیونٹی کو نوچ کر پھینکتے، دس بارہ اور چیونٹیاں پیروں پر چڑھ آتیں تھیں۔ یکایک کوے دادا نے میرا ہاتھ پکڑا اور دریا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ گھنے جنگل میں کاوے کاٹتا ہوا اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ اس کا ساتھ دینا میرے لیے مشکل تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اس کے پکارنے کی آواز مجھے برابر سنائی دے رہی تھی۔ اسی آواز پر میں اس کی طرف جس قدر تیز ہو سکتا تھا دوڑ رہا تھا۔ آخر ہانپتا کانپتا تھوڑی دیر میں میں دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ کوے دادا میرا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی میں کوے دادا کے پاس پہنچا وہ جھم سے پانی میں کود پڑا اور اس کا اشارہ پاتے ہی میں بھی فوراً دریا میں گھس گیا۔

جب ہم کمر کمر پانی میں پہنچ گئے تو کوے دادا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھے پیچھے کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔

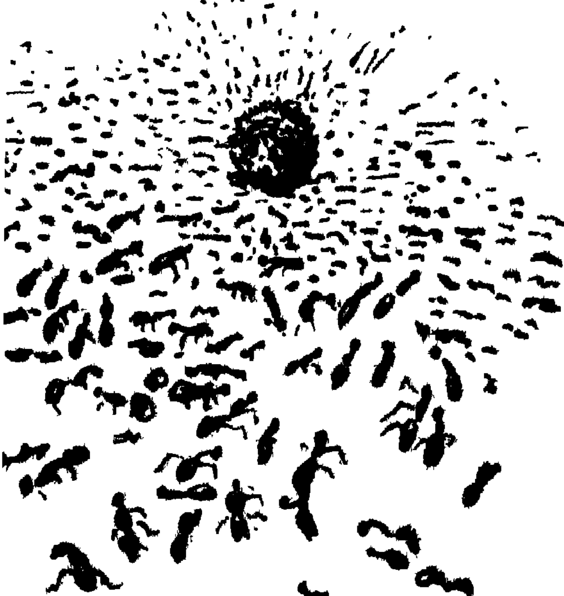
زمین، گھاس، جھاڑیاں، درختوں کے تنے، شاخیں اور پتے ہر چیز چیونٹیوں سے لدی ہوئی تھی۔ ہر چیز سیاہ ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر چیز کو بکھر بکھر کرتے ہوئے تارکول سے پوت دیا گیا ہو۔ اس نظارے کو ٹپ ٹپ، پٹر پٹر کی آواز نے جس سے اب کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور بھی زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ چیونٹیوں کے اس سیلاب نے اب

دریا کے کنارے کا رُخ کیا۔ ذرا سی دیر میں تمام چیونٹیاں درختوں اور جھاڑیوں سے اتر اتر کر کنارے پر اکٹھا ہونے لگیں۔ چند ہی لمحے میں ایسا لگنے لگا جیسے دریا کے کنارے پر چار پانچ موٹا رنگ بجاتا ہوا کالا کمبل بچھا دیا گیا ہے۔

ہاں! میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ان چیونٹیوں نے اس آگ پر بھی حملہ بول دیا تھا جس پر ہمارا شکار کیا ہوا سوٗر بھُن رہا تھا۔ شروع کی پچاس ساٹھ ہزار چیونٹیاں جل کر راکھ ہو گئی تھیں مگر انھوں نے آگ کو بجھا دیا تھا اور ان کی جلی ہوئی لاشوں پر سے گزر کر بقیہ چیونٹیاں دریا کے کنارے تک آ گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان چیونٹیوں نے ایک خاص سمت کی طرف یلغار کیا تھا اور جو چیز بھی ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالتی تھی اس کو تہس نہس اور برباد کر کے آگے بڑھتے رہنا ان کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔

چیونٹیوں کا یہ موٹا کمبل ہم سے چند گز کے فاصلے پر کنارے پر پڑا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ چیونٹیاں اب ہم پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ڈر کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کوے داوا کی طرف دیکھا۔ اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر میری کچھ ڈھارس بندھی، اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر مجھے خود آج تک یقین نہیں آتا۔ حالاں کہ وہ سب کچھ میری اپنی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

ہوا یہ کہ کروڑوں بلکہ اربوں چیونٹیوں کا بنا ہوا وہ کمبل آہستہ آہستہ سمٹنے اور ایک گولے کی شکل اختیار کرنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے



گولا پہلے فٹ بال کی برابر ہوا۔ پھر اس کے

گرد اور چیونٹیاں چمٹنے لگیں۔ زمین اور پیڑوں پر رینگتی ہوئی سب چیونٹیوں کا رُخ اس گولے کی طرف ہوگیا۔ تین چار منٹ کے اندر یہ گولا ایک بڑے گھڑے کے برابر ہوگیا۔

جب ایک بھی چیونٹی کسی کی طرف نہ رہی تو ——— تو وہ گولا ایک جھٹکے کے ساتھ اچھل کر پانی میں آگرا۔ پھر لڑھکتا ہوا چکّر کھاتا ہوا پانی کی سطح پر آگے بڑھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دریا کے بیچ دھارے میں پہنچ گیا۔ تعجب کی بات تھی کہ پانی کے بہاؤ کا اس کے رُخ پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ گولے کا رُخ دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ میں حیرت سے منہ کھولے اس گولے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ جب گولا دوسرے کنارے کے قریب پہنچ گیا تو میں نے سوالیہ نظروں سے کومے واوا کی طرف دیکھا۔ اس نے میرے دل کی بات تاڑلی اور بولا:

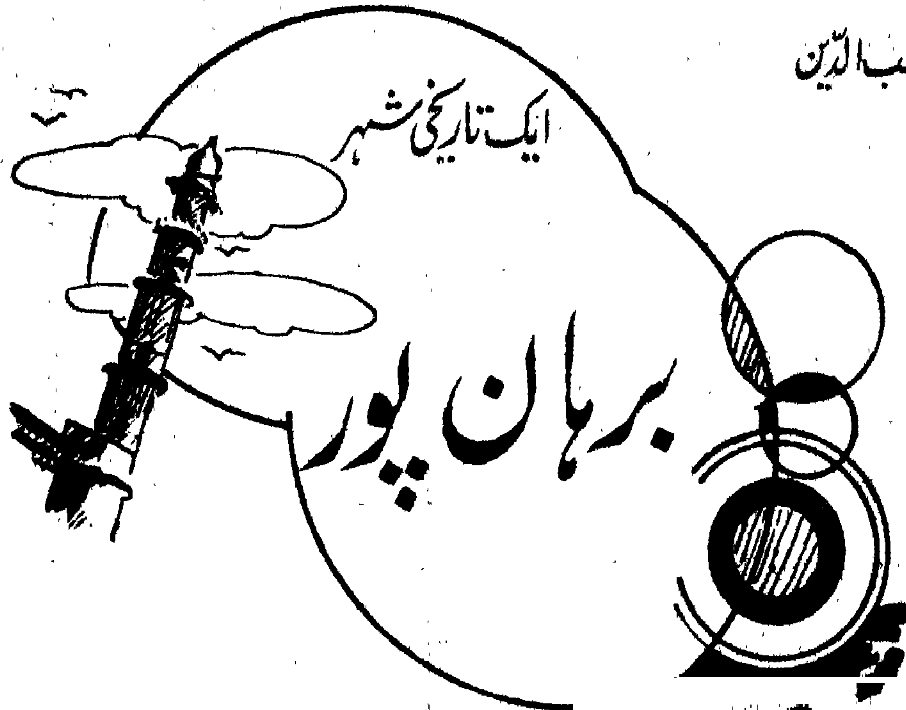
"اُس کنارے پر پہنچ کر گولا پھر منتشر ہوجائے گا اور لڑاکو چیونٹیوں کا یہ لشکر اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ جائے گا۔ آگ یا پانی کوئی بھی چیز اس لشکر کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ اُس کنارے پر تم کو ان چند ہزار چیونٹیوں کے مردہ جسم ضرور ملیں گے جو گولے کے اُوپری حصّے پر تھیں اور بھیگ کر یا ڈوب کر مرگئی تھیں ان چیونٹیوں نے اپنی جان دے کر اندر کی چیونٹیوں کو مرنے سے بچالیا۔

"قربانی کی کیسی انوکھی مثال!" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا ——— "ہم اپنے کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں مگر نہ جانے کتنے سبق ان چھوٹے اور حقیر جانوروں اور کیڑے مکوڑوں ہی سے ہم کو حاصل کرنا پڑیں گے۔"

چیونٹیوں کے اس سیلاب کے نظر سے اوجھل ہونے کے بعد ہم دونوں پھر کنارے پر آگئے اور اس جگہ گئے جہاں ہم سوٗر کو آگ پر چھوڑ آئے تھے۔ وہاں ہمیں راکھ کا ایک ڈھیر نظر آیا جس میں سوٗر کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ گوشت اور پوست سے ایک دم صاف۔ تھوڑی دیر تک ———

(باقی صہ ۵۹ پر)

جناب حسیب الدین



دکن کی دلّی ——— دارالسرور برہان پور

اپنی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے ایک خاص تاریخی اہمیت کا مالک ہے۔ اس شہر کو سنہ ۸۰۳ھ ۱۴۵۰ء میں نصیر خاں فاروقی نے آباد کیا اور شاہ جہاں نے سنہ ۱۰۳۹ھ - سنہ ۱۶۲۹ء میں اسے دارالسرور کا خطاب بخشا۔

برہان پور میں فاروقی خاندان کے ۱۳ بادشاہوں نے دو سَو سال سے زیادہ عرصۂ حکومت کی۔ ان کے دورِ حکومت نے کئی یادگاریں چھوڑیں جو ان کی عظمت و شان اور جاہ و جلال کی یاد دلاتی ہیں۔

یہ شہر دریائے تاپتی کے کنارے ایک خوش نما مقام پر آباد ہے۔ اس کے شمال میں جنوبی ہند کی واحد شاہ راہ پر اسیر کا ناقابلِ تسخیر قلعہ "کلیدِ دکن" واقع ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ یہاں کا صوبہ دار تھا۔ اس کی صوبے داری کا زمانہ برہان پور کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ وہ یہاں تقریباً ۳۵ سال رہا۔ اسی سرزمین پر اسے انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اور جب قسمت نے بُرے دن دکھائے تو انتہائی زوال

ی ذلتیں بھی یہیں برداشت کیں۔
خان خاناں نے یہاں بہت سی شاندار عمارتیں بھی بنوائیں اور برہان پور کو رشکِ بہشت بنا دیا۔ ان میں سے چند کے نام سنیے۔ نہر خضر۔ صفیہ جامع مسجد۔ تالاب لال باغ۔ دار الشفاء۔ حمام۔ ان کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں، باغ، محل اور سرائیں بنوائیں۔ شاہ جہاں نے بھی عالی شان عمارتیں بنوانے کی ابتداء برہان پور سے کی۔ محل گل آرا۔ آہو خانہ کے محلات۔ بارہ دری۔ چہل ستون۔ بیگم شاہ شجاع کا مقبرہ اسی کے بنوائے ہوئے ہیں۔

شاہ جہاں کے عہد میں ۱۶۴۱ء اور ۱۶۵۶ء میں مشہور سیاح ٹیورینر دو مرتبہ برہان پور آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں کی تجارت اعلیٰ پیمانہ پر تھی یہاں سے آب رواں عمدہ قسم کا ململ، ساٹن وغیرہ ایران۔ ترکی۔ پولینڈ۔ عرب اور قاہرہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی بھیجا جاتا تھا۔ ساٹن رنگین اور پھول دار ہوتا تھا۔ جو بدیسی ملکوں میں نقاب۔ پلنگ پوش اور رومال بنانے کے کام آتا تھا۔

ریشمی کپڑے اور زربفت کی یہاں بہتات تھی۔ تانے بانے میں سونے چاندی کے تار لگائے جاتے تھے۔ ریشمی کپڑوں پر بنے ہوئے پھول دونوں طرف سے یکساں اور دیدہ زیب نظر آتے تھے۔ ریشمی کپڑے اور زر بفت کی قیمتی اوڑھنیاں ایران اور ترکی بھیجی جاتی تھیں۔

مقدمہ رقعاتِ عالم گیری کے فاضل مصنّف نے لکھا ہے کہ برہان پور میں شاہجہاں، جہاں آرا، دارا اور اورنگ زیب کے کپڑے کے کارخانے تھے۔ اور یہ صنعت یہاں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔

چیزوں کی یہاں بڑی افراط ہونے کی وجہ سے دنیا کے ہر حصے سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ انگریزوں کا یہاں ایک کارخانہ تھا۔ یہاں سے ان کو تجارتی سامان۔ پارہ۔ سیسہ، ٹن، کپڑا، ساٹن اور مخمل فراہم کیا جاتا تھا۔ شہر میں سورت (SORUT) کے ملک التجار بیرجی بوہرہ کی آڑت کی دوکان تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری کمپنیاں اس کی مقروض تھیں۔

انگریزوں کا پہلا دلال ——— جادو داس برہان پوری تھا جس کی بے ضابطگی گر دیانتداری کا ذکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر کارپردازوں

کے خطوط میں ملتا ہے۔ ان خطوط کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برہان پور میں نیل کی پیداوار اور تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ برہان پور کا نیل ملاوٹ سے پاک اور دوسرے مقامات کے نیل کی بہ نسبت سستا بھی تھا۔

برہان پور اور گجرات سے سوت، کپاس، بحرۂ احمر، ہرمز، بصرہ اور فلپائن وغیرہ جاتا تھا۔ زین آباد کاغذ سازی کے لیے مشہور تھا۔ یہاں ایک ٹکسال تھی، توپیں ڈھالنے کا کارخانہ۔ فاروقی دور میں یہاں کئی توپیں ڈھالی گیئں۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد حسین عرب کی نگرانی میں "ہیبت الملک" توپ ڈھالی گئی، جو گورنر ہاؤس ناگ پور میں رکھی ہوئی ہے۔

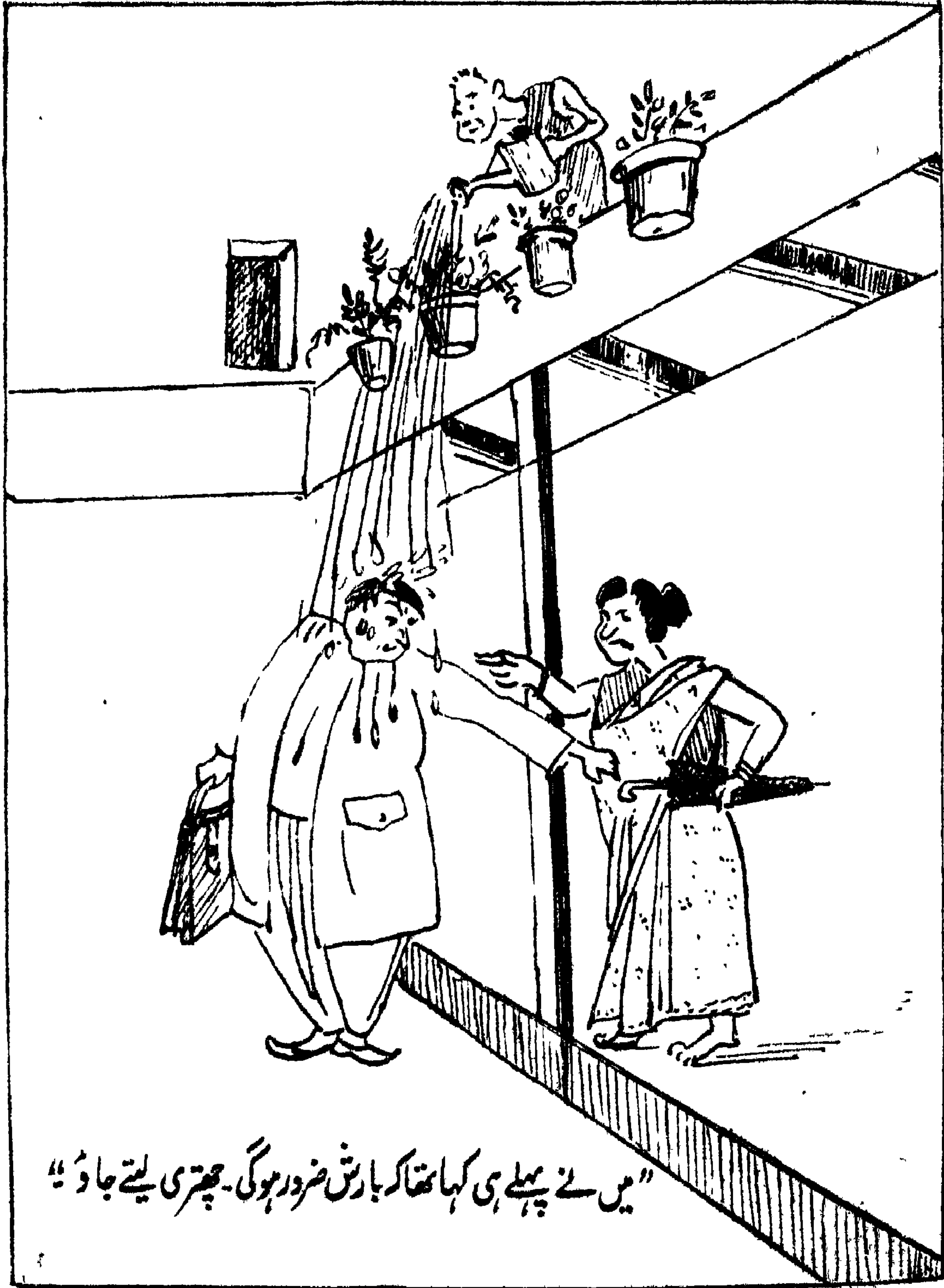
برہان پور شہر کے اردگرد ایک مضبوط فصیل ہے۔ اس میں ۱۲ دروازے ہیں۔ جن کے الگ الگ نام ہیں۔ یہ فصیل اب جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس فصیل کو نظام الملک آصف جاہ نے بنوایا تھا۔

مرہٹہ دورِ حکومت کی یادگار ——

دریائے تاپتی کے کنارے خوب صورت گھاٹ اور مندر ہیں۔ دریا کے مشرقی کنارے سے شہر پناہ کے عقب ان گھاٹوں کا منظر بڑا حسین نظر آتا ہے "اشنان" کے موقعوں پر یہاں بے پناہ ہجوم رہتا ہے۔

پر اب یہ شہر صرف مقبروں، مسجدوں، کھنڈروں اور ویرانوں کا شہر رہ گیا ہے۔ جن میں سے چند قابل دید یہ ہیں: -

آہو خانہ، محل گل آرا، اسیر، شاہ باجن کا مقبرہ، گنبد بیگم شاہ شجاع، راجہ کی چھتری، حضرت شاہ بھکاری کا مقبرہ۔ مقبرہ شاہ نواز، پیر خاں کا تکیہ، اکبری سرائے، راجہ جسونت سنگھ اور مہابت خاں کے محلات، ملا طاہر کے محل کے کھنڈرات اور علاقہ پیر پاکھر (فاخر؟) میں گنبدوں کا طویل سلسلہ۔



"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بارش ضرور ہوگی۔ چھتری لیتے جاؤ"

جناب محمد قاسم صدیقی





(پرندوں کی کہانی)

اُلّو اُداس کیوں رہتا ہے

کیا آپ نے کبھی اُلّو دیکھا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اُلّو اس قدر غمگین اور افسردہ کیوں دکھائی دیتا ہے؟ کیا آپ کو اس پر کبھی حیرت نہیں ہوئی کہ اُلّو اپنی عقلمندی کے لیے اس قدر کیوں مشہور ہے؟ آیئے آج ہم آپ کو یہ کہانی سنائیں۔

بہت زمانہ گزرا جب دنیا میں برگد کے درخت نہیں ہوتے تھے پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اُلّو نے زمین پر برگد کی ایک ننھی سی کونپل پھوٹتی دیکھی۔ دوسری چڑیوں نے بھی اس ننھّے سے پودے کو دیکھا مگر کوئی اہمیت نہ دی مگر اُلّو ان چڑیوں سے زیادہ دوراندیش تھا اس نے چڑیوں سے کہا "عقل سے کام لو اور اس پودے کو بڑا ہونے سے پہلے اُکھاڑ پھینکو ورنہ ایک دن یہ پودا جوان ہوکر برگد کا درخت بن جائے گا، اس کی شاخوں سے ایک طرح کا گوند نکلے گا اس گوند سے آدمی لاسہ تیار کرکے چڑیوں کو پکڑا کرے گا۔"

مگر چڑیوں نے اُلّو کی بات پر کان نہیں دھرا۔ وہ ہنسی خوشی گاتی ناچتی اور درختوں

شاخوں پر پھدکتی رہیں۔ ادھر برگد کا پودا برابر بڑھتا رہا۔ پھر آدمیوں نے سن اور جوٹ کے بیج بونے شروع کر دیے۔ چڑیوں نے اس کی طرف بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ صرف اُلّو آنے والے خطرے کو بھانپ گیا۔ اس نے چڑیوں سے کہا " ان بیجوں کو جلدی جلدی چگ لو ورنہ ان سے سن پیدا ہوگا۔ آدمی سن سے رسّی اور ڈوریاں تیار کرے گا اور ان ڈوریوں سے چڑیوں کے پکڑنے کے لیے جال بنائے گا۔"

لیکن چڑیوں نے پھر اُلّو کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنے ناچ گانے میں لگی رہیں۔ ادھر سن کے پودے بڑھتے رہے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ایک آدمی جنگل میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں تیر اور کمان تھے۔ اس بار پھر اُلّو نے چڑیوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کیا اس نے ان سے کہا:۔

"اپنے پروں کو زمین پر مت گرنے دو ورنہ یہ آدمی جو تمھارا جانی دشمن ہے ان کو اپنے تیروں میں لگائے گا اور پھر تمھاری خیر نہیں۔"

چڑیوں نے اُلّو کی ایک نہ سنی اور اس کا خوب مذاق اڑایا، مگر پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ اُلّو نے جو کچھ کہا تھا صحیح تھا۔

برگد کا درخت بڑھ کر جوان ہو گیا اور اس کی شاخوں سے نکلنے والے گوند سے آدمی نے لاسا تیار کر کے چڑیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ سن کے پودے بڑھ کر پک ہو گئے اور ان کے ریشوں سے ڈوریاں بنا کر آدمی نے چڑیوں کے پکڑنے کے لیے جال تیار کیے۔ تیر انداز نے چڑیوں کے پر چُن چُن کر اپنے تیروں میں لگا لیے اور چڑیوں کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ اب چڑیوں کو اس مصیبت کا احساس ہوا اور وہ بھاگی ہوئی اُلّو کے پاس گئیں۔ مگر اب اُلّو کیا کر سکتا تھا وقت گزر چکا تھا۔

بیچارہ اُلّو بس جبھی سے اداس ہے، غمگین ہے، دکھی ہے، اور کسی ٹھٹ پر بیٹھا چڑیوں کی عقل کا ماتم کرتا رہتا ہے۔



جناب قاضی محمد احمد



کوئلا پیدا کرنے والے خاص خاص ملک

دنیا میں کوئلا پیدا کرنے والے خاص خاص ملک ایک دو نہیں بہت سے ہیں۔ امریکا ہے، روس ہے، جرمنی ہے، برطانیہ ہے، فرانس ہے، پولینڈ ہے، جاپان ہے، چیکوسلوواکیہ ہے، بلجیم ہے، چین ہے، آسٹریلیا ہے، جنوبی افریقہ ہے، اور اپنا دیس ہندوستان ہے۔

کوئلے کی پیداوار میں اب تک امریکا (علاوہ ۱۹۳۸ء کے جبکہ جرمنی بڑھ گیا تھا) سب سے آگے رہا ہے۔ اس وقت دنیا کی کل پیداوار کا تقریباً ۱۹ فیصدی کوئلا امریکا کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔

اس وقت ساری دنیا کی کانوں سے جتنا کوئلا نکالا جاتا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصہ ان ملکوں کی کانوں سے نکالا جاتا ہے جنھوں نے صنعت وحرفت میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ان میں بھی امریکا، روس، برطانیہ، جرمنی سب میں آگے آگے ہیں۔ ایک مزے کی بات سنیے: ان ملکوں کی آبادی بہت کم ہے دنیا کی ساری آبادی کا کل بیس فی صدی۔ اور کوئلا ان کے یہاں سے کتنا نکلتا ہے۔ دنیا کی پوری کانوں کی نکاسی یا دنیا کی پیداوار کا ساٹھ فی صدی نکلتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایشیا (علاوہ چین و روس) افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی امریکا کی کانوں سے جتنا کوئلا نکلتا ہے وہ اتنا بھی تو نہیں جتنا اکیلا برطانیہ سے نکلتا ہے۔

کوئلے کے خرچ میں کفایت اور احتیاط ضروری ہے

ویسے تو یہ بات ہر چیز پر لاگو ہوتی ہے۔ جو چیز بھی آپ مناسب احتیاط اور کفایت سے خرچ کریں گے اس میں ضرور برکت ہوگی اور وہ بھی بہت دنوں تک آپ کے کام آئے گی۔ کوئلے کا معاملہ تو بہت اہم ہے۔ کوئلا پیڑ پودے کی طرح کوئی بڑھنے اور پھیلنے والی چیز تو ہے نہیں وہ تو کوئلے کی کانوں میں جتنا بھی ہے اتنا ہی رہے گا۔ مثلاً ایک کان میں بیس لاکھ ٹن ہے تو وہ اتنی ہی مقدار میں رہے گا۔ اس میں بڑھنے کی اور زیادہ ہونے کی صلاحیت نہیں اگر آپ اسے بہت احتیاط سے استعمال کریں گے صرف ضروری کاموں میں خرچ کریں گے۔ ۲۰ لاکھ ٹن کوئلا ظاہر ہے زیادہ دنوں چلے گا۔ آپ نے بے احتیاطی، لاپروائی اور پھوڑ پن سے کام لیا تو جلد ختم ہو جائے گا اس لیے سمجھ دار لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئلا صرف ان ہی چیزوں کے لیے استعمال ہونا چاہیے جہاں اس کے بغیر کام نہیں نہیں چل سکتا۔ اگر مندرجہ ذیل تین باتوں کا خیال رکھا جائے تو ہمارے دیس کا کوئلا بہت دنوں کے لیے کافی ہوگا۔ ہمیں اسے کفایت سے خرچ کرنا ہوگا کیونکہ جس رفتار سے یہ اب کانوں سے نکالا جا رہا ہے ۱۰۰ سال سے زیادہ اس کے ذخیرے نہ چل سکیں گے۔

۱۔ اچھے قسم کے کوئلے سے صرف دھاتیں پگھلائی جائیں۔ چھوٹے موٹے کارخانہ چلانے کے لیے اور بھاپ بنانے کے لیے اچھے قسم کا کوئلا بالکل نہ استعمال کیا جائے۔ یہ کام معمولی کوئلے سے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بجلی بنانے کے لیے بھی معمولی قسم کا کوئلا استعمال کیا جائے۔

۲۔ ہمارے یہاں کوئلا نکالنے کا طریقہ بہت نرالا ہے۔ ہم صرف اچھے قسم کا کوئلا باہر نکالتے ہیں۔ معمولی اور گھٹیا قسم کے کوئلے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ یوں ہی بے کار پڑا رہتا ہے۔ اس طریقے کی اصلاح ہونی چاہیے۔

مگر اس طریقے میں سدھار بہت مشکل ہے کوئلے کا کاروبار ملک کے سرمایہ دار لوگوں کے ہاتھ میں ہے یہ لوگ اپنے نفع کی خاطر صرف اچھا کوئلا نکالتے ہیں۔ معمولی کوئلا کانوں میں

(بقایا صلا پر)

ماسٹر:۔ لڑکو، بتاؤ لکڑی پانی میں کیوں نہیں ڈوبتی؟

لڑکا: جناب لکڑی پانی میں تیرنا جانتی ہے!

لڑکا:۔ (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب میرے کان میں اٹھنی گھس گئی ہے۔ اسے نکال دیجیے۔

ڈاکٹر:۔ کب گھسی تھی؟

لڑکا:۔ کوئی چھ مہینے ہو گئے ہوں گے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر:۔ تو اب تک نکلوائی کیوں نہیں؟

لڑکا:۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی ڈاکٹر صاحب۔ پر آج جیب خالی ہے۔

استاد:۔ جمال بتاؤ نقشے میں امریکہ کہاں ہے؟

جمال:۔ (امریکہ دکھاتے ہوئے) یہ ہے۔

استاد:۔ اچھا ٹھیک ہے۔ اب طاہر تم بتاؤ امریکہ کو کس نے ڈھونڈا

طاہر:۔ جمال نے۔

"میں ایک ایسی کہانی سنا سکتا ہوں جسے



سن کر لوگوں کے سر کے بال کھڑے ہو جائیں"

"براہ مہربانی کسی گنجے آدمی کو سنائیے"

ڈاکٹر:۔ (مریض سے) آپ کو بخار کس کس وقت محسوس ہوتا ہے؟

مریض:۔ جب جب میں تھرمامیٹر دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر:۔ لو یہ گولیاں دن میں تین مرتبہ کھالینا۔

مریض:۔ ڈاکٹر صاحب گولیاں کھانے کی ہمت ہوتی تو فوج میں بھرتی نہ ہو جاتا۔

محمد سلیم (جامعہ)

مناظر عاشق ہرگانوی

پہل گام

وادیٔ کشمیر کو لوگ جنت نظیر کہتے ہیں
کیوں ؟
یہاں آسمان کو چومتی ہوئی پہاڑی چوٹیوں پر پگھلتی ہوئی برف ہے، کانوں میں ترنم گھولنے والے جھرنوں کا شور ہے، پتھریلی چٹانوں سے سرسراتے ہوئے چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں۔ چنار اور آلوچے کے لہلہاتے ہوئے حسین باغات ہیں، پہاڑ کے شاداب دامن میں سرسبز مرغزار ہیں اور وہ خوب صورت نظارے جنہیں دیکھ کر خود قدرت کو بھی رشک آتا ہے ـــــ اور سری نگر ـــــ

کشمیر کا سب سے حسین شہر، مشرق کی جنت، ہندوستان کا وینس، جو سات پلوں پر بسا ہوا ہے، جس کے دامن میں دریائے جہلم اور ڈل لیک کی بل کھاتی ہوئی موجیں ہیں۔ جس کے سینے پر چھوٹے چھوٹے شکارے دوڑتے ہیں، خوب صورت ہاؤس بوٹ ہچکولے کھاتے ہیں اور جہاں باغات کے فواروں سے روپہلی چمکیلی دھاریں سنگِ مرمر کے حوض میں تیرتے ہوئے کنول کا سماں دکھلاتی ہیں۔

اسی سری نگر سے ۶۲ میل دور ۲۰۰۰ ے

فٹ کی بلندی پر پہل گام ہے یہ چاروں طرف سے اونچے اونچے سرسبز پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور اپنے خوب صورت نظاروں اور صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

سردیوں کے چار مہینوں میں یہاں کی وادی سفید برف سے ڈھک جاتی ہے اور سردی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بستی بالکل خالی ہو جاتی ہے۔ مگر جولائی اور اگست کے مہینوں میں یہاں کی آبادی پندرہ بیس ہزار سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لوگوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ہوٹلوں کے کمرے کھچا کھچ بھر جاتے ہیں اور پلیٹو (ایک میدان ہے) لدّر ندی کے کناروں اور ویران جگہوں پر چھوٹے بڑے خیمے لگ جاتے ہیں۔ ان خیموں کی قطاریں ایک عجیب سماں پیدا کر دیتی ہیں۔

لدّر ندی اپنے سرد اور شفاف پانی سے پہل گام کو ہمیشہ دل کش اور سرسبز بنائے رکھتی ہے۔ اس میں پچاس پچاس فٹ چوڑی دو مختلف دھاریں دو مختلف سمتوں سے پہل گام کے [illegible] آ کر ملتی ہیں اور ایک ہو کر بہنے لگتی ہیں۔

ندی کے کنارے پر نہایت دل فریب مناظر کے درمیان "پہل گام کلب" ہے۔ شام کے اوقات میں یہاں اچھی خاصی رونق رہتی ہے۔ مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے اور بچے اپنے دل پسند کھیلوں اور تفریحوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ کلب کے ایک طرف بچوں اور بچیوں کے لیے جھولے پڑے ہیں تو دوسری طرف فٹ بال، کرکٹ وغیرہ کھیلنے کے میدان بھی ہیں۔

اگر پہل گام کے بازار کی طرف نکل جائیے تو کشمیر کی سبزیاں، پھل، سمور اور کھالوں کا خوب صورت سامان بکتا ہوا نظر آئے گا ان کے علاوہ دواؤں کی دکانیں بساطی اور پنساریوں کی دکانیں ہیں، ہوٹل ہیں خیموں کی دکانیں ہیں جہاں میز، کرسیاں، لیمپ اور آرائش کی دوسری چیزیں کرایہ پر ملتی ہیں دودھ دہی، چائے، گھی اور مکھن بھی بکتے نظر آئیں گے۔ یہاں ڈاک خانہ اور ہسپتال بھی ہے۔ ڈاک بنگلہ اور تھانہ بھی ہے سڑکوں پر دوڑتے ہوئے موٹر بھی ہیں گھوڑے اور

خچر کی سواری بھی ہے۔

پہل گام کے قابلِ دید مقامات کی سیر کرنا چاہیں تو "ٹلیبن" اور "سرور" کی طرف نکل جایئے۔ ڈاک خانہ کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی چیڑ کے گھنے درختوں کے پیچھے سے اوپر پہاڑ کو گئی ہے۔ یہی "ٹلیبن" جانے کا راستہ ہے۔ ڈھائی میل کی چڑھائی کے بعد "بائی سرن" نام کا ایک خوبصورت مقام آئے گا۔ یہاں ایک خوب صورت میدان ہے۔ پاس ہی صاف شفاف پانی کے جھرنے چھوٹے چھوٹے آبشار بنا کر گر رہے ہیں۔ میدان میں چاہیں تو خیمے لگا کر ٹھہر سکتے ہیں نہیں تو بائیں طرف سے راستہ طے کیجیے۔ پھر چھ میل اوپر پہنچنے پر درختوں سے خالی ایک میدان نظر آئے گا۔ یہ میدان "ٹلیبن" ہے۔ درخت اور سبزہ یہاں سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک برفانی ندی بہتی رہتی ہے اور اس کے چاروں طرف ننگے پہاڑ ہیں۔ جن پر کہیں کہیں برف دکھلائی دیتی ہے۔ یہ مقام تنہائی پسند آدمیوں کے لیے کافی کشش رکھتا ہے۔

"سرور" جانے کے لیے "ٹلیبن" سے آگے بڑھیے یا پہل گام سے گیارہ میل کی اونچائی پر جایئے۔ لیکن "ٹلیبن" سے آگے جانے کے لیے نہ کوئی پگڈنڈی ہے اور نہ کوئی راستہ۔ بلکہ پتھروں سے بھرے ایک خشک نالہ کے ذریعہ طے کرنا ہوگا ——— نوک دار پتھروں پر قدم جما کر آگے بڑھتے جایئے۔ کچھ دور اوپر چڑھنے پر ایک ندی بہتی دکھائی دے گی۔ یہاں ٹھہر کر سستا سکتے ہیں۔ پھر آگے بڑھیے۔ یہاں تک کہ چوٹی پر پہنچ جایئے۔ یہاں ایک وسیع برفانی جھیل ہے۔ جس کے اردگرد برف پوش پہاڑوں کی لافانی دیوار نظارہ کو اور بھی زیادہ خوب صورت بنا رہی ہے۔ چاروں طرف سے برف کا پانی پگھل پگھل کر جھیل میں چھوٹے چھوٹے آبشار دوزخ کی صورت میں گر گر کر دل کش منظر پیش کرتا ہے۔ اور ایسے میں اگر سورج چمک رہا ہو تو جمی ہوئی برف پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑوں نے سفید چاندی کے چمکتے ہوئے تاج پہن رکھے ہوں۔





دیکھیے آتے ہیں مچھّر کیسے بَل کھاتے ہوئے
بِھن بِھناتے اور اپنی دُھن میں کچھ گاتے ہوئے

حملہ آور ہوتے ہیں ہر اک پہ کتراتے ہوئے
اور ہر گھر میں چلے آتے ہیں ڈراتے ہوئے

فائلیریا کی بیماری کو پھیلاتے ہوئے
اور ملیریا کی سب پر آگ برساتے ہوئے

پیلیا بھی کاٹنے سے ان کے ہوتا ہے کبھی
اس طرح پھرتے ہیں وہ امراض پھیلاتے ہوئے

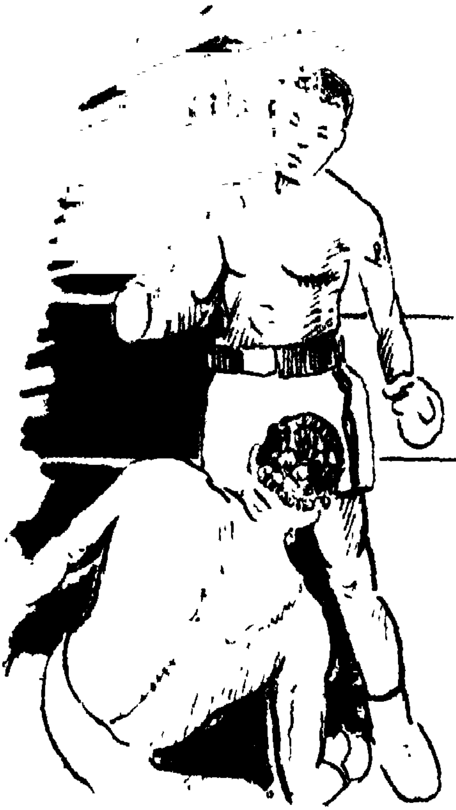
دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے در و دیوار پر
چھاؤنی چھاتے ہیں اپنی خوب اتراتے ہوئے

ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ ہو یا فلٹ ہو جس جگہ چھڑکا ہوا
موت آتی ہے انھیں پھر اُس جگہ جاتے ہوئے

مچھّروں کی زد سے بچنا چاہتے ہیں جو منیرؔ
تم انھیں پاؤ گے مچھّردانیاں لاتے ہوئے

جناب محمد عبید اللہ شریف

محمد علی کلے



۲۵ رمئی ۱۹۶۵ء کی رات یادگار رات ہے کیشیس کلے نے اس رات ہیوسٹن میں باکسنگ کے مقابلے میں سونی لسٹن کو شکست دے دی۔ اس مقابلے میں کل ایک منٹ لگا ہوگا اس طرح کلے نے ہیوی ویٹ کے عالمی چیمپین کا اعزاز دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

محمدؐ علی کلے (کیشیس کلے) نے ۱۵ سال کی عمر میں باکسنگ کی مشق شروع کی تھی۔ انھیں لائٹ ہیوی ویٹ کا اولمپک گولڈ میڈل ۱۹۶۰ء میں دیا گیا۔ میڈل حاصل کرنے کے بعد وہ پیشہ ور باکسر بن گئے اور باکسنگ کے (۱۹) مقابلوں میں اپنے حریفوں کو شکست دے چکے ہیں۔

محمدؐ علی کلے ۱۸ر جنوری ۱۹۴۲ء کو لوزویل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کیشیس کلے ایک کمرشیل آرٹسٹ ہیں وہ انھیں بہت چاہتے ہیں۔ محمدؐ علی کلے کے چھوٹے بھائی والیٹنو کلے بھی باکسنگ کو اپنا پیشہ بنانا چاہتے ہیں۔ محمدؐ علی کلے بہت ہی ذہین اور بذلہ سنج ہیں۔

محمد علی کلے نے لوزویل کے سنٹرل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی دوستوں نے انھیں راک فائبر اور بائیسکل چیمپین کا خطاب دے دیا تھا۔

ایک دفعہ کسی نے محمد علی کلے کی بائیسکل چرالی۔ چوری کی اطلاع دینے کے لیے جب لوزویل کے پولیس افسر کے پاس پہنچے تو پولیس افسر مارٹن نے (جو کمیونٹی جمنازیم میں باکسنگ کی تعلیم دیا کرتے تھے) محمدؐ علی کلے کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ ایک بہترین باکسر بن سکتے ہیں چنانچہ مارٹن نے انھیں جمنازیم آنے کی دعوت دیدی۔

اس طرح محمدؐ علی کلے کو ایک ایسا استاد مل گیا جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے پچھلے بیس سال میں دس ہزار سے زیادہ نوجوانوں کو باکسر بنایا ہے۔

محمدؐ علی کلے کو ۱۵ سال کی عمر میں دل کا عارضہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ بہترین علاج اور مکمل آرام کی وجہ سے صحت یاب ہو گئے تھے۔ لیکن باکسنگ کی کل چھ ہفتے کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے "چیمپئن آف ٹومارو" کے ٹیلی ویژن پروگرام میں حصہ لیا۔ اس مقابلے کی بے حد ستائیش کی گئی۔

پیشہ ور باکسر بننے سے پہلے انھوں نے (۱۰۸) دوستانہ مقابلوں میں حصہ لیا اور ایک سو مقابلے جیتے انھیں چھ مرتبہ گولڈن گلو کا اعزاز بھی ملا۔ محمد علی کلے ایک امریکن نیگرو ہیں انھوں نے چند سال پہلے اسلام قبول کیا ہے یہ ۱۹۵۹ء میں نیشنل گولڈن گلو کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا وزن ۱۴ اسٹون، ۱ پونڈ ہے محمدؐ علی کلے کے متعلق اتنا معلوم ہو جانے کے بعد باکسنگ کے گذشتہ ریکارڈ پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے جو درج ہے یہ ریکارڈ مقابلہ ختم ہونے کے وقت کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

کیشیس کلے (محمدؐ علی کلے) نے سونی لسٹن کو ۲۵ رمئی ۱۹۶۵ء بمقام لیوسٹن ایک منٹ میں ہرایا۔

ٹامی برنس نے جم روچے کو ۱۷ر مارچ ۱۹۰۸ء بمقام ڈبلن ایک منٹ ۲۸ سکنڈ میں شکست دیدی۔

جو لوئس ماکس نے اسکیملنگ کو ۲۲ر جون ۱۹۵۸ء بمقام نیویارک دو منٹ چار سکنڈ میں ناک آؤٹ کیا۔

سونی لسٹن نے فلوئڈ پٹرسن کو ۲۵ر ستمبر ۱۹۶۲ء بمقام شکاگو دو منٹ چھ سکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے ٹمی موریلو کو ۱۸ ستمبر ۱۹۴۲ء بمقام نیویارک دو منٹ نو سکنڈ میں ہرایا۔

ٹامی برنس نے بل اسکوٹر س کو ۴ جولائی ۱۹۰۷ء بمقام کلیفورنیا دو منٹ نو سکنڈ میں ناک آؤٹ کیا۔

سونی لسٹن نے فلوئڈ پٹرسن کو ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء بمقام لادس لگاس (نوادا) دو منٹ دس سکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے جیاک روپر کو ۱۷ اپریل ۱۹۳۹ء بمقام لاس انجلس کلیفورنیا دو منٹ بیس سکنڈ میں شکست دی۔

راکی مرسینو نے جرسی جو والکاٹ کو ۱۵ مئی ۱۹۵۵ء بمقام شکاگو دو منٹ ۲۵ سکنڈ میں شکست دی۔

جو لوئس نے جان ہنری لیوس کو ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء بمقام نیویارک دو منٹ ۲۹ سکنڈ میں ہرایا۔

جو لوئس نے بڈی بیر کو ۹ جنوری ۱۹۴۲ء بمقام نیویارک دو منٹ ۵۶ سکنڈ میں ہرایا۔

جیمس جیفری نے جیاک فنی گن کو ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء بمقام ڈیٹریا ڈشیگن ایک راؤنڈ میں ناک آوٹ کیا لیکن وقت ریکارڈ نہیں کیا گیا۔

(کوے دادا بقایا صفحہ ۴۳)

اُداس اور افسردہ نظروں سے ہم خاموشی سے اس ڈھانچے کو دیکھتے رہے۔ اس خاموشی کو کوے دادا کے ان الفاظ نے توڑا:

"یہی حشر ہوتا ہے اس آدمی کا جو زخمی ہونے یا کسی اور سبب سے ان چیونٹیوں کے راستے سے ہٹ جانے سے معذور رہتا ہے۔"

"اور اس آدمی کا بھی یقیناً یہی حشر ہوتا ہوگا جو میری طرح پیڑ پر چڑھ کر ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوگا۔"

"نک چپ! اب تم ہی بتاؤ کہ اس جنگل کا سب سے خطرناک جانور کون ہے؟"

"یقیناً وہی جس نے اس وقت ہم پر حملہ کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بزرگ اور بوڑھے بالو آنے بھی اس کو سب سے زیادہ خطرناک جانور بتایا ہے یا کسی اور کو۔ مگر آج کے تجربے نے تو مجھے یہی بتایا ہے۔"

(باقی آئندہ)



معلّم

کتابوں کی باتیں



چٹانوں کی کہانی: محمد امین

بچے عموماً سلیٹ پر لکھتے ہیں اور اپنی تختی پر سیلکھری
ماتے ہیں۔ قریب قریب ہر ایک گھر میں مسالہ پیسنے کی سل
ی ہے۔ ریل کے اسٹیم انجن میں کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ لیکن
سلیٹ، سیلکھری، سل اور کوئلہ ہیں کیا چیز؟ پتھر! جی ہاں
پتھر ہیں۔ ان سب کی چٹانیں ہوتی ہیں۔ اور بھی طرح طرح کی
انیں ہوتی ہیں۔ یہ چٹانیں، ٹیلے اور پہاڑ کی شکل میں زمین کے
پر دکھائی دیتی ہیں۔ زمین کھودنے پر بھی نکلتی ہیں اور سمندر کی تہہ
یں پائی جاتی ہیں۔ پہاڑ، برف سے ڈھکے ہوئے بھی ملتے ہیں اور
ل اُگلتے ہوئے بھی۔ پتھر نرم بھی ہوتا ہے اور سخت بھی۔ رنگین بھی اور سفید
ا۔ کھُردرا بھی اور چکنا بھی۔ اب یہ چٹانیں اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کتنی قسم
ہوتی ہیں؟ خاص خاص مشہور پتھروں کے نام کیا ہیں؟ یہ چٹانیں کیسے بن گئیں؟
بنیں؟ اب بھی بنتی بگڑتی رہتی ہیں یا نہیں؟ کس جگہ اور کیسی چٹانیں ہیں؟
ایسے تمام سوالات کا جواب، آپ "چٹانوں کی کہانی" میں پڑھیں گے۔ یہاں ہر

ایک بات بڑے سُلجھے ہوئے انداز میں بیان کر دی گئی ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ کتاب میں نقشے اور تصویریں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن یہ سب اتنی اچھی کتاب کی شان کے لائق نہیں ہیں۔ ہاں لکھائی چھپائی بالکل ٹھیک ہے۔ محمد امین صاحب، جغرافیائی معلومات کو بچوں تک پہنچانے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ ایک پکّے اور اچھے استاد ہی نہیں بلکہ تجربہ کار لکھنے والے بھی ہیں۔ اُن کی دل چسپ اور مفید کتابوں میں 'موسم اور آب و ہوا'، 'مصنوعی بارش'، 'سورج اور اس کا خاندان' اور 'ماؤنٹ ایورسٹ کی کہانی'۔ خاص طور ذکر کے قابل ہیں۔

امین صاحب نے کتاب کے آخر میں "کیا آپ جانتے ہیں" لکھ کر بہت سے سوال پوچھ لیے ہیں۔ آپ شاید سوچیں کہ استاد ہی جو ٹھہرے۔ لیکن یہ سوال واقعی نہایت مناسب ہیں۔ جواب تو کتاب میں موجود ہی ہے۔ اپنا امتحان آپ لینے کا موقع نکل آیا ہے۔ پہلے کتاب پڑھیے اور پھر اپنی جانچ کیجیے۔ اس کے بعد امین صاحب نے "موقع ملے تو" لکھ کر کچھ کہا ہے۔ یہ سب کرنے کے کام ہیں، ہاں اگر موقع ملے تو۔ اس طرح امین صاحب نے ایک مصنّف اور استاد دونوں کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اب پورا پورا فائدہ اٹھانا آپ کا کام ہے۔ یہ کتاب، کہانی کی کہانی ہے، معلومات کی معلومات۔

بچّوں کی کوششیں

معافی

میرے دل پر جیسے بجلی سی گر گئی۔ میں نے بہت ادب و احترام سے ماسٹر صاحب کو سلام کیا تھا اور جواب ملا "اونھ" آج کئی برس بعد ماسٹر صاحب ملے تھے۔ ان سے ایسی امید نہ تھی۔

کوئی تین سال کی بات ہے میں گھر کے پاس ہی ایک پرائمری اسکول کے تیسرے درجے میں پڑھتا تھا۔ ایک دن ماسٹر صاحب نے بلیک بورڈ یا تختۂ سیاہ پر ایک تصویر بنائی اور سب سے پہلے مجھ ہی سے پوچھا: "بتاؤ خالد یہ کس کی تصویر ہے ؟"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس طرح کی کوئی تصویر اس سے پہلے نظر سے نہ گذری تھی اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر کیا تھا ماسٹر صاحب کی چھڑی میرے اوپر برس پڑی۔

پھر انھوں نے میرے برابر والے لڑکے سے پوچھا: "رام لال تم بتاؤ یہ کس کی تصویر ہے ؟"

رام لال نے جھٹ سے جواب دیا "شری کرشن جی کی"

شاباش شاباش ماسٹر صاحب نے اس کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ بار بار خیال آرہا تھا کاش ماسٹر صاحب مسجد کی تصویر بنا دیتے۔

دوسرے دن مدرسے جانے کا وقت آیا تو میں بہت اُداس اُداس سا تھا۔ امّی اور ابّا نے میری صورت دیکھ کر کہا: "کہو بھئی خیریت تو ہے، تمھارا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے !"

میں نے انھیں کل کی بات بتائی۔ ابا کو ماسٹر صاحب کی یہ بات پسند نہ آئی انھوں نے ایک دوسرے اسکول میں میرا نام لکھا دیا۔

اُن ماسٹر صاحب سے کبھی کبھی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ میں برابر سلام کرتا اور وہ منہ پھیر لیتے۔ ماسٹر صاحب نے مجھے معاف نہیں کیا تھا۔

ایک دن میں کسی کام سے بازار جا رہا تھا پیچھے سے کسی نے پیٹھ پر ہاتھ مارا، ارے! یہ تو رام لال تھا ہم دونوں بڑی محبت سے گلے ملے۔ رام لال نے کہا "تمھارے جانے کے بعد میں نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔ ہوا یہ کہ دوسرے دن تم تو آئے نہیں ماسٹر صاحب نے تختہ سیاہ پر ایک تصویر بنائی اور مجھ سے اسی طرح سوال کیا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا تو وہی چھڑی میرے اوپر برسنے لگی پھر انھوں نے ماجد سے پوچھا، ماجد نے جھٹ بتا دیا "مسجد" ماسٹر صاحب نے اسے خوب شاباشی دی۔ میں نے بھی تمھاری طرح اسکول چھوڑ دیا۔

یہ بات سن کر میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ تو یہ تو بہ میں ان سے کتنا بدگمان ہو گیا تھا۔ کاش میں دوسرے دن چلا گیا ہوتا۔

میں نے رام لال سے کہا۔ چلو دوست ماسٹر صاحب سے معافی مانگ لیں۔ رام لال فوراً راضی ہو گیا اور بولا میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ آج دیس میں ایسے استادوں کی ضرورت ہے۔

اور ہم دونوں ماسٹر صاحب سے معافی مانگنے چل دیے۔

غیاث شمس بریلوی

بدھو کی واپسی

بھابی جان نے چاروں طرف دیکھ کر کہا: "بدھو کہاں رہ گئے" اور میں نے بھیا کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ رہے" بھابی جان ہنس پڑیں! "ارے بھئی ہم انھیں نہیں بدھو کو پوچھ رہے ہیں"

بھیا نے بتایا کہ ان کے نوکر کا نام بدھو ہے۔ وہ آج کان پور سے آئے تھے۔ میری بات کا جواب

دے کر وہ باہر آئے سامان کو دیکھا بھالا ۔ پھاٹک کے پاس کئی چھوٹے بڑے بکس، بستر بند وغیرہ رکھے تھے ۔ اور سامان کے بیچوں بیچ ایک صاحب بیٹھے تھے ۔ دانت نکالے آپ سے آپ مسکرا رہے تھے ۔ انھیں دیکھتے ہی بھیّا نے نعرہ لگایا: "ارے بھئی یہ رہے ہمارے بدّھو" ایسا لگ رہا تھا جیسے بدّھو صاحب اس بات کے منتظر ہوں کہ سامان کے ساتھ انھیں بھی اٹھا کر گھر میں پہنچا دیا جائے ۔

سامان وغیرہ رکھنے کے بعد ناشتے کی باری آئی ۔ بھابھی اور بھیا نے دسترخوان پر بدھو کے مزیدار قصے سنانے شروع کر دیے ۔ بھابھی ذرا نمک مرچ لگا کر بات کرتی ہیں مگر تھوڑی دیر کے تجربے کے بعد بدھو میاں نے وہ گل کھلائے کہ مزہ آگیا ۔

بھابھی نے بدھو سے کہا: جاؤ بدھو منہ ہاتھ دھو کر سر میں تیل لگاؤ بالوں میں کنگھی کرو، ذرا آدمی بنو۔
تھوڑی دیر بعد بدھو ہاتھ میں کنگھی لیے گھبرائے ہوئے غسل خانے سے نکلے ۔ سر سے صابن کے جھاگ اٹھ رہے تھے ۔ سب کھل کھلا کر ہنس رہے تھے ۔ غسل خانے میں شیمپو کی شیشی رکھی تھی ۔ بدھو نے اسے تیل سمجھ کر سر میں لگا لیا تھا ۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ بھابھی کے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی ۔ اور بدھو میاں کانی کے چمچے میں پانی لیے کھڑے تھے ۔ معلوم ہوا کہ بچی کو دوا پلانے کے لیے بھابھی نے چمچہ اور پانی منگایا تھا ۔

کتّے کا راتب ابھی نہیں پکا تھا اور کتّا بھوکا زیادہ تھا ۔ امی نے بدھو سے کہا: "ارے بدھو کتّا بھوکا ہے اسے ایک بار بے پکا گوشت دیدیا جائے تو اسے کون سی خارش ہو جائے گی ۔ بدھوا سے کچّا گوشت دیدو"
گوشت سے امّی کا مطلب راتب کے چھیچھڑوں سے تھا ۔ مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ بدھو نے پلاؤ کا گوشت کتّے کو کھلا دیا ہے اور پلاؤ کی یخنی کے لیے دیگچی میں چھیچھڑے اُبل رہے ہیں ۔

اچھا لیجیے اب بدھو میاں کا آخری شاہ کار بھی ملاحظہ کیجیے۔

بھیا کی چھٹیاں ختم ہوگئیں انھیں پہنچانے کے لیے میں بھی اسٹیشن آیا۔ سب ڈبے میں بیٹھ گئے مگر بدھو میاں گلے میں تھرماس ڈالے ہاتھ میں ناشتہ دان لیے پلیٹ فارم پر چہل قدمی فرما رہے تھے۔ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

میں بھیا سے رخصت ہوکر واپسی کے لیے مڑا تو بدھو میاں نظر آئے۔ ڈبّے میں سوار ہونے کے لیے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی گزر گئی اور پٹری چمکنے لگی۔ اب تو بدھو میاں حیران پریشان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اُن لوگوں کا ناشتہ اور بچّی کا دودھ ان حضرت کے پاس تھا۔ میں نے اسٹیشن پر اِدھر اُدھر پوچھا معلوم ہوا کہ اب کوئی گاڑی جائے گی اور نہ بس جائے گی۔ اتفاق سے ایک دوست مل گئے یہ اپنے مویشی ایک ٹرک میں کان پور لے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے ساری داستان سنا کر کہا: "تو بھئی ہمارا جانور بھی کان پور پہنچا دیجیے، شکریے کے علاوہ کرایہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔"

میرے دوست موڈ میں آگئے انھوں نے ٹرک کا جالی دار کواڑ کھول کر بدھو کو اس میں ٹھونس دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس طرح بدھو میاں بھابھی سے پہلے گھر پہنچ گئے۔ اور جوں ہی بھابھی گھر میں داخل ہوئیں انھوں نے دیکھا کہ بدھو میاں گرم دودھ شیشی میں بھر کر بالٹی میں ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ بھیا اور بھابھی دونوں ایک ساتھ حیرت سے بول اٹھے "ارے! تم ــــ تم کیسے آگئے؟"

بدھو میاں دانت نکال کر بولے: "بکریوں کے ساتھ آئے ہیں۔"

دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے مگر بکری والی بات بہت دنوں تک ان کے لیے مذاق بنی رہی۔

نسیم احمد محمد علی خاں بمبئی۔

ملکوں کے نام تلاش کیجیے

(۱) اس پین کی قیمت پانچ روپے ہے۔ (۲) اختر کی کتاب الماری میں ہے۔ (۳) آج آپا ناریل لائی ہیں۔ (۴) چار دن میں ناریل کتنا بڑا ہوگیا ہے۔

وجے کمار نانوی سوم (جامعہ)

جغرافیائی معلومات

۱۔ دنیا میں سب سے زیادہ انگور فرانس میں پیدا ہوتا ہے۔
۲۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیب فرانس میں پیدا ہوتا ہے۔
۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ کیلا برازیل میں پیدا ہوتا ہے۔
۴۔ دنیا میں سب سے زیادہ انناس جزیرہ ہوائی میں پیدا ہوتا ہے۔
۵۔ دنیا میں سب سے زیادہ آم ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔
۶۔ دنیا میں سب سے زیادہ کھجور عراق میں پیدا ہوتی ہے۔

زاہد حسین خاں کلکتہ

سائنس کا ایک مزیدار تجربہ

پہلے آپ مندرجہ ذیل چیزیں حاصل کریں۔
سلور نیٹریٹ۔ ایمونیم ہیڈرو سائیڈ۔ نمک اور ٹسٹ ٹیوب۔

اب آپ ٹسٹ ٹیوب میں تھوڑا سا پانی اور تھوڑا نمک ڈالیے نمک اتنی ہی مقدار میں ہو کر سب پانی میں گھل جائے۔ نمک پگھلنے کے بعد اس کا رنگ ہلکا پیلا ہو جائے گا اب آپ سلور نیٹریٹ کچھ قطرے ٹسٹ ٹیوب میں ڈالیے اب یہ بالکل سفید دودھ کے رنگ کا ہو جائے گا اور اب آپ پھر ایمونیم ہیڈرو سائیڈ کچھ قطرے اس میں ڈالیے اور پھر آپ دیکھیں گے ٹسٹ ٹیوب کا پانی جو دودھ کی طرح تھا پھر اپنی پہلی حالت میں آگیا یعنی اس کا رنگ پھر پیلا ہو گیا۔ آپ سے جب یہ تجربہ ہو جائے تو آپ اس جادو کو دوسرے دوستوں کو بھی دکھلائیں۔

ادھر اُدھر سے

صحافی



چنو کی امیّ کو کیسے قرار آئے گا

کوئی ایک ہفتہ تو ہوا ہے بے چاری ریچھنی کا بچہ مار ڈالا گیا۔ جب سے بے قرار ہے۔ اور یہ بھی تو سنیے چنو کو مارنے والے، اسے قتل کرنے والے کون تھے۔ خود چنو کے باپ تھے نورا صاحب۔

بات یہ ہے کہ دلی کے چڑیا گھر میں جاپانی ریچھوں کا ایک جوڑا آیا ہوا ہے۔ ریچھ کا نام نورا، ریچھنی کا نوری ہے۔ ان کے دو بچے تھے چنو اور منو۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ نورا صاحب کو چنو منو کی کسی بات پر تاؤ آ گیا چنو منو بات کی نزاکت کو تاڑ گئے اور سیدھے درخت پر چڑھ گئے۔ نورا صاحب نے درخت کے نیچے دھرنا دے دیا۔

آخر کئی گھنٹے درخت پہ بیٹھے بیٹھے دونوں بچے اکتا گئے۔ نیچے اتر آئے بس پھر کیا تھا۔ نورا صاحب نے لپک کے چنو کو جا دبوچا اور ختم کر دیا منو کو چڑیا گھر کے لوگوں نے بڑی مشکل سے بچایا۔

مگر چنو کی امیّ نوری کے دل پر کاری زخم لگا ہے۔ وہ اب تک دہاڑ رہی ہے اور نورا صاحب خاموشی سے سن رہے ہیں جیسے اپنے کیے پر

پچھتا رہے ہوں۔

روپا نے مُنی کو ختم کر دیا

اسی چڑیا گھر میں ۲۸ جون کو اس سے زیادہ ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ ایک شیرنی نے دوسری شیرنی کو ختم کر دیا۔

بات یہ ہوئی کہ اتھوپیا والے شیروں کے جوڑے کا نر مر گیا۔ چڑیا گھر والوں نے اسے ایک دوسرے شیر کے پلّے باندھ دیا۔ اس کی مادہ یا بیوی پہلے سے تھی۔ اس کا نام روپا تھا۔ پہلے تو روپا اور اس حبشن میں خوب بنی، دونوں ہنسی خوشی رہتی تھیں پر ایک دن ان دونوں میں نہ جانے کیوں ان بن ہو گئی اور لڑ پڑیں۔

دوپہر کا وقت، چلچلاتی دھوپ، ایسے میں دو شیرنیوں کا لڑنا، غصّے میں غرّانا اور دہاڑنا! شور و غل کی آواز سن کر بھیڑ جمع ہو گئی۔ چڑیا گھر کے لوگ بھی فوراً موقع پر پہنچ گئے، شور مچایا گیا۔ پتھر پھینکے گئے۔ شیرنیوں کو پنجرے میں واپس بلانے کی ترکیبیں کی گئیں مگر سب بے کار، دس منٹ کے اندر اندر روپا نے حبشن کی گردن پکڑ لی اور اسے مار ڈالا۔ ایک بھیانک چیخ نکلی اور بیچاری حبشن ختم ہو گئی۔

★

نہ جانے کیوں آج کل ریوا کے سفید شیروں کے جوڑے کے تعلقات بھی اچھے نہیں ہیں۔ اسی لیے چڑیا گھر والے دونوں کو ایک ساتھ پنجرے سے باہر نہیں نکالتے۔

کوہ پیماؤں کو اعزاز

پیام تعلیم کے پچھلے پرچے میں آپ ایورسٹ پر چڑھائی کی خبر پڑھ چکے ہیں۔ ایورسٹ پر چڑھائی کرنے والی یہ ٹیم ۲۲ جون کو دہلی واپس آ گئی۔ دہلی میں ٹیم کا بہت پرجوش خیر مقدم ہوا۔ مرکزی حکومت کے وزیروں، دوسرے بڑے افسروں اور عہدے داروں کے علاوہ جنتا کی ایک بڑی بھیڑ نے ان کا خیر مقدم کیا۔

ہماری حکومت نے اس موقع پر ایورسٹ کے ان فاتحوں کو شاندار اعزازات سے نوازا۔ ٹیم کے سردار مسٹر کوہلی اور ان کے دو ساتھیوں مسٹر نوانگ گمبو اور مسٹر سونم گیالتسو کو پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا۔ مسٹر نوانگ گمبو اس سے پہلے امریکن ٹولی کے ساتھ ایورسٹ پر چڑھ چکے

تھے۔ اس طرح آپ دنیا کے واحد انسان ہیں جو دوبار ایورسٹ کو سر کر چکے ہیں۔ مسٹر گیا تسو نے چالیس سال کی عمر میں ایورسٹ پر چڑھ کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ایورسٹ پر چڑھنے والے سات کوہ پیماؤں کے علاوہ ٹیم کے نائب لیڈر میجر کمار کو حکومت نے "پدم سری" کے اعزاز سے نوازا ہے۔ اس طرح ٹیم کے کل گیارہ آدمیوں کو اعزازوں سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

سنا ہے اس یادگار فتح کی خوشی میں ڈاک اور تار کا محکمہ یادگاری ٹکٹ بھی جاری کرنے والا ہے۔

خلائی اسٹیشن آسمان پر

پچھلے روس نے ایک اور کارنامہ دکھایا۔ ایک خلائی اسٹیشن آسمان پر بھیج دیا۔ یہ بارہ ٹن (۳۳۶ من) وزنی ہے۔ اس میں ایسی مشینیں لگی ہیں جو آپ سے آپ کام کرتی ہیں۔ اس خلائی اسٹیشن کی مدد سے یہ پتہ چلایا جائے گا کہ طویل خلائی سفر میں اس اسٹیشن کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور ایک سیارے سے دوسرے سیارے کے سفر کے دوران کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس خلائی اسٹیشن کی مشینیں ٹھیک کام کر رہی ہیں۔ تار و پیام کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

مینڈکی بھی چلیں مدار کو

آپ پیام تعلیم میں اکثر خلائی پرواز سے متعلق خبریں اور مضمون پڑھتے رہتے ہیں۔ اب ایک نئی خبر سنیئے۔ جلد ہی دو مینڈک بھی خلائی پرواز پر بھیجے جانے والے ہیں۔ ان مینڈکوں کے لیے خاص طرح کا راکٹ بنایا گیا ہے اس میں پانی بھرا ہوگا۔ دونوں مینڈک اس راکٹ کے چھوٹے سے تالاب میں اپنا مزے سے تیرتے ہوئے خلا میں دنیا کا چکر لگائیں گے۔ خلائی پرواز میں انسانوں کو بے وزنی کا احساس ہوتا ہے۔ سائنس داں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پانی کے جان داروں پر بے وزنی کا کیا اثر ہوتا ہے۔

دسترخوان پر شیر

مسٹر انجلو گیا کو بہت بھوک لگی تھی۔ گھر آئے منہ ہاتھ دھویا اور سیدھے کھانے کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا تو ٹھٹک کر رہ

گئے۔ کھانے کی میز پر کھانے کی جگہ ایک شیر صاحب دندنا رہے تھے۔ بے چارے کا ڈر کے مارے بُرا حال۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پر حواس کو قابو میں رکھا۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی اور پوری آواز سے شور مچانے لگے۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ بندوقیں بھی آگئیں لوگ شیر کو مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

اتنے میں کچھ لوگ پاس کے قصبے سے بندوقیں لیے ہوئے آپہنچے۔ یہ سرکس والے تھے۔ سرکس کے پنجرے سے تین شیر بھاگ نکلے تھے۔ یہ لوگ ان ہی کی تلاش میں تھے بڑی مشکل سے یہ لوگ شیر پر قابو پا سکے۔

(کالا پتھر بقایا صفحہ ۱۵)

جوں کا توں پڑا رہتا ہے۔ یہ کوئلا یہ دولت بے کار جاتی ہے۔ جبھی تو بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کوئلے کا کاروبار دیس کی سرکار کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

۳۔ کوئلے سے ملنے والی طاقت کو ہم پوری طرح حاصل کریں اور پوری طرح کام میں لائیں کوئلے کی ضمنی پیداوار سے بھی ہم پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔



ایڈیٹر پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

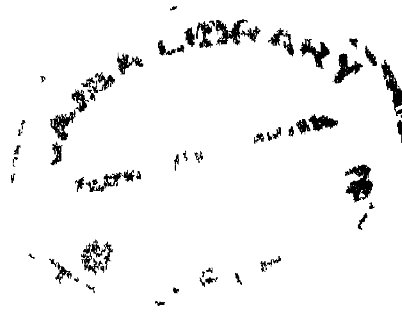


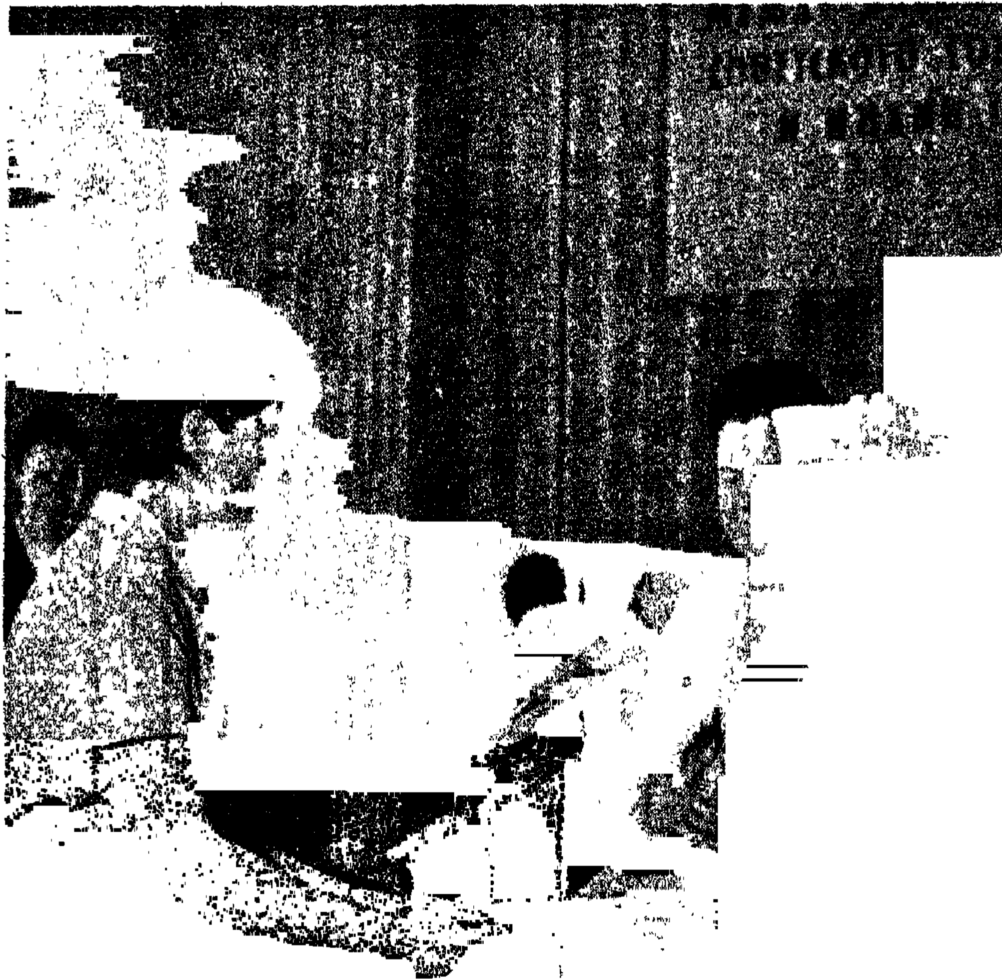
بچوں کے لئے مذہبی کتابیں
ارکان اسلام
مصنف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۲۵ نئے پیسے
عقائد اسلام
مصنف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۵۰ نئے پیسے
آں حضرتؐ
مصنف
الیاس احمد مجیبی
۵۰ نئے پیسے
سرکارِ دو عالم
محمد حسین حسان
دو روپے
ہمارے رسول
مصنف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۸۷ نئے پیسے
ہمارے نبی
مصنف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۴۰ نئے پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
نبیوں کے قصے
مصنف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت: ۸۷ نئے پیسے
مسلمان بیبیاں
مصنف
اعجاز الحق قدوسی
قیمت: ۷۵ نئے پیسے
رسول پاک
عبدالواحد سندھی ۱/۵۰
پاک کہانیاں
دو حصے
مرتبہ: مقبول احمد سیوہاروی
قیمت
دو روپے ۱۰ نئے پیسے
چار یار
مصنف
الیاس احمد مجیبی
قیمت
ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے
خلفاء اربعہ
مصنف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت
ایک روپیہ ۳۷ نئے پیسے

August, 1965. Regd. No, D. 1457

Payam -i- Taleem
New Delhi-25.

پیام تعلیم







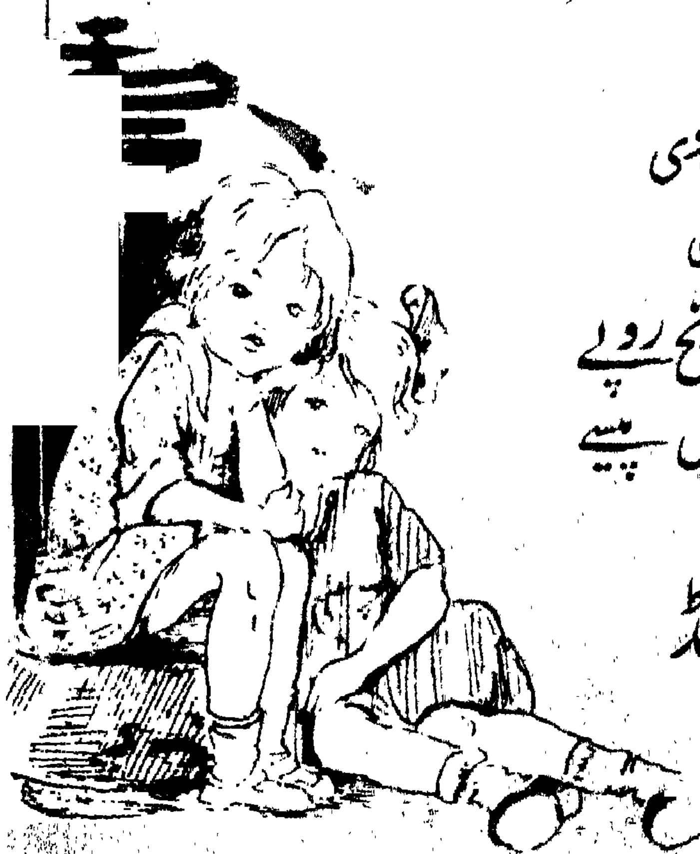
محمد اسمٰعیل جان محمد



پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۲ ستمبر ۱۹۶۵ء شمارہ ۹



ایڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ : گلیڈون میسی

سالانہ چندہ : ــــــ پانچ روپے

فی پرچہ : ــــــ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ مرحوم پر ایک اور
مضمون لکھیں گے اس میں مرحوم کی زندگی کے
بعض بہت دلچسپ اور سبق آموز واقعات لکھے
جائیں گے۔

اوپر کے مضامین کی وجہ سے بہت سے لکھے
لکھائے مضمون اس پرچے میں شامل نہ ہو سکے۔ بچوں
کی کوششوں کے صفحوں میں کتر بیونت کرنا پڑی۔ کئی
نظمیں نکالنا پڑیں۔ یہ سب چیزیں اب اگلے پرچے میں
چھپیں گی۔

اس پرچے میں آپ ایک مضمون پڑھیں گے
ہندوستانی بچوں سے دو دو باتیں۔ ہمارے وزیر اعظم
شری لال بہادر شاستری ابھی روس گئے تھے۔ وہاں
ان کا بڑا پرجوش استقبال ہوا اور وہاں کے
بچوں نے بھی شاستری جی کا خیر مقدم کیا۔ سرورق پر
جو تصویر ہے وہ اسی موقع کی ہے۔ [illegible]
[illegible] ایک روسی مضمون نگار نے اردو میں [illegible]
یہ ہمیں محترمہ ہاجرہ بیگم کی معرفت ملا ہے۔ ہم ان دونوں کے
شکر گزار ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے دیس کے
بچے خصوصاً [illegible]

اور جانکاری پیدا کریں۔ اس مضمون نے ان کے دل
میں یہ خواہش پیدا کی تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔

آپ کو یاد ہوگا جنوری میں ہم نے عزیزی میاں محمد شفیع
کی تصویر چھاپی تھی۔ انھوں نے ایس ایس سی بورڈ کے امتحان
میں اردو میں اپنے پورے صوبے میں سب سے زیادہ
نمبر حاصل کیے تھے۔ اب ایک اور خوش خبری آئی ہے اور
بمبئی سے ہی آئی ہے۔

اس مرتبہ یہ امتیاز اسماعیل بیگ [illegible]
کے ہونہار طالب علم محمد اسمٰعیل جان محمد نے حاصل کیا [illegible]
موصوف اس مدرسے کے [illegible]
درجے میں داخل ہوئے تھے [illegible]
کے توقیتیں تھے۔ خوش قسمتی سے [illegible]
ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بہت [illegible]
ان استادوں میں محمد اسماعیل ذاکر [illegible]
[illegible] صاحب۔ [illegible] صاحب
[illegible] ذکر ہیں۔ ہم اس [illegible]
عزیزی جان محمد کو مدرسے کے تمام [illegible]
[illegible] پرنسپل جناب محسن علی صاحب [illegible]
موصوف کی تصویر [illegible]
[illegible]

جناب محمد عبدالحفیظ ساکت



حمد

نظروں میں تیرا جلوہ، دل میں مقام تیرا
آٹھوں پہر زباں پر رہتا ہے نام تیرا

ہر جلوہ دے رہا ہے اِک دعوتِ نظارہ
ہر سانس میں ملا ہے مجھ کو پیام تیرا

دھوکا ہوا ہے اکثر دل کو تری صدا کا
ٹپکے ہے ہر صدا سے رنگِ کلام تیرا

خورشید، چاند، تارے مٹ جائیں گے یہ سارے
باقی رہے گا یارب بس ایک نام تیرا

اِک لفظِ کُن سے پیدا کون و مکاں ہوئے ہیں
خالق ہے دو جہاں کا، تخلیق کام تیرا

از مہر تا بہ ماہی سکہ ہے تیرا جاری
مضبوط اور اٹل ہے سارا نظام تیرا

تو مالکوں کا مالک، تو حاکموں کا حاکم
ہے تاجدارِ عالم ادنیٰ غلام تیرا

موجود ہر مکاں میں رہ کر بھی لامکاں ہے
ادراکِ فکر سے ہے، بالا مقام تیرا

ساکت نہیں ہے تنہا ممنونِ لطف و جب
کُل ممکنات پر ہے یہ فیض، عام تیرا



ایک بھیڑیا جنگل میں بھوک سے بے تاب کھانے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ایک خرگوش پر نظر پڑی جو جھاڑیوں میں چھپا غافل پڑا سو رہا تھا۔ بھیڑیے کو اس وقت وہی بہت غنیمت معلوم ہوا۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف قدم بڑھائے۔ بھاری قدموں کی آہٹ خرگوش کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ کود کر بھاگنے لگا۔ بھیڑیے نے راستہ روک لیا۔

"ارے ارے کہاں جاتے ہو بھئی خوب ہے۔ کیا حال چال ہیں۔ مجھے تو تم سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ ذرا ٹھہرو میاں، اتنی وحشت کیوں سوار ہے۔

"بیا بیا کہ مرا نیست طاقت دوری"
(آؤ آؤ مجھ میں تم سے دوری کی طاقت نہیں ہے)

مارے ڈر کے بے چارے خرگوش کی گھگھی بندھ گئی۔ قضا سر پر منڈلاتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی جان وہیں پر سوکھ گئی۔ ذرا سا اچھلا اور عاجزی سے ماتھا زمین پر رگڑ کر خوشامدانہ انداز سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

"اے حضور میں جانتا ہوں آپ کو بھوک بہت لگی ہے لیکن آپ کے لیے یہ ذرا سا لاغر جثہ... یہ نحیف اور ناتواں بدن بھلا کس کام کا۔ ایک لقمہ بھی تو نہیں۔ مجھے مار کر آپ کو کیا ملے گا۔ کچھ بھی



تو بھلا نہ ہوگا۔ میری بات مانیے۔ یہاں قریب ہی ایک لومڑی رہتی ہے میں آپ کو وہاں لے چلوں گا۔ ایسی موٹی تازی ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ ایسی تر و تازہ جیسے آبِ حیات۔ خون اتنا میٹھا جیسے شربت اور مصری۔ میرے ساتھ تکلیف کیجیے کسی حیلے بہانے سے میں اسے حاضر کروں گا مزے سے ناشتہ نوش جان کیجیے۔ ویسے میں آپ کا بندۂ بے دام تو ہوں ہی۔"

بھیڑیا اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ لومڑی کے گھر چل پڑا۔

ایک بڑی چالاک لومڑی وہاں رہتی تھی۔ اس کی چالبازی اور مکر و فن سے شیطان بھی پناہ مانگتا۔ ایسی چالیں چلتی کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں۔ سارے جنگل والے اس کے چھل کپٹ اور دغابازیوں سے نالاں اور پریشان تھے۔ خرگوش سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ اور خوب ٹھن رہی تھی۔ آج خرگوش کو انتقام لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ بھلا وہ کیوں چوکتا۔ بھیڑیے کو تو دروازے پر کھڑا کیا اور خود ایک سوراخ سے گھر کے اندر آکر بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا:۔ "مزاج شریف" لومڑی نے بھی بہت تعظیم سے سلام کا جواب دیا اور بولی۔

"آؤ اچھی طرح بیٹھو۔ آج کیسے بھول پڑے عید کا چاند ہوگئے تم تو"

خرگوش مسکرایا "جی ہاں کیا عرض کروں دنیا کے دھندوں میں پھنسا رہا۔ مدت سے شرف ملاقات حاصل نہیں کر پایا اور سعادت سے محروم رہا۔ جس کا مجھے خود افسوس ہے۔ اس وقت مصر



سے ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لائے ہیں۔
ایک متبرک مزار شریف پر رہتے ہیں آپ کی خوبیوں
اور گوشہ نشینی کی شہرت سن کر آپ کی صحبت
سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے وسیلہ بنایا
ہے۔ اگر وقت ہو تو ابھی ملاقات ہو۔ بہت غنیمت
... ورنہ جو وقت
مقرر کریں ان سے کہہ دوں۔"

لومڑی اس کی مکاری کی باتوں سے اصل
مطلب بھانپ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ملاقات کی غرض
کیا ہے اپنے جی میں کہا "جیسے یہ ہیں ویسا ہی ان سے
سلوک کرنا چاہیے۔ آج مزہ چکھاؤں گی۔ ڈھیلے
کا جواب پتھر ہے ایسے ایسے بزرگوں اور پارساؤں
کو میں خوب سمجھتی ہوں" چاپلوسی کے انداز سے
بولی۔

"اے لو ایسے بزرگ
... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک
... صفت کو لا کر کھڑا کر دو۔ میری صلاح
مانو ذرا ٹھہرو۔ یوں تو میں نے مسافروں اور
مہمانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میری جھونپڑی
کا دروازہ ایسے ایسے بزرگوں کے لیے ہر وقت
کھلا رہتا ہے کہ ان سے میں بھی کچھ فیض پاؤں اور
اپنی عاقبت سنواروں اور پھر ایسے بزرگ کے لیے
جن کا ابھی تم نے ذکر کیا ان کا آنا میری خوش نصیبی
ہے۔ سعادت ہے۔ ان کی مہمان نوازی میں جہاں
تک بنے گا رتی بھر کسر نہیں چھوڑوں گی۔ مہمان اپنی
روزی لے کر آتا ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ میں اپنا
فرض سمجھتی ہوں کہ ان کے رتبہ کے لائق انتظام

دوں۔ دنیا میں نیکی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ ایسے مہمان کوئی روز روز تھوڑی آیا کرتے ہیں۔ ذرا گھر میں جھاڑو دے لوں۔ اچھا سا فرش بچھا لوں جو انھیں زیب دے۔ کچھ پھول سجاؤں تب بلاؤں گی"

خرگوش دل میں اتنا خوش تھا کہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ سمجھا لومڑی بہکانے میں آگئی۔ بس اب بھیڑیے کو ملنے کے لیے بلائے گی ہنس کر بولا۔

"ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے وہ تو بڑے منکسر مزاج اور درویش صفت ہیں۔ گھر اور لباس کی آرائشوں سے بے نیاز۔ خیر آپ کی خوشی ہے تو انتظام کر لیجیے میں ذرا دیر باہر ہی رکے ہوں"، خوش خوش باہر آکر سب حال بیان کیا اور خوب باتیں بگھارنے لگا:" وہ تو آپ پر بالکل فریفتہ ہوگئی ہے۔ اور حضور کیا عرض کروں اب اس قدر موٹی ہوگئی ہے کہ جگہ سے ہلنا دشوار ہے۔ خوب گوشت اور چربی چڑھی ہے۔ بس آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

بھیڑیے کی حرص اور بھڑک اٹھی۔ گوشت کی لذت کے خیال سے منہ میں پانی بھر آیا۔ خیال ہی میں وہ مزے لے رہا تھا۔ خرگوش الگ اپنی چالوں پر نازاں تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ اس نیک خدمت کو انجام دینے سے اس کا گلا چھوٹ جائے گا۔ لیکن لومڑی بڑی دوراندیش تھی۔ مدتوں پہلے سے احتیاطاً اپنے گھر کے صحن کے بیچوں بیچ ایک گہری خندق کھود رکھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی مٹی نکال کر اس کے سرے پر گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے اُسے چھپا رکھا تھا۔ اور چھپا ہوا راستہ بھی بنایا تھا کہ جب کوئی ایسا خطرہ ہو، ضرورت پڑنے پر ادھر سے بھاگ نکلے کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ خرگوش جیسے ہٹا جھٹ گڑھے پر گھاس پھوس اس طرح بچھادی کہ بس ذرا سے اشارے میں ہٹ جائے اور کام بن جائے۔ قریب ہی ایک جھاڑی سے کچھ پھول نوچ کر اس پر بکھیر دیے۔ پھر چھپے راستے سے باہر آکر پکارا "اب مہمان صاحب تشریف لے آئیں" یہ کہہ کر خود چپکے سے باہر نکل گئی۔

خرگوش اتراتا اچھلتا اور بھیڑیا حرص اور لالچ میں چور دونوں اس تاریک کلبہ میں داخل ہوئے۔ بھیڑیے کا گھاس پر قدم رکھنا تھا کہ دھڑام سے منہ کے بل گڑھے میں گرا۔ تو خرگوش ادب سے پیچھے چل رہا تھا اسے گرتے جو دیکھا تو بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ جا وہ جا۔ اس کی کہیں گرد بھی نہیں ملی۔ جان بچی لاکھوں پائے۔



جناب سعادت نظیر

ٹوٹیں ظلم کی قیدیں ٹوٹیں
پھوٹیں امن کی کرنیں پھوٹیں
لوٹیں دل نے خوشیاں لوٹیں

تارے سوئے، سورج[۱] جاگا
بھاگا گھور اندھیرا[۲] بھاگا

تھی جو دکھ کی ریت گئی ہے
ہاری بازی جیت گئی ہے
سخت گھڑی اب بیت گئی ہے

تارے سوئے، سورج جاگا
بھاگا گھور اندھیرا بھاگا

[۱] آزادی کا سورج [۲] غلامی کا اندھیرا

آئی خوشی کچھ ایسے وطن میں
پھولوں کی رُت جیسے چمن میں
سوئی اُمنگیں جاگیں من میں

تارے سوئے، سورج جاگا
بھاگا گھور اندھیرا بھاگا

گہری نیند سے جاگی دنیا
جاگی گنگا ، جاگی جمنا
دھرتی پہ لہرایا پھریرا

تارے سوئے، سورج جاگا
بھاگا گھور اندھیرا بھاگا

جاگے گرجا، مسجد، مندر
کھیت، چمن، مل، مکتب، دفتر
روشن ہیں سب چھوٹے بڑے گھر

تارے سوئے، سورج جاگا
بھاگا گھور اندھیرا بھاگا

بچھڑے ساتھی ملنے لگے ہیں
دل کے غنچے کھلنے لگے ہیں
چاک جگر کے سلنے لگے ہیں

تارے سوئے، سورج جاگا
بھاگا گھور اندھیرا بھاگا

جناب محمد حفیظ الدین

اختر حسن فاروقی



اختر حسن فاروقی جامعہ کے استاد تھے۔ کوئی پینتیس چالیس سال جامعہ کے کاموں میں لگے رہے۔ چھٹیاں گزارنے اپنے گھر لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں تو ۱۵ر جولائی کو جامعہ آنے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ جگہ رزرو ہوگئی۔ سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔ دفعتاً وہ سفر پیش آگیا جس کی اطلاع اچانک ملی ہے اور اس سفر سے کوئی لوٹتا نہیں۔

وہ جامعہ کے ایک کامیاب اور نامور استاد تھے انھوں نے اپنی پوری زندگی جامعہ کی خدمت میں بتا دی اور اس شان سے بتائی کہ کبھی دائیں بائیں جھانکا نہیں، اپنے کام میں پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ لگے رہے۔ جامعہ کے بنانے والوں کی فہرست میں ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگیا۔

وہ عام اصطلاح میں بڑے آدمی نہ تھے۔ بڑے آدمی وہ لوگ سمجھے جاتے ہیں جن کے عہدے اونچے ہوں جن کا نام اخباروں میں چھپتا ہو۔ آئے دن تصویریں شائع ہوتی ہوں جنھیں عام لوگوں سے ملنے کی فرصت نہ ہو۔ جو پبلک میں دھواں دھار تقریریں کر سکتے ہوں اور اخبارات کو بیانات دیتے ہوں۔ ضرورت پڑے تو پبلک کی رہنمائی کرکے جیل جاتے یا ستیہ گرہ کرتے ہوں اور بھی بڑائی کی بہت سی نشانیاں ہیں ان میں سے ایک بھی اختر صاحب میں نہ تھی۔

وہ صرف ایک سیدھے سادھے، سچے اور اچھے ہندوستانی مسلمان تھے۔ ہندوستانی اس لیے کہا گیا کہ وہ ہندوستان کے ضلع فرخ آباد میں پیدا

ہوئے تھے، لکھنؤ میں پلے، بڑھے تعلیم پائی۔ جامعہ دلی میں خدمت کرتے کرتے اپنے رب کو پیارے ہوئے ورنہ خوبیاں کسی جگہ اور وقت کی پابند نہیں ہوتیں۔ کسی شخص کا اچھا مسلمان ہونا ہی تمام انسانی خوبیوں کا ضامن ہوتا ہے۔

وہ اچھے مسلمان اس لیے تھے کہ ان کے ہاتھ، زبان اور عمل سے کبھی کسی انسان کو اذیت نہیں پہنچی۔ وہ نماز روزے کے سخت پابند تھے کبھی کسی بڑی سے بڑی مصروفیت نے بھی ان کی نماز اور جماعت کی راہ نہیں روکی۔

وہ اسلامی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے مگر اس گہری دلچسپی میں شدت نہ تھی۔ ساری سختی اپنے اوپر اوڑھتے تھے وہ دین سے غفلت برتنے والے بے نمازی مسلمانوں سے بھی خوش رہتے تھے اور غیر مسلموں کی خدمت بھی فراخ دلی سے کرتے تھے اُن کی مذہبیت بند اور گندے تالاب کی سی نہ تھی ایسے رواں دواں چشمے کی طرح تھی جس کے صاف شفاف پانی سے سب فیض پاتے ہیں ان کی دینداری نخوت اور غرور کے کوچوں سے ہٹ کر چلتی تھی انھیں اپنی عبادت اور نیکی پر گھمنڈ نہ تھا۔ ایسی ہی بے ریا نیکی بندے کو خدا سے نزدیک کر دیتی ہے۔

وہ ایک نامور اور کامیاب استاد تھے لگ بھگ چالیس سال تک ہوسٹل میں نگراں بھی رہے اور استاد کے فرائض بھی انجام دیے اس مدت میں ہزاروں شاگرد ان کے زیر تعلیم و تربیت رہے ہوں گے۔ تربیت میں نرمی اور سختی وہ برابر برتتے تھے اس کٹھن کام کا جن کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس راہ میں کبھی کبھی کیسی نازک اور مشکل منزلیں پیش آجاتی ہیں وہ ان تمام منزلوں سے ایسے صاف گزرے جیسے کوئی مرد مومن پل صراط سے گزرے گا۔

ان کے شاگردوں میں سے شاید کوئی بھی ایسا نکلے جسے اختر صاحب کے برتاؤ سے شکایت رہی ہو کسی طالب علم نے کوئی خطا کی ان کے عفو کے دامن میں اُسے پناہ ملی کسی کے شدید جرم پر سزا دینا ضروری ہوا اور انھوں نے سزا دیدی تو وہ اس کے حق میں رحمت ثابت ہوئی، وہ اپنے عیبوں سے نکھر گیا اور اس کی گردن شفیق استاد کی محبت ملی درشتی کے آگے جھک گئی۔ ایک لمحے کے لیے بھی سزا پانے والے کی آنکھ میلی نہ ہوئی۔ گستاخی اور سرکشی تو دور کی بات ہے۔

وہ بڑا صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے ان کے ذاتی کمرے اور ہوسٹل کی صفائی اور ترتیب نمونے کی ہوتی۔ بیماری، آزاری، خوشی، غمی کسی حال میں کمرے کی چیزوں میں بے ترتیبی، پراگندگی اور انتشار نہ ہوتا۔ جو چیز جہاں رکھتے تھے معلوم ہوتا تھا یہ چیز اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہے۔ کبھی خراماں خراماں کسی پھوہڑ ساتھی کی طرف جا نکلے تو اس کے کمرے کی ہیئت بدل گئی۔

وہ مصوری کے استاد تھے پر مذہبی فتووں کی وجہ سے جاندار تصویریں بنانے میں جھجکتے تھے اور حتی الوسع ایسی تصویر بنانے سے پہلو بچاتے تھے پھر بھی بعض لاجواب تصویریں ان کے موئے قلم نے کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ ان کے شاگردوں میں کئی نامی استاد ہیں۔ انھیں اپنے فن سے ایسی لگن تھی کہ جامعہ کے بچوں میں سب سے زیادہ دلچسپی اسی مضمون سے پیدا ہو گئی تھی۔ ایک زمانے میں جامعہ پر یہ شعبہ چھا گیا تھا اب بھی ان کی اور ان کے شاگردوں کی یادگاریں جامعہ کے در و دیوار کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے خلوص، فن سے لگن اور محنت سے مسلسل کام کرنے کا اعجاز ہے۔ ایک کامیاب استاد اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے۔

وہ اچھے اور شفیق باپ تھے ان کے تینوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے کہ ان کی عزیز اور ہر کام میں شریک ہونے والی بیوی موت کے بے رحم ہاتھوں جدا ہو گئیں۔ ماں کی محبت اور باپ کی شفقت تو قدرت نے انھیں دی ہی تھی، پر یہ ان کی آزمایش کا بہت سخت اور کڑا امتحان تھا اس وقت اختر صاحب کی عمر بھی ایسی زیادہ نہ تھی وہ دوسری شادی کر لیتے تو کوئی بڑی بات نہ سمجھی جاتی دوست احباب نے تقاضے بھی کیے وہ سب کی سنتے رہے مگر ان کے خیال کے حاشیے میں بھی اس کا تصور نہیں آیا۔

اپنے بچوں اور دوسرے بچوں کی خدمت میں لگے رہے۔ بچوں کو عمر بھر یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ماں کی محبت سے وہ محروم ہیں۔ اسی روش کا کرشمہ ہے کہ تینوں بچے ماشاء اللہ بال بچے والے ہیں پھر بھی باپ کی یاد میں بلک بلک کر ایسے روتے ہیں گویا ان کی دنیا اجڑ گئی۔

ان کے ایک بچے نے چند لفظوں میں مجھ کو گوار کو بھی اطلاع دی۔ نہیں بتا سکتا کہ اس چھوٹے خط میں کتنا درد اور غم بھرا ہوا تھا۔ میں

جو ان بچوں کا حال سنتا ہوں تو ہمت نہیں پڑتی
کہ تعزیت اور دلاسے کے لیے سامنا کروں اور
اُن سے کہوں کہ زمانے کی یہی ریت ہے۔ کس
کے باپ ہمیشہ رہے جو تمہارا رہتا۔ پر دل سے
صدا اٹھتی ہے۔ بیشک دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے
پر دنیا میں ایسے شفیق باپ ہوتے کتنے ہیں ہاں ان
کا غم نہ ہوگا تو کس کا ہوگا۔

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور
(غالب)

وہ ایک بہت اچھے ساتھی تھے اُن سے مل
کر پہلی ملاقات میں ایسا لگتا تھا کہ یہ تو اپنے ہی ہیں
کوئی غیر نہیں۔ جوں جوں تعلق اور وقت بڑھتا یہ رشتہ
مضبوط اور گہرا ہوتا جاتا۔ بے احتیاط ساتھیوں سے
ان کے حق میں بے عنوانیاں بھی ہوئیں لیکن ان کے عفو و
کرم نے انھیں شرمندہ تک نہ ہونے دیا۔ مرحوم سے اس
لمبی مدت میں بڑے اچھے تعلقات رہے ہیں اس زمانے
کے چند واقعات لکھے جائیں تو بہت دلچسپ بھی ہوں
گے اور زریں یادگار بھی۔ خدا نے مہلت اور موقع
دیا تو یہ کام بھی کبھی ہو جائے گا۔ یہ مرنے والے کا
سرسری تذکرہ ہے۔ ایک حسین مجسمے کی تصویر ٹوٹے
ہوئے قلم اور اناڑی ہاتھوں نے کھینچی ہے پھر نقل
میں اصل کی وہ جاذبیت اور رعنائی کیونکر آئے۔

اے رحمت خدا! یہ تیری پیاری مخلوق کا غلام
اور بہت تھکا ہوا مسافر تیرے حضور آیا ہے اسے اپنی
رحمت کے شامیانے تلے جگہ دے۔ اس نے بہت
سی لمبی راتیں اور سہانی گھڑیاں جاگ جاگ کر گزاری
ہیں اس کو اب لحد کی آغوش میں چین اور سکھ کی
نیند سلا۔

اے لکھنؤ کی سرزمین! تیرا ذرہ ذرہ ادب و
تہذیب سے سنورا ہوا ہے آج جامعہ کا ایک شائستہ
فرزند امانت کی طرح تجھے سونپا گیا ہے اُس کی طبیعت
کی لطافتوں اور ظرافتوں کا پاس رکھنا۔ قبر کے رخنے
میں گرد و غبار نہ آنے پائے کہ صفائی مرنے والے کی
طینت میں تھی۔

ایسا رکھیو کہ کل داور محشر کے سامنے تری تہذیب
کی شہرت کو بٹہ نہ لگے۔ اس کی لطیف روح شہادت دے۔

امانت کی طرح رکھا زمیں نے حشر تک ہم کو
نہ ایک مو کم ہوا اپنا نہ ایک تار کفن بگڑا

اے عالم بالا کے مسافر! تجھ پر خدا کی ہزاروں لاکھوں
رحمتیں نازل ہوں۔ تیرا لگایا ہوا باغ سدا ہرا بھرا ہے۔ تو
چلا گیا تیری میٹھی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں بسی رہے گی۔

ایک تعزیتی خط

نیچے ہم ایک خط شائع کر رہے ہیں۔ یہ خط اختر حسن فاروقی مرحوم کے ایک پرانے شاگرد وارث رشید صاحب کا ہے۔ اس خط سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ استاد اور شاگرد کے تعلقات میں کتنی گہرائی، کتنا خلوص، کتنی اپنائیت تھی۔ جو سچ پوچھیے تو اختر حسن صاحب جیسے مخلص رفیقوں کی بدولت جامعہ، جامعہ بنی ہے۔

خط مخدوم و محترم پروفیسر محمد مجیب کے نام آیا تھا ان ہی کی نوازش سے یہ ہمیں ملا ہے۔

ایڈیٹر۔

مکرمی و مشفقی۔ اسلام علیکم

آج "تعلیم و ترقی" کا تازہ پرچہ آیا۔ پہلے صفحے پر نظر پڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ اختر صاحب بھی چل دیے! چند لمحوں کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ گرد و پیش کا سارا ماحول ساکت ہو گیا ہے۔ ایسے شفیق اور ایسے محبت اور خلوص کے پیکر بزرگ اب کہاں ملیں گے؟

ماضی کے دھندلکوں میں یادوں کے چراغ جھلملانے لگے۔ اس سال جنوری میں جامعہ نگر گیا۔ حسب دستور اختر صاحب سے ملنے گیا۔ اب وہ ہوسٹل کی عمارت کی نچلی منزل میں رہتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوا تو اختر صاحب پلنگ پر بیٹھے تھے۔ سامنے اسٹول پر سینی میں کھانا رکھا تھا۔ اختر صاحب مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھے، اٹھ کر گلے لگایا۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا پھر خود ہی کرسی اٹھانے لگے۔ میں نے تیزی سے بڑھ کر کرسی سنبھال لی۔ عرض کیا کہ "آپ تکلیف نہ فرمایئے۔ تشریف رکھیے۔ میں خود اپنے بیٹھنے کا انتظام کر لوں گا!" فرمایا "بہت دن بعد آئے ہو! دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اچھا ہوا آگئے۔ میں بہت بیمار تھا۔ دل کی بیماری کا کیا اعتبار؟ تمھارے آنے سے جی خوش ہو گیا، خدا عمر دراز کرے۔ خوب ترقی کرو۔ کیا

کھاؤ گے؟ میں تو اُبلا ہوا کھانا کھاتا ہوں ـــ
ارے سُنیے ـــ دیکھیے ـــ ذرا ـــ (پھر کسی طالبعلم کا نام لے کر پکارا) ڈائننگ ہال سے کھانا منگوا لیجیے ـــ بھئی تمھیں مطبخ کا ہی کھانا ملے گا ـــ"

پھر اپنے مخصوص پُروقار انداز میں مسکرائے تو محسوس ہوا کہ دل میں محبت کے سوتے اُبل رہے ہیں جو مخاطب کے احساسات پر بھی چھائے جا رہے ہیں۔

میں نے اِن کی صحت کا ذکر چھیڑا تو موضوع بدل دیا جیسے انھیں اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ خود میری ملازمت، ترقی اور تندرستی، بچوں کی خیر و عافیت، اعزہ کے حال چال کے بارے سوالات فرماتے رہے اور اطمینان بخش جوابات پر اظہارِ مسرت کرتے رہے۔ ماموں صاحب مرحوم (شفیق صاحب) کے انتقال کے بعد شاید ہی کوئی ملاقات ہوئی ہو جس میں انھوں نے مرحوم کا ذکر محبت اور درد کے ساتھ نہ کیا ہو۔ اس بار بھی دیر تک تذکرہ کرتے رہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو اٹھ کر جامعہ کی عمارت کے باہر تک پہنچانے آئے۔ پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ "خدا حافظ! معلوم نہیں ملاقات ہو یا نہ ہو۔ جاؤ خوش رہو" پھر بے اختیار سینے سے چمٹا لیا۔ اس لمحِ محبت کی گرمی اب تک سینے پر محسوس کرتا ہوں۔ وہ واپس جا رہے تھے میں نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہلکے رنگ کی گرم شیروانی، لمبے لمبے بال، روشن آنکھیں اور شفقت بھری مسکراہٹ کی تصویر جیسے دل پر نقش ہو گئی۔

خلوص، سادگی، بے نیازی اور قلندری کا یہ پیکر اپنے پیدا کرنے والے کے پاس چلا گیا۔ اب ایسا شفیق استاد کہاں ملے گا۔ ان کا دنیاوی منصب بڑا نہ تھا، دولت مند نہ تھے۔ اقتدار کے حامل بھی نہ تھے لیکن مرحوم کے پاس دل کی وہ دولت تھی جو انمول ہے اور نئی زمانہ عنقا ہے میرے لیے تو میرے استاد ابھی زندہ ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

تعزیت کس سے کروں؟ اختر صاحب کا غم آپ کا تنہا غم نہیں۔ ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت ضرور کرے گا۔

فقط خادم
وارث رشید قدوائی
نیلوکھیڑی

پیارے اختر ماموں

کتنی خاموش فضا ہے۔ کتنا اداس ماحول
ہر آنکھ اشک بار ہے اور ہر دل کسی کی جدائی میں
تڑپ رہا ہے۔

جامعہ وہی ہے۔ جامعہ کے لوگ بھی وہی ہیں
مگر ہر چیز میں کسی کی کمی ہے۔ ہر آنکھ کسی کو تلاش
کر رہی ہے اور ہر دماغ اس محبوب ہستی کے
بارے میں سوچ رہا ہے جو ۱۵ جولائی کو ہم سے
جدا ہو گئی۔

ہاں ۱۵ جولائی ہی وہ منحوس تاریخ تھی
جس دن ہمارے پیارے پیارے اختر ماموں
ہم سب کو روتا چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں
سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

جامعہ کا کونا کونا ہمیں ان کی یاد دلا رہا
ہے۔ بجری کی ایک ایک کنکری سے اُن کی چاپ
کی آواز آرہی ہے۔ اور جامعہ کے ایک ایک
کمرے میں اُن کی دلکش آواز گونج رہی ہے۔

جس طرف آنکھ اٹھتی ہے اُن کا مسکراتا
ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر موڑ پر معلوم ہوتا ہے کہ
ابھی اختر ماموں ہنستے ہوئے آئیں گے۔ آکر
گلے لگالیں گے۔ پیار سے چمٹالیں گے اور محبت
سے سر پر چپت لگاکر پیشانی کو بوسہ دیں گے۔

مگر جب آنکھ اٹھتی ہے تو وہی اُداسی،
وہی سوناپن حسرت سے ہمارا منہ تکتا ہے۔

جامعہ کھل چکی ہے۔ وہی جامعہ کے بلند گنبد
جو نئے سال پر سب کو مسکرا کر خوش آمدید کہتے تھے۔
وہی جو اپنے سے پیار کرنے والوں کو دیکھ مسکراتے
تھے۔ ان کی باتیں سن کر ایسا لگتا تھا جیسے ہنس
رہے ہوں اور بچوں کے معصوم قہقہے سن کر کھلکھلا
دیتے ہوں۔ آج سر جھکائے ہیں۔ ابھی وہ اس
کا انتظار کر رہے ہیں جو شروع سے اس عمارت
کا مکین رہا ہے۔ مگر انھیں کیا معلوم کہ یہ انتظار
انتظار ہی رہے گا۔ اب وہ کبھی واپس نہیں
آئے گا۔ جامعہ کے سرسبز لان۔ ان کے ہنستے
ہوئے پھول اور ان کی مسکراتی ہوئی کلیاں
بھی کسی کی ایک پیار بھری نظر کے لیے بے چین
ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے کسی کی ٹانگوں سے
لپٹنے کے لیے بے قرار ہیں۔ مگر آہ۔ انھیں کوئی
کیسے بتائے کہ اب وہ اس شفیق چہرے کو بھول
جائیں۔ اس پیاری مسکراہٹ کو فراموش کر دیں۔

ماموں جان آپ وہی تو ہیں کہ جو کبھی

کسی کا دکھ نہ دیکھ پاتے تھے۔ کسی کی آنکھ میں ایک آنسو دیکھ کر بے قرار ہو جاتے تھے۔ کسی کی ایک ہچکی سن کر آپ کا دل رو پڑتا تھا اور جب تک آپ اسے ہنسا نہ دیتے تھے آپ کو چین نہ آتا تھا۔ کیا آج آپ اتنے سنگدل ہو گئے کہ سب لوگ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ اور آپ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ کسی کو تسلی نہیں دیتے۔ کسی کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرتے اور کسی کو محبت سے گلے نہیں لگاتے۔

کسی کو کیا پتہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جامعہ اختر ماموں سے محروم ہو جائے گی۔

وہ اختر ماموں جن سے جامعہ جامعہ تھی۔ جو جامعہ کے معمار تھے۔ اس کے سچے دوست تھے۔ اور اس کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔

وہ کسی کے باپ تھے اور کسی کے چچا کسی کو معلوم نہیں۔ وہ سب کے پیارے اختر چچا تھے۔ شفیق باپ تھے اور ہمدرد بھائی تھے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس کا غم ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے ہر ایک اس طرح سوگوار نظر آتا ہے جیسے اس کی سب سے پیاری چیز اس سے چھین لی گئی ہے۔ یہ صدمہ ہم سب کے لیے کتنا بڑا ہے۔

کون کس کو تسلی دے اور کون کس کو صبر کی تلقین کرے۔ سب ایک ہی غم میں مبتلا ہیں۔

آج جامعہ کا ایک اور پرانا آدمی داغ مفارقت دے گیا۔ وہ جس نے جامعہ کے ننھے سے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ اسے باپ کی شفقت اور ماں کا پیار دیا تھا۔ وہ جو ساری زندگی جامعہ میں رہا۔ کاش آخری وقت بھی یہیں ہوتا۔ بار بار دل میں یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ انھیں آخری بار دیکھ لیتے۔ صرف ایک بار اور۔

کسے معلوم تھا کہ وہ اب جامعہ سے جائیں گے تو کبھی نہ آنے کے لیے جائیں گے کسے معلوم تھا کہ ۳۱ مئی کو ہم انھیں آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ کسے خبر تھی کہ یہ سفر ان کا آخری سفر ہوگا کاش یہ معلوم ہوتا تو جامعہ کے در و دیوار ان سے لپٹ کر کہتے "ابھی نہ جاؤ۔ ابھی ہمیں تمھاری بہت ضرورت ہے۔ تمھارے بغیر نہ ہم میں کوئی کشش ہے اور نہ دلکشی"

آج ہر آنکھ سے آنسو باہر آنے کو بے چین ہیں اور ہر دل سے گھٹی گھٹی آہیں باہر نکلنے کو بے تاب۔ مگر یہ سب بے سود ہے۔

اب ہم انھیں واپس نہیں بلا سکتے۔ مگر یہی ہمارے لیے کیا کم فخر کی بات ہے کہ اتنا پیارا آدمی ہمارا تھا۔ کتنے خوش قسمت تھے اختر ماموں کہ جب تک وہ زندہ رہے سب کا پیار انھیں ملا۔ اور جب وہ چلے گئے تو ہر آنکھ ان کے لیے رو رہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایسے بنو کہ جب تم پیدا ہو تو تم روؤ اور دوسرے ہنسیں۔ اور جب تم مرو تو تم ہنسو اور دوسرے روئیں۔

پیارے ماموں کی زندگی اور موت اس مقولے پر کتنی پوری اترتی ہے۔ کتنی کامیاب زندگی تھی ان کی اور کتنی کامیاب موت!

ہم سب ان کی زندگی کو مشعل راہ بنائیں تو دین و دنیا میں بھلا کیوں نہ کامیاب ہوں گے۔

اب اور کیا کہوں سوائے اس کے کہ خدا انھیں جنت میں سب سے اچھی جگہ دے۔

(آمین)

(رانو خاتون مدرسہ ثانوی جامعہ)

ہندوستانی بچّوں سے دو دو باتیں

از۔ ای۔ گولوبیف
(سودیت ہند ثقافتی تعلقات کی انجمن
کے نائب جنرل سکریٹری)



یہ قیمتی مضمون ہمیں سودیت ہند ثقافتی تعلقات کی انجمن ماسکو سے وصول ہوا ہے۔ ہم مضمون نگار جناب ای گولوبیف صاحب نائب جنرل سکریٹری کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں اور محترمہ ہاجرہ بیگم کا بھی۔ ان ہی کی تحریک پر ای۔ گولوبیف صاحب نے یہ مضمون تحریر فرمایا ہے۔

۔ایڈیٹر۔

پیارے بچو! تم میں سے بہتیرے اسکول جاتے ہوں گے اور غالباً وہاں دوسرے مضامین کے علاوہ جغرافیہ بھی سیکھتے ہوگے اور نقشے بھی دیکھ سکتے ہوگے۔ ذرا نقشہ کھول کر ہندوستان کے شمال میں دیکھو۔ یہاں تم ایک بڑا ملک دیکھوگے جس کا نام ہے سودیت یونین۔ کیا تم لوگ جانتے

ہو کہ اس ملک کے دارالحکومت کا کیا نام ہے؟
ٹھیک ہے۔ ماسکو۔

تم لوگوں نے ضرور پڑھا یا سنا ہو گا کہ کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کے وزیراعظم شری لال بہادر شاستری سوویت یونین آئے تھے۔ اُن کو اس ملک کے صرف چند شہر دیکھنے کا موقع ملا کیونکہ مختصر عرصے میں ہمارے اس لمبے چوڑے اور وسیع ملک کا چکر لگانا بالکل ناممکن بات ہے۔ اگر کوئی سب سے تیز رفتار ہوائی جہاز کے ذریعے روس کی مغربی سرحد سے سوویت مشرقِ بعید تک جائے تو یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے کئی دن کی ضرورت ہے۔ اور اگر کوئی تیز ریل گاڑی کے ذریعے جائے تو اس سفر کے لیے اس کو دس دن سے کم نہیں لگیں گے۔

لو میں تم لوگوں کو صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ شری شاستری ماسکو، لینن گراد، کیئف اور تاشقند کے شہر دیکھ سکے۔ تم لوگوں نے ان شہروں کے نام ضرور سنے ہوں گے۔ اور اگر ابھی تک نقشہ تمھارے سامنے ہے تو ان شہروں کو ذرا دیکھ لینا۔

شاستری جی سوویت دیس کے بہت سے لوگوں سے ملے اور بچوں سے ملے۔ اور ہر ملاقات میں سوویت دیس کے لوگوں نے شری شاستری اور ان کے ہمراہیوں کا بہت ہی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ یہ قدرتی بات ہے کیونکہ ہندوستانی عوام ہمارے بہت اچھے دوست ہیں اور بچو، تم جانتے ہو کہ دوست سے دوست کس طرح ملتے ہیں۔ ہے نا؟ لیکن میں یہاں صرف ایک ملاقات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ماسکو میں ہوئی۔ ہماری راجدھانی کی ایک مرکزی سڑک پر ایک خوبصورت عمارت ہے۔ یہ 'دوستی محل' کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر سوویت دیس کے لوگ اپنے غیر ملکی مہمانوں سے ملتے ہیں، مختلف ملکوں کے قومی تہواروں پر اور دوسرے موقعوں پر تقریبیں مناتے ہیں۔ اکثر ایسی تقریبیں ہندوستان سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ سوویت دیس کے جن لوگوں کو ہندوستان جانے کا موقع ملا ہے، وہ یہاں اپنے ہم وطنوں کو اپنے تاثرات بتاتے ہیں، ہندوستانی عوام کی مہمان نوازی، امن پسندی، محنت کے کارناموں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اسی 'دوستی محل' میں ہم ہندوستان کے یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی تقریبیں بھی مناتے ہیں۔

لیکن اس دن اس محل کا غیر معمولی ماحول تھا۔ اس محل میں شری شاستری، ان کی اہلیہ اور وہ تمام ممتاز مہمان آئے جو ان کے ساتھ سوویت یونین کا دورہ کر رہے تھے۔ سوویت ہند کلچرل تعلقات کی انجمن کے ممبر، مزدور، ملازمین، عالم، مصور، ادیب اور اسکولی بچوں نے ہندوستانی دوستوں کا شاندار استقبال کیا۔ یہاں ایک سوویت ہند دوستی کا جلسہ ہوا۔

تم لوگ جانتے ہو سوویت دنیا میں امن چاہتا ہے۔ وہ اس کے خاطر جد وجہد کر رہا ہے۔ کیوں، اس لیے کہ دنیا کا ہر بچہ خوش وخرم رہے، وہ ماں باپ کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارے، اور ہر بچہ خوب پڑھے لکھے اور اپنے ملک کے لیے اچھا شہری بنے ہر بچے کے پاس کھلونے ہوں کتابیں ہوں۔

اس جلسے میں ہمارے دونوں ملکوں کے اقتصادی تعاون کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہ ہم عوام کی زندگی بہتر بنانے میں آیندہ بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

صدر جلسہ نے اعلان کیا کہ ماسکو کے ایک بورڈنگ اسکول کے بچے چاچا شاستری کو خطاب کرنا چاہتے ہیں۔ اسٹیج پر ایک لڑکی آئی اور ایک لڑکا آیا۔ دونوں پانیروں کا لباس پہنے تھے یعنی سفید قمیص، نیلے پتلون اور اسکرٹ، گلے پر پانیروں کی لال ٹائی۔ دونوں نے چاچا شاستری کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر بڑی سنجیدگی سے اپنی بات شروع کی۔ لڑکے نے روسی میں کہا کہ اس کے اسکول میں بچوں کا بین الاقوامی دوستی کلب ہے وہ اس کا صدر بھی ہے۔ وہ ایک طالب علم ہے۔ اس کلب کے تمام ممبر چاچا شاستری سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کلب کے اعزازی صدر کا عہدہ قبول کریں۔ جو کچھ لڑکے نے کہا لڑکی نے ہندی میں اس کا ترجمہ کیا شاستری جی اس تقریر اور تجویز سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر لڑکی کی پوری تقریر سنی۔ اپنی بات ختم کرکے بچوں نے شاستری جی کو ایک بہت ہی خوب صورت ڈپلوما پیش کیا جس کا سرورق نیلے رنگ کا تھا۔

تم یہ پوچھ سکتے ہو کہ یہ بچوں نے کہاں سے پایا۔ تو میں تم لوگوں کو بتاؤں گا۔ اس بورڈنگ اسکول میں اپنا چھاپا خانہ ہے۔ ہے تو چھوٹا سا لیکن اصلی ہے۔ اس میں صرف بچے ہی کام کرتے ہیں۔ ان کو

تجربہ کار اُستاد مشینوں پر کام کرنا سکھاتے ہیں اس چھاپہ خانے میں اسکول کے بچوں نے یہ ڈپلوما چھاپا تھا۔

چاچا شاستری نے بچوں کی درخواست قبول کر لی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس دستاویز کو احتیاط سے رکھیں گے۔ ظاہر ہے کہ بچے خوش تھے۔

ماسکو بورڈنگ اسکول ہی سوویت یونین کا اکیلا اسکول نہیں ہے جہاں بچے ہندوستانی زبانیں سیکھتے ہیں، اور بھی ہیں۔ لیکن آج کل ہمارے بچے نہیں پڑھتے ہیں۔ گرمیوں میں چھٹیاں گزارنے کے لیے شہروں سے باہر جاتے ہیں۔ اُن میں سے بہت سے اینر کیمپوں میں آرام کرتے ہیں جو خوب صورت جگہوں میں ہیں۔ ان کیمپوں میں وہ ہندوستانی بچے بھی آرام کرتے ہیں جن کے ماں باپ اس وقت سوویت یونین میں کام کرتے ہیں۔ وہ روسی اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں اور اپنے روسی بھائی بہنوں سے ان کی اچھی دوستی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جب یہ ہندوستانی بچے اپنے ملک لوٹ آئیں گے تو وہ تم لوگوں کو اپنی روسی دوستوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکیں گے۔

(بقایا بچوں سے باتیں)

اس مدرسے کے لیے اور اس کے استادوں کے لیے ایک قابل فخر بات یہ ہے کہ اس کے طالب علم اس سے پہلے تین بار یہ امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں مکتبہ کے جنرل مینجر دو مہینے کے لیے مغربی جرمنی جا رہے ہیں۔ مغربی جرمنی میں ایک سوسایٹی ہے یہ کتابوں کی چھپائی۔ اور اشاعت وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ترقی پذیر یا پسماندہ ملکوں کی مدد کرتی ہے۔ تاباں صاحب کو اسی سوسایٹی نے دو مہینے کے لیے مدعو کیا ہے۔ تاباں صاحب وہاں کے مشہور پریسوں اور اشاعت گھروں میں اپنے مفید مطلب معلومات حاصل کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی واپسی پر مکتبہ کی مطبوعات کا معیار اور بلند ہو جائے گا۔ تاباں صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ پیام تعلیم کے لیے اپنے سفر کے حالات لکھ کر بھیجیں گے اور بچوں کے مطلب کی اچھی اچھی کتابیں پیام تعلیم کے لیے لائیں گے۔

اس ترتیب پیام تعلیم میں ایک تصویر چھپ رہی ہے۔ "دنیا کا وقت بتانے والی گھڑی" کی یہ ہمیں جرمنی سفارت خانہ کے اردو اخبار "اطلاعات جرمنی" کی نوازش سے ملی ہے۔ ہم اس اخبار کے شکر گزار ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ایسی مفید چیزیں ملتی رہیں گی جو ہمارے پیامیوں کے لیے دلچسپ اور مفید ہوں گی۔



جناب خضر برنی

بچوں کا ترانہ

دیپ جلاکر موڑ سجائیں بن جائے گا رستہ
اس پہ چلیں گے قدم ملاکر جیسے فوجی دستہ

رکھوالے ہم دیش کے بن کر اس کی شان بڑھائیں
سب بچوں کی فوج ہونیاری، ہنستے گاتے جائیں

دیپ جلاکر موڑ سجائیں بن جائے گا رستہ
اس پہ چلیں گے قدم ملاکر جیسے فوجی دستہ

ہم بچے سردار وطن کے ہم ہیں چوکیدار
بھارت ماں کے پیارے پیارے گلشن کا سنگھار

دیپ جلاکر موڑ سجائیں بن جائے گا رستہ
اس پہ چلیں گے قدم ملاکر جیسے فوجی دستہ

ڈولے، ڈولے، کیاری کیاری کلیاں کچھ مسکائیں
ہنسی خوشی کی باتوں کا یہ ایک سندیسہ لائیں

دیپ جلاکر موڑ سجائیں بن جائے گا رستہ
اس پہ چلیں گے قدم ملاکر جیسے فوجی دستہ

منزل کو ہم پاکے رہیں گے منزل چاہے بھاگے
جیون کی اک جوت جگاکر بڑھ جائیں گے آگے

دیپ جلاکر موڑ سجائیں بن جائے گا رستہ
اس پہ چلیں گے قدم ملاکر جیسے فوجی دستہ



ٹیبور سیکلج
ترجمہ: جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا اور آرماڈلو[1]

۸

آج کے شکار (جنگلی سور) پر یا اس کی ہڈیوں کے ڈھانچے پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے ہم جنگل میں آگے بڑھ گئے، جنگل قدم قدم پر گھنا اور دشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ جھاڑیاں کاٹ کر اپنے لیے راستہ بنانے کا کام ہم دونوں باری باری کرتے تھے۔ پھر بھی شاخوں کے ٹکرانے سے

---

[1] جنوبی امریکہ کا زمین کے اندر رہنے والا ایک جانور جس کے اوپر ہڈی کا ایک خول ہوتا ہے اور جب اُسے پکڑنا چاہتے ہیں تو وہ گول ہو کر گیند کی شکل کا ہو جاتا ہے۔

ہمارے سر زخمی اور کانٹوں سے پیر چھلنی ہو گئے۔ آگے بڑھنے کی رفتار بہت سست تھی۔

ایک بار اپنی باری پر میں جیسے ہی جھاڑی کاٹنے کے لیے آگے بڑھا، کومے داوا نے جھٹکے سے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے جھلا کر کہا۔

کومے داوا نے میرے سر کے اوپر والی شاخ کی طرف اشارہ کیا اور چیخ کر کہا:

"بنکو جیب! پیچھے ہٹو پیچھے۔ جلدی سے!"

میں فوراً پیچھے ہٹا اور اوپر نظر ڈالی۔ شاخ پر ایک بہت ہی بڑا اجگر لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے بل آہستہ آہستہ ڈھیلے کر رہا تھا اور پیڑ کے تنے کے سہارے نیچے اتر رہا تھا۔ تقریباً ایک فٹ موٹا اور لمبائی میں کم از کم بارہ فٹ ضرور ہوگا۔ اس کے چمکیلے جسم پر کالی اور بھوری چتیاں اور لکیریں بھلی لگ رہی تھیں مگر اس کے باوجود وہ انتہائی مکروہ اور ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں بغیر ہلے اس کو دیکھتے رہے۔ اجگر دھیرے دھیرے زمین پر آیا اور بغیر آواز کیے جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ یہ سانپ زہریلا نہیں ہوتا پھر بھی بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ عام طور سے یہ اپنے شکار کو، چاہے وہ آدمی ہو یا کوئی اور جانور، اپنی لپیٹ میں لے کر اتنے زور سے کستا ہے کہ ہڈیاں پسلیاں چرمرا کر رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنا بھاڑ سا منہ کھول کر اسے پورے کا پورا نگل جاتا ہے۔ جب وہ کسی سؤر یا اتنے ہی بڑے کسی دوسرے جانور کو نگل جاتا ہے تو پھر اس سے ہلا بھی نہیں جاتا۔ دس پندرہ روز تک ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے اور جب تک اپنی غذا کو پوری طرح ہضم نہیں کر لیتا اُس جگہ سے نہیں ہٹتا۔ ایسی حالت میں اس کو مارنا یا زندہ پکڑ لینا بالکل مشکل یا خطرناک نہیں ہوتا۔

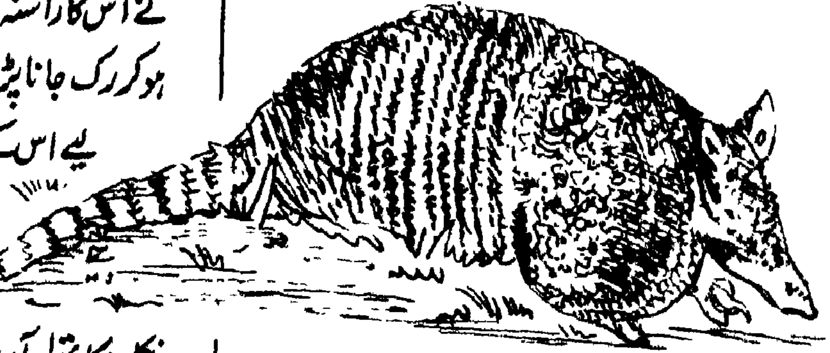
اجگر کے چلے جانے کے بعد میں نے کومے داوا کا شکریہ ادا کیا۔

"بوڑھے مالوآ کا قول ہے کہ جنگل میں رہ کر جو لوگ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہتے ہیں وہ دو زندگیوں کے مالک ہوتے ہیں!" کومے داوا نے جواب دیا۔

"میری تو دو زندگیاں بھی اس جنگل میں ناکافی ہوں گی!"

ہم اس جگہ سے آگے بڑھے ہی تھے کہ کومے داوا ٹھٹک گیا۔ خاموشی سے کچھ سُننے کی کوشش کرنے

لگا۔ ہمارے بائیں طرف سے ایک آواز آرہی تھی۔
دوسرے ہی لمحے آواز کرنے والی چیز ہمارے
سامنے تھی۔ یہ تھا ایک آرماڈِلو —— اتنا بڑا



آرماڈلو میں نے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔ جیسے ہی
اس نے ہمیں دیکھا وہ گول مول ہو کر گیند کی
طرح ہوگیا۔ فٹ بال کی گیند کے برابر۔ اس کے
جسم پر ہڈی کے خول کی تین پٹیاں ہی تھیں ان
پٹیوں نے اس کے جسم کو پوری طرح چھپا لیا تھا
البتہ اس کے نکونے منہ اور دُم کی جگہ پر دو چھوٹے
چھوٹے سوراخ ضرور نظر آرہے تھے اس کے
سر اور دُم پر بھی ہڈیوں کے خول چڑھے ہوئے تھے
آرماڈلو تو اپنی جگہ پہ بے حس و حرکت
پڑ گیا۔ کومے واوا نے آگے بڑھ کر اُسے ہاتھوں
میں اٹھا لیا۔ لیکن جیسے ہی کومے واوا نے اس کو
ڈوری سے باندھنا چاہا وہ اس کے ہاتھوں میں
سے تڑپ کر کودا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ
گھنی گھاس میں سرک گیا۔ کومے واوا اس کے
پیچھے بے تحاشہ دوڑ پڑا۔ لیکن ایک کنٹیلی جھاڑی
نے اس کا راستہ روک دیا۔ کومے واوا کو بے بس
ہو کر رک جانا پڑا۔ میں بھی کومے واوا کی مدد کے
لیے اس کے پیچھے دوڑا تاکہ جھاڑی کاٹ
کر اس کے لیے راستہ صاف
کر دوں لیکن وقت
نکل چکا تھا۔ آرماڈلو کو ہم دونوں نے ایک
بھٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ بھٹ یقیناً اس
آرماڈلو کی پناہ گاہ یا گھر تھا۔

"افسوس ہے کہ یہ دوسرا شکار بھی ہمارے
ہاتھ سے جاتا رہا!" میں نے کومے واوا کو ڈھارس
دلانے کی خاطر کہا۔

"کون کہتا ہے کہ جاتا رہا؟ ہم اسے ابھی
بھٹ سے نکال لیں گے۔ دھواں کر کے نکالیں گے۔
تم ذرا یہیں رکو۔ میں پھر آگ جلاتا ہوں!"

یہ کہتے ہوئے کومے واوا آگ جلانے کا
انتظام کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد
وہ آگ جلانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس عرصے میں میں نے بہت سی لکڑیاں اور

گھاس پھونس جمع کر لیا تھا۔ کومے واآوا کے کہنے پر میں نے بہت سی گھاس تنکے اور لکڑیاں بھٹ کے اندر ٹھونس دیں۔ بھٹ کے منہ کو ایک خاص درخت کی پتیوں سے پوری طرح چھپا دیا۔ یہ پتیاں جب سلگتی ہیں تو دودھیے رنگ کا بڑا گہرا دھواں چھوڑتی ہیں۔

اب کومے واآوا نے ناریل جیسے ایک پیڑ کا بڑا پتا کاٹا اور اس کو توڑ مروڑ کر ایک بڑا سا پنکھا بنایا۔ پھر وہ بھٹ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر اس کو اس طرح جھلنے لگا کہ سارا کا سارا دھواں بھٹ کے اندر جانے لگا۔ کومے واآوا پوری طاقت اور تیزی سے پنکھا جھل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ پسینے سے شرابور ہو گیا مگر پنکھا جھلنے کی رفتار میں کمی نہ آئی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اس کے ہاتھ سے پنکھا لے کر خود جھلنا شروع کیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ یہ کام کتنا مشکل تھا۔ ذرا سی ہی دیر میں میں سر سے پیر تک پسینے میں نہا گیا۔

آس پاس زمین کی درازوں سے دھوئیں کی لکیریں نکلنے لگیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آرماڈلو کا بھٹ دھوئیں سے خوب بھر گیا تھا۔ بھٹ کے اندر آرماڈلو زور زور سے اُچھل کود رہا تھا۔ اس اُچھل کود کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بیچارے آرماڈلو کا دم دھوئیں سے بری طرح گھٹ رہا ہوگا۔

کومے واآوا خوش تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ظالم اور بے رحم تھا اور آرماڈلو کی تکلیف سے اُسے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ عملاً اور طبیعتاً شکاری تھا۔ شکاری کو اپنے شکار پر قابو پانے کے بعد جو خوشی ہوتی ہے وہی خوشی اس وقت کومے واآوا کو ہو رہی تھی۔ آرماڈلو بچ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کومے واآوا اس کو پکڑنے کی۔ دیکھنا یہ تھا کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔

ایکا ایکی بھٹ میں کھڑبڑ کی آواز ہوئی اور آرماڈلو بھوبھل میں لتھڑا کچھ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھٹ کے منہ پر آ گیا۔ کومے واآوا پنکھا پھینک کر اس کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ آرماڈلو کے ہواس اب بھی بجا تھا۔ کومے واآوا کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے بھٹ کی طرف پلٹا اور اندر گھسنے لگا۔ وہ یقیناً گھٹ کر مرنا پسند کرتا تھا۔ دشمن کے ہاتھوں قید ہو کر مرنا اسے قبول نہ تھا۔

آرماڈلو بھٹ میں گھس ہی رہا تھا کہ کومے واآوا نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس

کی دُم مضبوطی سے پکڑ لی۔

"نک چپ انک چپ ا دوڑو ، نہیں تو یہ گیا"، کوے واآوا چلایا۔

آرماڈ تو اپنی پوری طاقت لگا رہا تھا۔ کوے واآوا بھی پوری طاقت سے اسے روک رہا تھا مگر آرماڈِلو، کوے واآوا کو اپنے ساتھ بھٹ کے اندر گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔

میں نے جلدی سے آرماڈِلو کی دُم پکڑ لی۔ اب ہم دونوں اس کو کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اپنی ساری طاقت لگانے کے بعد بڑی مشکل سے ہم اس کو باہر لا سکے۔ باہر نکالتے ہی کوے واآوا نے اپنے چاقو کا دستہ اس کے سر پہ دے مارا۔ آرماڈِلو بے ہوش ہو گیا۔ اب کوے واآوا نے اس کو آسانی کے ساتھ رسّی سے مضبوطی کے ساتھ باندھ لیا۔

ہم دونوں بہت خوش تھے۔ دونوں ہی بہت تھک چکے تھے۔ اس لیے سستانے کے لیے لیٹ گئے۔ پیاس کے مارے ہمارا برا حال تھا۔ پانی کے لیے دریا تک جانا ضروری تھا اور دریا کافی دور تھا۔

"پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا ہے"! میں نے کوے واآوا سے کہا۔

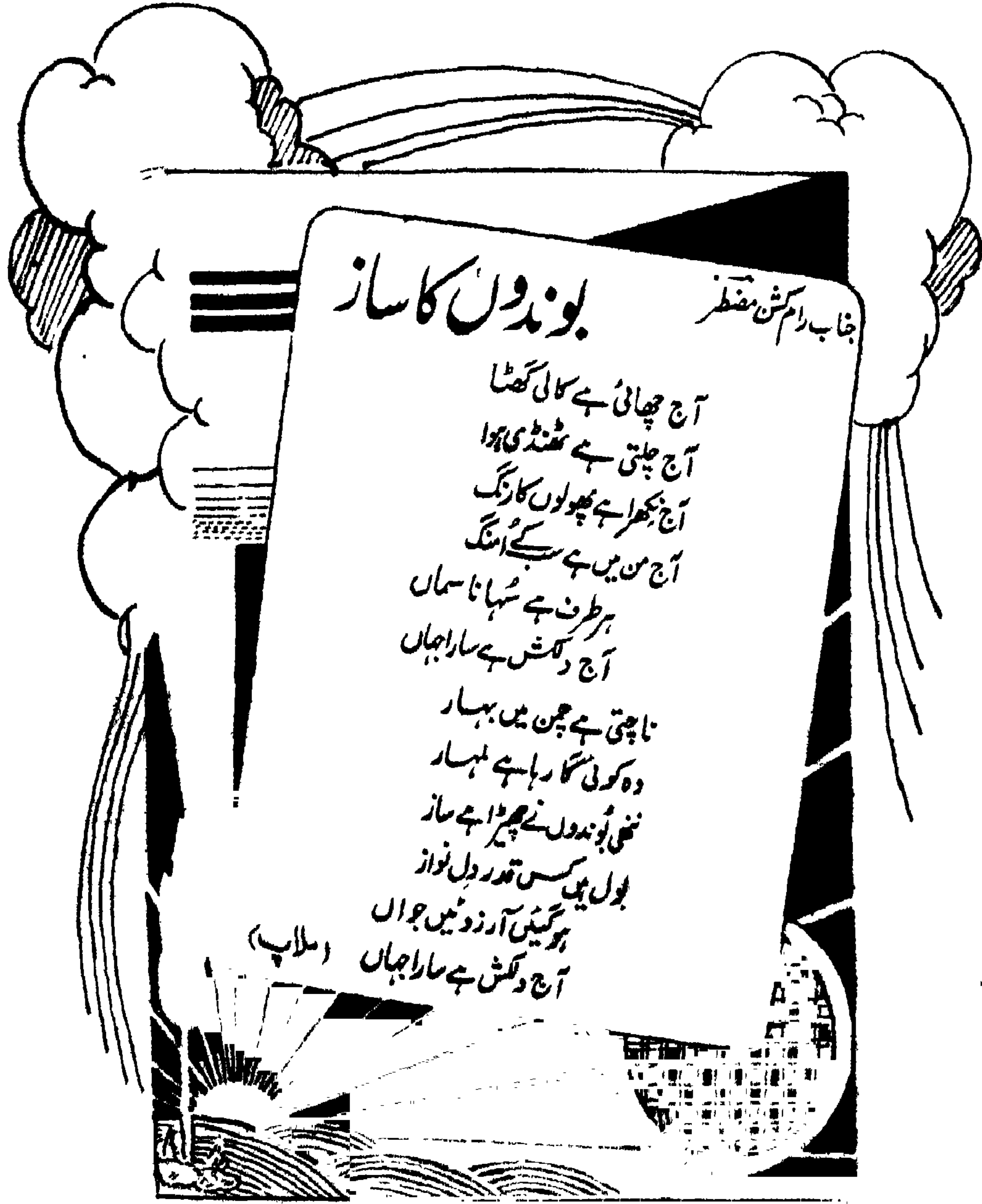
یہ سنتے ہی کوے واآوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک بڑے سے پیڑ کے پاس گیا۔ اس پیڑ پر ایک طرح کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کی لمبی لمبی شاخیں اِدھر اُدھر لٹک رہی تھیں۔ کوے واآوا نے اپنے چاقو کے ایک ہی وار میں بیل کی چار پانچ فٹ لمبی ایک شاخ کاٹی۔ پھر وہ اس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میرے پاس لایا اور بولا:

"نک چپ الو پانی پیو"

میں سمجھا کہ کوے واآوا پھر مذاق کرنے پر اتر آیا ہے میں مسکرا دیا۔

کوے واآوا نے جب دیکھا کہ میں اس کی بات پر یقین نہیں کر رہا ہوں تو اس نے بیل کی شاخ کا کٹا ہوا حصّہ اپنے منہ کو لگایا اور دوسرے ہاتھ سے بیل کو اوپر اٹھایا۔ بیل کے اٹھاتے ہی اس میں سے صاف و شفاف پانی نکلا۔ کوے واآوا اس کو غٹ غٹ پینے لگا۔ میں دنگ رہ گیا۔ پیاس کی شدت بھی کیا بری چیز ہے۔ جیسے ہی میں نے کوے واآوا کو پانی پیتے دیکھا، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کوے واآوا کے ہاتھ سے بیل چھین کر خود اپنے منہ سے لگالی۔ بیل کا پانی برف جیسا ٹھنڈا اور چشمے کے پانی کی طرح میٹھا تھا میں نے خوب جی بھر کر پیا۔

(باقی آیندہ)


بوندوں کا ساز
جناب رام کشن مضطر
آج چھائی ہے کالی گھٹا
آج چلتی ہے ٹھنڈی ہوا
آج بکھرا ہے پھولوں کا رنگ
آج من میں ہے سب کے اُمنگ
ہر طرف ہے سُہانا سماں
آج دلکش ہے سارا جہاں
ناچتی ہے چمن میں بہار
وہ کوئی گا رہا ہے ملہار
ننھی بُوندوں نے چھیڑا ہے ساز
بول ہیں کس قدر دل نواز
ہوگئیں آرزوئیں جواں
آج دلکش ہے سارا جہاں
(ملاپ)

جناب محمد امین

امریکی خلاباز

وہائٹ اور میک ڈوٹ



یہ تو آپ جانتے ہیں کہ خلا میں معلق رہنے اور اس میں تیرنے کا کام روس نے شروع کیا لیکن امریکا بھی خاموش نہیں ہے۔ وہ بھی انتھک کوشش کر رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ روسی خلاباز لیونوف کی اڑان کے ٹھیک ڈھائی مہینے بعد امریکا نے اپنا خلاباز خلا میں بھیج دیا۔

۳ر جون ۶۵ء کی خبر بڑی "سنسنی خیز" تھی۔ امریکی خلاباز میجر ایڈورڈ وہائٹ اپنے راکٹ سے نکل کر خلا میں تیرنے لگے۔ وہ خلا میں بیس منٹ تک تیرتے رہے۔ ایک اور امریکی خلاباز میجر میک ڈوٹ

بھی ان کے ساتھی تھے یہ راکٹ کے اندر کنٹرول روم میں بیٹھے تھے اور راکٹ کو چلا رہے تھے

راکٹ کا نام جیمنی ۴ تھا اور یہ ایک گھنٹے میں ۵۰۰، ۱۷، میل کی رفتار سے چکر لگا رہا تھا اس کے مدار کی اونچائی ایک طرف ۱۷۹، میل اور دوسری طرف ۱۰۱ میل تھی۔

تیسرے چکر کے دوران میجر وہائٹ اپنے کیبن سے باہر نکل آئے اور ایک سنہری رسّی کے سہارے وہ دور تک خلا میں تیرتے چلے گئے۔ یہ رسّی راکٹ سے بندھی ہوئی تھی۔ بیس منٹ تک وہ اسی طرح خلا میں تیرتے اور زمین کا مشاہدہ کرتے رہے۔ روسی خلاباز لیونوف سے چند منٹ زیادہ وہ خلا میں رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے راکٹ میں واپس آگئے۔ پھر انھوں نے چار گھنٹے تک آرام کیا اگرچہ ان کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی اور بھوک بھی نہیں لگی۔

وہائٹ کے ساتھ ایک خاص قسم کی خلائی گن (بندوق) تھی جس کی مدد سے وہ خلا میں تیرتے رہے۔ اس بندوق میں آکسیجن بھری ہوئی تھی اور توازن کو قائم رکھنے کے لیے وہائٹ کی کمر میں سامنے کی طرف بندھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی مدد سے آگے

پیچھے، دائیں بائیں، ہر طرف اپنی پوزیشن بدل سکتے تھے

روسی خلاباز لیونوف نے اس قسم کا آلہ استعمال نہیں کیا تھا اور وہ محض راکٹ سے بندھی ہوئی رسّی کے بل بوتے ہی اپنے توازن کو برقرار رکھ سکے تھے۔

دوسرا ٹیکنیکل فرق یہ تھا کہ لیونوف کا کیبن (جہاز کا کمرہ) خلا کے ماحول سے بالکل مختلف اور الگ تھلگ تھا لیکن جیمنی ۴ کا کیبن خلا کے ماحول کے عین مطابق تھا۔ اس کیبن کا ڈھکن کھلنے سے پہلے وہائٹ اور میک ڈیوٹ نے اپنے خلا کے لباس پہن لیے تھے اور اس میں آکسیجن بھری تھی۔

وہائٹ کا لباس ۲۱ تہوں کا تھا اور اس کا وزن ۱۴ کلوگرام تھا۔ اتنا وزنی اور بھاری لباس پہننے کے باوجود وہائٹ جب خلا میں نکلے تو قلابازی کھا کر نیچے نہیں گرے۔ وہ اطمینان سے تیرتے رہے اور پروگرام کے مطابق اتنا کام انجام دیتے رہے۔ زمین کی قوتِ کشش کو آخر کیا ہوا؟ آپ سوچیے اور سوچ کر خود ہی اس کا جواب معلوم کیجیے۔

دونوں خلاباز چکر لگاتے رہے اور چوہو دھویں

چکر کے دوران وہائٹ نے کرنل گریسم سے بات چیت کی۔ گریسم (سابق امریکی خلا باز) نے ایک دن پہلے کے اخبار کی سرخیاں پڑھ کر وہائٹ کو سنائیں جن میں ان کے کارنامے کو سراہا گیا تھا۔ پھر بیس سال کے کھیل کی خبریں سنائیں اور اُن سے کہا کہ یہ خبر میک ڈوِٹ کو بھی سنا دینا (یہ اُس وقت آرام کر رہے تھے۔)

دونوں خلا باز باری باری سے اپنے فرائض انجام دیتے۔ جب میک ڈوِٹ آرام کرتے تو وہائٹ زمین والوں خصوصاً اپنے ملک کے سائنس دانوں اور خلائی تجربے کے ماہرین سے بات چیت کرتے اور ان کو اپنے تاثرات سناتے۔ اس کے بعد میک ڈوِٹ اُٹھ بیٹھتے اور وہائٹ سونے کی کوشش کرتے۔

دونوں خلا باز زمین کے اردگرد چکر لگاتے رہے اور انھوں نے کل ۶۲ چکر لگائے اور وقت ۹۸ گھنٹے صرف ہوا۔ روس کے کرنل بیکوسکی کا ریکارڈ ۱۱۹ گھنٹے کا ہے۔ بہر حال ۹۸ گھنٹے تک چکر لگانا بھی کچھ کم ہمت کی بات نہیں تھی۔

دونوں خلا باز ٹھیک ٹھاک رہے اور طبی لحاظ سے ان کی صحت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے ذہن تیزی سے کام کرتے رہے اور چار روز کی متواتر اڑان کے باوجود وہ اپنے فرض منصبی سے کبھی غافل نہیں ہوئے، نہ اُن پر کبھی بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوئی۔

انھوں نے زمین کے مختلف نقطوں یا مقامات کی تصویریں بھی کھینچیں جیسے پورٹوریکو کے دو شہروں کی، کولمبیا کے بوگوٹا شہر کے ہوائی اڈے ال ڈوریڈو کی، کیلی فورنیا کے دو شہروں کی، بولیویا میں دو جھیلوں کی اور افریقہ میں اس مقام کی جہاں نیلا نیل اور سفید نیل ملتے ہیں یعنی ان کا سنگم ہے (تم ان ملکوں کو اٹلس میں تلاش کرو) غرض دنیا کے جس بر اعظم سے ہو کر وہ گزرتے وہاں کے چند مخصوص مقامات کی تصویریں اتار لیتے اور اپنے تاثرات بھی سناتے جاتے۔

تیسرے دن اڑان کے دوران میک ڈوِٹ نیچے زمین کے کنٹرول روم کے آدمی سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ مثلاً کنٹرول روم سے کہا گیا کہ "آپ لوگ زمین یعنی اپنی مادرِ گیتی پر اترنے کی تیاری کر رہے ہیں؟ میک ڈوِٹ نے جواب دیا کہ میں اس کی شکل (میجر وہائٹ

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا ہوں۔ مزید انھوں نے کہا کہ میں یہ آواز (ریڈیو کی آواز) بھی سنتے سنتے تنگ آگیا ہوں۔ پھر کنٹرول روم سے آواز آئی کہ ابھی آپ لوگوں کو ایک ہفتے تک اور چکر لگانا ہے میک ڈِوِٹ نے کہا "بہت اچھا۔ہم اس کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارے کھانے کا سامان اور بھیج دو۔"

جیمنی راکٹ کو چار دن تک متواتر خلا میں اڑانے کا پروگرام تھا اور یہ پروگرام کامیاب ہوتے دیکھ کر دنیا کے سبھی سائنس داں خصوصاً امریکی ماہرین بہت خوش تھے۔ یہ طے تھا کہ اخیر میں اسے بحر اطلانتک میں اتار لیا جائے گا۔ گرین وچ کے وقت کے مطابق اس کو ۵ بجکر ۱۲ منٹ پر شام کو ہمارے ملک کے وقت کے لحاظ سے رات کو ۱۰ بجکر ۴۲ منٹ پر اترنا تھا۔

امریکا کے بعض ماہرین کو کچھ شک سا ہونے لگا تھا کہ معلوم نہیں جیمنی کہاں اترے گا اور انھوں نے احتیاطاً اپنی حکومت کے ذریعے یو۔اے۔آر (مصر) کی حکومت کے صدر کرنل ناصر سے گزارش کرکے یہ اجازت بھی لے لی تھی کہ شاید ان کے ملک میں اتر جائے لیکن ایسی کوئی بات پیش نہیں آئی۔

راکٹ مسلسل ۹۸ گھنٹے تک اڑتا رہا اور اس نے کل ۱۶۰۹۰۶۸۴ میل کی مسافت طے کی۔اس میں مزید آکسیجن، بجلی، اور اڑنے کی طاقت کا انتظام تھا تاکہ اگر چار دن سے زیادہ اڑنے پر مجبور ہو تو کوئی پریشانی نہ ہو لیکن امریکن خلائی تحقیق کے ڈائرکٹر مسٹر چارلس میتھیوز نے فرمایا کہ "نہیں! ہم چار دن سے زیادہ راکٹ کو نہیں اڑائیں گے۔"

چنانچہ چار دن میں ۶۲ چکر لگانے کے بعد دونوں خلاباز کرۂ ہوائی سے ہوتے ہوئے بحر اطلانتک میں اتر آئے۔

نیچے اترتے وقت ۴ منٹ تک ان کا تعلق زمین سے منقطع ہو گیا تھا اور جب تک یہ کیفیت طاری رہی خلا کے ماہرین کچھ پریشان سے رہے لیکن جیسے ہی ناتا پھر سے قائم ہوا تو میک ڈِوِٹ نے بتایا کہ ہم کرۂ ہوائی میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر پیراشوٹ (ہوائی چھتری) کھل گیا اور وہ اطمینان سے نیچے اترنے لگے۔

دونوں تھکے تھکے سے تھے۔بھوکے بھی تھے لیکن ان کے چہروں سے بشاشت اور فتح و کامرانی

کی خوشی جھلکتی تھی اور وہ مایوس نہیں تھے۔ پانی میں جب وہ گرے تو دونوں اپنے کیپسول کے اندر ۱۲ منٹ تک پڑے رہے۔ دراصل اپنے متعینہ مقام سے وہ ۱۰۳ میل دور گرے تھے اس لیے ہیلی کوپٹر کو تلاش کرنے میں کچھ دیر ہوئی۔

بہرحال ہیلی کوپٹر جیسے ہی کیپسول کے قریب آیا فوراً سمندری غوطہ خوروں نے اس میں سے نکل کر پانی میں جست لگائی اور کیپسول میں رسّی اور تار سے بندھے ہوئے ہک کو فٹ کیا۔ اس کے بعد ہیلی کوپٹر نے کیپسول کو اٹھا کر ویسپ نام کے جہاز پر جو اس کام کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا لے جا کر اتارا۔

مسکراتے ہوئے دونوں خلا باز اپنے کیپسول سے باہر نکلے اور نکلتے ہی انھوں نے سب سے پہلے سلامی دی۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اگرچہ بھوکے بہت ہیں۔ اُن کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ چار روز تک مسلسل بے وزنی کے عالم میں رہنے کے باوجود دونوں چاق و چوبند ہیں۔

اسی وقت اُن کا طبی معائنہ کیا گیا۔ پتہ چلا کہ خون کا دباؤ کسی قدر کم ہے اور ان کے دلوں کی دھڑکن نارمل سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن ان کے پیروں میں لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ قدم ٹھیک طرح اٹھ رہے تھے اور وہ گھبرائے ہوئے نہیں تھے۔ پھر بھی چار روز کی خلائی اڑان کے تجربے کے بعد دونوں خلا باز کسی قدر پریشان سے تھے۔ چار روز تک وہ اپنے ڈبوں میں بند رہے اور اپنی اپنی سیٹوں سے بندھے رہے۔ ان پر بے وزنی کی کیفیت برابر طاری رہی۔

اس کے علاوہ نہ تو انکیں نہانے کا موقع ملا نہ داڑھی بنانے کا۔ اور کانوں میں ریڈیو کی آواز متواتر گونجتی رہی۔ اکثر سورج کی دھوپ اور روشنی جو ان کے ڈبوں میں چھن کر آتی تھی ان کے چہروں پر پڑتی تھی اور وہ ان کی نیند میں خلل ڈالتی تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیک سے سو نہیں سکے۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھا سکے اور پریشان سے رہے۔ نیچے اترنے کے بعد دونوں نے جی بھر کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد کئی گھنٹے تک آرام کیا۔

ہمارے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے امریکا کے صدر جانسن کو مبارک باد کا پیغام بھیجتے ہوئے فرمایا "جیمنی ۵ کی اُڑان سے ہمیں بہت دلچسپی تھی اور اس کی کامیاب اڑان سے ہمیں بہت

خوشی ہوئی ہے۔ اپنے ملک کے عوام، حکومت اور میں اپنی طرف سے یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دینے پر آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیمنی ۴ کی اڑان وہائٹ اور مِیک ڈوِٹ کے خلائی سفر نے ہماری ہمتوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ دونوں خلاباز خصوصاً وہائٹ نے خلا کے اندر رہ کر جو جو کارنامے انجام دیے ہیں اُن کا اندازہ ہمیں زمین پر رہ کر نہیں ہو سکتا۔ کامیاب اڑان، خلا میں تیراکی اور پروگرام کے مطابق سارا منصوبہ عمل میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ امریکا نے بھی روس کی طرح خلا کی سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست کامیابی حاصل کرلی ہے۔

سابق امریکی صدر کنیڈی نے خلا کی تحقیق کے سلسلے میں جو مہم تیزی سے شروع کرنے کی داغ بیل ڈالی تھی وہ آج پروان چڑھتی نظر آرہی ہے۔ امریکا روس سے دس سال پیچھے تھا لیکن اب وہ صرف ڈھائی مہینے پیچھے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس اور امریکا نے خلا کی تحقیق میں غیر معمولی ترقی کی ہے لیکن اگر دونوں مل کر چاند پر پہنچنے کا تجربہ کریں تو ہم ۱۹۷۰ء سے بہت پہلے چاند پر اپنا جھنڈا گاڑ سکتے ہیں۔

محترمہ سیدہ فرحت





یومِ آزادی

لال قلعے پر آج ترنگا شان سے پھر لہراتا ہے
دیش کی آزادی کے ترانے پھر آج سناتا ہے

چاچا نہرو! بول تمہارے کانوں میں پھر گونج اٹھے
سندر مکھڑا یاد ہمیں پھر آتا ہے

آنکھوں میں ہم آنسو بھر کر کرتے ہیں پھر یاد تمھیں
مر کے بھی! تم آج امر ہو تم سے ہمارا ناتا ہے

پیارے چاچا نہرو تم کو یاد ہمیشہ رکھیں گے
قدم قدم پر دھیان تمھارا ہم سب کو آجاتا ہے

ساری دُنیا کے نیتا تھے یاد تمھیں سب کرتے ہیں
اپنا پرایا سارے جگ میں آپ ہی کے گُن گاتا ہے

دیس کی آزادی کی حفاظت ہر قیمت پر کرنا ہے
بھارت دیس کا بچّہ بچّہ آج قسم یہ کھاتا ہے

فرحتؔ اپنے رہبر کا ہر نقشِ قدم اپنانا ہے
اُس نے بتایا جو رستہ ہے منزل تک لے جاتا ہے

راہ ہماری کیا روکے گا، ٹھکرا کر بڑھ جائیں گے
کوئی ہمارے رستے میں کیوں روڑا بن کر آتا ہے



جناب ابرار محسن

ڈاکو کی گرفتاری

(۲)

ایک روز اخبار میں خبر آئی کہ آدم پور کی پولس نے جنگل پر چڑھائی کر دی مگر جگّا ڈاکو اور اس کے گروہ کے آدمیوں نے جنگل کے اندر ہی سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ کافی دیر تک پولس اور ڈاکوؤں میں گولی چلتی رہی آخرکار پولس ہی کو ہار ماننی پڑی۔ ڈاکوؤں نے پولس کو جنگل کے اندر گھسنے ہی نہیں دیا۔ تین سپاہی مارے گئے اور پولس انسپکٹر بھی زخمی ہو گیا۔

یہ خبر پڑھ کر میں گھبرا گیا۔ اسی وقت ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا اور ان کو وہ خبر دکھا کر رونے لگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور جیب سے گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر کہا۔

"دیکھو تمہارے والد صاحب کا تار ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ خبر پڑھ کر گھبراؤ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں صرف معمولی چوٹ ہے۔"

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پاپا کا تار آنے

سے کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ اچانک میرے دل میں
ایک نیا خیال آیا۔

"مجھے خود کچھ کرنا چاہیے۔ جگا کو گرفتار کرانا
چاہیے یا کم از کم پولس کی مدد ہی کی جائے۔" میں نے
سوچا اور دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں ماسٹر صاحب
سے آدم پور کے جنگل اور جگا کے بارے میں پوچھا۔
ماسٹر صاحب نے بتایا ۔۔۔ "جگا اپنے آدمیوں کے
ساتھ آدم پور کے جنگل میں رہتا ہے وہ جنگل اتنا
گھنا ہے کہ اس میں دن کو بھی رات کا سا اندھیرا چھایا
رہتا ہے۔ اس کے اندر بے شمار جنگلی درندے تھے۔
جنھیں جگا اور اس کے ساتھیوں نے ختم کر دیا ہے۔
وہیں بیچ جنگل میں کسی جگہ وہ رہتے ہیں۔ وہ جگہ کسی
کو معلوم نہیں۔ بہت سے ڈاکو ہر وقت بندوقیں لیے
جنگل میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ
کوئی خطرہ ہو تو خبر کر دیں۔" میں گہری سوچ میں ڈوب
گیا۔ واقعی بڑا خطرناک آدمی تھا وہ جگا ڈاکو۔

دو ایک روز ہی بعد رقار کا ایک خط اور آیا:
"بھیا ۔۔۔ جگا نے ناک میں دم کر رکھا
ہے جب بھی پولس اس پر حملہ کرنے
جاتی ہے اسے خبر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے

آدمیوں کے ساتھ پہلے ہی سے تیار
ہو جاتا ہے۔ پولس اسے پکڑنے کے
لیے جو بھی ترکیب نکالتی ہے وہ ناکام ہوتی
ہے۔ ابھی کل ہی رات کے وقت ہمارے
گھر پر سب پولس والوں کی میٹنگ ہوئی۔
تم سوچتے ہوگے کہ ہمارے گھر پر کیوں ہوئی؟
پولس اسٹیشن پر کیوں نہ ہوئی؟ بات یہ ہے
کہ پاپا کو کچھ شک ہو گیا ہے کہ پولس کا کوئی
آدمی جگا سے ملا ہوا ہے اور اسے خبر
پہنچایا کرتا ہے۔ اسی لیے میٹنگ میں معمولی
سپاہی کوئی بھی نہ تھا بلکہ سب کے سب افسر
ہی تھے۔ تو یہ طے ہوا کہ جنگل کے دوسری
طرف جو ندی ہے اُدھر جگا کے آدمیوں
کا پہرہ نہیں رہتا ہوگا۔ اسی لیے پولس
والے مچھیروں کا لباس پہن کر جنگل میں
گھس جائیں آدھی رات کے وقت۔
جب پولس والوں نے جنگل میں داخل
ہونے کی کوشش کی تو ڈاکو پہلے ہی
سے ہوشیار تھے۔ انھوں نے کئی سپاہیوں
کو مار ڈالا۔ پاپا کے پہلے چوٹ لگ گئی
تھی اس لیے وہ نہیں جا سکے۔ اور

بھیّا آج جگّا کا خط آیا ہے جس میں
اس نے پاپا کو دھمکی دی ہے کہ اگر وہ
یہاں سے نہ گئے تو انھیں بھی نہیں چھوڑا
جائے گا۔ امّی بہت رو رہی ہیں لیکن
رحمو دادا اور پاپا انھیں بہلا رہے ہیں
کہ ڈاکو تو ایسی دھمکی دیتے ہی رہتے
ہیں۔ بھیّا! رحمو دادا بڑے اچھے ہیں۔
وہ بہت لمبے چوڑے آدمی ہیں لیکن ہیں
بوڑھے۔ ان کی داڑھی بالکل سفید ہے
وہ ہمارے گھر کا کام کاج کرنے کے
لیے صبح ہی صبح آجاتے ہیں اور شام کو
گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے گاؤں چلے جاتے
ہیں۔ ان کا گاؤں یہاں سے صرف دو
میل دور ہے۔ رحمو دادا ہم سے بڑی
محبت کرتے ہیں اور اب تو مجھے گھوڑے
کی سواری بھی سکھا رہے ہیں۔ بہت
اچھے ہیں وہ۔ اب جب تم خط لکھو تو
انھیں سلام ضرور لکھنا۔ اور ہاں ایک
کام کی بات سنو۔ آج رات کو میں
خود جنگل کی طرف جاؤں گا اور وہ
جگہ دیکھ کر آؤں گا جہاں جگّا رہتا ہے۔
پھر اُسے پکڑوا دوں گا۔ میں نے رحمو دادا
سے بھی چپکے سے کہہ دیا ہے۔ حالانکہ وہ
کہہ رہے ہیں کہ میں نہ جاؤں مگر میں
جاؤں گا ضرور۔ اچھا اب خط ختم کرتا ہوں۔
پاپا اور امّی بہت یاد کرتے ہیں میرے
دوستوں سے سلام کہنا ــــ وقار"

وقار کے اس خط نے مجھے اور بھی پریشان کر
دیا۔ میں خوب رویا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وقار کو
جگّا نے پکڑ لیا تو کیا ہوگا۔

اگلے ہی دن اخبار میں خبر تھی۔ "آدم پور کے
پولس انسپکٹر کا چھوٹا لڑکا غائب کر دیا گیا ہے خیال
ہے یہ جگّا ہی کی حرکت ہے ــــ"

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور اسلم سے کہا۔
"اب تو ضرور جاؤں گا اور جگّا کو گرفتار کراؤں گا۔ ابھی
اسی وقت"۔ مگر مشکل یہ تھی کہ آدم پور جاؤں کیسے۔
میرا جیب خرچ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت اسلم نے
میرا بڑا ساتھ دیا۔ اس نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر دو روپے
جوڑے تھے وہ مجھے دیدیے۔ بیچارہ اسلم!۔

رات کے وقت میں بھاگ نکلا جب کہ سب سو
رہے تھے۔ بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچا اور گاڑی میں
بیٹھ کر آدم پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت میرے

لباس کو اگر کوئی دیکھتا تو مجھے نہ پہچان پاتا کیونکہ میں نے
ایک پھٹا پرانا کرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اس لیے
کہ میں گھر جانے کے بجائے سیدھا جگا کے جنگل میں
جانا چاہتا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک
وقار کو چھڑا نہ لوں اور جگا کو گرفتار نہ کرا دوں گا
کسی کو شکل نہ دکھاؤں گا۔

جب میں آدم پور پہنچا تو دن نکلنے میں ایک
گھنٹہ باقی تھا اس لیے ابھی اندھیرا ہی تھا۔ ایک
آدمی سے معلوم کرکے میں جنگل کی طرف چل دیا۔ راستے
میں ایک درخت پرسے میں نے ایک لکڑی بھی توڑ
لی۔ جب میں جنگل میں داخل ہوا تو سورج نکل رہا
تھا۔ جنگل بڑا ہی گھنا تھا اور دور تک پھیلا ہوا
تھا۔ مجھے ڈر تو لگا لیکن وقار کا خیال آتے ہی دل
مضبوط کرکے جنگل کے اندر گھس ہی گیا۔ ابھی تھوڑی
دور ہی گیا ہوں گا کہ کسی نے میری گردن دبالی۔

"کون ہے تو؟" اس نے کہا۔ وہ ایک ڈاکو
تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بندوق تھی۔

"ارے بھیا کیوں اندھے فقیر کو ستاتے ہو۔"
میں نے کہا۔

ڈاکو نے میری گردن چھوڑ دی اور پوچھنے لگا۔
"یہاں کیوں آیا ہے؟"

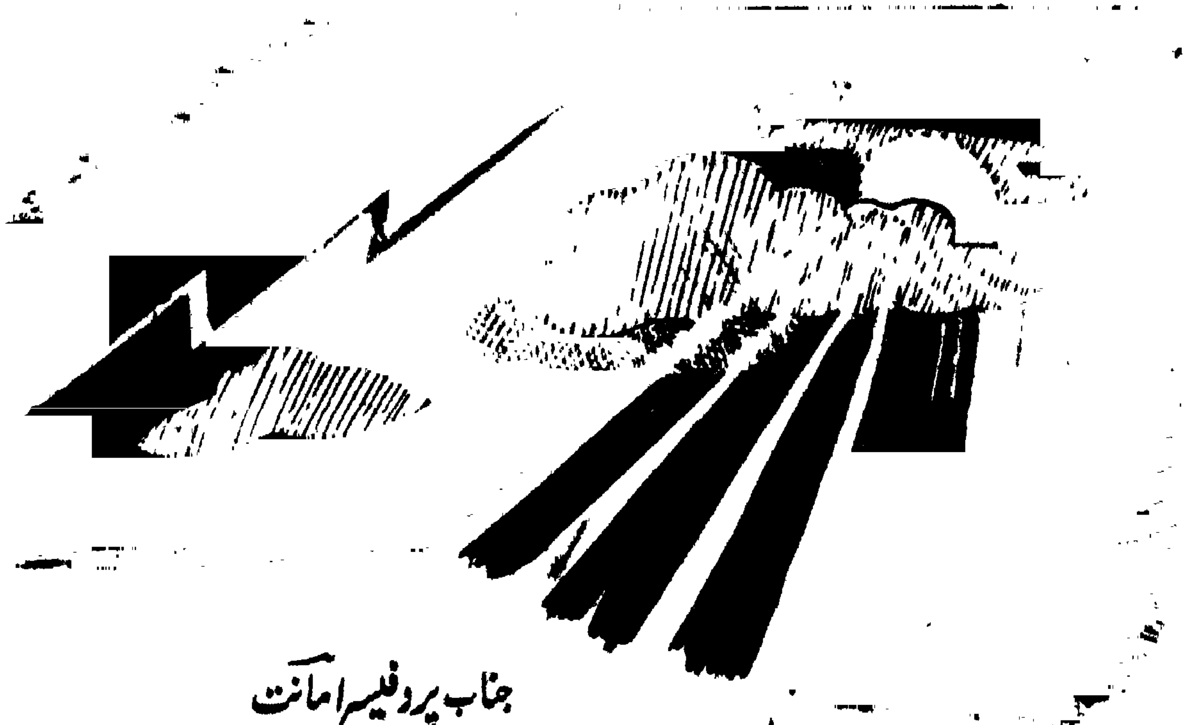
میں نے فوراً جواب دیا "بھوکا مرتے مرتے تنگ
آچکا ہوں اس لیے سوچا کہ جگا سے کہوں مجھے گولی
مار دے۔"

ڈاکو نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا آجا میرے ساتھ۔
تجھے دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا یاد آ گیا جو تیری طرح ہی اندھا
تھا۔ بے چارہ مر گیا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر جنگل کے اندر چلنے لگا جس
راستے پر ہم چل رہے تھے وہ جھاڑیوں سے ڈھکا
ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ایک عمارت
کے پاس پہنچے جس کا بڑا سا لوہے کا دروازہ تھا جو
بند تھا۔ ڈاکو تین بار چلایا۔ دروازہ کھل گیا اور ہم
اندر داخل ہو گئے۔ وہاں بہت سے ڈاکو تھے جو مجھے
غور سے دیکھنے لگے۔ اس ڈاکو نے انھیں بتایا کہ یہ
اندھا لڑکا ہے اسے وہ ترس کھا کر لے آیا ہے۔
شاید اس وقت جگا وہاں موجود نہ تھا۔

اسی عمارت میں ایک کوٹھری میں مجھے ٹھہرا
دیا گیا۔ میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ وقار کہاں ملے گا۔
میں جانتا تھا وقار کو اسی لیے غائب کیا گیا کہ بابا
پریشان ہو کر آدم پور چھوڑ دیں۔ مگر وقار کا کہیں
پتہ نہ تھا۔

(باقی آئندہ)



جناب پروفیسر امانت

برسات

آیا، برسا، کھل گیا بادل — دُنیا ساری ہوگئی جل تھل
رُت آئی کیسی برکھا کی — چاروں سمت مچی ہے ہلچل
جب آکاش پہ بجلی چمکی — رم جھم رم جھم برسا بادل
بن میں چنچل مور تو دیکھو — ناچا، جھوما، ہوگیا پاگل
بہہ نکلے ندی اور نالے — کھول کے جی یوں برسے بادل
کالی گھٹا سے جھانکا سورج — کرنیں پھوٹیں کومل کومل
کھیتوں میں آئے گی بہار اب — جلد بچھے گی ہر سو مخمل
ٹھنڈک پہنچی سب کے من کو
گرمی سے اب کون ہے بیکل



جناب رفیق محمد شاستری

پربت وہ سب سے اونچا

(۲)

تین سنگھ اور اس ٹولی کے ایک دوسرے انگریز رکن مسٹر ہلاری بہت خوش نصیب تھے۔ ۲۹ مئی ۵۳ء کو یہ دونوں باہمت انسان دنیا کے سب سے اونچے پربت پر پہنچ گئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ خبر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ جس نے سُنا ان بہادروں کے کارنامے کی داد دی۔ اس لیے کہ یہ کامیابی صرف تین سنگھ اور ہلاری کی کامیابی نہیں تھی۔ انسانی عزم و حوصلے کی کامیابی تھی۔ جو بھی سنتا خوش ہوتا۔ آخر انسان کے قدم اس جگہ پہنچ ہی گئے جسے لوگ انسانوں کے لیے ممنوع سمجھتے تھے۔ ایورسٹ، دنیا کا سب سے اونچا پربت انسان کے پیروں تلے آگیا۔

جی ہاں یہ محض ان دو آدمیوں کی کامیابی نہ تھی۔ پوری ٹیم کی کامیابی تھی جنھوں نے ان دو نوجوانوں کو اوپر تک پہنچایا۔ پچھلی تمام مہموں کی کامیابی تھی جنھوں نے اس مہم کی کامیابی کے لیے راستہ تیار کیا تھا۔ یہ انسانی عزم و حوصلے کی کامیابی تھی، جو ایورسٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔

تین سنگھ کا نام ساری دنیا میں عزت سے لیا جانے لگا۔ ہندوستان والوں میں تو اس نے ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ ہندوستان کے نوجوانوں کے دل میں ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچنے کا خیال انگڑائیاں لینے لگا۔ تین سنگھ ہندوستانی تھا مگر اس

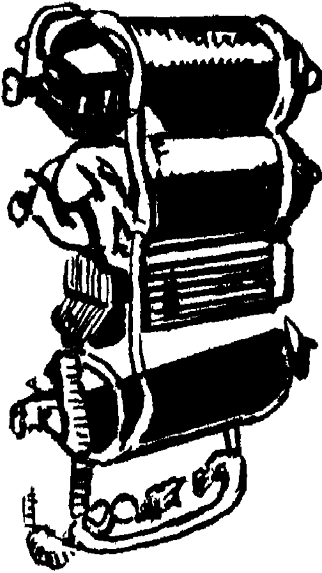
چڑھائی کی تیاری دوسرے ملک کے لوگوں نے کی تھی۔ اب ہندوستان کے نوجوان سوچنے لگے کہ کیوں نہ اپنے طور پر تیاری کرکے اور اپنے ہی ساز و سامان کے سہارے اس بلند ترین چوٹی کو سر کیا جائے۔

پھر کیا تھا، تیاریاں ہونے لگیں۔ کوہ پیمائی کا ایک باقاعدہ اسکول بھی دارجلنگ میں کھول دیا گیا۔ ہمارے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت نہرو، بنگال کے وزیر اعظم ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے نے اس اسکول کو قائم کرنے میں بہت سرگرمی دکھائی۔ تین سنگھ اس اسکول کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔

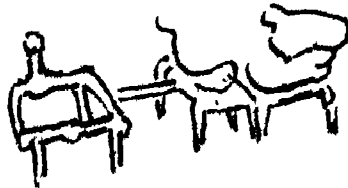
ایورسٹ پر ۱۹۵۳ء کی کامیاب چڑھائی کے بعد سوئزرلینڈ کی ٹولی نے ۱۹۵۶ء میں دوبارہ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کی۔ اس ٹولی نے دوبارہ اپنے چار آدمیوں کو چوٹی پر چڑھا دیا۔

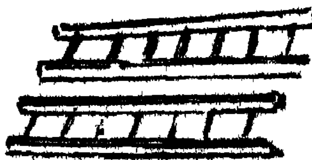
پہاڑ پر چڑھائی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آدمی جتنا اوپر چڑھتا جاتا ہے چڑھائی مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی ہے۔ سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے، برفیلے پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنانا اور رسیوں کے سہارے ہزاروں فٹ گہری برفیلی غاروں کو عبور کرنا ایسا کام ہے کہ بڑے بڑے جواں مرد بھی ہمت ہار بیٹھیں۔ پھر پوری

ٹولی کے لیے خاص طرح کا لباس، خاص طرح کے اوزار، سانس لینے کے لیے آکسیجن گیس کی بوتلیں، کھانے پینے کے سامان، ٹھنڈ سے بچنے کے لیے




کلہاڑی


کیلوں والا تلا


سیڑھیاں



جوتہ

اسنیپ لنک

ہتھوڑا

دستانہ

دنانے اور نہ جانے کیا کیا کچھ غرض یہ سب چیزیں ساتھ جاتی ہیں

ہندوستان کے نوجوان یہ سب تیاریاں کرتے رہے۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ۱۹۶۰ء میں ہندوستان والوں نے پہلی بار ایورسٹ پر چڑھائی کی کوشش کی لیکن سخت برفانی طوفان کی وجہ سے یہ ٹولی ایورسٹ پر چڑھنے میں ناکام رہی۔ اس ٹولی کے لیڈر بریگیڈیر گیان سنگھ تھے۔ اس ٹولی کے تین آدمی ایورسٹ چوٹی سے تقریباً ۷۰۰ فٹ نیچے پہنچ چکے تھے۔

۱۹۶۲ء میں ہندوستانیوں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس ٹولی کے لوگ تو ایورسٹ کے اور بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ ایورسٹ کی چوٹی کوئی ۴۰۰ فٹ رہ گئی تھی کہ ان لوگوں کو موسم کی خرابی کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔

۱۹۶۳ء میں امریکہ کی ایک ٹولی نے ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کی۔ اس ٹولی کے لوگوں نے پچھلی تمام کوششوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ سوئٹزرلینڈ کی ٹولی ۱۹۵۶ء میں ایک ہلّے میں دو بار ایورسٹ کو سر کرکے چار آدمیوں کو سب سے اونچے پربت پر چڑھانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ امریکی ٹولی نے ایک ہلّے میں تین بار ایورسٹ کو سر کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس ٹولی کے چھ آدمی ایورسٹ پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں ایک ہندوستانی نوجوان نوانگ گمبو بھی تھا۔

ہندوستان کے لوگ ان دنوں ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے پوری طرح تیاری کرتے رہے۔


نوانگ گمبو

انھوں نے اپنی پہلی دو بار کی چڑھائیوں سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایورسٹ پر چڑھنے کے لیے موسم بس ایک ہی دو دن اور وہ بھی بہت تھوڑے وقت کے لیے موافق ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایورسٹ کے علاوہ اور دوسری چوٹیوں کو سر کر کے اپنی مشق بڑھائی۔ اور اس سال پوری تیاری کے ساتھ ایورسٹ پر تیسری بار چڑھائی کی۔

۲۰ رمئی ۱۹۶۵ء کا دن ہندوستان کی کوہ پیمائی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا! اس دن کوہ پیماؤں کی ہندوستانی ٹیم کے دو نوجوان کیپٹن چیما اور نوانگ گمبو ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہ ہندوستانی ٹیم کی پہلی کامیابی تھی۔ نوانگ گمبو امریکی ٹولی کے ہمراہ ۱۹۶۳ء میں ایورسٹ کو سر کر چکے تھے۔ اب دوسری بار ہندوستانی ٹولی میں بھی وہ آگے رہے۔ اس کامیابی پر ہندوستان اور دنیا کے لوگ خوش تھے مگر ٹولی کے رہنما مسٹر کوہلی تو ایورسٹ پر چڑھائی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی ٹیم والوں نے اپنی دو بار کی ناکام چڑھائیوں سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس کے دو دن بعد یہ خبر آئی کہ ٹولی کے دو اور نوجوان سونم گیاتسو اور سونم ونگیال بھی


سونم گیاتسو


سونم ونگیال

۲۲ رمئی کو ایورسٹ کے اوپر پہنچ کر ہندوستان کا قومی جھنڈا لہرا آئے۔

ہندوستان والے اس خبر پر عش عش کر رہے تھے کہ یہ خبر پہنچی کہ ۲۴ رمئی کو مسٹر دوہرا اور انگ کامی بھی ایورسٹ کو سر کر آئے۔





سوئٹزرلینڈ والوں نے اپنی ٹولی کے چار آدمیوں کو دو بار میں ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھایا تھا — امریکہ والوں کے تین بار میں چھ آدمیوں کو۔ اب ہندوستان والوں نے بھی ایک مہم میں تین بار ایورسٹ کو سر کر کے امریکہ کے برابری کا ریکارڈ بنا دیا۔

اس خبر کے بعد معلوم ہوا کہ موسم ایک دم خراب ہو گیا ہے۔ ایورسٹ پر اب اور لوگوں کو بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ مگر پانچ ہی دن بعد ہندوستانی ٹیم کے ۱۹ ساتھیوں میں سے تین اور ساتھی ایورسٹ کو سر کر آئے۔ کیپٹن اہلووالیا شری راوت اور شری پھو دورجی ۲۹ رمئی کو صبح آخری کیمپ سے روانہ ہو کر دنیا کے سب سے اونچے پربت پر اپنے قدم رکھ آئے۔





(باقی صفحہ ۶۲)

برف کا گھر — محمد حسین حسان

جیسا نام انوکھا ایسی ہی کتاب انوکھی۔
اس میں برف کے گھر کا حال ہے۔ اس گھر کے
رہنے والوں کا حال ہے۔ اس گھر کی تصویریں
اور اس میں رہنے والوں کی تصویریں بھی ہیں۔
ساری کتاب دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔
آٹھ صفحے کی بلاک کی تصویریں ہیں۔

قیمت ۸۵ پیسے

آستین کا سانپ — محمد حسین حسان

بتائیے کون؟ یہ میاں چوہے صاحب ہیں۔
کیسی کیسی آفت ڈھاتے ہیں چیزیں چراتے
ہیں۔ وبائیں پھیلاتے ہیں جس گھر میں رہتے
ہیں اس کے رہنے والوں کو ہر دم پریشان
کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں ان ہی
کا کچا چٹھا ہے۔ پوری کتاب بلاک پر چھپی ہے۔

قیمت ۵۰ پیسے



دیمک — محمد حسین حسان

ایک ننھا سا بے حقیقت کیڑا۔ مگر کس
انتظام سے رہتا ہے کتنی سوجھ بوجھ سے
اپنی بستی بساتا ہے۔ پڑھ کر اچنبھا ہوتا
ہے۔ کتاب کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔
اور بلاک پر چھپی ہے۔ جگہ جگہ بلاک کی
تصویریں ہیں۔

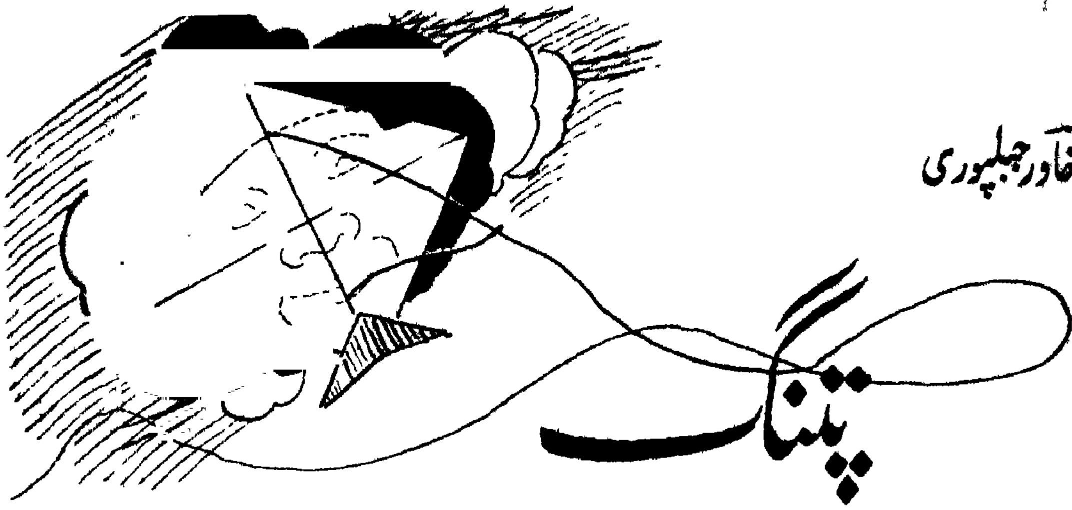
قیمت ۸۵ پیسے

چاند — محمد حسین حسان

وہی جنھیں آپ چندا ماموں کہتے ہیں۔
کتاب میں ان ہی چندا ماموں کا سچا سچا
حال ہے۔ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا گیا
ہے کہ کہانی کا مزہ آتا ہے۔ پوری کتاب
بلاک پر چھپی ہے۔ جگہ جگہ بلاک کی تصویریں
ہیں۔

قیمت ۵ پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



پتنگ

جناب خاور جبلپوری

دیکھو بھائی اڑ رہا ہے وہ مرا نیلا پتنگ
دیکھ کر پرواز اس کی آپ ہو جائیں گے دنگ

حکم پر چلتا ہے میرے کیسی اچھی بات ہے
دوسرا ہر کھیل گویا اس کے آگے مات ہے

غوطے کھاتا ہے مگر نیچے نہیں گرتا ہے یہ
صاف اور ستھری ہوا میں تیرتا پھرتا ہے یہ

کام کتنا اک اشارے پر مرے اس نے کیا
جھک گیا، جھک کر بڑھا، بڑھ کر اُٹھا، اُٹھ کر چلا

یہ ہوا کے دوش پر ہے بھاگنے کی گھات میں
مجھ سے جائے گا کہاں چوٹی ہے میرے ہاتھ میں

روکو اب جانے سے اس کو تاکہ دم لے لے زرا
دیر سے اڑتا رہا ہے اڑتے اڑتے تھک گیا

پڑھنے لکھنے سے میں اپنے جبکہ فرصت پاؤں گا
کام کر کے گھر کا پھر کوٹھے کے اُوپر آؤں گا

پھر پتنگ اپنا اٹھاؤں گا اڑانے کے لیے
منتظر ہوگا ہوا میں وہ بھی جانے کے لیے

پیچ تو ہرگز کسی سے میں لڑانے کا نہیں
مفت کی بدنامی اور نقصان اُٹھانے کا نہیں

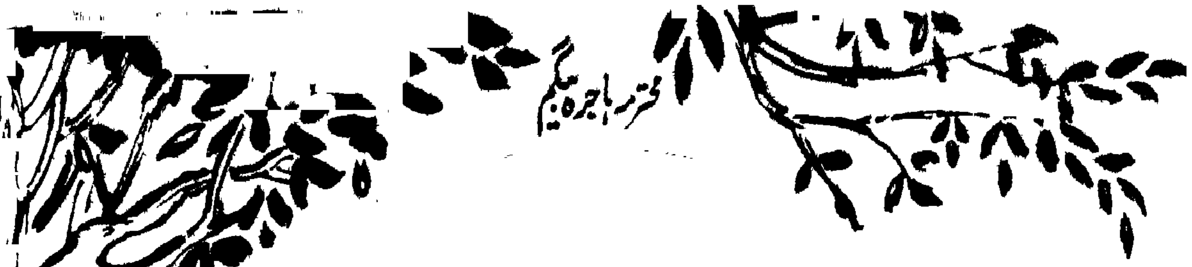
لوٹنے کے واسطے جو کوئی اس کو جائے گا
اُونچا منہ کر کے جو دوڑے گا تو ٹھوکر کھائے گا

میرے باعث پھر بھلا تکلیف کیوں پائے کوئی
کیوں کہے میرا پتنگ جو لوٹنے جائے کوئی

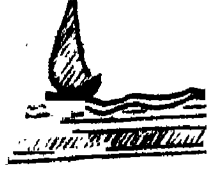
آپ سمجھیں گے کہ وقت اپنا گنوا دیتا ہوں میں
لیکن اس کی ہر ادا سے اک سبق لیتا ہوں میں

ہاتھ سے اخلاق کا ڈورا اگر چھوٹا کہیں
پھر کوئی اپنا پرایا پاس آنے کا نہیں

بڑے ہوتے ہی میں بھی ہو جاؤں گا اتنا ہی بلند
تب کہیں گے آپ میرا لاڈلا ہے ارجمند



محترمہ ہاجرہ بیگم



جہاں رات نہیں ہوتی

صبح ہوتے ہوتے ہمارا جہاز فن لینڈ کے ساحل کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن فن لینڈ کے دارالخلافہ ہیل سنکی تک پہنچنے میں گیارہ بج گئے۔ ہیل سنکی کا خوب صورت شہر سمندر کے کنارے کنارے بسا ہوا ہے۔ دراصل شہر کئی جزیروں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے ایک چھوٹا سا ٹگ (TUG) تیز رفتار سے آیا اور اس پر سے پائلیٹ یعنی رہنما ہمارے جہاز پر چڑھا اس نے ہمیں (Harbour) ہاربر یعنی کنارے تک پہنچایا۔

فن لینڈ یوں تو رقبے کے لحاظ سے خاصا بڑا ملک ہے۔ لمبائی چوڑائی میں یہ انگلینڈ اسکاٹ لینڈ اور ویلز کے مجموعی رقبے سے بھی کہیں بڑا ہے مگر چھوٹا اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ اس کی آبادی صرف ساڑھے تین ملین ہے۔ یعنی یوں سمجھو کہ ہندوستان کے ایک ضلع کی آبادی کے برابر یہی وجہ ہے کہ یہ ملک یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے کچھ زیادہ ترقی نہ کر سکا اور یہاں کے رہنے والوں پر پچھلی صدیوں میں کبھی SWEDEN کے رہنے والے۔ اور کبھی روسی۔ غرض کوئی نہ کوئی چھایا رہا۔

فن لینڈ کی دولت اس کے جنگلات ہیں میلوں میل چلے جاؤ ہرے بھرے درخت قطار در قطار کھڑے ہیں۔ اور ان کے تنوں کے سایے میں زمین پھولوں سے ایسی ڈھکی ہے جیسے کسی نے دولہا کی موٹر سجادی ہو۔ جہاں جنگل نہیں وہاں سبزہ زار

اور کھیت ہیں۔ اور سبزہ زاروں میں لال اور سفید چتیلی گائیں چگ رہی ہیں یا بطخیں اور بھیڑیں گھوم رہی ہیں۔ کہیں کہیں اکّا دکّا گھر نظر آ جاتا ہے جو عام طور سے سفید لکڑی کا بنا ہوا دور سے کھلونا سا نظر آتا ہے۔

ظاہر ہے فن لینڈ دوسرے ملکوں کو اپنے جنگل کی دولت یعنی لکڑی اور لکڑی سے بنا ہوا کاغذ اور مکھن، پنیر وغیرہ دودھ سے تیار کی ہوئی چیزیں بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ فن لینڈ پانی کے جہاز بنانے میں ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ اور دوسرے ملکوں کو جہاز بنا کر دیتا ہے۔

فن لینڈ میں جھیلیں بے شمار ہیں اور اسی لیے سمندری اور میٹھے پانی کی مچھلی بھی بہت پکڑی جاتی ہے۔ ہیل سنکی شہر اسی لحاظ سے نمایاں ہے کہ یہاں کی عمارتیں بہت عالیشان اور خوبصورت جدید طرز کے ڈیزائن کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ پورا ملک نہایت ہی صاف ستھرا۔ لوگ خوش پوشاک رنگت کے بہت گورے اور بھورے بلکہ سن کے رنگ کے بالوں والے۔

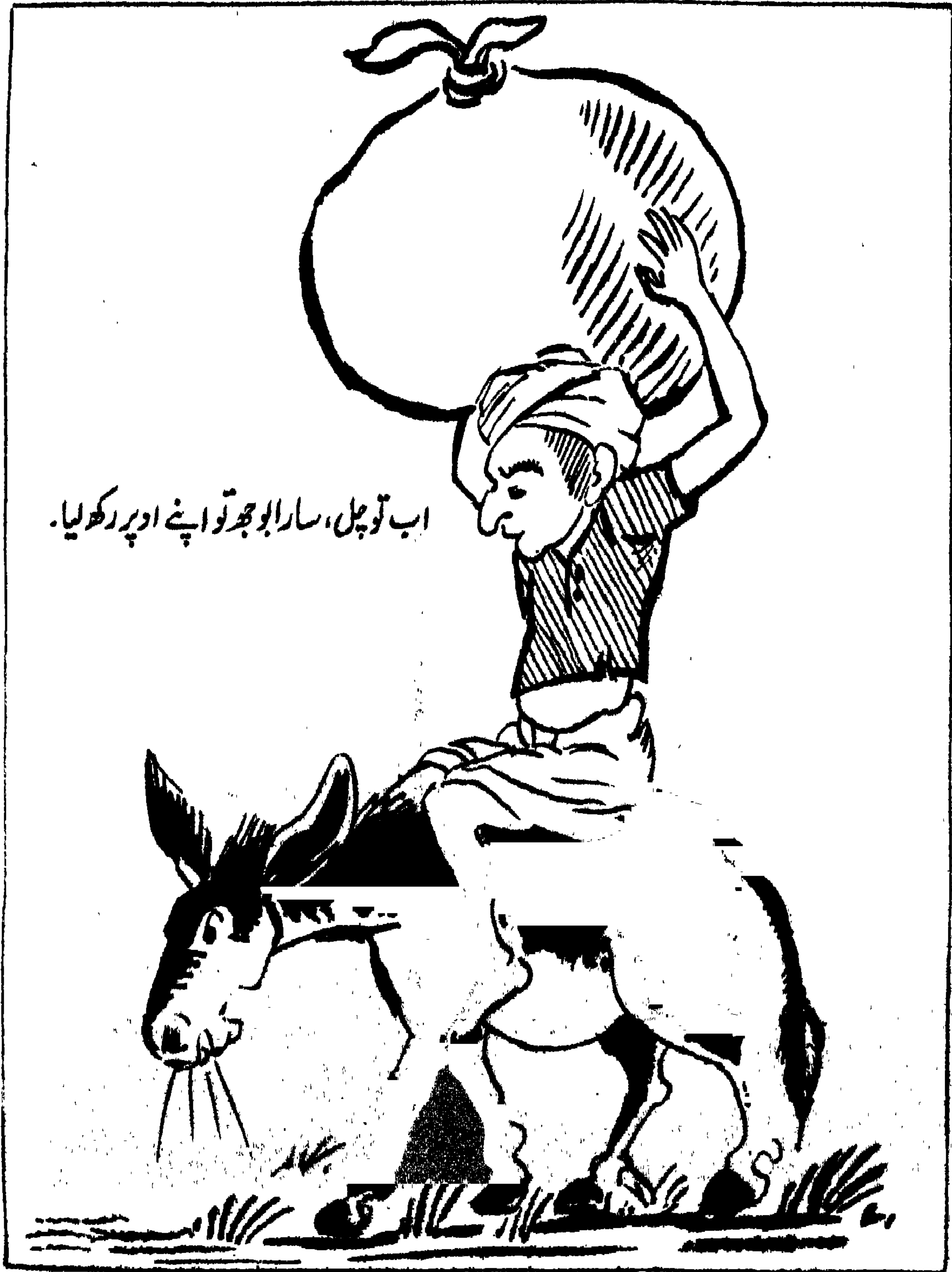
ہم فن لینڈ گرمیوں میں یعنی ۹ جولائی کو پہنچے لیکن سردی ایسی تھی جیسے دہلی میں جاڑوں میں ہوتی ہے۔ یہاں کے جاڑوں میں پورا ملک برف سے ڈھک جاتا ہے اور تمام جھیلیں اور تالاب یخ بستہ ہو کر شیشہ کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔

یہاں کمال کی بات یہ ہے کہ گرمیوں میں رات کو دن ہوتا ہے۔ یعنی فن لینڈ کے شمال لیپ لینڈ (Lap Land) کے صوبہ میں گرمیوں میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا بلکہ آسمان میں ایک سمت سے دوسری سمت جا کر پھر لوٹ آتا ہے۔ ہیل سنکی جنوب کی طرف ہے یہاں رات کے ۱۱ بجے تک سورج نہیں ڈوبتا تھا اور سورج ڈوبنے کے بعد بھی اس قدر روشنی رہتی تھی کہ باہر ہم بغیر بتی جلائے کتاب پڑھ سکتے تھے اور ادھر پھر گھنٹے دو گھنٹے میں دھوپ نکل آتی تھی۔

ہم لوگوں کے لیے تو رات کو نیند آنی محال ہو گئی کیونکہ ہم دن چڑھا دیکھ کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ لیکن گھڑی میں تو رات کے دو یا تین ہی بجے ہوتے تھے۔

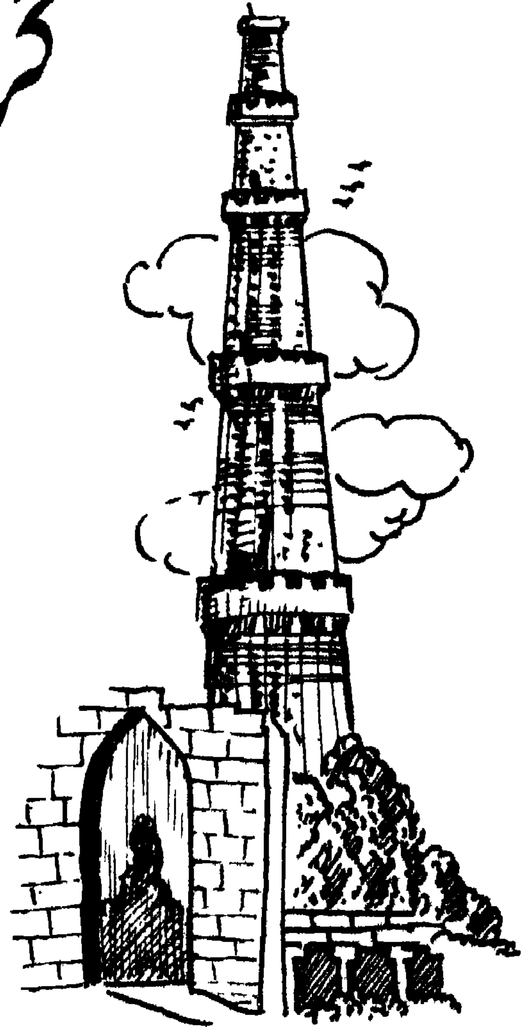
میں نے یہاں کے لوگوں سے پوچھا بھی کہ آپ کے یہاں مرغ کس وقت اذان دیتا ہے انھوں نے کہا صبح کے سات بجے۔ نہ معلوم

(باقی صدا۶۶ پر)


اب تو چل، سارا بوجھ تو اپنے اوپر رکھ لیا۔

جناب مرزا سلمان

گرتے مینار



ہمارے چچا میاں کے گھر میں جتنے آدمی ہیں ماشاء اللہ سبھی لاثانی ہیں۔ چچا، چچی کو تو ہم کچھ کہتے نہیں۔ بے ادبی ہوگی۔ پر قیامت برپا کرنے کو ان کی اولاد ہی کافی رہتی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی "شگوفہ چھوٹا کرتا ہے، شوشہ نمودار ہوا کرتا ہے، اور بحثیں ہوا کرتی ہیں۔

ایک ہیں بی سلمہ۔ ایسی وہمی کہ اللہ کی پناہ۔ دن میں ہر آندھی کا جھونکا ان کو سائیکلون معلوم ہوتا ہے اور رات میں ہر درخت بھوت دکھائی دیتا ہے۔ ایک مسعود بھائی ہیں۔ ہم لوگ ان کو چلتی پھرتی "ان سائیکلو پیڈیا" کہتے ہیں۔ فلاں شخص کب پیدا ہوا کب مرا، اس کا افتتاح کب ہوا، اس کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا فلاں جگہ کہاں ہے، فلاں ملک ——— کا دارالسلطنت کیا ہے ——— کچھ بھی پوچھیے جواب حاضر۔ سب سے بڑے بھائی جان ہیں۔ یوں کہنے کو تو وہ انجینئر ہیں پر ان سے بات کرکے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی وکیل ہوں۔ ایسے جھکی کہ جس کے پیچھے ہاتھ دھوکے پڑ جائیں کیا مجال اپنی بات منوائے بنا چھوڑ دیں۔ عزنی، شمشی اور گڈو ابھی خاصے چھوٹے ہیں۔ ان

بے چاروں کو تھالی کے بینگن سمجھیے۔ جدھر پلڑا بھاری دیکھا ادھر ہی جھک گئے۔

پچھلے اتوار کو میں ان سب سے ملنے دلّی گیا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ طے ہوا کہ قطب کی سیر کرآئیں۔ جلدی جلدی پکنک کا سامان اکٹھا ہوا اور بھائی بہنوں کا یہ قافلہ روانہ ہوگیا۔ ابھی گھر کے دروازے ہی میں پہنچے تھے کہ چچی بی چلّائیں "ارے بچّو! تم لوگ قطب صاحب جا تو رہے ہو پر دیکھو کہیں قطب مینار پر مت چڑھ جائیو۔ ابھی اسی دن تو کوئی کہہ رہا تھا کہ موا ایک طرف کو جھک گیا ہے۔ یوں بھی صدیوں پرانی لاٹ اور تم سب کے پانوں میں ہے سنیچر۔ اچھلتے کودتے چڑھو گے کہیں ڈھیڑی نہ ہو جائے نامراد۔"

ہم سب نے ایک قہقہہ لگایا اور چل دیئے اور بس میں بیٹھ۔ قطب جا پہنچے۔ وہاں تو جیسے ایک بھیڑ لگی تھی۔ شیطان کی آنت ایسی لمبی لائن تو لگی تھی مینار کے اوپر چڑھنے والوں کی لائن یا قطار اتنی لمبی اتنی لمبی کہ آپ شیطان کی آنت کہہ دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے ہی مینار کے قریب پہنچے بھائی ان سائیکلو پیڈیا چالو ہو گئے جیسے کوئی پیشہ ور گائیڈ ہوں۔

"قطب مینار کا نام قطب الدین ایبک کے نام پر ہے یہ غلام خاندان کا ایک بادشاہ ہوا ہے۔ دراصل یہ مسجد قوت الاسلام کا ایک مینار ہے جسے اذان دینے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ ۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک نے اسے بنوانا شروع کیا تھا۔ ابھی مینار ادھورا ہی تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے جانشین التمش نے تعمیر کا کام جاری رکھا اور ۱۲۳۰ء میں یہ چھ منزلہ ۲۵۰ فٹ اونچا مینار بن کر تیار ہو گیا۔"

اب اتنی گنتی تو گڈو میاں سیکھ ہی گئے ہیں "ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ واہ بھیّا صاحب اس میں تو پانچ ہی منزلیں ہیں۔"

"اوہو بھئی پوری بات تو سن لو پہلے!" مسعود بھائی جھلّا کر بولے "فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ایک زبردست زلزلہ آیا اور اس کی اوپری تین منزلیں گر گئیں۔ فیروز شاہ نے ۱۳۶۸ء میں انھیں دوبارہ بنوایا۔

اس کے بعد بھی دوبار، ۱۵۰۳ء اور ۱۸۲۸ء میں اوپر کی برجی گر گئی اور دوبارہ بنوائی گئی۔ ایک اور حادثے کے بعد آخر کار اس کو ہٹا ہی دیا گیا۔ اب یہ صرف پانچ منزلہ رہ گیا ہے اور اس کی اونچائی ۲۳۸ فٹ ہے۔"

مسعود بھائی اپنی کتھا کہہ چکے تو یہ طے ہوا کہ پہلے قطب مینار پر چڑھ لیا جائے اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر کھایا پیا اور کھیلا جائے۔ ہم سب تو جا کر لائن میں لگ گئے پر بی سلمہ کھڑی ٹکٹکی لگائے ان آدمیوں کو دیکھتی رہیں جو چوٹی پر کھڑے تھے۔ آدمی کیا گڑیاں لگ رہے تھے۔ وہ سب تو ہاتھ ہلا ہلا کر نیچے والوں کو اشارے کر رہے تھے پر کیا بی سلمہ کا جی دھک دھک کر رہا تھا۔

"ہائے دیکھنا تو کتنے اوپر کھڑے ہیں۔ اور کیسے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ان کو ڈر بھی نہیں لگتا۔" اور پھر ان کے جی میں خدا جانے کیا آئی دوڑی دوڑی گئیں اور مینار کا ایک طواف لگا کر واپس آئیں۔ اس وقت ان کی صورت دیکھنے والی تھی۔ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہانپتی کانپتی بولیں "ارے بھائی جان! امی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ سچ مچ مینار ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ میں خود اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئی ہوں۔ نا بابا میں نہ چڑھوں گی اور نہ آپ لوگوں کو چڑھنے دوں گی۔ ٹیڑھا تو ہوئی ہے کیا اعتبار جو کم بخت گر ہی جائے۔" یہ کہتے کہتے وہ بھائی جان کا ہاتھ پکڑ کر لٹک گئیں اور لگیں ان کو لائن سے باہر کھینچنے پر بھائی جان پہ جیسے کوئی اثر ہی نہیں بہت سکون سے بولے "ارے پگلی صرف پچیس ۲۵ انچ ہی تو جھکا ہے۔"

"ہائے اللہ۔ ۲۵ انچ یعنی ڈیڑھ فٹ سے بھی زیادہ" عرفی کے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُچھل کر لائن سے باہر جا کھڑی ہوئیں۔ شمسی اور گڈو نے بھی کانوں پہ ہاتھ دھرے اور اپنی عرفی باجی کے پیچھے لگ گئے۔

"چلو چھٹی ہوئی" بھائی جان ماتھے پر ہاتھ مار کے بولے "ان سب کے مارے تو ہم چڑھ رہے تھے ورنہ ہم تو ہزاروں بار پہلے بھی چڑھ چکے ہیں۔ اور ان گیدڑوں کی ڈر کے مارے حالت تباہ ہے۔

"اب آپ کچھ بھی کہیے بھائی جان۔ ہم تو پڑھنے سے رہے۔" چاروں کے چاروں ایک زبان ہو کر بولے مگر بھائی جان اتنی آسانی سے بخشنے والے کہاں تھے۔ سب کو ایک طرف لے جا کر بولے "میں نے انجینئرنگ پڑھی ہے، تین سال امریکہ میں رہا ہوں، گھاس تو نہیں کھودی؟"

"سنتے تو یہی ہیں۔" مسعود میاں نے سر ہلایا۔

بھائی جان نے ان کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے "قطب کی اونچائی ۲۳۸ فٹ ہے۔ سب سے نیچے اس کا قطر ۴۶ فٹ ہے۔ اس کی بنیاد کے لیے پچاس فٹ مربع ایک مضبوط پتھر کا چبوترہ بنایا گیا ہے اور اس کے بھی نیچے بہت گہرائی تک پتھر اور مسالے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے محکمۂ آثار قدیمہ نے کھدائی کر کے ان تفصیلات کا پتہ لگایا ہے۔ نیچے سے اتنا چوڑا اور اتنا اونچا مینار تو چوٹی پر ۲۲ فٹ تک کا جھکاؤ برداشت کر سکتا ہے۔"

"آپ اپنا حساب کتاب تو اپنے پاس رکھیے۔ آپ کے حساب سے اگر لوگ عمارتیں بنوانے لگیں تو اللہ نے چاہا ایک بھی نہیں بچے گی۔" سلمہ نے ایک ہی جملہ میں بھائی جان کی ساری قابلیت پر پانی پھیر دیا۔

"گھر کی مرغی دال برابر۔ نہ مانو ہماری بات۔ لیکن پرسوں کا اخبار اٹھا کر دیکھو ۷۵ سالہ بوڑھے ماہر تعمیرات مورٹمور وھیلر نے بھی یہی کہا ہے کہ قطب مینار بالکل محفوظ ہے۔"

پیسا کا مینار



"اور ہاں" جیسے بھائی جان کو کچھ ایک دم یاد آگیا ہو "پیسا کے کا مینار کا ذکر تو تم لوگوں نے سنا ہی ہوگا؟" اور انھوں نے مسعود بھائی کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں بھائی جان جو اٹلی میں ہے"

مسعود بھائی نے بولنا شروع کیا "آٹھ سو سال پرانا ہے وہ بھی۔ دو سو سال تو اُسے بنتے بنتے ہی لگ گئے تھے۔ آٹھ منزلیں ہیں اس میں اور ۱۷۵ فٹ اونچا ہے۔ اور کہتے ہیں وہ تو جب سے بنا ہے تب ہی سے ٹیڑھا ہے۔ خبر نہیں جان بوجھ کر ٹیڑھا بنایا گیا تھا یا غلطی سے بن گیا تھا۔ پیسکا نو نام کے ایک ماہر تعمیرات نے ۱۱۷۴ء میں اسے بنانا شروع کیا تھا۔ ۱۱۸۵ء تک ساڑھے تین منزلیں ہی بنی تھیں کہ اسے محسوس ہوا کہ ارے یہ تو ٹیڑھا بن رہا ہے یا اگر جان بوجھ کر ٹیڑھا بنا رہا تھا تو اسے ڈر لگا کہ میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا یہ گر جائے گا۔ اور وہ کہیں بھاگ گیا۔ پھر نہیں لوٹا۔ پیسا کے لوگوں میں ایک اور دل چسپ روایت مشہور ہے: جس معمار نے یہ مینار بنایا تھا وہ کبڑا تھا یہ مینار بھی اسی کی مناسبت سے ٹیڑھا بن گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ دلدلی زمین پر بنا ہوا ہے اس لیے تیسری منزل بننے سے یہ جھکنے لگا اور برابر جھکتا چلا جا رہا ہے۔

"۹۰ سال بعد ایک دوسرے شخص نے کام شروع کرایا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے سیدھا کرے مگر کتے کی دم کی طرح وہ ٹیڑھا ہی ہوتا چلا گیا۔ بہرحال اس نے سات منزلیں پوری کروا دیں۔ اس کے بھی اسّی سال بعد آٹھویں منزل بنائی گئی جس میں گھنٹیاں رکھی گئیں جو خاص خاص موقعوں پر بجائی جاتی تھیں۔"

"امریکہ سے واپسی پر میں یورپ کی سیر کرتا ہوا آیا تھا" بھائی جان نے رعب "اٹلی بھی گیا تھا اور پیسا کا مینار تھا۔ تاج محل کی طرح یہ بھی سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اسی لیے چاندنی راتوں یہ بہت ہی خوب صورت نظر آتا ہے۔ اس کے اوپر بہت بڑی بڑی گھنٹیاں رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک تو تقریباً سو من کی ہے۔ جب بجتی تو پورا مینار دہل جاتا تھا۔ اب مینار کی بنیاد بہت کمزور ہو گئی ہے۔ خطرہ ہے کہ بس مینار آج گرا کل گرا۔ اسی لیے نہ صرف یہ کہ گھنٹیاں بجانا بند کر دیا گیا ہے بلکہ آس پاس سے بھاری موٹریں تک نہیں

گزرنے دیتے"۔ سب بڑے شوق سے سُن
رہے تھے، بھائی جان کہتے رہے "آج کل
انجینئر فکرمند ہیں کہ کس طرح اس کی بنیاد کو
مضبوط بنایا جائے اور اسے گرنے سے بچایا
جائے۔ طرح طرح کی تجویزیں پیش کی جارہی
ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ جس طرح موٹر ٹھیک
کرتے وقت جیک لگا کر اوپر اُٹھا دی جاتی
ہے اسی طرح بہت سے جیک لگا کر اس
بھاری بھرکم مینار کو بھی اٹھا دیا جائے
جس کی موٹائی ۵۱ فٹ ہے، جس کی دیواریں
تیرہ فٹ موٹی ہیں اور جس کے وزن کا اندازہ
چالیس لاکھ من کے لگ بھگ لگایا جاتا ہے
اور پھر اس کی بنیاد کو پکا کر کے اسے واپس
اس کی جگہ رکھ دیا جائے"۔

سب پھیلی پھیلی آنکھوں سے بھائی
جان کو دیکھ رہے تھے۔ سلمہ نے پوچھا۔
"بھائی جان بھلا پیسا کا مینار کتنا
جھکا ہوا ہے؟"

"چوٹی پر اپنی جگہ سے پورے سترہ
فٹ"۔

"سترہ فٹ" سب کی آنکھیں تھوڑی
سی اور پھیل گئیں۔ اور سلمہ بی نے کچھ حقارت
اور کچھ اطمینان کے ملے جلے لہجے میں کہا "ہمارا
قطب مینار تو صرف ۲۵ انچ جھکا ہوا ہے۔
اس کا مطلب اگر پیسا کا مینار ۸۰۰ سال
سے کھڑا ہے تو قطب مینار تو ہزاروں سال
سے کھڑا رہے گا"۔

بھائی جان نے ٹھنڈی سانس بھر کر
کہا "شکر خدا کا تمہاری کھوپڑی میں بات
آئی تو"۔

غرض اس قدر حیل حجت کے بعد
سلمہ بی بھی راضی ہو ہی گئیں۔ عرفی، شمسی
اور گڈو کا تھا پیچھے پیچھے لڑھک لیے۔ پر
اب بھوک لگ آئی تھی۔ کھا پی کر ہم لوگ
تازہ دم ہوئے اور پھر تو ایک سانس میں
قطب مینار کے اوپر جا پہنچے۔ پوری دلی کی
وہاں سے سیر کرتے رہے جیسے ہوائی جہاز
سے دیکھ رہے ہوں۔ مگر تھوڑی ہی دیر
میں وہاں سے بھگا دیے گئے۔ دیکھنے والوں
کی بھیڑ جو بہت تھی۔ اور سب چیزیں
دیکھ کر شام کو گھر واپس ہوئے۔ چچی
بی نے گھر پہنچتے ہی پوچھا "تم لوگ قطب مینار

مصطفٰی کاظم - درجہ نہم جامعہ

آپ کو یقین آئے نہ آئے

گونگا بہرا انقلابی



آدمی تھنولی (جنوبی ہندوستان) کا رہنے والا تھا یہ ایک حیرت انگیز آدمی تھا۔ یہ بہرا تھا اور گونگا بھی۔ بے چارہ نہ بول سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ پھر بھی یہ عجیب و غریب آدمی اشاروں کی زبان میں مجمع پر جادو کر دیتا تھا ان پر ایسا قابو پا لیتا تھا جو ایک زبان سے تقریر کرنے والا آدمی نہیں پا سکتا۔

اس نے بعض دفعہ لوگوں کو ایسے ایسے مشکل کام کرنے پر بھڑکا دیا جن کی کامیابی کی کوئی ظاہری اُمید نظر نہ آتی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں اس نے ان ہی اشاروں کی مدد سے لوگوں کو اتنا بھڑکا دیا کہ چند ہزار لوگوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت سے انگریزوں کی پوری بادشاہت ہل گئی۔ اس بغاوت کا نام تاریخ میں پولیگر بغاوت ہے یہ تحریک اتنی کامیاب ہوئی کہ اس حصہ میں انگریزوں

کی حکومت قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔
آخرکار یہ تحریک دبا دی گئی مگر اس کے دبانے کی کوشش میں ہزاروں آدمی مارے گئے اور سرکاری خزانے کے کروڑوں روپیہ برباد ہو گئے۔ اس تحریک کے سردار 'اومی' کو بھی پکڑ کر پھانسی دے دی گئی اور اس طرح اس بہادر اور عجیب و غریب گونگے اور بہرے آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے ہیں چیونٹی کو بھی حقیر نہ سمجھو۔ لنگڑے لولے اور گونگے بہرے بھی ایسے کارنامے کر جاتے ہیں جو تاریخ میں یادگار رہ جاتے ہیں۔

(بقایا صفحہ ۶ کا)

پر چڑھے تو نہیں تھے؟" ہم سب تو چپ رہے، پر بھائی جان نے جواب دیا "امی چڑھے تو ضرور تھے۔ پر ہم جیسے انجینئروں کے ہوتے ہوئے موئے کی مجال تھی جو گرنے کی سوچ بھی سکے"! اور امی نے اپنے اکلوتے کی چٹاپٹ بلائیں لینا شروع کر دیں۔ بڑے چھپے

(بقایا صفحہ ۱۹ کا)



ایک ہلّے میں چار بار ایورسٹ کو سر کرنا واقعی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں نے اپنی محنت اور حوصلے سے یہ نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ایک ٹیم کی شکل میں مل جل کر اور خود پیچھے رہ کر دوسروں کو آگے بڑھانے کے جذبے سے جو کام کیا جاتا ہے۔ اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے۔
اگر سچی لگن ہو تو دنیا کا کوئی بھی پربت کسی کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا، چاہے وہ پربت آسمان سے بھی زیادہ بلند کیوں نہ

بچّوں کی کوششیں



دارجلنگ میں جب سورج نکلتا ہے

دارجلنگ ... فٹ اونچے پہاڑ پر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی یہ بہت مشہور ہے کیونکہ یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے۔ اس کے چاروں طرف ہمالہ پہاڑ کی چوٹیاں پھیلی ہوئی ہیں جو طرح طرح کے پھولوں اور درختوں سے سجی ہوئی ہیں۔ یہاں سے ہمالہ پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی ایک چوٹی (کنچن جنگا) دکھائی دیتی ہے۔ یہ چوٹی ۲۸۱۵۶ فٹ اونچی ہے۔ صبح کو سورج نکلتے وقت جو خوبصورتی پہاڑوں پر نظر آجاتی ہے وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

دارجلنگ میں طلوع آفتاب کا تماشا "آب زرد یٹری ہل" اور "ٹائگر ہل" کے نام کی جگہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر ٹائگر ہل (Tiger Hill) سے سورج نکلنے کا تماشا جتنا صاف اور خوبصورت ہوتا ہے اتنا "آب زرد یٹری ہل" سے نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں پر ایک شیر مارا گیا تھا اسی وجہ سے اس کا نام ٹائگر ہل (Tiger Hill) پڑا۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگل سے گھری ہوئی ایک اونچی جگہ ہے اور یہاں پر پہلے شیر، بھالو وغیرہ جنگلی جانور رہا کرتے تھے اسی وجہ سے اس کو ٹائگر ہل کہتے

گئے۔ میری سمجھ میں اس جگہ کا نام کسی دوسری وجہ سے
ہی پڑا ہوگا۔ یہ پہاڑ دارجلنگ سے آٹھ میل دور ہے
اور سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ اونچا ہے۔ زیادہ ٹھنڈک
کی وجہ سے لوگوں کا رہنا مشکل ہے۔ یہاں سے طلوعِ
آفتاب کے خوب صورت منظر کو دیکھنے کے لیے دور
دور سے لوگ آتے ہیں۔ دوسرے ملک کے لوگ
یہاں آکر طلوعِ آفتاب کے منظر کی تصویر اپنے ملکوں
میں لے جاتے ہیں۔ ٹائگر ہل کی چوٹی پر جہاں سے
طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا جاتا ہے ولایتی مٹی کا
ایک اونچا گھر بنا ہوا ہے۔ دارجلنگ سے ہوتے
ہوئے چور بنگلہ اور پھر وہاں سے جنگل ہوتے ہوئے
ٹائگر ہل جانا پڑتا ہے۔ غریب لوگ پیدل اور امیر
لوگ گھوڑوں یا رکشوں پر چڑھ کر وہاں جاتے ہیں
یہاں طلوعِ آفتاب کا منظر پوجا کی چھٹی میں صاف
صاف دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان دنوں آسمان
بادلوں سے ڈھکا نہیں رہتا۔ ان دنوں ٹائگر ہل
کے راستوں پر رات بھر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں
لیکن پیدل جانا خطرناک ہے یہاں کی چڑھائی کی وجہ
سے اترنے کی نسبت جانے میں دوگنا وقت لگتا ہے۔
دارجلنگ سے رات کے دو بجے (۲ بجے)
چلنے پر ٹھیک وقت ٹائگر ہل پہنچتے ہیں۔ وہاں گھر پر
چڑھ کر لوگ پورب کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس طرف
دیکھنے سے اندر دھنک کے سات رنگ ہر پل بدلتے
نظر آتے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک روشنی آسمان میں
پھیلتی رہتی ہے اور رنگ بھی اسی کے ساتھ بدلتے
رہتے ہیں۔ پھر پہاڑ کی آڑ سے سورج مہاراج بغیر
دھوئیں کے انگارے کی طرح کمہار کے گول چلتے ہوئے
چاک کی طرح درشن دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ آسمان میں لال کنول کھل گیا ہے یا آسمان نے
کیسر کے رنگ کا تاج پہن لیا ہے۔ جیسے ہی وہ نکلتے
ہیں ویسے ہی رنگ برنگ کی روشنیاں ماؤنٹ ایورسٹ
(MOUNT EVEREST) پر پڑتی ہیں تب
اس کا رنگ سونے کی طرح ہو جاتا ہے۔ اوپر نیچے
پہاڑوں کی لگاتار قطاریں اس خوب صورتی میں
چار چاند لگا دیتی ہیں اور دل کے اندر سے آواز
نکلتی ہے کہ کاش یہ خوب صورتی سارے دن رہ
جاتی لیکن یہ منظر کل دس منٹ رہتا ہے اور پھر
روشنی پھیل جاتی ہے۔

سچ معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خوبصورت منظر
دیکھنے کے لائق ہے۔ اگر آپ لوگ بھی دارجلنگ جائیں تو
ٹائگر ہل پر چڑھ کر سورج نکلنے کا منظر ضرور دیکھیں۔

امین ابوذر محمد مامون عفت

انوکھی دعوت

ایک بار دو آدمی کسی کام سے ایک گاؤں میں گئے۔ گاؤں کا چودھری بڑا زندہ دل، بہت ہنس مکھ تھا۔ ان میں سے ایک صاحب کسی کام سے باہر گئے۔ چودھری نے دوسرے صاحب سے پوچھا: "کیوں بابو جی! یہ صاحب کیسے آدمی ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "بالکل گدھے ہیں۔"

اگلے دن چودھری نے پہلے صاحب سے یہی سوال کر ڈالا۔

وہ بولے: "جی بالکل اُلّو ہیں۔"

دوپہر کھانے کا وقت آیا تو چودھری دونوں کو کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ دسترخوان پر کھانا رکھا تھا اور اس پر لال کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ کپڑا ہٹایا گیا تو دونوں بہت حیران ہوئے اور بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا "ارے یہ کیا؟"

چودھری نے دوسرے صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے مہمان سے کہا۔ میں نے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے آپ کو گدھا بتایا۔ اس لیے میں نے آپ کے لیے گھاس کا انتظام کیا پھر وہ دوسرے صاحب کی طرف اشارہ کرکے بولا: میں نے ان سے آپ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے آپ کو اُلّو بتایا اس لیے آپ کے لیے میں نے کیڑے کوڑوں کا انتظام کیا ہے۔

اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں دونوں مہمان اپنی اپنی جگہ کتنے شرمندہ ہوئے ہوں گے۔

احمر پرویز علی گڑھ

غلامی سے فاقہ اچھا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بھوکا بھیڑیا شکار کی تلاش میں جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اتنے میں اسے ایک موٹا تازہ کتا دکھائی دیا۔ بھیڑیے نے پاس آکر کہا: "کیوں بھئی کیا بات ہے جو تم اتنے موٹے تازے نظر آتے ہو۔"

کتا بولا: میرا مالک مجھے اچھی سے اچھی چیز کھانے کو دیتا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو میرا مالک تمھاری بہت خاطر کرے گا۔ مگر ایک شرط ہے۔ اس کے گھر کی چوکی داری اور حفاظت کرنا پڑے گی۔

بھیڑیا راضی ہو گیا اور کتے کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں بھیڑیے کو کتے کی گردن پر ایک نشان نظر آیا۔ اس نے کتے سے پوچھا: کیوں میاں تمھاری گردن پر یہ نشان کیسا ہے۔

کتے نے جواب دیا: میرا مالک دن بھر مجھے رسّی سے باندھے رکھتا ہے اور رات کو آزاد کر دیتا ہے۔

بھیڑیے کے قدم فوراً رک گئے۔ اس نے کتے کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا: نا بابا مجھے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرجانا منظور ہے مگر یہ غلامی منظور نہیں ـــــ اتنا کہا اور پیٹھ موڑ کر جنگل کی طرف واپس چلا گیا ـــــ

سید مشتاق احمد بمبئی

کالی مسجد

ہم نے دیکھی مسجد کالی
سب سے انوکھی سب سے نرالی
گنبد ہم نے دیکھے بھالے
لگتے تھے یہ ایک دم پیالے
ہم نے جو بھی دیکھی بھالی
لگتی تھی کچھ خالی خالی
ایک صاحب نے نماز پڑھائی
ہم سب نے جماعت بنائی
ہمارے ماسٹر صاحب آ ـــــ
گنبد پھر انھوں نے گنوائے
میں جو پھر سے گننے پر آیا
۳۸، ٦١ سب کچھ اڑایا
ماسٹر صاحب نے کہا کر و بس
گنبد تھے بھائی ایک سو دس
ہوا یہاں پر ٹھنڈی آئی
مشہود نے یہ نظم بنائی

مشہود متعلم مدرسہ ابتدائی (جامعہ)

(بقایا صفحہ ۵۳)

اس غریب کو دن اور رات کا فرق کیسے معلوم ہوجاتا ہے۔

ہیل سنکی میں ہر قسم کی ناؤ اور کشتی دیکھنے کو ملی۔ بلکہ معلوم ہوا کہ ہر شخص جس کی تھوڑی بہت بھی آمدنی ہے اپنی نجی موٹر بوٹ، بادبانی کشتی یا ناؤ رکھتا ہے۔

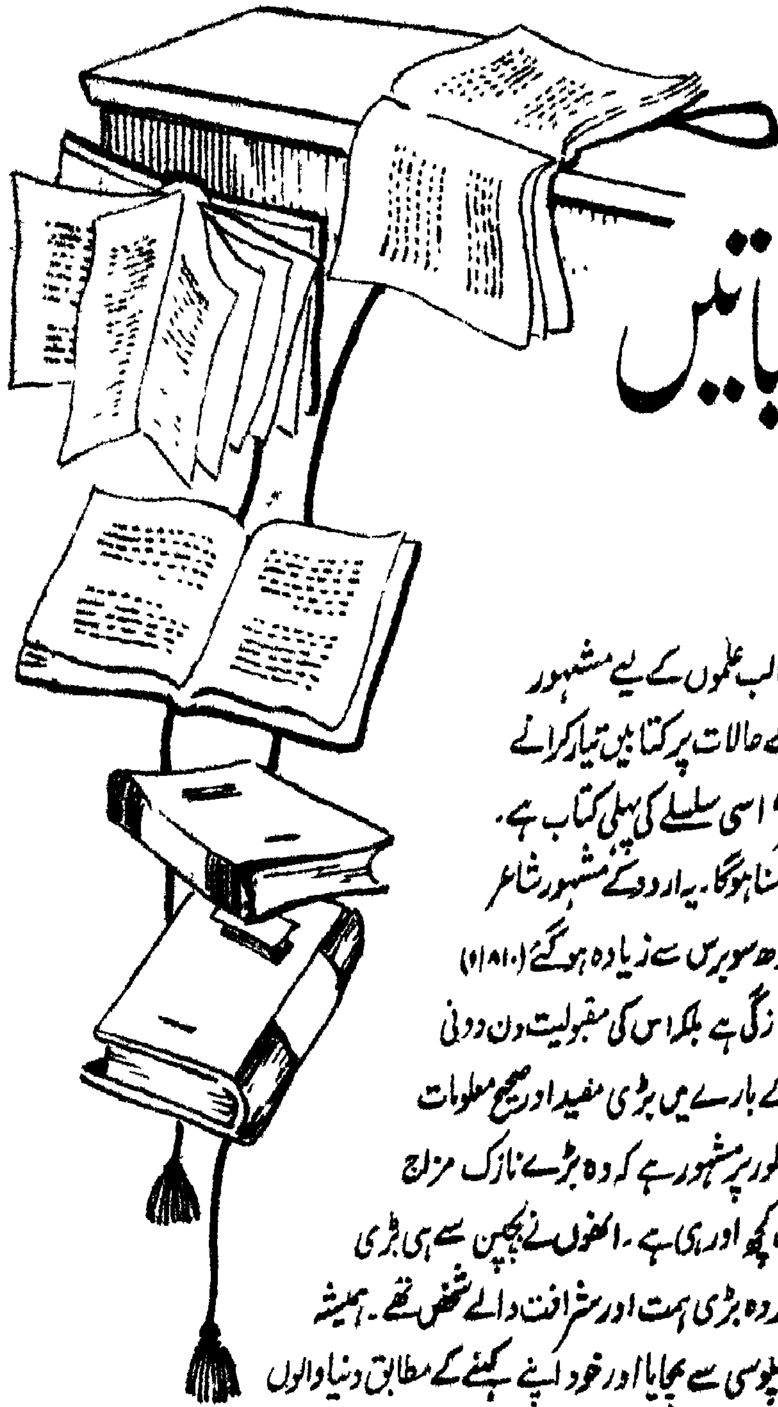
فن لینڈ کی حکومت ہندوستان کے طرز کی ہے یعنی یہاں بادشاہ نہیں بلکہ پارلیمنٹ ہے اور صدر ہے۔ صدر ابھی حال ہی میں ہندوستان بھی گئے تھے۔

ضروری نوٹ

پچھلے شمارے میں صفحہ ۲۹ پر سائنس کا ایک مزیدار تجربہ کے مصنف کا نام غلطی سے رہ گیا تھا۔ لکھنے والے ... [illegible]

ایڈیٹر

معلم



کتابوں کی باتیں

میر تقی میر

مکتبہ جامعہ نے اسکول کے طالب علموں کے لیے مشہور مشہور شاعروں اور نثر لکھنے والوں کے حالات پر کتابیں تیار کرانے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ "میر تقی میر" اسی سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔

میر تقی میر کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ اردو کے مشہور شاعر تھے۔ انھیں دنیا سے رخصت ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہو گئے (۱۸۱۰ء) مگر ان کی شاعری میں اب بھی ویسی ہی تازگی ہے بلکہ اس کی مقبولیت دن دونی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور میر کی زندگی کے بارے میں بڑی مفید اور صحیح معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ میر کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ بڑے نازک مزاج بلکہ نک چڑھے تھے۔ لیکن دراصل بات کچھ اور ہی ہے۔ انھوں نے بچپن سے ہی بڑی بڑی کٹھنائیاں جھیلیں اور دکھ سہے۔ مگر وہ بڑی ہمت اور شرافت والے شخص تھے۔ ہمیشہ انھوں نے اپنے آپ کو خوشامد اور چاپلوسی سے بچایا اور خود اپنے کہنے کے مطابق دنیا والوں سے یوں پایا کہ ع ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

لیکن ان حالات نے ان کی رگ رگ میں ایک ایسا درد بھر دیا جو ان کی شاعری کی جان بن گیا اور آج

تک اردو جاننے والے ان کے شعر پڑھتے ہیں اور تڑپتے ہیں۔

اس کتاب کے لکھنے والے کے بارے میں آپ کو کیا بتائیں۔ یہ تو آپ کے اور ہمارے حسین حسان صاحب ہی ہیں ابھی کچھ دن ہوئے، ان کی کتاب 'دیمک' کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ تو کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں وہ خاص چیز ہی ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے ایسا سادہ اور پیارا ڈھنگ اختیار کیا ہے کہ ایک دفعہ کتاب اٹھائیں تو بغیر ختم کیے ہوئے چھوڑنے کو دل نہیں ہوتا۔ کتاب کے آخر میں میر کے کچھ اچھے اچھے اشعار بھی درج ہیں۔

ایسی کتابیں پڑھنے سے زبان بھی سدھرتی ہے اور مذاق بھی۔ یعنی اچھی کتابوں کے پڑھنے کا چسکا لگتا ہے اور آیندہ کے لیے بہت اچھی بنیاد پڑتی ہے۔

مکتبہ اور حسین حسان صاحب دونوں اس سلسلے میں ہم سب کے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

قومی جھنڈے کی کہانی ۱۵ اگست کو دیس کی آزادی کی اٹھارویں سالگرہ منائی گئی۔ اس دن ہر جگہ قومی جھنڈے نے اپنی بہار دکھائی۔ ہم سب اپنے قومی جھنڈے کو خوب پہچانتے ہیں۔ اور دل سے اس کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن یہ قومی جھنڈا کب بنا؟ اس کے استعمال کے طریقے اور برتنے کے آداب کیا ہیں؟ اس طرف ہمارا دھیان کم ہی جاتا ہے۔

محمد ابراہیم فکری صاحب نے اپنی کتاب "قومی جھنڈے کی کہانی" میں یہ سب باتیں نہایت ہی مناسب طریقے پر بتائی ہیں۔ اس کے علاوہ فکری صاحب نے کچھ پرانے زمانے کے جھنڈوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر وہ بالکل سرسری ہے۔ انھوں نے کانگریس کے جنم، انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی اور 'بھارت چھوڑو تحریک' کا ذکر کر کے اس کتاب کو آپ کے لیے بہت کچھ بوجھل کر دیا ہے اور ایک آدھ جگہ خود بھی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا آپ تیرہ صفحے سے تئیس صفحے تک نہ پڑھیں تو کوئی بات نہیں۔ انھوں نے زبان کے معاملے میں بھی آپ کا دھیان کچھ کم ہی رکھا ہے ایسے بندھے ٹکے فقرے اور جملے لکھ دیے ہیں جنھیں آپ کو کسی کی مدد سے سمجھنا ہوگا جیسے "درمیانی درجے کے لوگ مشتق انقلاب اور سامراجی گورکھ دھندوں سے واقف نہیں تھے۔" انھوں نے قومی جھنڈے سے متعلق ایک ہندی گیت بھی جوڑ دیا ہے جو اس کتاب میں بالکل نہیں جچتا۔

پھر بھی یہ کتاب اپنے اندر بہت کچھ ایسی معلومات رکھتی ہے جس کی واقفیت سب بچوں کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب پر بنیادی ادب کے تیسرے کل ہند مقابلے میں وزارت تعلیم حکومت ہند کی طرف سے مصنف کو مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام دیا گیا ہے۔





اِدھر اُدھر سے

جیمنی ۵ پورے آٹھ دن خلا میں

آج کل چاند ستاروں پر انسان کو اتارنے کی تیاری بہت زور شور سے جاری ہے۔ چاند پر آدمی اتارنے کے سلسلے میں امریکہ نے اس مہینے ایک بہت اہم قدم اٹھانے کا پروگرام بنایا ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک خلائی طیارہ اس مہینے کے آخر میں اڑایا جائے گا۔ اس میں گورڈن کوپر اور چارلس بیٹھ کر زمین کے گرد آٹھ دن تک اڑان کریں گے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان کو چاند تک پہنچنے اور واپس آنے میں بھی تقریباً اتنا ہی وقت درکار ہوگا۔

اس خلائی طیارے کا نام جیمنی ۵ ہے جو ۱۹ر اگست کو اڑا کر ۲۷ر اگست کو امریکہ کے قریب اٹلانٹک سمندر میں اتار لیا جائے گا۔ اس طیارے کی اڑان کا خاص مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ انسان چاند تک جانے اور واپس آنے کے لیے لمبی مدت تک خلا میں بے وزنی کی حالت کو برداشت کر سکتا ہے یا نہیں۔

(نوٹ) ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ چند ٹیکنیکل دشواریوں کی وجہ سے یہ پرواز چند دنوں کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے ——— تازہ ترین اطلاع ہے کہ پرواز جاری ہے۔

دنیا کا وقت بتانے والی گھڑی

اس رسالے کے آخری صفحے پر ایک گھڑی کی تصویر چھپی ہے۔ یہ دیکھنے میں بالکل ریڈیو کی طرح ہے۔ ریڈیو تمام دنیا کی خبریں سناتا ہے۔ گھڑی دنیا کے تمام شہروں کا وقت بتاتی ہے۔ اس گھڑی کا نام "گیوکرون" ہے "گیوکرون" آپ کو دنیا کے تمام مشہور شہروں کا وقت ایک نظر میں بتا سکتی ہے۔ آپ اس گھڑی کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس وقت لندن، نیویارک، ماسکو، قاہرہ، ٹوکیو اور دنیا کے سینکڑوں بڑے دوسرے شہروں میں کیا بجا ہے۔

اس گھڑی کی ایجاد جرمنی کے ایک اسکول ٹیچر کا کارنامہ ہے۔ یہ اب جرمنی میں بہت مقبول ہو رہی ہے۔ جلد ہی بڑے پیمانے پر تیار کی جانے لگے گی اور دنیا کے بازار میں آجائے گی۔

ڈھائی ہزار سال پرانا اسکولی گھنٹہ

گھنٹہ تو تمام اسکولوں میں بجتا ہے۔ اسکول لگنے کے وقت بھی اور اسکول ختم ہونے کے وقت بھی۔ مگر ایک اسکول میں اس کام کے لیے ایک ایسا گھنٹہ کام میں لایا جاتا تھا جو آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔ پر اس بات کا پتہ کیسے لگا۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

یہ دشت جم کے علاقے کی بات ہے ـــ دشت جم روس میں وسط ایشیا میں واقع ہے۔ وہاں کے ایک اسکول میں حسب معمول ایک گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ مگر اس حقیقت کا کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ گھنٹہ ڈھائی ہزار سال پرانا ہے۔ بہت دنوں یہ گھنٹہ اسکول کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا اعلان کرتا رہا۔ ایک دن انسپکٹر صاحب اسکول کا معائنہ کرنے آئے۔ اتفاق سے ان کی نظر اس عجیب وغریب گھنٹے پر پڑی۔ انھوں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر کچھ حروف اور خاکے ابھرے ہوئے ہیں اور کچھ کھدے ہوئے ہیں۔ انھیں اس عجیب وغریب گھنٹے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ گھنٹہ اس اسکول میں کب سے ہے مگر اس بات کا کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ گھنٹہ اسکول میں کب اور کیسے آیا۔

انسپکٹر صاحب اس گھنٹے پر کھدے ہوئے حروف اور خاکے کی نقل اتار کر لے گئے۔ پرانے

زمانے کے آثار کا پتہ لگانے والوں نے ان تحریروں کا مطالعہ کیا اور پھر گھنٹے کی جانچ کی۔ وہ ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ گھنٹہ کم سے کم ڈھائی ہزار سال پہلے بنا تھا۔ ایک اور دلچسپ بات بھی معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ اس کے حروف قدیم ہندوستانی حروف سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

جاگور دِلّی میں

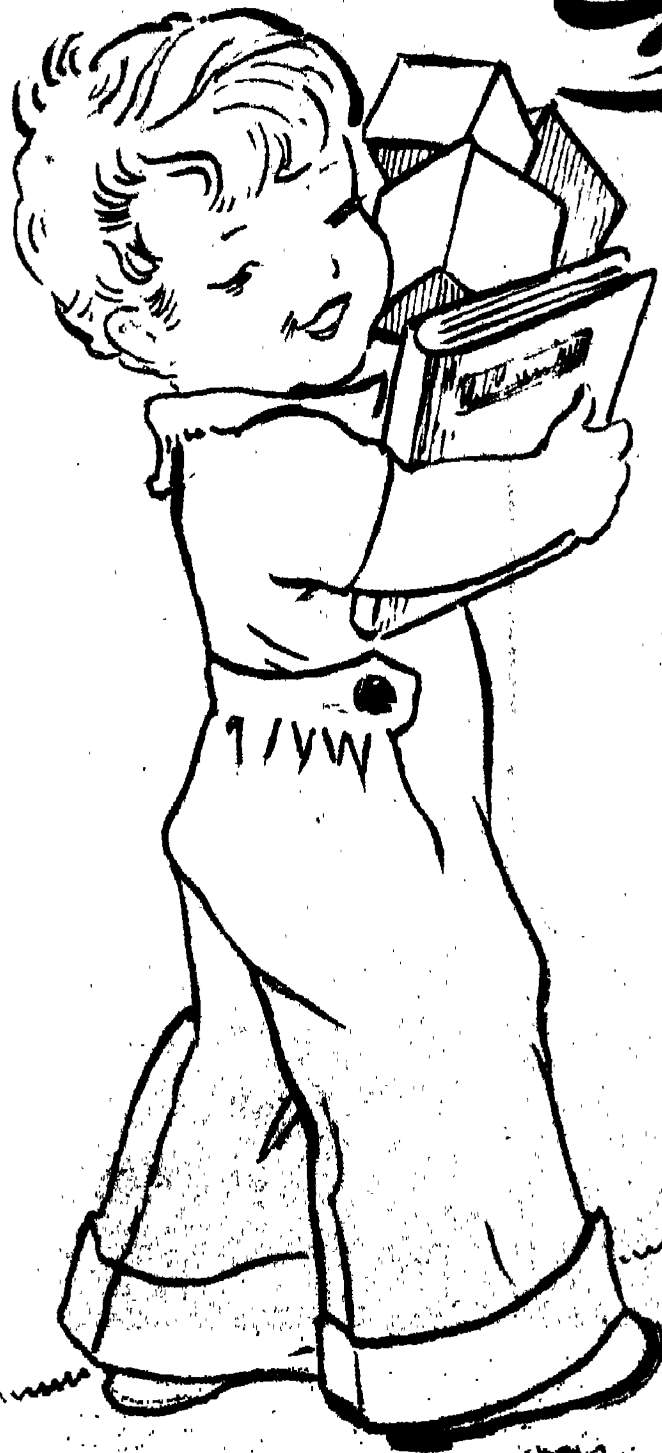
کوے داوا کی مسلسل کہانی آپ بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ اس کہانی میں ایک عجیب وغریب جانور "جاگور" کا بار بار ذکر آیا ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ "جاگور" صاحب اب دہلی تشریف لے آئے ہیں اور یہاں کے چڑیا گھر میں آرام کر رہے ہیں۔

ہندوستان کی ایک پہاڑی مینا امریکہ کے دارالسلطنت شکاگو کے چڑیا گھر میں دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ چڑیا گھر کے اس حصے میں جانے والے اکثر لوگوں کا خیر مقدم یہ مینا بڑے دلچسپ انداز میں کرتی ہے۔ وہ انگریزی میں ہر آنے والوں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

دہلی کے چڑیا گھر میں ایک نیا کوا آگیا ہے۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہے۔ یہ کوا ہندوستان ہی میں پکڑا گیا تھا

سفید کوا۔ جی ہاں سفید بلکہ بھدمیلا سفید کوا۔ آپ کے تو وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا۔ پر یہ ہمارے ہی دیس کا باسی ہے۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں پکڑا گیا ہے۔ دلی کے چڑیا گھر میں تین سفید شیر دو سفید قطبی ریچھ پہلے سے ہیں۔ یہ کاگا مہاراج اس سفید کنبے کے چھٹے رکن ہیں۔





پرنٹر پبلشر رشید احمد دہلوی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جاری کیا



تمام دُنیا کا وقت بتانے والی گھڑی

Payam -i- Taleem
New Delhi-25.

بچوں کے لئے

اسکولوں، گھروں، لائبریریوں [illegible]
خوبصورت کتابیں ۱۲ دلچسپ [illegible]

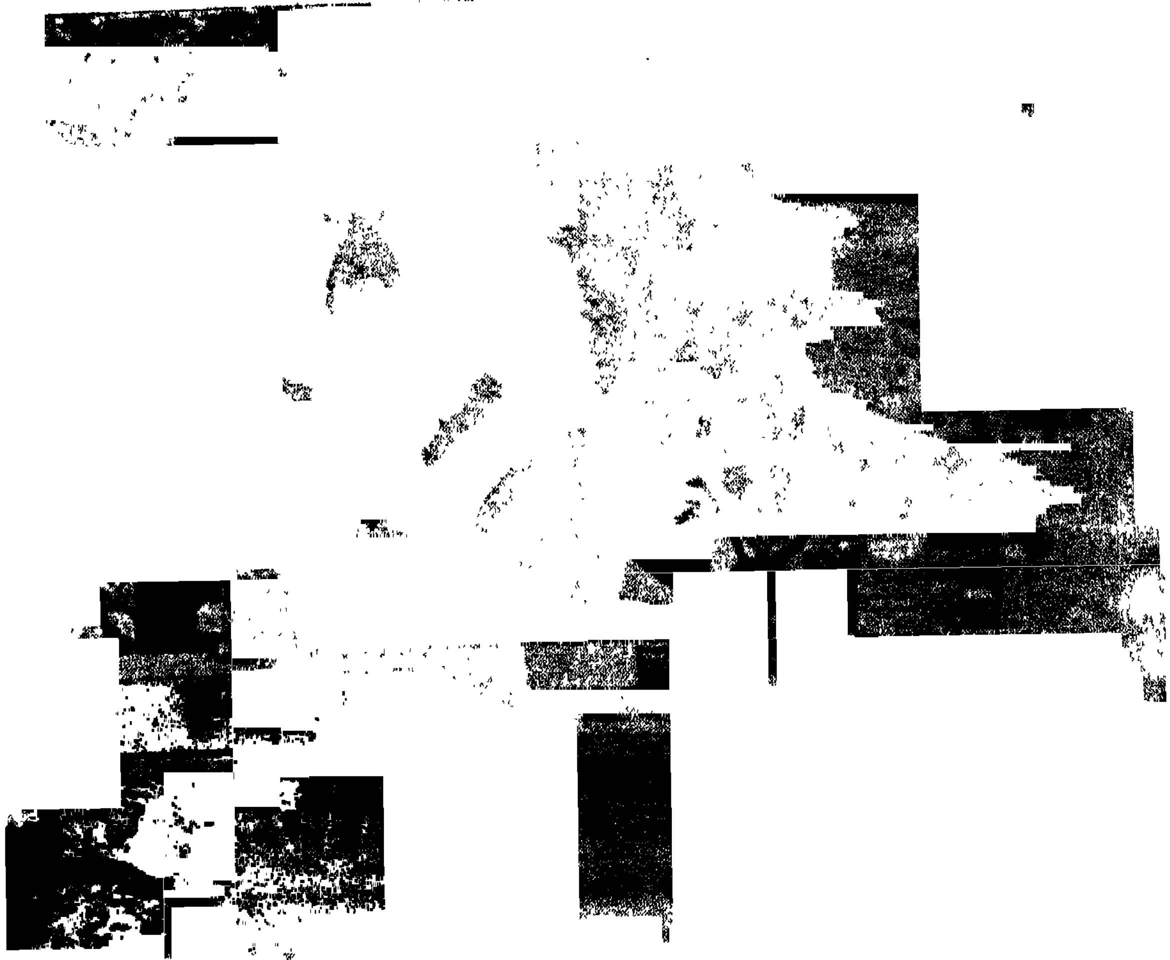
کتاب	صفحات		قیمت		
● پٹارہ	صفحات	۹	قیمت	۱۹	پیسے
● دوستانہ	"	۲۰	"	۲۵	"
● دو کہانیاں	"	۲۰	"	۳۱	"
● گیہوں کی بالی	"	۱۶	"	۳۱	"
● تصویروں میں پنچ تنتر کی کہانیاں	"	۵۲	"	۶۵	"
● روکی اور ششی	"	[illegible]	"	۴۹	"
● ننھی بھالو	"	۱۶	"	۳۸	"
● ننھا پیالہ	"	۴۳	"	۱۲۵	"
● بیشکا	"	۱۶	"	۳۱	"

ان میں سے پٹارہ ۱۰×۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
۲۹×۲۲ سنٹی میٹر کے سائز میں ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

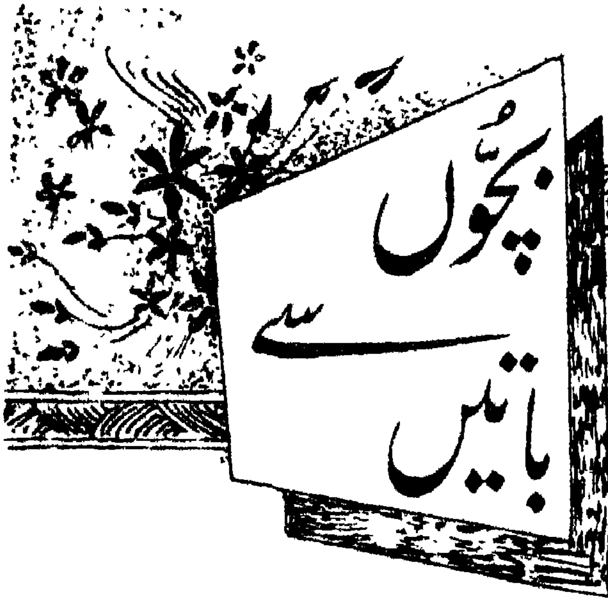
پیام تعلیم







فہرست



پچھلے مہینے اپنے دیس ہندوستان میں جانوروں کا ہفتہ منایا گیا تھا۔ 'پیام تعلیم' نے بھی اس میں حصہ لیا اور اکتوبر کے پرچے میں ایک مضمون ہرن کی فریاد شائع کیا۔ یہ مضمون بچوں میں اور بڑوں میں سب میں مقبول ہوا۔

اسی سلسلے میں ہمیں ایک مزے کی چیز ملی مگر بہت بعد میں ملی "جنگل کے جانوروں کا مشاعرہ" یہ اب کسی اگلے پرچے میں چھپے گی۔

اس پرچے میں ڈاکو کی گرفتاری کا آخری حصہ چھپ رہا ہے۔ کوے داوا کے بعد پیامیوں نے اسی کہانی کو سب سے زیادہ پسند کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مکتبہ اسے کتابی صورت میں چھاپنے کا انتظام کر رہا ہے۔

"اقبال نرائن" بچوں نے خاص طور پر پسند کیا۔ یہ سچے واقعات ہیں مگر سید احمد علی صاحب آزاد نے انھیں بڑے اچھے ڈھنگ سے لکھا ہے۔ بالکل کہانی کا سا مزہ آتا ہے۔ یہ سن کر پیامیوں کو دلچسپی ہوگی کہ یہ اقبال صاحب زندہ ہیں اور بنارس میں کسی مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

سویڈن کی کہانی (جتنے آدمی اتنی موٹریں) بھی بچوں نے بڑے شوق سے پڑھی مگر انھیں ایک شکایت ہے کہ سویڈن کے حالات بہت مختصر ہیں۔ کچھ اور تفصیل ہونی چاہیے تھی۔ اس پرچے میں بھی اسی طرح کا ایک مضمون چھپ رہا ہے۔ امید ہے کہ محترمہ ہاجرہ بیگم اس طرف توجہ فرمائیں گی۔

ان کے علاوہ "پروگرس رپورٹ" "عقل کی جیت" وغیرہ نثر کے بھی مضمون پسند کیے گئے۔ ہمارے "صحافی" صاحب بھی پیام تعلیم کے لیے ادھر ادھر سے معلومات فراہم

کرنے میں بہت محنت کرتے ہیں۔ ہمیشہ دلچسپ اور انھوتی چیزیں پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کا خبرنامہ یعنی "اِدھر اُدھر سے" پیامی خاص طور سے پڑھتے ہیں۔

پرچے میں نظمیں بھی ایک سے ایک اچھی تھیں۔ بزمی بھارتی کی نظم معرکے کی چیز تھی۔ پیامیوں کو یہ بہت ہی پیاری لگی۔ شاد سلطان پوری صاحب کی نظم کو پیام تعلیم سے کئی پرچوں نے نقل کیا اور سنا ہے آل انڈیا ریڈیو بھوپال نے اسے قومی گیت کے طور پر اپنا لیا ہے۔ ان کے علاوہ درزی والی نظم چھوٹے بچوں اور بچیوں میں بہت مقبول ہوئی۔ کماری اودے لکشمی ماتھر کا گیت بھی بچوں نے مزے لے کر پڑھا۔

اس پرچے میں آپ یوسف ناظم صاحب کی کہانی "یونیفارم" پڑھیے اور مزے لیجیے۔ بچیاں خاص طور سے اسے غور سے پڑھیں گی تو انھیں سبق بھی ملے گا بہت اچھا سبق۔ یوسف ناظم صاحب کی ایک اور کہانی ہمارے پاس رکھی ہے نام نہیں بتائیں گے۔ یہ بھی بہت ہی مزے کی ہے کیسی لگے گی پرچے میں پڑھیے گا۔

ہمارے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اسی مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم ایک بڑا اچھا مضمون "یادوں کے پھول" شائع کر رہے ہیں یقین ہے کہ آپ اسے بہت شوق سے پڑھیں گے۔

ہمارے محترم دوست خالد عرفان صاحب نے آپ کے لیے ایک معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک خشک سائنسی مضمون کو انھوں نے کس قدر دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کے لیے انھیں بہت محنت کرنا پڑی ہوگی۔ آپ بھی اسے اسی شوق اور انہماک سے پڑھیے۔

ہمارے رفیق شاستری صاحب نے وعدے کے مطابق امریکہ کے جیمنی ۵ کی کامیاب اڑان کا حال بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اقبال مہدی صاحب آپ کے لیے اس مرتبہ جادو کا بٹوا لائے ہیں۔ مضمون پڑھیے اور بٹوا بنایے۔ بنا لیجیے تو ہمیں بھی بتایے۔

محبی شاہد علی خاں صاحب انچارج شاخ مکتبہ جامعہ بمبئی کی کوششوں سے ہمارے پاس نظم و نثر کا اچھا سا مجموعہ بمبئی سے آیا ہے۔ اس میں سے

(باقی صفحہ ۹ پر)

ہمارے ننھے

خاں بزمی بھارتی

سیمابی کے دونوں "بھتیجے" کتنے پیارے کتنے اچھے
نام بتائیں ان کے تم کو جاوید اور تنویر ہیں سُن لو
ایک ہے کچھ کچھ بھولا بھالا دوسرا کچھ ہے چنچل سا
صبح کو دونوں جلدی اٹھیں اٹھ کے نہائیں کپڑے بدلیں
ناشتہ کرکے پڑھنے جائیں پڑھ کر دونوں ساتھ ہی آئیں
بستے اپنی اپنی جگہ پر الماری میں رکھیں جاکر
دھو کر منہ پھر کھانا کھائیں سیمابی کو ساتھ بٹھائیں
کھانے سے یہ فارغ ہوکر لیٹیں جاکر ایک پلنگ پر
پھر کچھ باتیں کرتے کرتے سو جاتے ہیں تینوں بچّے
سوتے سے پھر تینوں اٹھ کر خوب نہائیں گھر میں نل پر
کپڑے پہنیں بال بنائیں چھیلا بن کر باہر آئیں
میداں میں پھر کرکٹ کھیلیں خوب مزے سے اچھلیں کودیں
شام سے پہلے گھر آ جائیں گھر میں خوشی کے دیپ جلائیں
بزمی ان میں ایک اور گُن ہے اچھی کہانی سننے کی دھن ہے
رات کو چاہے دیر سے سوئیں صبح کو اپنے وقت پہ اٹھیں
پڑھتے ہیں یہ وقت پہ اپنے وقت مقرر کھیل کا ان کے
دیس کو اپنے ایسے ہی بچّے مہکائیں گے چمکائیں گے
اچھے اچھے کام کریں گے
دیس کا اونچا نام کریں گے

جناب وصال الدین احمد، برہانپور

یادوں کے پھول



ہمارے پیارے، سب سے پیارے رہنما چاچا نہرو اسی مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ پیارا مضمون اُن کی جینتی کے سلسلے میں شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر

سارا ماحول خاموش اور پراسرار سا بنا ہوا ہے۔ شام کے دھندلے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سڑکیں سنسان ہیں ان کے کنارے بجلی کے کھمبے سر جھکائے اداس اداس نظروں سے زمین کو تک رہے ہیں۔ شاید کچھ کھو گیا ہے شاید کچھ تلاش کر رہے ہیں ——

اس وقت مجھے ۱۳-۱۴ سال اُدھر کا زمانہ بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔ جب ہم بچے قومی تہواروں پر چاچا نہرو زندہ باد، چاچا نہرو امر رہیں، دنیا کا نیتا نہرو ہے جیسے نعرے لگاتے شاہراہوں پر گشت لگاتے تھے اس وقت میں انگریزی کی ابتدائی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے شہر میں کاغذ بنانے کا کارخانہ بن کر مکمل ہو گیا تھا۔ اس کا افتتاح کرنے کے لیے چاچا نہرو آنے والے تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر سارے شہر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ ہفتوں پہلے ان کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ہم بچوں میں بھی ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ بس

ٹولیاں بنا بنا کر انھیں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے تھے۔

ایک شام میرا دوست نند کشور جو ایک بڑے سرکاری افسر کا لڑکا تھا فخریہ انداز میں کہنے لگا "یار تم لوگ تو چاچا نہرو سے مل بھی نہیں سکو گے وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ لیکن میں تو اپنے ڈیڈی کے ہمراہ ان سے ملنے جاؤں گا۔ وہ میرے ڈیڈی کے بہت پکے دوست ہیں۔ انھیں سُرخ گلاب کے پھولوں کی مالائیں پہناؤں گا۔ سُرخ گلاب انھیں بہت پسند ہیں نا ——"

بے ساختہ میری زبان سے بھی نکل گیا۔ —میں بھی ان سے ملنے جاؤں گا۔ انھیں پھولوں کا ہار پہناؤں گا —— یہ سن کر سب دوست قہقہہ مار کر ہنسنے لگے —— نند کشور کہنے لگا "تم کس کے ساتھ جاؤ گے۔ تمھارے تو ڈیڈی بھی نہیں ہیں اور پھر تم تو بہت غریب ہو۔ اسکول کی فیس تو دے نہیں پاتے۔ ہر مہینے سر ۲ ، ۶ کلاس سے نکال دیتے ہیں۔" سب دوست ہنسنے لگے —— میرا چہرہ اُتر گیا میں خفت مٹانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر دھیرے سے کھسک گیا۔ اس پر ایک اور قہقہہ پڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ——

سچ مچ میں تو بہت غریب ہوں۔ چاچا نہرو مجھے کیا جانیں۔ میرے پتا بھی نہیں ہیں۔ میری ماں ہی ہے جو بیڑیاں بنا کر مجھے پڑھا رہی ہے۔ یہی سب باتیں سوچ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو چلے آ رہے تھے۔ شام کا جھٹپٹا ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے گھر میں گیا اور بغیر کھائے پیئے سو گیا ——

دوسرے روز صبح اندھیرے ہی لوگ سڑکوں پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں اس روز بے حد اُداس اور خاموش خاموش سا تھا۔ اوروں کی طرح میں بھی چپ چپ جا کر لوگوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بچے بوڑھے مرد عورتیں سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے اور چاچا نہرو جس طرف سے آنے والے تھے اُدھر دیکھے جا رہے تھے۔ ان میں ایک ہیجانی کیفیت تھی۔ لیکن میں خاموش کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا، ان کے اُجلے اُجلے کپڑوں کو، ان کے خوشی سے دمکتے ہوئے چہروں کو درختوں اور مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنی سدھ بدھ بھولے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ پھولوں کے ہار بھی ساتھ لائے تھے۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ نعرے لگ رہے تھے اور

جوش میں صفیں بھی درہم برہم ہو رہی تھیں۔ پولیس اور فوجی سپاہی انھیں بار بار پیچھے ڈھکیل رہے تھے ــــ آخر ایک شور اٹھا فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ چاچا نہرو کھلی ہوئی جیپ گاڑی میں ہاتھ جوڑے پھول لٹاتے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھیرے چلے آرہے تھے ــــ لیکن پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرا چہرہ اترا ہوا ہی رہا۔ اور میں خالی خالی نظروں سے ان کی جیپ کو آتے ہوئے دیکھتا رہا ــــ پھر پتہ نہیں کیا ہوا پلک جھپکتے ہی چاچا نہرو جیپ سے کود پڑے اور ایک گلاب کے پھولوں کی مالا میرے گلے میں ڈال دی اور مجھے گدگداتے ہوئے اسی سرعت کے ساتھ پھر جیپ پر بیٹھ گئے ــــ میں دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا ــــ یہ سب کب ہو گیا پتہ نہیں۔ میری آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں۔ پتہ نہیں یہ کیسے آنسو تھے ــ

آج بھی وہ گلاب کا ہار میرے پاس بڑی حفاظت سے ایک چھوٹی سی صندوقچی میں محفوظ ہے۔ وہ ایک یادگار ہے ایک عظیم یادگار بچوں سے اتھاہ محبت اور پیار کرنے والے اس عظیم شخص کی جو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا جو سب بچوں کو ہنستا کھیلتا اور گلاب کے پھول کی طرح سدا مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بچے غریب کے ہوں یا امیر کے ہندو کے ہوں یا مسلمان کے، کالے ہوں یا گورے یا دنیا کے کسی بھی دیش کے ــــ

بچوں سے باتیں (بقایا ہم)

ایک بڑی اچھی نظم ہم اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔ باقی چیزیں اگلے پرچوں میں چھپیں گی۔

ہماری جامعہ میں ہر سال تعلیمی میلا بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ یہ میلا اس مرتبہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں منایا جا رہا ہے۔ اس کا دلچسپ حال آپ جنوری کے پرچے میں پڑھیں گے۔

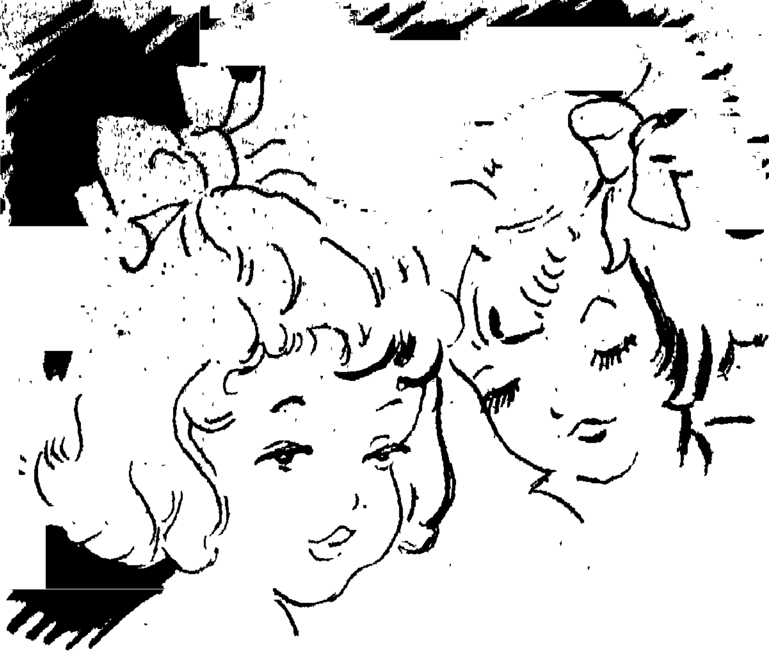
نوحۂ غم

محترمہ سیدہ فرحت

(استاد محترم اختر حسین فاروقی کی یاد میں)

اختر تابدار رُوٹھ گیا
رونقِ ہر دیار رُوٹھ گیا
مخلص و غم گسار تھا نہ رہا
جامعہ کا وقار تھا نہ رہا
اقربا، دوست، سوگوار ہیں آج
اُس کے شاگرد اشکبار ہیں آج
میٹھی باتیں جو اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
پیکرِ خلق و انکسار تھا وہ
سب کا ہمدرد و غم گسار تھا وہ
وہ خلوص و وفا پیکر تھا
اُس کو حساس دل میسر تھا
شفقتیں اس کی یاد آتی ہیں
خوں کے آنسو ہمیں رُلاتی ہیں!
ایک ہمدرد سادہ دل فنکار
ایک درویش، صاحبِ ایثار
خدمتِ ملک و قوم مسلک تھا
ایک عالم میں عمر بھر وہ رہا
فرق آیا نہ استقامت میں
لب نہ کھولے کبھی شکایت میں
سہہ لیا جو بھی ناگوار ہوا
درد دل کا نہ آشکار ہوا

یاد کرتے ہیں آہ بھرتے ہیں
مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں



جناب یوسف ناظم

یونیفارم

(پہلے دن)

فرحانہ: کل تو منگل ہے نا۔ بھئی ہمارے اسکول کی یہ بات بڑی اچھی ہے، منگل کے دن یونیفارم نہیں پہننا پڑتا — زیبو تم کل کون سا رنگ پہنو گی۔

زیبو: میں تو اپنا وہی کاسنی رنگ پہن کر آؤں گی۔ کاسنی پاجامہ، کاسنی شرٹ اور سفید دوپٹہ۔ اور بی فرحت — آپ کا کیا ارادہ ہے؟

فرحت: ہم لوگوں نے کب الگ الگ رنگ پہنے ہیں۔ اسکول کی ساری لڑکیوں میں تو ہم مثلث (تکڑم) کے نام سے مشہور ہیں — اور ہاں ذرا ان بی ثریا اور نکہت کو دیکھو بس دن بھر اسی ٹوہ میں رہتی ہیں کہ ہم تینوں کیا کر رہے ہیں۔

فرحانہ: ہاں بھئی مجھے ان دونوں کا اپنے آگے پیچھے گھومنا اس قدر کھلتا ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ بی ثریا تو اپنے آپ کو شاید حسین بھی سمجھتی ہیں۔

فرحت: پر ہیں دونوں عقل کے نام سے صفر بس ہر کسی کی نقل کرنے میں دونوں کو کمال ہے۔

زیبو: پرسوں تم ایک بیگ لائی تھیں نا، موتیوں کا — آج نکہت بیگم ویسا ہی بیگ لیے چلی آئی ہیں اور یوں ٹھسے سے چل رہی ہیں گویا کوہ نور ہیرا لے آئی ہیں۔ اور ثریا گلے میں ویسی ہی مالا لٹکائے ہوئے آئی ہیں جیسا میں دو چار دن پہلے پہن کر آئی تھی۔

زیبو: میں کہتی ہوں کیوں نہ ان دونوں کو دوست

بنایا جائے۔

فرحت: ہٹو بھی۔ تم نے ان میں دوستی کرنے کی کیا بات دیکھ لی۔

زیبو: تم دیکھو تو سہی۔ ان سے اپنی دوستی کیسی نبھتی ہے ـــ اے لو، ان دونوں نے ہمیں یہاں بیٹھا دیکھ لیا ہے نا۔ بس ادھر ہی چلی آ رہی ہیں۔

فرحانہ: اب تم انھیں نہ بلاؤ۔ جونک کی طرح لپٹ جائیں گی۔

زیبو: تم تو فرحانہ ایسی بن رہی ہو جیسے وہ تمھیں دیکھ لیں گی تو تم لوٹ ٹاٹ جاؤ گی ـــ اب یہ جلا ہوا منہ ذرا سیدھا کر لو ـــ (زور سے) اے تم دونوں ہو۔ میں تو سمجھی کہیں کی شہزادیاں ہمارے اسکول میں آگئی ہیں ـــ ثریا تم تو بڑی پیاری لگ رہی ہو۔

فرحت: اور نکہت کیا کم ہیں۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کیبر کا دوہا ہوں۔

نکہت: اوہو، بڑے شاعرانہ موڈ میں ہیں فرحت باجی۔ ـــ باجی ہم دونوں کو کون پوچھتا ہے۔ اسکول بھر میں دھوم ہے تو بس آپ تینوں کی۔

ثریا: سچ کہتی ہوں زیبو بہن۔ ہمارا بھی کتنا جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں آپ کی ٹولی میں شریک ہو جائیں لیکن آپ ہیں کہ منہ ہی نہیں لگاتیں۔

زیبو: تم بھی کیا باتیں کرتی ہو ثریا ـــ ہم تینوں خود ایک دوسرے سے اکتا گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے کچھ اور دوست بنیں۔ لیکن لڑکیاں تو جیسے ہم سے ڈرتی ہوں۔

نکہت: ہاں، سبھی یہ سمجھتی ہیں کہ تم تینوں اگر چاہو تو اسکول کی بنیاد تک ہلا دو۔

فرحانہ: اے لو سنو فرحت! ہم اسکول میں اتنے بدنام ہیں آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔

ثریا: وجہ ایک نہیں کتنی ہی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ ہی تینوں نے تو صالحہ کے توشہ دان میں زندہ مینڈک کو بند کر دیا تھا اور اس بے چاری نے کھانے کے وقت جب توشہ دان کھولا تو مینڈک اچھل کر اس کی گود میں آگرا اور اس کے سارے کپڑے سالن میں لت پت ہو گئے!

نکہت: اور وہ بات! پچھلے سال اسکول کے نوٹس بورڈ پر آپ ہی نے تو لکھ دیا تھا کہ لڑکیاں کل صبح ۸ بجے اسکول آجائیں اور اپنے محبوب شاعروں کے آٹوگراف حاصل کریں۔ دوسرے

دن کتنی ہی لڑکیاں آٹھ بجے سے پہلے اسکول آگئیں اور دو گھنٹے تک سوکھتی رہیں ۔ بعد میں انھیں پتہ چلا کہ اس دن تو پہلی اپریل تھی۔

زیبو : ارے وہ تو مذاق تھا ۔۔۔ کل تو ہم وہ تماشہ کرنے والے ہیں کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔

ثریا اور نکہت : زیبو بہن ، ہمیں بھی بتائیے نا ۔ آپ کو ہماری قسم۔

زیبو : ارے کل خود ہی دیکھ لینا ۔ جلدی کیا ہے ۔

ثریا : کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم کسی سے کہہ دیں گے ۔

فرحانہ : ہاں بھئی کیا بھروسہ ۔ تم ہماری دوست تھوڑی ہو ۔

نکہت : فرحانہ باجی ! آپ تو ہم پر خوا مخواہ الزام دھرتی ہیں ۔ ہم دوست کیوں نہیں ہیں ۔ آپ ہی ہمیں دوست نہ سمجھیں تو ہم کیا کریں ۔

زیبو : فرحانہ تم بھی کیا دل توڑنے والی بات کر دیتی ہو

فرحت : لیکن زیبو ۔ تم ہی سوچو ہم نے آج تک اپنی کوئی اسکیم کسی کو بتلائی نہیں ۔ اب ان دونوں کو کیسے بتلا دیں ۔

زیبو : ارے بھئی ۔ ہم ان دونوں کو اچھی طرح جانتے ہیں کتنے دنوں سے ہم انھیں دیکھ رہے ہیں ۔ ہم نے تو انھیں چغلی کھاتے نہیں دیکھا ۔

ثریا : زیبو بہن ۔ تم چاہو تو ہم سے قسم لے لو ۔

نکہت : ہماری کیا شامت آئی ہے جو ہم کسی کی شکایت کرتی پھریں ۔

زیبو : اچھا اگر تم دونوں ہماری ساتھی بننا چاہتی ہو تو سب سے پہلے تو یہ ہو گا کہ تم دونوں آئندہ کبھی ہمارے بغیر کینٹین میں نہیں جاؤ گی ۔۔۔ دوسرے یہ کہ منگل کے دن وہی رنگ پہنوگی جو ہم تینوں پہنیں گی ۔

ثریا : منظور منظور ۔ اس میں ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے

نکہت : لیکن وہ اسکیم تو بتلاؤ ۔

زیبو : وہ اسکیم تو کل دوپہر کی ہے ۔ صبح میں تو بس یہ ہو گا کہ ہم پانچوں ایک ہی رنگ کے لباس میں اسکول آئیں گے ۔ پانچوں ایک ساتھ گھومیں گے ایک ساتھ کینٹین جائیں گے ۔ اور دوپہر میں اپنی اسکیم پر عمل کریں گے ۔

نکہت : منظور منظور ۔ کل میری طرف سے کینٹین میں دعوت ہو گی ۔

زیبو : اب یہ دعوت وادت کے جھگڑے نہ کھڑے کرو ۔ ہم آپس میں تکلف نہیں کرتے ۔ دعوتیں صرف تکلف والے کیا کرتے ہیں ۔

فرحانہ : اب بس بیچاری کا دل نہ توڑو ۔ نکہت

کل ہم سب تمہاری ہی جان کو پٹیں گے۔

زیبو: اچھا اب چلیں۔

ثریا: لیکن زیبو بہن۔ آپ نے یہ تو بتلایا ہی نہیں کہ کل کون رنگ پہننا ہے۔

زیبو: ہاں۔ اے لو میں بھول ہی گئی۔ لیکن پہلے قسم کھاؤ کہ کسی سے کہو گی نہیں بی نکہت تم بھی۔

ثریا اور نکہت: ہمیں اپنی اپنی جان کی قسم جو کسی سے کچھ کہیں۔

زیبو: دیکھو کل پاجامہ کاسنی اور ہرے رنگ کا پہننا ہے۔ ایک پائنچہ ہرے رنگ کا ہو اور دوسرا پائنچہ کاسنی رنگ کا۔ شرٹ بھی ایسی ہی ہوگی۔ سامنے کا حصّہ ہرے رنگ کا اور پچھلا حصّہ کاسنی رنگ کا۔

نکہت: کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں

زیبو: سچ نہیں تو کیا جھوٹ بک رہی ہوں۔

ثریا: اور دوپٹہ!

زیبو: دوپٹہ بھی اسی رنگ کا ہوگا۔ آدھا ہرا اور آدھا کاسنی۔ تو طے رہا نا۔

نکہت: بالکل طے۔ واقعی مزا آجائے گا۔

زیبو: تم دوپہر کو دیکھنا کیا ہنگامہ ہوتا ہے۔

(دوسرے دن)

(زیبو، فرحانہ اور فرحت تینوں کاسنی پاجامہ اور کاسنی شرٹ پہنے، سفید دوپٹہ اوڑھے اسکول میں موجود ہیں۔ اسمبلی کا وقت ہو چکا ہے لیکن نکہت اور ثریا ابھی تک نہیں آئی ہیں)

زیبو: خدا جانے ان دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اب تک نہیں پہنچیں۔

فرحانہ: بے چاریوں کو کپڑے رنگنے میں دیر لگ گئی ہوگی۔

فرحت: آجاتیں تو آج ان کی گت بن جائے گی۔ ۔ اے لو۔ وہ اسمبلی کی گھنٹی بج گئی۔

زیبو: دیکھو دیکھو۔ وہ دونوں چلی آرہی ہیں بھاگتی ہوئی۔ دونوں نے دورنگی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ چلو بھاگو یہاں سے۔

(ثریا اور نکہت ہرا کاسنی پاجامہ، ہری کاسنی شرٹ، اور اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے داخل ہوتی ہیں۔ اسکول کی ساری لڑکیاں اسمبلی کے لیے جمع ہو چکی ہیں، استانیاں بھی جمع ہیں۔ ہر کسی کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہنس رہی ہیں اور استانیاں پریشان ہیں صدر معلّمہ ان کی طرف بڑھتی ہیں۔)

صدر معلمہ: تم دونوں ادھر آؤ — یہ اسکول میں پہننے کا لباس ہے یا سرکس کا ڈریس۔ اگر تم دونوں کو جوکر بننے کی نوکری مل گئی ہے تو پھر اسکول کیوں آتی ہو — (استانیوں سے) آپ لوگ اسمبلی شروع کر دایئے اور ان دونوں معزز ہستیوں کو سب کے سامنے الگ کھڑا کیجیے — ان کی حماقت سے لطف اٹھانے کا سب کو حق حاصل ہے۔

(اسمبلی ہوتی ہے۔ ثریا اور نکہت دونوں سر جھکائے بیحد شرمندہ اور پریشان سب سے الگ کھڑی رہتی ہیں۔ ان کی نظریں، زیبو، فرحانہ اور فرحت کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ اسمبلی کے بعد انھیں صدر معلمہ کے اجلاس پر حاضر ~~ہونا پڑتا~~ ہے۔)

صدر معلمہ: ہاں اب بتلایئے ثریا بیگم صاحبہ اس شان سے یہ سواریاں کدھر کی تفریح کو نکلی ہیں۔

ثریا: جی — جی۔ میں سمجھی کہ ایسا لباس پہننے کی سب کو اجازت ہے۔

صدر معلمہ: ہاں ہاں کھلی اجازت ہے اور دس بیس لڑکیوں سے کہو کہ اگلے منگل کو ایسا ہی لباس پہن کر آئیں۔ ہمارا اسکول بالکل تو نکلی کا میلا دکھائی دینے لگے گا — ہونہ ہوں تمھارے بھیجے میں یہ بات آئی کیسے نکہت تم بھی تو پھوٹو اپنے منہ سے۔

نکہت: جی آپا۔ ہم دونوں نے سوچا تھا کہ...

صدر معلمہ: ہاں فرمایئے نا کیا سوچا تھا۔ انھیں دیکھو سوچنا دیکھو۔ جیسے یہی تو آئن اسٹائن ہیں۔ میں سمجھتی ہوں تم دونوں یہاں اپنے لیونگ سٹہ لینے آئی ہو۔

نکہت اور ثریا: نہیں نہیں آپا (رو پڑتی ہیں) ہم سے بھول

صدر معلمہ: (خادمہ سے) ان دونوں کو ان کی کلاس میں لے جاؤ اور ان کی کلاس ٹیچر سے کہو کہ ان دونوں کو دن بھر کلاس کے سامنے والان میں کھڑا رہنے دیں۔ ادھر سے جو بھی گزرے انھیں دیکھے اور خوش ہو — اب جاؤ کھڑی کیوں ہو۔ میں بہت نظارہ کر چکی۔

(نکہت اور ثریا دن بھر کلاس کے سامنے دالان میں کھڑی رہتی ہیں۔ روتے روتے ان کا برا حال ہو جاتا ہے۔ زیبو، فرحانہ اور فرحت بھی انھیں دیکھنے آتی ہیں لیکن یہ ان سے باتیں تک نہیں کرتیں۔)

ترجمہ ہاجرہ بیگم

رامو دھوبی



رامو دھوبی بڑا غریب   بڑھیا دھوبن بڑی عجیب
صبح صبح جب دھوبی جاگے   بڑھیا اس سے پیسے مانگے
دھوبی کپڑے دھونے جائے   بڑھیا دن بھر ناچے گائے
سانجھ سمے دھوبی گھر آئے   بڑھیا بیٹھی پان چبائے
دھوبی کہتا لا دے روٹی   بڑھیا بیٹھی گوندھے چوٹی
دھوبی بیچارہ جب سوئے   بڑھیا زور زور سے روئے
کہتا دھوبی ہے بھگوان
یہ بڑھیا ہے یا طوفان

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

غیاث پور

جامعہ ملیہ جہاں سے تمھارا رسالہ پیام تعلیم نکلتا ہے نظام الدین کی بستی سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے تم جانتے ہو کہ اس بستی کو نظام الدین کیوں کہتے ہیں ہم اس کی کہانی تمھیں سنانا چاہتے ہیں۔

نظام الدین سے کچھ دور جدھر آگرہ کو ریل جاتی ہے کیلوکھری ایک بستی ہے۔ کسی زمانے میں جسے اب چھ سات سو برس ہو گئے ہوں گے اس کیلوکھری میں ایک بزرگ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

لوگ ان کے پاس صبح سے شام تک جاتے تھے اور ان کی اچھی اچھی باتیں سنتے تھے۔

وہ کہتے تھے خبردار جھوٹ نہ بولنا جھوٹ بولنے سے آدمی کی صورت بگڑ جاتی ہے، چہرہ کی رونق جاتی رہتی ہے۔ وہ کہتے تھے ایسی بات نہ کہو جسے تم پورا نہ کر سکو کسی کے پیچھے کسی کو برا کہو۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر انسان کی مدد کرے، مسلمان بھی انسان ہے، ہندو بھی انسان اور عیسائی بھی انسان ہے، غریب اور جسے تم نیچ کہتے ہو وہ بھی انسان ہے اور امیر جسے تم اونچا کہتے ہو وہ بھی انسان ہے۔ اس زمانے کے بادشاہ وزیر اور بڑے بڑے امیر بھی ان سے دعا کراتے تھے اور ان کی باتیں سنتے تھے۔

ان بزرگ کا نام تھا خواجہ نظام الدین اولیا۔ یہ نام تم یاد رکھنا بھولنا نہیں!!"

خواجہ نظام الدینؒ کے بڑے بوڑھے بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور اتر پردیش کے شہر بدایوں میں رہنے لگے تھے۔

بدایوں میں ایک بہت اچھا مکتب تھا جس میں خواجہ نظام الدینؒ نے پڑھا تھا۔ مکتب کی پڑھائی ختم ہو گئی تو ان کی امّی نے جن کا نام بی بی زلیخا تھا مکتب کی پڑھائی ختم ہونے کی پگڑی بندھوائی۔

بی بی زلیخا نے سوچا کہ پگڑی کسی ایسے آدمی سے بندھوائی جائے جو بہت نیک ہو، جو کسی کو تکلیف نہ دیتا ہو، سچ بولتا ہو، جو کہتا ہو اُسے پورا بھی کرتا ہو۔ بدایوں میں بڑے بڑے لوگ رہتے تھے، بڑے بڑے نیک رہتے تھے مگر ان سب میں شیخ علی اونچے اخلاق کے آدمی تھے اور تمام بدایوں والے انھیں جانتے تھے۔

اب ایک بات یہ بھی سن لو کہ نیک اور اچھا بننے کے لیے کسی اونچی ذات ہی کی ضرورت نہیں ہے، جو انسان بھی اچھی باتیں سیکھ لیتا ہے وہی نیک اور خدا کا اچھا بندہ بن جاتا ہے۔

شیخ علی کسی زمانے میں گھوسی تھے اور دہی بیچا کرتے تھے، بڑے پہلوان تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا سا لٹھ رہتا تھا، دن میں دہی بیچتے اور رات کو کسی کے گھر میں گھس کر جو مال مل جاتا لوٹ لیتے اور گھر کا مالک روکتا تو لٹھ سے اس کی خبر لیتے۔

خدا نے انھیں سیدھا راستہ دکھایا، نیک اور غازی بنایا تو انھوں نے پکّی توبہ کی اور عہد کیا کہ نہ اب کسی کے گھر میں چوری کروں گا نہ کسی کو دکھ دوں گا بس خدا سے لو لگاؤں گا۔ پھر تو شیخ علی ایسے ہو گئے کہ لوگ ان سے دعائیں کراتے اور حد سے بڑھ کر یہ کہ خواجہ نظام الدین کی امّی جو سیدانی اور بڑے بزرگ کی بیٹی تھیں انھوں نے بدایوں جیسی بڑی بستی میں ان ہی کا انتخاب کیا اور ان ہی کے ہاتھوں اپنے بیٹے کے سر پر مکتب کی پڑھائی کے ختم کی پگڑی بندھوائی، اور جب شیخ علی پگڑی باندھنے لگے تو بی بی زلیخا نے گھر میں سے کہلا بھیجا میرے بچّے کے لیے دعا کیجیے کہ یہ نیک ہو کر زندہ رہے، اور کبھی برائی کی طرف نہ جائے۔ شیخ علی پگڑی باندھ کر اور دعا دے کر چلے گئے۔ اس کے کچھ دن بعد خواجہ نظام الدینؒ دلی آ گئے اور یہاں کے بڑے بڑے عالموں سے اونچی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر مدّتوں بعد کیلوکھری میں جا کر رہنے لگے۔

خواجہ نظام الدینؒ کی ایک بات سن کر تمھیں تعجب بھی ہو گا افسوس بھی ہو گا اور خوشی

بھی ہوگی۔ افسوس تو یوں ہوگا کہ ان کے باپ جن کا نام سید احمد بخاری تھا انھیں بچپن چھوڑ کر خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی ماں چرخہ کات کات کر گزارہ کرتی تھیں مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی تھیں۔

خوشی اس لیے ہوگی کہ یہ اپنی ماں کے بڑے تابعدار رہتے اور کبھی کوئی بات ماں کے خلاف نہ کرتے تھے۔

تعجب اس پر ہوگا کہ اگر کسی دن فاقہ ہوتا اور کھانے کو کچھ میسر نہ ہوتا تو ان کی ماں اپنے بیٹے سے یوں کہتیں:

بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔

اور خواجہ نظام الدینؒ ماں کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوتے۔ تو کیا تمھارے نزدیک یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ فاقہ ہو۔ لقمہ میسر نہ آئے اور فقط اتنی بات سے آدمی خوش ہو جائے۔

خواجہ نظام الدین خوب بڑے ہو گئے تو اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ مجھے اماں کا یہ جملہ بڑا ہی پیارا لگتا تھا کہ "آج ہم خدا کے مہمان ہیں"

چنانچہ اسی زمانے سے یہ کہاوت بن گئی ہے۔

پیٹ سے فاقہ خوشی بے اندازہ

اور یہ کہاوت ہر اُس کتاب میں لکھی ہوئی ہے جس میں اور بھی بہت سی کہاوتیں ہیں۔

خواجہ نظام الدینؒ مدتوں کیلوکھری میں رہے اور پھر اس بستی کے قریب آکر ٹھہر گئے جس کا نام نظام الدین ہے۔ بستی کا اصل نام غیاث پور تھا اور اسے دلّی کے مشہور بادشاہ غیاث الدین بلبن نے بسایا تھا۔

غیاث الدین بلبن کا نام آگیا ہے تو ذرا یہ بھی سن لو کہ غیاث الدین بلبن کیسا بادشاہ تھا اور اس کی حکومت کا ڈھنگ کیسا تھا۔

غیاث الدین بلبن نے چالیس برس دلّی میں حکومت کی ہے۔ اس کی حکومت میں ہر جگہ امن اور چین تھا۔

دلّی کے آس پاس جتنے گاؤں تھے ان سب میں لٹیرے رہتے تھے غیاث الدین نے ان تمام لٹیروں کا خاتمہ کر دیا۔ جگہ جگہ چوکیاں اور قلعے بنا دیے قلعے اور چوکیوں میں فوج کے سپاہی اور پولس کے جوان رہتے تھے جن کے ڈر سے لٹیروں کی ہمت پست ہو گئی تھی جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں پولس کے سپاہی بہت اچھے ہوتے تھے

وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کام پرجا کی حفاظت کرنا ہے۔ وہ چوروں کی ذرا رعایت نہ کرتے تھے اور ہر دم ان کی تاک میں لگے رہتے تھے ، وہ رشوت لے کر چوروں کو بچاتے نہ تھے۔

فوج بھی خوب چوکنی رہتی تھی جس گاؤں سے خبر ملتی کہ ڈاکو لوٹ مار کی تیاری کر رہے ہیں گھوڑے دوڑا کر پہنچ جاتی اور ڈاکوؤں کو پکڑ کر ایسی سزا دیتی کہ توبہ توبہ پکارنے لگتے تھے۔

غیاث الدین نے اپنی اولاد سے کہہ دیا تھا کہ تم اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ بادشاہ کے بیٹے ہو اگر تم نے کسی ہندو یا مسلمان کو دکھ دیا، کسی کا مال چھینا، کسی کے گھر پر زبردستی قبضہ کیا تو بغیر سزا کے تم بچ نہیں سکتے۔ انصاف میں نہ بیٹے کو دیکھا جاتا ہے نہ بھائی کو۔ حاکم وہی اچھا ہے جو خدا سے ڈرے اور پرجا کو آرام پہنچائے۔ جھگڑا اور فساد نہ پھیلنے دے۔

ہم تمھیں یہ سنا رہے تھے کہ خواجہ نظام الدینؒ کیلوکھری سے غیاث پور میں آ گئے اور یہیں رہنے لگے تھے۔ مدتوں تک رہتے رہے جب اللہ کے پیارے ہو گئے تو یہیں ان کی قبر بنی اور اب اس بستی کو ہر چھوٹا بڑا نظام الدین کہتا ہے۔ سرکاری کاغذوں میں بھی اس کا نام نظام الدین ہے اور ریل کے ٹکٹوں پر بھی نظام الدین چھپا ہوا ہے۔ ہاں جس دروازہ سے یہ بستی شروع ہوتی ہے اس پر اب تک ایک تحریر 'غیاث پور' لکھا ہوا ہے۔ تمھارا جی چاہے تو کبھی جاکر دیکھ لینا۔

غیاث الدین بلبن کی بڑی اچھی اچھی کہانیاں ہیں جنھیں ہم تمھیں پھر کبھی سنائیں گے۔

سپیرا

جناب خضر برنی



ایک سپیرا بین بجاتا ہنستا گاتا آیا
کاندھے پر سانپوں کی بہنگی، نیولا ساتھ میں لایا
سر پر پگڑی ہاتھ میں سونٹا دھیرے دھیرے آیا
اُٹھ کر سوتے بچے بھاگے ایسا شور مچایا
اپنی باتوں سے پھر اس نے بچوں کو للچایا
ایک سپیرا بین بجاتا ہنستا گاتا آیا

پاؤں میں چھم چھم کرتے گھونگھرو ہوا میں جب لہرائے
دوڑے دوڑے، دور سے بچے پیچھے پیچھے آئے
دیکھ کے سارے بچوں کو وہ اور بھی کچھ بل کھایا
ایک سپیرا بین بجاتا ہنستا گاتا آیا

ہاتھ سے ڈھولک جس دم اس نے ٹھنک ٹھنک گرمائی
تھاپ پہ جس کی جھولے سے ایک ساپن سی لہرائی
دیکھ کے جس کو دل ہی دل میں ہر بچہ گھبرایا
ایک سپیرا بین بجاتا ہنستا گاتا آیا

جھولے سے ایک سانپ کو لے کر نیولے آگے ڈالا
کھیل دکھا کر بولا سب سے پیسے دے دو لالا
تالی بجائی سب بچوں نے ایسا کھیل دکھایا
ایک سپیرا بین بجاتا ہنستا گاتا آیا
کاندھے پر سانپوں کی بہنگی نیولا ساتھ میں لایا

کہ عام مشاہدے کے خلاف ہے

مانگے کا اُجالا

جناب خالد عرفان (بنگلور)

رات ہوئی۔ چاند نکلا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روپہلی چاندنی سارے میں پھیل گئی۔
قمر میاں مزے میں آکر لگے لہک لہک کر گانے ہے

چندا ماما دُور کے　　بڑے پکائیں بُور کے

پھر اپنی اپیا سے بولے "کیوں اپیا سورج سے تو ہمارے چندا ماما ہی بھلے ان کی روشنی کیسی روپہلی کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ سورج دادا کی گرم گرم دھوپ سے تو خدا بچائے ذرا گھر سے نکلے میدان میں آئے اور پسینے میں نہا گئے۔
اپیا قمر میاں کے بھولے پن پر مسکرادیں، بولیں۔ پر قمر میاں تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارے چندا ماما کا یہ اُجالا مانگے کا اُجالا ہے۔ ان کی جو یہ چمک دمک ہے یہ سورج دادا کی دین ہے۔
قمر میاں حیران ہو کر بولے: تو اپیا کیا چندا ماما کی یہ روشنی نقلی روشنی ہے۔

اپیا: بھئی دیکھو اصلی نقلی تو میں جانتی نہیں۔ یوں سمجھو کر تمھارے چندا ماموں کا ایک حصہ یا ایک رخ ہمیشہ سورج کے سامنے رہتا ہے۔ اسی لیے یہ ہمیں چمک دار نظر آتے ہیں۔ اس روشنی کو وہ زمین کی طرف

پھیلتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس روشنی کا عکس زمین پر پڑتا ہے۔ یہ روشنی اصلی نہیں ہوتی اس لیے پھیکی پھیکی ہوتی ہے۔ اس سے نہ اناج پیدا ہو سکتا ہے نہ پھل ترکاریاں پک سکتی ہیں نہ اس میں گرمی ہے۔

قمر: واہ بھئی ہم تو سمجھے تھے ہمارے چندا ماما بھی سورج دادا کی طرح ہمیں روشنی پہنچاتے ہیں۔ پر بات بالکل دوسری نکلی۔ اچھا اپیا چراغ کی یا بجلی کے بلب کی روشنی کو آپ کیا کہیں گی۔

اپیا: قمر میاں چراغ یا آگ ہی کو دیکھ کر تو انسان کا دھیان ادھر گیا ہے۔ اور جبھی سے تو اس نے سوچنا شروع کیا ہے کہ یہ روشنی کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتی ہے۔ چراغ کو یا آگ کو تم سورج کا ایک چھوٹا سا نمونہ سمجھو۔

قمر: وہ کیسے اپیا؟

اپیا: دیکھو تم کوئی چیز جلاتے ہو۔ اب جیسے تم آگ جلاتے ہو تو وہ لال انگارا ہو جاتی ہے بس جبھی اس میں سے روشنی نکلنے لگتی ہے اسی طرح ہمارے سورج دادا تو ایک بھٹی ہیں جلتی ہوئی بھٹی۔ اتنی اتنی گرم کہ ہزاروں بلکہ کروڑوں میل کی چیزیں اس کی گرمی سے جھلس کر رہ جائیں۔ اس بھٹی کی گرمی سے تو روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں سورج دادا کی بات تو بہت دور کی ہے تم چراغ یا موم بتی جلا کر دیکھو اس کی لو بھی تو کافی گرم ہوتی۔

قمر: جی ہاں اپیا بہت گرم ہوتی ہے۔ ہاتھ لگا دو تو جل جائے۔

اپیا: اس کا بھید یہ ہے کہ موم بتی میں یا کوئلے میں کاربن ہوتی ہے اس کے جلنے پر جو شعلہ نکلتا ہے وہ گرم ہوتا ہے۔ اس گرمی سے بن جلے کاربن کے ذرّے چمک اٹھتے ہیں۔ اور روشنی پھینکنے لگتے ہیں ــــ یعنی گرمی روشنی سے بدل جاتی ہے ــــ ہے نا عجیب بات۔

قمر: اور کیا اپیا بالکل عجیب بات ہے۔

اپیا: بات اصل میں یہ ہے کہ گرمی اور روشنی دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں فرق کیا ہے؟ فرق ہے ان کی شعاعوں کی لمبائی کی دکھائی دینے والی

روشنی کی لہروں کی لمبائی گرمی کی لہروں
کی لمبائی سے چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ لہریں
جتنی چھوٹی ہوتی ہیں اتنی ہی آسانی سے
ہمیں نظر آتی ہیں۔ لیکن بہت زیادہ کبھی نہیں
سورج سے نکلنے والی روشنی کی لہروں کی
لمبائی میں اور مصنوعی ذریعوں سے پیدا
کی جانے والی روشنی کی لہروں کی
لمبائی میں کافی فرق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے
ان دونوں میں آسانی سے تمیز کی جا سکتی ہے۔
اچھا قمر میاں آپ نے سڑکوں پر بلب یا ٹیوب
جلتے دیکھے ہوں گے۔ ان میں سے یا تو زرد
اور پیلی پیلی روشنی نکلتی ہے یا سبزی مایل
سفید۔ زرد روشنی ایسے بلب سے نکلتی ہے
جس کے اندر سوڈیم نامی دھات کے بخارات
بھرے ہوں۔ سبز روشنی پارے کے بخارات
سے نکلتی ہے۔ پارے کے بخارات سے نکلنے
والی روشنی کا رنگ دھندلا دھندلا نظر
آتا ہے۔ مگر پارے والا بلب سستا ہوتا
ہے۔ زیادہ دیر تک کام دیتا ہے۔ اس کی
روشنی بھی دور تک پہنچتی ہے۔
تو قمر میاں اتنی بات تو آپ کی سمجھ میں آ گئی
ہو گی کہ کوئی چیز جب تک گرم نہ ہو روشنی
نہیں دیتی۔ گرمی جبھی پیدا ہو گی جب اسے
جلایا جائے گا۔ اسی طرح کوئی چیز جتنی زیادہ
گرم ہو گی اتنی ہی روشن ہو گی۔ کم درجۂ حرارت
سے جو لہریں نکلتی ہیں وہ بہت لمبی ہوتی ہیں
اور نظر نہیں آتیں۔ کوئلے کو اگر اس قدر
دہکایا جائے کہ لال انگارہ بن جائے تب
بھی اس سے زیادہ لمبائی والی لہریں نکلیں
گی۔ زرد اور نارنجی روشنی کی لہریں بھی نکلیں
گی مگر اکا دکا۔
جبھی تو زیادہ روشنی حاصل کرنے کے لیے
کسی چیز کو اتنا گرم کرنا چاہیے کہ اس سے نکلنے
والی زیادہ تر لہریں دکھائی دینے والی
روشنی کی لہریں ہوں۔
ہمارے دیہاتی بھائیوں کے گھروں میں
تو اب بھی کہیں کہیں مٹی کے دیے نظر آ جاتے
ہیں، ان میں سرسوں وغیرہ کا تیل ڈالا
جاتا ہے۔ دیوالی کے تیوہار میں دلی جیسے
بڑے شہروں میں بھی بہت سے پرانے خیال
کے لوگ بھی دیے جلاتے ہیں۔ دیواروں
پر چھتوں کی منڈیروں پر قطار در قطار دیے

جلے ہوئے کتنے بھلے لگتے ہیں!
انگریزوں کے زمانے میں مٹی کے تیل یا کیروسین آئل کی ریل پیل ہو گئی تو ٹین کے بنے ہوئے چراغوں کا رواج چل پڑا پھر لال ٹینیں آئیں۔ دیہاتوں، قصبوں میں جہاں جہاں بجلی نہیں پہنچی ہے اب انھی کی حکومت ہے۔ پھر روشنی کے بڑے بڑے ہنڈے چلے۔ یہ بھی گیس یا تیل سے جلتے تھے۔ ان پر ایک جالی نما ٹوپی سی ہوتی ہے۔ تیل یا گیس کے جلنے سے یہ ٹوپی گرم ہو کر روشن ہو جاتی ہے۔ اس جالی کو ہی۔ای یم یا تھوریم آکسائڈ نام کے مرکب میں ڈبو لیا جاتا ہے۔

قمر: ہاں ہاں اپیا، یہ گیس کے ہنڈے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ ان کی روشنی تو بڑی زوردار ہوتی ہے۔ ہم نے تو یہ محمود دیال کے ہاں جو بیاہ ہوا تھا اس میں دیکھے تھے۔

اپیا: ضرور دیکھے ہوں گے پر اب تو ایک چیز ایسی چلی ہے جس نے ان سب چیزوں کو مات دیدی ہے۔

قمر: (تعجب سے) وہ کیا؟

اپیا: ارے بھئی بجلی ـــ بجلی۔

قمر: (ہنس کر) بھئی واہ ہم تو سمجھے کہ اپیا نجانے کیا نئی چیز بتا رہی ہیں بجلی تو ہمارے بنگلور میں چپے چپے پر ہے۔

اپیا: ٹھیک ہے۔ پر کیا یہ بات تمھیں عجیب نہیں معلوم ہوتی کہ اک زرا بٹن دبایا اور چھت پر لٹکتا ہوا یا تمھاری میز پر رکھے ہوئے لیمپ کا بلب جگمگا اٹھا۔

قمر: بات تو بالکل ٹھیک کہتی ہیں اپیا مگر یہ ان لوگوں کو عجیب معلوم ہوا ہوگا جنھوں نے پہلے پہل اسے جلایا ہوگا۔ ہم نے تو بلب کی روشنی میں آنکھیں کھولی ہیں اسی لیے اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا کہ بجلی کیا چیز ہے اور بلب کیسے روشن ہو جاتا ہے۔ بٹن دبایا بلب جل گیا بٹن دبایا پنکھا چلنے لگا۔

اپیا: جبھی تو میں بتا رہی ہوں قمر میاں، تمھیں خیال آتا ہو یا نہ آتا ہو پر میرے دل میں تو اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ خالی بٹن دبانے سے یہ بجلی کیوں جل اٹھتی ہے۔ بلب ایک دم کیسے روشن ہو جاتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے اس

کا کھوج لگایا۔ کتابیں پڑھیں اپنے استادوں سے پوچھا۔

قمر : پھر؟ ہمیں بھی کچھ بتایئے؟

اپیا : کیوں نہیں تو تم بھی سنو۔ دیکھو جب بھی کسی تار میں بجلی کی رَو دوڑائی جاتی ہے تار کی کوشش ہوتی ہے کہ اس رَو کو اپنے اندر دوڑنے نہ دے۔ یہ رَو بےچاری اور تو کچھ کر نہیں پاتی غصے میں لال پیلی ہو جاتی ہے۔ تار کو خوب گرم کر دیتی ہے رکاوٹ جتنی زیادہ ہوگی تار اتنا ہی زیادہ گرم ہوگا۔ ہوتے ہوتے اتنا گرم ہو جائے کا چمکنے لگے گا۔

اب سے لگ بھگ سو سال پہلے اسی اصول کو اپنا کر سر ہمفری ڈیوی نے بجلی کا پہلا لیمپ تیار کیا تھا۔

قمر : (بہت اشتیاق سے) وہ کیسے؟

اپیا : انھوں نے کیا یہ کہ پہلے کاربن کے دو ٹکڑے لیے انھیں بلب نما شیشے کے درمیان مخالف سمتوں میں جوڑا۔ ان دونوں کے بیچ خالی جگہ میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ سر ہمفری ڈیوی نے کاربن کے ان ٹکڑوں میں بجلی کی رَو دوڑائی۔ کافی کوشش کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ہوا کے ذرے برق پارے بن گئے۔ یہ برقیائے ہوئے ذرّے یا برق پارے کاربن سے ٹکرانے لگے۔ اُجلی اور تیز دودھیا روشنی نکلنے لگی۔ اس وقت اس کا نام کاربن آرک لیمپ رکھا۔ اس اصول پر بنائے ہوئے لیمپ آج بھی فوٹوگرافی میں اور سینما کی فلم لیتے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان دونوں کے لیے بہت تیز روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

قمر : مگر اپیا ہم نے تو یہ کاربن آرک لیمپ کہیں دیکھے نہیں۔

اپیا : تم دیکھ کر بھی کیا کرتے یہ بہت بھونڈے ہوتے تھے۔ ان میں ایک بڑی خرابی بھی تھی۔ کاربن کھلی ہوا میں جلائیں تو ہوا سے آکسیجن لے کر کاربن ڈائی آکسائڈ بن جاتی ہے۔ یہی ان لیمپوں میں ہوتا۔ ان میں لگے ہوئے کاربن کے ٹکڑے جلد ہی آکسائڈ بن کر راکھ ہو جاتے۔

اس خرابی کو دور کرنے کے لیے بلب کے اندر کی ہوا خاص طریقے سے نکال لی جاتی۔

پر اب کاربن کے ٹکڑوں کو بلب میں بند
کیسے کیا جائے؟ سوچتے سوچتے ایک ترکیب
سمجھ میں آئی: باریک تاگے پر کاربن کے
ذرّے چڑھا کر اسے بلب میں استعمال
کرنے لگے۔ یہ ساری تبدیلیاں ۱۸۷۵ء
سے ۱۸۵۸ء تک تھامس ایڈیسن
اور سر جوسف وسن نے اپنے اپنے سائنس
معاملوں میں یا تجربے خانوں میں کی تھیں۔
مگر ان کاربن والے دھاگوں کا استعمال
کچھ کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ اس لیے انھوں
نے مختلف دھاتوں کے تاروں پر تجربہ
شروع کیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ دھات
کے تار جتنے باریک اور نازک ہوتے ہیں
اسی قدر زیادہ بجلی کی رو کو دوڑنے سے
روکتے ہیں اور خود دہکنے لگتے ہیں یہ بھی
معلوم ہوا کہ رکاوٹ کی یہ طاقت ہر دھات
میں الگ الگ ہوتی ہے۔
آخر کئی دھاتوں پر تجربہ کرنے کے بعد
ٹنگس ٹن نامی دھات اس کام کے لیے
سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی اس
کے کئی سبب تھے (۱) اس دھات کے تار
بہت باریک بنائے جا سکتے تھے۔ (۲) مضبوط
بھی بہت ہوتے تھے (۳) سب سے بڑی بات
یہ کہ تین ہزار سینٹی گریڈ تک گرم کرنے کے
بعد ہی یہ پگھل سکتے ہیں۔ اس سے کم درجے کی
حرارت پر نہیں۔ پھر گرم تار سے نکلنے والی
لہریں دکھائی دینے والی روشنی کی لہریں
ہوتی ہیں۔ آج کل کے بلبوں میں اسی
دھات (ٹنگس ٹن) کے تار ہوتے ہیں۔
ان بلبوں میں بھی ایک خامی یا خرابی کا پتہ
چلا۔ اچھا دیکھو ایک کام کرو کہیں سے
کوئی پرانا بلب تلاش کر لاؤ۔

قمر: (کچھ سوچتا ہے) کہاں سے لاؤں اپیا؟ پرانا
بلب بھلا کہاں ملے گا (پھر سوچتا ہے)
آہا دیکھیے یاد آگیا (دوڑ کر جاتا ہے۔
باورچی خانے کی ایک پرانی سی الماری
میں کھکوڑ کر دیکھتا ہے) ارے اپیا مل
گیا مل گیا۔ پرانا بلب مل گیا دیکھیے یہی نا؟

اپیا: ہاں بھئی یہی۔ شاباش اچھا اب ذرا
بلب کے اندر کی سطح کو غور سے دیکھو۔ کوئی
کالی کالی سی چیز جمی ہوئی نظر آرہی ہے نا؟

قمر: جی ہاں نظر آرہی ہے۔

اپیا: کچھ بتا سکتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ قمر میاں یہ
وہی دھات ہے جس سے بلب کا تار بنا
ہے یہ دھات گرمی سے گیس کی شکل میں
بدل گئی ہے۔ اور ٹھنڈی ہو کر شیشے پر جم
گئی ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ یہ تار جب بھی گرم
ہو کر سفید ہو جاتا ہے تو تار کے ذرّے
یا ایٹم اتنی تیزی سے حرکت کرنے لگتے ہیں کہ
سطح پر کہیں کہیں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گیس بن
جاتے ہیں۔ اس تار کا یہ حصّہ جہاں سے یہ
ذرّے یا ایٹم الگ ہوئے ہیں پتلا ہونے
لگتا ہے اور پھر کسی دن ٹوٹ جاتا ہے
اس طرح تار کی زندگی مختصر ہو جاتی ہے۔
اس خرابی کو دور کرنے کی بھی تدبیریں
کی گئیں۔ اس سلسلے میں بھی بہت سے تجربے
کیے گئے۔ ایک تجربہ کامیاب ہوا۔ یعنی یہ کہ
بلب میں کوئی سی بھی گیس بھر دی گئی تو تار
چاہے کتنا ہی گرم ہو تار کی دھات کے
ذرّے حرکت نہ کریں گے۔ حرکت نہ کریں
گے تو بھاپ بن کر اڑیں گے بھی نہیں۔ اس
مقصد کے لیے نائٹروجن اور آرگن گیس
بہت مناسب معلوم ہوئے۔

لیکن قمر میاں بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی
گیس کی بدولت ایک مسئلہ تو حل ہو گیا مگر
دوسری مشکل کا سامنا ہوا۔ یہ تو میں ابھی
بتا چکی ہوں کہ تار سے روشنی جبھی پھوٹتی
ہے جب تار کافی گرم ہو جائے اور یہ گرمی
روشنی میں بدل جائے۔ بلب میں گیس بھری
گئی تو تار کی گرمی اس گیس کی وجہ سے
بلب کے باہر جانے لگی۔ اس لیے ایسا
گیس استعمال کیا گیا جو بلب کی حرارت
یا گرمی کو کم سے کم باہر نکالے۔
مگر قمر میاں ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ دیکھو
اس بلب میں دو طرح کے عمل ہوتے ہیں۔
(۱) بجلی کی قوت گرمی یا حرارت میں تبدیل
ہوتی ہے۔ (۲) یہ گرمی یا حرارت روشنی
میں بدل جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ
بجلی کی جتنی قوت بلب میں پہنچائی جاتی ہے
وہ پوری کی پوری خرچ بھی ہوتی ہے کہیں
ضائع تو نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ بجلی کی
اس قوت سے جتنی گرمی پیدا ہونی چاہیے
اتنی پیدا ہو رہی ہے؟ اور اس حرارت کو
روشنی کی جس مقدار میں بدلنا چاہیے اتنی

ہی مقدار میں بدل رہی ہے؛
شروع شروع میں جو بلب بنائے گئے ان
میں روشنی والے نازک تاروں کو کسی اور
دھات کے موٹے تار کے جنگلے پر لپیٹ
دیا جاتا تھا۔ اس طرح بجلی کی طاقت کافی
مقدار میں خرچ ہوتی تھی۔ گرمی یا حرارت
بھی بے کار جاتی۔ اس خرابی کو دور کرنے
کے لیے روشنی والے تار کو لچھے کی شکل میں
استعمال کرنے لگے۔ دو تین فٹ لمبے تار کو
لپیٹ کر لچھا بنا لیا جاتا۔

مگر اب لوگوں کو ایک اور شکایت پیدا
ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ تار سے نکلنے
والی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ کام کرنے
سے آنکھوں پہ بار پڑتا ہے پھر اس روشنی
پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔
سائنسداں پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں
نے طے کیا کہ بلب کی اندرونی سطح کو
میلا کر دیا جائے۔ اس سے روشنی بجائے
اس کے کہ ایک مرکز کے پورے بلب سے پھوٹتی
ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں پر بھی بار
نہیں پڑتا۔ اس طرح کے دودھیا سے

بلب کا استعمال برابر بڑھ رہا ہے۔

اور بھئی قمر میاں یہ سائنس داں بھی بالکل آپ
کی طرح سیماب صفت ہوتے ہیں۔ نچلا تو بیٹھا ہی
نہیں جاتا۔ ایک کام پورا کیا کہ فوراً دوسرے
پہ ہاتھ ڈال دیا۔ اور کچھ نہیں تو پہلے ہی کام
کو بہتر بنانے کی، اسے اور ترقی دینے کی
سوچنے لگے۔

انھوں نے سوچا بلب سے روشنی تو حاصل
ہو جاتی ہے مگر تار کو گرم کرنے کے لیے
بجلی کی جتنی طاقت مہیا کی جاتی ہے اس کا
بس دسواں حصہ روشنی میں تبدیل ہوتا ہے
باقی طاقت کو ضائع ہونے سے کس طرح بچایا
جائے۔ اس کے علاوہ دو چیزیں وہ اور
چاہتے تھے (۱) کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے
کہ بلب کا شیشہ گرم نہ ہو اور (۲) روشنی
سورج کی روشنی سے ملتی جلتی ہو۔

انھوں نے پتہ چلایا کہ بلب کی جگہ اگر ایسے
ٹیوب استعمال کیے جائیں جن میں سے گیس
خارج ہو گئی ہو تو بلب میں استعمال ہونے والی
بجلی کی قوت سے حاصل ہونے والی روشنی
کی چوگنی بلکہ چھ گنی مقدار حاصل ہو گی اس طرح

کے ٹیوب کا نام انھوں نے گیس ڈسچارج ٹیوب رکھا۔

ان نلکوں میں کوئی مناسب گیس بھری ہوتی ہے۔ مثلاً سوڈیم دھات یا پارہ کے بخارات یا نیان (NEON) گیس۔ نلکے کے دونوں سرے کسی دھات سے بند کیے جاتے ہیں۔ جب ان کے ذریعے نلکے میں برقیہ یا الیکٹرون (ELECTRON) کی لہر یا رو دوڑائی جاتی ہے تو اندر بھری ہوئی گیس برقیا دیے جاتے ہیں دوسرے لفظوں میں گیس کے ذروں پر بجلی کی لہر یا رو کا اثر پڑتا ہے وہ حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور روشنی کی شعاعیں نکلنے لگتی ہیں۔

بجلی برقیہ یا الیکٹرون کی لہر پیدا کرنے کے لیے یا تو منفی پلیٹ کو بجلی کی مدد سے بہت زیادہ گرم کیا جاتا ہے۔ یا دونوں پلیٹوں کے درمیان اتنا دباؤ پیدا کیا جاتا ہے کہ منفی پلیٹ سے برقیے ذرے نکل کر بہنے لگتے ہیں۔ نلکے سے نکلنے والی روشنی کے رنگ کا انحصار اس گیس پر ہوتا ہے جو نلکے کے اندر بھری جاتی ہے۔ تم نے نیان گیس سے بھرے ہوئے نلکوں سے سرخ روشنی نکلتی ہوئی دیکھی ہوگی۔ سوڈیم یا پارہ سے بھرے نلکیوں یا ٹیوبوں سے سڑکوں اور راستوں کو روشن کیا جاتا ہے۔

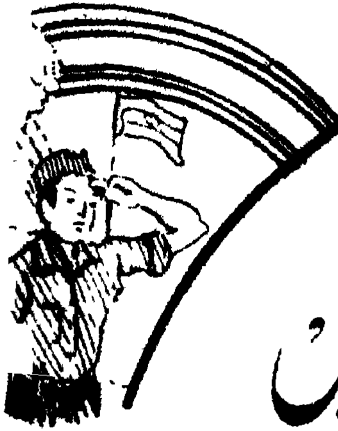
نلکے میں اگر کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھری جائے تو روشنی دن کی روشنی سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں گیس کو بار بار بدلنا پڑتا ہے۔ ویسے سوڈیم یا پارے کے بخارات کے ساتھ ارگان گیس اور نیان گیس ملا دیے جائیں تو بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے نلکے یا ٹیوب گھروں میں استعمال نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ان کی روشنی میں رنگ بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہاں اس خرابی کو دور کر کے اور دودھ جیسی روشنی حاصل کر کے انھیں گھروں میں استعمال کر سکتے ہیں۔

پارے کے بخارات سے نکلنے والی سبزی مائل روشنی کے ساتھ ساتھ ایسی شعاعیں بھی نکلتی ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ انھیں بالائے بنفشئی شعاعیں کہتے ہیں۔ ان کو بعض چیزوں میں سے گزارا جائے تو سفید روشنی بن کر نکلتی ہیں۔ اس کے لیے ڈسچارج ٹیوب پر ایک خاص

مرکب کا لیپ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح چھن کر آنے والی روشنی سورج کی روشنی جیسی لگتی ہے۔ ایسے نلکوں یا ٹیوبوں کو فلورسینٹ (FLURES ENT) ٹیوب کہتے ہیں۔ ان سے نکلنے والی روشنی صاف ہوتی ہے۔ نقصان پہنچانے والی بالائے بنفشی شعاعوں سے پاک ہوتی ہے۔ یہ ٹیوب چاہے کتنی دیر تک جلایے گرم نہ ہوں گے
اس ٹھنڈی روشنی کا سایہ بھی کم گہرا ہوتا ہے۔ آنکھوں پر بار بھی نہیں پڑتا اور قمر میاں آپ جتنی دیر چاہیں اس روشنی میں کام کر سکتے ہیں۔

قمر میاں دیر تو ہو گئی ہے پر اب یہ بھی سُن لیجیے کہ بلب کی ایجاد کے سلسلے میں کون سی چیز کب ایجاد ہوئی۔

- ۱۸۶۵ء کاربن آرک لیمپ بنائے گئے۔
- ۱۸۷۹ء کاربن لگے تار استعمال کیے گئے۔
- ۱۹۰۵ء ہوا خارج کر کے ٹینٹالم دھات کا تار استعمال کیا گیا
- ۱۹۰۹ء ہوا خارج کر کے ٹنگسٹن دھات کا تار استعمال کیا گیا۔
- ۱۹۱۲ء گیس بھرے ہوئے بلب لچھے دار تار کے ساتھ بنائے گئے۔
- ۱۹۶۵ء لچھے دار تار استعمال ہوئے۔
- ۱۸۹۵ء کاربن ڈائی آکسائیڈ ڈسچارج ٹیوب بنائے گئے۔
- ۱۹۳۴ء سوڈیم کے بخارات استعمال ہوئے۔
- ۱۹۵۷ء مندرجہ بالا ٹیوب میں ترمیم کی گئی۔
- ۱۹۶۵ء پارے کا استعمال۔
- ۱۹۶۵ء پارے کو استعمال کر کے فلورسینٹ ٹیوب بنائے گئے۔



جناب عادلؔ کہلگانوی

امن کا ہم پرچم لہرائیں

ہم نفرت کا بھانڈا پھوڑیں ظلم و ستم کے بندھن توڑیں
ٹوٹ گئے جو رشتے جوڑیں گیت امن کے ہم سب گائیں
امن کا ہم پرچم لہرائیں

گوتم اور گاندھی کی زمیں پر جو تھے شانتی کے پیغمبر
کرنے نہ پائے بدامنی گھر سب کو یہ پیغام سنائیں
امن کا ہم پرچم لہرائیں

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ہندی ہیں بھائی بھائی
پھر کیوں ہو آپس میں لڑائی مذہب کا مطلب سمجھائیں
امن کا ہم پرچم لہرائیں

بھارت ماں کی آشا ہم ہیں نہیں کسی سے ہم کچھ کم ہیں
سب سے آگے رہے قدم ہیں دیش کا اونچا نام اُٹھائیں
امن کا ہم پرچم لہرائیں

بائیسکل یا چھتری

محترمہ ہاجرہ بیگم



کوپن ہیگن کا شہر ڈنمارک کی راجدھانی ہے اس کے بیچوں بیچ ایک اونچا مینار ہے۔ یہ مینار تقریباً شہر کے ہر حصے سے نظر آتا ہے۔ جب کوئی گھر سے باہر نکلنے والا ہوتا ہے تو اس مینار کی طرف ایک نظر ڈال لیتا ہے۔ اس لیے کہ اس مینار کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آئندہ چند گھنٹوں میں موسم کیسا ہوگا۔

جب موسم اچھا ہونے کی توقع ہوتی ہے تو اس مینار پر ایک لڑکی سائیکل چلاتی نظر آتی ہے لیکن جب بارش کا امکان ہو تو سائیکل والی لڑکی کا مجسمہ غائب ہوجاتا ہے اور ایک چھتری والا مجسمہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

ڈنمارک کا ملک اسکنڈی نے وین یعنی شمال مغربی یورپ کے ملکوں میں واحد ملک ہے جہاں اونچے پہاڑ نہیں ہیں بلکہ میدان ہیں اور سبزہ زار ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈنمارک میں سائیکلوں کا رواج حد درجہ ہے۔ ۱۲ سال پہلے جب میں کوپن ہیگن آئی تھی تو مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس شہر میں جتنی آبادی ہے (یعنی ۱۵ لاکھ کے قریب) تقریباً اتنی ہی سائیکلیں بھی ہیں!!

اب ۱۲ سال بعد کوپن ہیگن کی آبادی بھی بڑھ گئی ہے یعنی ۲۰ لاکھ کے قریب ہوگئی اور موٹروں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوگئی ہے لیکن سائیکلوں کی افراط اب بھی ویسی ہی ہے۔ مرد عورت، لڑکا، لڑکی، بوڑھا جس کو دیکھو وہ سائیکل پر نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹانگوں کا استعمال یہ لوگ بھول گئے ہیں۔ عورتوں کی سائیکلوں پر پیچھے "کیریئر" پر چھوٹی سی گول کرسی

بچوں کے بیٹھنے کے لیے لگی ہے۔ اگر کہیں یہ کرسی کا نمونہ ہندوستان پہنچ جائے تو بہت ہی مقبول ہو۔

کوپن ہیگن بھی بہت بڑی بندرگاہ ہے ایک جگہ سمندر کے ساحل پر کالے پتھر کا بنا ہوا جل پری کا مجسمہ لگا ہے۔ ڈنمارک کا سب سے مشہور افسانہ نگار ہینز کرسچن اینڈرسن[1] تھا جس نے بچوں کے لیے بہترین افسانے لکھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک "بدصورت بطخ کا بچہ" "شہنشاہ کے جادو کے کپڑے" وغیرہ دنیا بھر کے بچوں کو محبوب ہیں۔ ان ہی قصوں میں سے ایک جل پری شہزادی کے بارے میں بھی ہے۔ کوپن ہیگن کے لوگوں نے ہینز اینڈرسن کی یادگار میں جل پری کا مجسمہ نصب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص اس مجسمہ کو چوم لیتا ہے وہ ضرور دوبارہ لوٹ کر آتا ہے۔

کوپن ہیگن سے چند میل دور وہ تاریخی مقام ہے جہاں شہزادہ ہیملیٹ رہتا تھا جس کا قصہ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامہ میں لکھا ہے۔

ڈنمارک کے لوگ نہایت محنتی اور ہنرمند ہوتے ہیں۔ کوپن ہیگن میں ہمیشہ ایک نمائش لگی رہتی ہے جس میں ملک کی کاری گری کے بہترین نمونے، کشیدہ کاری، چمڑے کے کام سے لے کر فرنیچر اور مکان میں استعمال کی تمام چیزوں کے ڈیزائین رکھے رہتے ہیں۔ دور دور سے لوگ آکر ان نمونوں کو دیکھتے اور چیزوں کے آرڈر دیتے ہیں۔

ڈنمارک کا مکھن، پنیر، انڈا اور گوشت بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کو جاتا ہے۔ دودھ کی یہاں اس قدر افراط ہوتی ہے کہ بالائی اور مکھن نکالنے کے بعد جو چھاچھ بچتا ہے وہ سوروں کو ڈال دیا جاتا ہے اگر کسی ہوٹل میں آپ چائے پینے کو مانگیں تو وہ مہنگی ہوگی لیکن دودھ سستا ہوگا۔

ایک زمانہ تھا جب ڈنمارک، ناروے، اور سویڈن کے لوگ تقریباً ایک ہی قوم مانے جاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ لوگ بہت ہی ہوشیار جہاز راں تھے۔ اور سمندر اور دریاؤں کے ذریعہ دور دور کے ملکوں میں جاتے تھے اور وہاں تجارت کر کے لوٹتے تھے۔ یہ لوگ اس وقت وائی کنگ کہلاتے تھے۔ اور انھوں نے یورپ کے

---

[1] جولائی ۱۹۶۵ء کے پیام تعلیم میں اینڈرسن پر بہت اچھا مضمون شائع ہوا ہے آپ نے نہ پڑھا ہو تو ضرور پڑھیے۔

اکثر ملکوں پر جیسے انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، فرانس، فن لینڈ، روس وغیرہ پر اپنا سکہ جما رکھا تھا۔
شمال میں علاوہ گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے یہ امریکہ کے اس حصہ تک جاتے تھے جو اب الاسکا کہلاتا ہے اور کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے کئی سو سال پہلے انھیں معلوم تھا کہ بحر اوقیانوس کے دوسرے ساحل پر خشکی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ صرف جزیرہ ہے یا برّاعظم۔
ان لوگوں نے خشکی کی راہ اپنی کشتیاں لے جانے کی ترکیب بھی دریافت کرلی تھی۔ اور جب وہ دریا چھوڑنا چاہتے تھے تو درختوں کے تنوں کو کاٹ کر رولر بنا لیتے تھے اور ان رولروں پر کشتیوں کو پھسلاتے ہوئے لے جاتے تھے۔

کہتے ہیں قسطنطنیہ میں آج بھی ایک چٹان پر ڈین لوگوں کی پرانی زبان میں ایک عبارت کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ وہاں تک تجارت کرنے جایا کرتے تھے۔

ہندوستان میں اب بھی ان ملکوں سے تجارت اور کاروبار ہوتا ہے۔ علی گڑھ میں سب سے پہلے بڑے پیمانے پر مکھن کا کارخانہ قائم کرنے والا شخص کے ڈینز بھی سویڈن کا باشندہ تھا۔ آج وہ زندہ نہیں لیکن اس کے نام کا مکھن اب بھی بڑے شوق سے لوگ کھاتے ہیں۔

جناب انور برہان پوری

ایک بچے کے تاثرات

بڑا ہو کے امی میں نہرو بنوں گا
کروں گا میں خدمت وطن کی کروں گا

غریبوں سے الفت ہمیشہ کروں گا
میں ان کی ہی خاطر جیوں گا مروں گا

مصائب سے ہرگز نہ گھبراؤں گا میں
مصائب سے ٹکرا کے بڑھتا رہوں گا

بدل دوں گا اپنے وطن کی میں قسمت
وطن کو میں جنّت بنا کر رہوں گا

مٹا کر رہوں گا میں تاریکیوں کو
سیاہ راستوں کو میں روشن کروں گا

کسی کی امانت میں کرنا خیانت
بُرا فعل ہے یہ میں اس سے بچوں گا

بڑھاؤں گا میں اپنی علمی لیاقت
پڑھوں گا تو پڑھ کر عمل بھی کروں گا

کبھی جھوٹ بولوں گا ہرگز نہ انور
جو سچ بات ہوگی وہی میں کہوں گا



جناب ابرار محسن

ڈاکو کی گرفتاری

(۴) آخری قسط

جگا میری کمر پر پیار سے گھونسا مار کر ڈاکوؤں کے ساتھ چلا گیا۔ وہی کل والا ڈاکو پھر آیا اور مجھ سے شراب مانگنے لگا۔ اس نے کہا۔

"جگا ہمیں بہت تھوڑی سی شراب دیتا ہے وہ کہتا ہے اکثر ڈاکو شراب کی ہی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں۔ مگر یار اندھے تجھے شراب پینے کی اجازت مل گئی ہے۔ تیری وجہ سے ہمیں بھی مل جایا کرے گی ــــ"

میں نے کہا: "ارے میں تو پیتا نہیں ہوں شراب۔ بس تو ہی پیا کر روز ایک بوتل ــــ"

ڈاکو نے خوش ہو کر مجھے گود میں اٹھالیا اور الماری میں سے بوتل نکال کر منہ سے لگا دی اور لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

جب وہ بے ہوش ہو گیا تو میں نے ٹارچ اٹھائی اور بے تحاشا جنگل سے باہر کی طرف بھاگا۔ جلد ہی پولس اسٹیشن کے قریب ہی بنے ہوئے ایک بنگلے کے پاس پہنچ گیا۔

"ضرور یہی پاپا کا بنگلہ ہوگا": میں نے سوچا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے ــــ؟" پاپا کی آواز سنائی دی۔

ان کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔

"ارے بیٹا تم ۔۔۔؟" انھوں نے تعجب سے کہا اور پستول کو جیب میں رکھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

"میں تو سمجھا تھا کہیں تمھیں بھی جگّا نے اسکول سے غائب کر دیا۔"

مجھے لے کر وہ اندر آئے اور امّی کو آواز دی۔ امّی بھی مجھ سے لپٹ گئیں اور بری طرح رونے لگیں۔

میں نے پاپا کو سب حال سنایا اور ان سے کہا وقار ٹھیک ہے فکر بالکل نہ کریں۔

"پھر تم اسے لائے کیوں نہیں؟" امّی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ابھی اگر اسے لے آتا تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

اور جب میں نے پاپا کو بتایا کہ سب انسپکٹر کوڈوں سے ملا ہوا ہے اور کل رات کو پولس اسٹیشن حملہ ہونے والا ہے تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ بڑبڑائے۔ "تو ...تا ہوں اسے گرفتار۔"

"نہیں پاپا!" میں نے کہا۔ "ایسا نہ کریں ورنہ جگّا چوکنا ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" پاپا کچھ سوچ کر بولے۔

"رحمو دادا کہاں ہیں؟" میں نے پاپا سے پوچھا۔ "وقار نے اپنے خطوں میں ان کی تعریف لکھی تھی۔"

"ہاں بیٹا۔" پاپا بولے۔ "بڑا ہی وفادار نوکر ہے۔ وقار کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ وہ یہاں صرف دن میں ہی آتا ہے۔ شام ہوتے ہی اپنے گاؤں چلا جاتا ہے۔ میں بھی اس کا خیال رکھتا ہوں۔ وہ دیکھو سامنے والا کمرہ اس کے لیے ہی خالی کرا دیا ہے تاکہ بے چارہ دن میں جب تھک جائے تو آرام کر سکے۔"

میں کمرہ کھول کر اندر گیا۔ بس ویسے ہی وہاں ایک پلنگ تھا جس پر سرخ رنگ کا ایک رومال پڑا ہوا تھا۔ میں نے پاپا کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ دنگ رہ گئے۔

"پاپا!" میں نے کہا۔ "کل رات کو ہوشیار رہیں پولس اسٹیشن پر حملہ ہوگا۔ اور پرسوں دن کے بارہ بجے اپنے تمام سپاہیوں کو لے کر باہر فلاں جگہ مل جائیے میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ جنگل کی طرف آنے سے پہلے وہ کام ضرور کر لیں جو میں نے ابھی کہا ہے۔"

"پرسوں کیوں کل ہی کیوں نہیں ـــ ؟" پاپا بے چینی سے بولے۔

"بس ایک وجہ ہے" میں نے کہا "کل میں ایک بات کا یقین کرنا چاہتا ہوں۔ جلدی کرنے سے ہم سے غلطی ہو سکتی ہے ـــ اچھا اب میں چلتا ہوں"

"نہیں۔ نہیں۔ میں اسے نہیں جانے دوں گی ڈاکوؤں میں" امی مجھ سے لپٹ گئیں۔

"اس کا جانا ٹھیک ہے۔ ورنہ وقار کبھی نہ آسکے گا" پاپا نے انھیں سمجھایا اور امی روتی رہ گئیں۔

"تو پاپا۔ پرسوں دن کے بارہ بجے جب آپ کو جنگل کی طرف سے فائر کی آواز آئے تو آپ وہ کام کر کے سپاہیوں کو لے کر جنگل کی طرف آجائیں" میں نے کہا اور پھرتی سے باہر نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگا۔

عمارت کا دروازہ بند تھا۔ میں نے تین بار پکارا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر وہی ڈاکو بے ہوش پڑا تھا۔ میں وقار کے پاس گیا اور جلدی جلدی اسے سارا حال سنا کر جگا کے کمرے میں آ لیٹا کیونکہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جگا اور اس کے ساتھی شور مچاتے ہوئے اندر آگئے۔ آج وہ شاید بہت سا روپیہ لوٹ کر لائے تھے اس لیے سب ناچ رہے تھے، کود رہے تھے۔ میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا جب اُجالا پھیلنے لگا تو جگا نے ان لوگوں سے کہا۔

"اب تم لوگ آرام کرو۔ مجھے بھی جانا ہے۔ اور ہاں، یاد رکھو۔ آج رات کو پولس اسٹیشن پر۔"

جگا چلا گیا۔ ڈاکو بھی سب سو گئے اس لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ میں چپکے سے اٹھا اور وقار کے پاس پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

"کل تم آزاد ہو جاؤ گے" میں نے وقار سے کہا۔

"وہ کس طرح ـــ ؟"

پھر میں نے اُسے سب کہانی سنائی۔ وہ بھی حیران رہ گیا۔ کہنے لگا۔

"اچھا تو یہ بات ہے ـ بھیا تم پڑھنے لکھنے میں تو بالکل بدھو تھے مگر اس کام میں بڑے ہوشیار نکلے۔"

"تم نے خوب پکڑا بدمعاش کو۔ میں تو ہمیشہ دھوکے میں رہتا۔" وقار بولا۔

"بھیا، پاپا نے مجھے پوچھا ہوگا۔ امی خوب روئی ہوں گی" وقار نے کہا۔

میں نے جھوٹ بول دیا "وقار، امی کو جب پتہ چلا کہ تم اور میں ڈاکوؤں کو گرفتار کرانے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئیں۔"

وقار خوش ہو گیا۔ اگر میں اسے بتاتا کہ امی

اس کے لیے رو رہی تھیں تو شاید وہ بھی رونے لگتا۔

رات کے وقت جگّا واپس آیا۔ سب ڈاکوؤں نے مل کر کھانا کھایا اور جگّا نے مجھ سے کہا:

"اے بھئی اندھے، آج بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہیں"

جگّا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے ڈاکو بھی سوائے ایک ڈاکو کے جو پہرے پر رہتا تھا۔ مگر آج رات پہرے پر کوئی دوسرا ڈاکو تھا۔ اس لیے اس نے شراب نہیں مانگی بلکہ بندوق لیے برابر ٹہلتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے وفادار سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر میں جاگ رہا تھا۔ آدھی رات گزرنے کے بعد اچانک فائروں کی آواز سنائی دی۔

"ہو گئی ٹکر۔" میں بڑبڑایا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی ڈاکو ہانپتے کانپتے واپس آ گئے۔ ان میں سے کئی کراہ بھی رہے تھے۔

جگّا کے کمرے میں سب جمع ہوئے۔ جگّا گرج رہا تھا۔

"آج پہلی بار جگّا کی ہار ہوئی ہے۔ پولس پہلے ہی سے تیار تھی۔ ہمارے کئی آدمی مارے گئے۔ معلوم ہوتا ہے سب انسپکٹر نمک حرام نکلا۔ اس نے پولس کو ہوشیار کر دیا ہوگا۔ میں پہلے اسی بدمعاش کو ختم کروں گا۔ [illegible] انسپکٹر کو بھی دیکھ لوں گا۔"

سارے ڈاکو خاموش کھڑے تھے۔ سر جھکائے ہوئے۔

"جاؤ اب آرام کرو۔ ابھی رات باقی ہے میں بھی آرام کروں گا۔" جگّا نے کہا۔

جب سب چلے گئے تو جگّا کراہنے لگا اور مجھے آواز دی "اندھے۔ سو گیا کیا۔؟"

"کیا ہے میرے آقا؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"آج میری انگلی زخمی ہوئی ہے تو کل میں مار ڈالا جا سکتا ہوں۔ کون جانے۔" جگّا نے کہا۔

"ہاں سردار" میں نے کہا "ڈاکوؤں کی جان ہتھیلی پر رہتی ہے۔"

"کاش میں صرف ایک بار اپنے بچے کو دیکھ سکتا۔!" جگّا بولا۔

"کون ہے وہ۔؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔ بس تو سو جا اب۔" جگّا نے بات کاٹ دی۔

اس وقت مجھے نیند آ گئی۔ صبح کے وقت آنکھ کھلی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ڈاکو سو رہے تھے۔ جگّا غائب تھا۔

میں نے وفادار سے کہا "تیار ہو جاؤ۔ اب وقت

قریب ہی آگیا ہے "۔

"میں تیار ہوں" وقار نے کہا۔

میں باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر غور سے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازے سے باہر گیا۔ ہاں ایک بات اور بتاؤں۔ دروازہ اندر سے تو کوئی بھی کھول سکتا تھا مگر باہر سے کھلوانے کے لیے تین آوازیں نکالنا ضروری تھا۔ میں باہر گیا۔ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے تین آوازیں نکالیں، دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ کئی ڈاکو کھڑے تھے۔ شاید میری آوازوں نے انھیں جگا دیا ہوگا۔

"کہاں گیا تھا ۔؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"ارے تمھیں نہیں معلوم"۔ میں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "سردار صبح مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ انھوں نے انسپکٹر اور سب انسپکٹر دونوں کو ختم کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ میرے ساتھیوں سے کہہ دو خوب شراب پئیں اور خوشی منائیں"۔

ڈاکو سوچنے لگے کہ سردار اندر سے کو کیوں لے گیا تھا مگر میں نے جیب سے ایک سرخ رنگ کا رومال نکال کر انھیں دکھایا۔

"دیکھو۔ سردار نے یہ رومال بھی مجھے دیا ہے تاکہ تم میری بات کو جھوٹ نہ سمجھو" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ یہ سردار ہی کا رومال ہے" وہ سب بولے اور سردار کے کمرے میں جا کر الماری میں سے بوتلیں نکال کر خوب پینے لگے۔ وہ خوب اچھل اچھل کر گا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ نشے کی زیادتی سے گر پڑے۔

میں نے جلدی سے وقار کو باہر نکالا اور سردار کے کمرے میں رکھی ہوئی بندوقوں میں سے ایک اٹھا کر باہر آیا اور جنگل سے باہر آکر ایک ہوائی فائر کر دیا تقریباً ۱۵ منٹ میں پولس کی لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔ پولس والے اور بابا جنگل میں گھس پڑے۔ انھیں روکنے والا کوئی بھی نہ تھا کیونکہ جنگل کی حفاظت کرنے والے ڈاکو بھی شراب کے نشے میں چور تھے۔ سب نے ہی شراب پی تھی کیونکہ سردار نے انھیں اجازت دے دی تھی۔

میں پولس کو عمارت کے پاس لے گیا۔ تین بار چلانے پر دروازہ کھلا پولس والوں نے ڈاکوؤں کو جکڑ لیا۔ اس کے بعد عمارت کی تلاشی لی گئی۔ اس میں سے لاکھوں روپیے کے نوٹ اور سونے چاندی کے زیور نکلے۔ بہت سی بندوقیں نکلیں جنھیں پولس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

دروازہ کھلنے کا جادو یہ تھا کہ دروگا دُوں والے

ایک کوٹھری میں قید تھے۔ ان کا کام بس یہ تھا کہ میں آوازیں سنتے ہی ایک زنجیر کھینچ لیں جس کا سرا کوٹھری میں لٹک رہا تھا۔ اسی زنجیر کے کھینچے جانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ بہر حال ان گاؤں والوں کو بھی آزاد کرایا اور ڈاکوؤں کو لے کر باہر آئے۔

پاپا نے بتایا کہ فائر کی آواز سنتے ہی انھوں نے رمو دادا کو گرفتار کر لیا جس کی نقلی سفید داڑھی کے پیچھے جگا کا ڈراؤنا چہرہ تھا۔ کل رات کو ڈاکوؤں کے حملے سے پہلے ہی انھوں نے سب انسپکٹر کو حوالات میں ڈال دیا تھا۔

سب ڈاکوؤں کو بھی حوالات میں ڈال دیا گیا۔ وہاں جگا بھی تھا۔

"ارے اندھے تم۔ ؟" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"ابے تو خود ہوگا اندھا۔ میں کیوں ہوتا" میں نے کہا اور گھر چلا آیا۔

میں وقار کو اپنی اور پاپا کے سامنے ہی بتا رہا تھا "میں دراصل تمھارے خطوں سے ہی کھٹک گیا تھا تم نے لکھا تھا کہ رمو دادا صرف دن ہی میں آتے ہیں گھوڑے پر۔ تو جگا بھیس بدل کر یہاں رہ رہا تھا تاکہ ہر بات اسے معلوم ہو سکے۔ پولس اسٹیشن پر تو اس کا ایک جاسوس تھا ہی۔ اور اس دن اس کے کمرے میں سرخ رومال دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہی جگا ہے۔ کیونکہ میں نے اس کے گلے میں ایسا ہی رومال بندھا ہوا دیکھا تھا"۔

"بیٹے کیا تمھارے ساتھ کوئی لڑکا اسلم پڑھتا تھا۔ ؟" پاپا نے پوچھا۔

"ہاں پاپا۔ بے چارے نے میری بڑی مدد کی۔ مجھے کرائے کے لیے دو روپے دیئے" میں نے کہا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں"۔

"وہ جگا کا لڑکا ہے۔ اس کا اپنا بیٹا۔ جگا نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس کا خیال رکھوں اور اسے یہ کبھی نہ معلوم ہونے دوں کہ اس کا باپ ڈاکو تھا۔ جگا ہر مہینے اس کی فیس اسکول بھیج دیتا ہے مگر اسلم کو نہیں معلوم کہ دراصل یہ فیس اس کا اپنا باپ، مشہور ڈاکو جگا ہی بھیجتا ہے"۔ پاپا کہہ رہے تھے اور ہم حیرانی سے سن رہے تھے۔

"جگا کو پھانسی ضرور ہو جائے گی"۔ انھوں نے کہا۔ "اور ہاں تمھیں اسے گرفتار کرانے کا انعام دس ہزار روپے ملنے والا ہے"۔ — "اس کی ہم موٹر خریدیں گے"۔ وقار نے خوشی سے اچھل کر کہا۔

"نہیں" میں نے دھیرے سے کہا "یہ روپیہ اسلم کی تعلیم پر صرف کیا جائے گا۔ سب کا سب"۔ "شاباش بیٹے" پاپا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی۔ بس دو دن بعد اسلم کو بھی یہیں بلا لوں گا"۔

جناب پروفیسر امانت

پیارے نعیم اُٹھو!

پیارے نعیم اُٹھو! سورج نکل چکا ہے
دُنیا کا رنگ دیکھو بالکل بدل چکا ہے
اُڑتے ہوئے پرندے باغوں میں جا رہے ہیں
مل مل کے گیت گاتے خوشیاں منا رہے ہیں
یہ ننھی مُنی چڑیاں تم کو اُٹھا رہی ہیں
چوں چوں کا اپنی نغمہ تم کو سُنا رہی ہیں
آکاش کے ستارے بے نور ہو گئے ہیں
جاگے تھے رات ساری اب تھک کے سو گئے ہیں
مشرق میں تازہ سورج بیدار ہو چکا ہے
دریائے نور میں وہ مُنہ ہاتھ دھو چکا ہے
کروٹ نہ بدلو یوں تم آنکھیں ذرا تو کھولو
لو چائے بن چکی ہے مُنہ ہاتھ اُٹھ کے دھولو
امی بُلا رہی ہیں آواز دے رہی ہیں
'لو چائے اُٹھ کے پی لو' تم سے وہ کہہ رہی ہیں
پیارے نعیم! اُٹھو!



ٹیبور سیکلج

ترجمہ: جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا

(۱۰)

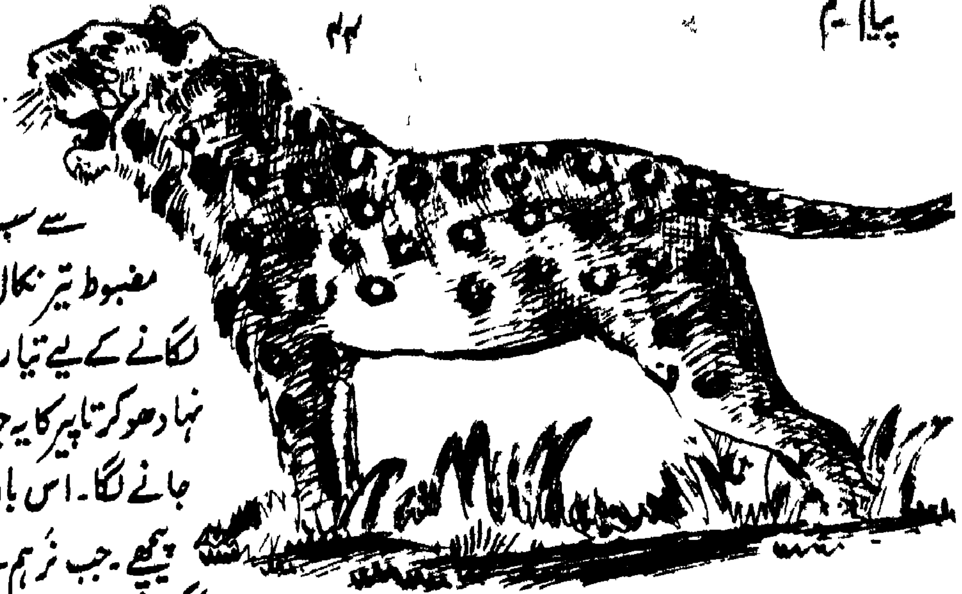
مجھے یقین تھا کہ جاگور کے کنارے پر پہنچتے ہی تمام دوسرے جانور ہڑبڑا کر بھاگ پڑیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بندر اسی طرح نہاتے رہے، اسی طرح کھیلتے رہے۔ مور خور نے گردن اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ دوسرے جانور بھی جاگور کی آمد سے بے نیاز اطمینان سے پانی پیتے رہے۔ کنارے پر پہنچ کر جاگور نے ادھر اُدھر نظر ڈالی اور ذرا الگ تھلگ سی جگہ ڈھونڈھ کر اطمینان سے پانی پینے لگا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کومے واوا کی طرف دیکھا۔

"جنگل میں صبح اور شام پانی پینے کا وقت ہوتا ہے اُس وقت کوئی جانور ایک دوسرے کا دشمن نہیں رہتا۔ کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرتا۔" کومے واوا نے میرے کان میں کہا۔

اب میری سمجھ میں آگیا: جنگل کے قدرتی قانون کے مطابق صبح اور شام کا وقت، امن اور سلامتی کا وقت ہے۔ خاص طور پر وہ وقت جب جانور پانی پینے کے لیے نکلتے ہیں۔ اُس آدمی کی سمجھ میں یہ بات مشکل ہی سے آئے گی جو جنگل اور اس کے رازوں سے واقف نہ ہو۔

پانی پینے کے بعد جاگور نے سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمبی انگڑائی لی۔ اپنے پچھلے پیروں



نے اپنے تیروں میں
سے سب سے زیادہ تیز اور
مضبوط تیر نکال لیا تھا اور نشانہ
لگانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔
نہا دھو کر تاپیر کا یہ جوڑا جنگل کی طرف
جانے لگا۔ اس بار مادہ آگے تھی۔ نر
پیچھے۔ جب نر ہم سے کوئی بیس گز کے
فاصلے پر آ گیا تو کوے واوا نے اپنی پوری طاقت
سے کمان کا چلہ کھینچ کر تیر چھوڑ دیا۔ سنسناتا ہوا
تیر نر تاپیر کے پہلو میں دل کے قریب پیوست ہو گیا۔
نشانہ اتنا صحیح اور کامیاب تھا کہ تاپیر لڑکھڑا کر
اسی جگہ گر پڑا اور دم توڑ دیا۔

چند لمحے بعد ہم دونوں پیڑ سے نیچے اترے۔
تاپیر کو اٹھا کر لے جانا چاہا۔ مگر تو بہ کیجیے اٹھانا تو
در کنار ہم دونوں اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکے۔
مجبوراً اسے وہیں چھوڑ کر تاپیر کو گھسیٹتے ہوئے
کیمپ میں لائے۔ تاپیر کی کھال اتنی سخت اور
ہوتی ہے کہ اتنی دور تک جھاڑیوں اور کا
میں رگڑ کھانے کے بعد بھی اس پر خراش
نہ آئی۔

تاپیر کو دیکھ کر دوسرے ساتھی

کو تان کر دن بھر کی سستی اتاری۔ پورا منہ کھول کر
بڑی سی جمائی لی اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف
خاموشی کے ساتھ لوٹ گیا۔

جاگور کے جانے کے بعد ایک اور جانور آیا۔
یہ تاپیر تھا۔ کافی بڑا اور تندرست۔ اس کے پیچھے
اس کی مادہ آ رہی تھی۔ یہ قد میں اس سے کچھ چھوٹی
تھی۔ ان کا قد بڑے جنگلی سور سے بھی کچھ زیادہ
ہی تھا۔ تھوتھنیوں کے آگے ان کی لمبی ناکیں لٹکی
ہوئی تھیں۔ گینڈے جیسے کھال والا صرف یہی ایک
جانور امیزن کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔

تاپیر کے اس جوڑے کو اکیلے پانی میں نہاتا
اور لوٹتا ہوا چھوڑ کر باقی جانور ایک ایک کر کے
جنگل کی طرف لوٹنے لگے۔ اس وقت تک کوے واوا

خوشی ہوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ سب لوگ دو دن کی خوراک کی طرف سے بے فکر ہو گئے۔

چار آدمیوں نے تاپیر کو صاف کرنے کا کام سنبھالا۔ میں نے کومے واوا کی مدد سے اس کے ٹکڑے کئے اور ان کو درخت کی شاخوں پر لٹکا دیا۔ اس کی ایک ایک ران اتنی بھاری تھی کہ دو آدمی بڑی مشکل سے اٹھا کر شاخ پر لٹکا سکے

ہم اس سوچ میں تھے کہ گوشت کو اسی وقت بھون لیا جائے یا اسی طرح شاخوں پر لٹکا رہنے دیا جائے اور بھوننے کا کام صبح کیا جائے۔ دراصل ہم سب تھک چکے تھے اور گوشت بھوننے کا کام ایک بوجھ سا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے کومے واوا کی رائے لی۔

"بزرگ مالوا کہتے ہیں کہ بھنے ہوئے گوشت پر آدمی کی نیت خراب ہوتی ہے اور کچے گوشت پر درندوں کی" کومے واوا نے کہا۔

ے واوا کا مطلب سمجھ گئے اور گوشت کو حفاظت سے لٹکا دیا گیا۔

*

ے سے پہلے کومے واوا کہا۔

"نک چپ! ہماری ملاقات کا یہ آخری دن ہے۔ دوپہر تک تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو جاؤ گے۔"

وہ یہ بات مسکرا کر کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہمارے جانے کا اس کے دل پر بہت اثر ہے۔

جب تاروں کی روشنی پھیکی پڑنے لگی اور مشرق کی طرف کچھ کچھ سفیدی نظر آنے لگی تو کومے واوا بولا:

"نک چپ: صبح ہو چلی ہے۔ چلو کچھ جنگلی پھل ہی ڈھونڈھ لائیں۔ معلوم ہوتا ہے اس علاقے میں اناناس بہت ہیں۔"

میں فوراً تیار ہو گیا۔ چند منٹ بعد ہم جنگل میں تھے اور اسی راستے پر چل رہے تھے جو ہم نے کل شام بنایا تھا۔ کافی دیر تک ہم دونوں یوں ہی چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر میں نے کومے واوا سے پوچھا:

"واوا! تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ اس علاقے میں اناناس ضرور ملیں گے؟"

"کل جو تاپیر ہم نے شکار کیا تھا نا؟ اس کی ناک پر اناناس کے کانٹے چبھے ہوئے تھے اس کی ناک کی کھال بھی کافی موٹی اور کھردری ہوتی

ہے۔ اسی وجہ سے یہ ننھے ننھے کانٹے تمہیں نظر نہ آئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ مرنے سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ پہلے اُس نے اناناس کھائے تھے۔"

"یہ کیسے معلوم کر لیا تم نے؟"

"اُس کی اوجھڑی میں سے اناناس کے تازے پتے نکلے تھے" کوے واوا نے بتایا۔

اس وقت میں کوے واوا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا۔ کتنا اچھا مشاہدہ ہوتا ہے ان لوگوں کا۔

یکایک کوے واوا رک گیا۔ اس نے اپنا رُخ اس طرف کر لیا جدھر چند بڑے پیڑ کھڑے تھے اور اوران سے آگے ایک کھلا ہوا گھاس کا میدان تھا۔ پھر اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور میدان کی طرف جھانک کر دیکھنے لگا۔

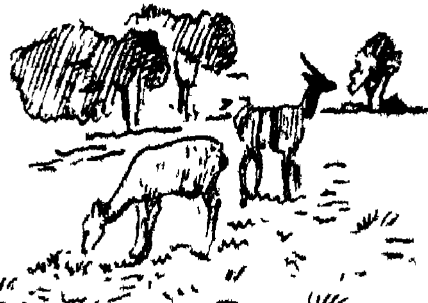
اُس نے پیچھے مڑکر مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پاس پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا جدھر وہ اشارہ کر رہا تھا۔۔ لمبے تڑنگے خوب صورت ہرنوں کا ایک جوڑا بیچ میدان میں مزے سے گھاس چر رہا تھا۔

"اس ہرن کا گوشت کیسا ہوتا ہے" میں نے پوچھا۔

"بہت ہی لذیذ۔"

"مارو نا پھر۔"

"ہرگز نہیں۔" کوے واوا نے ذرا تلخی سے کہا اور پھر اپنے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ میرے خیال میں یہ آواز اُن ہرنوں کی آواز کی نقل ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس آواز کو سُن کر دونوں ہرنوں نے اپنی گردنیں اٹھائیں، ہماری طرف دیکھا





اور چند قدم ہماری طرف بڑھ آئے۔ ان کی اس
حرکت کو دیکھتے ہی کوے داآوا نے اپنا تیر کمان اور
چاقو آہستہ سے زمین پر ڈال دیا اور آہستہ قدموں
سے ہرنوں کی طرف چلنے لگا۔ کوے داآوا کو اپنی طرف
آتا دیکھ کر دونوں ہرن رک گئے۔ کوے داآوا آہستہ
آہستہ چلتے ہوئے ہرنوں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔
ہرن جوں کے توں کھڑے کان ہلاتے رہے۔ کوے داآوا
نے دو تین قدم اور لیے اور ایک ہرن کی گردن کے
چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اس نے اس کی
پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ پٹھوں کو تھپ تھپایا اور پھر اپنے
دونوں ہاتھ اس کی گردن میں اس طرح ڈال دیئے
جیسے ہم اپنے گھر کی گائے یا گھوڑے کی گردن میں ڈال
دیتے ہیں۔ ہرن اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا۔ ایسا معلوم
ہو رہا تھا جیسے کوے داآوا کے پیار اور دلار سے وہ لطف
لے رہا ہو۔

"بڑے اچھے دوست ہیں یہ ہرن۔ نک چپ
آؤ تم بھی آجاؤ" کوے داآوا نے مجھے آواز دیتے ہوئے کہا
آہستہ آہستہ احتیاط سے قدم اٹھاتا میں دوسرے
ہرن کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا پیٹھ
تھپ تھپائی۔ یہ بھی پہلے ہرن کی طرح خاموش کھڑا
اپنی چھوٹی سی دم ہلاتا رہا اور ایک عجیب محبت بھرے
انداز میں میرے ہاتھ چاٹنے لگا — پھر نامعلوم کیوں
وہ ایک دم بھڑک اٹھا اور چند ہی قلانچوں میں
اپنے ساتھی سمیت جنگل میں غائب ہو گیا۔

"کتنے پیارے اور بھولے ہوتے ہیں یہ جانور۔
مجھے ان کی گردن اور پیٹھ سہلانے میں بڑا مزا آتا ہے۔
وہ تم سے کبھی نہیں بھاگیں گے۔ بس انھیں اتنا یقین
ہو جائے کہ تم ان کی طرف دوست کی حیثیت سے
آ رہے ہو" کوے داآوا نے کہا۔

میں نے تو اب تک کوے داآوا کو صرف ایک
شکاری کی حیثیت سے جانا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس
کے اور جنگلی جانوروں کے درمیان صرف وہی تعلق
ہے جو ایک شکاری اور شکار کے درمیان ہوتا ہے
اس واقعے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

میری حیرت کو کوے داآوا نے تاڑ لیا۔ بولا
"جہاندیدہ مالوآ کا کہنا ہے۔" ایک جانور
دوسرے جانور کا شکار اسی وقت کرتا ہے جب
بھوکا ہوتا ہے۔ انسانوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے"!

کوے داآوا کی زندگی کا یہ دوسرا اور انوکھا
رخ اب میرے سامنے آیا۔ میرے دل میں اس ننھے
شکاری کی قدر اور عزت کتنی ہو گئی بیان نہیں کر سکتا۔
واپس آ کر کوے داآوا نے اپنا تیر کمان اٹھایا۔

ہم پھر جنگل میں داخل ہو گئے اور آدھ گھنٹے تک چلتے رہے۔ سورج نکل آیا تھا۔ پیڑوں کی چوٹیاں سرخ اور سنہری کرنوں سے جگمگانے لگی تھیں جنگل میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی چڑیوں کی چہچہاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔

اس وقت تک ہم کافی چل چکے تھے۔ میں کچھ تکان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ کوے داوا نے شاید اس بات کا اندازہ لگالیا۔ وہ پانی کے ایک چھوٹے سے نالے کے پاس رک گیا اور بولا:

"نک چپ! آؤ سستالیں، پھر آگے چلیں گے"۔

میں تو خدا سے چاہتا تھا، فوراً بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"شہد پسند ہے تمھیں؟ نک چپ!"

"ہاں۔ شہد کی مٹھاس اور لذت کے کیا کہنے؟"

"انناس کے ساتھ بھی شہد کھایا ہے کبھی تم نے؟"

"نہیں، کبھی نہیں"۔

"کھاؤ گے تو بس ہونٹ چاٹتے رہ جاؤ گے"۔

"لیکن نہ تو یہاں شہد ہے اور نہ انناس۔ بلاوجہ زبانی مزے لینے سے فائدہ"؟ میں نے طنزاً کہا۔

"ایسا نہیں ہے میاں نک چپ! جنگل میں سب کچھ ہے۔ تم یہاں رکو۔ میں ابھی لاتا ہوں شہد۔ رہے انناس تو وہ مل ہی جائیں گے"۔

"کہاں سے لاؤ گے شہد؟ ہمیں بھی تو بتاؤ"؟

"بس تم بیٹھے بیٹھے دیکھتے رہو۔ ابھی آتا ہے شہد بھی"۔

"مانا کہ شہد کا چھتّا تم ڈھونڈھ لوگے۔ کسی اونچے پیڑ پر مل جائے گا۔ مگر یہ تو بتاؤ شہد نکال کر لاؤ گے کس چیز میں"؟

"اس کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ گھبراتے کیوں ہو"؟

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پاس ہی بانس کی ایک باڑی تھی۔ اس میں سے کوے داوا نے ایک خوب موٹا سا بانس کاٹا۔ اس بانس میں اس نے ایک لمبی سی پوری گانٹھ کے نیچے سے کاٹی۔ پھر اس پوری کا دوسرا سرا اس طرح کاٹا کہ دوسری گانٹھ پوری کے ساتھ لگی رہی۔ اس طرح کھلے منہ کی بوتل جیسی ایک نال بن گئی جس کا ایک منہ کھلا ہوا تھا اور دوسرا بند۔ اس نے اسی طرح کی ایک نال اور تیار کر لی۔ اس کے بعد وہ ایک پیڑ کے پاس گیا۔ یہ پیڑ کافی اونچا تھا۔ اس کی چھال بالکل سفید تھی۔ بارہ تیرہ فٹ کی اونچائی تک بالکل سیدھا چلا گیا تھا۔ کوے داوا نے اپنے چاقو کا پھل جڑ کے پاس زور سے ملا کر ٹوٹی ہوئی چھال کو چاقو کی

نوک سے ابھارا اور چٹکی سے چھال کو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ چھال اکھڑ آئی۔ وہ ذرا پیچھے ہٹا اور دونوں ہاتھوں سے چھال کو پکڑ ایک کرا جھٹکا دیا۔ چھال دور تک اُچلتی چلی گئی۔ پھر اس نے ایک اور زوردار جھٹکے سے چھال کو پیڑ سے الگ کر لیا۔ اس چھال سے اس نے ایک سُتلی بٹی اور بانس کی دونوں نالوں کے منہ کو ایک ایک سرے سے باندھ دیا۔ پھر اس سُتلی کو گلے میں اس طرح ڈال لیا کہ دونوں نالیں اس کی پیٹھ پر لٹکنے لگیں۔ بقیہ چھال کو اس نے اپنی کمر کے اردگرد لپیٹ لیا۔ اس کے بعد وہ مسکراتے ہوئے میرے پاس آیا اور نالیں دکھا کر بولا:

"ٹک چپ! دیکھو ان میں آئے گا شہد۔"

"مان لیا۔ لیکن شہد کا چھتا کہاں ہے" میں نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو" نالے کے اس پار ایک بڑے سے سوکھے ہوئے پیڑ کی ایک کھوک سی تھی۔ کومے داوا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کومے داوا نے تیر کمان میرے پاس رکھا اور خود نالے میں اتر گیا۔ لیکن فوراً ہی باہر آ گیا۔ نالے کی تہہ میں یقیناً کٹیلی جھاڑیاں تھیں جن سے اس کے پیر زخمی ہو گئے تھے۔ باہر نکل کر کومے داوا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک ایسے پیڑ کے پاس گیا جو نالے کے اوپر پھیلا ہوا تھا اور جس پر جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کومے داوا نے پیڑ کی ایک اونچی شاخ سے لٹکی ہوئی بیل کی ایک موٹی شاخ کو کاٹ دیا۔ بیل کا ایک سرا نیچے لٹک آیا۔ اس سرے کو پکڑ کر کومے داوا نے زور سے کھینچا، جھٹکے دیئے اور پھر پیچھے ہٹ کر بیل کو پکڑے پکڑے ایک لمبی سی پینگ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نالے کے اُس پار کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بیل کا سرا جھاڑی میں اٹکا دیا اور سوکھے پیڑ کی طرف چل پڑا۔

(باقی آئندہ)



چندا ماموں دور کے

جناب ظفر گورکھپوری

یہ نظم مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے پڑھی گئی ——— ظفر۔

چندا ماموں دور کے باسی، نیل گگن کے راج کمار
برسوں سے ہم ننھے بالک ذکر تمہارا سنتے ہیں
برسوں سے یہ حالت ہے، جب رات رُپہلی آئی ہے
ہم بستر پہ لیٹے لیٹے پیار کے سپنے بُنتے ہیں

تم اکثر جب نیل گگن کی جھل مل جھل مل کھڑکی سے
اپنا اُجلا اُجلا چہرہ ہنس ہنس کر دکھلاتے ہو
مت پوچھو اُس وقت ہمارے جی کا کیا ہوتا ہے حال
یوں لگتا ہے جیسے تم اب آتے ہو اب آتے ہو

کیا جانے کیسے ماموں ہو آ نہ سکے تم آج تلک،
اور امی ہر شب کہتی ہیں چندا ماموں آئیں گے
بھات کی تھالی نذر کریں گے میرے پیارے مُنّے کو
اور مُنّی کی خاطر ماموں دودھ کی پیالی لائیں گے

خوابوں اور خیالوں کی جو باتیں تھیں وہ ختم ہوئیں
دور ہے دانش مندوں کا یہ دیوانوں کا عہد نہیں
اپنا جیون جہد و عمل کے پھولوں کا باغیچہ ہے
اپنا عہد اک عہدِ حقیقت، افسانوں کا عہد نہیں

اس میں یہ بھی لکھا ہے کچھ ہم جیسے انسانوں نے
اپنے علم کی قوت سے تیار کیا ہے ایک جہاز
جس کی تیز اڑانوں سے یہ تیز ہوا شرماتی ہے
جو نیلے آکاش کی جانب کرنے والا ہے پرواز

دھرتی صدیوں کی پستی سے اُوپر اُٹھنے والی ہے
انساں اب آکاش کے اوپر اپنی بزم سجائے گا
کاہکشاں کی راہیں ہوں گی اور تاروں کے جوگی دیپ
وقت صدائیں دیتا ہے اب وہ دن جلدی آئے گا

چندا ماموں، اب تم آؤ یا مت آؤ، فکر نہیں
اب تو تمھارے گھر کچھ دن میں ہم خود آنے والے ہیں
دودھ بھات جو تم نے چھپا کر اپنے گھر میں رکھا ہے
اب ہم چندا ماموں تم سے چھین کے کھانے والے ہیں

لیکن اب کچھ روز سے ہم نے جان لیا ہے سارا بھید
چندا ماموں گھر آئیں گے اور نہ کچھ وہ لائیں گے
ہم دھرتی کے رہنے والے اور وطن ان کا آکاش
اِتنی اونچائی سے ماموں کیسے نیچے آئیں گے

امّی نے برسوں تک ہم کو بہلایا ہے وعدوں سے
دی دی نے بھی خوب افسانے ماموں کے دُہرائے ہیں
ڈیڈی نے بھی انگلی سے نیلا آکاش دکھایا ہے
خالہ جان نے بھی اکثر ان کے ہی نغمے گائے ہیں

"دودھ بھات" کی آس لیے ہر رات کو ہم سو جاتے تھے
لیکن اب ہم سو نہ سکیں گے بات یہ ہم نے ٹھانی ہے
ہمت کرکے اب ہم چندا ماموں تک خود جائیں گے
ہم کو کوئی فکر نہیں آئے جو مصیبت آنی ہے

مُنّی دیکھو میں بازار سے لایا ہوں یہ ایک کتاب
اِس میں لکھا ہے انسان اس دور کا ہے بیدار بہت
آج زمیں کا چھوٹا سا اک ذرّہ بھی بے جان نہیں
شبنم میں ہیں لاکھ ستارے، کلیوں میں گلزار بہت



جناب رفیق محمد خاں شاستری

ستاروں سے آگے......

اس دنیا کے چپے چپے کی خاک چھان لینے کے بعد اب حضرت انسان نے چاند اور ستاروں کی طرف رخ کیا ہے اور یہ ہم سے لاکھوں کروڑوں میل دور ہیں۔ کہتے ہیں ان چاند تاروں کے آگے اور بھی کئی جہان ہیں۔ ان گنت۔ پر ابھی ان چاند تاروں کی دنیا تک پہنچنا انسانی عزم و حوصلے اور اس کی سوجھ بوجھ کے لیے ایک امتحان بنا ہوا ہے۔ چاند پر پہنچنے کی کوششیں ابھی تجربوں کی منزل سے گزر رہی ہیں۔ انسان اس مشکل سفر کو طے کرنے کی کوشش میں دن رات لگا ہوا ہے۔ کیا عجب جو یہ حضرت انسان ان چاند تاروں کی دنیا سے آگے کے جہان میں بھی اپنی فتح کا پرچم لہرا آئیں۔

ابھی چند سال پہلے روس نے پہلی بار خلا میں ایک راکٹ اڑایا تھا، یعنی زمین کی فضا سے

اور اس کی قوت کشش سے اوپر بہت اوپر جہاں نہ ہاتھ پیر میں کسی قسم کی قوت کا احساس ہوتا ہے اور نہ کسی چیز میں کوئی وزن قائم رہتا ہے۔ پھر اس کے بعد چھوٹے چھوٹے جانور خلائی پرواز پر بھیجے گئے۔ مقصد یہ پتہ لگانا تھا کہ خلا میں اس بے وزنی کی حالت میں جانداروں کا زندہ رہنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ جب اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا کہ خلائی طیاروں میں اس طرح کا ماحول بنایا جا سکتا ہے جس میں جانداروں کا زندہ رہنا ممکن ہے تو پھر انسان کو خلائی پرواز پر بھیجا گیا۔ آج سے کوئی پانچ سال پہلے روسی خلا باز یوری گگارن نے صرف ۱۰۸ منٹ خلا میں گزارے مگر اب یہ اڑان کئی کئی دن جاری رہتی ہے۔ اور اب تو انسان خلائی طیارے سے باہر نکل کر کچھ دیر خلا میں تیر بھی لیتا ہے۔

اس وقت دنیا کے دو بڑے ملک چاند اور ستاروں کے جہان سے آگے نکل جانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ملک ہمارے آپ کے لیے نئے نہیں ہیں۔ دونوں کی کوششوں کا ذکر پیام تعلیم میں برابر ہوتا رہا ہے۔ یعنی روس اور امریکہ۔ اب تک ان دونوں ملکوں کے بیس حوصلہ مند انسان پندرہ اڑانوں میں خلا میں دنیا کا چکر کاٹ چکے ہیں۔ ان لوگوں نے کل ملا کر ۱۱۵۰ گھنٹے خلا میں گزارے ہیں۔ اس میں امریکہ والوں نے ۶۵۰ گھنٹے اور روس والوں نے ۵۰۰ سے کچھ زیادہ گھنٹے گزارے۔

امریکہ نے انسان کو چاند تک بھیجنے کے سلسلے میں ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کا مقصد ۱۹۷۰ء تک انسان کو چاند پر اتارنا ہے۔ اس سلسلے میں تجربے برابر جاری ہیں۔ خاص طرح کے راکٹ بنائے جا رہے ہیں۔ خلا بازوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ چاند اور خلا کی زندگی کے بارے میں سائنسی معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔

اس منصوبے کے ماتحت سب سے کامیاب تجربہ جیمنی ۵ کی اڑان تھی۔ یہ اڑان گزشتہ مہینے کے آخر میں ہوئی تھی۔ جیمنی ۵ کے نام کے طیارے میں امریکی خلا بازوں نے ۸ دن تک خلا میں سفر کیا۔ یہ مدت پچھلی تمام مدتوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس سے پہلے روسی خلا باز ویلری بیکوفسکی نے ۵ دن تک خلا میں پرواز کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا جسے جیمنی ۵ کی اڑان نے توڑ دیا۔ جیمنی ۵ کے دونوں خلا باز گورڈن کوپر اور چارلس کونراڈ نے خلائی پرواز

میں نیا ریکارڈ قائم کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ انسان ۸ دن کے لمبے عرصے تک بھی خلا میں سفر کر سکتا ہے۔
اس آٹھ دن کے خلائی سفر کی اس لیے بھی بڑی اہمیت ہے کہ تیز سے تیز رفتار راکٹ کے ذریعہ چاند تک کا سفر کرنے اور زمین تک واپس آنے میں تقریباً اتنا ہی وقت لگے گا۔ جیمنی ۵ کی اڑان اس حیثیت سے ایک تاریخی اڑان کہی جا سکتی ہے۔ گورڈن کوپر اور چارلس کونراڈ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان چاند تک کے لمبے سفر کی مشکلات کو جھیلنے کی قوت رکھتا ہے۔

جیمنی ۵ کی اڑان ۲۱ اگست کو (ہندستانی وقت کے مطابق) ساڑھے سات بجے شام کو شروع ہوئی۔ پورے آٹھ دن خلا میں پرواز کرنے کے بعد یہ غبارہ ۲۹ اگست ۱۹۶۵ء کو شام کے ساڑھے چھ بجے سمندر کی سطح پر اتر آیا۔ اس طرح ان نوجوانوں نے ۱۹۱ گھنٹے تک خلا میں بے وزنی کی حالت کا مقابلہ کیا۔ پھر بھی ان کی صحت پر اس کا کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ یہ دونوں نوجوان اتنی اچھی حالت میں تھے کہ جب وہ جہاز کے ڈیک پر پہنچے تو خوشی سے اچھل پڑے۔

انھیں خوشی کیوں نہ ہوتی۔ اس زمین کے

انھوں نے ۱۲۰ چکر جو لگائے تھے وہ بھی خلا میں یعنی اس دنیا کی کشش سے دور جہاں نہ ہاتھ پیروں میں جان معلوم ہوتی ہے اور نہ کسی چیز میں کوئی وزن محسوس ہوتا ہے۔ ہر چیز معلق رہتی ہے۔ ایک ایسی جگہ سے اپنی دنیا میں واپس آ جانا ان کے لیے واقعی بہت خوشی کی بات تھی۔ ان لوگوں کو دنیا کے ۱۲۱ چکر لگانے تھے۔ ابھی ایک چکر لگانا اور باقی تھا کہ ان خلابازوں نے واپس لوٹ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ فیصلہ انھوں نے کیوں کیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہمت ہار بیٹھے تھے یا ان کے پاس اڑان کے لیے جن جن چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے ان کی کمی ہو گئی تھی۔ انھوں نے یہ فیصلہ موسم کے خراب ہو جانے کے ڈر سے کیا۔ وہ زمین سے بہت اوپر بہت ہی اوپر پرواز کر رہے تھے دور بین سے وہ اس دنیا کو صاف دیکھ رہے تھے۔ چاند اور سورج بھی دن میں کئی بار نظر آ جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے آخری چکر میں دیکھا کہ جس جگہ انھیں اترنا ہے۔ ایک بھیانک طوفان اس طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنا آخری چکر پورا نہیں کیا اور ۱۲۰ ایک سو بیس بار چکر کے بعد ہی لوٹ آئے۔

ان دونوں خلابازوں میں کرنل کوپر کا خلائی پرواز کا یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار وہ ۱۹۶۳ء میں خلائی پرواز کر چکے تھے اُس موقع پر انھوں نے ۳۴ گھنٹے اور ۲۰ منٹ خلا میں گزارے اس طرح دو دفعہ میں انھوں نے ۲۲۵ گھنٹے سے بھی زیادہ خلائی پرواز کی ہے۔ ابھی تک کسی خلاباز نے اتنی لمبی مدت تک خلائی سفر نہیں کیا ہے۔

لفٹنٹ کمانڈر کونراڈ کا خلائی پرواز کا یہ پہلا موقع تھا۔ آٹھ دن تک خلائی پرواز کا شاندار ریکارڈ قائم کرنے میں ان سے آگے صرف ان کے ساتھی کرنل کوپر ہی ہیں۔

اس خلائی پرواز میں ان لوگوں نے بہت سے سائنسی تجربات کیے۔ بہت سی تصویریں کھینچیں جن سے بہت سی اب تک کی نامعلوم باتوں کے پتہ لگنے کا امکان پیدا ہوا ہے۔ خلائی پرواز میں سب سے بڑا مسئلہ ایندھن کا ہوتا ہے مگر اب جیمنی ۵ میں جس طرح کا ایندھن استعمال کیا گیا ہے تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ اب وہ ایک ماہ تک کی اڑان کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

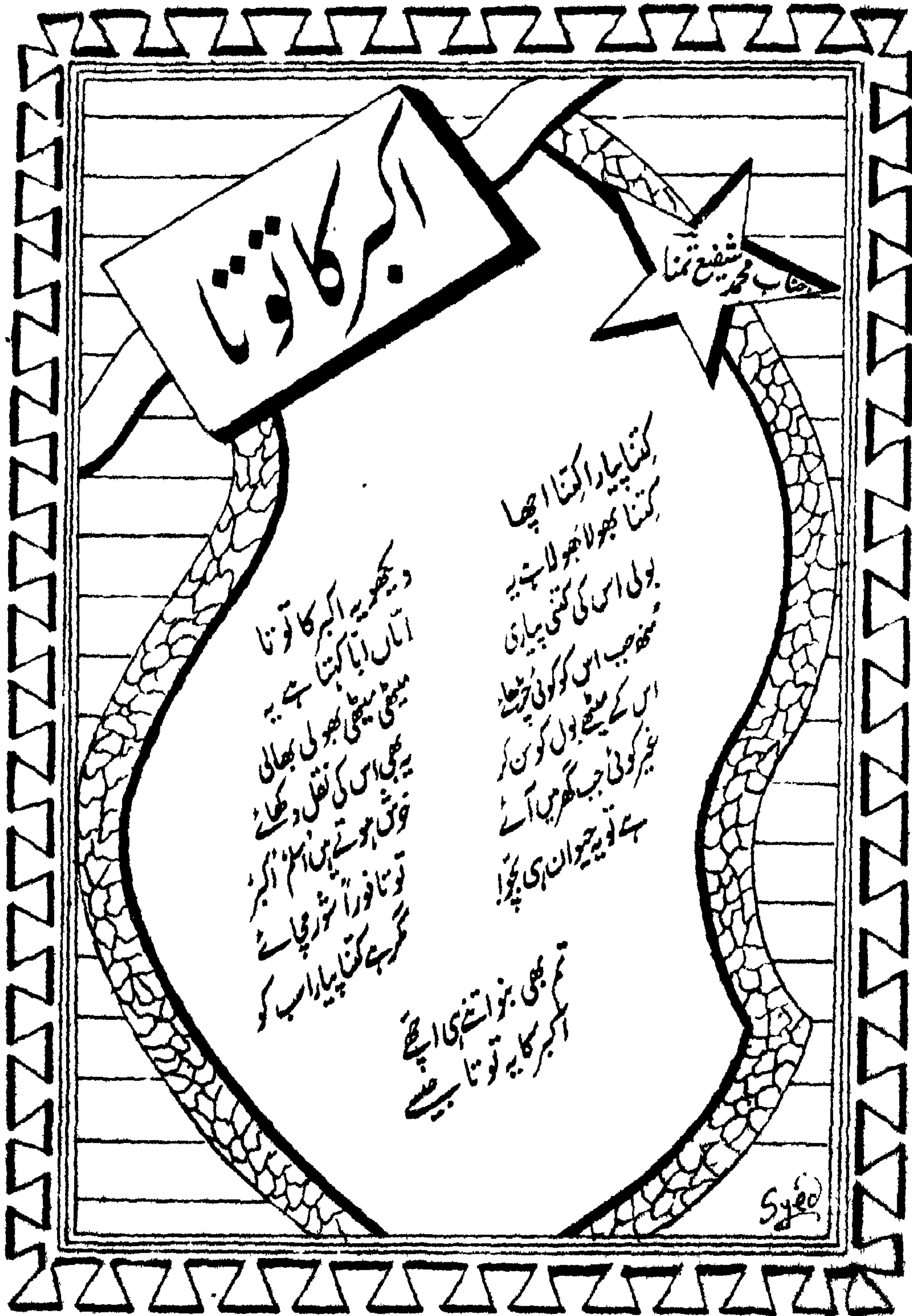
اب تک امریکہ اور روس کے بیس حوصلہ مند انسان خلا میں پرواز کر چکے ہیں۔ ہر خلاباز اپنے پہلے کے خلاباز کا ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ پہلے خلا میں راکٹ بھیجنا مشکل تھا۔ مگر دس سال کے عرصے میں طرح طرح کی چیزیں خلا میں بھیج دی گئی ہیں۔

ان چاند اور ستاروں کی دنیا کی طرف انسان ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ اب چاند تاروں کی دنیا اسے حیرت زدہ نہیں کرتیں۔ اس میں حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

بڑوں کی کوششیں (بقایا ۶۰)

جوتا تو اپنا پہنے تھے اور ایک جوتا وہی جس کی تلاش میں سب لوگ تھے لیکن ان کو تو ابھی بھی پتہ نہ تھا اس لیے وہ تو حیران ہو گئے کہ آخر بات کیا ہے۔ انھیں تب پتہ چلا جب بھائی صاحب ان کی طرف لپکے اور سب لوگ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔



اکبر کا توتا
جناب محمد شفیع تمنا
کتنا پیارا کتنا اچھا
کتنا بھولا بھالا ہے یہ
بولی اس کی کتنی پیاری
منھ جب اس کو کوئی چڑھائے
اس کے میٹھے بول کو سن کر
غیر کوئی جب گھر میں آئے
ہے تو یہ حیوان ہی بچو!
دیکھو یہ اکبر کا توتا
اماں ابا کہتا ہے یہ
میٹھی میٹھی بھولی بھالی
یہ بھی اس کی نقل دکھائے
خوش ہوتے ہیں اسلم اکبر
توتا فوراً شور مچائے
مگر ہے کتنا پیارا سب کو
تم بھی بن جاؤ اتنے ہی اچھے
اکبر کا یہ توتا جیسے
Syed



بڑوں کی کوششیں

پیام تعلیم کے پچھلے پرچے میں بڑوں کی کوششوں کے سلسلے میں کچھ مضمون چھپ چکے ہیں۔ اب کے ہمارے عبدالغفار مدھولی صاحب نے یہ چند دلچسپ مضمون اور بھیجے ہیں۔ مدھولی صاحب آج کل استادوں کے مدرسے میں اردو کے استاد ہیں اور ان طالب علموں کو اردو پڑھاتے ہیں جو اردو کی الف ب بھی نہیں جانتے۔ مگر مدھولی صاحب کے پڑھانے کا ڈھنگ کچھ ایسا ہے کہ ان کا شاگرد تھوڑے ہی دنوں میں نہ صرف پڑھنا بلکہ لکھنا بھی سیکھ لیتا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اس پیاری نکھری ستھری زبان سے ایک خاص محبت ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں جامعہ میں بالغوں کی تعلیم کا ادارہ بہت دنوں سے قائم ہے ہمیں امید ہے کہ تعلیم د ترقی والے غفار صاحب کے اس کامیاب تجربے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

۔ ایڈیٹر۔

بھابھی سے ملیے

ہو سکتا ہے آپ میرا یہ عنوان پڑھ کر ہنسیں پر میں غلط نہیں کہہ رہی، میرے خیال سے سبھی بہنوں کو اس بھابھی نام کے انسان سے ملنے کا موقع ملا ہوگا۔ ہر وقت " بھابھی بھابھی " ہی پریشان ہیں۔ ماں سے کچھ مانگئے تو کہتی ہیں اپنی بھابھی سے لو۔ بھائی کہتے ہیں کہ تمھاری بھابھی جی خریداری میں ہوشیار ہیں، ان کے ساتھ جا کر خرید لاؤ۔ اور کیا سناؤں بڑے بڑے افسروں کو تو رشوت دے کر منا لو، پر بھابھی کو منانا تو خدا کو منانا ہے۔ کبھی اچھی طرح بولو تو کہتی ہیں مجھی کو ئی

کام ہو گا تبھی میٹھی میٹھی بول رہی ہو، سوچ لو
میں ان باتوں میں نہیں آنے والی۔ اگر زور سے
بولو تو کہتی ہیں نوکر نہیں جو تمھاری منت کروں۔
میں بھی باپ کی بیٹی ہوں۔ تم پڑھتی ہو نہ کہ کسی
پر احسان کرتی ہو۔ اچھے کپڑے پہن کر باہر جاؤ
تو ٹوکتی ہیں، کیا کوئی نئی بات ہے۔ سادے
کپڑے پہن کر جاؤ تو کہتی ہیں بھابھی کی ناک
کٹواؤ گی۔

اگر کوئی سہیلی آجائے تو طنزوں کی جیسے
بوچھار ہو جاتی ہے۔ کہتی ہیں تمھاری سہیلی آئی
ہے چائے تو بنا دو پیچھے کہو گی بھابھی کیسی ہے
پانی کو بھی نہیں پوچھا۔ اگر کہوں بھابھی تم بیٹھو
چائے میں بنا لاتی ہوں تو بولیں گی میں کالج کی
لڑکیوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ میں رہی
گنوار ان پڑھ۔ اس وقت وہ بھول جاتی ہیں کہ
وہ بھی کالج کی پڑھی لکھی لڑکی ہیں۔ اچھا میرا خیال
ہے آپ مل لیے ہوں گے بھابھی سے۔ بتائیے زرا
کیسی لگیں ہماری بھابھی۔

سنتوش کماری گپتا
بیسک دوسرا سال

ارے یہ کیا؟

گرمی کا موسم تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔
ہم سب سونے کے انتظار میں تھے۔ گھڑی نے
دس بجا دیے اور ہم سب اپنے بستر پر لیٹ گئے۔
اتنے میں ہماری امی جان بھی آئیں اور بستر پر بیٹھ
گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بتی بجھائی اور
سو گئیں۔ ٹھیک اوپر جہاں میرا چھوٹا بھائی سو
رہا تھا ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ اس پر کپڑے
ٹنگے ہوئے تھے۔ ابھی سوئے ہوئے ہمیں چند
لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ میرا بھائی ایک دم
چلانے لگا۔ امی جان نے پوچھا "کیا ہوا ہے؟
کچھ بولو تو سہی" لیکن کوئی آواز نہیں۔ امی جان
نے پھر کہا "بیٹا، بات کیا ہوئی بتاؤ تو پتا چلے"
ادھر بے چارے کے منہ سے آواز ہی نہیں نکلتی
آخر وہ بھی کیا کرے۔

اتنے میں امی جان کچھ پریشان سی وہاں
پہنچیں۔ یہاں تک کہ ان کو اتنی بھی سدھ نہ
رہی کہ بتی تو جلا دوں۔ خیر اس کے پاس جاکر انھوں
نے آس پاس ٹٹولا اور پھر اس کے جسم کو ہاتھ لگایا
تو ان کے ہاتھ کوئی نرم سی چیز آئی۔ وہ اسے

دبا کر دیکھنے لگیں تو انھیں ایسا لگا کہ وہ چوہا
تھا۔ تو وہ ایک دم چیخ اٹھیں۔ 'چوہا!' اتنے
میں میری آنکھ بھی کھل گئی اور اٹھ بیٹھی۔ پوچھا۔
"امی کیا ہوا ہے؟ کون ہے؟" وہ بولیں "پتا
نہیں کیا چیز پیر پر گر پڑی ہے؟ مجھے تو چوہا لگتا
ہے، ذرا بتی تو جلاؤ۔ یہ تو بری طرح ڈر گیا ہے۔
دیکھو ہے کیا چیز؟"

میں نے جھٹ سے بتی جلادی اور بھاگی
اس جگہ پر جہاں دونوں تھے۔ آخر جھٹ سے
اُس چیز کو اٹھایا۔ دیکھتے ہی ایک دم چلائی "ارے
یہ کیا؟ یہ تو نائیلون کی جُراب ہے، کیا اس سے
اتنا ڈرا جارہا تھا۔ پھر بھی ہنس کر بول اٹھا:
"واہ تیری کرامات!"

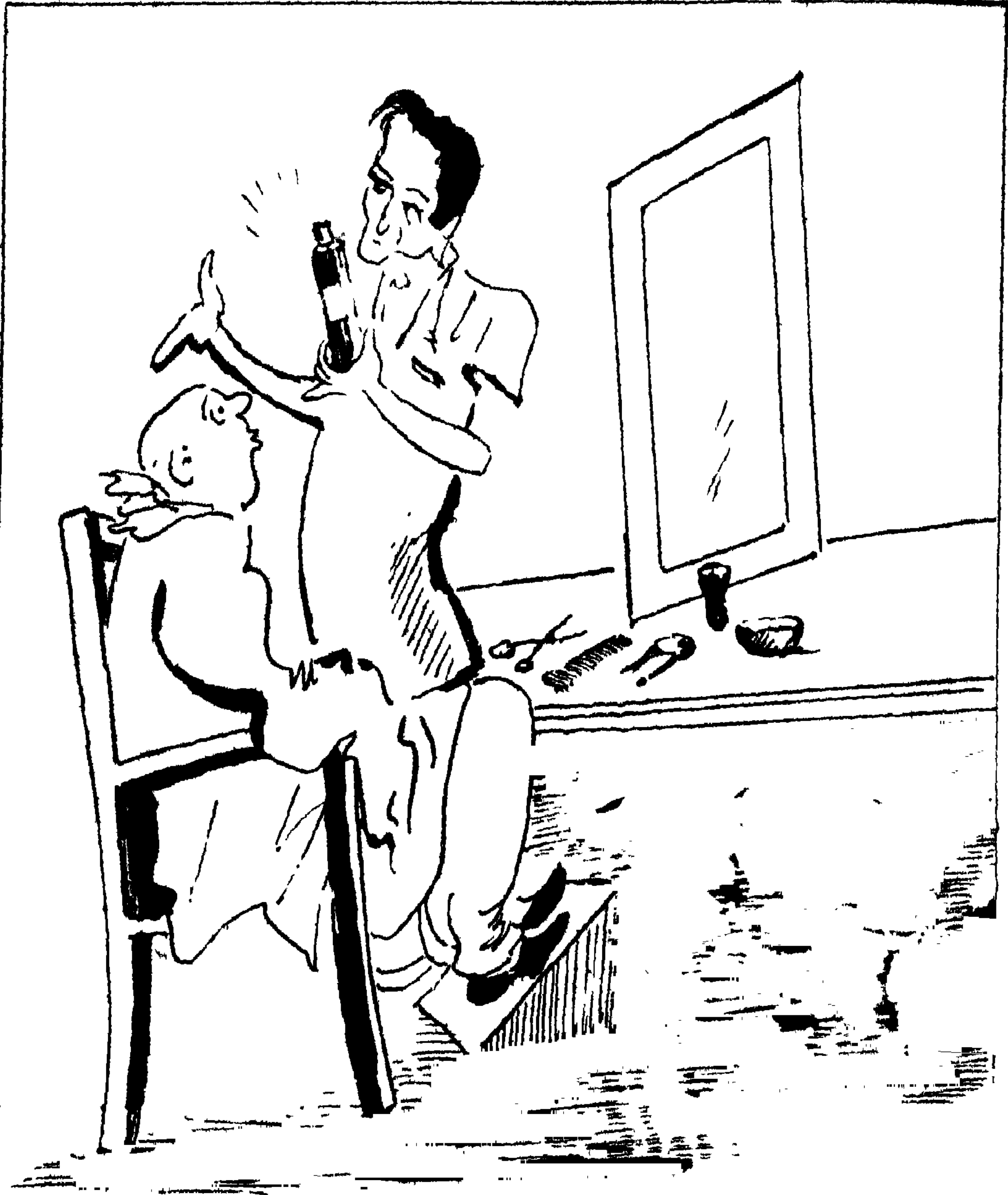
آپ بھی ہنسیے

زندگی میں کئی واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن
کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو عجیب و غریب ہوتے
ہیں اور جب بھی ہمیں ان کا دھیان آتا ہے تو ہم
اپنے آپ ہی ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک
واقعہ جو کہ اس وقت میرے ذہن میں ہے اسے
میں پیش کر رہی ہوں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے گھر میں ایک
بزرگ کو کہیں جانا تھا۔ وقت بہت زیادہ ہو چکا
تھا وہ جلدی میں آئے اور جوتے پہنے اور چل
دیے چلتے چلتے وہ تو بہت آگے چلے گئے۔ اِدھر
ہمارے بھائی صاحب کے دفتر جانے کا وقت بھی
ہو گیا۔ وہ جلدی سے تیار ہوئے اور جوتے پہننے
کے لیے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک جوتا تو پڑا ہے
اسے تو جھٹ سے پہن لیا لیکن دوسرا جوتا تھا
کہ دکھائی دینے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اِدھر ڈھونڈ
اُدھر ڈھونڈا لیکن وہاں ہوتا تو نکلتا۔ عجیب حالت
تھی ان کی۔ انھوں نے خوب ہنگامہ کیا۔ گھر کے سبھی
لوگ اس کام میں لگ گئے۔ لیکن ناممکن بات ممکن
کیسے ہو سکتی ہے؟ بھائی صاحب دفتر جانے
سے بھی رہ گئے کیونکہ دوسرا جوتا بھی موچی کے
پاس تھا۔ سبھی بہت پریشان تھے کہ آخر جوتا گیا
کہاں؟

اتنے میں کیا دیکھا کہ بابا بڑے مزے سے
کھٹ کھٹ کرتے چلے آرہے ہیں۔ گھر کے سبھی
لوگوں کا دھیان اُن کی کھٹ کھٹ کی آواز سے
اُن کے جوتوں کی طرف گیا۔ دیکھا تو وہ ایک

(باقی صفحہ ۵۶ پر)



"آپ یہ تیل استعمال کیجیے، ایک مہینے کے اندر بڑے بڑے بال اُگ آئیں گے۔"

"جی یہ میری ہی ایجاد ہے۔"

جناب اقبال مہدی

جادو کا بٹوا بنائیے

بٹوا روپے رکھنے کے کام آتا ہے۔
بٹوے میں روپے پیسے رکھتے بھی جاتے
ہیں اور ان میں سے نکال کر خرچ بھی کیے جاتے
ہیں۔

جادو کا بٹوا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں
سے چاہے جتنے پیسے نکال کر خرچ کرتے جایئے۔ وہ کبھی خالی
نہیں ہوتا۔ ایسا بٹوا بنانا مجھے نہیں آتا۔

جادو کا بٹوا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں چاہے جتنے پیسے
ڈالیے، ضرورت کے وقت ہمیشہ خالی نکلتا ہے کبھی کبھی پیسوں کے ساتھ خود
بھی غائب ہو جاتا ہے۔ ایسا بٹوا بنانے کے لیے آپ آمادہ نہ ہوں گے۔

جادو کا ایک بٹوا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ اس میں کوئی نوٹ یا سکہ یا کوئی اور ایسی
ہی چیز ڈال کر رکھیں، آپ چاہیں تو اس میں سے غائب ہو جائے اور آپ خالی بٹوا دوستوں کو
دکھا دیں اور آپ چاہیں تو وہی چیز اس بٹوے میں آکر پھر رکھی جائے۔

اس جادو کے بٹوے میں آپ ایک روپے کا نوٹ رکھ کر دو روپے کا نوٹ (یا دو روپے کا نوٹ
رکھ کر ایک روپے کا نوٹ) یا سفید کاغذ رکھ کر رنگین کاغذ۔ سوتی کپڑا رکھ کر ریشمی کپڑا۔ خالی دھاگا رکھ
کر مرغی کا پر غرض کوئی چیز رکھ کر اس کی جگہ کوئی دوسری چیز نکال کر دکھا سکتے ہیں اور دیکھنے والوں کو حیرت

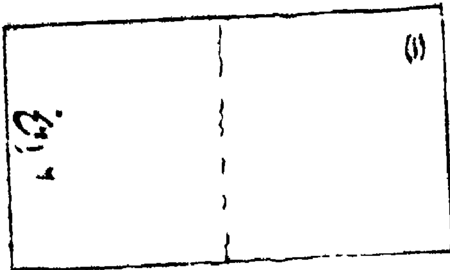
میں ڈال سکتے ہیں۔

ایسا بٹوا حاصل کرنے کے آپ ضرور خواہش مند ہوں گے۔

اگر میں آپ سے کہوں کہ ایسا بٹوا برف دیس کی شہزادی کے پاس ہے مگر اس تک پہنچنے کے لیے آپ کو سانپوں کے دریا اور بھوکی چیلوں کے میدان سے گزرنا پڑے گا، کالے اُتو کی مدد لے کر چونٹیوں کے غار میں سات دن گزارنے پڑیں گے اور نیلے بالوں والے دیو سے لڑ کر بوڑھے مگرمچھ سے مقابلہ کرنا پڑے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرے مول لینے پڑیں گے تب بھی آپ ایسے بٹوے کو حاصل کرنے کے لیے شاید تیار ہو جائیں گے۔

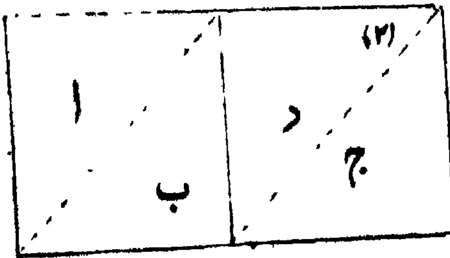
لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا۔ کیونکہ یہ بٹوا میرے پاس ہے اور مجھے ایسے بٹوے بنانے نہ صرف آتے ہیں بلکہ میں ایسے بٹوے بنانا دوسروں کو سکھا بھی دیتا ہوں۔ آپ بنانا چاہیں تو بنا کر دیکھیے۔ ترکیب بیان کیے دیتا ہوں۔

۱۲ اِنچ



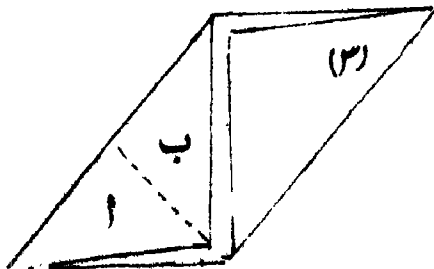
۱۔ ایک مستطیل کاغذ لیجیے جس کی لمبائی چوڑائی سے دگنی ہو۔

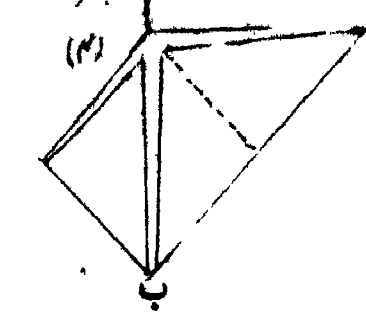
۲۔ لمبائی کے بیچ سے (نقطہ دار خط پر) اِس کو موڑ کر دُہرا کیجیے، شکن ڈال دیجیے اور پھر کھول دیجیے۔



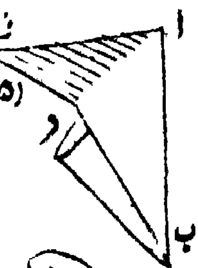
۳۔ بائیں طرف کے اوپر والے کونے کو نقطہ دار خط (بائیں مربع کے وتر) پر نیچے کی طرف اس طرح موڑیے کہ مثلث ا مثلث ب کو ڈھک لے۔

۴۔ اسی طرح دائیں طرف کے نیچے والے کونے کو نقطہ دار خط (دائیں مربع کے وِتر) پر اوپر کی طرف اس طرح موڑیے کہ مثلث 'ج' مثلث 'د' پر آ جائے۔ اور کاغذ شکل نمبر ۳ کی طرح تہہ ہو جائے۔

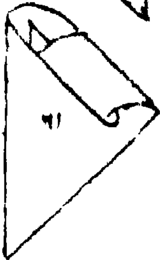




۵. شکل نمبر ۳ کے بائیں طرف کے مثلث کو نقطہ دار خط پر اُوپر کی طرف
اس طرح تہہ کیجیے کہ چھوٹا مثلث 'ا' چھوٹے مثلث 'ب' کو ڈھک لے۔
اور کاغذ شکل نمبر ۴ کی طرح ہو جائے۔



۶. شکل نمبر ۴ کے داہنی طرف کے بڑے مثلث کو نقطہ دار خط پر
نیچے کی طرف موڑیے۔ موڑ پر دبا کر شکن ڈالیے اور اس مثلث کو پھر
کھول کر خط 'ا ب' پر اس طرح موڑیے کہ کاغذ شکل نمبر ۵ کی طرح
ہو جائے۔



۷. شکل نمبر ۵ کے اوپر کے چھوٹے مثلث کی نوک 'ج' کو نیچے
کے مثلث کی جیب کے اندر ڈال کر پورے چھوٹے مثلث کو اِس
جیب کے اندر کر دیجیے۔

۸. شکل نمبر ۶ میں شکل نمبر ۵ کو پلٹ کر اسی عمل کو سمجھایا گیا ہے۔



۹. شکل نمبر ۷ "جادو کے بٹوے" کی مکمل شکل ہے۔ اس بٹوے
میں 'ا' اور 'ب' دو الگ الگ جیبیں ہیں۔ دو جیبوں کا راز صرف آپ
ہی کو معلوم ہونا چاہیے۔ دوسروں کے ہاتھ میں بٹوا پہنچتے ہی جادو کا
اثر ختم ہو جائے گا۔

جادو دکھاتے وقت ایک جیب میں سب کے سامنے کوئی چیز رکھیے۔ چیز ایسی ہونی چاہیے جو بٹوے
میں رکھنے کے بعد اُبھری ہوئی نہ دکھائی دے۔ لفافے کو ہاتھ میں لے کر چپکے چپکے ہونٹ ہلائیے اور "چھومنتر"
یا کوئی اور ایسا ہی لفظ کہتے ہوئے ہاتھ کو ہوا میں ہلایئے۔ اسی دوران میں بٹوے کو ہاتھ میں اس طرح گھما
لیجیے کہ پہلی جیب کی جگہ دوسری خالی جیب آ جائے۔ اب سب کے سامنے ہاتھ روکیے اور خالی جیب کھول کر
سب کو دکھا دیجیے کہ بٹوا خالی ہے۔ دیکھنے والے سمجھیں گے کہ وہ چیز جادو کے زور سے غائب ہو گئی ہے
اپنے جادو پر یقین کرانے کے لیے اعلان کیجیے کہ آپ اس چیز کو بٹوے میں پھر واپس منگوا دیں گے۔ پھر اسی

طرح کچھ پڑھیے اور "چھو منتر" وغیرہ کہہ کر ہاتھ ہوا میں ہلائیے۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے بٹوے کو اس طرح گھمائیے کہ پہلی جیب پھر اپنی اصلی جگہ پر پہنچ جائے۔ اب ہاتھ روک کر اُس جیب میں رکھی ہوئی وہی چیز لوگوں کو دکھا دیجیے۔ لوگوں سے کہیے کہ وہ چیز پہلی مرتبہ بھی "اسی جگہ" رکھی ہوئی تھی لیکن آپ نے جادو کے زور سے نظر بندی کر دی تھی اور وہ چیز اس جیب میں موجود ہوتے ہوئے بھی اُن کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

دوسرا کھیل آپ یہ دکھا سکتے ہیں کہ ایک ہی شکل یا لمبائی کے دو رنگ کے کاغذ یا دھاگے یا کپڑے وغیرہ لے کر اُن میں سے ایک کو پہلے سے ایک جیب میں چھپا دیجیے۔ دوسرے کو لوگوں کو اچھی طرح دکھایئے اور اُن کے سامنے دوسری جیب میں رکھ دیجیے اور اسی طرح 'چھو منتر' وغیرہ کہہ کر پہلی جیب سے دوسری چیز نکال کر دکھا دیجیے۔ لوگ سمجھیں گے کہ آپ نے اپنے جادو کے زور سے اس چیز کا رنگ تبدیل کر دیا ہے۔

اسی طرح آپ ایک جیب میں کوئی بھی چیز لوگوں سے رکھوا کر دوسری جیب میں سے پہلے سے رکھی ہوئی کوئی بھی دوسری چیز نکال کر دکھا سکتے ہیں۔ دو ایک مرتبہ جادو دکھا کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ اصل جادو بٹوے میں اتنا نہیں ہے جتنا آپ کے 'ہاتھ کی صفائی' میں ہے۔

'ہاتھ کی صفائی' مشق کرنے سے آتی ہے۔ لیکن 'ڈھونگ' رچانے سے اس میں مدد ملتی ہے۔ 'ڈھونگ' میں مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۔ جادو کا ڈنڈا۔ کوئی بھی چھوٹا سا ڈنڈا جس سے صرف جادو دکھانے کا کام لیا جائے۔

۲۔ دو تین رنگوں کی لمبی کاغذ کی ٹوپی۔ یہ آپ اخبار کا کاغذ موڑ کر خود بنا سکتے ہیں اور اُسے روشنائی سے کہیں سے لال کہیں سے نیلا رنگ سکتے ہیں۔

۳۔ کالے یا کسی بھی گہرے رنگ کا چغہ۔ امّی یا آپا کے دوپٹے سے مدد لی جا سکتی ہے۔

۴۔ کسی خاص جگہ کھڑے ہو کر، پاس ایک ایسی چھوٹی میز یا تپائی رکھ کر جو سامنے اور دائیں بائیں سے کپڑا ڈال کر ڈھک دی گئی ہو۔ آپ کے اور دیکھنے والوں کے بیچ میں اگر کھینچ کر کھلنے بند کیے جانے والے پردے بھی پڑ سکیں، چاہے رسّی پر دو چادریں ہی ڈال دی جائیں، تو 'ڈھونگ' میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مضمون کے شروع کی تصویر کے 'جادوگر' کی نقل آپ بھی کر سکتے ہیں۔



حمید: کیا آپ اپنے درزی کا پتہ بتا سکتے ہیں۔
نسیم: جی ضرور۔ ایک شرط ہے۔ کہیں آپ اُسے میرا موجودہ پتہ نہ بتا دیں۔

مجسٹریٹ: آپ کی عمر۔
حامد: جی تیس سال حضور۔
مجسٹریٹ: عجیب بات ہے تم تین سال سے برابر اپنی عمر تیس سال بتا رہے ہو۔
حامد: جی حضور میں ان لوگوں میں سے نہیں جو گھڑی میں کچھ کہتے ہیں گھڑی میں کچھ۔

شاہد: بھلا آپ ٹرنک کا کیا کریں گے۔
پرویز: میں اس میں اپنے کپڑے رکھوں گا
شاہد: کپڑے؟ اور خود ننگے پھریں گے۔

ایک ہوٹل میں کسی اجنبی نے کھانے سے نیپکن اٹھا کر اسے گردن سے باندھ لیا۔ ہوٹل کے منیجر نے بیرے کو بلایا اور کہا کسی نہ کسی طریقے سے اس اجنبی کو بتا دو کہ نیپکن گلے میں نہیں باندھتے
بیرے نے اجنبی کے پاس آکر بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا: حضور بال بنوائیے گا یا صرف شیو کرائیے گا۔

چھوٹے میاں: خلیل بھیا جو ماؤتھ آرگن آپ نے مجھے دیا تھا نا تو سچ جانیئے وہ میرے لیے عید کا بہترین تحفہ تھا۔
خلیل: خوب! بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ تمھیں اتنا پسند آیا۔
چھوٹے میاں۔ میں جب کبھی اسے بجاتا ہوں تو امی مجھے اکنی دے کر باہر بھیج دیتی ہیں۔

وقار: کیوں جناب جب میں گانے لگتا ہوں تو تم ہمیشہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتے ہو آخر یہ کیا بات ہے۔
وحید: بھئی میں اس وقت اپنے پڑوسیوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ تان سین میں نہیں کوئی اور ہے

معلّم

کتابوں کی باتیں

میر انیس :- محمد حسین حسّان

ستمبر کے 'پیام تعلیم' میں آپ نے حسین حسّان صاحب کی کتاب 'میر تقی میر' کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ لیجیے اب ان کی دوسری بالکل تازہ کتاب 'میر انیس' کی خوش خبری سنیے۔ یہ کتاب بھی پچھلی کتاب کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے مکتبے نے آپ کے لیے شروع کر رکھا ہے۔

ثانوی مدارس کے بڑے طالب علم یعنی 'نویں' دسویں اور گیارھویں جماعتوں میں اردو پڑھنے والے غالباً سب ہی بچے میر انیس کے نام سے واقف ہوں گے۔ ان کا کلام اس منزل پر اردو کی درسی کتابوں کی زینت ضرور رہتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جس کسی کے کان مرثیے کے پُر درد اور پُر اثر بیان سے واقف ہیں، اس کی زبان پر میر انیس کا نام آنا بھی لازمی ہے۔ مرثیے کی ابتدا اردو زبان میں کب اور کہاں ہوئی اور اس کے لفظی معنی کیا ہیں۔ یہ سب باتیں اس کتاب میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بتائی گئی ہیں۔ لیکن اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ "مرثیے سے مراد وہ نظمیں ہیں جو واقعات کربلا کے متعلق کہی گئیں"۔ اردو میں مرثیہ شروع سے ہی لکھا گیا بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا ہی مرثیے سے ہوئی۔ اس نے عالم، جاہل، عام، خاص ہر ایک کے دل میں جگہ

کرلی۔ مرثیہ لکھنے والوں میں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت، میر انیس کے حصّے میں آئی۔ وہ ۱۸۰۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آ رہے۔ اُن کے والد میر خلیق اور ان کے دادا میر حسن نہ صرف اپنے زمانے کے نہایت ہی مشہور و معروف شاعر تھے بلکہ آج بھی ان کا نام اردو شاعری میں بہت روشن ہے۔ میر انیس نے اپنے بزرگوں کے نام کو کچھ اور روشن کر دکھایا۔ اُن کے مرثیوں نے دلوں کو ایسا متا ثر کیا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ اُن کا کلام، روانی، دلکشی اور لطافت کی سند بن کر رہ گیا۔ انھوں نے مرثیے کے میدان میں نئے نئے ڈھنگ سے مضمون باندھے اور منظر نگاری میں کمال کر دکھایا۔ جذبات کی بولتی ہوئی تصویریں اتار کر دکھوئیں اور میدانِ جنگ کا جیتا جاگتا نقشہ اپنے قلم کی قوت سے کھینچ ڈالا۔ ذرا یہ بند پڑھیے۔ بی بی صغرا بہت بیمار ہیں۔ مجبوراً حضرت امام حسین علیہ السلام انھیں گھر ہی پر چھوڑے جا رہے ہیں۔

صغرا نے کہا، کوئی کسی کا نہیں زنہار — سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار

اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار — اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا، سب کے ہیں غمخوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا

سچ ہے کوئی مُردے سے محبت نہیں کرتا

اس چھوٹی سی کتاب میں میر انیس کی زندگی کے حالات اور اُن کے کلام کی خصوصیات عمدگی کے ساتھ سمو دی گئی ہیں۔ ہر بات نہ صرف پوری چھان بین کے بعد لکھی گئی ہے بلکہ مناسب الفاظ میں بھی کہی گئی ہے۔ حسین حسّان صاحب کے لکھنے کا انداز آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ چھوٹے بڑے بچوں کی ضرورت، طبیعت، اور لیاقت کا صحیح صحیح اندازہ رکھتے ہیں اور زندگی بھر ان کے لیے کتابیں لکھتے اور ان سے باتیں کرتے رہے ہیں۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پوری ذمہ داری برتتے ہیں۔ لہٰذا ان کی ہر کتاب، ایک اچھی کتاب ضرور ہوتی ہے۔ مکتبہ جامعہ کا یہ پروگرام کہ اچھے اچھے لکھنے والوں سے مدرسے کے طالب علموں کے لیے اردو کے مشہور مشہور شاعروں اور نثر لکھنے والوں کے حالات پر کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں صاف ستھرے طریقے سے پیش کیا جائے، دراصل اردو کی ایک خدمت ہے۔ ایسی کتابیں پڑھنے والا بچہ بلاشبہ اردو زبان کا صحیح مذاق اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اور اس کا ذوق و شوق یقیناً پروان چڑھے گا۔

صحافی

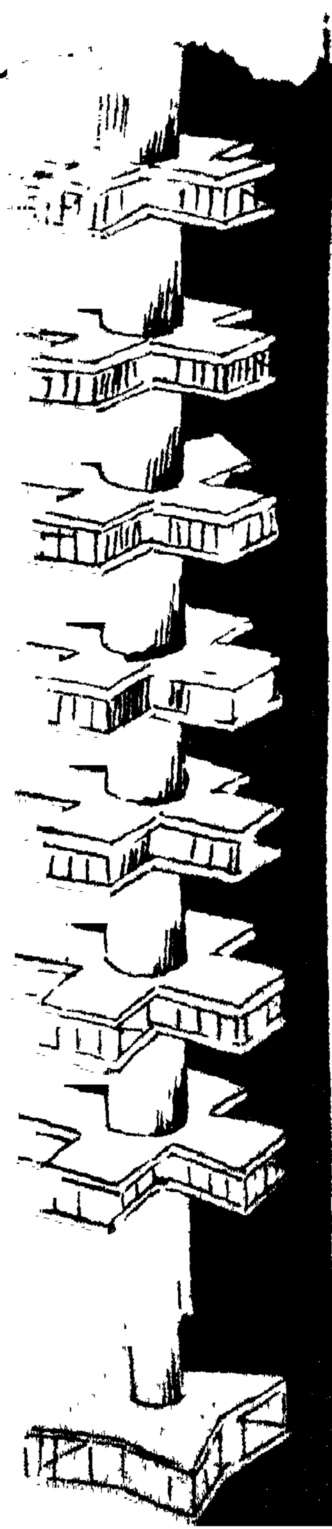
اِدھر اُدھر سے

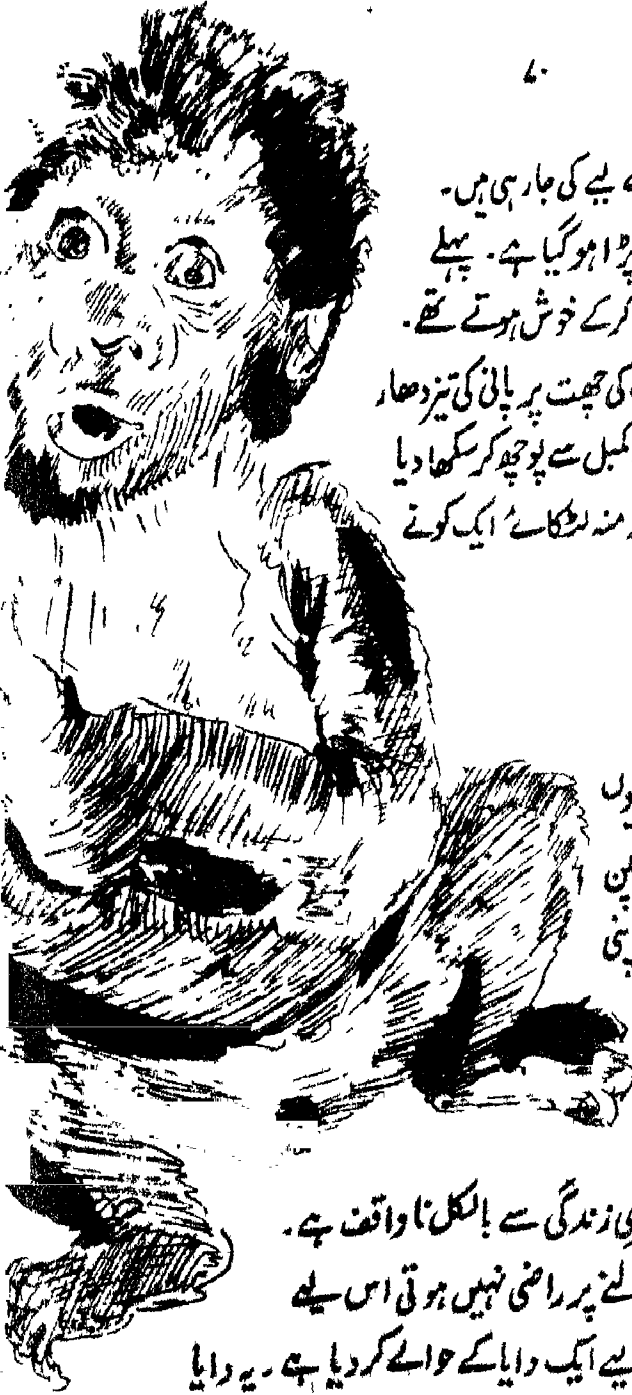
مینار یا ہوٹل

دیکھیے ذرا غور سے دیکھیے یہ مینار ہے یا ہوٹل ہے؟ جی جناب یہ ہوٹل ہے ہوٹل! زیادہ سے زیادہ آپ اسے مینار نما ہوٹل کہہ سکتے ہیں۔ یہ جرمنی کے ایک صنعتی علاقے میں بنایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ تین سو فٹ اونچا مینار ہوگا۔ رہائشی کمرے مینار کے چاروں طرف گملوں کی طرح لٹکے نظر آتے ہیں۔

ساڑھے چار من کا بندر

جرمنی کا ایک مشہور شہر ہنوور ہے۔ اس شہر کے چڑیا گھر میں ابھی کچھ دنوں پہلے امریکہ سے ایک بندر لایا گیا ہے۔ یہ بندر، کہتے ہیں دنیا کا سب سے بڑا بندر ہے۔ پورے سوا چار من کا! پہلے خوب ہشاش بشاش رہتا تھا خوب کام کیا کرتا تھا مگر آج کل کچھ اداس اداس سا رہتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا موٹاپا اس کی تندرستی کے لیے خطرناک بنتا جا رہا ہے۔ اب بندر میاں کو پرہیزی کھانا ملتا ہے۔ کئی کئی دن فاقے





بھی کرنے ہوتے ہیں۔ یہ تدبیریں اسے دبلا کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔
پران باتوں کی وجہ سے وہ بہت بدمزاج اور چڑچڑا ہو گیا ہے۔ پہلے
بندر میاں چڑیا خانے کے ملازمین کے ساتھ کام کر کے خوش ہوتے تھے۔
صبح سویرے چڑیا خانے کا ملازم ان کے پنجرے کی چھت پر پانی کی تیز دھار
ڈال کر دھویا کرتے تھے تو بندر میاں اسے اپنے کمبل سے پوچھ کر سکھا دیا
کرتے تھے پر اب تو سارے دن کمبل اوڑھے اور منہ لٹکائے ایک کونے
میں پڑے رہتے ہیں۔

بن مانس بچہ

جرمنی کے ایک دوسرے چڑیا گھر میں گوریلوں
یعنی بن مانسوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ یہ جوڑا بچپن
سے چڑیا گھر میں ہی پلا بڑھا ہے اور اب اسے اپنی
جنگلی زندگی شاید بالکل یاد نہیں رہی ہے۔
ڈھائی مہینے پہلے مادہ بن مانس کے یہاں
ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس ننھے بن مانس کا نام
میکس ہے۔ میکس کی ماں بن مانسوں کی فطری زندگی سے بالکل ناواقف ہے۔
چنانچہ وہ اپنے بچے سے ڈرتی ہے۔ اور اسے پالنے پر راضی نہیں ہوتی اس لیے
چڑیا خانے کے منتظمین نے اسے پرورش کے لیے ایک دایا کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ دایا
اس ننھے بن مانس کو بالکل انسانی بچوں کی طرح پال رہی ہے۔ وہ مقررہ وقت پر اسے بوتل سے دودھ
پلاتی ہے۔ روز سویرے جب دایا برش سے کر میکس کے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کرتی ہے تو میکس
بہت خوش ہوتا ہے۔

ایک ریچھنی جو فوج میں ملازمت کرتی ہے

اس بار ٹائٹل پر ایک عجیب و غریب تصویر چھپی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ سرکس کی تصویر ہے۔ جی نہیں یہ تو ایک فوجی گاڑی کی تصویر ہے۔ اس میں ایک ریچھنی ایک فوجی کمانڈر کے ساتھ بیٹھی ہے۔ یہ ریچھنی مغربی جرمنی کی فوج میں باقاعدہ ملازم ہے۔

یہ ریچھنی لنکا کے جنگلوں میں پیدا ہوئی اور پچھلے چار پانچ سال سے جرمنی کی ایک پیرا شوٹ فوجی بٹالین میں سپہ گری کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اور کارپوں کے عہدے پر فائز ہے۔

اس بٹالین میں کوئی سپاہی یا افسر ایسا نہیں جو اس مادہ ریچھ کی دیکھ بھال پرورش اور لاڈ و پیار سے پالنے میں کوئی کسر باقی چھوڑتا ہو۔ اس بٹالین کے ایک سارجنٹ ورنر فرڈننڈ فوجی ملازمت سے پہلے اسٹوٹکارٹ کے چڑیا خانے میں جانوروں کے رکھوالے تھے۔ ایک دن انھیں جنگلی جانوروں کے کسی سوداگر کے پاس ریچھ کی یہ دودھ پیتی بچی بکتی ہوئی ملی۔ انھوں نے اسے خرید لیا۔ تب سے یہ مادہ ریچھ اس بٹالین کی ایک مستقل رکن ہے۔

وہ فوجی مشقوں کے دوران دوسرے سپاہیوں کے مانند ان خیموں میں رہتی ہے۔ پریڈوں وغیرہ کے موقعے پر اپنے کام کی سب سے پہلی گاڑی میں جسے اس کے افسر سارجنٹ ورنر فرڈننڈ چلاتے ہیں سوار ہوتی ہے اور بڑے شوق سے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر محاذ پر پرواز کرنے کی عادی ہے۔ البتہ پیراشوٹ کے ذریعے نیچے چھلانگ لگا کر اترنے کی اسے اجازت نہیں ہے۔

دنیا کا سب سے بلند پوسٹ آفس

ابھی پچھلے ہفتے لندن میں ایک پوسٹ آفس کی عمارت کا افتتاح ہوا تھا۔ یہ عمارت بھی ایک مینار کی طرح ہے جو ۶۲۰ فٹ بلند ہے۔ یہ ہمارے قطب مینار سے بھی دوگنا اونچا ہے۔ یہ مینار ۹۰ مربع فٹ کے ایک چبوترے پر تیار کیا گیا ہے۔ سب سے اوپر کی منزل پر ایک گھومتا ہوا چائے خانہ ہے جس میں ایک وقت میں ۱۲۰ آدمی بیٹھ کر چائے پی سکتے ہیں اور اگر آسمان صاف ہو تو لندن کی زندگی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

چاند پر راکٹ اتارنے کی ایک اور کوشش

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں روس نے چاند پر راکٹ اتارنے کی ایک اور کوشش کی۔ لونز ۷ نام کا یہ راکٹ جس میں کوئی آدمی نہیں بیٹھا تھا چاند پر صحیح سلامت نہیں اتر سکا بلکہ چاند کے قریب پہنچ کر اس کی سطح سے ٹکرا گیا۔

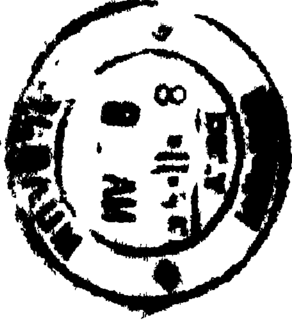

رنگ بھریے

vember, 1965

Regd. No. D. 1457

Payam-i-Taleem

New Delhi-25.



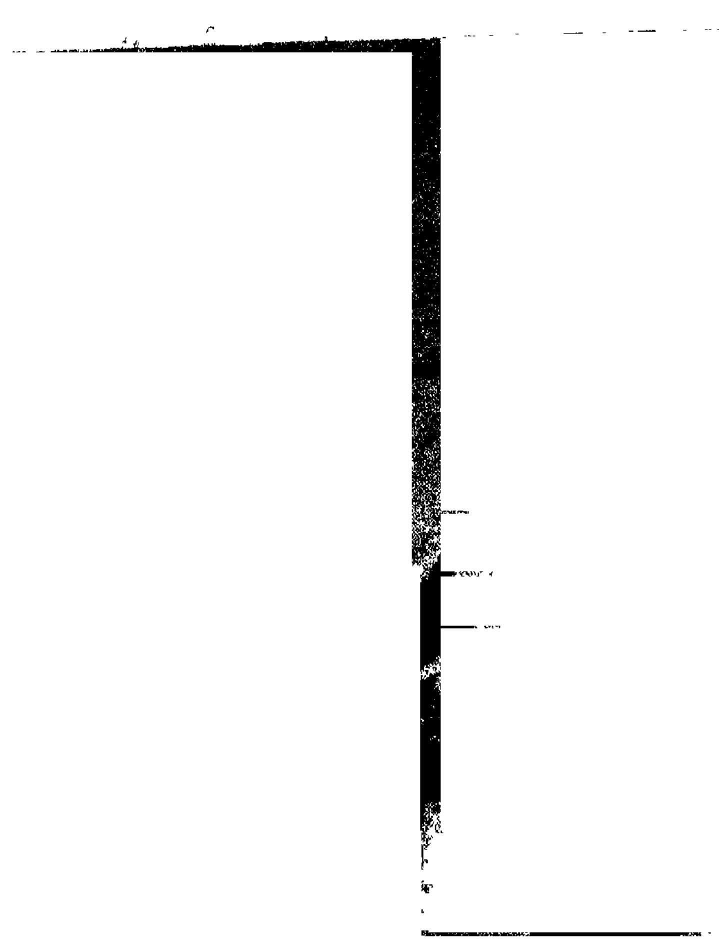
بچوں کے لئے

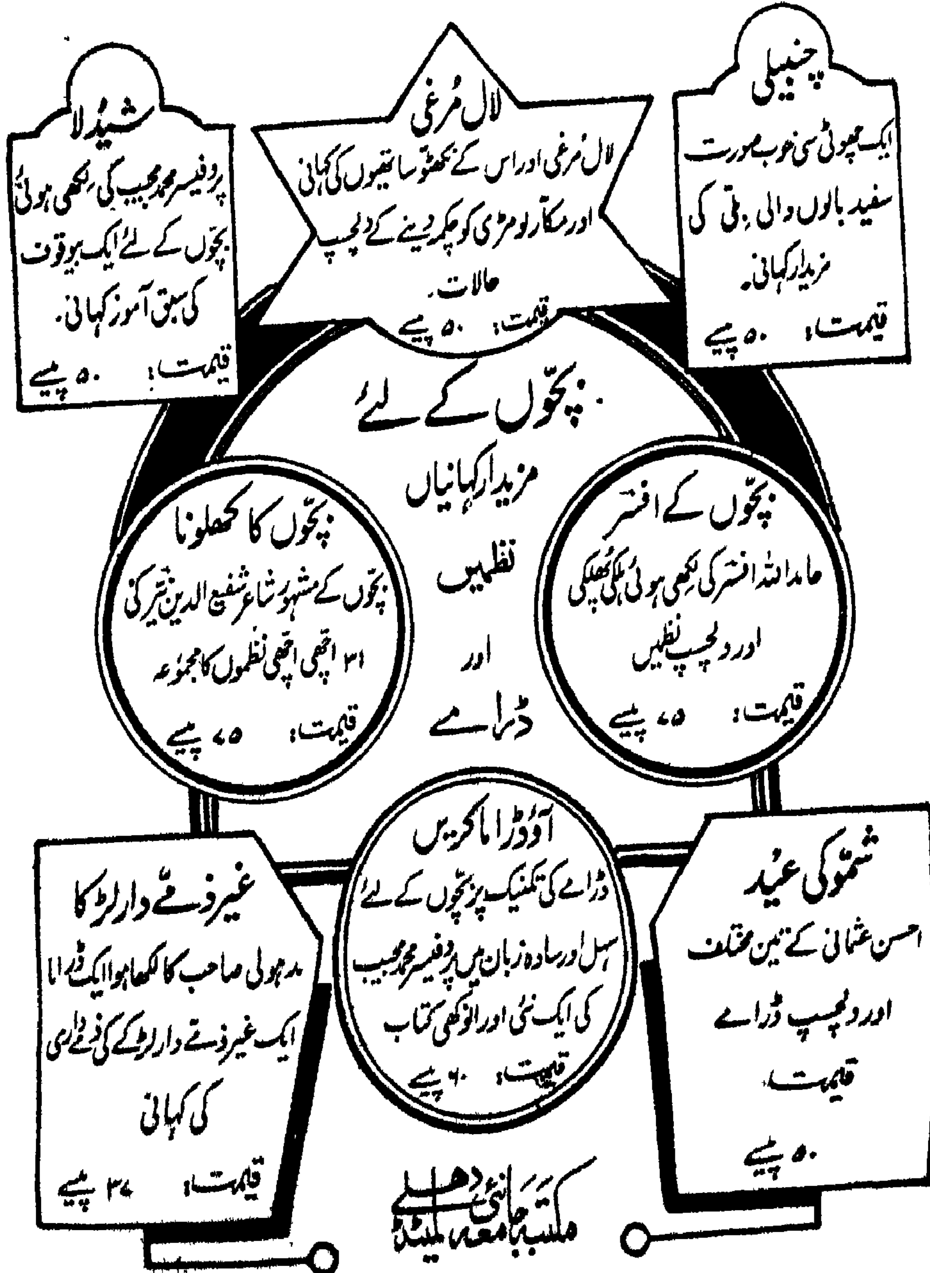
اسلو میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

	صفحات	قیمت (پیسے)
چوزہ	۱۶	۱۹
دستانہ	۲۰	۲۵
دو کہانیاں	۲۰	۳۱
گیہوں کی بالی	۱۶	۳۱
تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں	۵۲	۷۵
روی اور شمشی	۷۸	۶۹
تین بھالو	۱۶	۳۷
نیلا پیالہ	۶۴	۱۲۵
بیشکا	۱۶	۳۱

ان میں سے چوزہ ½ ۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں ½ ۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر کے سائز پر ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی



شیدلا
پروفیسر محمد مجیب کی لکھی ہوئی
بچوں کے لئے ایک بیوقوف
کی سبق آموز کہانی۔
قیمت: ۵۰ پیسے
لال مُرغی
لال مرغی اور اس کے نکھٹو ساتھیوں کی کہانی
اور مکار لومڑی کو چکمہ دینے کے دلچسپ
حالات۔
قیمت: ۵۰ پیسے
چنبیلی
ایک چھوٹی سی خوب صورت
سفید بالوں والی بلی کی
مزیدار کہانی۔
قیمت: ۵۰ پیسے
بچوں کے لئے
مزیدار کہانیاں
نظمیں
اور
ڈرامے
بچوں کا کھلونا
بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیر کی
۳۱ اچھی اچھی نظموں کا مجموعہ
قیمت: ۷۵ پیسے
بچوں کے افسر
حامد اللہ افسر کی لکھی ہوئی ہلکی پھلکی
اور دلچسپ نظمیں
قیمت: ۷۵ پیسے
غیر ذمے دار لڑکا
مدھولی صاحب کا لکھا ہوا ایک ڈراما
ایک غیر ذمے دار لڑکے کی ذمے داری
کی کہانی
قیمت: ۳۷ پیسے
آؤ ڈراما کریں
ڈرامے کی تکنیک پر بچوں کے لئے
سہل اور سادہ زبان میں پروفیسر محمد مجیب
کی ایک نئی اور انوکھی کتاب
قیمت: ۶۰ پیسے
شمو کی عید
احسن عثمانی کے تین مختلف
اور دلچسپ ڈرامے
قیمت:
۵۰ پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۲ — دسمبر ۱۹۶۵ء — شمارہ ۱۲

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی
آرٹسٹ : گیڈون میسی



سالانہ چندہ : —— پانچ روپے
فی پرچہ : —— پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

فہرست

بچوں سے باتیں

اب کی ہماری جامعہ میں تعلیمی میلا ۲۹ راکتوبر کی جگہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں منایا گیا۔ یہ میلا امید سے بھی کہیں زیادہ دھوم دھام سے ہوا۔ آج کل کے حالات کی وجہ سے پہلے تو جامعہ کے کارکن کشمکش و پنج میں تھے، کوئی بات طے نہ کر پائے تھے۔ پھر اچانک حالات بدلے۔ لڑائی بند ہو گئی۔

پر اب میلے کی تیاری کے لیے وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ کام کرنے والوں کو دوگنی محنت کرنا پڑی۔ شکر ہے کہ خدا نے ان کی محنت کو کامیاب کیا۔ میلے کے سارے پروگرام بہت خوش اسلوبی سے انجام پائے۔ تفصیلی حالات آپ جنوری میں پڑھیے گا۔ بہت دلچسپ ہوں گے۔

پیامِ تعلیم کا اگلا پرچہ جنوری کا ہوگا۔ ہم بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ یہ پرچہ خاص نمبر کے طور پر نکالا جائے۔ موجودہ ہنگامی حالات نے ہمیں بھی کشمکش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ مگر مکتبے کے مخلص کارکنوں کی بدولت یہ مسئلہ حل ہو گیا، جلد حل ہو گیا۔ ہم مجیب احمد خاں

صاحب اور محترم سید احمد ولی صاحب کے خاص طور پر ممنون ہیں۔

تو جناب جنوری کا یہ پرچہ خاص نمبر ہوگا۔ اس میں بہت اچھی اچھی چیزیں ہوں گی، کہانیاں بھی، ڈرامے بھی، مضمون بھی، پیاری پیاری نظمیں بھی۔ اچھی اچھی تصویریں بھی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خاص نمبر آپ کو پسند آئے گا، بہت پسند آئے گا۔

ہمارے دو خاص نمبروں، نہرو نمبر اور حالی نمبر کی حیثیت تاریخی یادگار کی ہو گئی ہے۔ ان کی مانگ برابر جاری ہے اور ہمیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ نئے سال کا یہ تحفہ آپ حاصل کرنا چاہیں۔ تحفے کے طور پر اپنے ساتھیوں، عزیزوں کو دینا

چاہیں تو منیجر پیام تعلیم کو ایک کارڈ ڈال دیجیے۔ کسی ایجنٹ سے خریدتے ہوں تو اسے بتا دیجیے وہ یہاں سے زیادہ پرچے منگوا لے گا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ کوئی شوقین پیامی اس سالنامے سے محروم نہ رہے۔

لیجیے صاحب آپ کی بہت ہی محبوب کہانی "کوے واآوا" بھی ختم ہوئی۔ اس پرچے میں اس کا آخری حصہ چھپ رہا ہے۔ یہ ایک ایڈونچرس کہانی تھی اس لیے آپ کو بہت بھلی لگی۔ "کوے واآوا" آپ ہی کی عمروں کا تو بچہ ہے پر وہ کیسے کیسے حیرت میں ڈالنے والے کام کرتا ہے!

پر بات بس اتنی تو نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ کو اس علاقے کے ایک پرانے قبیلے کے رہن سہن کا اندازہ ہوا۔ وہاں کے جنگلوں کے درندوں، چرندوں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا حال معلوم ہوا۔ یہ معلوم ہوا کہ کوے واآوا بغیر بندوق کی مدد کے مالی تیر کمان سے کیسے شکار کرتا تھا۔ کہانی کہانی میں یہ اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔

مکتبہ آپ کی خواہش کے مطابق اسے کتابی صورت میں چھاپ رہا ہے۔ اگر آپ جلد جلد یاد دہانی کریں تو کتاب جلد چھپ جائے۔ ڈاکو کی گرفتاری کے سلسلے میں لوگوں کے خط آنے شروع ہو گئے ہیں اور مکتبہ اسے جلد شائع کرنے کا انتظام کر رہا ہے۔

پچھلے پرچے کے بارے میں پیامیوں نے بہت اچھی رائے لکھی ہے۔ مضامین میں "یادوں کے پھول"، "فیاض پور" "مانگے کا اجالا" "ستاروں سے آگے" "بائیسکل یا چھتری"، کہانیوں میں "یونیفارم"، "ڈاکو کی گرفتاری" "کوے واآوا" بہت پسند کیے گئے۔ نظموں میں ڈامو دھوبی، ہونہار بچے، چندا ماموں، سپیرا کی پیامیوں نے خاص طور پر تعریف کی ہے۔ جادو کا بٹوا بھی خاصے کی چیز ہے۔

کسی پچھلے پرچے میں ہم نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر محترم تاباں صاحب چھپائی کے سلسلے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرنے تین مہینے کے لیے جرمنی تشریف لے گئے تھے۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ محترم موصوف انگلستان اور روس ہوتے ہوئے (۲۱ نومبر) واپس تشریف لے آئے۔ ہم پیام تعلیم کی طرف سے، اپنے پیامیوں کی طرف سے تاباں صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کی معلومات سے [illegible] بہت فائدہ پہنچے گا۔



شرف علی بریلوی

اچھی باتیں

خدا ہی کو زیبا یہ حمد و ثنا ہے
نہیں جس کا ثانی کوئی دوسرا ہے

اسی کی ہی قدرت سے سب کچھ بنا ہے
وہی سب کا خالق ہے رب ہے خدا ہے

وہی ہے رکوع اور سجدے کے لائق
وہی بندگی اور عبادت کے لائق

نبیؐ نے یہ بچوں کو تعلیم دی ہے
کہ ماں باپ کا حق تمھارے یہی ہے

کرو ان کی خدمت جو توفیق دی ہے
اسی میں تمھارے لیے بہتری ہے

جو ماں باپ کو تم نے راضی کیا ہے
تو بیشک خدا تم سے راضی ہوا ہے

انھوں نے تمھیں کس مصیبت سے پالا
نہ دن رات دیکھا نہ دیکھا اُجالا

جو روئے ذرا تم تو تم کو سنبھالا
اگر سو گئے تم تو جھولے میں ڈالا

ذرا تم کو دُکھ ہے تو وہ ہیں پریشاں
ذرا تم کو سُکھ ہے تو وہ بھی ہیں شاداں

تمھیں جب کسی دُکھ نے ہے آکے گھیرا
تو ماں باپ کا ہو گیا ہے سویرا

نہ کروٹ ہی بدلی نہ منھ تم سے پھیرا
کہاں نیند ان کو ہے دل پر اندھیرا

جو کھایا پیا تم نے وہ بھی ہیں کھاتے
تمھیں سو کے بستر پہ ہیں وہ سُلاتے

ادب اپنے ماں باپ کا تم کرو گے
تو دُنیا میں عزّت سے تم بھی رہو گے

حقوق ان کے سارے ادا تم کرو گے
ہمیشہ دعاؤں سے تم خوش رہو گے

خدا کا نبیؐ کا، جو فرمان مانا
تو جنت میں ہو گا تمھارا ٹھکانا

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

پندرہ سیر کی اشرفی

جی! پندرہ سیر کی اشرفی؟ کیا یہ کوئی جادو کی کہانی ہے۔ بھلا پندرہ سیر کی اشرفی دیکھی ہے کسی نے؟

نہیں! جادو کی کہانی نہیں، سچ مچ کی بات ہے۔ تم نے سنا ہوگا اسی ہندوستان میں جہاں ہم تم رہتے ہیں، جہاں کپ کپاتی سردی، جھلستی گرمی، اور برسات کی بہار آتی ہے۔ کالے کالے بادل جھومتے برستے اور جل تھل کر دیتے ہیں، اسی ہندوستان میں کبھی مغلوں کا خاندان تھا جس میں بڑے بڑے بادشاہ تھے، ایسے بادشاہ جو گھوڑوں پر چڑھ کر سیکڑوں کوس کا دھاوا بولتے تھے۔ لڑتے تھے حکومت کرتے تھے، غریبوں کی سیوا کرتے تھے، دوستوں کو مالا مال کر دیتے اور دشمنوں کا برا حال کر دیتے تھے۔

ان بادشاہوں میں شاہ جہاں تھا، شاہجہاں کا باپ جہانگیر تھا۔ جہانگیر کا باپ اکبر تھا، اکبر کا باپ ہمایوں تھا جس کا سنگ مرمر کا مقبرہ نظام الدین کے قریب ہر مسافر سے کہتا ہے کہ مجھے دیکھو، میری اوپری منزل دیکھو جس میں بھول بھلیاں ہے جہاں جاکر ہر ایک بھول جاتا ہے کہ کہیں کدھر جانا چاہیے اور کدھر سے نکل کر باہر آنا چاہیے۔

اور پھر نیچے کی منزل دیکھو اور تہہ خانے میں جاکر خاک کا وہ ڈھیر دیکھو جس میں ہمایوں بادشاہ دبا پڑا ہے اور قیامت تک دبا پڑا رہے گا اور سوچو کہ ہر انسان کا آخر انجام یہی ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر خاک کے ڈھیر میں دبایا جاتا ہے۔

اسی ہمایوں کا باپ بابر تھا، بابر ہندوستان آیا اور پانی پت کی لڑائی لڑی تو خوب لوٹ مار ہوئی۔ ہمایوں کی بہن گل بدن نے اپنی کتاب میں جس کا نام ہمایوں نامہ ہے، لکھا ہے کہ اس لڑائی میں پانچ بادشاہوں کی دولت بابر بادشاہ کے

ہاتھ لگی۔

اس سے پہلے جتنے بادشاہ آئے انھیں دولت ملی تو خزانے میں جمع کی مگر بابر نے سارا خزانہ لٹا دیا۔

بابر کے ساتھیوں میں ایک تھے خواجہ کلاں بیگ۔ کچھ دن ہندوستان میں رہ کر گھبرا گئے تو بادشاہ سے کہا: "بادشاہ سلامت، اب میرا جی نہیں لگتا، کابل کی یاد آتی ہے، اجازت ہو تو کابل چلا جاؤں"۔ بادشاہ نے روکنا چاہا مگر خواجہ کلاں رکے نہیں۔ بادشاہ نے اجازت دیدی اور ان کو بہت سے تحفے دیے اور ایک فہرست لکھ کر دی جس میں ہر ایک تحفے کا نام اور جسے یہ تحفہ دیا جانے والا تھا اس کا نام لکھ کر دیدیا۔ اور خواجہ کلاں کو ہدایت کی کہ کابل پہنچ کر یہ تحفے بیگمات کو، ہماری بہنوں اور گھر کی عورتوں کو دیدینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ جب یہ تحفے دو تو دیوان خانے کے باغ میں ایک جلسہ کرنا جس میں تمام عورتوں کو بلانا اور پھر ہر ایک بیگم کو تحفہ دینا۔

بابر بادشاہ نے ہر ایک بیگم کو ایک ناچنے والی چھوکری، ایک سونے کی رکابی جس میں لعل، موتی، یاقوت، ہیرے، زمرد، فیروزے، زبرجد، لبالب بھرے تھے۔ دو چھوٹے خوان جن میں اشرفیاں بھری تھیں اور ہر قسم کے رنگ برنگے نو جوڑے تھے دیے تھے۔

یہ تحفے بہنوں کو، بچوں کو، گھر کی عورتوں کو، رشتہ داروں کو، اتاؤں کو اور ان کے بچوں کو دیے تھے اور یہ بھی ہدایت کی تھی کہ جو لوگ مجھے دعائیں دیتے ہیں سب کو الگ الگ اشرفیوں اور جوڑوں کے حصے دینا۔

خواجہ کلاں تحفے لے کر کابل پہنچے تو دیوان خانے کے باغ میں بڑا شان دار جلسہ کیا۔ قناتیں تنیں، خیمے اور سراپردے نصب ہوئے، جھنڈیاں لہرائیں اور تین دن تک دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ اچھا اب اشرفی کی بات سنو!!

بابر بادشاہ نے خواجہ کلاں کو ایک اشرفی بھی دی تھی جس کا وزن پندرہ سیر تھا۔ اور یہ کہہ دیا تھا کہ یہ چچا جان (عموی عس) کی ہے، ان سے کہنا کہ بادشاہ نے آپ کے لیے فقط ایک اشرفی بھیجی ہے۔

چچا نے یہ سن کر بہت برا منایا۔ اور تین دن تک دل میں کڑھتے رہے کہ بیگمات کو تو ایسے ایسے نفیس جوڑے، جواہرات، لعل، ہیرے، زبرجد، اور مجھے فقط ایک اشرفی!

(باقی صـ۲۳ پر)

جناب وقار احمد جامی سید پوری

لوری



اب سو جا میری جان میرے راج دُلارے
چندا کے نگر سے ہے تجھے نندیا پکارے
بے چین ہیں درشن کے لیے چاند ستارے
اب سو جا میری جان میرے راج دُلارے
نندیا ہے تیرے دُوارے کھڑی ہاتھ پسارے

یہ چاند ستاروں کی ردا تیرے لیے ہے
خوشبو سے بسی مست ہوا تیرے لیے ہے
ڈوبی ہوئی نشے میں فضا تیرے لیے ہے
اب سو جا میری جان میرے راج دُلارے
نندیا ہے تیرے دُوارے کھڑی ہاتھ پسارے

چندا کے نگر لے کے تجھے جائے گی نندیا
تاروں سے بھری سیج پہ بٹھلائے گی نندیا
پریوں سے تجھے گیت یہ سنوائے گی نندیا
اب سو جا میری جان میرے راج دُلارے
نندیا ہے تیرے دُوارے کھڑی ہاتھ پسارے

جناب وقار خلیل حیدرآباد

چارمینار کی کہانی

دکن پر قطب شاہی حکمرانوں نے کئی سو سال حکومت کی۔ آج ریاست آندھرا پردیش کا جو رقبہ اور علاقہ ہے بالکل یہی رقبہ اور علاقہ قطب شاہی حکومت میں بھی تھا۔

اسی قطب شاہی سلسلے کے پانچویں جلیل القدر بادشاہ محمد قلی قطب شاہ معانی (۱۵۶۵ء تا ۱۶۱۱ء) نے اپنی محبوب بیوی بھاگ متی (حیدر محل) کے نام پر حیدرآباد شہر بسایا اور اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ محمد قلی کا زمانہ آخری سولھویں صدی اور ابتدائی سترھویں صدی عیسوی کا دور ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب ایران، ترکی، برطانیہ اور ہندوستان میں صحت مند اور نئے تصورات ابھر رہے تھے۔ انگلستان میں ملکہ الزبتھ کی حکومت تھی اور لندن شہر بلکہ پورا انگلستان انگریزی کے مشہور شاعر شکسپیر کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب امریکہ کے مشہور شہر نیویارک کی بنیاد ڈالی گئی، ادھر دکن میں محمد قلی نے اپنی تخت نشینی کے تقریباً ۱۲ سال بعد ۱۵۹۱ء میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان میں شہنشاہ جلال الدین اکبر کی حکومت تھی۔ اکبر کے ہم عصر بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ دکن میں گنگا جمنی ہندی ایرانی روایات کو سمو کر مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی بنیاد رکھ رہے تھے۔

محمد قلی اور اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب غلام ربانی نے ایک جگہ لکھا ہے: "محمد قلی، اکبر کا ہم عصر تھا۔ دولت میں قطب شاہی حکومت، مغلیہ سلطنت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گولکنڈہ اس وقت ہیروں کا شہر کہلاتا تھا۔ اکبر نے نیا شہر

فتح پور سیکری آباد کیا تو محمد قلی نے حیدر آباد بسایا۔ اکبر
نے فتح پور میں بلند دروازہ بنوایا تو محمد قلی نے
حیدر آباد میں چار مینار تعمیر کرایا۔ اکبر کی ایک بیوی ہندو
تھی، محمد قلی کی ایک بیوی بھی ہندو تھی۔ اکبر نے شرع
کے خلاف داڑھی صاف کرائی اور کھڑکی دار پگڑی
سر پر رکھ کر راجپوتی وضع اختیار کی تو محمد قلی نے بھی
داڑھی کو خیر آباد کہا اور کشتی وضع قطع اختیار کی۔ اس
کی تصویر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ترکمان تھا۔
اکبر کو اپنی رعایا سے محبت تھی تو محمد قلی کو اپنی رعایا
سے عشق تھا۔ اکبر کی حکومت اس کے مرنے پر ختم ہو گئی
لیکن محمد قلی کی حکومت (لوگوں کے دلوں پر) اب بھی
باقی ہے اور آج بھی آندھرا پردیش کے حکمران اور
عوام اس کے مزار پر حاضری دیتے ہیں، اس کے
کارناموں کو سراہتے ہیں اور عقیدت کے پھول
چڑھاتے ہیں۔" اسی محمد قلی کی یاد میں ہر سال قیام
آندھرا پردیش کے ساتھ ہی "یوم محمد قلی قطب شاہ"
کی رنگا رنگ علمی اور کلچرل تقریبیں شہر حیدر آباد میں
"ادارہ ادبیات اردو" کی طرف سے شایان شان
طریقوں پر منائی جاتی ہیں۔

چار مینار چار محال پرانے شہر حیدر آباد کے
بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس کی تعمیر کی تاریخ "یا حافظ"
سے نکلتی ہے۔

کہتے ہیں یہ عمارت حضرت امام حسینؓ کے تعزیہ
کی یادگار ہے۔ اس ۱۸۹ فٹ اونچی اور سڈول عمارت
کی تعمیر خاص ڈھنگ اور سلیقے سے ہوئی۔ اس کے
چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنوائی گئیں جو آج بھی
آباد ہیں۔ ان سڑکوں کے ساتھ ساتھ خوب صورت
محل اور ۱۴ ہزار دو منزلہ دوکانیں آباد تھیں۔
اب محل تو باقی نہیں رہے مگر دوکانیں اب بھی ہیں۔
ان کے علاوہ مکہ مسجد ہے، جامع مسجد ہے اور نظام میر
عثمان علی خاں کی جشن سلور جوبلی کے موقع پر تعمیر کردہ
دواخانہ یونانی کی خوب صورت عمارت ہے۔

"چار مینار" تمام کا تمام پتھر کا بنا ہوا ہے جس
کے نیچے چاروں سمتوں پر چار کمانیں ہیں اور ان کے
اوپر دو کمرے ہیں جہاں کسی زمانے میں "مدرسۃ العلوم"
کے نام سے ایک مدرسہ قائم تھا۔

چار مینار کا ہر پہلو سو فٹ کا ہے۔ چاروں کونوں
پر چاروں کمانوں میں سے ہر ایک کی بلندی ۱۸۴
فٹ ہے۔ چار مینار کی چھت کے کناروں پر سنگین
پیش دالان ہیں جن کے باہر کی طرف چھوٹی چھوٹی سی
کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ اندرونی اور بیرونی حصوں میں
خوب صورت اور رنگا رنگ گل بوٹوں کے دیکھنے سے

قطب شاہی طرز تعمیر کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ فرانسیسی
سیاح موسیو تھاونٹ اور ٹیورنر کے علاوہ ولیم میتھولڈ
اور ممتاز مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے بھی چار مینار
کے فن تعمیر اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کی ہے۔

"چار مینار" کے فن تعمیر میں یہ بات خاص طور
پر قابل غور ہے کہ اس عمارت کی عالی شان جسامت
اور بلندی کے ساتھ ساتھ اونچی کمانوں اور بلند
میناروں کا تناسب اس انداز سے قائم کیا گیا ہے کہ پوری
عمارت ہلکی پھلکی اور سبک دکھائی دیتی ہے۔ اور
بیچ شہر میں واقع ہونے کے سبب یہ ایسی لگتی ہے جیسے
انگوٹھی میں نگینہ۔ چار مینار کی تعمیر ڈیڑھ دو سال میں
مکمل ہوئی اور اس پر تین لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

خود محمد قلی اپنی مشہور نظم "مناجات" میں
خدائے تعالیٰ سے جہاں اور بہت سی باتوں کی التجا
کرتا ہے وہیں اپنے شہر کے ان آثار کی معموری اور
آبادی کی بھی دعائیں کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں مَن یا سمیع

"چار مینار" کے اوپر ایک مسجد (جسے بعض
مورخوں نے مدرسۃ العلوم کہا ہے) اور مسجد کے
ساتھ ایک حوض بنایا گیا تھا اس حوض میں تالاب
جل پلی سے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تالاب ۱۷۷۱ء تک
باقی تھا۔ اسی حوض کا پانی اطراف و اکناف کے محلوں
کو سیراب کرتا تھا۔ اس کے علاوہ چار مینار کی چاروں
سمتوں میں پانی کی نہریں اور مٹی کے نلوں کا جال بچھا
تھا جن سے لوگ بآسانی پانی حاصل کر سکتے تھے۔

چار مینار کے بالائی حوض کے علاوہ نیچے بھی ایک گول
حوض بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک بہت بڑا فوارہ تھا
جو پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ دو ہاتھی اور دو شیر
پتھر سے تراشے گئے تھے جو ایک دوسرے کے مقابل
کھڑے ایک دوسرے پر پانی پھینکتے تھے۔ تاریخوں
میں لکھا ہے کہ یہ فوارہ مغل قبضہ کے بعد بت پرستی
کی علامت سمجھ کر توڑ دیا گیا ان کے ٹوٹے ہوئے پتھر
نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے زمانے میں چار مینار
کے قریب پڑے ہوئے تھے۔ قطب شاہی سلطنت
کے خاتمے کے بعد صوبیدار بہادر دل خاں کے زمانے
میں چار مینار کا جنوب مغربی مینارہ بجلی کے صدمے
سے گر گیا تھا جس کی تعمیر اسی زمانے میں ساٹھ ہزار
روپے سے کرائی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں ناصر الدولہ کے عہد
میں ایک لاکھ روپے کے خرچ سے چار مینار پر باریک
چونے کی استرکاری بھی ہوئی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں لارڈ
ڈفرن وائسرائے ہند کی آمد کے موقع پر چار مینار کے

گرد لوہے کا کٹہرا نصب کیا گیا اور شمال کی طرف ایک آہنی دروازہ بھی قائم ہوا۔ یہ آثار اب نہیں ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں چار مینار کی دوسری منزل پر چاروں جانب چار گھڑیال نصب کیے گئے جو آج بھی صحیح وقت دیتے ہیں۔ خاص خاص سرکاری تقریبوں کے موقعوں پر چار مینار پر بجلی کی روشنی بھی کی جاتی ہے اور یہ تاریخی عمارت بقعۂ نور بن جاتی ہے۔

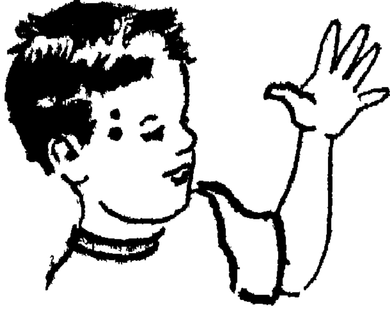
قطب شاہوں کے سنہرے کارناموں میں شہر کی تشکیل اور تعمیرات کو خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اس سلطنت کی تعمیر اور تاسیس ایسے افراد کے ہاتھوں ہوئی تھی جو بڑے تمدن کے حامل تھے اور شاندار خاندانی روایتوں کے ساتھ تلنگانے کی سرزمین میں حکمرانی کر رہے تھے۔ قطب شاہی بادشاہوں نے اپنے کو اس سرزمین میں ایسا پیوست کیا کہ دو پشتوں کے بعد وہ بالکل دکنی ہو گئے۔ نہ صرف تلگو رعایا کو اپنا تمدن دیا بلکہ بہت کچھ اُن کی روایتوں کو بھی اپنایا۔ ملک کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کے اہلِ کمال مقرر کیے۔ مقامی حسن کاروں اور کاریگروں کی ہمت افزائی کی گئی۔ ملک میں بہترین تمدنی ذخیرے جمع کیے اور لاتعداد مسجدیں، خانقاہیں، مندریں، کارواں سرائے، دواخانے، تالاب اور پُل تعمیر ہوئے جن پر آج بھی آندھرا پردیش ناز کرتا ہے۔ قطب شاہوں کے بعد آصف جاہی حکمرانوں نے بھی شہر حیدرآباد کو اپنا دارالخلافہ بنا کر اس کی تعمیر اور آرائش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اب آندھرا پردیش کا صدر مقام ہونے کے سبب حیدرآباد تعمیری اور دیگر فلاحی کاموں میں برابر ترقی کر رہا ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر دکن دیس کا وہی تمدن اب بھی برقرار ہے۔ وہی خلوص، وہی محبت، وہی رواداری، اتحاد اور بھائی چارگی کی فضا جس کا ڈول قطب شاہوں نے ڈالا تھا چار سو سال سے اب تک جاری و ساری ہے۔

بچوں سے باتیں (بقایا صد ۲ کا)

پچھلے پرچے میں بڑوں کی کوششوں کے سلسلے میں ایک مضمون نگار کا نام لکھنے سے رہ گیا ہے۔ یہ سنتوش آریہ ہیں اور تلکو ور کے مدرسے میبک (سال دوم) کی طالب علم ہیں۔

اس مرتبہ جامعہ کا نہرو انعام (ایک ہزار روپیہ) جامعہ کے پرانے طالب علم راشد نعمانی صاحب کو ملا ہے۔ آپ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ شروع سے جامعہ میں تعلیم پائی ہے۔ یہیں سے ایم اے کرنے کے بعد ٹیچرس ٹریننگ کالج میں ایم ایڈ کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔ ہم انھیں دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

محترمہ ہاجرہ بیگم

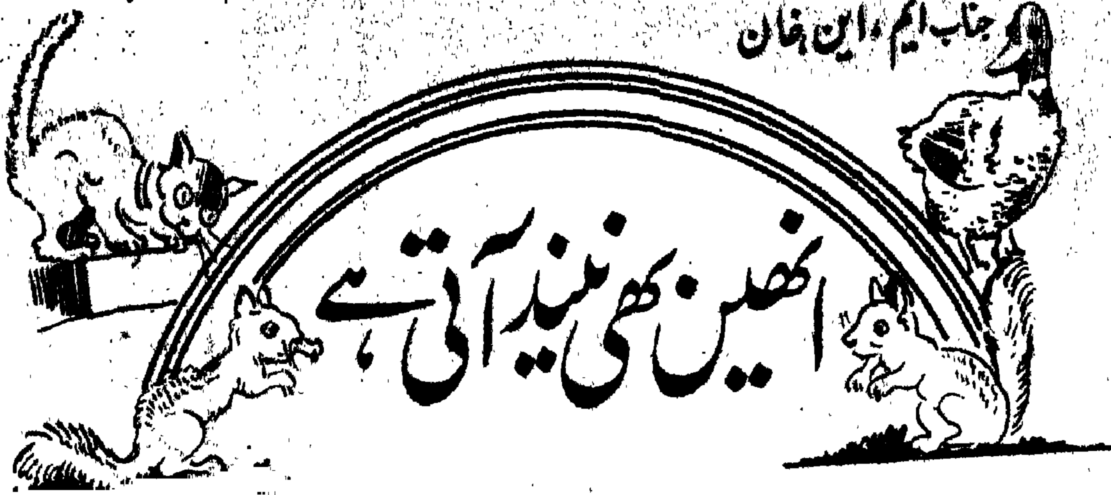


ننھی نینا



ننھی نینا روز کنویں پر پانی بھرنے جائے
سر پر رکھ کر چھوٹی مٹکی پانی بھر بھر لائے

نٹ کھٹ منو چلا گھومنے لے کر اپنی گھوڑی
لگا نشانہ، کنکر پھینکا اس کی مٹکی پھوڑی
مٹکی پھوٹی پھیلا پانی بھیگی نینا ساری
اوں اوں کر کے روتی نینا بیٹھ وہیں بے چاری



انھیں بھی نیند آتی ہے

جناب ایم، این خان

ہم اپنے گھر میں طرح طرح کے جاندار پالتے ہیں۔ کسی کے یہاں توتا ہے تو کسی کے یہاں کتا۔ کسی کو بلی اچھی لگتی ہے تو کسی کو کبوتر بھاتے ہیں۔ کہیں گائے بھینسیں پل رہی ہیں تو کہیں گھوڑے اور ہاتھی۔ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے



کہ وہ اپنے پالتو جانور کو زیادہ سے زیادہ آرام سے رکھے، وقت پر کھلائے پلائے۔

لیکن کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ جاندا سوتے کس طرح ہیں؟ انھیں بھی تو ہماری طرح آرا کی ضرورت ہوتی ہوگی، یہ بھی تو ہماری آپ کی طر سوتے ہوں گے۔

جی ہاں یہ جانور بھی ہماری آپ کی طرح آرام بھی کرتے ہیں، سوتے بھی ہیں، خواب بھی دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم گلہری کو لیتے ہیں اسے ہم آپ کبھی کبھی کٹو بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت زیادہ سونے والا جانور ہے۔ گلہری تقریباً اپنی آدھی عمر سونے میں گزار دیتی ہے۔ سردی کا موسم شروع ہوتے ہی یہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد گہری نیند سو جاتی ہے اور ساری سردی سونے میں گزار دیتی ہے۔ اس کا گھونسلا پتوں کا ہوتا ہے، یہ بہت نرم اور آرام دہ

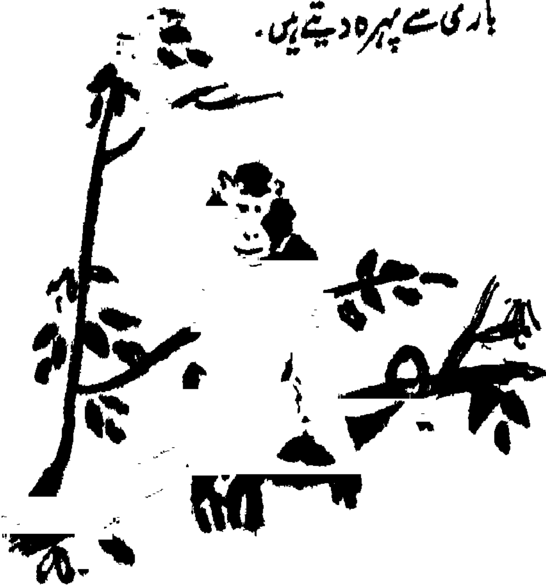
تا ہے۔ یہ کچھ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ اندر کی گرمی
ہر نہیں نکل سکتی اس وجہ سے اندر کا موسم جاڑوں
ں بھی گرم رہتا ہے ۔

ہاتھی سوتا بھی ہے اور ہماری آپ کی طرح خراٹے



ی لیتا ہے۔ اور خواب کے مزے بھی لوٹتا ہے ۔
ھی کبھی تو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر دہاڑیں بھی
رتا ہے۔ یہ اکثر زمین پر لیٹ کر سوتا ہے۔ سوتے
قت اپنی سونڈ منہ میں دبا لیتا ہے لیکن زمین پر لیٹ
سونا ضروری نہیں ہے۔ کہتے ہیں فرانس کے بادشاہ
لوئی شانزدہم کے پاس ایک ہاتھی تھا جو پانچ سال
؛ زمین پر نہیں لیٹا ۔ جب وہ سوتا تھا تو اپنی سونڈ
سے گرد پتھر کی دیوار کے سوراخوں میں پھنسا کر
اپنے سر کو آرام سے ٹیک کر سو جاتا تھا۔ ہاتھی بڑا
مدار جانور ہے۔ اُن بنوں میں جہاں ہاتھی کثرت
پائے جاتے ہیں، بہت سے ہاتھی ایک جگہ جمع
ہوتے ہیں اور کچھ ہاتھی جاگ کر باری

باری سے پہرہ دیتے ہیں۔



بندر عام طور پر اپنے پنجوں کے سہارے
درختوں کی ٹہنیوں پر سوتے ہیں۔ اکثر بندر پوال
یا پال وغیرہ کا بستر بنا کر بھی سوتے ہیں امریکہ کے
ایک چڑیا گھر میں ایک بندر اور بندریا ایک دوسرے کی
طرف رخ کر کے سوتے تھے اور اپنے درمیان اپنے
بچے کو سلاتے تھے۔ تاکہ دونوں طرف سے بچے کی حفاظت
بھی رہے اور اسے گرمائی بھی پہنچتی رہے۔

چمگادڑ لاپرواہ قسم کا جانور ہے اسے
اپنے آرام کی کوئی خاص فکر نہیں۔ یہ سردی کے
موسم میں کوئی خاص تیاری نہیں کرتا اور نہ کھانا
جمع کر کے رکھتا ہے۔ چمگادڑ آبادی سے دور بھاگتا
ہے۔ اس کا دل ویرانے میں لگتا ہے۔ اس لیے یہ

کھنڈروں، پتھر کی پرانی عمارتوں اور گنبدوں وغیرہ کو رہنے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ عام طور سے چمگادڑ درختوں کے سوراخوں اور گھاس پھوس کی چھتوں میں رہتے ہیں۔ جب یہ سوتے ہیں تو اپنے پیروں سے درختوں وغیرہ کی ٹہنیوں کو مضبوطی سے جکڑ کر لٹک جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ چمگادڑ عام طور پر دن کے اجالے میں سوتے ہیں اور رات کی تاریکی میں تفریح کرنے نکلتے ہیں۔

جاتے ہیں۔



مرغیوں کو جب نیند ستاتی ہے تو یہ اپنے پنجوں سے زمین کھودتی ہیں۔ پروں کو پھڑپھڑاتی ہیں۔ اور ایک گڑھا سا بنا کر اس میں جم کر بیٹھ جاتی ہیں اور سو جاتی ہیں۔



شیر اور چیتے یہ خونخوار درندے اپنا زیادہ وقت سونے میں گزار دیتے ہیں جب انھیں نیند ستاتی ہے تو لمبی لمبی جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ جنگلوں میں یہ درندے اپنے شکار کے گوشت سے پیٹ بھرنے کے بعد گہری نیند سو جاتے ہیں۔ جاگنے پر کچھ دیر سستاتے اور انگڑائیاں لیتے ہیں اور پھر شکار کی تلاش میں نکل

جاڑوں کے موسم میں دھوپ نکلنے پر مرغیاں بہت زیادہ سوتی ہیں۔

نیوزی لینڈ کی ووی چڑیا زمین کے اندر بِل بنا کر دن بھر سوتی رہتی ہے۔ سونے کی تیاری میں وہ اپنے سر کو کندھوں کے پروں سے باہر نکال لیتا

ہے۔ سوئیٹ پرندہ ایک دوسرے سے لپٹ چپٹ کر سوتا ہے۔

نیند آتے ہی سب ہی پرندے اپنے پر بکھیر لیتے ہیں اس طرح ان کے جسم کے اندر کی گرمی باہر نہیں نکلنے پاتی لیکن کئی پرندے سوتے وقت اپنے جسم کے تمام اعضاء کو سمیٹ لیتے ہیں۔ بہت سی چڑیاں پیڑ پر بیٹھے بیٹھے سوتی ہیں۔ لیکن سوتے وقت بھی ٹہنیوں کو اپنے پنجوں کے ذریعے مضبوطی سے پکڑ لیتی ہیں۔ اُن کے پنجوں کے نیچے والی گدّیاں اس کام میں انھیں مدد دیتی ہیں۔



کتّے اکثر کروٹ لے کر سوتے ہیں لیکن یہ اپنے پیٹ کے بل سیدھے لیٹ کر بھی سو لیتے ہیں۔ یہ سوتے میں کبھی خرّاٹے لیتے ہیں کبھی دُم ہلاتے ہیں۔ شاید یہ بھی خواب دیکھتے ہیں۔ کتّوں کے لیے نیند کھانا کھانے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر کتّے کو پانچ دن تک نہ سونے دیا جائے تو مر جائے گا۔ یہ رات بھر پہرہ دینے کے بعد صبح تڑکے ہی سو جاتا ہے۔

بلّی رات بھر کھانے کی تلاش میں پریشان رہتی ہے۔ اپنے شکار کی گھات میں گھنٹوں دبکی بیٹھی رہتی ہے۔ پیٹ بھرنے پر پیر پھیلا کر سوتی ہے۔ یہ سوتے سوتے چونکتی ہے اور چلّاتی بھی ہے۔ یوں سمجھیے کہ خواب آتے ہیں۔



سفید بھالو بھی بلّی کی طرح پیر پھیلا کر سوتے ہیں اور خواب بھی دیکھتے ہیں۔

گھوڑے کھڑے کھڑے ہی سو جاتے ہیں مگر کھڑے پیچھے والی ایک ٹانگ ڈھیلی کرکے ٹیڑھی کر لیتے ہیں جو سہارے کا کام دیتی ہے لیکن بعض اوقات یہ کروٹ لے کر بھی سوتے ہیں۔

اونٹ کے سونے کا طریقہ ہی نرالا ہے یہ گھٹنوں کے کناروں پر اپنے چاروں پیروں کو ایک لائن میں ٹکا کر کروٹ سے لیٹ جاتا ہے اور اپنی

گردن کو پیٹھ پر پھیلا کر سو جاتا ہے۔

نیند کی حالت میں بندر، گتے، بلیاں اور ایسے ہی دوسرے جانور رہ رہ کر آوازیں نکالتے ہیں اور چونکتے ہیں۔ ڈاکٹر وینڈر کے خیال کے مطابق وہ اس طرح خواب دیکھنے کا ثبوت دیتے ہیں۔

گائے بہت سیدھی ہوتی ہے۔ دانہ پانی کھانے کے بعد کئے گھنٹوں جگالی کرتی رہتی ہے، بعد میں آنکھیں بند کر کے پیر پھیلا کر بیٹھ جاتی ہے اور سو جاتی ہے۔ شہر کی گائے دیہات کی بہ نسبت زیادہ سوتی ہے۔ کھُر والے جانور لیٹتے نہیں بلکہ بیٹھے ہی بیٹھے سو لیتے ہیں۔

پالتو بھینسیں بھی اسی طرح بیٹھ کر سوتی ہیں لیکن اگر پانی سے بھرا کوئی گڈھا مل جائے تو یہ کیچڑ میں آرام کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ یہ سب چوپائے آرام کے وقت جگالی ضرور کرتے ہیں۔ اور جگالی کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جے جے پیلے کا خیال ہے کہ وہیل مچھلی چٹانوں پر جا کر سو جاتی ہے۔ سوتے وقت یہ پانی میں بھیگنا پسند کرتی ہے۔ جیسے جیسے یہ سوکھتی جاتی ہے ویسے ہی ویسے اس کی نیند گہری ہوتی جاتی ہے۔ مچھلیوں کے سونے کے بارے میں ابھی سائنس داں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچے۔ لیکن ان کی کئی قسموں کے رہن سہن عادات و اطوار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مچھلیاں بھی سوتی ہیں۔ ماؤتھ بارڈر مچھلی رات ہوتے ہی اپنے بچوں کو اپنے منہ میں رکھ لیتی ہے۔ اسی طرح بندرگاہ میں تیرنے والی مچھلیاں رات میں بندرگاہ کی بتیاں جل جانے کے بعد تیرنا بند کر دیتی ہیں اور ٹیڑھی ہو کر سو جاتی ہیں۔ سارس جیسے پرندے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ہی سو جاتے ہیں۔ ہنس اور بطخیں عام طور پر پانی پر ہی سو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ سردی کے اچانک بڑھ جانے سے یہ سوتے ہوئے جانور پانی کے ساتھ ہی جم جاتے ہیں۔ مینڈک ٹھنڈے خون کا جانور ہے سخت گرمی اور سخت سردی کے موسم میں یہ زمین کے اندر گھس جاتا ہے اور مہینوں سوتا رہتا ہے۔





جناب شمشاد ادیب سہارنپوری

ہندوستاں ہمارا



یہ شانتی کا حامی
یہ امن کا پیامی
یہ دوستوں کا ضامن
یہ دشمنوں کا محسن
یہ آشتی کا رہبر
یہ پریم کا پیمبر
یہ علم و فن کا محور
یہ ویرتا کا پیکر
یہ "تاج" کا نگہباں
یہ "ایلورا" پہ نازاں
یہ شان ہے جہاں کی
یہ جان ہے جہاں کی
یہ "وشو" کا ہے پیارا
یہ جگ کا ہے دلارا

"سارے جہاں سے اچھا
ہندوستاں ہمارا"

جامعہ میری نظر میں



۲۹ اکتوبر کو جامعہ کا یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد اسی دن پڑی تھی۔ اسی زمانے میں جامعہ کا تعلیمی میلا بھی ہوتا ہے۔ یہ مضمون اسی تقریب میں شائع کیا جاتا ہے۔ مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے جامعہ پر مضمون لکھے تھے۔ سید احمد علی صاحب نے ان مضامین میں سے مختلف ٹکڑوں کو اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ جامعہ کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پیامی اس مضمون کو غور اور توجہ سے پڑھیں گے اور اچھا اثر قبول کریں گے۔

ایڈیٹر

جامعہ میں کئی ادارے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی، جامعہ کالج اور استادوں کا مدرسہ وغیرہ۔ میں مدرسہ ابتدائی کا طالب علم ہوں۔ اس لیے میں اس ادارے کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں۔ میں یہاں تین سال سے پڑھ رہا ہوں اس سے پہلے میں نے کئی اسکولوں میں پڑھا ہے اردو کم جاننے کی وجہ سے پانچویں جماعت پاس کرنے کے باوجود جامعہ میں میرا داخلہ چوتھی جماعت میں ہوا تھا۔ اس اعتبار سے میں جامعہ کی تعلیم کا دوسرے مدرسوں کی تعلیم سے اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میری نظر میں اُن مدرسوں کی باتیں بھی ہیں اور اس مدرسے کی بھی۔ مضامین کی تعلیم وہاں بھی ہوتی تھی اور جامعہ میں بھی ہوتی ہے۔ وہاں بھی امتحانات ہوتے تھے۔ طلباء کامیاب ہوتے تھے ناکام ہوتے

تھے۔ ڈویژن لاتے تھے، فرسٹ ہوتے تھے، سکنڈ ہوتے تھے۔ جامعہ میں بھی یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

لیکن ہم اور آپ جانتے ہیں کہ ہماری اور آپ کی پوری تسکین ان مضامین کی تعلیم سے، ان امتحانات اور ان نتائج سے نہیں ہوتی۔ ہماری اور آپ کی طبیعتیں بہت سی دوسری باتوں کے لیے بھی بے تاب رہتی ہیں، مچلتی رہتی ہیں۔ ان میں خود کچھ کرکے سیکھنا، خود کچھ بنانا، مزید معلومات کے لیے بے تاب رہنا، اپنے مشاہدوں سے نئی نئی باتوں میں اضافہ کرتے رہنا اور ان تمام کاموں میں آزاد رہنا، آزادی سے سوچنا، آزادی سے کرنا اور بوقت ضرورت اپنے استادوں سے مدد لینا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں جامعہ میں ان باتوں کی تسکین کے لیے کتنے مواقع ہیں۔

سید جاوید علی

اس مدرسے میں کبھی کھلی ہوا کا مدرسہ تھا اور خود کرکے سیکھنے کے جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ نئی نئی چیزیں بنتی تھیں اور نئے نئے ڈھنگ سے بنتی تھیں۔ ہر طالب علم کی مصروفیت قابل دید ہوتی تھی۔ اب بھی کرکے سیکھنے کے بہت سے مواقع ہیں۔ اس کے لیے بچوں کی حکومت کا الیکشن اور ایک دن کا مدرسہ ہمارے لیے خود کرکے سیکھنے کا اچھا موقع فراہم کرتے ہیں۔ میونسپلٹی کے بارے میں ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا اور الکشن میں ووٹ، ووٹر بلیٹ پیپر، بیلٹ باکس، پولنگ اسٹیشن اور الکشن کمشنر کے بارے میں رائے دے کر بھی معلومات حاصل کیں۔ اس طرح خود کرکے تسکین حاصل کرنے کا موقع دوسرے مدرسوں میں نہیں ہوتا۔

نگار سلطانہ

نصاب تعلیم کے علاوہ اور جاننے کی خواہش، مزید معلومات حاصل کرنے کا جذبہ ہماری فطری خواہش ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ملتا ہے جب تعلیم کے دوران آسمان پر ہیلی کوپٹر گزر رہا ہو۔ آپ جانتے ہیں ہماری کیا حالت ہوتی ہے۔ یا زلزلے کا زوردار جھٹکا آجائے تو ہم جاننے کے لیے کتنے بے تاب ہوتے ہیں۔ سوچیے کہ دوسرے مدرسوں میں اس جذبہ کو تسکین دی جاتی ہے یا دبا دیا جاتا ہے۔ جامعہ میں تو خبروں کا ہی روز ایک ایسا سلسلہ رہتا ہے جس سے بہت معلومات حاصل

ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اور جاننے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ٹیلی ویژن، تعلیمی فلمیں، ریڈیو اور اچھے پروجیکٹس کا سلسلہ بھی بڑی تسلی دیتا رہتا ہے۔ اس سے ہمارے فطری جذبہ کی تسکین ہوتی ہے۔ ان میں امتحانات نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم پورے شوق اور آزادی سے ان میں حصہ لیتے ہیں۔

منظور عالم

نئی نئی جگہوں کے دیکھنے کے لیے ہم کتنے بیتاب رہتے ہیں! بسوں اور ریلوں کے سفر میں ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے اور اگر یہ سفر مشاہدے کے لیے کیا جائے تو نئی نئی چیزوں کو دیکھنے سے ہم کتنا سیکھتے ہیں! ایک تعلیمی سفر کتنی ہی تعلیمی کتابوں کی تعلیم سے بہتر ہوتا ہے۔ مشاہدے کی تعلیم کو بغیر یاد کیے ہم عمر بھر نہیں بھولتے۔ لیکن اس طرح تعلیم دینے کا طریقہ مدرسوں میں برتا جاتا ہے۔ ہمارے مدرسے میں مشاہدے کی یہ تعلیم نہ صرف مقامی جگہوں کے دیکھنے سے ہوتی ہے بلکہ اکثر ہم دہلی سے باہر بھی اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں جاتے رہتے ہیں۔ ان تعلیمی سیروں میں ہم اپنی سمجھ بوجھ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور ان لمحات کی یاد ہمیں اکثر آتی رہتی ہے۔ ان تعلیمی سیروں میں تجسس اور تلاش کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ مشکل پسندی کا جذبہ تسکین پاتا ہے۔

یوسف حسین

جامعہ کے مدرسوں میں اساتذہ اور طلباء مل جل کر کام کرتے ہیں۔ یہاں اساتذہ اور طلباء کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بچوں کے بینک، بچوں کی دوکان، بچوں کا خوانچہ اور بچوں کی حکومت میں اساتذہ طلباء کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اگر غلطی ہوتی ہے تو بڑی ہمدردی سے صحیح بات بتلاتے ہیں۔ ان تمام جگہوں پر طلباء ہی مہمانوں کو ان شعبوں کے بارے میں صحیح معلومات دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیل، ڈراموں کی ریہرسل اور میلے کی تیاری کے موقعوں پر یہ تعلق اور بھی قریب اور مضبوط نظر آتا ہے۔ اس وقت استاد بھی ہمیں میں سے ایک فرد کی حیثیت سے ہماری مدد کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ہم میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ اور زیادہ بڑھتا ہے۔ دوسرے مدرسوں میں یہ تعلق بہت کم ہوتا ہے یا ہوتا ہے تو چند طلباء تک محدود رہتا ہے۔

ذمہ داری کی تعلیم بھی بینک، دوکان، خوانچہ

اور مرغی خانہ میں کام کرنے سے ملتی ہے۔ اگر ذمہ داری، دیانت داری، وقت کی پابندی، اور بچوں کی اپنی سمجھ بوجھ سے کام کرنا سکھانا ہے تو اس کی عملی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ صرف کتابوں میں پڑھا دینے سے یہ خوبیاں نہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان خوبیوں کی تعلیم کا ذریعہ تو کوئی ذمہ داری کا کام ہی ہوگا۔ خواہ وہ مرغی خانہ ہو خواہ ایک دن کا مدرسہ۔

افسر امین

جامعہ میں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے۔ اس لیے اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔ اپنی مادری زبان سے ہر ایک کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ جہاں جہاں اردو زبان جاننے والوں کے لیے دوسری زبان ذریعہ تعلیم ہے وہاں یہ قدرتی لگاؤ نہیں ہے۔ سیکھنے کی رفتار کم ہے اور بڑی مشکل سے امتیازی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ سیکھنے کے حوصلے پست رہتے ہیں۔

حبیبہ خاتون

جامعہ میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ جہاں مسلمان طلباء کو ان کے مذہب کے بارے میں بتلایا جاتا ہے وہاں ہندو اخلاقیات کا بھی انتظام ہے۔ اس مذہبی تعلیم کی بنیاد تعصب پر نہیں ہے بلکہ آپس کی رواداری پر ہے۔ مسلمان، ہندو اور سکھ طلباء مل جل کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسا دوسری جگہوں پر بھی ہوتا ہے مگر جیسی جامعہ میں رواداری کی فضا دیکھنے میں آتی ہے دوسری جگہ یہ بات نہیں ہے۔ جامعہ رواداری کی تعلیم میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

مجیب الحق

(بقایا صـ۲ کا)

بادشاہ نے خواجہ کلاں سے کہہ دیا تھا کہ اشرفی میں باریک سوراخ کرکے ریشم کی ڈوری ڈالنا اور چچا جان کی آنکھیں بند کرکے اشرفی گلے میں ڈال دینا۔

چچا جان کے گلے میں اشرفی ڈالی گئی تو پہلے پہلے تو پندرہ سیر کے بوجھ سے بڑے گھبرائے مگر جب پتہ چلا کر خالص سونے کی اشرفی ہے تو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر چیخنے لگے۔ "خبردار میری اشرفی کے قریب کوئی نہ آئے۔ یہ سونے کی اشرفی ہے، سونے کی!"

چچا جان کی یہ بات سن کر سب جلسے والے ہنس پڑے اور جلسہ ختم ہوگیا۔

جناب کوثر اعظمی

درسِ عمل



(اس کھلنڈرے بچے کے نام جو امتحان میں ناکام ہو کر روتا ہے)

چاہے نہ کوئی کچھ بھی لیکن چاہے سے کہاں کچھ ہوتا ہے

آتا ہے وہی اک دن آگے، انسان یہاں جو بوتا ہے

غفلت کا صلہ جز ناکامی کیا اور بھلا ہوتا غافل

اے طفلک ناداں بیٹھ کے اب بے کار عبث تو روتا ہے

کب علم سی دولت ملتی ہے بے شوق و طلب بے محنت کے

کیا خاک بھلا وہ پائے گا، کم بخت جو غافل سوتا ہے

کچھ وقت کی اپنے قدر کرو، یہ وقت بڑی اک دولت ہے

ملتا ہے وہی پھر ہاتھوں کو بے کار اسے جو کھوتا ہے

ڈیبورسیکلج

ترجمہ: جناب مجیب احمد خاں

کومے واوا

(آخری قسط)

جس پیڑ کی کھوک میں شہد کا چھتّا تھا اُس پر چڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پیڑ بالکل سیدھا اور بہت موٹا تھا۔ پرانا ہو جانے کی وجہ سے اس کی چھال اُتر چکی تھی۔ تنا بالکل چکنا پڑ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ چھوٹا سا لڑکا اس پر کیسے چڑھ پائے گا۔

کومے واوا نے پیڑ کے پاس پہنچتے پہنچتے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی چھال کھول لی تھی اور اس کے دونوں سروں کو ملا کر گرہ لگا دی تھی۔ جڑ کے پاس پہنچ کر اُس نے چھال کے اس پھندے کو انگریزی کے ہندسے 8 کی شکل کا بنایا۔ اس کے دونوں حلقوں میں اپنے پیروں کے پنجے ڈالے۔ دونوں ہاتھوں سے پیڑ کی گولی بھری اور پھندے سمیت پیروں کو پیڑ کے تنے پر جما دیا۔ دوسرے لمحے وہ بندر کی طرح تیزی کے ساتھ پیڑ پر چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بارہ گز اونچی کھوک کے پاس پہنچ گیا۔ پیروں والی چھال کو نکالا اور پیڑ کے ساتھ لپیٹ دے کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ اب ایک طرح وہ پیڑ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔

کھوک کے اندر کا سوراخ جس میں سے شہد کی مکھیاں آتی جاتی تھیں بہت چھوٹا تھا۔ کومے واوا کا ہاتھ کھوک

کے اندر نہ جا سکا۔ اس نے اپنی کمر سے چاقو نکالا اور سوراخ کو بڑا کیا۔ جب سوراخ کافی بڑا ہو گیا تو اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا۔ شہد سے بھری ایک ٹکڑی باہر نکالی اور اس کو بانس کی نلکی میں نچوڑ لیا۔ اس طرح اس نے چار ٹکڑیاں نکالیں اور ان کا شہد نلکیوں میں جمع کر لیا۔ پھر اس نے شہد سے لت پت ہاتھ مزے لے کر چاٹے۔ ہزاروں مکھیاں اس کے آس پاس بھنبھنا رہی تھیں مگر کسی مکھی نے اسے کاٹا نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کوے وادا نے ان پر کوئی منتر کر دیا ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ بعد میں کوے وادا نے مجھے بتایا کہ شہد کی یہ مکھیاں کاٹنا نہیں جانتیں۔

کوے وادا اطمینان سے نیچے اترا۔ جھاڑی میں الجھی ہوئی اسی بیل کے ذریعے اس نے پہلے کی طرح نالا پار کیا اور تیز تیز قدموں سے میرے پاس آگیا۔ ہم دونوں نے جی بھر کر شہد کھایا۔ شہد بہت میٹھا اور خوشبودار تھا۔ ہلکی سی تیزابیت نے اس کو اور مزے دار کر دیا تھا۔ جب ہماری طبیعت شہد سے بھر گئی تو کوے وادا نے بانس کی پتیوں کی ڈاٹ بنا کر نلکیوں کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اب شہد گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کوے وادا [illegible]

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کوے [illegible] سے سوال کیا۔

"اناناس لینے ـــــ معلوم ہے میں نے پیڑ پر سے کیا دیکھا؟ اناناس کا بڑا سا کھیت۔ بس ان پیڑوں سے آگے نکلتے ہی ہم اناناس کے کھیت میں ہوں گے۔" کوے وادا نے سامنے والے پیڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور واقعی دس منٹ کے بعد رام بانس سے ملتی جلتی جھاڑیوں کا ایک بڑا قطعہ ہمارے سامنے تھا۔ ان جھاڑیوں کی پتیاں تلوار کی طرح لمبی تھیں۔ ہر پتی کے دونوں کناروں پر مڑے ہوئے باریک کانٹوں کی باڑیں تھیں۔

ان کو دیکھتے ہی میں نے کوے وادا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہی تو ہیں اناناس کی جھاڑیاں۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ مدھو بھگت!" کوے وادا نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر وہ کانٹوں سے بچتا بچاتا اس کھیت کے اندر گھس گیا۔ وہاں سے چاقو سے ایک پیڑ کی پتیاں [illegible] کے بیچ میں ہاتھ ڈال کر [illegible] ہاتھوں میں اٹھا [illegible]

یہ پھل تربوز کے برابر تھا اور اس کا رنگ ہلکا نارنجی تھا۔ کوسے واوآ نے اس کو اچھال کر میری طرف پھینکا۔ میں نے اسے لپک تو لیا لیکن میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ انناس کے پھل کے آس پاس بھی کانٹوں بھری پتیاں ہوتی ہیں۔ یہی باریک باریک کانٹے میری ہتھیلیوں میں چبھ گئے تھے۔ میں نے اپنی تکلیف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس لیے کہ ننگ دھڑنگ کوسے واوآ کٹیلی جھاڑیوں کے اندر گھسا ہوا انناس کاٹ رہا تھا۔ کانٹے لگنے سے اس کے بدن پر جگہ جگہ خون کی بوندیں چھلک آئی تھیں۔ مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس کے سامنے مجھے اپنی معمولی تکلیف کا اظہار کرنے سے شرم آ رہی تھی۔

کوسے واوآ نے ایک کے بعد ایک کوئی پچیس تیس انناس کاٹ کر میری طرف اچھالے۔ میں ان کو ایک جگہ پر ڈھیر کرتا گیا۔ اس کے بعد کوسے واوا کھیت سے باہر آ گیا۔ اس نے ایک انناس کو چاقو سے چھیلا۔ اس کے گول گول قتلے بنائے اور پھر ان پر شہد لگا کر خود بھی کھایا اور مجھے بھی کھانے کو دیا۔ انناس خود ہی کیا کم مزیدار پھل ہوتا ہے۔ اس شہد نے اس کی لذت کو اور بھی بڑھا دیا۔ اتنی مزیدار چیز میں نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔

کچھ دیر سستانے کے بعد ہم دونوں نے انناسوں کی ایک گٹھری سی بنائی اور اس کو ایک موٹے بانس میں لٹکا کر بہنگی بنا لی۔ اس بہنگی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر پسینے سے شرابور مگر خوش و خرم ہم دونوں کیمپ واپس آ گئے۔

ہمارے واپس آنے تک جہاز کی مرمت کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اور اس کو کنارے سے دور گہرے پانی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جتنی دیر میں ہم دونوں نے منہ ہاتھ دھویا، دسترخوان لگ چکا تھا۔ جی ہاں دسترخوان ــــ کیلے کے پتے بڑی بڑی گول گول تھالیوں کی شکل میں کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ پتوں کی یہ تھالیاں ایک بڑے دائرے میں سلیقے سے رکھ دی گئی تھیں۔ ان پر بھنا ہوا گوشت سجا ہوا تھا۔ ہر بڑی تھالی کے پاس ایک ایک چھوٹی تھالی تھی۔ اس پر شہد لگے ہوئے انناس کے قتلے رکھے ہوئے تھے۔

آج سب لوگوں نے ایک دعوت کی طرح مل کر کھانا کھایا۔ گوشت کھانے کے بعد انناس کھایا گیا۔ اسے سبھی نے پسند کیا۔ یہ خوب بہت مزیدار تھا۔ پھر کئی دن بعد کوئی پھل کھانے کو ملا تھا۔ اس لیے اور

بھی زیادہ مزیدار لگا۔

کھانا کھانے اور تھوڑا آرام کرنے کے بعد کپتان نے چھوٹی کشتیوں کے ذریعے لوگوں کو جہاز پر پہنچانا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر سب لوگ جہاز پر پہنچ گئے۔ میں کوے داوا کے ساتھ اس کی کینو پر جہاز کے قریب آیا۔ تمام مسافر جہاز کے نچلے حصے سے اپنا بھیگا ہوا سامان عرشے پر لانے لگے اور دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں عرشے پر چاروں طرف مختلف قسم کا سامان اور رنگ برنگے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی نمائش لگی ہو۔ جہاز کے عملے کے لوگ جہاز کی صفائی میں لگ گئے۔

میں ابھی کوے داوا کے ساتھ کینو ہی پر بیٹھا تھا، کچھ دیر بعد جب میں نے اوپر جہاز کی طرف نظر اٹھائی سب لوگوں کو عرشے کے جنگلے پر کھڑا ہوا پایا۔ سب سے آگے وہ بزرگ کھڑے تھے جنھوں نے کوے داوا کے لیے ایک تھیلی میں روپے اکٹھا کیے تھے۔ وہ کوے داوا سے بولے:

"صاحب زادے! میں اپنی طرف سے اور اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے تمھاری مدد، ہمدردی اور مہربانیوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ رقم تمھاری خدمت میں پیش کرتا ہوں جو ہم سب نے مل کر تمھارے لیے جمع کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نذرانے کو قبول کر کے ہمیں ممنون کرو گے۔"

"مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری ضرورت کی ہر چیز جنگل میں مل جاتی ہے۔" کوے داوا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بڑے میاں نے کوے داوا کے جواب کو سنا ان سنا کر دیا اور روپوں کی تھیلی کوے داوا کی کینو میں رکھ دی۔

کوے داوا نے تھیلی پر نظر ڈالی۔ پھر میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے دبایا۔ زبان سے کچھ نہ بولا۔ پانی کی سطح پر جمی ہوئی اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ اس کے دل پر کیا کیفیت گزر رہی تھی۔

"کوے داوا! تم نے جہاز اندر سے بھی دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔" کوے داوا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آؤ چلو۔ ہمارے جہاز کو دیکھو۔" میں کوے داوا کو لے کر جہاز پر چڑھ گیا۔

کوے داوا ہر چیز کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ہر چیز نئی اور انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ مہذب دنیا کی یہ چیزیں اس نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ جہاز کا پورا چکر لگانے کے بعد کوے داوا

نے واپس جانا چاہا۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر میں نے اپنا ہیٹ اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

"یہ ٹوپی اپنے پاس میری یادگار کے طور پر رکھ لو۔ اگر کبھی کوئی پوچھے کہ یہ کس نے دی؟ تو کہہ دینا میرے ایک دوست نک چیپ نے"۔

کومے وادا نے ہیٹ اتار کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور شکریے کے آنسو چمک رہے تھے۔

جہاز سے اتر کر کومے وادا اپنی کینو میں جا بیٹھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ یکایک اس نے اپنی کمان اٹھائی، چلے میں ایک تیر لگایا اور ڈوبتے ہوئے نارنجی سورج کی طرف پوری طاقت سے چھوڑ دیا۔ ایک بڑا سا قوس بناتا ہوا تیر دریا کی سطح پر کافی دور جا کر گر پڑا۔

اسی درمیان میں اس نے سر کی پٹی کے ساتھ بندھا ہوا عقاب کا پر ایک جھٹکے کے ساتھ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"نک چیپ! یہ لو میری یادگار۔ میں اب چلتا ہوں ابھی مجھے اپنا تیر دریا سے نکالنا ہے۔ دیر کروں گا تو وہ کھو جائے گا"۔

یہ کہتے ہوئے کومے وادا نے اپنے چپو تیزی سے چلانا شروع کر دیے۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں تیر گرا تھا۔ مگر وہ اسی جگہ رکا نہیں اس کے چپو اسی تیز رفتاری کے ساتھ چلتے رہے اور اُس کی کینو اسی تیزی سے آگے، اور آگے بڑھتی چلی



گئی۔ چند ہی لمحوں میں کوے دادا اور اس کی کینو شفق کے نارنجی دھندلکے میں گھل مل گئی۔

میں عرشے کے جنگلے پر جھکا ہوا اس نارنجی دھندلکے میں کوے دادا کو دیکھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ اس کا دیا ہوا پر میری انگلیوں کے درمیان سرسرا رہا تھا۔

یکایک لوگوں کی ملی جلی آواز میرے کانوں میں پڑی — "ارے دیکھو کوے دادا روپیوں کی تھیلی تو یہیں چھوڑ گیا"۔

میں نے ایک بار پھر مغرب کی طرف دیکھا کوے دادا اور اس کی کینو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

کوے دادا چلا گیا۔ اب میں شاید اس سے کبھی نہ مل سکوں گا۔ لیکن اس کی بھولی شکل، معصوم چہرہ — اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے بزرگ مالو آ کے اقوال میرے ذہن میں اب تک جوں کے توں محفوظ ہیں — عقاب کا وہ پر میرے پاس اب تک ہے۔ مجھ پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو میں اس پر کو نکال لیتا ہوں۔ اس وقت مجھے کوے دادا کا دھیان آتا ہے۔ ایمیزن کے اس جنگل کی یاد آتی ہے۔ کوے دادا کا پُر اعتماد چہرہ سامنے آجاتا ہے اور جب اس عقاب کے پر کو اپنی انگلیوں پر پھیرتا ہوں تو اس کی سرسراہٹ سے اپنے میں ہمت، جرأت اور خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا محسوس کرتا ہوں۔

(ختم شد)

ضروری اعلان

آپ کے محبوب "پیام تعلیم" کا شاندار سالنامہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ سالنامہ ہماری طرف سے نئے سال کا تحفہ ہوگا جو پیامیوں کو جنوری کے شروع میں مل جائے گا۔

آئے دن یہ شکایتیں ہمیں ملتی رہتی ہیں کہ رسالہ خریداروں کو نہیں ملتا۔ حالانکہ یہاں سے پرچہ باقاعدہ طریقے پر احتیاط کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے جو پیامی چاہتے ہیں کہ ان کا سالنامہ ضائع نہ ہو انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ ۵۵ پیسے کا ٹکٹ ہمیں بھیج دیں تاکہ پرچہ رجسٹری کے ذریعے بھیجا جا سکے ٹکٹ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے گا۔

سالنامے کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحے ہوگی اور قیمت ایک روپیہ۔ مستقل خریداروں سے علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائے گی۔ جن پیامیوں کا چندہ ختم ہو گیا ہے انھیں چاہیے کہ جنوری سے قبل سالانہ چندہ اور رجسٹری کا محصول بھیج دیں۔

جو اصحاب ایجنٹوں سے خریدتے ہیں انھیں چاہیے کہ اپنی کاپی محفوظ کرا لیں۔

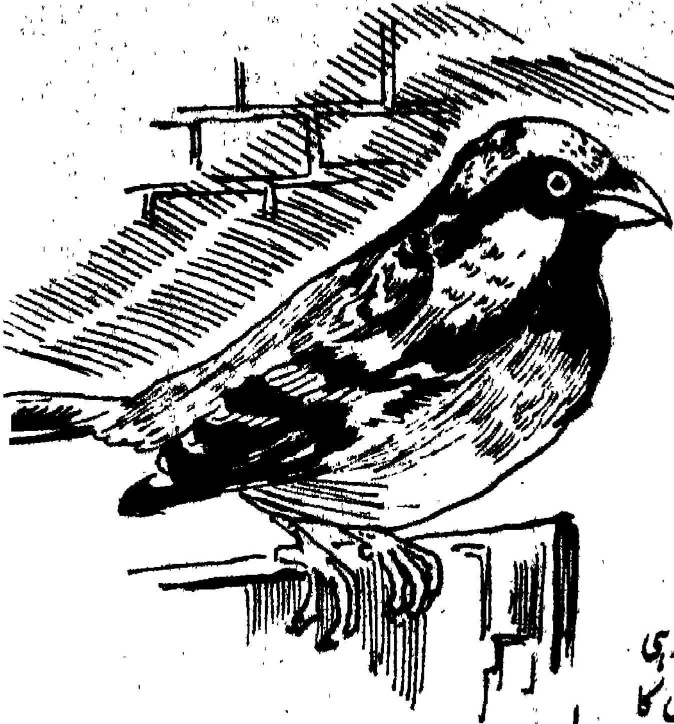
منیجر پیام تعلیم

جناب حافظ باقوی

سچ

سچ آئینہ سچ آئینہ
سچ سچ سچ ہیرے کا نگینہ
سچّائی ہستی کی زینت
سچّائی جنّت کا زینہ
جس دل میں سچّائی ہوگی
اس میں نہ آئے ہرگز کینہ
اک دن جھوٹے کا سر نیچا
تنا رہے سچّے کا سینہ
سچ ہے راحت سچ ہے رحمت
سچّائی خوشیوں کا خزینہ
جھوٹ سے دل کی دُنیا کالی
سچ کے نور سے روشن سینہ
سچّا رب کا پیارا حافظ
سچّے سے خوش شاہ مدینہ

جناب مفتوں کوٹوی



ہمدردی

ابا نے آخر اس شیر کو پنجرے میں قید کر ہی لیا!!! آپ اسے چڑا کہیے — مٹھی بھر پروں کا ڈھیر — لیکن ہمارے لیے تو وہ ایک بھیڑیا ہے جو نقصانات کیا کرتا ہے۔

وہ ہمارے گھر پر اس طرح قابض تھا جیسے ہم اس کے کرایے دار ہوں یا اس کے رحم و کرم سے اس مکان میں رہ رہے ہوں۔

صبح ہوئی اور چوں چوں شروع ہوئی۔ اس نے اپنے رفیقوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ اور وہ اپنے گھر بار سمیت یہاں رہ بس رہے تھے۔ ہماری حیثیت تو ثانوی تھی۔ گویا اس کی اجازت سے اس کی [illegible] سے ہم یہاں [illegible] تھے

[illegible]

کئی آوازیں بلند ہوں تو وہ ایک غوغا بن جائیں گی۔

اکثر یہ چڑے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے، کبھی ایک دوسرے کو نوچ رہے ہیں، کھسوٹ رہے ہیں۔ اور یہ نچے ہوئے پر اڑ اڑ کے فرش پر گر رہے ہیں۔ کبھی یہ خود بھی لڑتے ہوئے نیچے آگرتے۔ اس حال میں کہ ایک کی چونچ ہے اور دوسرے کے سر کی کھال اس کی چونچ میں — دن میں یہ ہنگامے کئی مرتبہ ہوتے۔

ہمارے گھر میں ان کے ایک نہیں کئی گھونسلے تھے۔ کتابوں کے درمیان میں، بکسوں کے بیچ میں — سردی کے بندھے ہوئے بستروں کے پیچھے۔ روشندان کے کونے تو ان کی مستقل ملکیت تھے

وہاں آزادی سے یہ جو چاہتے کرتے۔ گھونسلوں میں پہلے انڈے دیے جاتے۔ ان میں سے بچے پیدا ہوتے۔ چوں چوں میں اور اضافہ ہوتا۔ گھر کی صفائی ستھرائی پر خاک پڑی ہوتی تھی۔ تمام فرش، میز، کرسی، پلنگ ان کی بیٹ سے خراب ہو رہے تھے۔ اِدھر اماں چیخ رہی ہیں کہ بالکل نیا دوپٹہ چڑے کی بیٹ سے خراب ہو گیا۔ اُدھر آپا جان چلّا رہی ہیں کہ ان کی تیل کی شیشی الٹ پلٹ پڑی ہوئی ہے۔ پلنگ کی چادر کا ستیاناس ہوتا رہتا۔ میز پوش کہاں تک بدلا جاتا؟

جب گھونسلے بنائے جانے کا موسم ہوتا یہ مخلوق تنکے چن چن کر لاتی۔ کبھی گھر کے باہر سے اس ذخیرے کی فراہمی ہوتی اور کبھی گھر کے اندر ہی سے۔ دھاگوں بھا پروئی ہوئی سوئیاں غائب، دھاگوں کی لٹیاں غائب، گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے دوپٹے، کپڑے اور زیور غائب۔ کتابوں پر چونچیں چلتیں۔ ان کاغذوں کے پُرزے گھونسلوں کی زینت بنتے۔ گھر والے اس کے خلاف مہم شروع کرتے۔ تپائی، اسٹول، میز، کرسی، سیڑھیوں پر چڑھ چڑھ کر یہ گھونسلے بگاڑے اور پھینکے جاتے ــــ لیکن یہی کام تو کرنے کو نہیں رہ گیا تھا ــــ گھر والے اِدھر دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے۔ ذرا اُدھر سے توجہ ہٹتی کہ یہ گھونسلے پھر جم جاتے۔ جب انڈے دیے جاتے تو اماں کی ہمدردیاں شامل ہو جاتیں کہ اب انھیں نہ چھیڑا جائے ــــ گھر کے بچے اگر اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تو انھیں مار پڑتی اور انھیں بے رحم، ظالم، قاتل کہا جاتا ــــ انڈوں کے بعد بچے۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی قائم رہتا۔ سب گھر والے سپر ڈال چکے تھے۔ اور دماغ کام نہیں کرتا تھا کہ کس طرح یہ معرکہ سر کیا جائے!

آخر سوچ بچار کر اس مرتبہ مکمل پلان تیار کر لیا تھا کہ گھونسلے بچوں سے خالی ہوتے ہی اس کولونی کو برباد کر دیا جائے گا۔ اس مخلوق کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔ چنانچہ گھونسلے پھینکے جا رہے تھے۔ ان گھونسلوں میں سے گھر کی کئی گمشدہ چیزیں برآمد کی جا رہی تھیں۔ یہ مخلوق اپنے گھونسلوں کی بربادی پر احتجاج کر رہی تھی۔ شور مچا رہی تھی۔ لیکن گھر والے اس مرتبہ فولاد کا دل اور پتھر کا کلیجہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کی ایک نہیں سن رہے تھے۔ گھر میں ایک ہیجان برپا تھا۔ ضعیف مگر فاتح پرندوں اور طاقتور مگر شکست خوردہ انسانوں کی جنگ جاری تھی۔ انسان مروّت و شفقت سے بیگانہ ہو کر اپنی سفاکی پر اتر آیا تھا۔ پرندہ فی الحال عاجز و مجبور نظر آ رہا تھا۔

محترم چڑا ابھی بے بس تھا۔ لیکن ہمت و جرأت اس کی مستقل مزاجی سے نمایاں تھی۔ دیگر آبادی اگر اس گھر سے نکل بھی گئی تو وہ بعد کی بسائی ہوئی تھی! اولین قدم تو اس گھر میں اسی نے رکھا تھا۔ وہ برسوں سے یہاں آباد تھا۔ اپنے اس حق کے خلاف وہ ہر ممکن کوشش و مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اپنی بیگم کے ساتھ اس وقت بھی موجود تھا۔ خانماں خرابی، بربادی اور پریشانی اس وقت اس پر منڈلا رہی تھی۔ لیکن مدبرانہ اور دانشمندانہ طور پر وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

ادھر ابا اُسے گھر سے بھگانے کا مکمل تہیہ کر چکے تھے۔ سوچ لیا تھا کہ کسی طرح یہ ہاتھ لگے تو اس کے پرزے پرزے اڑا دیے جائیں —— یہی تو تمام فساد کی جڑ تھا۔ تمام افراتفری اسی نے تو پھیلا رکھی تھی۔ اسی نے تو تمام گھر کا دم ناک میں کر رکھا تھا۔

ایک روز یہ چڑا اماں کے سنگھار دان کے سامنے آئینہ میں اپنے مقابل سے مردانہ وار لڑ رہا تھا۔ بڑی محویت اور استغراق کے ساتھ، کہ ابا نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ اب یہ ان کی مٹھی میں چوں چوں کر رہا تھا۔ —— بڑی مشکل سے پکڑا گیا تھا مردود کہیں کا —— ابا نے اسے پنجرے میں قید کر دیا۔ اس کی سزا کا مسئلہ زیر غور تھا۔

پنجرے میں چڑے کی اچھل کود جاری تھی —— تڑپ رہا تھا، تلملا رہا تھا۔ لیکن کون پروا کرتا؟ سبھی گھر والے تو اس سے پریشان تھے۔ زک اٹھائے ہوئے تھے، ہارے ہوئے بھی تھے۔ اب کون اس پر رحم کرتا، کس کو اس سے ہمدردی ہوتی؟

مُنّا اسکول سے گھر آیا تو چھوٹے بہن بھائیوں نے اس نئے قیدی کی اطلاع دی۔ تماشہ دیکھنے کے لیے سب کے ساتھ وہ بھی پنجرے کے پاس گیا —— لیکن اور بچوں کی طرح وہ اس قیدی کے تڑپنے اچھلنے پر خوش نہ ہو سکا۔ چپ سا ہو گیا۔ نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ بظاہر کھیلتا بھی رہا۔ لیکن کچھ سوچتا بھی رہا۔

گھر والے اطمینان سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ قید کا دوسرا دن تھا۔ لیکن چڑے کا اچھلنا، کودنا، تڑپنا، تلملانا جاری تھا۔ مُنّا اسکول سے آ چکا تھا۔ سب بچے گھر کے آنگن میں کھیل رہے تھے۔ اماں کے کانوں میں زور سے جھٹکے کی آواز آئی۔ وہ دوڑی ہوئی اس آواز پر دوسرے کمرے میں گئیں۔ فرش پر کانچ کا پیالہ ٹوٹا پڑا تھا۔ اور پائدان پر چڑا موجود تھا۔ اپنے پر پھیلا رہا تھا۔ پنجرے پر نظر دوڑائی، وہ خالی تھا۔

پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ منّے سے چڑے کا تڑپنا

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

جناب عبدالرحیم نشتر

وطن کی شان

اپنے وطن کی شان بڑھاؤ
ننھے منّے چاند ستارو !
دیس کے اندھیارے کو مٹاؤ

آپس میں سب لڑنے لگے ہیں
اپنا مقصد بھول گئے ہیں
مذہب کی تلوار اُٹھا کر
مذہب ہی کو ڈھال بنا کر
امن کا پودا چھانٹ رہے ہیں
دیس میں نفرت بانٹ رہے ہیں
گلی گلی میں شور مچا ہے
جیسے کوئی حشر بپا ہے
پھوٹ کے بادل لہراتے ہیں
یہ اندھیارے مُسکاتے ہیں



ننھے منّے چاند ستارو !
دیس کے اندھیارے کو مٹاؤ
اپنے وطن کی شان بڑھاؤ

جناب جمال اختر (جامعہ کالج)

داڑھی نوچ لی

(ترکی کی ایک لوک کہانی)

یہ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔
استانبول میں ایک غریب خاکروب رہتا تھا۔ یہ گھروں میں جھاڑو دے کر حلال روزی کماتا تھا۔
یہ خاکروب اصل میں استانبول کا رہنے والا نہیں تھا۔ ترکی کے ایک دور دراز صوبے سے آیا تھا۔ اس کے گاؤں میں سبھی لوگ بڑی تنگی ترشی سے دن گزارتے تھے۔ اس کا حال بھی بہت خراب تھا۔ فاقوں پر نوبت تھی۔ آخر اس زندگی سے تنگ آگیا اور من میں آئی کہ کہیں اور جاکر قسمت آزمانا چاہیے۔
یہ سوچ کر وہ گھر سے چل پڑا اور سفر کی مصیبتیں اٹھاتا مرتا کھپتا آخر استانبول پہنچ گیا۔
استانبول پہنچ کر وہ کام پر لگ گیا۔ بےچارہ دن بھر سخت محنت کرتا جو مزدوری ملتی اس میں سے [illegible]

بچا کر رکھتا۔ بہت ہی سادہ زندگی گزارتا تھا۔
ہوتے ہوتے تین چار سال میں کافی رقم جمع ہوگئی، پورے پانچ سو روپے۔ پر اب ایک خیال اُسے ہر وقت ستاتا رہتا۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ پوری کی پوری رقم کوئی چرالے اور وہ ہاتھ ملتا رہ جائے۔
اس کی پریشانی دن پر دن بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا جب تک یہ رقم کسی شریف نیک اور دیانت دار آدمی کے پاس امانت نہ رکھ دے گا اُسے سکون حاصل نہ ہوگا۔
پر بھلا اتنے بڑے شہر میں ایسا آدمی کون ملے گا۔
اس کا خیال ہر پھر کے شہر کے قاضی کی طرف جاتا تھا۔
اس نے ہمیشہ قاضی کے بارے میں اچھی باتیں سنی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سبھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ اسے نیک اور دیانت دار سمجھتے ہیں۔

پر ایک غریب خاکروب، جھاڑو دینے والا بھنگی اتنے بڑے آدمی سے ملاقات کا موقع کیسے پائے۔ پر وہ ایک دن جرأت کر ہی بیٹھا۔ اپنا دن بھر کا کام ختم کر کے سیدھا قاضی کی حویلی پہنچا۔ قاضی جی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بڑی عاجزی سے کہا:

"حضور والا، اس شہر میں ہر ایک آپ کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ محض آپ کے علم کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی شرافت، نیکی اور انسانیت کی وجہ سے بھی۔ پر کیا آپ مجھ جیسے غریب خاکروب کی بات پر کان دھریں گے؟"

قاضی جی نے خاکروب کی بات توجہ سے سنی اور بولے۔

"ہاں ہاں، ضرور تم اپنے دل کی بات کہو۔"

غریب خاکروب نے کہنا شروع کیا: "میں اس شہر میں اکیلا ہی رہتا ہوں، اور امیر غریب سب کے یہاں جھاڑو دیتا ہوں۔ اس کام پر جو پیسے ملتے ہیں ان میں سے بس اتنا ہی خرچ کرتا ہوں کہ جسم اور جان کا رشتہ قائم رہے، باقی بال بچوں کے لیے جمع کرتا ہوں۔ مجھے دو سال ہو چکے ہیں اور اتنے دنوں میں تھوڑی سی رقم جوڑ جاڑ کر اتنی ہو گئی ہے کہ اسے لے کر میں گھر واپس جا سکتا ہوں۔ اچھے قاضی جی میری درخواست ہے کہ جب تک میں گھر نہ جاؤں یہ تھوڑی سی پونجی اپنے پاس رکھ لیجیے۔ میں جب گھر جانے لگوں گا تو آپ سے لے لوں گا۔ میں نے یہ روپیہ بڑے جتن سے جمع کیا ہے۔ اس لیے برابر ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی چور اچکا اسے اڑا لے جائے اور میری خون پسینے کی محنت اکارت جائے۔"

قاضی جی بہت خوش ہوئے، کہنے لگے "شاباش



میاں تم نے بہت اچھی بات سوچی۔ یہ رقم تم یہاں رکھ جاؤ، میں اسے حفاظت سے رکھوں گا۔ گھر جانے کا خیال ہو تو لے جانا۔"

غریب خاکروب نے اطمینان کا سانس لیا۔ رقم قاضی جی کے حوالے کرکے خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

اس خاکروب کے گاؤں کے دو آدمی اور بھی اس شہر میں محنت مزدوری کے کام کرتے تھے۔ ان کا بھی یہی پیشہ تھا۔

ابھی قاضی کے پاس روپے رکھے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ان دونوں خاکروبوں نے اپنے گاؤں جانے کی ٹھانی۔ وطن جانے کی خواہش اور اپنے گھر والوں سے ملنے کا شوق جیسے بھڑک اٹھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے کافی رقم پس انداز یا جمع کرلی ہے اور اطمینان سے گھر جا سکتے ہیں۔

انھوں نے اپنے دل کی بات اس خاکروب کو بتائی اور زور دیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔

خاکروب نے کہا "میرا ارادہ تو کچھ دوسرا ہے۔ میں تو ایک سال اور ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح [illegible]"

یہ بات تو خاکروب بھی سمجھتا تھا کہ اکیلے سفر کرنے سے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر سفر کرنا کہیں بہتر ہے۔ اس نے اپنے جی میں کہا میں نے اچھی خاصی رقم تو جمع کرلی ہے اور اب تو یہ پانچ سو روپے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اس لیے اب یہاں زیادہ ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے ہاں کردی اور بولا: "اچھی بات ہے میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

* * *

دوسرے دن صبح کو خاکروب قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی امانت واپس مانگی پر وہ تو قاضی کی صورت دیکھتے ہی ششدر رہ گیا۔ وہ اس کی بات سنتے ہی پیچ و تاب کھانے لگے اور غصّے کا جیسے دورہ پڑ گیا۔ بڑی زور سے ڈکرائے:

"پانچ سو روپے، کون پانچ سو روپیوں کی بات کر رہا ہے بے تو کمینے!"

"وہی رقم جو میں نے کئی سال میں ایک ایک پیسہ کرکے جمع کی تھی اور آپ پر بھروسہ کرکے آپ کے پاس امانت رکھ دی تھی!"

بے چارے خاکروب نے بہت دھیمی اور بجھی [illegible] یہ بات کہی جیسے اس پر اوس پڑ گئی ہو۔

"کُتّے کے بچے نکل جا گھر سے ورنہ ابھی دھکّے دے کر نکلواتا ہوں"۔ قاضی نے اپنے نوکروں کو آواز دی اور انھوں نے سچ مچ اسے دھکّے دے کر نکال دیا۔

خاکروب بہت خوش خوش قاضی کے گھر آیا تھا پر اب تو وہ بہت حیران تھا، ششدر تھا اپنے کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ بھلا ایک قاضی کے آگے خاکروب کی بات کون سُنے گا! بے چارہ کلیجہ مسوس کے رہ گیا۔

وہ اُلٹے پاؤں گھر کی طرف لوٹا بہت نڈھال تھا۔ اس نے دونوں ساتھیوں کو رخصت کر دیا بھلا بے پیسے کوڑی کے کیسے گھر جاتا، بال بچوں کو کیسے منہ دکھاتا۔ وہ اپنے کو ہزار تسلی دیتا تھا کہ خدا اس ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ضرور دے گا پر اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ اس کے لیے سچ مچ یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ اب نہ جانے کتنے دنوں بعد اسے گھر جانا، بال بچوں کو دیکھنا نصیب ہوگا۔ اسے گھر بار کا بال بچوں کا خیال آتا تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے۔

مرتا کیا نہ کرتا بے چارا پھر سے محنت مزدوری میں لگ گیا۔ مگر اب وہ بہت دکھی، بہت پریشان، بہت غم گین رہتا تھا۔ یہ پریشانی اور رنج و غم اس کے چہرے سے ٹپکنے لگا تھا۔

ایک دن وہ ایک سوداگر کے ہاں جھاڑو دے رہا تھا۔ اتفاق سے سوداگر کی بیوی کی اس پر نظر پڑی۔ وہ بہت نیک دل اور شریف عورت تھی غریب خاکروب کی اُداس صورت پر اُسے بڑا ترس آیا۔ اس نے بہت ہی نرمی سے پوچھا،

"کیوں بھئی کیا بات ہے چودھری۔ ایسا لگتا ہے کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آگیا ہے جس کی وجہ سے تم اتنے پریشان اور اُداس نظر آتے ہو"

خاکروب نے جواب دیا "آپ کا خیال بہت ٹھیک ہے بیوی جی۔ پر بیوی جی آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار!"

"نہیں نہیں تم اپنی بات تو بتاؤ کیا عجب جو میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں"۔ سوداگر کی بیوی نے بہت ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

خاکروب پہلے تو اتنے بڑے گھر کی عورت سے دیر تک بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا پر اس عورت کے لہجے میں اتنی ہمدردی، اتنی گرم جوشی اتنی اپنائیت تھی کہ دھیرے دھیرے اپنے کو کچھ کچھ مانوس محسوس کرنے لگا۔ آخر اسے اپنی ساری بپتا سنا ڈالی۔

سوداگر کی بیوی نے پوری رام کہانی بڑے غور سے سنی اور دیر تک خاموش رہی جیسے کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد سر اُٹھا کر بولی: "دیکھو بھئی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے پر جیسے جیسے میں بتاؤں ٹھیک ٹھیک ویسے ہی کرنا ہوگا۔"

خاکروب نے جواب دیا: "ہاں ہاں بیوی جی میں ویسے ہی کروں گا۔"

سوداگر کی بیوی نے خاکروب کو بتایا کہ اگلے دن صبح کو مقررہ وقت پر قاضی کے ہاں پہنچ جائے اور اس سے اپنی امانت واپس مانگے مگر اس سے بات اس طرح کرے جیسے پہلی بار اس کے پاس آیا ہے۔ پہلی بار اس سے اپنی امانت واپس مانگ رہا ہے۔

خاکروب نے کہا "بہت اچھا بیوی جی۔ میں اسی طرح اس سے بات کروں گا" یہ کہہ کر خاکروب اپنے گھر چلا گیا۔

سوداگر کی بیوی نے اسی دن اپنا زیوروں کا صندوقچہ نکالا اور کچھ قیمتی قیمتی زیور اور جواہرات چھانٹ لئے۔ اور پھر اپنے گھر کی ماما سے کہا: "میں کل سویرے قاضی کے پاس جاؤں گی تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

"اور ہاں میری بات کان لگا کے سنو۔ میں تو قاضی کی حویلی جاؤں گی۔ تم باہر ہی رہنا۔ خاکروب کو دیکھتی رہنا۔ وہ جس وقت قاضی کے گھر میں داخل ہو تم باہر اس کا انتظار کرنا جوں ہی وہ باہر نکلے فوراً تم اندر آ جانا مجھے آواز دینا اور کہنا کہ آپ کے شوہر واپس آگئے ہیں اور گھر پہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ماما نے ان ہدایتوں کو بار بار دہرایا اور سوداگر کی بیوی کو اطمینان ہو گیا کہ ماما میری بات سمجھ گئی ہے۔

دوسرے دن صبح کو سوداگر کی بیوی قاضی کے گھر کی طرف روانہ ہوئی اس کے ہاتھ میں بہت ہی قیمتی زیورات کا بیگ تھا۔

قاضی جی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور پوچھنے لگے "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"قاضی صاحب آداب" سوداگر کی بیوی نے بہت ادب و احترام سے اسے سلام کیا اور بولی: "قاضی جی میں ایک درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔"

قاضی نے کہا: "فرمائیے، آپ کی خدمت



کرنے میں بڑی مسرت ہوگی جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا کروں گا۔"

سوداگر کی بیوی نے کہا: "بات یہ ہے کہ میرے خاوند کاروبار کے سلسلے میں چند دنوں کے لیے مصر گئے ہوئے تھے۔ پر اب ان کا خط آیا ہے کہ وہاں انھیں زیادہ ٹھہرنا پڑے گا اور میں خود ان کے پاس وہاں پہنچ جاؤں۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق سفر کی تیاری کرلی ہے مگر ایک چیز مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔ بھلا میں اپنے زیوروں اور جواہرات کا کیا کروں۔ یہ دیکھیے۔"

سوداگر کی بیوی نے اپنے سارے زیور اور جواہرات قاضی جی کے سامنے میز پر الٹ دیے۔ اور بولی "یہ بہت ہی قیمتی ہیں۔ انھیں نہ تو چھوڑتے بنتا ہے نہ لے جاتے بنتا ہے۔ ساتھ لے جاتے ہیں تو ڈر یوں لگتا ہے کہ راستہ بہت خطرناک اور جوکھم کا ہے۔ اسی لیے میں آپ جیسے ایماندار، نیک، شریف اور صاحبِ احترام بزرگ کے پاس آئی ہوں کہ جب تک میں باہر رہوں آپ میرے زیوروں کو اپنے پاس امانت رکھیں گے۔ جب میں لوٹ کر آؤں گی تو آپ سے لے لوں گی۔"

قاضی جی اس قیمتی خزانے کو دیکھ کر چوندھیا گئے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اتنے میں خاکروب آگیا اور اس نے بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔

قاضی جی نے بھنگی سے پوچھا: "کیوں بھائی میں تمھاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

قاضی جی نے یہ بات بہت لاپرواہی سے کہی۔ ان کا دل تو اس وقت اپنے سامنے پھیلے ہوئے ہیرے جواہرات میں اٹکا ہوا تھا۔

خاکروب نے بڑی عاجزی سے کہا "حضور سرکار میں اب اپنے گاؤں جا رہا ہوں اور اپنے پانچ سو روپے لینے آیا ہوں۔"

"اچھا اچھا تو گویا تم نے جس وقت جانے کا
طے کیا اس سے پہلے ہی جا رہے ہو۔" یہ بات قاضی نے
بڑی ہی نرمی اور سرپرستی کے انداز میں کہی۔ اور پھر
خزانچی کو حکم دیا کہ خاکروب کو پانچ سو روپے دیدے۔
اور جس وقت خاکروب اپنی رقم ہاتھ میں لے
کر باہر جانے لگا تو بولے: "اچھا میاں خدا حافظ،
خدا کرے تمھارا یہ سفر خیر و عافیت سے کٹے۔ اور
خوش و خرم اپنے بال بچوں سے ملو۔"

"کبھی کبھی تو بڑا اچنبھا ہوتا ہے،" قاضی جی
بڑے اطمینان سے بولے "بھلا لوگ مجھ پر اتنا بھروسا
کرتے ہیں، دیکھا آپ نے یہ بے چارہ بھنگی بنا کسی
رقعہ، بنا کسی رسید کے اپنی عمر بھر کی کمائی میرے
پاس جمع کر گیا۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ جب میں
اپنا روپیہ مانگوں گا، مجھے فوراً مل جائے گا۔"

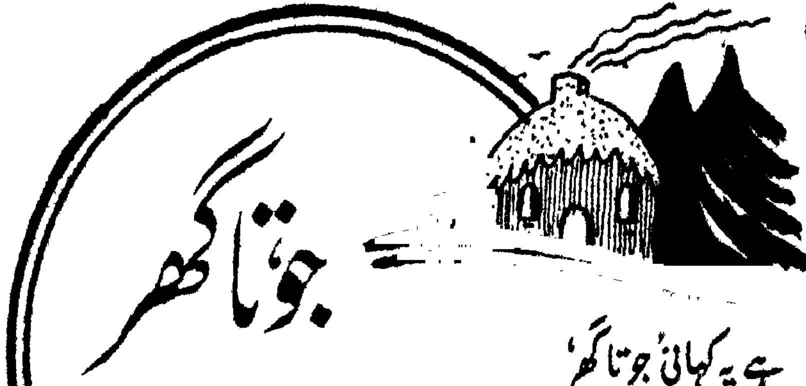
ابھی قاضی جی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ سوداگر
کی بیوی کی ماما بھاگی بھاگی آئی اور زور سے بولی
"بیوی جی، بیوی جی میاں تو آگئے، گھر میں بیٹھے ہیں
آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی سوداگر کی بیوی کا چہرہ خوشی
سے جیسے تمتما اٹھا۔ گھبراہٹ میں جلدی جلدی زیور
وغیرہ جمع کر کے بیگ میں ٹھونسے اور بڑی جلدی میں
قاضی سے رخصت چاہی اور بولی: "قاضی صاحب آپ
کی مہربانی کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

کچھ دیر کے لیے تو قاضی جی کا دماغ بالکل فیل
ہو گیا۔ سکتے میں آگئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ
کیا ہو گیا اور جب ذرا ہوش آیا تو بات سمجھ میں آئی
کہ کس طرح دھوکے فریب کا جواب دھوکے فریب
سے دیا گیا۔ پھر تو قاضی جی کے غصے کی نہ پوچھو۔ بس
نہیں چلتا تھا کہ داڑھی کے سارے بال جڑ سے
اکھاڑ دیں۔

پر اتنے ہی پر تو بس نہیں ہوا۔ یہ بات ہوتے
ہوتے سارے شہر میں پھیل گئی۔ جتنے نیک نام تھے،
قاضی جی اتنے ہی بدنام ہو گئے۔ اب کوئی ان پر بھروسا
نہیں کرتا تھا۔ (انگریزی سے)

جناب ریاض آفندی



جوتا گھر

ہے یہ کہانی "جوتا گھر"
سن لو بچو! تم مل کر

ایک تھی بڑھیا چھوٹی سی
کانچ کی گڑیا ہو جیسی

چھوٹا سا تھا اس کا گھر
نام تھا اس کا "جوتا گھر"

اس کے پیارے بچے تھے
گن نہ سکے وہ اتنے تھے

سب سے کہتی سوچو تو
کیسے پالوں ان سب کو

دن تو گزرتا باتوں میں
جاگتی بڑھیا راتوں میں

رات کو بچے گھر آتے
ماں کے ڈر سے سو جاتے

ایسا ہے ایک جوتا گھر
تم ہی بتا دو ہے وہ کدھر



امن کی خاطر

محترمہ ممتاز بیگم مومن بیجاپور

شمی اور اسلم ہر روز صبح سویرے اپنے باغ میں جاتے۔ کبھی چنبیلی کے پھول چنتے، کبھی گلاب توڑتے۔ کبھی تتلیوں کے پیچھے بھاگتے، کبھی چڑیوں کے پیچھے دوڑتے۔ باغ کا مالی رامو ان دونوں کو بہت پیار کرتا۔ پھول چننے میں مدد کرتا۔ پر بچے تتلیاں پکڑنے کی فرمائش کرتے تو دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا "نا بابا! میں تو پنکھ پر ظلم نہ کروں گا۔ اڑتی کھیلتی تتلیوں کو کبھی نہیں ستانا چاہیے۔"

اس پر شمی کڑھتی پر کچھ کہہ نہ پاتی۔ پھر دوسرے دن دونوں تتلیوں کا جال لے جاتے۔ پر رامو ان سے بڑی نرمی، بہت پیار سے کہتا: "بچو، چاہے میری جان لے لو مگر ان بھولی بھالی رنگ برنگی تتلیوں پر ظلم نہ کرو۔ انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔"

ایک دن دونوں نے مل کر ایک اسکیم بنائی کہ چلو مالی کے چوری چھپے چڑیاں پکڑیں۔ انھوں نے اپنے دوست پپو کے گھر سے چڑیوں والا جال لے لیا اور دوڑ چلے باغ کی طرف۔ دونوں نے املی کے درخت کے نیچے تھوڑے سے چاول بکھیر دیے اور اس پر جال لگا دیا۔ اتنے میں رامو گھومتا ہوا ادھر آ نکلا۔ دیکھا کہ دونوں بچے چڑیوں کی گھات میں ہیں۔ اس نے چلّا کر کہا "ارے یہ کیا جال بچھایا ہے تم نے، اسکول میں کیا یہی سیکھنے جاتے ہو؟ ماسٹر صاحب نے کیا یہی سکھایا ہے؟" اس پر دونوں کا

خون کھول اُٹھا۔ اسلم نے چلّا کر کہا: "ہم کچھ بھی کریں تمھیں اس سے کیا؟ جاؤ اپنا کام کرو۔" اس پر رامو بھی گرج دار آواز میں بولا "جانتے ہو یا نہیں۔ ہزار بار کہا ہے کہ ان معصوم اور پیاری پیاری چڑیوں کو نہ ستاؤ۔" آخرکار دونوں نے اپنا جال اٹھایا اور منہ بسورتے گھر کی طرف چلے۔

گھر میں جاتے ہی امّی نے انھیں اُداس اُداس





دیکھا اور پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا؟ یہ سُن کر انھوں نے رو رو کر ساری رام کہانی سنائی۔ پر وہ یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ امی کو ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ وہ تو الٹی رامو کی تعریف کرنے لگیں۔ "واہ بھئی واہ ہمارا مالی بھی کتنا اچھا ہے۔ ہمارے بچّوں کو اس بُرے کام سے روکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جانوروں اور پرندوں پر ظلم کرنا بُری بات ہے۔ بے گناہوں کو ستانے سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے۔"

اس دن کے بعد سے دونوں نے تتلیوں کو ستانا تو چھوڑ دیا مگر اس بات کی ٹوہ میں رہے کہ اب مالی کی اسی قسم کی غلطی پکڑ کر امّی سے ذلیل کروائیں۔ تھوڑے دن گزرے کہ گرمیاں آئیں۔ مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی شدت کی تھی۔ دونوں اپنی تصویروں والی کتابیں لیے املی کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ اور تصویریں دیکھنے لگے۔ یکایک انھیں پاس کی گھاس میں سرسراہٹ سی سنائی دی پر انھوں نے دھیان نہ دیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مالی کی پھوس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ وہ لپک کر باہر نکل آیا اور بولا: "بچّو سنبھل کر رہو گرمی کے دن ہیں سانپ بچھو کا خطرہ ہوتا ہے۔" مگر اس پر دونوں نے اَن سُنی کر دی۔ مالی وہیں کھڑا ہوا کبھی گھاس پر نظر ڈالتا کبھی درخت پر کیوں کہ

اب وہ سانپ کی چپ چپ بخوبی سن رہا تھا۔ اُس نے
دونوں سے کہا کہ گھر چلے جاؤ۔ پر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ مالی
نے دل میں کہا کہ یہ دونوں ہی عقل کے کچے اور ضد کے
پکے ہیں۔ سانپ یہیں کہیں قریب ہی ہے۔ وہ لاٹھی لے
کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں اس کی طرف دیکھتے اور
طرح طرح کے منہ بناتے رہے۔



اچانک مالی اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہو
گیا۔ کیونکہ سامنے والی گھاس میں ایک کالا سا سانپ
سرسرا رہا تھا۔ مالی کے اس طرح چونکنے سے اسلم
اور شمی بھی گھبرا گئے۔ انھوں نے مالی سے اشارہ کرکے
پوچھا کہ کیا بات ہے۔ انھوں نے مالی کے ہاتھوں کی
طرف دیکھا جو صاف اشارہ کر رہا تھا کہ سامنے
والی اونچی گھاس میں کچھ ہے۔ اب تینوں صاف
طور پر دیکھ سکتے تھے کہ گھاس کے اندر تقریباً چار
فٹ لمبا کالا کالا سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا

رامو ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر جھونپڑی
میں بھاگا اور دوسرے ہی لمحے میں برچھا لیے برآمد
ہوا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا گھاس کے قریب پہنچا۔
ادھر دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ
جانے اب کیا ہو۔ اب رامو نے آہستہ سے اپنا برچھا
سیدھا کیا اور پلک جھپکتے میں سانپ کے سر پر وار کیا۔
برچھے کی نوک سانپ کے سر میں جا گھسی۔ وہ بے
تاب ہو کر پٹخیاں کھانے لگا۔ مگر رامو بے خوفی
سے برچھا پیوست کیے کھڑا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے
تک یہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے بعد سانپ کا جسم ٹھنڈا
ہو چکا تھا۔ وہ یوں ہی اُسے برچھے کی نوک سے
لٹکائے باہر چلا آیا۔

اچانک اسلم کے ذہن میں ایک بات آئی۔
اُس نے چپکے سے شمی کے کان میں کہا۔ رامو بھی روز
ہی تاکید کرتا ہے کہ تتلیاں نہ پکڑو، چڑیاں نہ مارو،
غلیل نہ چلاؤ۔ پر آج اس نے گھاس میں پڑے ہوئے
معصوم سانپ کو کیسی بے دردی سے کچلا ہے۔ چلو

(باقی ص ۵۰ پر)

ہمارے ارادے

جناب بدیع الزماں خاور

جہاں علم سے لوگ سیراب ہوں گے
ممالک وہ زرخیز و شاداب ہوں گے
جو قومیں ہیں بے علم، اُن کے سفینے
جہالت کے طوفاں میں غرقاب ہوں گے

ہمیں اپنے عزم و عمل پر یقیں ہے
ہمارے ارادے ظفریاب ہوں گے
ہیں ذرّے مگر جب اُبھر جائیں گے ہم
جہاں کے لیے مہر و مہتاب ہوں گے
رقم جو کریں گے ہم اپنے لہو سے
وہ تاریخ کے ضوفشاں باب ہوں گے
وہ نوخیز فن کار ہم آج کے ہیں
جو کل غالب و میر و سیماب ہوں گے





جناب حمید اللہ خاں

خطا کرے کوئی

دینا نگر سے ایک لمبی کچی سڑک امرود کے باغوں کے بیچ سے بل کھاتی ہوئی چھاؤنی کے مڈل اسکول کو جاتی تھی۔ شاہد، صابر، سلیم تینوں اس سڑک پر اسکول کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تینوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک محلے میں رہتے تھے۔ آپس میں بھائیوں جیسا پیار تھا۔ لیکن صابر چڑچڑا تھا، سلیم بہت سمجھدار عقلمند اور شاہد شرارتوں کا پتلا تھا۔

"ارے بھئی شاہد اسکول کی گھنٹی بجنے میں بیس منٹ کی دیر ہے کیوں نہ ذرا امرودوں کی طرف دھیان دیا جائے" صابر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں"۔ شاہد امرود کے پیڑوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور تینوں باغ میں داخل ہو گئے۔

سلیم آگے بڑھ کر ایک امرود جو درخت کے نیچے پڑا تھا اٹھانے لگا۔ صابر دور ہی سے چلّایا "یہ امرود میرا ہے پہلے میں نے دیکھا تھا"

"نہیں بھئی پہلے میں نے دیکھا تھا" سلیم نے امرود اٹھاتے ہوئے کہا۔

صابر چڑ گیا اور کہنے لگا "یہ امرود مجھے دیدو ورنہ ٹھیک نہ ہوگا"

سلیم نے جواب دیا: بھیا امرود جس کے ہاتھ میں

ہے اسی کا ہوا۔

یہ سنتے ہی صابر کو غصہ آگیا اور اس نے ایک پتھر اٹھا کر سلیم کے سر پر مار دیا اور اپنا بستہ اٹھا کر مدرسہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلیم کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ شاہد نے فوراً اپنا رومال اس کی پیشانی پر باندھ دیا اور اس کو لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس روز دونوں اسکول نہ جا سکے۔

دوسرے روز گیارہ بجتے ہی سب لڑکے کلاس میں جمع ہونے لگے۔ صابر بھی ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا اور شاہد اور سلیم کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ سلیم کل کے سبق کا نقصان ہو جانے کی وجہ سے کچھ فکر مند سا تھا۔ اس نے صابر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ البتہ شاہد کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ کلاس میں شور و غل ہو رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے شور و غل ختم ہوا، خاموشی چھا گئی۔

ماسٹر صاحب اسکول کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے جماعت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی انھوں نے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی اور حاضری لینے لگے۔ محمد منیر، شمس الدین، عبدالرحمٰن، موہن، کیلاش، اللہ بخش، صابر۔

"حاضر جناب" صابر نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

"کل کہاں غائب تھے؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"والد صاحب کی طبیعت خراب تھی۔"

"ہونہہ۔" ماسٹر صاحب نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

"محمد سلیم" ماسٹر صاحب نے سلیم کو گھورتے ہوئے کہا "کل کہاں تھے۔ یہ تمھارے سر پر پٹی کیسی بندھی ہے؟"

"زینے سے گر پڑا تھا اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔" سلیم نے جواب دیا۔

"ہونہہ، بیٹھ جاؤ" ماسٹر صاحب بولے اور ایک بار پھر وہ حاضری کے رجسٹر پر جھک گئے۔

"شاہد"

"حاضر جناب"

"اور تمھیں کیا ہوا تھا جو تم بھی غیر حاضر تھے؟" ماسٹر صاحب نے چشمے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں... میں... وہ... وہ..."

"ہاں ہاں تم وہ... وہ... وہ کیا" ماسٹر چلائے۔

اور شاہد نے ماسٹر صاحب کو پورا واقعہ سنا ڈالا۔

"تو یہ بات ہے" ماسٹر صاحب بولے۔ "لیکن صابر اور سلیم مجھ سے جھوٹ کیوں بولے۔ صابر یہاں آؤ" ماسٹر صاحب غصہ میں چلائے اور صابر ماسٹر صاحب

کی میز کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔

"کیا شاہد سچ کہہ رہا ہے؟"

"جی ہاں" صابر نے جواب دیا۔

"سلیم تم بھی یہاں آؤ" اور سلیم بھی میز کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔

"یہ بید لو" ماسٹر صاحب سلیم کو بید دیتے ہوئے بولے:

"اس کا کیا کروں ماسٹر صاحب"؟

"تم صابر کے پچیس بید مارو۔ یہی اس کی سزا ہے" سلیم نے بید ہاتھ میں لی۔ صابر چپ چاپ کھڑا تھا۔ سلیم کے دونوں بازو پھیلے، بید ہوا میں لہرائی، اور پھر... سلیم لپک کر صابر سے لپٹ گیا دونوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ دونوں رو رہے تھے۔ فرق بس اتنا تھا کہ صابر کے ہاتھ اپنی ندامت کے آنسو پونچھ رہے تھے تو سلیم اپنی خوشی کو آنسوؤں میں چھپا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میں نے سزا دینے کے لیے کہا" ماسٹر صاحب چلا اٹھے "یہ کیا ہے جواب دو سلیم"؟

"ماسٹر صاحب آپ ہی نے ہم کو یہ سبق سکھایا ہے"۔

"کیا سبق۔ کون سا سبق" ماسٹر صاحب بولے

"یہی کہ بخش دو گر خطا کرے کوئی" سلیم آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

اس کا جواب سن کر ماسٹر صاحب بھی مسکرا دیے، جماعت کے سب لڑکوں کے چہرے سلیم کی خوش اخلاقی سے جگمگا رہے تھے۔

امن کی خاطر (بقایا صفحہ ۴۶ کا)

آج امی کو اس ظلم کی داستان سنائیں گے۔

دونوں امی کے کمرے میں پہنچے۔ انھوں نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ دونوں پریشان سے نظر آئے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ اس پر دونوں نے رامو کے سانپ مارنے کے واقعے کو خوب نمک مرچ لگا کر سنایا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ تو گھاس میں آرام کر رہا تھا ہمیں کاٹنے تھوڑی دوڑ رہا تھا۔ ہم تھے امی کی چھاؤں میں وہ گھاس میں۔

مگر امی جان نے کچھ نہیں کہا الٹے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ بچو تم ابھی نا سمجھ ہو، ایسی چیز جو دوسروں کو نقصان پہنچا سکتی ہے، اُسے ختم کرنا ہی اچھا ہے اگر سانپ کو چھوڑ دیا جاتا تو نہ جانے کتنوں کو ڈس لیتا۔





نیشنل ہائی اسکول داپولی (ضلع رتناگیری) کوکن[ل] کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جو ترقی کے پچیس مرحلے طے کر چکا ہے۔ اور اب اس اسکول کے "جشنِ سیمیں" کا پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔ یہاں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ طلباء و طالبات کی ہمہ جہتی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہماری "اسکول پارلیمنٹ" اس سلسلے کی اہم ترین کڑی ہے۔ سالِ رواں کے لیے پارلیمنٹ کے انتخابات گذشتہ اگست میں ہوئے ہیں اور مختلف محکموں کے لیے مندرجہ ذیل وزرا چنے گئے ہیں:۔

۱۔ وزیرِ اعظم	یوسف محمد اسحاق قاضی	درجہ دہم
۲۔ وزیرِ تفریحات	عبدالوہاب عبداللہ نائکر	درجہ دہم
۳۔ وزیرِ تقریبات	عبدالرشید عثمان رکھانگے	درجہ دہم
۴۔ وزیرِ نشر و اشاعت	غلام محمد ابراہیم قاضی	درجہ دہم
۵۔ وزیرِ کھیل	علی کھوتو مالونکر	درجہ نہم

ل مہاراشٹر کا ساحلی علاقہ جو رتناگیری، تھانہ اور قلابہ نامی تین اضلاع پر مشتمل ہے۔

۶. وزیر برائے میدانی مقابلہ جات عثمان اسماعیل جلگی درجہ نہم
۷. وزیر دفاع[1] امان اللہ عبدالغفور جمالدار درجہ دہم
۸. وزیر مالیات اسماعیل محمد قاسم جوگلے درجہ دہم
۹. خاتون وزیر شمع قمرالدین قاضی درجہ دہم

صدر کے اختیارات اسکول کے پرنسپل عالی جناب بہاؤالدین پرکار بی۔ اے (آنرز) بی، ٹی کو اور نائب صدر کے حقوق جناب عبدالرحمن پرکار ایس، ٹی، سی، پی، ایڈ کو حاصل ہیں۔

غلام محمد قاضی
وزیر نشر و اشاعت

ہمارا الیکشن

اتوار کا دن تھا۔ جولائی کی اٹھارویں تاریخ تھی۔ جب ہمارے وائس پرنسپل (ایم۔ ایم ربانی ہائر سیکنڈری اسکول کامٹی) جناب حاجی عبدالمتین صاحب نے پریر میں اعلان کیا کہ آج اسٹوڈنٹس یونین کا انتخاب ہوگا۔

تمام لڑکوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہر طرف چہ میگوئیاں، ہر طرف ہلچل، آج الیکشن ہے، آج الیکشن ہے۔ آرٹس اور سائنس کے طلبا اپنی الگ الگ ٹولیاں بنائے ہوئے اپنے اپنے امیدواروں کی کامیابی کے لیے کین واسنگ کرتے پھر رہے تھے۔ عام خیال تھا کہ جنرل کپتان سائنس گروپ کا طالب علم ہی ہوگا۔ کیونکہ تقریباً چار سال سے اسکول میں سائنس کے طلبا ہی جنرل کپتان منتخب ہوتے چلے آئے تھے۔

آخری پیریڈ میں الیکشن ہونے والا تھا۔ تمام لڑکے جوق در جوق ربانی ہال میں جمع ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں آرٹس اور سائنس کے ٹیچر بھی آگئے۔ وائس پرنسپل صاحب نے الیکشن سے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ پھر جناب حمید جمال صاحب نے الیکشن کا آغاز کیا۔ ووٹنگ کا طریقہ یہ تھا کہ امیدواروں کے نام بلیک بورڈ پر لکھ دیے جاتے تھے اور لڑکے ہاتھ اٹھا کر ووٹ دیا کرتے تھے۔ ووٹنگ ہوئی، جنرل کپتان کی سیٹ کے لیے غیر متوقع طور پر عبدالرحیم نشتر کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد فٹ بال کپتان، والی بال کپتان، ہاکی کپتان، انڈور گیمس کپتان اور سکریٹری آف ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا مقابلہ ہوا۔

---

[1] یہ وزیر صاحب کیا خدمات انجام دیں گے۔ (ایڈیٹر)

الیکشن

عہدہ	امیدواران	کامیاب امیدوار
۱۔ جنرل کپتان	محمود الحسن، عبدالرحیم نشتر	عبدالرحیم نشتر
۲۔ فٹ بال کپتان	محمد لیٰسین، محمد ایوب	محمد لیٰسین
۳۔ والی بال کپتان	مشتاق احمد، ضمیر الدین	ضمیر الدین
۴۔ انڈین گیمس کپتان	سمیع اللہ خاں، قدیر احمد	قدیر احمد
۵۔ ہاکی کپتان	وکیل احمد	وکیل احمد
۶۔ سکریٹری آف ڈیبیٹنگ سوسائٹی	جاوید احمد	جاوید احمد

الیکشن کے تین دن بعد جب اسٹوڈینٹس یونین ترتیب دی گئی تو اس میں کچھ مناسب تبدیلیاں کردی گئیں۔ جنرل کپتان محمود الحسن بنادیے گئے اور عبدالرحیم نشتر کو سکریٹری آف ڈبیٹنگ سوسائٹی مقرر کیا گیا۔ چونکہ یہ تبدیلیاں مناسب قسم کی تھیں اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہیں کیا۔ مندرجہ ذیل مجلس منتظمہ کی تشکیل ہوئی۔

۱۔ صدر اور وزیر خارجہ	محمود الحسن	یازدہم	ٹیچر انچارج	جناب	عبدالحلیم صاحب ثاقی	
۲۔ وزیر اعظم اور وزیر تعلیم	عبدالرحیم نشتر	"	"	"	سعید اختر صاحب	
۳۔ وزیر داخلہ	عبدالنعیم	"	"	"	ظہیر عمر صاحب	
۴۔ وزیر امور سائنس	عبدالحفیظ	"	"	"	اشوک کمار بھاٹیہ صاحب	
۵۔ وزیر امور ادب	جمیل احمد	"	"	"	محمد یوسف انصاری صاحب	
۶۔ وزیر مالیہ	ضمیر الدین	"	"	"	محمد سلطان صاحب	
۷۔ وزیر صحت	جلیل احمد	"	"	"	شوکت علی صاحب	
۸۔ وزیر زراعت و امور طالبات	زاہدہ بیگم	"	"	"	ارجن لال صاحب نسیم	
۹۔ پبلسٹی منسٹر	عبدالستار	دہم	"	"	محمد لیٰسین صاحب	
۱۰۔	جمال اختر	"	"	"	محمد حفظ الرحمٰن صاحب	

عبدالرحیم نشتر



بھیگ کیوں رہے ہیں، چھتری میں آجائیے!

بچوں کی کوششیں

زبان اپنی اپنی

مہاراج پرتاپ موہن صبح کو پریشانی کے عالم میں اٹھے۔ انھوں نے ایک انوکھا خواب دیکھا تھا۔ بہت انوکھا خواب۔ انھوں نے اپنے عقل مند نورتن بلوا بھیجے۔ یہ لوگ نورتن فوراً حاضر ہوئے جھک کر سلام کیا اور خاموش کھڑے ہوگئے۔

چند لمحوں کے بعد مہاراج موہن نے کہا: "میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے۔ اس میں میرے سب دانت گر چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھے کچھ نقصان ہونے والا ہے۔"

سب رتنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر ہلایا لیکن کچھ نہ کہا۔

"کیوں" مہاراج نے کہا "کیا تم میں سے کوئی بھی میرے خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا؟"

ایک رتن نے جھک کر کہا "مہاراج! آپ کے خواب کی تعبیر بہت غم ناک ہے۔ آپ کے سب رشتے دار مر جائیں گے۔ آپ کی ماں، بہن، بھائی اور بیوی وغیرہ سب آپ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے۔"

مہاراج نے یہ بات سنی تو پہلے تو ان کے چہرے پر غم کی کیفیت طاری ہوئی اور پھر غصّہ آگیا۔ جس رتن نے خواب کی تعبیر بتائی تھی اس سے مہاراج نے گرج کر کہا: "تمھیں ایسی غم گین خبر دینے کی کیسے جرأت ہوئی؟"

مہاراج کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ ان کی آواز دربار میں گونج اٹھی۔ "سپاہیو! اس بے وقوف کو لے جاؤ اور سو کوڑے مارو!"

سپاہی اس بے چارے کو لے کر چلے گئے۔

اب راجا نے دوسروں کو مخاطب کیا "تم میں سے کون میرے خواب کی صحیح تعبیر بتا سکتا ہے؟"

ڈر کے مارے سب کا برا حال تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ پہلے نے سچ کہا تھا۔

"بتاتے کیوں نہیں" مہاراج نے کہا "نہ بتاؤ گے تو میں سب کے سر کٹوا دوں گا۔"

یہ سن کر سب سے بوڑھا رتن آگے آیا اور ادب سے بولا "مہاراج آپ دل نہ میلا کریں آپ کا خواب خوشی کا باعث ہے۔ آپ سالہا سال اپنی رعایا پر حکومت کریں گے۔ آپ کی عمر لمبی ہوگی اور آپ اپنے ہر رشتے دار سے زیادہ جئیں گے۔"

مہاراج خوش ہو کے بولے "تم سچ مچ بہت عقل مند ہو۔ تم نے میرے خواب کا اچھا مطلب نکالا۔ یہ لو سونے کے سو سکے۔"

"کیوں؟" ایک رتن نے دوسرے کے کان میں کہا "پہلے نے بھی تو یہی کہا تھا اور اسے سو کوڑے ملے، اور دوسرے کو سونے کے سو ٹکڑے؟"

رتن نے جواب دیا "سچ تو ہے لیکن سچ کہنے کے بھی تو طریقے ہوتے ہیں۔"

(لوک کہانی، ترجمہ "ٹریژر چیسٹ")

مجیب الدین انور (حیدرآباد دکن)

چھڑی کا مستحق کون؟

کہتے ہیں کسی امیر نے کسی آدمی کو نوکر رکھ لیا۔ یہ آدمی شہر بھر میں بدھو اور احمق مشہور تھا۔ امیر کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا پر پچھلے زمانے کے لوگوں میں ایک بات بہت اچھی تھی۔ کسی کو نوکر رکھ لیتے تھے تو آخر تک نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ امیر بھی اس کی حماقت کی باتوں کو برداشت کرتا رہا مگر انھیں الگ نہیں کیا۔

ایک دن امیر کو مذاق سوجھا۔ اس آدمی کو ایک چھڑی دی اور کہا: "بدھو میری طرف سے اس شخص کو تحفے میں دے دینا جو تم سے بھی زیادہ بدھو ہو۔"

اتفاق کی بات چھ مہینے بعد امیر بیمار ہوا۔ ایسا بیمار ہوا کہ جینے کے لالے پڑ گئے۔ وہ بدھو میاں سے بولا: "بدھو میاں اب میں تم سے رخصت ہوا چاہتا ہوں۔"

بدھو میاں نے پوچھا: "کہاں تشریف لے جایئے گا؟"

امیر: "ایسی جگہ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔"

بدھو: "تو کیا وہاں رہنے کے لیے مکان بنوا لیا ہے؟"

امیر: "نہیں!"

بدھو: "باورچی خانے اور توشے خانے کا کوئی انتظام ہے؟"

امیر: "نہیں۔"

اب بدھو میاں مسکرا دیے اور بولے "حضور جہاں آپ کو تھوڑے دن رہنا تھا وہاں تو آپ نے اتنا اونچا محل بنوایا اور آرام و آسائش کا سارا انتظام کیا اور جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ اچھا ایک بات بتایئے وہاں کوئی گاڑی جاتی ہے ؟"

امیر: "نہیں پیدل جانا ہے ۔"

یہ سن کر بدھو میاں کو اپنے آقا پر اور بھی ترس آیا وہ چھڑی آقا کو واپس لوٹا دی اور بولا: "تو پھر حضور یہ چھڑی آپ ہی رکھ لیجیے ۔ اس سے آپ کو بہت سہارا ملے گا۔"

اس۔ ام مسعود۔ سید پوری

بچپن میں میری ماں بھوتوں سے ڈراتی تھیں

ایک گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام بھولو تھا۔ وہ بہت تن درست بہت طاقت ور تھا۔ لیکن ایک بات اس میں بہت بری تھی۔ وہ رات کو بہت ڈرتا تھا۔ دن بھر تو اپنا کام کرتا رہتا تھا لیکن شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی وہ گھر میں دبک کر بیٹھ جاتا تھا۔ دروازے سے قدم باہر نہیں نکالتا تھا۔

وہ دن بھر کام کر کے شام کو گھر میں بھی اپنا دھیان بٹانے کے لیے گانا گاتا یا اپنے آپ سے زور زور سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ لوگ اس سے بہت ناراض تھے۔ ان کی نیند حرام کر دیتا تھا۔ آخر گاؤں کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس کو ڈرایا جائے۔

ایک دن بھولو رام اپنا دن کا کام ختم کرکے گاتا گاتا ہوا آرہا تھا۔ گاؤں والے سب چھپے بیٹھے تھے جب وہ سامنے سے گزرا تب ایک دم سے سب نے خوب شور مچایا۔ اُدھر بھولو رام بھی زور سے چیخا: "بھوت بھوت" اور بے ہوش ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ بھولو رام کو اُس کے گھر لے گئے۔ جب وہ ہوش میں آیا تو چیخنے لگا "بھو.... بھو.... بھوت۔" گاؤں کے لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ بھوت نہیں بلکہ گاؤں والے تھے۔

تب اسے ذرا اطمینان ہوا۔ گاؤں کے آدمیوں نے پوچھا۔ کہ وہ اتنا کیوں بھوت سے ڈرتا ہے وہ کہنے لگا۔ بچپن میں میری ماں مجھے بھوت سے ڈراتی تھیں۔ پر اب بھولو رام کے دل سے بھوت کا ڈر نکل گیا تھا۔ اور اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اپنے بچوں کو کسی چیز سے نہ ڈراؤں گا۔ بچپن میں کسی چیز کا ڈر دل میں ہو تو مشکل سے نکلتا ہے۔

وجے کمار

(جامعہ)

پری کا انعام

بہت دنوں کی بات ہے کہ ملک یونان میں ایک بادشاہ تھا جو اپنی رحم دلی کی وجہ سے پورے یونان میں مشہور تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنے وزیروں اور کچھ درباریوں کے ساتھ شکار کھیلنے جنگل کی طرف نکل پڑا۔

اتفاق کی بات بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے بہت دور نکل گیا اور اس کو اپنے ساتھیوں کے چھوٹ جانے کا کوئی خیال نہ رہا۔ شام ہو چکی تھی۔ دن ڈھل چکا تھا اور وہ اپنی سلطنت سے بہت دور تھا۔ لیکن بے چارہ کیا کرتا۔ وہیں ہری ہری گھاس پہ چادر بچھا کر لیٹ گیا تھکا ماندہ تو تھا ہی لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو دن کے آٹھ بج چکے تھے۔ اس وقت بادشاہ کے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے۔ کھانے کے لیے پاس کچھ نہ تھا۔

بے چارے نے جنگلی پھلوں کو کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ لیکن اب بادشاہ بجائے گھر لوٹنے کے شکار کی تلاش میں نکل پڑا۔ ابھی چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اس کی نظر ایک جھونپڑے پر پڑی۔ بادشاہ کے قدم بے اختیار جھونپڑے کی طرف اٹھنے لگے۔ جوں ہی بادشاہ جھونپڑے کے نزدیک پہنچا ایک آدم خور نے آ کر بادشاہ کو گھیر لیا۔ اس کے پورے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ ہونٹ خوب موٹے موٹے تھے۔ دُم بھی تھی اور ہاتھی جیسے لمبے لمبے دانت بھی تھے۔ بادشاہ اس کی ہیبت ناک صورت دیکھ کر ڈر گیا لیکن ہمت کر کے اپنی بندوق آدم خور کی طرف کر دی اور اس کا خاتمہ کر کے آگے بڑھا۔ بادشاہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ بادشاہ اپنے گھر سے بہت دور تھا لیکن یہ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے آرام کرنے کے لیے ایک نامعلوم جزیرے پر اپنا گھوڑا روک دیا اور دریا کی موج کو اچھلتے کودتے حیرت سے دیکھنے لگا۔ یکایک بادشاہ کی نظر ایک خوب صورت سنہری اور چمکیلی مچھلی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر بادشاہ نے اس مچھلی کو حاصل کرنے کے لیے چھلانگ لگا دی۔ اب بادشاہ کی حیرت کی حد نہ رہی کیوں کہ وہاں مچھلی کے بجائے ایک محل کا خوب صورت دروازہ نظر آیا۔

بادشاہ بے اجازت اس محل میں داخل ہو گیا۔ جب وہ محل کے اندر پہنچا تو اس کی نظر ایک پری پر پڑی جو چاند سورج سے زیادہ خوبصورت تھی۔ یہ وہی خوبصورت مچھلی تھی جو مچھلی کی شکل

دریا کی سیر کرنے نکلی تھی۔ پری بادشاہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھی۔ پری نے بادشاہ سے کہا: "اے نیک دل، رحمدل، انصاف پسند بادشاہ کیا تو جانتا ہے تیرے بغیر تیری رعایا کتنی بے چین ہے اگر تو دیکھنا چاہتا ہے تو اس آئینے میں دیکھ لے"۔ یہ کہہ کر اس نے بادشاہ کو ایک آئینہ دیا۔

بادشاہ نے دیکھا سچ مچ اس کے نہ رہنے کی وجہ سے اس کی رعایا بے چین ہے کسی سپاہی اس کی کھوج میں ہیں اس کے تینوں لڑکے غمگین ہیں۔ بادشاہ نے کہا: "اے رحمدل پری مجھے میرے ملک پہنچا دے"۔ پری نے کہا: "ہاں ہاں ضرور، میں تمھاری رحمدلی کی وجہ سے بہت خوش ہوں اور چاہتی تھی کہ کچھ دوں۔ لیکن تم خود ہی میرے پاس آگئے" یہ کہہ کر بادشاہ کو ایک سونے کے بند پنجرے میں ایک حسین اور خوبصورت سی چڑیا دی۔ جب وہ گاتی تھی تب اس کے منہ سے لعل اور ہیرے گرتے تھے۔ یہ تحفہ دے کر پری نے بادشاہ کو اس کے ملک میں پہنچا دیا۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی رعایا کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے اور امن چین سے رہنے لگے۔

محمد خالد رشید چکدینوی
مسلم ہائی اسکول (ضلع پٹنہ)

(بقایا صفحہ ۳۲ کا)

تلملاتا نہیں دیکھا گیا۔ اور اس نے از راہ ہمدردی چڑے کو آزاد کر دیا تھا۔ اور چڑے کی آزادی کا اعلان پہلی مرتبہ اس چھناکے سے ہوا تھا۔

گھر والوں کی نظروں کے آگے پھر سے بربادی، گندگی اور خرابی کا نقشہ پھر گیا۔ سر چکرا رہے تھے، دماغ ماؤف ہو رہے تھے۔ نظریں غصہ سے پلٹ رہی تھیں زبانیں للکارنے پھٹکارنے کے لیے کھل رہی تھیں۔ ہاتھ مار پیٹ پر آمادہ ہو رہے تھے۔

لیکن منا ــــ ہمدردی سے بھرا ہوا منا۔ اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔

ایجنٹ حضرات سے

'پیام تعلیم' کا سالنامہ جس کی ضخامت ۱۵۰ صفحے اور قیمت ایک روپیہ ہوگی' دسمبر کے آخر میں شائع ہو جائے گا۔ براہ کرم اپنی مطلوبہ کاپیوں کی تعداد ہمیں ہر حالت میں ۲۴ر دسمبر تک ضرور بھیج دیجیے۔

منیجر
'پیام تعلیم'



ایک صاحب اپنی زندگی سے بہت بے زار تھے آخر ایک دن وہ خودکشی کے لیے تیار ہو گئے۔ اتفاق سے اسی وقت ان کا ایک دوست ادھر نکل آیا۔ یہ بزرگوار اپنی کمر کے گرد رسّی باندھے کھڑے ہیں۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا: "ارے یہ کیا؟"
وہ صاحب بولے: "زندگی سے بے زاری"
دوست نے کہا: "تو پھر یہ رسّی کمر کے گرد کیوں باندھے ہو؟"
انھوں نے جواب دیا: "گلے کے گرد پھندا ڈالنے سے تو دم نکلنے لگا تھا!"

"بھئی تم نہیں جانتے میرے بھائی نے ایک حیرت انگیز ایجاد کی ہے؟"
"کیا؟"
"اُبلے ہوئے انڈے تیار کرنے کا نسخہ۔ وہ مرغیوں کو گرم پانی میں تیراتا ہے تاکہ وہ اُبلے ہوئے انڈے دے سکیں۔"

موٹر کار ندی کنارے پہنچی تو پُل ٹوٹا ہوا تھا۔ کنارے پر ایک دیہاتی بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔ ڈرائیور نے اس سے پوچھا "یہ ندی زیادہ گہری تو نہیں ہے؟"
اس نے جواب دیا: "جی نہیں۔"
"کیا اس میں سے کار گزر جائے گی؟"
دیہاتی: "جی ہاں ضرور گزر جائے گی۔"
ڈرائیور نے اپنی موٹر ندی میں ڈال دی پر وہ تو تین چار گز آگے جا کر پانی میں ڈوب گئی۔ ڈرائیور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر باہر نکلا اور چیخ کر بولا: "کم بخت تو تو کہتا تھا کہ ندی زیادہ گہری نہیں ہے۔"
دیہاتی سر کھجا کر بولا: "عجیب بات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بطخ نے ندی پار کی تھی۔ اس کے تو بس ٹانگوں ٹانگوں پانی تھا۔"



بڑوں کی کوششیں

میرا خواب

اُس دن بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے
تھک گیا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ ایک خواب
دکھائی دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ کلاس لگی ہوئی ہے
اردو کا گھنٹہ چل رہا ہے اور غفار صاحب ہمیں
پڑھا رہے ہیں۔ میرا نام لے کر کہا آپ پڑھیے،
اور میں کھڑا ہو گیا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی
میں پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے بہت شرم آ رہی
تھی۔ ماسٹر صاحب نے کہا کہ آپ بہت پڑھتے تھے
آج کیا ہو گیا۔ تب میں نے مشکل سے ایک صفحہ
پڑھا اور بیٹھ گیا۔

اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ اپنے کو کمرے میں
پایا۔ میرے ساتھی اُٹھ چکے تھے۔ دن نکل چکا تھا
میں نے اپنا سب کام پورا کیا۔ اس دن اردو کا
گھنٹہ بھی تھا۔ اردو کی کتاب کو اُٹھا کر پڑھنے
بیٹھ گیا، کہیں آج سچ مچ خواب پورا نہ ہو جائے۔
سبق بھی مشکل تھا۔ کلاس میں گیا۔ میرا پڑھنے کا
نمبر آیا کتاب کو تیزی سے پڑھنے لگا۔ ماسٹر صاحب
نے شاباشی دی۔ میں خوش تو تھا لیکن وہ خواب
اب بھی یاد آ رہا تھا۔

چرن داس
(سال دوم)

نادان کی بھول

میرے چاچا چاچی کے انتقال کو تھوڑے ہی
دن ہوئے تھے۔ میرے چاچا چاچی کا لڑکا دیر چھوٹا
سا تھا اسے ایک دن ایسا آدمی ملا جو باؤجی کی طرح
پوشاک پہنے رکشے پر آ رہا تھا۔ اسے اس نے باؤجی

سمجھ کر رکشا روک لیا۔ اور اس کے گلے لگ کر رونے لگا اور کہنے لگا آپ اتنے دن کہاں رہے، نہ کوئی خط لکھا۔ عجیب بات تھی۔ وہ راہی بڑا حیران سا ہمارے گھر آیا اور پوچھا یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ قصہ اس کا نہیں تھا کالونی کے اور لوگوں کو بھی شبہ ہو گیا تھا کہ کالڑا صاحب آ گئے ہیں۔ بعض کو ان کے مرنے کا خیال نہ تھا۔

ہم نے اس راہ گیر کو سارا قصہ سنایا اور اس سے معافی مانگی۔ اس واقعہ نے ہمارے دلوں پر اور بھی نمک چھڑک دیا۔ سارا گھر رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔ جسے سن کر پڑوس کے آدمی ہمارے گھر آ گئے۔ کوئی آدمی کہتا وہ بڑے اچھے تھے۔ کیوں روتے ہو آخر ایک دن تو یہ زندگی فنا ہونا ہی ہے۔ اس طرح ایک نادان کی بھول سے یہ قصہ ہنگامے کا سبب بن گیا۔

سندری کالڑا
سال دوم

قدرت سے کچھ سیکھو

پھول کھلے مسکائی کلی
ناچے بن میں مور
چاہتی ہوں میں بھی ناچوں گاؤں
بچھڑے بادل کا چھور
سورج کی کرنیں آتی ہیں
دنیا کو جگا جاتی ہیں
سب بچوں نے لی انگڑائی
دور آنکھوں سے نیند بھگائی
عجب ہے ان کرنوں کی لیلا
کبھی اٹھاتیں کبھی سلاتیں
پھر بھی سب کے من کو بھاتیں
ہم بھی ایسے کام کریں
جگ میں اونچا نام کریں

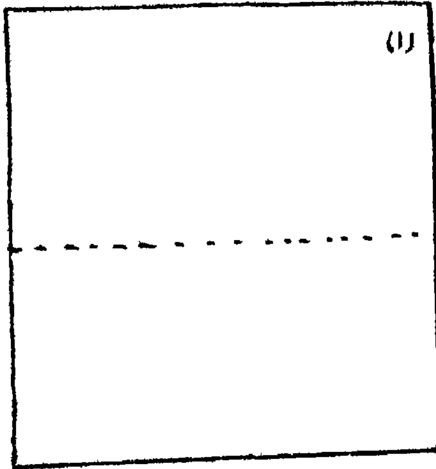
اوشا کتیال
سال دوم

پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہم سے ضرور کیجیے، مگر اپنے مقامی ڈاکخانے کو بھی متوجہ کرتے رہیے۔

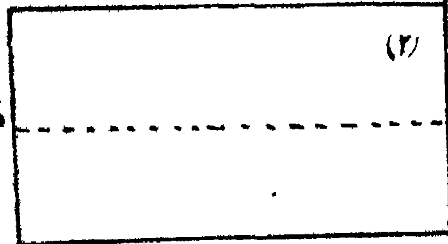
منیجر

کاری خورشید عبداللہ (اورنگ آباد)

ٹوپی بنائیے



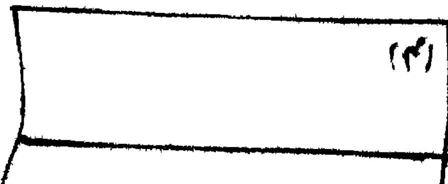
ایک مربع کاغذ شکل نمبر ۱ کی طرح لیجیے۔



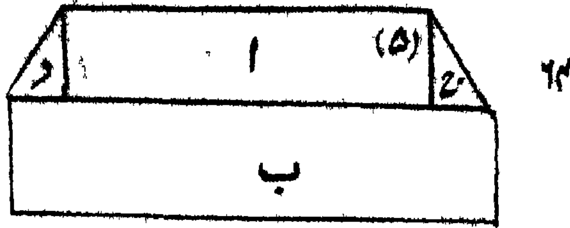
بیچ میں نشان لگا کر شکل ۲ کی طرح موڑ لیجیے۔



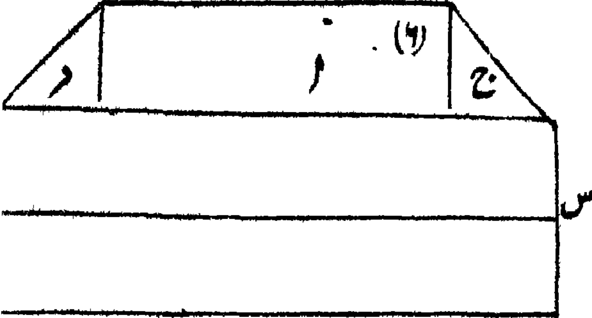
مزید ایک موڑ دِ اور ذ پر موڑ کر شکل ۳ کی طرح بنا کر پھر کھول دیجیے۔



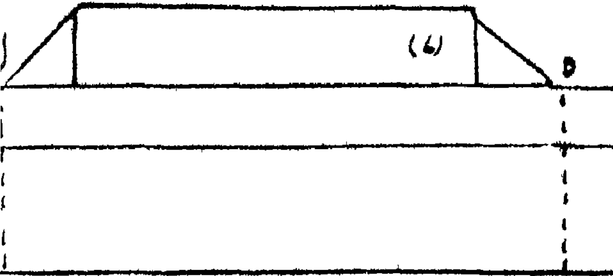
جو شکل ۴ کی طرح رہے گا۔



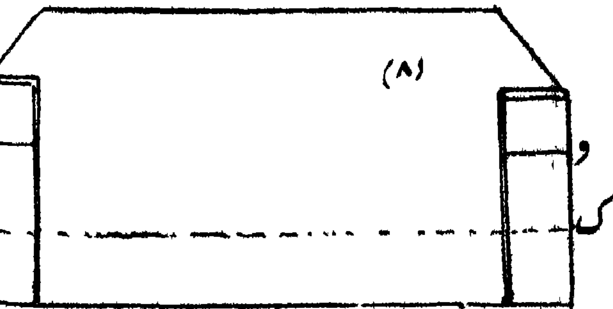
اوپر کے دونوں جانب کے سرے د اور ج
پر ترچھے موڑ کر شکل ۵ کی طرح بنا لیجیے۔



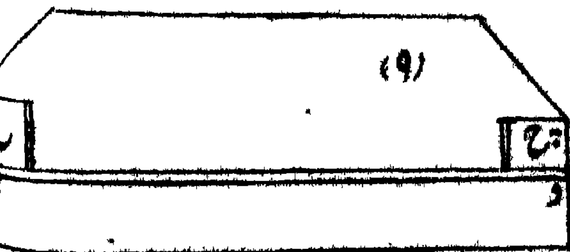
حصہ ب کے اوپری رُخ کو س اور سؔ
پر موڑ دیجیے۔ شکل ۶ کی طرح۔



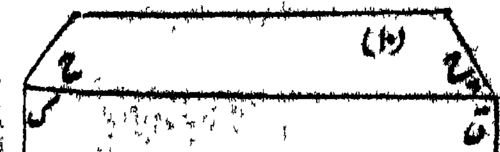
اوپر کی جانب پٹی س اور ش کو
مزید ج اور د پر موڑ کر شکل ۷ کی طرح
تیار کر لیجیے۔



شکل ۷ پر ہ، ا اور ل، ی کو پشت
کی جانب موڑ کر پچھلا حصہ اپنے سامنے
لے لیجیے جو شکل ۸ کی طرح ہوگا۔



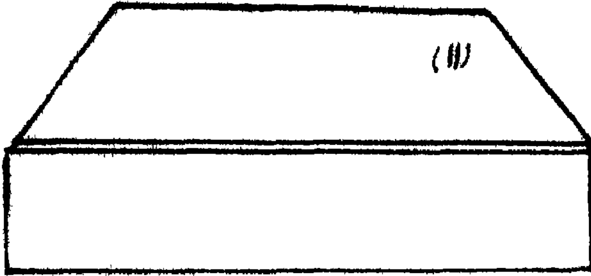
شکل ۸ میں ک اور گ پر نشان
لگا کر پٹی و اور ن پر موڑ دیجیے جس سے
آپ کو شکل ۹ حاصل ہوگی۔
پٹی ق، ک کو ج، ج پر موڑ دیجیے شکل ۱۰
کی طرح۔ پٹی ق، ک کے پیچھے کا حصہ یعنی ک، گ
والا اسے آپ کھانچا ج اور ج کے اندر احتیاط

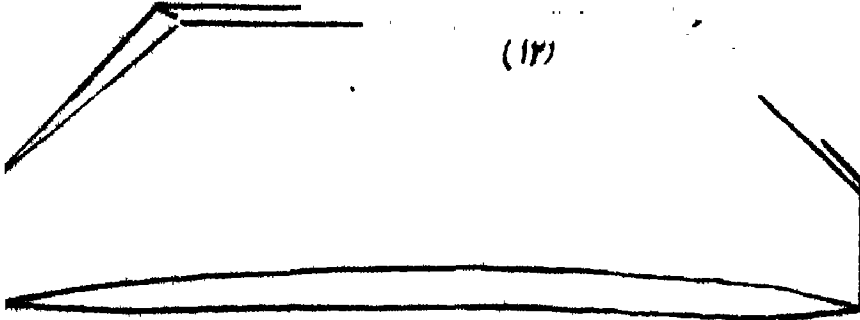


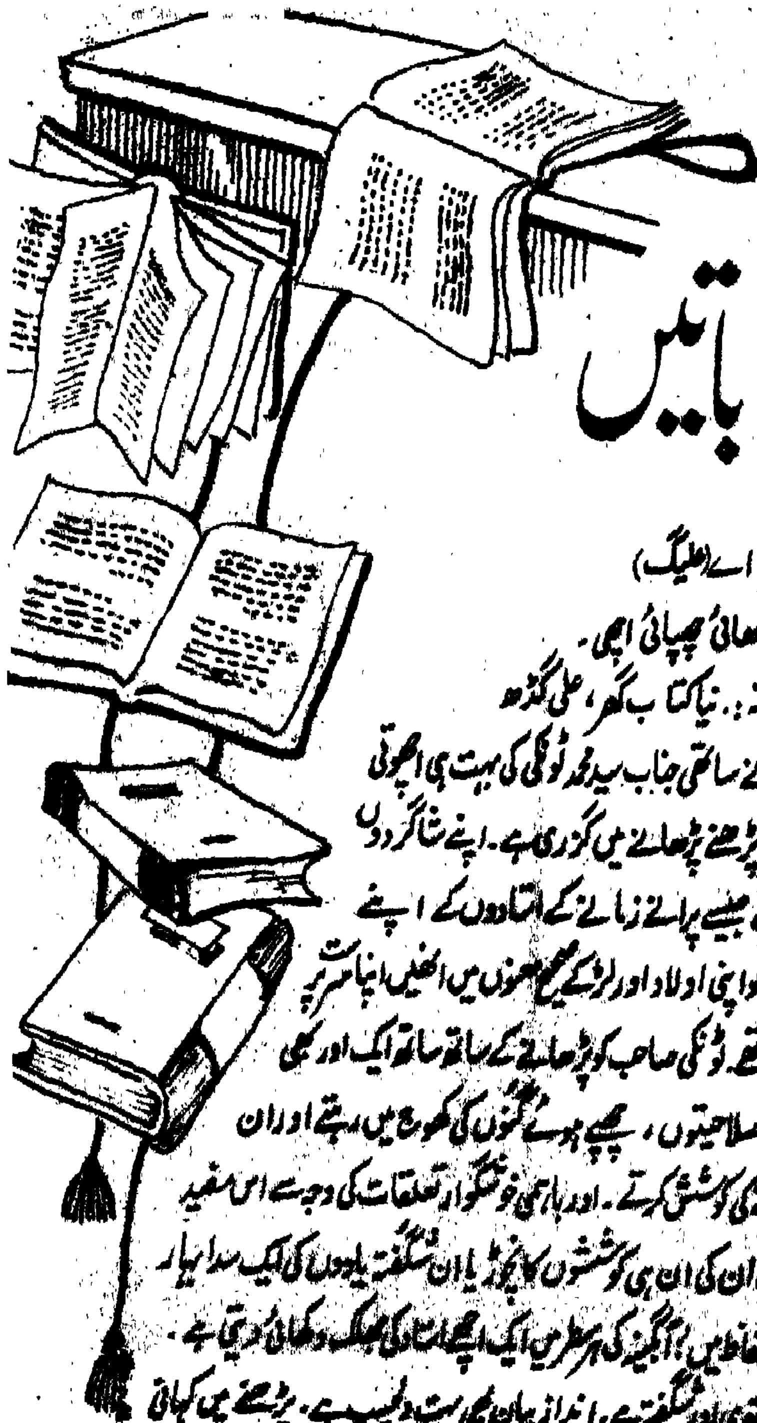
سے ڈال کر پٹی برابر کر لیجیے۔ اسے نیچے سے کھول کر اوپری حصے کو تصویر میں دیے ہوئے طریقے پر موڑ سکتے ہیں۔

لیجیے ہمارے نیتا جی کی ٹوپی تیار ہو گئی۔

اخبار یا بڑا کاغذ لے کر اسے آپ اپنے لیے بھی بنا سکتے ہیں۔







معلم

کتابوں کی باتیں

آبگینہ : از: سید محمد ٹونکی ایم اے (علیگ)

ضخامت ۶۴ صفحے ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ لکھائی چھپائی اچھی۔

قیمت مجلّد: ایک روپیہ پندرہ پیسے ۔ ملنے کا پتہ: نیا کتاب گھر، علی گڑھ

یہ پیام تعلیم کے ساتھی، بہت پرانے ساتھی جناب سید محمد ٹونکی کی بہت ہی اچھوتی کتاب ہے ۔ ٹونکی صاحب کی ساری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کے تعلقات بالکل ایسے ہی تھے جیسے پرانے زمانے کے استادوں کے اپنے شاگردوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ لڑکوں کو اپنی اولاد اور لڑکے صحیح معنوں میں انھیں اپنا سرپرست سمجھتے تھے دل کی بات کہنے میں ذرا نہ جھجکتے تھے۔ ٹونکی صاحب کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی دُھن تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کی خفیہ صلاحیتوں، چھپے ہوئے گُنوں کی کھوج میں رہتے اور ان صلاحیتوں کو ابھارنے، انھیں اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ۔ اور باہمی خوشگوار تعلقات کی وجہ سے اس مفید کام میں بڑی مدد ملتی تھی۔ یہ چھوٹی سی کتاب ان کی ان ہی کوششوں کا نچوڑ یا ان شگفتہ یادوں کی ایک سدا بہار پھلواری ہے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند کے الفاظ میں "آبگینہ کی ہر سطر میں ایک اچھے استاد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

کتاب کی زبان بھی بہت نکھری، ستھری اور شگفتہ ہے۔ انداز بیان بھی بہت دلچسپ ہے۔ پڑھنے میں کہانی کا سا لطف آتا ہے اور کہانی بھی ایک نہیں بہت سی۔

ہمیں یقین ہے کہ ٹونکی صاحب کی یہ کتاب لڑکوں اور استادوں میں یکساں مقبول ہوگی۔

۱۔ سستی دھاتیں :۔ سید تقی رضا نقوی امروہوی

۲۔ قیمتی دھاتیں :۔ سید تقی رضا نقوی امروہوی

۳۔ کوئلہ :۔ سید قاضی محمد احمد

دنیا کی کہانی کو آٹھ دس ہزار برس پہلے سے شروع کیا جاتا ہے۔ اس سے پرانی تاریخ نہ معلوم ہونے کے برابر ہے جسے 'پتھر کا زمانہ' کہتے ہیں کیوں کہ اس وقت انسان صرف پتھر ہی کا استعمال جانتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے مختلف دھاتوں کا استعمال سیکھ لیا اور ترقی کے راستے پر چل پڑا۔ اس نے اپنی سمجھ بوجھ کے سہارے زمین کا سینہ چیرا اور چھپی ہوئی دولت سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے لگا۔ لوہا، تانبا، سیسہ وغیرہ ہمارے کام کی دھاتیں ہیں۔ کچھ دھاتیں انسان نے خود بھی بنا لیں جیسے پیتل جو تانبے اور جست کے ملانے سے بن جاتا ہے۔ یہ سب سستی دھاتیں کہلاتی ہیں۔ اس نام کی کتاب میں انھیں کا ذکر ہے۔ سستی دھاتیں کون کون سی ہیں؟ ان کو کس طرح کام کے لائق بنایا جاتا ہے اور ان سے کیسے کیسے کام نکلتے ہیں؟ یہ سب 'سستی دھاتیں' پڑھنے سے پتہ چلے گا۔

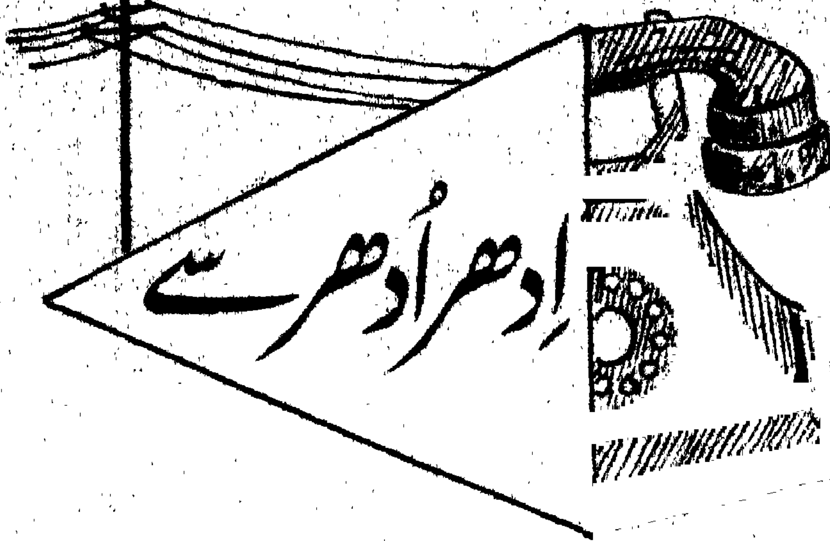
قیمتی دھاتوں میں سونا، چاندی، سوڈیم اور ریڈیم شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ بچوں نے سوڈیم اور ریڈیم کا نام نہ سنا ہو۔ اب انھیں ان کے بارے میں پتہ چلے گا۔ یہ دھاتیں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں اور مشکل سے ہاتھ لگتی ہیں، اسی لیے وہ قیمتی ہیں۔ لیکن دھاتیں خواہ سستی ہوں یا قیمتی، سب ہی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ذرا سوچیے تو کہ کوئی دھات بھی موجود نہیں ہے۔ پھر ذرا اپنی دنیا کا نقشہ جمائیے۔ اڑا اڑا دھم! لوٹ پڑے آٹھ دس ہزار برس پیچھے۔ وہی پتھر کا زمانہ آ گیا۔ سوئی تک پاس نہیں۔ نہ پیسہ نہ ٹکا۔ نہ کوئی مشین، نہ جہاز، نہ زیور، نہ دولت۔ واقعی یہ تمام دھاتیں ہی ہماری ساری ترقی کا سبب ہیں۔

ان دونوں کتابوں میں سیدھے سادے آسان ڈھنگ سے دھاتوں کے بارے میں مفید معلومات درج کی گئی ہیں۔ وہ بھی باتوں باتوں میں۔ سید تقی رضا صاحب ایک تجربہ کار استاد ہیں اور ان کتابوں کے

ان کے علم اور تجربے کی جھلک موجود ہے۔

کالا کلوٹا کوئلہ! اسے کون نہیں جانتا؟ سینکڑوں قسم کی مشینیں ساری دنیا میں دن رات اس کے بل بوتے پر دھڑ دھڑ کیا کرتی ہیں۔ دنیا کی موجودہ ترقی میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ دراصل ایک قسم کا کالا پتھر ہے جو چٹانوں کی شکل میں جگہ جگہ زمین کے نیچے پایا جاتا ہے اور اسے کھود کر نکالتے ہیں۔ خدا جانے وہ کب سے زمین کے نیچے منہ چھپائے پڑا تھا۔ لیکن لگ بھگ دو ہزار سال پہلے اس کا پتہ چلا۔ پھر تو اس کے دن پھر گئے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ اس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اسے کان سے نکالنے کے مخصوص طریقے ہیں۔ ہمارے دیس میں بھی کوئلہ ملتا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں قاضی محمد احمد صاحب نے اپنی کتاب 'کوئلہ' میں بخوبی بیان کی ہیں جن سے واقفیت بڑھتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنے بیان کو دلچسپ بھی بنا دیا ہے۔ قاضی محمد احمد صاحب جغرافیہ کے لکچرر ہیں اور اپنے مضمون سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

یہ تینوں کتابیں ادارۂ تعلیم و ترقی نے پورے صاف ستھرے طریقے پر تیار کی ہیں۔ اُن کی زبان اتنی آسان ہے کہ کم پڑھے لکھے بڑے اور تیسری چوتھی جماعتوں میں پڑھنے والے بچّے آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔



صحافی

میں ایک موٹر کار کھا سکتا ہوں

جادو کا تماشا دکھانے والے ایک شخص مسٹر لیون سیمسن نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک موٹر کار کھا سکتا ہے۔ مگر ایک دم نہیں بلکہ ایک ایک پرزہ کر کے پانچ سال کے اندر۔

سیمسن یونان کا رہنے والا ہے۔ آج کل آسٹریلیا میں اپنے کمال دکھا رہا ہے۔ وہ چلتی ہوئی موٹروں اور موٹر سائیکلوں کو اپنی طاقت سے روک دیتا ہے۔ گزشتہ ساڑھے چار سال کے اندر وہ ان تماشوں میں ساڑھے بارہ ہزار بلیڈ اور ۳۰۰ سے زیادہ بلب نگل چکا ہے۔

پنڈت نہرو کی سالگرہ

ہمارے سب کے پیارے چاچا نہرو کو اپنی سالگرہ منانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ چھوٹے تھے تو یہ شکایت کرتے تھے کہ یہ سالگرہ کا تہوار سال میں ایک ہی بار کیوں آتا ہے۔ پنڈت جی کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ بچے بھی ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔

اب پنڈت جی ہم میں نہیں۔ پر بچے ان کی سالگرہ کا دن بہت دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اسی لیے پنڈت جی کے جنم دن کو ہمارے ملک میں "بچوں کا دن" کہا جاتا ہے۔

اس سال ۱۴ نومبر کو پنڈت جی کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی گئی۔ ملک کے کونے کونے سے جلسوں، جلوسوں اور میلوں کے ہونے کی خبریں ملی ہیں۔

دہلی میں اُس دن بچوں کا میلا ہوا۔ گانے بجانے، ڈرامے اور جلسوں کے علاوہ پینٹنگ کے مقابلے بھی ہوئے۔ میلے میں بچوں نے اپنی اپنی دکانیں لگائیں، بچے ہی دکاندار تھے، بچے ہی خریدار، بچے ہی جلسوں کے صدر تھے، بچے ہی مقرر۔

ہمارے وزیراعظم لال بہادر شاستری جی نے بھی بچوں کے ایک جلسے میں تقریر کی تھی۔

پنڈت نہرو کی یادیں

روس کے سفارت خانے کی طرف سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایک رسالہ نکلتا ہے۔ جس کا نام ہے "سوویت دیس"۔ اس رسالے کی طرف سے پنڈت نہرو کی یاد میں بہت سے انعامات جاری کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے مشہور لکھنے والوں کو یہ انعامات ملے۔ ان انعام پانے والوں میں اردو کے مشہور شاعر سردار جعفری بھی ہیں۔

سوویت دیس نے پنڈت جی کی یاد میں بچوں کی پینٹنگ کا ایک مقابلہ بھی کیا تھا۔ اس مقابلے میں ۱۲ سال کی ایک بچی کماری سروج

دُنیا کے پرانے چڑیا گھر

کہتے ہیں آج سے کوئی تین ہزار سال پہلے چین کے ایک بادشاہ نے ایک چڑیا گھر بنوایا تھا۔ اس چڑیا گھر میں ملک کے مختلف علاقوں کے چرندے اور پرندے رکھے گئے تھے۔ مگر یہ چڑیا گھر آج کی طرح کا چڑیا گھر نہیں تھا، جہاں ہر آدمی جا سکے۔ اس میں راجا کے خاص خاص آدمی ہی جا سکتے تھے۔

بہت دنوں پہلے مصر کے بادشاہ شوقیہ طور پر جنگلی جانور اور پرندے پالتے تھے۔ صحیح معنی میں سب سے پہلے چڑیا گھر مصر کے ایک بادشاہ نے قائم کیا تھا۔ اس بادشاہ نے اپنے چڑیا گھر کے لیے بھانت بھانت کے جنگلی جانوروں اور پرندوں کو زندہ پکڑ کر لانے کے لیے لوگوں کو مختلف ملکوں میں بھیجا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ قسم قسم کے بندر، شیر، چیتے، زراف اور سیکڑوں قسم کے کتّے لائے۔

آج سے دو ہزار سال پہلے روم کے شہنشاہ نے بھی ایک بہت بڑا چڑیا گھر بنوایا تھا۔ کہتے ہیں اس چڑیا گھر میں دنیا کے مختلف ملکوں کے چھ سو سے زیادہ شیر تھے۔ اور بے شمار دوسرے جانور۔

مگر اس سے بہت پہلے مصر میں ایک تہوا

ایا جاتا تھا۔ بہت ہی دلچسپ تہوار۔ اُس دن جنگلی لوروں کا ایک بڑا جلوس نکلتا تھا۔ بہت ہی دھوم دھام سے نکلتا تھا جیسے کوئی چلتا پھرتا چڑیا گھر۔

دنیا کی آبادی

سمندر میں چھپی ہوئی دولت کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب زرا خشکی پر بسنے والوں کی آبادی پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے۔

دنیا کی کل آبادی اس وقت اندازاً ۳۰۰ کروڑ ہے۔ مگر اس آبادی کا دو تہائی حصّہ اکیلے دس ملکوں میں آباد ہے۔ باقی ایک تہائی آبادی ڈیڑھ سو کے قریب دوسرے ملکوں میں آباد ہے۔

آبادی کے لحاظ سے پہلا نمبر چین کا ہے۔ اس کی آبادی ۶۵ کروڑ ہے۔ ہندوستان کا نمبر دوسرا ہے۔ یہاں کی ۴۶ کروڑ ہے۔ روس میں ۲۲ کروڑ۔ امریکہ میں ۱۹ کروڑ۔ انڈونیشیا اور پاکستان میں دس دس کروڑ۔ جاپان میں ساڑھے نو کروڑ۔ برازیل میں ساڑھے سات کروڑ۔ مغربی جرمنی اور برطانیہ میں ہر ایک میں ساڑھے پانچ کروڑ انسان بستے ہیں۔

اٹلس کی تصویر

نومبر کے پیام تعلیم میں ہم نے دنیا کے سب سے

اونچے پوسٹ آفس یا ڈاک خانے کا ذکر کیا تھا۔ اس پرچے میں اُس کی تصویر بھی دیکھیے۔ یہ تصویر ہمیں برٹش انفارمیشن سروس کی عنایت سے ملی ہے۔ ہم ان کی اس نوازش کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ایشیا کے بچّوں کی نمائش

انگلستان میں پچھلے ہفتے ایشیا کے بچّوں کی ایک نمائش کی گئی تھی۔ اس نمائش میں ایشیا کے مختلف ملکوں کے بچّے اپنی قومی پوشاکوں میں موجود تھے۔ ان بچّوں نے اپنے ملک کے تحفے ایک دوسرے کو پیش کیے۔ بچّوں کی پینٹنگ، گانے بجانے اور ڈرامے بھی ہوئے۔ ہندوستان کے بچّوں نے ان پروگراموں میں بہت دلچسپی سے حصّہ لیا۔

بچّوں کے لیے کہانیاں

اِس موقع پر کہانیوں کا ایک مقابلہ بھی ہوا۔ یہ کہانیاں ایشیا کے مختلف ملکوں کے لکھنے والوں نے خاص طور سے چھوٹے بچّوں کے لیے لکھی تھیں۔ اس مقابلے میں ۲۰۴ کہانیاں آئی تھیں۔ ہندوستان سے انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی گیارہ زبانوں کی کہانیاں شامل تھیں۔ ان میں سے تین کہانیوں کو انعام بھی ملا۔



پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس دریا گنج میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع

ember, 1965. Regd. No. D. 1451

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.